تفسیر مظہری

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی

مولانا سید عبدالدائم الجلالی

دارالاشاعت

تفسیر مظہری

جلد سوم

بقیہ سورۂ نساء سے سورۂ مائدہ

پارہ ۵ تا پارہ ۶

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتیؒ

تشریحی ترجمہ مع ضروری اضافات

مولانا سید عبدالدائم الجلالی

رفیق ندوۃ المصنفین

ناشر

دارالاشاعت

اردو بازار کراچی ۱ ——— فون ۲۱۳۷۶۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست عنوانات

تفسیر مظہری اردو جلد سوم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

تفسیر مظہری اردو جلد سوم پارہ پنجم و ششم

پارہ وَالْمُحْصَنٰتُ

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اور حرام کر دی گئی ہیں شوہروں والی عورتیں، یعنی شوہروں والی عورتوں سے کسی دوسرے کا نکاح اس وقت تک درست نہیں جب تک ان کے شوہر مر نہ جائیں، یا طلاق نہ دے دیں او عدت، وفات یا عدت طلاق گزر نہ جائے، سہاگن عورتوں کو محصنات کہنے کی وجہ یہ ہے کہ نکاح اور بیاہ سے ان کا تحفظ ہو جاتا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری کی روایت ہے کہ اس آیت کا نزول ان مہاجر عورتوں کے متعلق ہوا جو خود بغیر شوہر کے مسلمان ہو کر ہجرت کر کے آجاتی تھیں اور بعض مسلمان ان سے نکاح کر لیتے تھے پھر ان کے شوہر مسلمان ہو کر ہجرت کر کے آجاتے تھے اللہ نے ایسی عورتوں سے نکاح کرنے کی اس آیت میں ممانعت فرما دی۔

میں کہتا ہوں شاید اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ آزاد عورت اگر ہجرت کر کے آجائے اور اس کا شوہر مسلمان ہو تو خواہ وہ دار الحرب میں ہی ہو مگر اس عوت کا جدید نکاح جائز نہیں کیونکہ دین دونوں کا ایک ہے اگرچہ حکماً وطنیت کا اختلاف ہے لیکن اگر کوئی عورت مسلمان ہو کر ہجرت کر آئے اور اس کا شوہر مسلمان نہ ہو۔ اور دار الحرب میں موجود ہو تو ایسی عورت کا جدید نکاح درست ہے اللہ نے فرمایا ہے، يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ، وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ یعنی اگر مومن عورتیں تمہارے پاس ہجرت کر کے آجائیں تو ان کی جانچ کر لو، اگر جانچ کے بعد وہ مومن ثابت ہوں تو پھر کافروں کے پاس ان کو واپس نہ بھیجو نہ وہ ان (کافروں) کے لئے حلال ہیں نہ وہ (کافر) ان کے لئے حلال ہیں، الی قولہ، اور ان سے نکاح کرنے میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

لیکن امام اعظمؒ اور صاحبینؒ کے نزدیک دار الحرب سے نکلتے ہی مومن عورت کی اپنے کافر شوہر سے فرقت ہو جاتی ہے کیونکہ وطنیت حقیقۃً بھی بدل جاتی ہے اور حکماً بھی۔ امام صاحبؒ کے نزدیک فرقت کے بعد کوئی عدت بھی نہیں ہے لیکن صاحبین کے نزدیک عدت لازم ہے، امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک مسلمان ہونے کے وقت سے تین حیض ہو جانے کے بعد فرقت کا حکم ہوگا بشرطیکہ شوہر نے اس سے قربت کی ہو اور قربت نہ کی ہو تو مسلمان ہوتے ہی فرقت کا حکم ہو جائے گا وطنیت کے اختلاف سے ان ائمہ کے نزدیک کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مگر جو تمہاری مملوک ہو جائیں، عطاء نے کہا اس استثناء کی مراد یہ ہے کہ اگر کسی کی

باندی اسی کے غلام کے نکاح میں ہو تو غلام کے نکاح سے نکال لینے کا اس کو حق ہے مگر یہ قول باجماع سلف غلط ہے صحیح وہ ہے جو مسلم اور ابو داؤد اور ترمذی اور نسائی نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے لکھا ہے ابو سعیدؓ کا بیان ہے کہ جنگ اوطاس میں ہم نے کچھ عورتیں گرفتار کی تھیں جن کے شوہر موجود تھے، ہم نے ان سے قربت کرنی مناسب نہیں سمجھی اور رسول اللہ ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا، اس پر آیت نازل ہوئی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو عورتیں غنیمت جنگ میں تم کو اللہ نے دی ہوں اور تم اُن سے حلال سمجھ کر قربت کی ہو تو کوئی گناہ نہیں ہے۔

طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول جنگ حنین کے دن ہوا، فتح حنین کے دن مسلمانوں کو کچھ عورتیں ہاتھ لگیں جو اہل کتاب کی تھیں اور ان کے شوہر موجود تھے اگر کوئی مسلمان اُن میں سے کسی عورت سے قربت کرنی چاہتا تھا تو وہ کہتی تھی میرا شوہر ہے یہ مسئلہ حضورؐ سے دریافت کیا گیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی عورت گرفتار ہو کر آئے خواہ شوہر کے ساتھ یا بغیر شوہر کے بہر طور شوہر سے فرقت ہو جاتی ہے اور جو اس عورت کا مالک ہو اس کے لئے اس عورت سے قربت درست ہے لیکن استبراء ضروری ہے کیونکہ اوطاس کے دن رسول اللہ ﷺ کے منادی نے نداء کر دی تھی کہ حاملہ عورتوں سے وضع حمل سے پہلے نکاح نہ کیا جائے اور نہ غیر حاملہ عورتوں سے جب تک ان کو حیض نہ آجائے۔

اسی طرح مالک کو اختیار ہے کہ وہ مملوکہ کا کسی اور سے نکاح کرا دے، اور یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ کسی عورت کے قیدی بنا لینے کا تقاضا یہی ہے کہ قید کرنے والے کو جس طرح قیدی کی ذات کی ملکیت خالص طور پر حاصل ہو جاتی ہے اسی طرح قیدی سے **کامل نفع اندوزی کا بھی حق حاصل ہوتا ہے۔ امام مالکؒ** امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا یہی قول ہے ان ائمہ کا بیان ہے کہ اوطاس کی لڑائی میں عورتوں کو اُن کے شوہروں سمیت گرفتار کیا گیا تھا، امام اعظمؒ نے فرمایا کہ صرف قید ہونے سے ہی کسی عورت کی فرقت کا حکم نہیں ہو جاتا وہاں اگر صرف ایک گرفتار ہو دوسرا گرفتار نہ ہو (تو محض گرفتاری سے ہی فرقت کا حکم ہو جائے گا) امام صاحب کے نزدیک وطنیت کا حقیقی اور حکمی اختلاف موجب فرقت ہے قیدی ہو جانا موجب فرقت نہیں، احناف کا مقولہ ہے کہ وطنیت کے اختلاف سے مصالح نکاح کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے گویا وطنیت کا اختلاف محرم ہوا اسی طرح ہے اور گرفتاری کا تقاضا ہے کہ مملوک کی ذات کی خالص ملکیت مالک کو حاصل ہو رہا، کامل طور پر منفی تمتع اندوزی تو یہ ضروری نہیں، ملکیت ذات کے لئے ملکیت تمتع لازم نہیں، مگر یہ نص کے مقابلہ میں قیاسی استدلال ہے (جو قابل قبول نہیں)۔

ابن ہمام نے لکھا ہے کہ **جنگ اوطاس** میں تنہا عورتوں کا بغیر مردوں کے گرفتار ہونا روایت میں آیا ہے، ترمذی کی روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت ابو سعیدؓ خدری نے فرمایا ہم نے اوطاسؓ میں کچھ عورتیں قید کیں جن کے شوہر انکی قوم میں موجود تھے لوگوں نے اس کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ سے کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

میں کہتا ہوں کہ ترمذی کی روایت میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے یقینی طور پر صرف عورتوں کا بغیر شوہروں کے گرفتار **ہونا معلوم ہوتا ہو** اس لئے امام شافعیؒ کا قول ظاہر ہے اور اگر صرف عورتوں کا بغیر شوہروں کے گرفتار ہونا ثابت بھی ہو جائے تب بھی عموم الفاظ قابل اعتبار ہے خصوص سبب معتبر نہیں، پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ آیت میں شوہر والی عورتوں سے استثناء ملکیت ذات کے الفاظ سے کیا گیا ہے، اختلاف دار (وطن) کا لفظ نہیں ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ بالاجماع آیت اپنے عموم پر نہیں ہے کیونکہ عموم آیت تو ہر مملوکہ کو شامل ہے خواہ جنگ میں گرفتار کی گئی ہو یا خریدی گئی ہو یا میراث کے ذریعہ سے ملی ہو اور یہ مسئلہ اجماعی کہ اگر کوئی منکوحہ خریدی جائے تو عموم آیت اس کو شامل نہیں ہے، پس آیت اگرچہ عام ہے مگر اپنے عموم پر نہیں ہے بلکہ مخصوص البعض ہے اس لئے شوہر والی عورت اگر بطور غنیمت ملی ہو تو آیت کے عموم سے اس کو بھی ہم نے خاص کر لیا (کیونکہ شوہر والی عورت کو اگر خرید لیا جائے تو وہ بالاجماع مخصوص ہے اور اس پر ہم نے قیدی منکوحہ کو قیاس کر لیا)۔

میں کہتا ہوں کہ تخصیص عام خواہ ظنی ہو مگر اس کے لئے دلیل شرعی ہونی چاہئے نص ہو یا اجماع ہو یا قیاس ہو صرف رائے تو تخصیص کے لئے کافی نہیں، اس کے علاوہ خرید کردہ منکوحہ کو بالاجماع عموم آیت سے مخصوص قرار دینا قابل تسلیم نہیں (ایسا کوئی اجماع نہیں ہے) بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا اللہ کی مراد اس آیت سے یہ ہے کہ جب منکوحہ باندی کو فروخت کر دیا جائے تو صرف بیچنے سے ہی شوہر سے اس کی تفریق ہو جاتی ہے اور محض فروخت ہی اس کے لئے طلاق بن جاتی ہے، رواہ ابن ابی شیبۃ وابن جریر عبد بن حمید۔

میں کہتا ہوں ممکن ہے کہ آیت میں محصنات سے مراد ہوں صرف وہ آزاد عورتیں جو شوہروں والیاں ہوں اور ان پر قیاس کر کے منکوحہ باندیوں کو بھی ان کے ساتھ ملا دیا جائے اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ منکوحہ آزاد عورتیں تم پر حرام کر دی گئی ہیں سوائے ان عورتوں کے جن کو قید کر کے باندی بنا لیا گیا ہو اس وقت خرید کردہ یا میراث میں ملی ہوئی باندی کو حکم حلت سے خاص کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی کیونکہ خریدنے (اور میراث میں آنے سے) پہلے وہ محصنہ ہی نہیں تھی مملوکہ تھی ہاں وہ قیدی عورت جس کو قید کر کے باندی بنایا گیا ہو پہلے سے باندی نہیں تھی، آزاد عورت تھی۔

كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اللہ نے ان عورتوں کی حرمت کو تم پر فرض کر دیا ہے، عبیدؓ کی روایت سے ابن جریرؒ نے کتاب اللہ کی تشریح میں حضرت عمر بن خطابؓ کا قول نقل کیا ہے (یعنی) چار (عورتیں تمہارے لئے مقرر کر دی ہے) اور ابن جریج کی روایت سے ابن المنذرؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ایک سے چار تک نکاح میں لانے کی اجازت دی ہے)۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اور ان مذکورہ عورتوں کے ماسوا تمہارے حلال کر دیا گیا ہے، حدیث اور اجماع اور قیاس کی وجہ سے وہ عورتیں جن کی حرمت کی تشریح ہم نے مذکورۂ بالا بیان میں کر دی ہے اور چار سے زیادہ عورتیں اس عمومی حکم حلت سے الگ کر لی گئی ہیں۔

اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ حرام کردہ مذکورۂ بالا عورتوں کے علاوہ دوسری عورتوں کو طلب کرنا مال کے ساتھ (تمہارے لئے حلال کر دیا گیا ہے) باموالکم سے مراد ہے مال دے کر لینا خواہ مہر دے کر یا خرید کر۔

مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ط پاک دامن رہتے ہوئے بغیر ناجائز تعلق کے۔

محصنین سے مراد ہیں پاک دامن باعفت کیونکہ عفت نام ہے فاحشہ (یعنی بے حیائی اور زنا) سے شرم گاہ کو اور ملامت و عذاب سے نفس کو بچانے اور محفوظ رکھنے کا، سفاح سے مراد ہے زناء کیونکہ سفح کا لغوی ترجمہ ہے بہانا یعنی جوہر منوی کو بے فائدہ بغیر غرض غسل کے بہانا (یہ ہی زناء ہے)۔

ان تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ ، اُحِلَّ لَكُمْ مَّاوَرَاءَ ذٰلِكُمْ سے بدل ہے کیونکہ ماوراء کی طرف حلت کی نسبت کرنے سے طلب بالمال ہی مقصود ہے کیونکہ محرمات کے علاوہ دوسری عورتیں بھی کسی کے لئے بلا شبہ حلال نہیں ہیں بلکہ صحیح نکاحؔ یا ملکیت شرط ہے اور طلب بالمال سے یہی مراد ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اَنْ تَبْتَغُوْا سے پہلے ب محذوف ہو اور اس کا تعلق احل سے ہو یعنی محرمات کے علاوہ دوسری عورتیں تمہارے لئے اس طور پر حلال کی گئی ہیں کہ تم ان کو مال کے عوض طلب کرو خواہ مہر کے ساتھ نکاح کر لو یا قیمت سے خرید لو، اس صورت میں مہر نکاح کے لئے ضروری قرار پائے گا (جیسے خریدنے کیلئے قیمت) کیونکہ حلت کے لئے طلب بالمال کی قید لگائی ہے اس کی تائید دوسری آیت سے

لہ اس صراحت سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَاءَ ذٰلِكُمْ عام نہیں ہے کہ محرمات کے علاوہ ہر عورت کی حلت پر بہر طور دلالت کر رہی ہو (ورنہ آیت سے یہ امر ظاہر ہوتا ہے کہ ہر طرح طلب بالمال جائز ہے بلکہ یہ امر مجمل ہے۔ اس کے اندر وہ نکاح صحیح بھی آتا ہے جو موجب احصان ہے اور زناء بھی اس کے اندر آ جاتا ہے (طلب بالمال دونوں میں ہوتی ہے) پس حدیث یا اجماع سے نکاح کی جو شرائط مثلاً شہادت اعلان اور ولی کی اجازت وغیرہ مقرر کی گئی ہیں وہ اس مجمل کا بیان ہیں شہادت وغیرہ کی شرط لگانے کو قرآن پر حدیث یا اجماع سے زیادتی یا خبر آحاد سے کتاب کے عموم کی تخصیص نہیں کہا جا سکتا، واللہ اعلم (از مولف قدس سرہٗ)

بھی ہوتی ہے اللہ نے فرمایا، وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ، اس آیت میں صراحت ہے کہ بغیر مہر کے نکاح کا جواز صرف رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک کیلئے مخصوص تھا قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ بغیر تعیین مہر کے نکاح صحیح ہی نہ ہو مگر ہم نے قیاس کو آیت ذیل کی وجہ سے ترک کر دیا اللہ نے فرمایا ہے لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَالَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً اس آیت کے آخری فقرہ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ بغیر تعیین مہر کے بھی نکاح صحیح ہو جاتا ہے، اسی آیت کی وجہ سے ہم نے کہا کہ نکاح کے لئے مہر لازم ہے اور نکاح کا مقتضا بھی ہے، مگر نکاح کے وقت مہر کا ذکر ضروری نہیں ہے اسی پر اجماع ہے لیکن امام شافعیؒ قائل ہیں کہ نکاح کے وقت اگر مہر کا ذکر نہیں کیا یا یہ شرط کرلی کہ مہر نہ ہوگا اور خلوت صحیحہ سے پہلے مر گیا تو عورت کا مہر واجب نہ ہوگا مگر جمہور کے نزدیک اس صورت میں خلوت سے پہلے بھی مہر مثل واجب ہے جیسے خلوت کے بعد مر جانے کی صورت میں بالاجماع مہر مثل واجب ہوتا ہے ہم کہتے ہیں کہ عورتوں کی حلت کو مال کے ساتھ آیت میں مقید کیا ہے لہٰذا بطور حق شرع مہر کا وجوب ہے اس کے علاوہ باموالی میں باء الصاق کے لئے ہے یعنی حلت کو طلب بالمال کے ساتھ متصل ہونا چاہئے پس شافعی جو کہتے ہیں کہ جو عورت اپنے نفس کو بغیر ذکر مہر کے یا مہر نہ ہونے کی شرط پر شوہر کے سپرد کر دے تو اس کے مہر مثل کا وجوب جماع تک موخر کیا جائے گا، ورنہ باء کا مفہوم (یعنی نکاح کے ساتھ مہر کا اتصال) محقق نہوگا۔

پھر علقمہ کی روایت بھی آئی ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ سے دریافت کیا گیا کہ اگر کسی نے بغیر مہر مقرر کئے کسی عورت سے نکاح کیا ہو اور جماع کئے بغیر مر گیا ہو تو کیا حکم ہے فرمایا عورت کے لئے مہر مثل ہوگا نہ کم نہ زیادہ اور عدت لازم ہوگی، اور میراثی حصہ دیا جائے گا یہ سن کر حضرت معقلؓ بن سنان اشجعی کھڑے ہو گئے اور بولے ہمارے خاندان کی ایک عورت تھی بروع بنت واشق اس کا فیصلہ رسول اللہ ﷺ نے بھی ایسا ہی کیا تھا جیسا آپ نے کیا اس پر حضرت ابن مسعودؓ خوش ہو گئے، رواہ ابوداؤد و الترمذی والنسائی والدارمی بیہقی نے کہا اس حدیث کی تمام سندیں اور روایتی سلسلے صحیح ہیں۔

...... ایک شبہ ......

اگر مہر لوازم نکاح میں سے ہے تو بغیر مہر کے نکاح کرنے والی عورت کو اگر جماع سے پہلے طلاق دے دی جائے تو اس کے لئے مہر لازم ہونا چاہئے، حالانکہ سوائے امام احمدؒ کے اس کا کوئی قائل نہیں اور وہ بعض روایات کے لحاظ سے صرف نصف مہر مثل کے قائل ہیں لیکن صحیح روایات میں ان کا قول بھی جمہور کے قول کی طرح ہی ہے۔

ازالہ :۔ متعہ (کپڑوں کا جوڑا وغیرہ) دینا تو اس کو بھی لازم ہے اور یہ متعہ نصف مہر کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔

مسئلہ :۔ اگر مہر نہ ہونے کی شرط پر نکاح کیا ہو تو امام مالکؒ کے نزدیک نکاح ہی صحیح نہ ہوگا کیونکہ بیع کی طرح نکاح بھی عقد معاوضہ ہے پس جس طرح بیع بشرط عدم قیمت اجماعاً درست نہیں اسی طرح نکاح بھی بلا شرط مہر درست نہیں۔

ہم کہتے ہیں نکاح بیع کی طرح عقد معاوضہ نہیں ہے بلکہ مہر کا وجوب بحکم شرعی ہے (نکاح حقیقت میں عقد اقرار ہے اور محض تراضی کا نام ہے جس کیلئے شریعت نے مہر کو واجب کر دیا ہے) تاکہ محل کی عظمت کا اظہار ہو جائے اگر بیع کی طرح عقد معاوضہ ہوتا تو بغیر ذکر مہر کے نکاح صحیح نہوتا جیسے قیمت کا ذکر کئے بغیر بیع صحیح نہیں ہوتی پس مہر نہونے کی شرط لغو اور فاسد ہو جائے گی اور نکاح صحیح رہے گا البتہ بیع میں چونکہ قیمت رکن ہے اس لئے بیع بغیر ذکر قیمت کے یا عدم قیمت کی شرط پر درست نہ ہوگی۔

فائدہ :۔ یہ آیت چاہتی ہے کہ مہر مال ہو کیونکہ طلب بالمال کے ساتھ حلت مقید ہے لیکن معلوم اور مقرر منافع کا حکم بھی شرعاً مال کا ہی ہے (اونکی بھی مالی قیمت ہوتی ہے) اسی لئے نص حدیث اور اجماع کی رو سے عقد اجارہ (ٹھیکہ، کرایہ داری وغیرہ) درست ہے، باوجودیکہ اجارہ میں صرف منافع کی بیع ہوتی ہے مقابلہ میں کوئی مثل نہیں ہوتا اور قیاس اس کے جواز سے

انکار کرتا ہے پھر منافع وقت بیع موجود نہیں ہوتے (اور مبیع کا بیع کے وقت موجود ہونا ضروری ہے) اور آئندہ پیدا ہونے والے منافع کی طرف اپنی ملکیت کی اور خریدار کو مالک بنانے کی نسبت ایک لغو چیز ہے (معلوم نہیں آئندہ وہ منافع پیدا بھی ہوں یا نہوں) لیکن ضرورت عمومی کے تحت شریعت نے منافع کو مثل مال کے قرار دے کر اجارہ کو جائز کہا ہے مثلاً کسی مکان کو کرایہ پر لینے کا جواز قیاساً تو ممکن نہیں کیونکہ ایک طرف سے زر کرایہ مقرر ہے مگر دوسری طرف سے (مکان ہے جس کی بیع نہیں کی جارہی ہے) مکان میں سکونت اور سردی گرمی سے حفاظت وغیرہ کے منافع وقت عقد موجود نہیں ہیں آئندہ حاصل ہونے والے ہیں (لیکن نہیں کہا جاسکتا کہ آئندہ یہ منافع پیدا ہو بھی سکیں گے یا نہیں) مگر مکان موجود ہے پس مکان کے وجود ہی کو وجود منافع کے قائم مقام قرار دے کر عقد اجارہ کو شریعت نے جائز کہا ہے یہی وجہ ہے کہ مزدور کو مزدوری کے لئے جانور کو سواری کے یا بوجھ لادنے کے لئے زمین کو کھیتی کرنے کے لئے اور مکان کو رہنے اور استعمال کرنے کے لئے کرایہ پہ لینا دینا جائز ہے نکاح کی بھی یہی حالت ہے، اجارہ کی طرح اس کی بھی ضرورت ہے شوہر کی طرف سے اگر مہر میں دینے کے لئے حقیقۃً مال نہ بھی ہو تب بھی اگر منافع مقررہ کو مہر بنادیا گیا ہو تو نکاح صحیح ہو جائے گا، گویا یہ بھی طلب بالمال کی ایک صورت ہو جائے گی۔

مسئلہ :۔ اگر نکاح کے وقت یہ شرط لگائی کہ شوہر ایک سال تک بیوی کی خدمت کرے گا اور یہ یکسالہ خدمت مہر نکاح ہو گی تو امام محمدؒ کے نزدیک خدمت یکسالہ کی قیمت واجب ہو گی کیونکہ شوہر کا بیوی کی خدمت کو مہر قرار دینا مقتضائے نکاح کے خلاف ہے نکاح کا تقاضا شوہر کی مالکیت ہے اور خدمت مقتضا مملوکیت ہے مگر چونکہ خدمت کو مہر قرار دیا ہے اور مقرر کردہ چیز کو ادا کرنا تقاضاء عقد ہے لیکن اس کو ادا کرنے سے قاصر ہے اس لئے اس کی قیمت ادا کرنی لازم ہے، امام اعظمؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مہر مثل واجب ہو گا کیونکہ منافع کو مال کے قائم مقام قرار دینا اس وقت صحیح تھا جب منافع کو ادا کرنا ممکن تھا اور جب ادائے منافع تقاضائے عقد کے خلاف ہے لہٰذا اس کی سپردگی ممکن نہیں تو منافع کو مال کے قائم مقام نہیں قرار دیا جائے گا اور مہر مثل واجب ہو گا۔

مسئلہ :۔ اگر نکاح کے وقت یہ شرط کی کہ کوئی دوسرا آزاد ملازم ایک سال تک بیوی کی خدمت کرے گا اور یہی نکاح کا مہر ہو گا تو نکاح صحیح ہو گا اور شوہر کے ذمہ خدمت کی قیمت ادا کرنا بالاتفاق واجب ہو گا بشرطیکہ مقرر کردہ ملازم خدمت کرنے پر راضی نہ ہو یا خدمت سے اجنبی مرد کا عورت سے میل جول ہو جانا ضروری ہو۔

مسئلہ :۔ اگر عورت کے جانور سال بھر تک چرانا یا اس کی زمین کو جوتنا بونا اور کھیتی کرنا مہر قرار دیا تو بعض روایات میں آیا ہے کہ ایسا کرنا جائز نہیں۔ یہ بھی ایک طرح کی عورت کی خدمت ہے لیکن صحیح روایت میں اس کا جواز آیا ہے کیونکہ یہ عورت کی خالص خدمت نہیں ہے عام طور پر میاں بیوی مل کر مالی امور کی نگہداشت کرتے ہیں اس کی تائید حضرت موسیٰ اور حضرت شعیب کے قصے سے ہوتی ہے اور ہماری شریعت میں اس کے خلاف کوئی حکم آیا نہیں ہے، امام احمدؒ اور ابن ماجہؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عتبہ بن منذرؓ نے بیان کیا ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے آپ نے طٰسٓمّٓ کی تلاوت فرمائی جب حضرت موسیٰؑ کے قصہ پر پہونچے تو فرمایا موسیٰؑ نے اپنی شرمگاہ کو پاک رکھنے (یعنی حضرت شعیب کی لڑکی سے نکاح کرنے) اور اپنے پیٹ کی روٹی کی شرط پر آٹھ یا دس سال کے لئے اپنی جان کو (حضرت شعیبؑ کے کام پر) لگا دیا، یہ قصہ دلیل میں اس وقت پیش کیا جاسکتا ہے جب وہ بکریاں جن کو چرانے کا موسیٰؑ نے وعدہ کیا تھا حضرت شعیبؑ کی صاحبزادی کی ہونا ثابت ہو جائے مگر بظاہر ایسا نہیں ہے (بلکہ قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان بکریوں کے مالک حضرت شعیب تھے، پھر بیٹی کے مہر کے عوض خود اپنی بکریاں چرانے کی خدمت حضرت موسیٰؑ سے کیسے لے سکتے تھے)۔

مسئلہ :۔ اگر قرآن کی کسی صورت کی تعلیم کو مہر قرار دیا تو امام مالکؒ و امام شافعیؒ کے نزدیک جائز ہے ایک روایت میں امام احمد کا قول بھی یہی آیا ہے، امام اعظم اور صحیح روایت میں امام احمدؒ کے نزدیک ناجائز ہے اور مہر مثل دینا واجب ہے، اس اختلاف کی بنیاد ایک دوسرا اختلافی مسئلہ ہے سوال یہ ہے کہ حج اذان اور تعلیم قرآن ایسی عبادتوں کی

اجرت لینی جائز ہے یا نہیں جو اس کو جائز کہتا ہے وہ تعلیم قرآن کو مہر قرار دینے کے جواز کا بھی قائل ہے کیونکہ جب ان عبادات کی اجرت (یعنی قیمت) ہو سکتی ہے تو ان کا شمول بھی مال سے ذیل میں ہو سکتا ہے اور جو ان عبادات کی اجرت کو ناجائز کہتا ہے وہ تعلیم کو مہر قرار دینے کا بھی مخالف ہے، شافعیؒ جو تعلیم قرآن کو مہر قرار دینے کے جواز کے قائل ہیں ان کی طرف سے استدلال دو طرح سے کیا گیا ہے اول تو یہی کہ مطلق عبادات کی اجرت جائز ہے دوسرے خصوصیت سے تعلیم قرآن کو مہر قرار دینے کا جواز۔

اول مسئلہ کی، تائید دو حدیثوں سے ہوتی ہے، پہلی حدیث کے راوی حضرت ابو سعیدؓ خدری ہیں کہ کچھ صحابیؓ عرب کے کسی قبیلہ کی طرف سے گزرے قبیلہ والوں نے صحابیوں کو کھانا نہیں دیا اتفاقاً ان کے سردار کو کسی سانپ یا بچھو نے ڈس لیا، اہل قبیلہ نے صحابہؓ سے پوچھا کیا تمہارے پاس اس کی کوئی دوائی ہے یا کوئی منتر پڑھنے والا ہے صحابہؓ نے کہا تم نے چونکہ ہماری میزبانی نہیں کی اس لئے بغیر اجرت مقرر کئے ہم منتر دم نہیں کرینگے۔ آخر ان لوگوں نے بکریوں کا ایک گلہ دینے کا اقرار کیا اور حضرت ابو سعیدؓ سورۂ فاتحہ پڑھ کر تھتکارنے لگے یہاں تک کہ وہ شخص اچھا ہو گیا اور قبیلہ والے بکریاں دینے لگے۔ صحابہؓ نے کہا جب تک ہم رسول اللہ ﷺ سے دریافت نہ کرلیں گے بکریاں نہیں لیں گے۔ چنانچہ حضور صلعم سے (حاضر ہو کر) دریافت کیا آپ ہنس دیئے اور فرمایا تم کو کیسے معلوم ہوا کہ سورۂ فاتحہ منتر ہے، بکریاں لے لو اور میرا بھی ان میں حصہ مقرر کر دو۔

دوسری حدیث کے راوی حضرت ابن عباسؓ ہیں کہ چند صحابیؓ ایک پانی (چشمہ) کی طرف سے گزرے وہاں ایک شخص کو بچھو یا سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ مقامی باشندوں میں سے ایک شخص سامنے آیا اور اس نے پوچھا کیا تم میں سے کوئی منتر جاننا ہے (صحابہ میں سے) ایک آدمی نے جا کر سورۂ فاتحہ پڑھ دی، وہ شخص اچھا ہو گیا۔ سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کرنے والا وہاں سے بکریاں لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس آیا، ساتھیوں نے اس فعل کو برا سمجھا اور کہا تو نے کتاب اللہ کی مزدوری لی ہے جب سب مدینہ پہنچے تو رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ اس شخص نے کتاب الٰہی کی مزدوری لی ہے آپ نے فرمایا تمہارے لئے سب سے زیادہ اجر لئے جانے کی مستحق تو اللہ کی کتاب ہی ہے۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا تم نے ٹھیک کیا اپنے ساتھ میرا بھی ایک حصہ لگا لو۔ یہ دونوں حدیثیں صحیحین میں مذکور ہیں۔ خارجہ بن صلت کے چچا کی روایت سے ایسی ہی حدیث امام احمد اور ابوداؤد نے بھی نقل کی ہے ان دونوں حدیثوں کا جواب یہ ہے کہ وہ لوگ جن سے بکریاں لی تھیں کافر تھے اور ان کا مال لینا جائز ہے ایک بات یہ بھی ہے کہ منتر کوئی خالص عبادت نہیں اس لئے اس کی اجرت لینی جائز ہے (اور تعلیم قرآن محض عبادت ہے)

نمبر دوم کی دلیل میں امام شافعیؒ کی طرف سے حضرت سہل بن سعدؓ کی روایت کردہ حدیث پیش کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک عورت حاضر ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں نے حضورؐ کے لئے اپنے آپ کو ہبہ کیا یہ کہہ کر وہ دیر تک کھڑی رہی۔ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس کا نکاح مجھ سے کرا دیجئے بشرطیکہ آپ کو اس کی ضرورت نہ ہو۔ فرمایا مہر میں دینے کے لئے تیرے پاس کوئی چیز ہے۔ اس نے عرض کیا سوائے اس تہبند کے جو میں باندھے ہوئے ہوں اور کچھ نہیں ہے فرمایا کچھ تلاش کر دخواہ لوہے کی انگوٹھی ہی ہو اس شخص کو جستجو کے بعد بھی کچھ نہیں ملا تو حضورؐ نے فرمایا کیا تجھے کچھ قرآن آتا ہے اس نے جواب دیا جی ہاں فلاں فلاں سورتیں یاد ہیں فرمایا تجھے جو قرآن آتا ہے اس کی تعلیم کے عوض میں نے اس عورت کو تیرے نکاح میں دیا۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جا میں نے اس کو تیرے نکاح میں دیا اس کو قرآن سکھا دینا متفق علیہ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح بغیر مہر کے اپنے نکاح میں لے آنا حضور ﷺ کے لئے خاص تھا اسی طرح بغیر مہر کے اس عورت کا نکاح کرا دینا جس نے اپنے نفس کا اختیار دے دیا ہو آپؐ کے لئے ہی مخصوص تھا۔

ابن جوزی نے مکحول کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کا نکاح تعلیم قرآن کے عوض کرا دیا تھا لیکن رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی کو اس کی اجازت نہیں، اسی طرح طحاوی نے لیث کا قول لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد یہ کسی کیلئے جائز نہیں۔ ابن جوزی نے اس حدیث کا یہ بھی جواب دیا ہے کہ شروع اسلام میں افلاس کی مجبوری کی وجہ سے ایسا تھا۔

میں کہتا ہوں گویا ابن جوزیؒ نے اس حکم کے منسوخ ہونے کا دعویٰ کیا حالانکہ نسخ صرف احتمال سے ثابت نہیں ہوتا۔ نہ رسول اللہ ﷺ کے لئے اس حکم کے خاص ہونے کی کوئی دلیل ہے۔

امام اعظمؒ کے قول کو ثابت کرنے کیلئے دو طریقے اختیار کئے گئے ہیں ۱۔ عموماً عبادات کی اجرت لینا جائز نہیں خصوصیت کے ساتھ تعلیم مہر نہیں بن سکتی۔ نمبر اول کا ثبوت چند احادیث سے ملتا ہے حضرت عبادہ بن صامت کا بیان ہے کہ میں نے اصحاب صفہ میں سے کچھ لوگوں کو لکھنا سکھادیا اور قرآن پڑھادیا ان میں سے ایک شخص نے مجھے ایک کمان تحفہ میں دیدی، میں نے خیال کیا اس سے جہاد میں تیر اندازی کروں گا اور رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا فرمایا اگر آگ کا طوق پہنایا جانا تم کو پسند ہو تو قبول کرلو۔ رواہ احمد ابو داؤد، اس روایت کی سند میں ایک شخص مغیرہ ہے جس کو ابن جوزیؒ نے ضعیف کہا ہے۔ دوسری حدیث حضرت ابی بن کعبؓ کی روایت کردہ ہے۔ حضرت ابیؓ نے فرمایا میں نے ایک شخص کو قرآن سکھایا اس نے مجھے ایک کمان ہدیہ میں دی۔ میں نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا حضور صلعم نے فرمایا اگر تو اس کو لے لے گا تو آگ کی کمان لے گا یہ سن کر میں نے واپس کردی۔ رواہ ابن الجوزی۔

ایک اور حدیث حضرت عبدالرحمٰنؓ بن سہل انصاری کی روایت سے آئی ہے حضرت عبدالرحمٰنؓ نے کہا میں نے خود سنا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمارہے تھے قرآن پڑھو مگر حد سے تجاوز نہ کرو اور نہ اس سے دور ہو جاؤ (کہ بالکل ہی پڑھنا چھوڑدو) اور نہ اس کے عوض کچھ کماؤ (یعنی تعلیم قرآن کو کمائی مت بناؤ) اور نہ اس پر مغرور بنو (یعنی قرآن کا علم سیکھ کر مغرور نہ بن جاؤ) رواہ الطبرانی۔

حضرت مطرفؒ بن عبداللہ کا بیان ہے کہ حضرت عثمانؓ بن عاص نے عرض کیا مجھے میری قوم کا امام بنا دیجئے فرمایا (اچھا امامت کرو مگر) قوم میں جو شخص سب سے کمزور ہو اس کا لحاظ رکھنا اور ایسا موذن مقرر کرنا جو اذان کی اجرت نہ لے رواہ احمد (ان تمام روایات سے عبادات کی اجرت لینے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے تعلیم قرآن ہو یا اذان)۔

اگر ہم دوسری عبادات کی اجرت لینے کو جائز بھی تسلیم کرلیں تب بھی تعلیم قرآن کی اجرت لینی جائز نہیں ہو سکتی کیونکہ اجارہ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ کام معلوم ہو اور وقت عمل بھی معلوم ہو اور تعلیم کبھی تھوڑے عمل سے مکمل ہو جاتی ہے اور کبھی زیادہ عمل کی ضرورت پڑتی ہے پھر تعلیم متعلم کی صلاحیت واستعداد پر موقوف ہے اور صلاحیت کی تخلیق سے معلم قاصر ہے جب تعلیم قرآن کی اجرت لینی جائز نہیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ شریعت نے اس کی کوئی مالی قیمت تسلیم نہیں کی اور تعلیم قرآن کو اموال کی فہرست میں شامل نہیں کیا لہٰذا اس کو مہر بھی نہیں قرار دیا جاسکتا کیونکہ طلب نساء مال کے عوض ضروری ہے۔ رہی حدیث سہل بن سعد تو وہ حدیث احاد ہے قرآن کی صراحت اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ اس کے خلاف ہے لہٰذا قرآن کے مقابلہ میں اس پر عمل کرنا ممکن نہیں۔

بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مفعول لہ ہے اُحِلَّ لَكُمْ کا یعنی حلت کی قید نہیں ہے (کہ طلب بالمال حلت کی لازمی شرط ہو اور بغیر مال دیئے حلت نہ ہو) مطلب یہ ہے کہ محرمات کے علاوہ دوسری عورتوں کی طلب کرو اس خیال سے کہ تمہارا مال ان کے مہر اور قیمتوں میں صرف ہو سکے جب کہ تم پاک دامن ہو اور زنا کار یا رانے گانٹھنے والے نہ ہو۔ بیضاویؒ نے اَنْ تَبْتَغُوْا سے پہلے مضاف کو اس لئے محذوف مانا ہے تاکہ اَنْ تَبْتَغُوْا مفعول لہ ہو سکے صحیح یہ ہے کہ مضاف محذوف ماننے کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ اَنْ اور اَنَّ سے پہلے حرف جار کا محذوف ہونا قیاساً صحیح ہے (پس اَنْ تَبْتَغُوْا سے پہلے لِ قیاساً محذوف ہی ہے اور یہ حلت کی علت ہے) اس تاویل کے بعد بیضاوی نے لکھا ہے کہ حنفیہ نے جو اس آیت سے مہر کے مال

۱؎ لاتغلوا حد سے تجاوز نہ کرو، صاحب نہایہ نے لکھا ہے کہ حضورؐ کو جن اخلاق و آداب کا حکم دیا گیا تھا ان میں سے ایک امر یہ بھی تھا کہ آپؐ ہر کام میں حد اعتدال پر قائم رہیں حد اوسط ہی سب سے افضل ہے، افراط و تفریط دونوں بری ہیں۔

۲؎ یعنی قرآن کی نگہداشت کرو اس کی تلاوت سے دور نہ ہو جاؤ، جفء کا معنی ہے دوری نہایہ۔ (از مولف قدس سرہٗ)

ہونے کی ضرورت پر استدلال کیا ہے وہ اس توجیہ کی روشنی میں غلط ہے بیضاوی کا مطلب یہ ہے کہ محرمات کے علاوہ دوسری
عورتوں سے نکاح کی حلت کی علت یہ ہے کہ تمہارا اموال زناکاریوں میں صرف نہ ہو آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عورتوں کی
حلت بغیر مال کے ممکن نہیں ہے (اور مہر میں مال دینا لازم ہے)۔
میں کہتا ہوں کہ اَنْ تَبْتَغُوْا کو مفعول لہ قرار دینا غلط ہے یہ حکم حلت کی قید ہی ہے کیونکہ بغیر مالی مہر کے نکاح کا ناجائز ہونا
اجماعی فیصلہ ہے دیکھو اگر کسی نے بغیر مہر کے نکاح کیا تو مہر مثل لازم ہے اسی طرح اگر کسی نے کسی مردار کو یا مٹی کو یا چولھے کی
خاک کو مہر قرار دیا یا اسی قسم کی کسی اور ایسی چیز کو مہر بنایا جو کچھ قیمت نہیں رکھتی تو مہر مثل اجماعاً واجب ہے۔ امام شافعیؒ نے
بھی جو تعلیم قرآن کو مہر قرار دینے کے جواز کا قول کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے تعلیم قرآن کی مالی قیمت مان کر
مال کی فہرست میں اس کو شامل کیا ہے جس طرح تعلیم قرآن کی اجرت لینے کو انہوں نے جائز کہا ہے صحیح توجیہ وہی ہے جو ہم
نے ذکر کر دی اسی سے اجماعی مسائل کا استنباط کیا جاسکتا ہے۔
مسئلہ :۔ اگر کسی نے باندی کو آزاد کیا اور آزادی کو ہی اس کا مہر قرار دیا اور یوں کہا کہ میں تجھے اس شرط پر آزاد کرتا
ہوں کہ تو مجھ سے نکاح کرلے اور اس آزادی کو اپنا مہر تسلیم کرلے تو آزادی بالاجماع صحیح ہے امام احمد نے فرمایا اگر ایسا دو
گواہوں کی موجودگی میں کہا ہے تو نکاح بھی صحیح ہو جائے گا۔ حضرت صفیہ کے نکاح کا قصہ اس کا مؤید ہے دوسری روایت میں
امام احمدؒ کا قول جمہور کے قول کے موافق آیا ہے۔ جمہور کا قول یہ ہے کہ آزادی تو ہو جائے گی مگر عورت کو اختیار ہوگا نکاح بشرط
عتق کرے یا نہ کرے اگر کرلے گی تو اس کے لئے مہر مثل ہوگا، امام یوسفؒ اور سفیانؒ ثوری کا قول جمہور کے خلاف ہے یہ دونوں
امام عورت کے اختیار کے قائل نہیں۔ ایک تو حضرت صفیہؓ کے نکاح کا واقعہ اس کی تائید کرتا ہے دوسرے حضرت جویریہؓ کا
واقعہ بھی ہے کہ جب بنی مصطلق کے قیدیوں کے ساتھ وہ گرفتار ہو کر آئیں اور ثابتؓ بن قیس اور ان کے ایک چچازاد بھائی کے
حصہ میں پہنچیں تو ثابتؓ نے ان کو مکاتب بنادیا جویریہؓ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور زرِ مکاتبت کی درخواست کی رسول
اللہ ﷺ نے فرمایا میں زرِ مکاتبت تو تمہاری طرف سے ادا کردوں گا مگر شرط یہ ہے کہ تم کو مجھ سے نکاح کرنا ہوگا۔ حضرت
جویریہ نے کہا بہت اچھا۔ حضورؐ نے فرمایا تو میں نے ایسا کرلیا (یعنی نکاح کرلیا) رواہ احمد وابوداؤد من حدیث عائشہؓ۔
ہم کہتے ہیں یہ نکاح بلا مہر تھا کیونکہ کسی کو بھی اپنی ذات کی ملکیت حاصل نہیں (کہ جب وہ چاہے تو اپنے کو بیچ ڈالے لہٰذا
اس نکاح کا حکم نکاح بلا مہر کا ہے اور مہر مثل واجب ہے رہی حدیث تو وہ ناقابل استدلال ہے کیونکہ بغیر مہر مثل کے نکاح بلا مہر
رسول اللہ ﷺ کے لئے ہی خاص تھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے خَالِصَۃً لَّکَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ۔
اگر باندی صورت مذکورہ میں نکاح سے انکار کردے تو مزدوری کرکے اپنی قیمت کے بقدر آزاد کرنے والے کو دینا اس
پر لازم ہے امام اعظمؒ اور صاحبینؒ اور امام شافعی کا یہی مسلک ہے امام مالکؒ اور امام زفر باندی پر ادا قیمت واجب نہیں قرار دیتے اول
الذکر قول کی وجہ یہ ہے کہ آقا نے آزادی کو نکاح کا مہر قرار دیا ہے اور باندی نے نکاح سے انکار کردیا اس لئے آزادی بغیر عوض
کے رہ گئی اور آقا اس پر راضی نہیں لہٰذا کوشش کرکے اپنی قیمت ادا کرنا باندی پر لازم ہے جیسے اگر کسی نے اس شرط پر آزاد کیا
ہو کہ آزاد کردہ غلام کو ایک سال تک خدمت کرنی ہوگی اور آزاد کرنے کے بعد آقا مر جائے (اور غلام کے لئے خدمت کرنے کا موقع نہ ہو
تو امام اعظم اور امام ابو یوسف کے نزدیک غلام پر لازم ہے کہ وہ اپنی قیمت (آقا کے وارثوں) کو ادا کرے اور امام محمد کے نزدیک خدمت کے معاوضہ کے برابر قیمت ادا کرے) امام مالکؒ
اور امام زفرؒ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ جب آزادی کو مہر قرار نہیں دیا جاسکتا تو یہ آزادی بلا عوض ہوگی لہٰذا باندی اگر نکاح سے انکار کردے تو اس پر اپنی قیمت ادا کرنا لازم
نہیں جیسے اس صورت میں ادائے قیمت لازم نہیں جبکہ وہ نکاح کا اقرار کرلے (بہرحال اقرار ہو یا انکار ہر صورت میں آزادی
بلا قیمت ہوگی) یہی قول زیادہ ظاہر ہے۔
مسئلہ :۔ اجماعاً مہر کی زیادتی کی کوئی حد نہیں (باہم تراضی سے مہر کی مقدار زیادہ سے زیادہ ہوسکتی ہے) جیسا کہ آیت
وَاٰتَیْتُمْ اِحْدٰھُنَّ قِنْطَارًا کی تفسیر میں ہم لکھ چکے ہیں۔ کم سے کم مہر کتنا ہوسکتا ہے اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے امام

شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک کم سے کم مہر کی بھی کوئی خاص حد نہیں ہے جو چیز اور جتنی مقدار کا بیع میں قیمت بن سکتی ہے وہ نکاح میں مہر بھی ہو سکتی ہے کیونکہ آیت اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مطلق ہے (اس میں مہر کی کوئی خاص حد نہ کثرت کی جانب مقرر کی ہے نہ قلت کی جانب) امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ نے فرمایا کم سے کم مہر کی مقدار شرعاً مقرر ہے جتنی مقدار چوری کرنے سے چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے وہی مقدار کم سے کم مہر کی ہے، امام اعظمؒ کے نزدیک یہ مقدار ایک دینار یا دس درہم ہے اور امام مالکؒ کے نزدیک پاؤ دینار یا تین درہم جانب قلت میں مقدار مقرر ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْ اَزْوَاجِهِمْ فرض کا معنی ہے اندازہ مقرر کرنا اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں (۱) شرعاً مہر کی مقدار مقرر کر دی گئی ہے لہٰذا جو شخص مہر کی مقدار معین نہیں کہتا وہ آیت کے مفہوم کو باطل قرار دیتا ہے۔ (۲) مہر کی مقدار مقرر کرنے والا خود اللہ تعالیٰ ہے اب جو شخص مقدار مہر کی تعین بندہ کے اختیار میں دیتا ہے۔ وہ فرضنا کی ضمیر پر عمل نہیں کرتا ہم (اس کے جواب میں) کہتے ہیں کہ یہ آیت مہر کے متعلق نہیں بلکہ۔ عورتوں کے نفقہ کے متعلق ہے کیونکہ پوری آیت یہ ہے قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ یعنی جو کچھ ہم نے بیویوں اور باندیوں کے متعلق لوگوں پر فرض کیا ہے ہم اس سے واقف ہیں۔ اب اگر آیت میں مہر مقرر کرنا مراد لیا جائے گا تو باندیوں کا مہر مقرر ہونا بھی لازم آئے گا حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں۔

امام شافعیؒ نے اپنے مسلک کی تائید میں چند احادیث پیش کی ہیں ایک وہ حدیث ہے جسکے راوی حضرت سہل بن سعدؓ ہیں اس حدیث میں ہے کہ حضور صلعم نے فرمایا تھا تلاش کرو خواہ لوہے کی کوئی انگوٹھی ہی مل جائے۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

دوسری حدیث وہ ہے جس کے راوی حضرت عامر بن ربیعہ ہیں کہ ایک عورت نے جوتوں کے ایک جوڑے کے عوض نکاح کیا تھا، حضورؐ نے اس سے فرمایا کیا تو خوشی اس پر راضی ہے عورت نے عرض کیا جی ہاں، حضورؐ نے اجازت دیدی، اس حدیث کو ترمذی نے صحیح کہا ہے مگر ابن جوزیؒ نے کہا کہ یہ صحیح نہیں ہے اس کی سند میں ایک راوی عاصم بن عبید اللہ ہے جس کو یحییٰ بن معین نے ضعیف نا قابل حجت قرار دیا ہے اور ابن حبان نے کہا ہے یہ فاحش الخطا اور متروک ہے۔

تیسری حدیث وہ ہے جس کے راوی حضرت جابرؓ بن عبد اللہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کسی نے عورت کو مہر میں ہاتھ بھر کھانا دے دیا تو وہ عورت اس کے لئے حلال ہو گئی دوسری روایت میں ہے کہ اگر کسی نے نکاح کے بارے میں مٹھی بھر آٹا یا غلہ یا ستو دے دیا تو اس نے عورت کو حلال بنا لیا۔ رواہ الدار قطنی ،ابوداؤد کی روایت میں لپ بھر ستو یا چھوارے کا لفظ آیا ہے۔

اس حدیث کی تمام سندوں میں ایک راوی صالح بن مسلم بن رومان آیا ہے جس کو یحییٰؒ اور رازیؒ نے ضعیف کہا ہے بعض سندوں میں بجائے صالح بن مسلم کے موسیٰ بن مسلم آیا ہے اور موسیٰ مجہول ہے۔

دار قطنی کے بیان میں عبد اللہ بن مومل بروایت ابوالزبیر از جابر آیا ہے اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ ہم لپ اور دولپ پر عورتوں سے نکاح کر لیا کرتے تھے۔ امام احمد نے کہا ابن مومل کی احادیث منکر ہیں اور یحییٰ نے کہا یہ ضعیف ہے۔

ایک حدیث کے راوی حضرت ابو سعیدؓ خدری ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رانڈوں سے نکاح کرو اور علائق ادا کرو، عرض کیا گیا علائق کیا ہیں فرمایا جس پر (دونوں طرف کے) سرپرست راضی ہو جائیں خواہ درخت پیلو کی ایک چھڑی ہی ہو۔ یہ حدیث دار قطنی نے اسماعیل بن عیاش کی سند سے بیان کی ہے اور اس شخص کو علماء نے ضعیف کہا ہے ابن حبان نے کہا یہ نا قابل احتجاج ہے۔ اسی سند میں ایک راوی ابوہارون عبدی ہے جس کا نام عمارہ بن جون تھا، حماد بن زید نے کہا یہ بڑا جھوٹا تھا امام احمدؒ نے کہا یہ کچھ نہیں۔ شعبہ نے کہا اگر وہ آکر میری گردن بھی مار دے تو مجھے پسند ہے بنسبت اس کے کہ میں اس کی بیان کردہ کوئی حدیث روایت کروں۔ سعدی نے کہا یہ بڑا جھوٹا اور مفتری تھا۔

دار قطنی اور بیہقی نے ایسی ہی حدیث محمد بن عبد الرحمٰن سلمانی سے عن ابیہ عن ابن عباسؓ یا ابن عمرؓ کی روایت سے

بیان کی ہے۔ موخر الذکر کو دار قطنی اور طبرانی نے نقل کیا ہے یحییٰ بن معین نے کہا محمد بن عبدالرحمٰن کچھ نہیں۔ ابن حبان نے کہا اس شخص نے اپنی باپ کی راویات لکھ کر مشتبہ بیان کی ہیں اور سب موضوع ہیں۔ بیہقی نے یہ حدیث ایک سند سے حضرت عمرؓ کی روایت سے بیان کی ہے اس کی سند بھی ضعیف ہے۔ ابو داؤد نے عبدالملک بن مغیرہ طائفی کی وساطت سے عبدالرحمٰن سلمانی کی یہ حدیث مرسلاً مراسیل میں بیان کی ہے عبدالحق نے کہا مرسلاً یہ حدیث اور طریقوں سے زیادہ صحیح ہے۔ بیہقی نے یحییٰ بن عبدالرحمٰن از عبدالرحمٰن ازوالد عبدالرحمٰنؓ بیان کیا ہے کہ جس شخص نے ایک درہم (مہر) پر عورت کو اپنے لئے حلال بنالیا تو عورت اس کے لئے حلال ہو گئی۔ ابن شاہینؒ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں دو درہم اور اس سے زیادہ (مہر) پر نکاح حلال ہے۔

امام ابو حنیفہؒ نے اپنے مسلک پر حضرت جابرؓ کی روایت سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خوب سن لو کہ عورتوں کا نکاح صرف ان کے اولیاء (سرپرست) ہی کریں اور کفو سے ہی ان کا نکاح کیا جائے اور مہر دس درہم سے کم نہ ہو رواہ الدار قطنی والبیہقی۔ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث مختلف طریقوں سے آئی ہے لیکن تمام طریقوں کا مدار مبشر بن عبید پر ہے جس کے متعلق ابن حنبل نے کہا یہ کچھ نہیں اس کی احادیث من گھڑت ہیں اس نے جھوٹ کہا یہ حدیث گھڑتا تھا دار قطنی نے کہا یہ جھوٹ کہتا تھا، ابن حبان نے کہا یہ موضوعات کی روایت کی نسبت ثقات کی طرف کرتا تھا۔ ابن ہمام نے کہا (یہ حدیث خواہ ضعیف ہو لیکن) اس کا شاہد ایک اور ہے جو اس کی تائید کرتا ہے اور جس کی روایت موقوفاً حضرت علیؓ سے آئی ہے کہ دس درہم سے کم (چوری) میں چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے اور مہر دس درہم سے کم نہ ہو۔ امام محمدؒ نے کہا ہم کو حضرت علیؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عامرؓ اور حضرت ابراہیم کا قول پہنچا ہے (جس میں دس درہم کی تعین ہے) اور شرح طحاوی میں حضرت جابرؓ کی سند سے اس کو رسول اللہ ﷺ کا فرمان کہا گیا ہے مگر حضرت علیؓ کا اثر ہونے کی سند میں ایک راوی داؤد داؤدی ہے جس نے یہ قول بروایت شعبی از حضرت علی بیان کیا ہے یحییٰ بن معین نے کہا کہ داؤد کی حدیث کچھ نہیں ابن حبان نے کہا داؤد رجعت کا قائل تھا، پھر شعبیؒ نے حضرت علیؓ سے سماع نہیں کیا۔ اس کے بعض طریقوں میں غیاث بن ابراہیم آیا ہے جس کو احمد اور بخاری اور دار قطنی نے متروک قرار دیا ہے اور یحییٰ نے کذاب کہا ہے اور ابن حبان نے کہا یہ حدیث گھڑتا تھا۔

حضرت علیؓ کا ایک اور قول آیا ہے کہ پانچ درہم سے کم مہر نہیں اس کی سند میں ایک شخص حسن بن دینار ہے جس کے متعلق امام احمدؒ نے کہا یہ حدیث لکھتا نہ تھا اور یحییٰ نے کہا یہ کچھ نہیں اور ابو حاتم نے اس کو کذاب کہا ہے۔

میں کہتا ہوں اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ دس درہم کی تعین کرنے والی کوئی حدیث صحیح نہیں بلکہ اس کے برخلاف حضرت سہل بن سعدؓ کی حدیث صحیح ہے اور بالفرض اگر تعین مہر کی کوئی حدیث صحیح بھی ہو تب بھی اس سے کتاب اللہ کی زیادتی جائز نہیں کتاب اللہ کی صراحت مطلق ہے۔

اگر یہ توجیہ کی جائے کہ شریعت نے تمتع کی عظمت کا اظہار کرنے کے لئے مہر کا قانون جاری کیا ہے اس لئے ایسی چیز کو مہر نہیں قرار دیا جا سکتا جس کی کوئی قیمت نہ ہو جیسے گیہوں کا ایک دانہ یا روئی کی کرچ، اس میں تمتع کی عظمت کا اظہار نہیں ہے لہٰذا کوئی کم از کم مقدار کی تعین شرع کی طرف سے ہونا چاہئے تو ہم کہیں گے یہ خود ساختہ توجیہ ہے جس سے کتاب اللہ کا حکم جو مطلق ہے باطل ہو جاتا ہے اس لئے واجب الرد ہے۔ واللہ اعلم

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ پس جس طریق سے تم عورتوں سے لذت اندوز ہو گئے ہو تو ان کے مہر ان کو دو۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ اس آیت میں عقد متعہ مراد ہے یعنی ایسا عقد جس میں مہر معین ہوتا ہے اور مدت معین ہوتی ہے مدت مقررہ گزرنے کے بعد عورت بائنہ ہو جاتی ہے طلاق کی ضرورت نہیں ہوتی مگر استقرار حمل سے رحم کی صفائی دیکھنے کے لئے ایک حیض کا انتظار کرنا ضروری ہے اگر مدت کے اندر زوجین میں سے کوئی مر جائے تو ایک کو دوسرے کی میراث بھی نہیں ملتی اس عقد کرنے والوں پر نہ زوج کا اطلاق ہوتا ہے نہ زوجہ کا (یعنی یہ میاں بی بی نہیں ہوتے)۔

عبدالرزاق نے مصنف میں بروایت ابن جریج عطاء کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ متعہ کو اب بھی حلال جانتے تھے اور (ثبوت میں) یہ آیت پڑھتے تھے حضرت ابن عباسؓ نے یہ بھی فرمایا کہ حضرت ابی بن کعب کی قرات میں اس آیت میں الی اجل مسمی بھی ہے اور فرماتے تھے اللہ عمر پر رحم فرمائے متعہ اللہ کے بندوں پر اللہ کی ایک رحمت تھی اگر عمر اس کی ممانعت نہ کر دیتے تو زنا کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

ابن عبدالبر کا بیان ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے متعہ کے متعلق پوچھا گیا کہ یہ نکاح ہے یا زنا، فرمایا نہ نکاح ہے نہ زنا، دریافت کیا گیا پھر کیا ہے فرمایا یہ ویسا ہی ہے جیسا اللہ نے فرمادیا ہے دریافت کیا گیا کیا اس کی عدت کے لئے حیض آنے کی ضرورت ہے فرمایا ہاں! میں نے پوچھا کہ متعہ کرنے والے مرد و عورت باہم وارث ہوں گے فرمایا نہیں۔ متعہ کی حلت کا قول صحابہؓ کی ایک جماعت کی طرف منسوب ہے۔ نسائی اور طحاوی نے لکھا ہے کہ حضرت اسماءؓ، بنت صدیق اکبرؓ نے فرمایا ہم نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایسا کیا تھا۔ مسلم نے بیان کیا ہے کہ حضرت جابرؓ نے فرمایا ہم نے رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی زمانہ میں متعہ کیا تھا آخری دور خلافت میں حضرت عمرؓ نے ہم کو روک دیا پھر ہم نے حکم سے تجاوز نہیں کیا۔

طحاوی نے حضرت جابرؓ اور حضرت سلمہؓ بن اکوع کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ صحابہؓ کے پاس تشریف لائے اور متعہ کی اجازت دیدی۔

صحیحین میں حضرت ابن مسعودؓ کا قول منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو اجازت دیدی کہ مقرر مدت کے لئے عورتوں سے نکاح کیا جا سکتا ہے پھر حضرت ابن مسعودؓ نے یہ آیت تلاوت کی یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمْ۔

ان آثار صحابہؓ سے متعہ کا (جواز تو معلوم ہوتا ہے لیکن) منسوخ نہ ہونا (اور اب بھی جائز ہونا) ثابت نہیں ہوتا صرف حضرت ابن عباسؓ کا اثر اور حضرت ابن مسعودؓ کی قرات سے غیر منسوخ ہونا معلوم ہوتا ہے۔

عبدالرزاق نے مصنف میں لکھا ہے کہ معاویہؓ نے طائف میں ایک عورت سے متعہ کیا۔

عمرو بن شیبہ نے اخبار المدینہ میں اپنی سند سے لکھا ہے کہ سلمہؓ بن امیہ نے ایک عورت سے متعہ کیا جب اس کی اطلاع حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو آپؓ نے عمر کو دھمکایا۔ عبدالرزاق نے مصنف میں لکھا ہے کہ معبد بن امیہ متعہ کی حلت کے قائل تھے۔ حافظ نے لکھا ہے کہ متعہ کی حلت کا فتویٰ تابعین کی ایک جماعت نے دیا ہے جن میں سے ابن جریج، طاؤس، عطاء اور حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد اور سعید بن جبیر اور فقہاء مکہ بھی تھے اسی بناء پر حاکم نے علوم الحدیث میں اوزاعی کا قول نقل کیا ہے کہ اہل حجاز کے پانچ قول متروک ہیں ان میں سے اہل مکہ کا حلت متعہ کا قول اور اہل مدینہ کا بی بی سے لواطت کی حلت کا قول بھی ہے۔

مسئلہ:۔ متعہ کے ناجائز اور حرام ہونے پر اجماع ہو چکا ہے سوائے شیعہ کے اور کوئی اس کی حلت کا قائل نہیں۔ حرمت متعہ کا ثبوت اس آیت سے ہوتا ہے اللہ نے فرمایا ہے وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِھِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ فَاِنَّھُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْعٰدُوْنَ۔ متعہ والی عورت کو بیوی نہیں کہا جاتا اور نہ وہ مملوکہ ہے اسی لئے متعہ کرنے والے اور عورت میں سلسلہ توارث قائم نہیں (اور نہ زوجہ یا مملوکہ کے سوا تیسری عورت سے شرم گاہ کو محفوظ نہ رکھنے والے کو حق سے تجاوز کرنے والا کہا ہے معلوم ہوا کہ متعہ کو حلال قرار دینا حد شرعی سے تجاوز کرنا ہے)۔

اگر اس آیت کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ کے مسلک کے مطابق کی جائے تو پھر اس کو منسوخ ماننا پڑے گا (حالانکہ یہ آیت سب کے نزدیک محکم ہے منسوخ نہیں ہے) مسلم نے لکھا ہے کہ ربیع بن سبرہ بن معبد جہنی کا بیان ہے کہ میرے باپ

نے مجھ سے کہا میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا آپؐ نے فرمایا لوگو میں نے تم کو عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دیدی تھی اب اللہ نے قیامت تک کے لئے اس کو حرام کر دیا۔ لہٰذا اگر کسی کے پاس کوئی ایسی (عورت) ہو تو وہ اس کو آزاد کر دے اور جو کچھ تم ان کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔

مسلمؒ نے راوی مذکور کا یہ بیان بھی نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو متعہ کی اجازت دیدی تھی اس لئے میں اور ایک اور آدمی ایک عامر یہ عورت کے پاس گئے عورت جوان اور صراحی گردن تھی (یعنی کسی قدر دراز قامت تھی) ہم دونوں نے اس سے درپردہ درخواست کی، اس نے مجھ سے کہا تم مجھے کیا دوگے میں نے کہا اپنی چادر پیش کروں گا میرے ساتھی نے بھی اپنی چادر کی پیش کش کی اس کی چادر میری چادر سے اچھی تھی مگر میں اس سے اچھا جوان تھا عورت نے میرے ساتھی کی چادر دیکھ کر پسند کی اور جب مجھے دیکھا تو مجھے پسند کیا پھر کہنے لگی تیری چادر میرے لئے کافی ہے تو مجھے پسند ہے چنانچہ میں اس کے ساتھ تین شب رہا اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کسی کے پاس کوئی متعہ والی عورت ہو وہ اس کو چھوڑ دے۔

ابن ماجہ نے صحیح سند سے بیان کیا ہے حضرت عمر نے خطبہ دیا اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے تین روز تک متعہ کی اجازت ہم کو دے رکھی تھی پھر حرام فرما دیا اب اگر میں کسی کو متعہ کئے ہوئے پاؤں گا تو خدا کی قسم پتھر مار مار کر اس کو ہلاک کر دوں گا بشرطیکہ وہ شادی شدہ ہو۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے خطبہ دیا اور فرمایا لوگ عقد متعہ کیوں کرتے ہیں حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی ممانعت فرمادی تھی اگر کسی نے متعہ کیا ہوگا اور میرے پاس اس کو لایا جائے گا تو میں ضرور اس کو سنگسار کر دوں گا۔

حضرت ابن عمرؓ سے متعہ کا حکم دریافت کیا گیا فرمایا حرام ہے عرض کیا گیا حضرت ابن عباسؓ تو اس کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں فرمایا حضرت عمر کے زمانہ میں کیوں نہیں بولے۔

حضرت سلمہ بن اکوع کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلعم نے اوطاس کے سال تین دن کیلئے ہم کو اجازت دی تھی پھر ممانعت فرمادی۔ مسلم۔ یہ بھی مسلم کی روایت ہے کہ حضرت سبرہ بن معبدؓ نے فرمایا فتح مکہ کے سال جب ہم مکہ میں داخل ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے ہم کو (متعہ کی) اجازت دیدی تھی پھر مکہ سے نکلنے سے پہلے ہی ممانعت فرمادی۔

حازمی نے اپنی سند سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان نقل کیا ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمرکاب تبوک کے جہاد کے لئے گئے عقبہ (علاقہ شام) میں پہنچے تو وہاں کچھ عورتیں آگئیں ہم نے ان سے متعہ کر لیا اس خیال سے کہ یہ ہماری اونٹنیوں پر سوار ہو جائیں گی پھر رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے اور عورتوں کو دیکھ کر فرمایا یہ کون ہیں ہم نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ یہ عورتیں ہیں ہم نے ان سے متعہ کر لیا ہے۔ یہ بات سن کر حضورؐ کو اتنا غصہ آیا کہ رخسار مبارک سرخ ہو گئے اور چہرہ کا رنگ بدل گیا اور کھڑے ہو کر ایک خطبہ دیا اور حمد و ثناء کے بعد متعہ کی ممانعت فرمادی، حکم پاتے ہی ہم نے عورتوں کو رخصت کر دیا پھر ایسی حرکت نہیں کی اور نہ آئندہ کبھی کریں گے۔

طحاوی نے نقل کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمرکاب تبوک کے جہاد کو نکلے آپؐ نے ثنیۃ الوداع میں پڑاؤ کیا وہاں کچھ چراغ (روشن) دیکھے اور عورتوں کو روتے پایا فرمایا یہ کیا ہے عرض کیا گیا یہ عورتیں ہیں ان کے مردوں نے ان سے متعہ کیا تھا اور اب ان سے جدا ہو رہے ہیں فرمایا طلاق اور نکاح اور عدت اور میراث (کے قانون) سے اللہ نے متعہ کو حرام اور باطل کر دیا ہے، دار قطنی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ اللہ نے طلاق اور عدت اور میراث (کے حکم) سے متعہ (کے جواز) کو ڈھا دیا۔

حسن و عبداللہ ابناء محمد حنفیہ راوی ہیں کہ حضرت محمدؒ بن علی (محمد بن حنفیہ) نے سنا کہ حضرت ابن عباسؓ متعہ کے متعلق کچھ نرم ہیں تو فرمایا ابن عباسؓ ایسی بات چھوڑ دو کیونکہ خیبر کے دن رسول اللہ ﷺ نے متعہ کی اور پالتو گدھوں کے گوشت کی ممانعت فرمادی تھی۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ ابن حنفیہؒ نے کہا ابن عباسؓ تمہارے اندر کچھ گمراہی ہے (بخاری و مسلم)

مسلم نے بوساطت عروہ بن زبیر بیان کیا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر نے مکہ میں کھڑے ہو کر فرمایا کہ اللہ نے کچھ لوگوں کے دل ویسے ہی نابینا کر دیئے ہیں جیسے ان کی آنکھیں اندھی کر دی ہیں وہ متعہ (کے جواز) کا فتویٰ دیتے ہیں۔ آپ ایک شخص پر یعنی حضرت ابن عباسؓ پر تعریض کر رہے تھے کیونکہ آخر عمر میں حضرت ابن عباسؓ کی آنکھیں جاتی رہی تھیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت ابن زبیرؓ سے پکار کر کہا بلاشبہ تم احمق اور اکھڑ ہو، خدا کی قسم امام المتقین یعنی رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں متعہ کیا جاتا تھا۔ حضرت ابن زبیرؓ نے جواب دیا تو خود تم اپنا تجربہ کر دیکھو خدا کی قسم اگر تم نے کیا تو میں تم کو سنگسار کرا دوں گا۔

حضرت ابن ابی عمرہؓ انصاری نے فرمایا آغاز اسلام میں مجبور شخص کے لئے متعہ کی اجازت تھی جیسے مردار اور خون اور خنزیر کے گوشت کی پھر اللہ نے دین کو محکم کر دیا اور متعہ کی ممانعت فرما دی۔ بیہقیؒ نے زہری کا قول نقل کیا ہے کہ انتقال سے پہلے حضرت ابن عباسؓ نے حلت کے فتویٰ سے رجوع کر لیا تھا، ابو عوانہ نے صحیح میں بھی اسی طرح ذکر کیا ہے۔

ابو داؤدؒ نے ناسخ میں اور ابن المنذر و نحاس نے عطاء کے طریق سے بیان کیا ہے کہ اس آیت کو منسوخ کر دیا یَاأَیُّهَا النَّبِیُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَالْمُطَلَّقَاتُ یَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ وَاللَّائِی یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیضِ نے بیہقی وغیرہ نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول اور ابو داؤد و بیہقی نے سعیدؒ بن مسیب کا قول نقل کیا ہے کہ متعہ کو آیت میراث نے منسوخ کر دیا۔

ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ متعہ شروع اسلام میں تھا جب کوئی شخص کسی ایسی بستی میں جاتا تھا جہاں اس کی شناسائی نہ ہوتی تھی تو جتنی مدت اس کو وہاں ٹھہرنا ہوتا تھا اتنی مدت کیلئے وہ کسی عورت سے نکاح کر لیتا تھا عورت اس کے سامان کی حفاظت کرتی اور اس کی ضروریات ٹھیک کر دیتی تھی۔ یہاں تک کہ آیت إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ نازل ہوئی۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا بیوی اور باندی کے علاوہ اب ہر شرمگاہ حرام ہے۔

میں کہتا ہوں شاید حضرت ابن زبیرؓ اور دوسرے علماء سے مناظرہ کرنے کے بعد حضرت ابن عباسؓ نے اپنے سابق فتویٰ سے رجوع کر لیا تھا اور متعہ کا منسوخ ہونا ان پر ظاہر ہو گیا تھا۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ متعہ کا فتویٰ صرف اسحالت میں دیتے تھے کہ آدمی سفر میں مجبور اور مضطر ہو۔ حازمی نے سعیدؒ بن جبیر کا قول نقل کیا ہے۔ ابن جبیرؓ نے کہا میں نے حضرت ابن عباسؓ سے عرض کیا آپ کے فتویٰ کو قافلے (چاروں طرف) لے گئے اور شاعروں نے بھی اس فتویٰ کی بابت شاعری کی فرمایا شاعروں نے کیا کہا میں نے عرض کیا یہ شعر نظم کئے ہیں ؂

قد قلت للشیخ لما طال محبسہ ! یاصاح ھل لک فی فتویٰ ابن عباسؓ
ھل لک فی رخصۃ الاطراف آنسۃ تکون مثواک حتی یصدر الناس

جب شیخ کا قیام طویل ہو گیا تو میں نے اس سے کہا میرے دوست کیا ابن عباسؓ کے فتویٰ پر چلنے کی آپ کو خواہش ہے کیا نازک نرم انگلیوں والی خاتون کی آپ کو ضرورت ہے جو واپسی کے وقت تک آپ کے لئے مرکز قیام رہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا سبحان اللہ میں نے تو اس کا فتویٰ نہیں دیا متعہ تو بس ایسا ہی ہے جیسے مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت مجبور کے علاوہ کسی کے لئے جائز نہیں۔ ابن منذرؒ نے تفسیر میں اور بیہقیؒ نے سنن میں بھی یہ روایت بیان کی ہے لیکن اس کے الفاظ یہ ہیں إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ خدا کی قسم میں نے تو اس کا فتویٰ نہیں دیا نہ میری یہ مراد ہے اور نہ مجبور کے علاوہ کسی اور کے لئے میں نے متعہ کو حلال قرار دیا ہے۔

ابن جریج نے بھی اپنے فتویٰ سے رجوع کر لیا تھا ابو عوانہ نے صحیح میں لکھا ہے کہ ابن جریج نے بصرہ میں فرمایا گواہ رہو کہ میں نے اس سے رجوع کر لیا یعنی متعہ کی حلت کے فتویٰ سے پہلے جواز متعہ کی تائید میں ابن جریج نے اٹھارہ حدیثیں بیان کی تھیں۔

﴿...... ایک شبہ ......﴾

مسلم کی بعض روایات میں متعہ کی حلت اور حرمت دونوں کا اوطاس کے سال میں ہونا آیا ہے اور بعض روایات میں آیا ہے کہ فتح مکہ کے دن حضورؐ نے متعہ کو حرام کر دیا اور صحیحین میں آیا ہے کہ خیبر کے دن متعہ کو حرام کیا اور بعض روایات میں غزوۂ تبوک میں صدور ممانعت کا ذکر ہے۔ تعارض روایات کو کس طرح دور کیا جاسکتا ہے۔

ازالہ :۔ اوطاس کا جہاد فتح مکہ سے متصل ہی ایک ہی سال میں ہوا تھا رہا خیبر کے دن حرمت ہونے کا معاملہ تو یہ جان لینا ضروری ہے کہ متعہ کی اجازت دوبار ہوئی تھی اور ہر بار اجازت منسوخ کر دی گئی تھی آخر کار دوامی حرمت کا فیصلہ کر دیا گیا۔ ابن ہمام نے اس کی صراحت کی ہے صحیح مسلم میں باب نکاح المتعۃ کے عنوان میں درج ہے کہ نکاح متعہ کی اجازت دی گئی پھر اجازت منسوخ کر دی گئی پھر اجازت دی گئی پھر اجازت منسوخ کر دی گئی اور قیامت تک کے لئے حرمت کا فیصلہ ہو گیا۔

بغوی نے ربیع بن سلیمان کی وساطت سے بیان کیا ہے کہ شافعیؒ نے فرمایا کہ متعہ کے علاوہ مجھے اور کوئی ایسی چیز اسلام میں معلوم نہیں کہ اس کو حلال کرنے کے بعد حرام کیا گیا ہو، پھر حلال قرار دیا گیا ہو اور پھر حرام کر دیا گیا ہو بعض علماء کا قول ہے کہ متعہ تین بار منسوخ ہوا بعض کے نزدیک تین بار سے بھی زیادہ مرتبہ اس کا نسخ ہوا۔ باقی غزوۂ تبوک میں ممانعت کا ذکر تو اس سے یہ مراد نہیں کہ تبوک سے پہلے اجازت تھی اور تبوک میں ممانعت ہوئی بلکہ مطلب یہ ہے کہ تبوک میں جن لوگوں نے متعہ کیا تھا ان کو یہ علم نہ تھا کہ متعہ کی دائمی حرمت ہے اسی لئے متعہ کرنے کی خبر سن کر رسول اللہ صلعم کو اتنا غصہ ہو گیا کہ چہرۂ مبارک کا رنگ بدل گیا اور خطبہ میں لوگوں کو بازداشت کی حازمی کا بیان ہے کہ وطن اور گھر پر رہنے کی حالت میں تو متعہ کی اجازت کبھی بھی نہیں دی گئی تھی بلکہ بعض اوقات میں ضرورت کے زیر اثر اجازت ہوگئی تھی اور حجۃ الوداع میں اس کی بھی حرمت ہو گئی اور دوامی حرمت ہو گئی۔

اکثر مفسرین کے نزدیک آیت میں متعہ مراد ہی نہیں ہے، بلکہ صحیح نکاح کے بعد جماع سے بہرہ اندوز اور لذت گیر ہونا مراد ہے یعنی عورتوں سے نکاح کرنے کے بعد جب تم لذت یاب اور بہرہ اندوز ہوگئے تو ان کے مہر ادا کرو۔ حسن اور مجاہد کا بھی یہی قول ہے ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ استمتاع نکاح ہے اور (ادائے مہر کا یہ ہی حکم ہے) آیت وَاٰتُوا النِّسَاءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً۔

مسئلہ :۔ تفسیر مذکور کی بناء پر بظاہر جماع کے بغیر عورت کو مہر کا استحقاق نہیں ہوتا لہٰذا امام مالکؒ کے قول کا ثبوت اس آیت سے ملتا ہے کیونکہ امام مالکؒ کا مسلک ہے کہ صرف نکاح سے عورت کو پورے مہر کا استحقاق نہیں ہوتا نصف مہر کی مستحق ہو جاتی ہے ہاں جماع یا موت سے پورے مہر کا استحقاق ہو جاتا ہے۔

جمہور کے نزدیک صرف نکاح سے ہی کامل مہر کا استحقاق ہو جاتا ہے لیکن بغیر جماع کے طلاق دینے سے نصف مہر ساقط ہو جاتا ہے کیونکہ آیت اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ میں باء الصاق کے لئے ہے لہٰذا عقد کے ساتھ ہی مال کا وجوب ہو جاتا ہے۔ جماع تک وجوب مال کو موخر رکھنا مدلول آیت کے خلاف ہے۔ اس آیت سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ بہرہ اندوزی اور قربت کے ساتھ مہر واجب ہو جاتا ہے اور قربت کے بعد مہر کے سقوط کا احتمال بھی نہیں رہتا۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ صرف نکاح کے بعد بغیر جماع کے مہر واجب نہیں ہوتا اس مفہوم کی طرف سے آیت خاموش ہے لہٰذا امام مالک کا استدلال غلط ہے اور دونوں آیتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے چونکہ عورت محض عقد نکاح سے مہر کی مالک ہو جاتی ہے اس لئے وصول مہر کے بغیر شوہر کو قربت سے روک دینے کا اور اس کے ساتھ سفر میں جانے سے باز رہنے کا اس کو حق ہے۔ اور اگر مہر میں کسی غلام کو نامزد کیا گیا ہو تو عورت اس غلام کو آزاد کر سکتی ہے۔ شوہر آزاد نہیں کر سکتا واللہ اعلم بالصواب۔

فَرِيْضَةً ط بطور فرض۔ یا اللہ نے مہر دینا فرض کر دیا ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرَاضَيْتُم بِهِ مِن بَعْدِ الْفَرِيضَةِ ۚ اور مقرر ہونے کے بعد بھی (مہر وغیرہ کی) جس مقدار پر تم باہم رضامند ہو جاؤ (خواہ بڑھانے پر یا گھٹانے پر یا معافی پر) تو اس (کے لین دین) میں تم پر کوئی گناہ نہیں جن لوگوں کے نزدیک اِسْتَمْتَعْتُمْ سے مراد متعہ ہے ان کے نزدیک اس آیت کا یہ مطلب ہو گا کہ اگر کسی نے متعہ کیا ہو اور متعہ کی مدت ختم ہو جائے تب بھی عورت اپنی طرف سے مدت میں کمی بیشی کر سکتی ہے اسی طرح مرد مقررہ معاوضہ دینے میں بیشی کر سکتا ہے اگر مدت کی زیادتی پر باہم رضامندی نہ ہو تو الگ الگ ہو جائیں۔ اور جن کے نزدیک اِسْتَمْتَعْتُمْ سے نکاح صحیح مراد ہے ان کے نزدیک یہ مطلب ہو گا کہ مہر مقرر ہونے کے بعد اگر عورت مقررہ مہر کا کچھ حصہ خود کم کر دے یا کل معاف کر دے یا مرد مقرر کردہ سے زائد از خود مقرر کر دے تو درست ہے۔

مسئلہ :۔ یہ آیت بتا رہی ہے کہ مقرر کرنے کے بعد اگر طرفین میں سے کوئی مہر میں زیادتی یا کمی کرے گا تو اس کا الحاق اصل مہر کے ساتھ ہو گا (یعنی زیادتی یا کمی کے بعد مہر کی جتنی مقدار ہو گی اسی کو اصل مہر قرار دیا جائے گا پہلے تقرر کا اعتبار نہ ہو گا) اس لئے عورت کو جس طرح اصل مہر طلب کرنے کا حق ہے اسی طرح مرد کی طرف سے جو مہر کی مقدار بڑھا دی گئی ہو اس کا مطالبہ کرنے کا بھی اس کو استحقاق ہے (اور مرد کا یہ عذر قابل سماعت نہیں کہ اصلی مہر تو وہ ہے جو شروع میں مقرر کیا گیا تھا، رہی زیادتی تو وہ میری طرف سے بطور عطیہ تھی میں اب چاہوں دوں چاہوں نہ دوں) امام شافعی زیادتی (اور کمی) کو اصل مہر (کی طرح) نہیں قرار دیتے بلکہ شوہر کی طرف سے زیادتی کو (اور عورت کی طرف سے کمی کو) ایک طرح کا از سر نو ہبہ قرار دیتے ہیں (اور ہبہ کا مالک ہونے کے لئے موہوب لہ کا قبضہ ہو جانا شرط ہے) اس لئے اگر قبضہ ہو جائے گا تو ہبہ جاری رہے گا قبضہ نہ ہو گا تو باطل سمجھا جائے گا۔ آیت مذکورہ ہمارے مسلک کی تائید کر رہی ہے ورنہ آیت کی افادی حیثیت کچھ نہ ہو گی (کیونکہ زوجین میں سے ہر ایک کو ہبہ کرنے کا تو عمومی ضابطہ ہبہ کے تحت اختیار ہونا بالکل بدیہی ہے پھر خصوصیت کے ساتھ اس جگہ ذکر کی کوئی وجہ نہیں)

امام احمدؒ کے نزدیک بھی چونکہ زیادتی کا حکم اصل مہر کا ہوتا ہے اس لئے آپ نے کہا کہ اگر شوہر مر جائے یا قربت کر لے تو پورا مہر مع زیادتی کے واجب الادا ہو جاتا ہے اور اگر قربت سے پہلے طلاق دے دی ہو تو جس طرح اصل مہر کا نصف واجب ہوتا ہے اسی طرح زیادتی کا نصف ادا کرنا بھی لازم ہوتا ہے۔

امام اعظمؒ نے فرمایا اگر قربت کے بغیر طلاق دے دی تو اصل مہر (کی تنصیف ہو گی اور اصل مہر) سے زیادہ کی ہوئی رقم کی تنصیف نہ ہو گی بلکہ وہ کل ساقط ہو جائے گی کیونکہ اللہ نے آیت وَإِن طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ میں بوقت عقد مقرر کردہ مہر کا نصف واجب الادا قرار دیا ہے (زیادتی کے نصف کا ذکر نہیں کیا) امام مالکؒ نے فرمایا قربت کے بعد کل زیادتی واجب الادا ہو جاتی ہے (جس طرح کل مہر واجب الادا ہو جاتا ہے) لیکن اگر قربت کے بغیر طلاق دیدے تو مقرر کردہ مہر کے نصف کے ساتھ زیادتی کا نصف بھی واجب الادا ہوتا ہے اور اگر قربت سے پہلے شوہر مر جائے اور عورت نے زیادتی پر قبضہ بھی نہ کیا ہو تو کل زیادتی ساقط ہو جاتی ہے۔

مسئلہ :۔ باجماع علماء عورت کو حق ہے کہ اپنے مہر کا کوئی حصہ بھی معاف کر دے اب اگر اس نے نصف مہر سے کم شوہر کو ہبہ کیا ہو اور قربت کے بغیر شوہر اس کو طلاق دیدے تو شوہر دیئے ہوئے مہر میں سے عورت سے اتنی مقدار کی واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے کہ نصف مہر مکمل ہو جائے شیخین کا یہی قول ہے لیکن امام محمدؒ نے فرمایا کہ جتنی مقدار عورت کے قبضہ میں پہنچ گئی اور رہ گئی ہے اس کے نصف کا مطالبہ کر سکتا ہے (اور جو حصہ عورت نے از خود ساقط کر دیا اس کو محسوب نہیں کیا جائے گا)۔

إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿٢٤﴾ یہ حقیقت ہے کہ اللہ مصالح سے بخوبی واقف ہے اور جو احکام اس نے دیئے ہیں ان کی حکمت کو وہ جانتا ہے۔

وَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا أَن يَنكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ اور تم میں سے جو کوئی آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرنے کی سکت نہ رکھتا ہو۔ طول طائل، طائلہ سب کا لغوی معنی ہے فضل قدرت دولت مالی وسعت

(قاموس) یہاں طول بمعنی استطاعت ہے یعنی قدرت مطلب یہ کہ جو کوئی تم میں سے استطاعت نہ رکھتا ہو نکاح کرنے کی استطاعت۔ اس صورت میں طولاً مفعول مطلق اور ان ینکح مفعول بہ ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ طولاً مفعول بہ ہو اور اس کا معنی ہو اونچا ہونا کیونکہ اونچا ہونا فضل و دولت کے لوازم میں سے ہے اور ان ینکح سے پہلے با محذوف ہو اس صورت میں مطلب اس طرح ہوگا۔ کہ جو شخص آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرنے کی حد تک اونچا نہ اٹھ سکے (یعنی اس کے پاس اتنا مال نہ ہو) مولفؒ نے اس جملہ کی دو نحوی ترکیبیں اور بھی لکھی ہیں لیکن مطلب میں کوئی خاص تفاوت نہیں اس لئے ہم نے اختصار کو پسند کیا)
محصنٰت (محفوظ عورتیں) اس سے مراد ہیں آزاد عورتیں کیونکہ وہ غلامی کی ذلت سے محفوظ ہوتی ہیں۔

فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ تو وہ نکاح کرلے اس عورت سے جو تم میں سے کسی کی مملوکہ ہو یعنی کسی دوسرے کی باندی سے، کیونکہ اپنی باندی سے (باندی رکھتے ہوئے) تو نکاح کی ضرورت ہی نہیں اس لئے اپنی باندی سے نکاح جائز نہیں۔

مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ۭ لیکن وہ تمہاری مسلمان باندیوں میں سے ہو (مشرکہ باندی سے نکاح درست نہیں)۔

اس آیت سے امام شافعیؒ امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے دو امور پر استدلال کیا ہے۔ (۱) اگر آزاد عورت سے نکاح کا مقدور ہو تو باندی سے نکاح حرام ہے۔

(۲) کتابیہ باندی سے مطلقاً نکاح حرام ہے کیونکہ فَلْيَنْكِحْ امر کا صیغہ اباحت کے لئے ہے اور باندی سے نکاح کی اباحت کو دو شرطوں سے مشروط کیا ہے ایک تو حرہ سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ ہو دوسرے باندی مومن ہو کیونکہ ایمان کو اگرچہ بصورت شرط ذکر نہیں کیا گیا ہے، بلکہ پیرایۂ وصف میں ذکر کیا ہے مگر) وصف شرط کے حکم میں ہے اور شرط کے انتظار سے حکم معدوم ہو جاتا ہے اور اباحت معدوم ہو گئی تو حرمت ثابت ہو گئی۔

حضرت جابر اور حضرت ابن مسعودؓ کی طرف اس قول کی نسبت کی گئی ہے۔ بیہقی نے ابو الزبیر کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے خود سنا حضرت جابرؓ فرما رہے تھے حرہ پر باندی سے نکاح نہ کیا جائے۔ باندی کے اوپر حرہ سے نکاح کیا جا سکتا ہے اور جس کے پاس حرہ کو دینے کے لئے مہر ہو وہ باندی سے کبھی نکاح نہ کرے۔ اس روایت کی سند صحیح ہے۔ ابن المنذر نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ نے باندیوں سے نکاح اس شخص کے لئے حلال کیا ہے جس کے پاس حرہ کا مہر نہ ہو اور اس کو اپنے متعلق گناہ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو۔

حنفیہ نے اس کا جواب چند طرح سے دیا ہے (۱) ہمارے نزدیک مفہوم مخالف کو دلیل میں پیش کرنا صحیح نہیں اور انتفاء شرط سے عدم حکم بھی لازم نہیں کیونکہ زیادہ سے زیادہ کہ شرط کو علت کا درجہ دے دیا جائے لیکن علت کے انتفاء سے معلول کا انتفاء ضروری نہیں ممکن ہے معلول کے وجود کی کوئی دوسری علت بھی ہو۔ لہٰذا وجود شرط و وصف موجب حکم ضرور ہیں (بشرطیکہ کوئی مانع موجود نہ ہو) اور شرط و وصف نہ ہونے کی صورت میں عدم حکم لازم نہیں بلکہ عدم حکم کی طرف سے سکوت اختیار کیا جائے گا اب اگر شرط و وصف نہ ہونے کی صورت میں کسی دوسری علت کی وجہ سے حکم موجود ہوگا تو بہتر ورنہ عدم حکم کا فیصلہ کیا جائے گا مگر یہ عدم اصلی عدم ہوگا کیونکہ وجود حکم تو وجود شرط کی وجہ سے عارضی تھا اصل عدم حکم ہی تھا اس عدم کو حکم شرعی نہیں کہا جائے گا۔ اب صورت مسئلہ پر غور کیجئے باندی مؤمنہ ہو یا کتابیہ کافرہ، اور مرد حرہ سے نکاح کرنے کی استطاعت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو بہر حال مطلقاً باندی سے نکاح کا جواز آیت فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ سے ثابت ہے نیز آیت اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَاۗءَ ذٰلِكُمْ بھی اس جواز پر دلالت کر رہی ہے لہٰذا آیت فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کا مفہوم مخالف نکال کر کتابیہ سے نکاح کو حرام قرار دینا یا باندی سے نکاح کے جواز کی شرط حرہ سے نکاح کے عدم استطاعت کو قرار دینا درست نہیں۔

(۲) جو لوگ مفہوم مخالف سے استدلال کرتے ہیں ان کے نزدیک بھی یہ ضروری ہے کہ وہ شرط یا وصف احترازی ہو۔ اتفاقی نہ ہو لیکن اس جگہ ہو سکتا ہے کہ قید کا ذکر صرف عادت اور رواج پر مبنی ہو (احترازی نہ ہو) کیونکہ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے کہ آدمی باندی سے نکاح اسی وقت کرتا ہے جب حرہ سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ ہو (ورنہ کون اپنی نسل کو باندی کی اولاد

کہلوانا پسند کرتا ہے) اور یہ بھی رواج اہل اسلام کا تقاضا ہے کہ کوئی مسلمان کافرہ باندی سے معاشرت کو پسند نہیں کرتا اسی عرف اور عادت کی وجہ سے المحصنٰت کی صفت المومنٰت بیان کی ورنہ باجماع علماء یہ قید احترازی نہیں ہے۔ امام شافعیؒ نے بھی اسی لئے فرمایا کہ حرہ کتابیہ سے نکاح کرنے کی استطاعت ہو تو باندی سے نکاح درست نہیں۔ اس کے علاوہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ المومنٰت کی قید نہ احترازی ہے نہ اتفاقی بلکہ افضل صورت بیان کرنے کے لئے ہے۔

(۳) اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ مفہوم مخالف عدم اباحت پر دلالت کر رہا ہے تب بھی ضروری نہیں کہ ہر غیر مباح حرام ہو جائے ممکن ہے کہ غیر مباح مکروہ ہو اور ہم کراہت کے قائل ہی ہیں۔ بدائع میں اس کی صراحت کر دی گئی ہے کہ کتابیات خواہ باندیاں ہوں یا حرہ سب سے نکاح مکروہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس عمل سے کافروں سے موالات لازم آتی ہے جس کی ہم کو ممانعت کر دی گئی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ دو دوستوں میں رشتہ محبت کو مضبوط کرنے والا سوائے نکاح کے اور کوئی (رشتہ) تم کو نہیں ملے گا۔ رواہ ابن ماجہ عن ابن عباسؓ۔

اللہ تعالیٰ نے (موالات کفار کی ممانعت میں) فرمایا ہے لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ دوسری آیت میں آیا ہے لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ عورتوں سے نکاح کی رغبت چار امور کی وجہ سے ہوتی ہے مال، شرافت نسب، جمال، دین، داری، تم دیندار عورت سے نکاح کر کے کامیاب بنو۔ رواہ مسلم والبخاری من حدیث ابی ہریرۃؓ مسلم نے حضرت جابرؓ کے حوالہ سے حدیث کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ عورت سے نکاح اس کے دین اور مال اور حسن کی وجہ سے کیا جاتا ہے تو دیندار کو اختیار کر۔ حاکم اور ابن حبان نے حضرت ابو سعیدؓ کی روایت سے اور ابن ماجہ، بزار اور بیہقی نے حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث بیان کی ہے۔ باندیوں سے نکاح کی کراہت اس وجہ سے ہے کہ اولاد غلام ہوگی اور غلامی موت کے حکم میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اپنے نطفوں کے لئے انتخاب کرو، کفو سے نکاح کرو اور کفو سے نکاح کراؤ۔ رواہ ابوداؤد والحاکم بیہقی نے اس حدیث کی تصحیح کی۔ یہ حدیث حضرت عائشہؓ کی روایت سے آئی ہے۔

وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِكُمْ اور اللہ تمہارے ایمان کو خوب جانتا ہے، ایمان اور اعمال کی وجہ سے ہی ایک کی دوسرے پر برتری ہوتی ہے۔

بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ یعنی تم باہم ایک دوسرے کی نسل سے ہو یعنی آزاد ہوں یا باندی غلام سب ایک ہی آدمؑ کی اولاد ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اب کوئی شبہ نہیں کہ اللہ نے تم سے (دور) جاہلیت کی خرابی اور باپ دادا پر شیخی کرنے کو دور کر دیا ہے اب تو آدمی یا مومن متقی ہے یا کافر بدبخت۔ سب آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے (بنے) تھے۔ یہ حدیث ابوہریرہؓ کی روایت سے ترمذی اور ابوداؤد نے بیان کی ہے۔ امام احمد اور بیہقی نے حضرت عقبہؓ بن عامر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے یہ نسب کسی کے لئے باعث عیب نہیں۔ تم سب آدمؑ کی اولاد ہو۔ کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں مگر دین اور تقویٰ کی وجہ سے آدمی کیلئے بدزبان فحاش اور بخیل ہونا پورا پورا عیب ہے۔

یہ دونوں جملے اس لئے فرمائے کہ لوگ باندیوں سے نکاح کرنے کو عار نہ سمجھیں بلکہ ان کو اس طرف رغبت خاطر پیدا ہو۔

فَانْكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ تو مومن باندیوں سے تم ان کے آقاؤں کی اجازت سے نکاح کرو۔ ھُنَّ کی ضمیر فتیات کی طرف راجع ہے اور فتیات سے مراد ہیں باندیاں۔ خواہ خالص مملوکہ ہوں یا مکاتبہ یا مدبرہ یا ام ولد (مکاتبہ وہ باندی جس سے آقا نے عقد کتابت کر لیا ہو یعنی اس سے کہہ دیا ہو کہ اتنا روپیہ اگر تو اپنی قیمت کا دیدیگی تو آزاد ہو جائے گی اور مدبرہ وہ باندی ہے جس سے آقا نے کہہ دیا ہو کہ میرے مرنے کے بعد تو آزاد ہے اور ام ولد وہ باندی ہے جس سے آقا کی کوئی اولاد ہو گئی ہو) فَانْكِحُوا امر کا صیغہ وجوب کے لئے ہے اور وجوب کا حکم قید (باذن) کی طرف راجع ہے یعنی باندیوں سے نکاح ان کے آقاؤں کی اجازت کے بغیر جائز نہیں چونکہ اجازت کی قید کا وجوبی طور پر ذکر مقصود تھا اسی لئے دوبارہ فَانْكِحُوا کا صیغہ امر ذکر کیا کیونکہ باندیوں سے نکاح کی اجازت تو مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ سے معلوم ہو گئی تھی مگر آقاؤں کی اجازت کا وجوب معلوم نہ ہوا

تھا کیونکہ ایک ہی صیغہ سے جواز اور وجوب دونوں یکدم مستفاد نہیں ہو سکتے اسی لئے دوبارہ فانکحوا فرمایا تاکہ پہلے سے اباحت اور دوسرے سے وجوب سمجھ میں آجائے۔ غلام کا بھی یہی حکم ہے۔ کسی مملوک کا نکاح آقا کی اجازت کے بغیر نہیں ہوگا یہ مسئلہ اجماعی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس غلام نے آقا کی اجازت کے بغیر نکاح کیا وہ زانی ہے۔ حضرت جابرؓ کی روایت سے یہ حدیث ابوداؤد اور ترمذی نے بیان کی ہے اور ترمذی نے اس کو حسن کہا ہے سنن میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے آیا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا جو غلام آقا کی اجازت کے بغیر نکاح کر لے اس کا نکاح باطل ہے۔

مسئلہ :۔ کیا غلام نے اگر آقا کی اجازت کے بغیر نکاح کر لیا تو نکاح منعقد نہیں ہوتا یا منعقد تو ہو جاتا ہے مگر اس کا نفاذ آقا کی منظوری پر موقوف رہتا ہے۔ یہ مسئلہ اختلافی ہے امام ابو حنیفہ امام مالکؒ اور ایک روایت کے بموجب امام احمدؒ کا قول یہ ہے کہ انعقاد نکاح تو ہو جاتا ہے مگر نفاذ آقا کی اجازت پر موقوف رہتا ہے کیونکہ غلام میں نکاح کی اہلیت ہے اور وہ اپنی اہلیت سے تصرف کر رہا ہے اجازت مولیٰ کی ضرورت صرف اس وجہ سے ہے کہ اگر باندی نے مولیٰ کی اجازت کے بغیر نکاح کر لیا تو مولیٰ کی رضا مندی کے بغیر اس کا حق قربت ساقط ہو جائے گا اور غلام نے اذن آقا کے بغیر نکاح کیا تو آقا کو اپنی مرضی کے بغیر ادائے مہر کا ذمہ دار بننا پڑے گا۔ آیت میں بھی صرف اذن مولیٰ کی شرط مذکور ہے عقد کی شرط نہیں ہے۔ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا (یعنی اگر آقا بعد کو راضی بھی ہو جائے تب بھی نکاح سابق کالعدم ہوگا اور جدید نکاح کرنا پڑے گا) کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے نکاح کو باطل فرمایا ہے۔ اور آیت میں بھی باذن کی باء اتصال کو چاہتی ہے لہٰذا اذن کو نکاح سے متصل ہونا چاہئے نکاح کے بعد اذن ہونے پر نکاح موقوف نہ رہنا چاہئے۔

وَّاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ اور ان باندیوں کو ان کے مہر دیدو۔ امام مالکؒ نے فرمایا بظاہر یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ مہر باندی کا حق ہے (آقا کو نہیں پہنچے گا) جمہور کا قول ہے کہ باندی کا مہر اس کے آقا کی ملک ہوگا باندی تو غیر مختار ہے اس کے مالکہ ہونے کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ رہی آیت تو اس میں قید باذن اھلھن کی محذوف ہے یعنی باندیوں کو ان کا مہر ان کے آقاؤں کی اجازت سے دیدو چونکہ سابق میں باندیوں سے نکاح کرنے کی یہ شرط ذکر کر دی تھی اس لئے یہاں دوبارہ ذکر کرنا ضروری نہ تھا۔ یا یوں کہا جائے کہ باندیوں کے دینے سے مراد ہے ان کے آقاؤں کو دینا یعنی اٰتوھن میں مضاف محذوف ہے اصل میں اٰتوا موالیھن تھا آیت کی یہ دونوں تاویلیں ضعیف ہیں۔

(۱) اس لئے کہ عطف کا تقاضا یہ نہیں ہوتا کہ معطوف میں بھی وہی قید معتبر ہے جس کا ذکر معطوف علیہ کے ساتھ کر دیا گیا ہو قید موخر میں اشتراک کو عطف نہیں چاہتا مقدم کے اشتراک کو چاہتا ہے۔ (۲) دوسری تاویل اس لئے کمزور ہے کہ مضاف کو حذف کرنے کی کوئی وجہ ہونی چاہئے۔ اہل کا ذکر پہلے ہو چکا ہے پھر بجائے اٰتوھم کے اٰتوھن کہنے کی کوئی وجہ نہیں محقق تفتازانی نے ھن کہنے کا یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ اس سے مملوکات سے نکاح کے مہر کو واجب کرنا اور ان کے صنفی اعضاء سے تمتع اندوزی کے معاوضہ کو لازم قرار دینا مقصود ہے اس بیان کا تقاضا یہ ہے کہ مہر ان ہی کو دیا جائے۔ رہا مولیٰ کا مالک ہو جانا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مولیٰ اپنی مملوکہ کی ذات کا مالک ہے (لہٰذا مملوکہ کا ہر مال اسی کی ملک ہے) زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ منکوحہ باندی مہر پر قبضہ کرنے کا اختیار رکھتی ہے جیسے وہ غلام جس کو مولیٰ نے تجارت کی اجازت دیدی ہو بیع اور ثمن پر قبضہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے لہٰذا باندیوں کے قبضہ میں ہی ان کا مہر شوہروں کی طرف سے دیا جانا چاہئے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اجور سے (مہر مراد نہ ہوں بلکہ) نان نفقہ مراد ہو اس صورت میں آقا کے اذن کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔

بِالْمَعْرُوْفِ دستور کے مطابق یعنی مہر کی ادائیگی میں کمی نہ کی جائے نہ ٹالا جائے۔ اس لفظ کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ شرعی حکم کے مطابق مہر دیا جائے یعنی آقا کی اجازت کے ساتھ۔ کیونکہ آقا کی اجازت کے بغیر ان کو مہر دیدینا (یعنی مہر کا مالک بنا دینا) شرعاً ممنوع ہے۔

مُحْصَنٰتٍ پاک دامن۔

غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ علی الاعلان بدکاری کرنے والیاں نہ ہوں۔

وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ نہ چھپ کر یار بنانے والیاں ہوں۔ حسنؒ نے فرمایا مسٰفحت کا معنی ہے ہر جائی ہو جانا اور یار بنانے والی سے مراد ہے کسی کی مخصوص داشتہ بن جانے والی عرب کے نزدیک اول فعل حرام تھا اور دوسرا جائز۔

غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ مُحْصَنٰتٍ کا بیان ہے یعنی پاک دامن عورتیں وہی ہیں جن میں یہ دونوں عیب نہ ہوں۔ نکاح کو محصنت کے ساتھ مقید کرنے سے مراد ہے بہتر صورت کا اظہار (یعنی افضل یہ ہے کہ محصنات سے نکاح کرو اگرچہ زانیہ سے بھی نکاح درست ہے) یہ قول امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا ہے۔ امام احمدؒ کے نزدیک زانیہ سے جب تک وہ توبہ نہ کرلے نکاح درست نہیں خواہ وہ حرہ ہو یا باندی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً وَّالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُھَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ وَّحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ (یعنی زانیہ اور مشرکہ سے نکاح مومنوں کے لئے حرام کر دیا گیا ہے) اسی آیت کی تفسیر سورۂ نور میں انشاء اللہ آئے گی۔ امام مالکؒ نے فرمایا زانیہ سے نکاح مطلقاً مکروہ ہے (خواہ اس نے توبہ کرلی ہو) چونکہ نکاح کے لئے عورت کے محصن ہونے کی شرط تھی اس لئے ادائے مہر کے لئے بھی یہ شرط لگا دی جب نکاح حالت احصان میں ہوگا تو مہر کی ادائیگی بھی اسی حالت میں ہوگی۔ اب یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ ادائے مہر کے لئے بالاجماع عورت کا پاک دامن ہونا ضروری نہیں۔

فَاِذَآ اُحْصِنَّ پھر جب مسلمان باندیاں شوہر والیاں ہوں۔ احصان کا لغوی معنی ہے روک باز داشت قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال کئی معانی میں آیا ہے۔ حرہ ہونا، پاک دامن ہونا، شوہر والی ہونا، مسلمان ہونا، کلام چونکہ مسلمان باندیوں کے متعلق ہے اس لئے اس جگہ حرہ یا مسلمہ مراد نہیں ہے اور عفت بھی مراد نہیں ہے کیونکہ آئندہ آیت میں مرتکب زناء ہونے کا حکم بیان کیا گیا ہے اس لئے شوہر والی باندیاں ہی مراد ہیں۔

فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَۃٍ اگر وہ زنا کی مرتکب ہو جائیں۔

فَعَلَیْھِنَّ نِصْفُ مَا عَلَی الْمُحْصَنٰتِ تو ناکتخدا عورتوں سے آدھی سزا ان کو دی جائے اس جگہ محصنٰت سے مراد ہیں۔ آزاد ناکتخدا عورتیں کیونکہ شوہر والی آزاد عورتوں کے فعل زنا کی سزا سنگسار کر دینا ہے اور سنگساری کی سزا کی تنصیف ممکن نہیں مِنَ الْعَذَابِ ط یعنی حد شرعی (کا نصف)۔

مسئلہ :۔ آزاد مرد اور عورت اگر مرتکب زنا ہو جائیں اور نکاح شدہ نہ ہوں تو امام اعظمؒ کے نزدیک اس کی سزا سو تازیانے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ زانی اور زانیہ میں سے ہر ایک کے سو تازیانے مارو۔ امام احمد اور امام شافعی کے نزدیک سو کوڑوں کے ساتھ ایک سال کے لئے جلاوطن کر دینا بھی ضروری ہے۔ امام مالکؒ نے فرمایا جلاوطن کرنے کی سزا مرد کے لئے ہے عورت کے لئے نہیں ہے۔ جلاوطنی کی سزا کی دلیل حضرت عبادہؓ بن صامت کی روایت کردہ یہ حدیث ہے کہ بے شوہر والی بے بیوی والے سے زنا کرے تو سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی (ان کی سزا ہے) رواہ مسلم۔

حضرت زید بن خالدؓ کا بیان ہے کہ میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ غیر محصن زانی کو سو کوڑے مارنے اور ایک سال کے لئے دیس بدر کرنے کا حکم دے رہے تھے۔ رواہ البخاری۔

امام مالکؒ نے فرمایا حدیث میں لفظ اَلْبِکْرُ آیا ہے اور بکر کا لفظ عورتوں کو شامل نہیں ہے لہٰذا عورتوں کے لئے جلاوطنی کی سزا نہیں ہے۔ مگر یہ دلیل ہیچ ہے (بکر کا لفظ مرد عورت کو شامل ہے اور حدیث میں دونوں کے لئے استعمال ہوا ہے) کیونکہ حدیث کی رفتار بتا رہی ہے کہ حضورؐ نے عورتوں کے لئے راہ نکال دی بغیر شوہر والی بغیر بیوی والے سے زنا کرے لفظ بکر عورت کو شامل نہیں ہے یہ بات غلط ہے (اول تو یہ کہ اسی حدیث میں اَلْبِکْرُ بِالْبِکْرِ فرمایا ہے اول بکر سے مرد اور دوسرے بکر

سے عورت مراد ہے یا برعکس دوسرے یہ کہ) حضور صلعم نے فرمایا بکر سے نکاح کی اجازت لی جائے (اس حدیث میں بھی بکر سے مراد دوشیزہ عورت ہی ہے) اس کے علاوہ حضرت زید بن خالدؓ کی روایت میں جو من زنی کا لفظ آیا ہے وہ مرد اور عورت دونوں کو شامل ہے۔

امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا یہ حدیث آحاد ہے اور حدیث آحاد سے کتاب اللہ کے حکم پر زیادتی جائز نہیں (کتاب اللہ میں صرف سو کوڑے مارنے کا حکم ہے اور حدیث میں جلاوطن کردینے کا بھی ذکر ہے لہٰذا حدیث آحاد سے قرآنی حکم پر زیادتی نہیں ہوسکتی) سورۂ نور میں انشاء اللہ اس کی مزید تنقیح آئے گی۔

مسئلہ :۔ شادی شدہ ہو یا نا کتخدا، غلام ہو یا باندی اس کی سزا چاروں اماموں کے نزدیک بالاتفاق پچاس کوڑے ہے۔ باندی کی یہ سزا تو عبارت النص سے معلوم ہی ہورہی ہے (کہ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ فرمایا ہے یعنی آزاد عورتوں کی سزا کا نصف) اور غلام کی یہ سزا دلالت نص سے بطریق مساوات ثابت ہوگی۔ مملوک (باندی ہو یا غلام) کو جلاوطنی کی سزا کسی امام کے نزدیک نہیں دی جائے گی صرف امام شافعی کا ایک قول آیا ہے کہ چھ ماہ کے لئے مملوک کو دیس بدر کردیا جائے۔

ابو ثورؒ کا قول ہے کہ شادی شدہ مملوک کو سنگسار کردیا جائے مگر آیت مذکور ابو ثور کے قول کی تردید کررہی ہے سنگساری کی سزا کو آدھا کرنا ممکن ہے اور آیت میں مملوک کی سزا آدھی قرار دی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ مجاہدؒ اور سعیدؒ بن جبیر کے نزدیک نا کتخدا باندی اور غلام کے زناء کی کوئی شرعی حد نہیں ہے کیونکہ آیت میں سزا کے لئے احصان کی شرط لگائی ہے جس سے سمجھا جاتا ہے کہ غیر محصن کی کوئی سزا نہیں۔

امام اعظمؒ کے نزدیک تو مفہوم شرط (ترتب) حکم کے لئے) معتبر ہی نہیں باقی تینوں امام اگرچہ مفہوم شرط کا اعتبار کرتے ہیں مگر ان کے نزدیک اس آیت میں شرط کا کوئی مفہوم (مخالف) ہی نہیں ہے بلکہ اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ باندی غلام خواہ محصن ہی ہو اس کو سنگسار نہیں کیا جائے گا اس کی سزا صرف تازیانہ ہے (اور وہ بھی نصف) حر کا حکم اس کے خلاف ہے (محصن حر کی سزا رجم اور غیر محصن کی تازیانہ) اس کا حکم رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کسی کی باندی ارتکاب زنا (پہلی مرتبہ) کرے اور زنا کھل جائے تو اس کو تازیانہ کی سزا دے اور لعنت ملامت نہ کرے پھر (دوبارہ) زنا کرے اور اس کا زنا کھل جائے تب بھی کوڑے مارے اور تثریب نہ کرے اس کے بعد (تیسری بار) زناء کرے اور اس کا زنا ثابت ہوجائے تو اس کو بیچ ڈالے خواہ بالوں کی رسی کے عوض ہی ہو۔ رواہ البخاری و مسلم من حدیث ابی ہریرہؓ اس حدیث میں لفظ امۃ دائرہ شرط میں آیا ہے جو مفید عموم ہے اجماع کا یہی فیصلہ ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا لوگو! اپنی باندی غلاموں پر حد شرعی قائم کرو۔ کتخدا ہوں یا نا کتخدا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی ایک باندی نے زنا کیا تھا تو حضور صلعم نے مجھے حکم دیا کہ اس کے کوڑے ماروں، مگر مجھے معلوم ہوا کہ اس کے حال ہی میں بچہ پیدا ہوا ہے اس لئے مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر اس وقت میں اس کے کوڑے ماروں گا تو یہ مرجائے گی۔ اس لئے کوڑے نہیں مارے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اس کا تذکرہ کیا آپ نے فرمایا تم نے اچھا کیا۔ رواہ مسلم۔

حضرت عبداللہ بن عیاشؓ بن ابی ربیعہ کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے اور کچھ قریشی جوانوں کو حکم دیا کہ حکومت کی چند باندیوں کو زنا کی سزا میں پچاس پچاس کوڑے ماریں۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۚ قانون سزا کا یہ اجرا تم میں سے ان لوگوں کی وجہ سے ہے جو چوٹ کے دکھ سے ڈرتے ہوں۔ تاکہ تم زنا کے قریب بھی نہ جاؤ (اور مار کھانے سے ڈرتے رہو)۔

وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ اور شہوت رانی اور زناء سے رکا رہنا ہی تمہارے لئے بہتر ہے آخرت میں بھی اور دنیا میں بھی۔

اکثر اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ ذلک سے اشارہ باندیوں سے نکاح کرنے کی طرف ہے یعنی جن لوگوں کو زنا میں پڑجانے

کا اندیشہ ہو ان کے لئے باندیوں سے نکاح جائز ہے۔ کیونکہ زنا موجب مصیبت ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی (اس صورت میں عنت بول کر زناء مراد ہوگا کیونکہ زنا عنت کا سبب ہے) اور باندیوں کے نکاح سے بچا رہنا بشرطیکہ پاکدامنی ہاتھ سے جانے کا اندیشہ نہ ہو زیادہ بہتر ہے تاکہ اولاد غلام نہ پیدا ہو اور فعل مکروہ کا ارتکاب نہ کرنا پڑے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آزاد عورتیں گھر کی درستی اور باندیاں گھر کی تباہی (کا سبب ہیں یہ حدیث حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے دیلمی نے مسند الفردوس میں اور ثعلبی نے بیان کی ہے لیکن تحریر میں اس کو ضعیف کہا ہے میں کہتا ہوں گھر کی تباہی اس طرح ہوگی کہ باندیوں کی اولاد باندیوں کے آقاؤں کی غلام ہوگی اور باپ کا گھر ان سے خالی رہے گا یہ تفسیر آئندہ آیت کے مناسب ہے۔

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾ یعنی جو شخص باندیوں سے نکاح کے بغیر نہ رہ سکے تو اللہ اس کو معاف کرنے والا ہے اور رحمت والا ہے کہ اس کو باندیوں سے نکاح کرنے کی اجازت دیدی ہے۔

یہ تفسیر امام شافعیؒ اور امام مالک کے قول کو ثابت کر رہی ہے کہ باندیوں سے نکاح صرف انہی لوگوں کے ہے جن کو زنا میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو کیونکہ لمن میں لام اختصاص کے لئے ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ یہی قول حضرت جابرؓ کا ہے اور طاؤس اور عمرو بن دینار بھی اسی کے قائل تھے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک باندی سے نکاح کے جواز کی یہ شرط نہیں ہے کہ عدم نکاح کی صورت میں زنا میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو ہاں بتقاضائے آیت امام صاحب کے نزدیک بے ضرورت باندیوں سے نکاح مکروہ ضرور ہے۔

فائدہ :۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے فرمایا کہ باندی سے نکاح مشروط ہے اول شرط یہ کہ حرہ سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ ہو۔ دوئم یہ کہ باندی مسلمان ہو پھر اس کے نتیجہ میں اولاد غلام پیدا ہوتی ہے۔ بدرجہ مجبوری صرف ضرورت کے تحت شریعت نے اس کی اجازت دی ہے اور چونکہ ایک سے ضرورت پوری ہو جاتی ہے اس لئے ایک سے زائد سے نکاح کرنا حر کے لئے جائز نہیں۔

امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا باندی سے نکاح کا جواز عمومی ہے باندی مسلمان ہو اہل کتاب میں سے ہو حرہ سے نکاح کرنے کی استطاعت ہو یا نہ ہو بہر حال جائز ہے صرف ضرورت پوری کرنے کے لئے ہی نہیں ہے اگرچہ بے ضرورت مکروہ ہے (مگر جائز ہے) کیونکہ آیت وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اور فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ کا حکم مطلق ہے (اس میں کوئی قید یا شرط نہیں) اگر حر کے لئے باندی سے نکاح کے عدم جواز کی علت اس بات کو قرار دیا جائے کہ اولاد غلام پیدا ہوگی (اور حر کی اولاد کا غلام ہونا لازم آئے گا) تو پھر غلام کے لئے بھی باندی سے نکاح کرنا ناجائز ہونا چاہئے جب کہ اس کو حرہ سے نکاح کرنے کی استطاعت ہو حالانکہ اس کا قائل کوئی نہیں۔ اس کے علاوہ غلام کے لئے تو دو باندیوں سے نکاح کرنا آپ کے نزدیک بھی جائز ہے پھر حر کے لئے تو بدرجہ اولیٰ یہ جواز ہونا چاہئے کیونکہ حر کے لئے چار عورتوں سے نکاح جائز ہے اور غلام کے لئے صرف دو سے۔ اول حکم قرآن میں آیا ہے اور دوسرا احادیث سے ثابت ہے۔ مزید یہ کہ چار عورتوں سے حر کے نکاح کا جواز مطلق ہے حرہ عورتوں سے ہو یا باندیوں سے صرف حرہ عورتوں کے ساتھ اس نکاح کو مقید رکھنا جائز نہیں۔ امام مالکؒ کے نزدیک بھی حر کے لئے چار عورتوں سے نکاح جائز ہے خواہ وہ آزاد ہوں یا باندیاں (یا مخلوط)۔

مسئلہ :۔ تین اماموں کے نزدیک حرہ پر باندی سے نکاح درست نہیں (خواہ رضامندی ہو) صرف امام مالکؒ قائل ہیں کہ اگر حرہ رضامند ہو تو اس کے اوپر باندی سے نکاح کیا جا سکتا ہے ورنہ آپ کے نزدیک بھی جائز نہیں۔ حرہ سے باندی پر نکاح کرنا بالاتفاق جائز ہے۔ ائمہ ثلثہ کہتے ہیں کہ آیت فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا کا مفہوم بتا رہا ہے کہ حرہ پر باندی سے نکاح ناجائز ہے کیونکہ جس کے نکاح میں حرہ ہوگی اس کو یقیناً حرہ کی استطاعت ہوگی لہٰذا جبر ہو یا غلام اور حرہ رضامند ہو یا ناراض کسی صورت میں حرہ پر باندی سے نکاح جائز نہیں ہو سکتا۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے حرہ پر باندی سے نکاح کے عدم جواز کی دلیل میں یہ حدیث بھی بیان کی ہے کہ اصحابؓ

سنن نے سعید بن منصور کی اسناد سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حرہ پر باندی سے نکاح کی ممانعت فرمائی ہے اور فرمایا ہے کہ باندی پر حرہ سے نکاح کیا جاسکتا ہے بیہقی اور طبری نے حسنؒ بصری تک سند کا اتصال کر کے اس حدیث کو لکھا ہے البتہ عامر احول کی روایت کو غریب قرار دیا ہے بلکہ عمرو بن عبید عن الحسن معروف سند ہے
حافظ نے سعیدؒ بن منصور کی روایت کو مبہم کہا ہے (کیونکہ سعیدؒ نے ابن علیہ کا قول نقل کیا ہے اور ابن علیہ نے اپنے اور حسنؒ بصری کے درمیان کے راوی کا نام نہیں بتایا صرف اتنا کہا کہ مجھ سے ایسے شخص نے بیان کیا جس نے خود حسنؒ بصری سے سنا تھا) عبدالرزاق نے یہ حدیث حسنؒ کی روایت سے مرسلاً بیان کی ہے ابن ابی شیبہؒ نے اس کو مرسلاً بیان کیا ہے۔ ہمارے نزدیک حدیث مرسل حجت ہے اور شافعیؒ کے نزدیک بھی حدیث مرسل قابل استدلال ہے بشرطیکہ اس کی تائید صحابہؓ کے اقوال سے ہو رہی ہو اور اس حدیث کو صحابہؓ کی تائید حاصل ہے۔
ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے حضرت علیؓ کا قول موقوفاً بیان کیا ہے کہ حرہ کے اوپر باندی سے نکاح کرنا مناسب نہیں دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حرہ کے اوپر باندی سے نکاح نہ کیا جائے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول بھی اسی طرح منقول ہے۔ عبدالرزاق نے ابوالزبیر کے طریق سے بیان کیا ہے کہ حضرت جابرؓ فرما رہے تھے کہ حرہ کے اوپر باندی سے نکاح نہ کیا جائے اور باندی پر حرہ سے نکاح کیا جاسکتا ہے بیہقی نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے بیہقی کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ جس میں حرہ کے مہر کی استطاعت ہو وہ باندی سے کبھی نکاح نہ کرے اس کی اسناد صحیح ہے۔
ابن ابی شیبہ نے سعید بن مسیب کا قول نقل کیا ہے کہ باندی کے اوپر حرہ سے نکاح کر اور حرہ پر باندی سے نکاح نہ کر۔
اس موضوع پر حضرت عائشہؓ کی روایت سے بھی حدیث آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ غلام کی طلاق دو بار ہے۔ اس کے آخر میں حضورؐ نے فرمایا باندی کے اوپر حرہ سے نکاح کیا جاسکتا ہے اور حرہ کے اوپر باندی سے نہیں کیا جاسکتا۔ رواہ الدار قطنی۔ اس کی سند میں ایک راوی مظاہر بن اسلم ضعیف ہے۔
امام ابو حنیفہؒ کتاب کی تخصیص اخبار آحاد سے جائز نہیں قرار دیتے مگر اس جگہ یہ تخصیص لازم آ رہی ہے کیونکہ آیت وَاُحِلَّ لَکُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمۡ کا حکم عام ہے (اور احادیث میں حرہ پر باندی سے نکاح کی ممانعت کر دی گئی ہے تو آیت کا حکم عام نہیں رہا) اس اعتراض کو دور کرنے کے لئے یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ حدیث اگرچہ خبر آحاد ہے مگر اس کی تائید اجماع سے ہو گئی ہے (اور اجماع سے کتاب کی تخصیص جائز ہے)۔
امام شافعیؒ کے نزدیک غلام کے لئے حرہ پر باندی سے نکاح جائز ہے لیکن امام اعظمؒ اور دوسرے آئمہ کے نزدیک جائز نہیں کیونکہ احادیث مرسلہ ممانعت کی عام ہیں۔ پھر مفہوم مخالف سے استدلال کو درست قرار دینے والے آئمہ کے نزدیک مفہوم مخالف سے عدم جواز کا استنباط عام ہے غلام کے لئے بھی ہے، واللہ اعلم۔
یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُبَیِّنَ لَکُمۡ اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لئے کھول کر بیان کر دے یعنی تمہارے دین کے احکام اور مصالح، لام تاکید استقبال یا تعلیل کے لئے ہے۔
وَیَہۡدِیَکُمۡ سُنَنَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ اور تم سے اگلے (ایماندار) لوگوں کے طریقے تم کو بھی بتا دے۔ اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ گذشتہ شریعتوں کے احکام اگر وہ ہماری شریعت میں منسوخ نہ ہو گئے ہوں ہمارے لئے بھی باقی ہیں اور کتاب اللہ یا سنت سے اگر ان کا ثبوت ہو رہا ہو تو ان کی تعمیل ہم پر بھی واجب ہے۔ ہاں یہودی روایات کا اعتبار نہیں، کیونکہ یہودی کافر ہیں اور نا قابل اعتماد۔ البتہ اگر حضرت عبداللہ بن سلام اور حضرت کعب احبار جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم مسلمان ہونے کی حالت میں اسرائیلی ولیات نقل کریں تو قابل اعتماد ہیں۔
وَیَتُوۡبَ عَلَیۡکُمۡ اور تم پر رحمت کے ساتھ توجہ کرے یعنی بیان احکام سے پہلے جو گناہ تم کر چکے ہو ان کو معاف کر دے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ تم کو توبہ کرنے کی توفیق دینا چاہتا ہے یا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم ایسے کام کر لو

جن سے تمہارے گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٦﴾ اور اللہ مصالح احکام سے خوب واقف ہے اور اس کے احکام پر حکمت ہیں۔

وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ اور اللہ تم کو نیک اعمال کی توفیق دینا چاہتا ہے۔ تاکید اور مضمون کو پختہ کرنے کے لئے دوبارہ آیت کو ذکر کیا۔

وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اور چاہتے ہیں وہ لوگ جو خواہشات پر چلتے ہیں یعنی شریعت کے نافرمان ہوتے ہیں لیکن اگر شریعت کے موافق خواہشات پوری کی جائیں تو یہ اتباع شریعت ہے اتباع شہوات نہیں ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ ان خواہش پرستوں سے زناکار لوگ مراد ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک مجوسی مراد ہیں کیونکہ وہی تمام محرم عورتوں کو حلال جانتے ہیں۔ بعض نے یہودی مراد لئے ہیں کیونکہ یہودیوں کے نزدیک علاتی بہنیں اور بھتیجیاں بھانجیاں حلال ہیں۔

اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿٢٧﴾ کہ تم حق سے کامل طور پر پھر جاؤ یعنی حرام کو حلال سمجھنے لگو کیونکہ حرمت عقیدہ رکھتے ہوئے گناہ کرنے سے حرام کو حلال سمجھ کر اختیار کرنا بڑا جرم اور باطل کی طرف زیادہ میلان ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ اللہ تمہارا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہے، اسی لئے اس نے آسان لیکن برحق شریعت تمہارے لئے مقرر کی ہے اور گزشتہ قوموں کیلئے جو چیزیں حرام تھیں ان میں سے کچھ تمہارے لئے حلال کر دی ہیں۔ ابن ابی شیبہؒ نے المصنف میں اور ابن المنذرؒ نے تفسیر میں مجاہدؒ کا قول نقل کیا ہے کہ جو سہولتیں اللہ نے اس امت کو عنایت فرمائی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اللہ نے باندیوں سے اور عیسائی و یہودی عورتوں سے مسلمان کا نکاح جائز قرار دیا ہے۔ تفسیر مدارک میں مذکور ہے کہ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔

وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿٢٨﴾ اور انسان پیدائشی کمزور ہے نہ خواہشات سے رک سکتا ہے نہ طاعات کی تکلیف اٹھا سکتا ہے اور جتنا قرب قیامت ہوتا جاتا ہے اتنا ہی اس کا ضعف بڑھتا جاتا ہے اسی لئے اللہ نے اس امت پر زیادہ بار نہیں ڈالا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ اے ایمان والو، آپس میں ایک دوسرے کے مال نہ کھاؤ یعنی کوئی کسی کا مال نہ کھائے نہ مسلمان مسلمان کا نہ ذمی کافر کا۔ حربی کافر جس سے کوئی معاہدہ نہ ہو اس کا مال بلا غدر کھانا ممنوع نہیں ہے۔

بِالْبَاطِلِ باطل طور سے یعنی اس طریقہ سے جو شرعاً ممنوع ہے جیسے غصب، چوری، خیانت، جواء سود اور تمام ناجائز عقود۔

اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً مگر یہ کہ کھانے کا ذریعہ تجارت ہو (یعنی اگر جائز تجارت ہو تو ایک کا مال دوسرے کے لئے ممنوع نہیں ہے) تجارةً کوفیوں کی قرات میں آیا ہے (اور یہی قرات مشہور ہے) باقی اہل قرات نے تجارۃٌ پڑھا ہے اس صورت میں تکون تامہ ہوگا اور تجارۃٌ اس کا فاعل ہوگا یعنی کھاؤ جبکہ تجارت ہو۔

عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ آپس کی رضامندی سے رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا بیع صرف آپس کی رضامندی سے ہوتی ہے۔ یہ حدیث حضرت ابو سعیدؓ خدری کی روایت سے ابن ماجہ اور ابن المنذر نے بیان کی ہے یعنی لوال اور بکوال دونوں کی رضامندی ضروری ہے بیع کا معنی ہے مال کا مال سے تبادلہ خواہ زبانی الفاظ سے ہو یا (بغیر الفاظ) استعمال کئے صرف لین دین سے اور اجارہ کا معنی ہے مال کے عوض مقررہ منافع کو لینا (ایک کا مال دوسرے کے لئے حلال ہونے کے تو اور طریقے بھی ہیں جیسے ہبہ میراث اجارہ وغیرہ) پھر خصوصیت کے ساتھ صرف تجارت کا ذکر اس وجہ سے ہے کہ عموماً (روزمرہ) تجارت ہی سے ایک کا مال دوسرے کے پاس پہنچتا ہے اور تجارت ہی حصول مال کا سب سے پاکیزہ ذریعہ ہے۔[1]

[1] اصبہانی نے حضرت ابو امامہ کی مرفوع روایت بیان کی ہے کہ تاجر میں اگر چار باتیں ہوں تو اس کی کمائی پاک ہوتی ہے، خریدتے وقت (مبیع کی) برائی نہ کرے، بیچتے وقت (مبیع کی) تعریف نہ کرے، بیع میں فریب سے کام نہ لے، دوران خرید و فروخت میں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت رافع بن خدیج نے فرمایا عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ پاکیزہ کمائی کون سی ہے فرمایا اپنے ہاتھ کی کمائی اور پاک بیع۔ رواہ احمد حضرت مقدام بن معدی کرب راوی ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا اپنی ہاتھ کی کمائی سے بہتر کبھی کسی نے کوئی کھانا نہیں کھایا اللہ کے نبی داؤد بھی اپنے ہاتھوں کی کمائی کھاتے تھے۔ رواہ البخاری۔ حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم جو کچھ کھاتے ہو اس میں پاکیزہ ترین وہ ہے جو تمہارے ہاتھوں کی کمائی ہو اور تمہاری اولاد (کی کمائی) بھی تمہاری کمائی ہے۔ رواہ الترمذی وابن ماجہ۔

اس آیت سے تجارت کے علاوہ دوسرے مالی ذرائع جیسے مہر خیرات اور عاریت وغیرہ کی حرمت پر استدلال نہیں کیا جاسکتا کیونکہ حصول مال کے یہ ذرائع باطل نہیں ہیں بلکہ شرعی صراحتوں سے ثابت ہیں۔

حنفیہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ مجلس عقد میں ایجاب و قبول کے بعد موال اور بکوال کسی کو اختیار فسخ نہیں رہتا، خواہ کوئی بھی اپنی جگہ سے ہٹا نہ ہو۔ امام مالکؒ کا بھی یہی قول ہے وجہ استدلال یہ ہے کہ باہمی رضامندی سے خرید و فروخت کے بعد خواہ اس جگہ سے دونوں میں سے کوئی بھی نہ ہٹے لیکن مبیع اور ثمن میں تصرف کامل کا حق ہو جاتا ہے اور تصرف کامل کا اختیار بیع کے ختم ہونے پر دلالت کرتا ہے اور ختم بیع بتارہا ہے کہ دونوں میں سے کسی کو فسخ کا اختیار نہیں رہا۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ ایجاب و قبول کے بعد بھی تفرق مجلس سے پہلے دونوں کو اختیار فسخ دیتے ہیں کیونکہ حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیع و شراء کرنے والوں میں سے ہر ایک کو دوسرے کے خلاف اختیار (فسخ) ہے جب تک دونوں میں تفرق (جدائی) نہ ہو جائے۔ متفق علیہ۔

حضرت حکیم بن حزام راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خرید و فروخت کرنے والے مختار ہیں جب تک دونوں متفرق نہ ہو جائیں اگر دونوں سچ بولیں گے اور (اپنی اپنی چیزوں کے عیوب) کھول کر بیان کردیں گے تو دونوں کو اس تجارت میں برکت حاصل ہوگی۔ اگر جھوٹ بولیں گے اور چھپائیں گے تو تجارت کی برکت برباد ہو جائے گی متفق علیہ۔ حنفیہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ تقاضائے کتاب اللہ کے خلاف احادیث پر عمل جائز نہیں اور کتاب کا اقتضاء ہے کہ ایجاب و قبول کے بعد دونوں میں سے کسی کو اختیار نہیں رہتا۔ رہا احادیث مذکورہ کا مضمون بتارہا ہے کہ اختیار سے مراد اختیار قبول ہے کیونکہ لفظ متبایعان (اور بیعان) خود اسی طرف اشارہ کررہا ہے بیع اور شراء میں مشغول ہونے کی حالت میں ہی (حقیقتاً) ہم ان پر متبایعان (خرید و فروخت کرنے والے) کا اطلاق کرسکتے ہیں عقد کے ختم ہونے کے بعد تو نہ کوئی بیع میں مشغول رہتا ہے نہ شراء میں (ہاں مجازاً ان کو متبایعان کہہ سکتے ہیں لیکن مجازی معنی کی طرف رجوع کرنے کے لئے کوئی قرینہ یا ضرورت ہونی چاہئے جو یہاں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱) قسمیں نہ کھائے، امام احمدؒ اور حاکمؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن شبل نے بیان کیا میں نے خود سنا رسول اللہؐ فرما رہے تھے تاجر ہی فاجر ہیں صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا اللہ نے بیع کو حلال نہیں کیا ہے فرمایا حلال کیوں نہیں کیا ہے مگر تاجر (بیچتے وقت) قسمیں کھاتے ہی اور گناہ گار ہو جاتے ہیں باتیں کرتے ہیں تو جھوٹی کرتے ہیں، حاکم نے حضرت رفاعہ بن رافع کی روایت بیان کیا ہے اور اس کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا تاجروں کو قیمت کے دن بدکاروں (کے گروہ) میں اٹھایا جائے گا سوائے ان لوگوں کے جو اللہ سے ڈرتے ہوں اور نیکی کرتے ہوں اور (بیع کے وقت) سچ بولتے ہوں، ترمذی اور حاکم نے بیان کیا اور ترمذی نے اس کو حسن کہا کہ حضرت ابو سعید خدری نے فرمایا کیا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے سچا امانتدار تاجر انبیاء اور صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا، ابن ماجہ اور حاکم نے حضرت ابن عمرؓ کی مرفوع روایت بیان کی کہ سچا امانتدار مسلمان تاجر قیامت کے دن شہیدوں کے ساتھ ہوگا، طبرانی نے حضرت صفوانؓ بن امیہ کی مرفوع روایت بیان کی ہے کہ اللہ کی مدد خوش اعمال تاجروں کے ساتھ ہوتی ہے، اصبہانی نے حضرت انسؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ سچا تاجر قیامت کے دن عرش کے سایہ میں ہوگا، اصبہانی نے حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، پاکیزہ ترین کمائی ان تاجروں کی ہے کہ جب بات کرتے ہیں تو جھوٹی نہیں کرتے ہیں کوئی وعدہ کرتے ہیں تو اس کے خلاف نہیں کرتے جب ان کے پاس امانت رکھی جاتی ہے تو خیانت نہیں کرتے خریدتے وقت (بیع کی) برائی نہیں کرتے اور بیچتے وقت تعریف کرتے اگر ان پر قرض ہو تو ادائیگی کو ٹالتے نہیں اور ان کا کسی پر قرض ہو تو عار نہیں دلاتے۔ ۱۲،

مفقود ہے) یا کم سے کم یوں کہہ سکتے ہیں کہ متبایعان سے مراد دونوں معنی لے سکتے ہیں حالت عقد اور بعد از عقد دونوں صورتوں میں لوال اور بکوال پر اس لفظ کا اطلاق ہو سکتا ہے لہٰذا آیت سے احادیث کو موافق بنانے کے لئے اول معنی مراد لیا جائے گا۔ باقی احادیث میں جو تفرق کا لفظ آیا ہے اس سے مراد قولی ردوبدل ہے (جسمانی طور پر جدا جدا ہو جانا مراد نہیں ہے) کذا فی الہدایۃ۔

ابن ہمام نے لکھا ہے کہ قولی پر اطلاق شرع اور عرف میں بکثرت ہوتا ہے اللہ نے فرمایا ہے وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ اہل کتاب نے اسی وقت اختلاف کیا جب ان کے پاس کھلی ہوئی آیات آگئیں۔

میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ مجلس سے جدا ہونے سے پہلے ہی بیع کی تکمیل اور مبیع و ثمن میں تصرف کرنے کے جواز پر آیت ضرور دلالت کر رہی ہے مگر حق فسخ کی نفی پر دلالت نہیں کر رہی ہے اس لئے بہتر یہ ہے کہ جس طرح امام اعظمؒ کے نزدیک تکمیل بیع کے بعد بھی خیار روایت اور خیار عیب ثابت رہتا ہے اسی طرح تکمیل بیع کے بعد مجلس سے جدا ہونے سے پہلے خیار مجلس ہونے کا اقرار کیا جائے تاکہ صحیح حدیث پر عمل ترک نہ ہونے پائے۔ باقی احناف کا یہ قول کہ متبایعان اسی وقت تک رہتے ہیں جب تک خرید و فروخت میں مشغول رہیں تکمیل عقد کے بعد ان کو متبایعان حقیقتاً نہیں کہا جا سکتا یہ بات غلط ہے کیونکہ فریق ثانی کے قبول کرنے سے پہلے تو فریق اول کو بائع کہا جاتا ہے ایجاب کے بعد قبول سے پہلے متبایعان نہیں کہا جاتا ہاں ایجاب و قبول کے بعد جب عقد تمام ہو جاتا ہے اور مجلس عقد باقی رہتی ہے اس وقت تک عرفاً اور شرعاً مشغولیت عقد کی حالت ہی قرار دیا جاتا ہے کیونکہ مجلس عقد کے پورے اوقات ایک ہی ساعت کے حکم میں ہوتے ہیں لہٰذا جب تک مجلس عقد باقی ہے لوال اور بکوال کو حقیقتاً متبایعان کہا جاتا ہے (خواہ تکمیل عقد پہلے ہو چکی ہو) پھر تفرق سے مراد قولی ردوبدل ہونا ایک مجازی معنی ہے اور جب حقیقت متعذر نہیں ہے تو مجاز کی طرف رجوع کرنا کیا معنی رکھتا ہے علاوہ ازیں بعض احادیث کے الفاظ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تفرق سے تفرق جسمانی اور تفرقہ مجلس ہی مراد ہے۔ مسلم نے حضرت ابن عمرؓ کے روایت کردہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ جب دو باہم خرید و فروخت کرنے والوں نے خرید و فروخت کی ہو تو جب تک دونوں جدا نہ ہوں بیع کے متعلق دونوں میں سے ہر ایک با اختیار ہے (چاہے فسخ کر دے یا قائم رکھے) اس حدیث میں لفظ تو بتا رہا ہے کہ خرید و فروخت کے بعد بھی ہر ایک کو اختیار رہتا ہے (یعنی نا تعقیب کے لئے ہے)۔

دوسری روایت عمرو بن شعیبؒ کے دادا کی بایں الفاظ ہے خرید و فروخت کرنے والے جب تک جدا نہ ہوں با اختیار ہیں سوائے اس کے کہ عقد خیار (خیار رویت خیار عیب وغیرہ) ہو (تو جدا ہو جانے کے بعد بھی صاحب اختیار کو مدت معینہ کے اندر اختیار فسخ رہتا ہے) اور کسی کیلئے جائز نہیں کہ دوسرے ساتھی (بائع یا مشتری) سے اس اندیشہ کی وجہ سے الگ ہو جائے کہ کہیں وہ بیع کو فسخ کر دے (یعنی عقد ہوتے ہی اس جگہ سے اندیشۂ فسخ کے پیش نظر ہٹ جانا جائز نہیں) رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بغیر باہمی رضامندی کے دونوں (عقد کرکے) جدا نہ ہوں۔ رواہ ابوداؤد۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک اعرابی کو (مجلس کے اندر) بیع کے بعد (بھی فسخ کرنے کا) اختیار دیا تھا۔ رواہ الترمذی وقال صحیح غریب یہ احادیث صراحۃً بتا رہی ہیں کہ تکمیل بیع کے بعد بھی اس جگہ سے جدا ہونے کے پہلے فسخ بیع جائز ہے، واللہ اعلم۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اور تم خودکشی نہ کرو یعنی تم میں سے کوئی اپنے کو خود قتل نہ کرے۔ حضرت ثابت بن ضحاکؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص دنیا میں کسی چیز سے خودکشی کرے گا قیامت کے دن اسی چیز کے ذریعہ سے اس کو عذاب دیا جائے گا۔ رواہ البغوی من طریق الشافعی۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص پہاڑ سے گر کر خودکشی کرے گا وہ جہنم کی آگ میں جائے گا ہمیشہ ہمیشہ دوامی طور پر دوزخ میں لڑھکتا ہی چلا جائے گا اور جو شخص کسی لوہے سے خودکشی کرے گا وہ وہی لوہا ہاتھ میں

لئے دوزخ کے اندر ہمیشہ ہمیشہ دوامی طور پر اپنے کو مارتا ہی رہے گا۔ الفاظ کی کچھ تقدیم تاخیر کے ساتھ بخاری اور مسلمؒ اور ترمذیؒ نے یہ حدیث نقل کی ہے اور نسائیؒ نے بھی اس کو بیان کیا ہے۔ ابو داؤدؒ کی روایت میں آیا ہے جس نے زہر ڈکار اوہ جہنم کی آگ میں زہر ہاتھ میں لئے زہر ڈکارتا رہے گا۔ حضرت جندبؓ بن عبداللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا گزشتہ اقوام میں سے ایک آدمی کے اعضاء پر زخم ہو گیا اس سے برداشت نہ ہو سکا اور چھری نکال کر اس نے خود اپنا ہاتھ کاٹ ڈالا آخر مرتے دم تک خون نہ رکا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے بندہ نے جان دینے میں جلدی کی میں نے اس پر جنت حرام کردی، رواہ البغوی۔

ابو داؤد، ابن حبان اور حاکم نے صحیح میں لکھا ہے کہ عمرو بن عاصؓ نے خوف سردی کی وجہ سے تیمم کے جواز میں اسی آیت سے استدلال کیا اور رسول اللہ ﷺ نے تردید نہیں فرمائی۔ عمرو بن عاص کا بیان ہے ایک سرد رات میں مجھے احتلام ہو گیا اس وقت میں ذات السلاسل کے جہاد پر تھا مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں نے غسل کیا تو مر جاؤں گا اس لئے میں نے تیمم کر کے نماز پڑھ لی اس کا تذکرہ جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے ہوا تو آپ نے فرمایا عمروؓ تو نے جنابت کی حالت میں ساتھیوں کو نماز پڑھا دی میں نے عرض کیا (یا رسول اللہ ﷺ) اللہ نے فرمایا ہے وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ حضورؐ میرا جواب سن کر ہنس دیئے اور کچھ نہیں فرمایا۔ حسن، عکرمہ، عطاء بن ابی رباح اور سدی کے نزدیک آیت مذکورہ کا معنی یہ ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرو جیسے دوسری آیت میں آیا ہے ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ (پھر تم وہی لوگ ہو کہ باہم ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو) یعنی اپنے دینی بھائیوں کو قتل نہ کرو مسلمان کو (بلاقصور) قتل کرنا شرک کے علاوہ سب سے بڑا گناہ ہے۔ حضرت جریرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا میں لوگوں کو سنا دینا چاہتا ہوں (لوگ کان لگا کر سن لیں) میرے بعد تم لوگ لوٹ کر (عملاً) کافر نہ ہو جانا کہ باہم ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔ رواہ البخاری [1]

بعض علماء نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے ناجائز طور سے مال کھا کے اپنی جانوں کو ہلاک نہ کرو اس تفسیر کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ ناجائز طریقے سے مال کھانا کھانے والے کو ہلاک کر دینے والا ہے آخرت میں دوزخ میں لے جائے گا۔ دوئم یہ کہ کسی کا ناجائز طور پر مال کھانا اس کی ہلاکت کا سبب ہے (وہ غریب تباہ ہو جائے گا)۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝۲۹ کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تم پر ہی مہربان ہے یعنی انتہائی رحمت کی وجہ سے ہی اس نے تم کو نیکیوں کا حکم دیا اور برائیوں سے روکا ہے۔

بعض علماء نے آیت کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کی توبہ قبول ہونے کی یہ شکل بتائی تھی کہ خود ایک دوسرے کو قتل کرے لیکن تم پر اللہ کی یہ رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لئے قبول توبہ کی یہ صورت نہیں قائم کی بلکہ ندامت اور استغفار ہی کو تمہاری توبہ قرار دے دیا۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ اور جو ایسا کریگا (یعنی ناحق کسی کا مال کھائے گا یا ناحق کسی کو قتل کریگا)۔

عُدْوَانًا قصداً دوسرے پر زیادتی کرنے کی وجہ سے

وَّظُلْمًا اور اپنی جان پر ظلم کرنے کی وجہ سے چونکہ کسی کا مال بغیر استحقاق کے کھانا اور کسی کو ناحق قتل کرنا موجب عذاب ہے اس لئے یہ فعل فی الحقیقت اپنے اوپر خود ظلم ہوگا۔ عدوان اور ظلم مصدر ہیں یا حال ہیں یا مفعول لہ (ہم نے

---

[1] عاصم بن بہدلہ کی روایت ہے کہ مسروق "صفین" میں گئے اور دونوں صفوں کے درمیان کھڑے ہو کر کہا لوگو متوجہ ہو کر سن لو بتاؤ اگر کوئی منادی آسمان سے تم کو پکارے اور تم اس کو دیکھ بھی رہے ہو اور اس کا کلام بھی سن رہے ہو اور وہ یہ کہے کہ جن حرکات میں تم مشغول ہو اللہ تم کو اس کی ممانعت فرماتا ہے تو کیا اپنی حرکات سے باز آجاؤ گے لوگوں نے جواب دیا سبحان اللہ (ضرور باز آجائیں گے) اس پر مسروق نے کہا تو خدا کی قسم جبرئیل محمد ﷺ پر یہی لے کر نازل ہوئے تھے کہ اللہ نے فرمایا ہے وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا، اور میری نظر میں آسمان سے نازل ہو کر رو در رو ہو کر کسی کا کچھ سنانا اور تمہارا اس سے سننا اس آیت کے نزول سے زیادہ کھلا ہوا (اور واجب العمل) نہیں ہے۔ (از مولف قدس سرہٗ)

دونوں جگہ مفعول لہ کا ترجمہ کیا ہے)۔

فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا ۭ تو ہم آخرت میں اس کو جہنم کی آگ میں داخل کریں گے۔

وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝ اور آگ میں داخل کرنا اللہ کے لئے سہل ہے جو شخص غیر کے مال کو ناجائز طور پر کھانا اور کسی کو ناحق قتل کرنا حلال سمجھتا ہے اس کے لئے یہ وعید دوامی عذاب کی ہے جس سے کبھی رہائی نہ ہو گی اور جو لوگ حلال نہیں سمجھتے مگر ارتکاب کرتے ہیں ان کے لئے (عذاب دائمی کی یہ وعید نہیں بلکہ) دوزخ کا مستحق بنانے کو ظاہر کر رہی ہے ہو سکتا ہے کہ اگر اللہ چاہے تو معاف فرمادے۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے بچے رہو گے جن کی تم کو ممانعت کی جا رہی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کبیرہ وہ گناہ ہے جس پر اللہ نے دوزخی ہونے کی یا (اپنے) ناراض ہونے کی یا لعنت کرنے کی یا عذاب کی مہر کر دی ہو ضحاک نے بھی اسی طرح فرمایا کبیرہ وہ گناہ ہے جس پر اللہ نے دنیا میں کسی سزا یا آخرت کے عذاب کی وعید دی ہو۔

میں کہتا ہوں کبائر کے تین درجات ہیں (ا) سب سے بڑا کبیرہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک سمجھنا۔ رسول اللہ ﷺ جو چیز لے کر آئے تھے اگر اس کا ثبوت قطعی دلیل سے ہو جائے تو اس کی تکذیب بھی شرک کے حکم میں داخل ہے (یعنی سب سے بڑا گناہ ہے) خواہ صراحت کے ساتھ تکذیب ہو اور کوئی تاویل (اسلام میں کھینچ کر لانے کی) نہ کی گئی تو اس کو کفر کہا جاتا ہے اور اگر (اسلام میں کھینچ کر لانے کی) کوئی توجیہ کی گئی ہو (مگر حقیقت میں وہ تکذیب رسول ہو) تو اس کو ہوا پرستی اور بدعت (قبیحہ) کہتے ہیں (یہ بھی کفر ہے دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت کفر التزامی یعنی قصد الکفر کی ہے اور دوسری صورت کفر لزومی کی۔ یعنی قائل نے التزام کفر نہیں کیا، نہ کفر کا وہ قائل ہے بلکہ اس کے قول پر تکذیب رسول اور کفر لازم آتا ہے رافضی، خارجی، قدریہ (انسان کو اپنے افعال و اعمال کا خالق قرار دینے والے جیسے جہمیہ اور معتزلہ) اور مجسمہ (اللہ کا جسم اور اعضاء ماننے والے) ان سب کے اقوال موخر الذکر شق میں داخل ہیں (یعنی عقائد و افکار کے اعتبار سے بدعتی اور ہوا پرست ہیں) اسی بنیاد پر حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا سب سے بڑا کبیرہ گناہ ہے اللہ کا ساجھی قرار دینا اور اللہ کے پوشیدہ عذاب سے بے خوف ہو جانا اور اللہ کی رحمت سے ناامید ہو جانا اور اللہ کے کرم سے نراس بن جانا۔

میں کہتا ہوں کہ اللہ نے فرمایا ہے اللہ کے پوشیدہ مواخذہ سے صرف گھاٹا اٹھانے والے ہی بے خوف ہوتے ہیں اور سوائے گمراہوں کے اپنے رب کی رحمت سے اور کوئی ناامید نہیں ہوتا، اللہ کی رحمت سے صرف کافر ہی نراس ہوتے ہیں۔[1]

کبیرہ کا دوسرا درجہ :۔ دوسری قسم کا کبیرہ وہ گناہ ہے جس سے اللہ کے بندوں کی جان یا مال یا آبرو کا نقصان ہو۔ سفیانؒ ثوری نے فرمایا کبائر وہ ہیں جن کی وجہ سے تمہارے اور اللہ کے بندوں کے درمیان حق تلفیاں ہوں باللہ کے حقوق تلف کرنے سے بھی بڑا گناہ ہے کیونکہ اللہ تو بڑا ہے اس (کی رحمت) سے ہر چیز چھوٹی ہے وہ سب گناہ معاف کر دے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے عرض کیا تھا اے اللہ! تیری مغفرت میرے گناہوں سے زیادہ سمائی والی ہے۔ اللہ نے خود فرمایا ہے وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (میری رحمت میں ہر چیز کی سمائی ہے)۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے پاس تین رجسٹر ہیں ایک رجسٹر (کے اندر درج شدہ لغزشوں) کی تو اللہ کو پرواہ نہیں۔ اور دوسرے رجسٹر (کے اندر درج شدہ گناہوں) میں سے اللہ کچھ نہیں چھوڑے گا۔ اور تیسرے دیوان (کے مندرجات) کو اللہ نہیں بخشے گا۔ ناقابل معافی رجسٹر تو شرک کا (رجسٹر) ہے اور جس رجسٹر کی اللہ کو

---

[1] بزار اور طبرانی نے اوسط میں حضرت بن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کبائر کیا ہیں فرمایا اللہ کا (ذات و صفات میں) ساجھی قرار دینا اور اللہ کی رحمت سے ناامید ہو جانا اور اللہ کی پوشیدہ گرفت سے بیباک بن جانا۔

پرواہ نہیں وہ اللہ کی حق تلفیوں کا رجسٹر ہے جیسے روزہ نہ رکھنا، نماز ترک کرنا۔ اللہ جس کو چاہے گا معاف کر دے گا اور درگزر فرمائے گا اور جس رجسٹر میں سے اللہ کچھ بھی ترک نہیں کرے گا۔ وہ بندوں کی باہمی حق تلفیوں کا رجسٹر ہے لامحالہ بدلہ دینا ہو گا (اگر بندہ خود اپنا حق معاف کر دے تو خیر) رواہ احمد والحاکم۔ طبرانی نے ایسی ہی حدیث حضرت سلمانؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کی ہے اور بزار نے حضرت انسؓ کی روایت سے بھی ایسا ہی نقل کیا ہے حضرت انس بن مالکؓ راوی ہیں کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا۔ قیامت کے دن ایک منادی عرش کے اندر سے ندا دے گا اے امت محمدؐ بلاشبہ اللہ نے سب مومن مردوں اور عورتوں کے سب گناہ معاف کر دیئے تم آپس میں اپنے حقوق بخش دو اور جنت میں میری رحمت سے داخل ہو جاؤ۔ رواہ البغوی حضرت ابوبکرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حجتہ الوداع میں قربانی کے دن دوران خطبہ میں فرمایا تمہارے خون تمہارے مال تمہاری آبروئیں باہم حرمت والی ہیں جیسے آج کا دن تمہارے اس شہر میں اس ماہ میں حرمت والا ہے (یعنی کسی کی جانی مالی اور عزت کی حق تلفی جائز نہیں جس طرح حرم کے اندر کسی قسم کا گناہ درست نہیں) رواہ البخاری و المسلم۔ ترمذی نے بھی یہ حدیث عمرو بن عاص کی روایت سے نقل کی ہے اور اس کو صحیح کہا ہے۔

اسامہ بن شریک کی روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب حج کرنے نکلا لوگ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کر رہے تھے کوئی کہتا تھا یا رسول اللہ میں نے طواف سے پہلے سعی کر لی کوئی کہتا تھا میں نے بعض چیزوں کو مقدم کر لیا کوئی کہتا تھا میں نے بعض چیزوں کو پیچھے کیا حضورؐ فرماتے جا رہے تھے کوئی حرج نہیں کوئی گناہ نہیں سوائے اس شخص کے جس نے ناحق کسی مسلمان کا مال کاٹا ہو یہی شخص گناہ میں پڑا اور تباہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ الَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ وَ اَعَدَّ لَہُمۡ عَذَابًا مُّہِیۡنًا ہ وَ الَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ بِغَیۡرِ مَا اکۡتَسَبُوۡا فَقَدِ احۡتَمَلُوۡا بُہۡتَانًا وَّ اِثۡمًا مُّبِیۡنًا جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کو اذیت دیتے (یعنی ناراض کرتے) ہیں دنیا اور آخرت میں ان پر اللہ کی پھٹکار ہو گی اور اللہ نے اس کے لئے ذلت آفریں عذاب تیار کر رکھا ہے اور جو لوگ مسلمان مردوں اور عورتوں کو بلاجرم کئے دکھ دیتے ہیں وہ لوگ اپنے اوپر بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔

اس آیت میں دونوں قسم کے کبائر کا بیان ہے (اول آیت میں) کفر کا اور (دوسری آیت میں) بندوں پر ظلم کا۔

آیت زیر تفسیر کو آیت یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَکُمۡ بَیۡنَکُمۡ بِالۡبَاطِلِ۔ وَ لَا تَقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ کے بعد ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ بندوں پر ظلم خواہ جانی ہو یا مالی بہر طور بزرگ ترین گناہوں میں سے ہے جن صحیح احادیث میں کبیرہ گناہوں کی گنتی آئی ہے ان میں بیشتر مظالم اور شرک کا ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت انسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کبیرہ گناہ ہے اللہ کا ساجھی بنانا اور ماں باپ کی نافرمانی کرنا اور کسی کو (ناحق) قتل کرنا اور دانستہ جھوٹی قسم کھانا جھوٹی قسم کا لفظ حضرت عبداللہؓ بن عمرو کی روایت سے بخاری نے ذکر کیا ہے اور حضرت انسؓ کی روایت میں جھوٹی قسم کی جگہ جھوٹی شہادت کا لفظ آیا ہے اس روایت کو شیخین نے بیان کیا ہے۔

ابن مردویہ نے حضرت انسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ کبائر سات ہیں (تین مذکورہ بالا اور ان میں) چار زیادہ بیان کئے ہیں کسی پاک دامن عورت پر زناء کی تہمت یتیم کا مال کھانا سود کھانا اور جہاد سے بروز مقابلہ فرار۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سات ہلاکت آفریں باتوں سے بچو صحابہؓ نے عرض کیا وہ کون سی ہیں فرمایا اللہ کا ساجھی بنانا، جادو، ناحق ایسے شخص کو قتل کرنا جس کو قتل کرنے سے اللہ نے منع کر دیا ہے، سود کھانا یتیم کا مال کھانا، جہاد کے دن بوقت مقابلہ پیٹھ دکھانا اور پاک دامن بھولی بھالی مومن عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا۔ رواہ البخاری و المسلم بن راہویہ کی روایت میں والدین کی نافرمانی اور کعبہ میں الحاد کا مزید ذکر ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کے نزدیک سب سے بڑا کون سا گناہ ہے

فرمایا کسی کو اللہ کا مثل قرار دینا حالانکہ اللہ نے ہی تجھے پیدا کیا ہے اس شخص نے عرض کیا اس کے بعد کون سا فرمایا اپنے بچہ کو اس اندیشہ سے قتل کر دینا کہ وہ تیری روزی میں شریک ہو جائے گا اس شخص نے عرض کیا پھر کون سا فرمایا ہمسایہ کی بیوی سے زنا کرنا۔ حضورؐ کے اس بیان کی تصدیق میں اللہ نے نازل فرمایا وَالَّذِیْنَ لَایَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ الآیۃ۔ رواہ البخاری والمسلم۔ رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں زنا کو ہمسایہ کی بیوی سے اس لئے مشروط کیا کہ اس میں ہمسایہ کی حق تلفی ہے۔ دوسری حدیث میں حضور نے فرمایا۔ پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنے کے مقابلہ میں دس عورتوں سے زنا کرنا آسان (یعنی کم درجہ) ہے۔ رواہ احمد عن المقداد بن الاسود۔ اس روایت کے راوی ثقہ ہیں۔ طبرانی نے بھی اس کو کبیر اور اوسط میں بیان کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بزرگ ترین کبیرہ گناہوں میں سے اپنے ماں باپ کو گالی دینا ہے کسی نے کہا اپنے والدین کو کس طرح گالی دی جاسکتی ہے۔ حضور صلعم نے فرمایا آدمی کسی کے باپ کو گالی دیتا ہے پھر وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے آدمی کسی کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے۔ رواہ البغوی وغیرہ۔

حضرت ابو بکرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کیا میں تم کو تین اکبر الکبائر نہ بتاؤں صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ضرور بتائیے۔ فرمایا اللہ کا ساجھی بنانا اور والدین کی نافرمانی کرنا۔ حضور صلعم یہ فرمانے کے وقت تکیہ لگائے ہوئے تھے پھر بیٹھ گئے اور فرمایا سن لو اور جھوٹ بولنا سن لو اور جھوٹ کہنا سن لو اور جھوٹی بات کہنا۔ حضور صلعم مسلسل یہ الفاظ اتنی بار مکرر سہ کرر فرماتے رہے کہ ہمارا خیال ہوا کہ اب حضور (صلعم) خاموش ہو جائیں (کیونکہ ہم پورے طور پر سمجھ چکے تھے) رواہ البخاری۔

فائدہ :۔ حضور اقدسؐ نے قوت کے ساتھ جھوٹ بولنے پر جو تہدید کی اس کی وجہ یہ تھی کہ جھوٹ بہت سے کبائر کو شامل ہے۔ شرک باللہ جھوٹی شہادت جھوٹی قسم تہمت زناء جھوٹا دعویٰ رسول اللہ ﷺ پر دروغ بندی (یہ سب جھوٹ کے اقسام ہیں) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے جو شخص قصداً مجھ پر دروغ بندی کرے اس کو اپنا ٹھکانا دوزخ میں کر لینا چاہئے۔ رواہ البخاری والمسلم۔ غیبت زناء سے بھی زیادہ سخت ہے۔ رواہ البیہقی عن ابی سعید وجابر مرفوعاً چغلی (بھی جھوٹ کی قسم ہے) حضرت عبدالرحمن بن غنم اور حضرت اسماء (رضی اللہ عنہم) کی مرفوع روایت ہے کہ بدترین بندگان خدا وہ لوگ ہیں جو چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں۔ رواہ احمد۔

فاسق کی مدح بھی (جھوٹ کی ایک قسم ہے) حضرت انسؓ کی مرفوع روایت ہے کہ جب فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو اللہ غضب ناک ہو جاتا ہے اور عرش میں لرزہ آجاتا ہے۔ رواہ البیہقی جو مستحق لعنت نہ ہو اس پر لعنت کرنا (بھی ایک طرح کا جھوٹ ہے) کیونکہ غیر مستحق پر لعنت کرنے سے لعنت کرنے والے پر لوٹ آتی ہے۔ رواہ الترمذی عن ابن عباس و ابوداؤد عن ابن عباسؓ وابی الدرداء مرفوعاً کسی پر طعن کرنا اور فحش بکنا بھی (جھوٹ ہی کی قسم ہے) حضرت ابن مسعودؓ کی مرفوع روایت ہے کہ مومن نہ طعنے باز ہوتا ہے نہ زیادہ لعن کرنے والا نہ فحش بکنے والا نہ بے حیا۔ رواہ الترمذی۔

ان کے علاوہ اور معاصی بھی (کبیرہ) ہیں اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا جو شخص مجھے اس (زبان) کی جو دونوں جبڑوں کے درمیان ہے اور اس (شرمگاہ) کی جو دونوں ٹانگوں کے درمیان ہے ضمانت دے دے گا (یعنی زبان اور شرم گاہ کو ناجائز استعمال سے روکنے کا ذمہ دار بن جائے گا) میں اس کے لئے جنت کا ضامن ہو جاؤں گا۔ رواہ البخاری عن سہل بن سعد۔

امام مالکؒ اور بیہقیؒ نے صفوانؓ بن سلیم کی مرسل روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کیا مومن بزدل ہوتا ہے فرمایا، ہاں! عرض کیا گیا کیا مومن بخیل ہوتا ہے فرمایا ہاں! عرض کیا گیا کیا پکا جھوٹا ہوتا ہے فرمایا، نہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا منافق کی تین نشانیاں ہیں خواہ وہ نماز پڑھتا روزہ رکھتا اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو بات کہے تو جھوٹی کہے وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے۔ اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ رواہ مسلم والبخاری۔

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی مرفوع روایت مذکور ہے کہ چار باتیں ہیں جس میں یہ ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا اور جس میں کوئی ایک بات ہوگی اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی تا وقتیکہ اس کو چھوڑ نہ دے (اس کو کامل یا ناقص منافق قرار دیا جائے گا) جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ بات کرے تو جھوٹی کرے۔ معاہدہ کرے تو توڑ دے جھگڑے کے وقت فحش بکنے لگے۔

کبیرہ کا تیسرا درجہ وہ ہے جس کا تعلق (خالص) اللہ کے حق سے ہے جیسے زنا اور شراب خوری۔ ابن ابی حاتم نے لکھا کہ حضرت ابن عمرؓ سے شراب کے متعلق پوچھا گیا فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق دریافت کیا تھا تو حضورؐ نے فرمایا تھا یہ بزرگ ترین گناہ کبیرہ اور فواحش کا سرچشمہ ہے جو شراب پی لیتا ہے وہ نماز بھی چھوڑ دیتا ہے اور (کبھی) اپنی ماں، پھوپھی اور خالہ پر بھی جا پڑتا ہے۔ عبد بن حمید نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بھی ایسا ہی نقل کیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب زانی زنا کرتا ہے تو مومن ہونے کی حالت میں نہیں کرتا اور نہ چور مومن ہونے کی حالت میں چوری کرتا ہے اور نہ مومن ہونے کی حالت میں شرابی شراب پیتا ہے اور نہ لٹیرا بحالت ایمان لوگوں کا مال لوٹتا ہے کہ لوگ اس کو لوٹتے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں (اور انتہائی یاس کی حالت میں اپنے مال کو بچا نہ سکیں) اور تم میں سے کوئی بحالت ایمان مال غنیمت میں خیانت نہیں کرتا پس ان باتوں سے بچو، پرہیز رکھو، متفق علیہ۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ بحالت ایمان قاتل قتل نہیں کرتا۔ رواہ البخاری۔

میں کہتا ہوں لواطت کا حکم زنا کی طرح ہے اللہ نے (اس کی مذمت میں) فرمایا ہے اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ کیا تم ایسی بے حیائی کا کام کرتے ہو کہ تم سے پہلے جہان بھر میں کسی نے نہیں کیا۔

چوری سے زیادہ سخت رہزنی ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ یہ آیت راہزنی ہی کے متعلق ہے۔ کم ناپنا تولنا بھی چوری کے حکم میں ہے اللہ نے فرمایا ہے وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ کم تولنے کم ناپنے والوں کے لئے ویل ہے خیانت بھی بڑی خباثت ہے اور نفاق کی نشانی ہے۔[1]

کسی گناہ کو حقیر سمجھنا اور پرواہ نہ کرنا بھی بڑا گناہ ہے کیونکہ صغیرہ گناہ کو بھی حقیر سمجھنا مغفرت سے دور کر دیتا ہے اور (حکم خداوندی سے) سرکشی پر دلالت کرتا ہے اور کبھی کبھی کفر تک پہنچا دیتا ہے لیکن اگر اپنے گناہ کو بڑا سمجھتا ہے (عذاب سے) ڈرتا ہے تو اس کو مغفرت کا استحقاق ہو جاتا ہے رسول اللہ صلعم نے فرمایا مومن اپنے گناہ کو ایسا جانتا ہے جیسے اس کے سر پر پہاڑ رکھا ہو اور منافق اپنے گناہ کو ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی کی طرح سمجھتا ہے کہ ذرا سا اشارہ کیا اور وہ اڑ گئی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا تم لوگ کچھ اعمال ایسے کرتے ہو جو تمہارے نزدیک بال سے بھی زیادہ باریک (حقیر) ہوتے ہیں لیکن رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہم ان کو تباہ کن جرائم میں سے شمار کرتے تھے۔ رواہ البخاری عن ابی سعید بسند صحیح واحمد مثلہ۔

اس تنقیح سے ثابت ہوتا ہے کہ جس نے کبیرہ گناہوں کا حصر سات میں کیا (صرف سات گناہوں کو کبیرہ کہا) اس نے غلطی کی اگر صغیرہ گناہ پر جمارہے یا اس کو حقیر سمجھے تو وہ بھی کبیرہ بن جاتا ہے۔ ابن ابی حاتم نے لکھا ہے کہ سعید بن جبیر نے فرمایا کسی نے حضرت ابن عباسؓ سے دریافت کیا، کیا کبیرہ گناہ سات ہیں فرمایا سات سو کے قریب ہیں۔ مگر استغفار کے ساتھ کوئی کبیرہ (کبیرہ) نہیں رہتا اور جم جانے کے ساتھ کوئی صغیرہ (صغیرہ) نہیں ہوتا (بلکہ کبیرہ ہوتا ہے) یہ بھی فرمایا کہ جس عمل سے اللہ کی نافرمانی کی جائے وہ کبیرہ ہے لہٰذا جو شخص اگر اس طرح کا کوئی عمل کر گزرے تو اس کو اللہ سے استغفار کرنا چاہئے

---

[1] (حاشیہ از مولف) نمبر ا خیانت، چوری اور کم تولنا کم ناپنا کبیرہ کے نمبر دوئم کے ذیل میں داخل ہے، ۱۲ نمبر ۲ ترمذی اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کا فرمان نقل کیا ہے کہ بلا عذر دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھنا کبائر میں سے ہے، ابن ابی شیبہ نے حضرت عمر اور حضرت ابو موسیٰ اور حضرت ابو قتادہ کی روایت سے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے، (از مولف)

کیونکہ اللہ دوزخ کے اندر اس امت میں سے کسی کو ہمیشہ نہیں رکھے گا سوائے اس کے جو اسلام سے پھر گیا ہو یا کسی فرض (کی فرضیت) کا اس نے انکار کر دیا ہو یا تقدیر کو نہ مانتا ہو۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جو یہ فرمایا کہ استغفار کے ساتھ کوئی کبیرہ نہیں رہتا اس سے آپ کی مراد وہ کبیرہ ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے حقوق سے ہو وہ کبائر جن کا تعلق انسانوں کے حق سے ہو تو (ان کی معافی کے لئے صرف استغفار کافی نہیں بلکہ) ان میں حقوق کی واپسی اور مظلوم کو راضی کرنا بھی ضروری ہے۔

فائدہ :۔ بعض (عارفوں) کا قول ہے کہ کبھی بندہ اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ پھر کسی گناہ سے اس کو ضرر نہیں پہنچتا۔ اس قول سے یہ مراد نہیں ہے کہ بعض لوگ شرعاً مکلف نہیں رہتے اور ان کے لئے حرام حلال ہو جاتا ہے یہ عقیدہ تو کفر والحاد ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ قلب کی صفائی اور نفس کے تزکیہ کے بعد بعض آدمی ہر وقت مرتبہ حضور پر فائز رہتے ہیں ان سے کوئی گناہ سرزد ہی نہیں ہوتا اور اگر کبھی ہو جاتا ہے خواہ چھوٹا گناہ ہو یا بڑا تو وہ ان کی نظر میں بہت بڑا ہوتا ہے وہ اتنے نادم اور غمگین ہوتے ہیں گویا ان کی جان مال گھر بار اولاد سب تباہ ہو گئی یہی ندامت، توبہ اور اندوہ اندوہ وہی مزید نزول رحمت اور ترقی مرتبہ کا ذریعہ ہو جاتا ہے۔ انہی لوگوں کی برائیوں کو اللہ نیکیوں سے بدل دیتا ہے۔

عارف رومیؒ نے جو حضرت معاویہؓ اور شیطان کا باہمی قصہ فجر کی نماز کے سلسلہ میں ذکر کیا ہے اس کی صحت کی سند تو مجھے معلوم نہیں لیکن تمثیل کے لئے صرف مان لینا ہی کافی ہے (ایک روز شیطان نے معاویہؓ کو فجر کی نماز کے لئے بیدار کر دیا آپ نے شیطان سے پوچھا تیرا کام تو ادائے فرائض سے غافل بنانا ہے تو نے اپنے کام سے ہٹ کر یہ کیا حرکت کی کہ نماز کے لئے مجھے جگا دیا شیطان نے جواب دیا مجھے اندیشہ تھا کہ اگر آپ کی نماز قضا ہو جائے گی تو آپ کو اتنا رنج اور غم ہوگا اور اتنی ندامت ہوگی کہ اداء فرض سے آگے آپ کے مرتبہ کو بڑھا دے گی)۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تم نے گناہ نہ کئے تو اللہ ایسے لوگوں کو پیدا کر دے گا جو گناہ کریں گے اور پھر معافی کے طلب گار ہوں گے اور اللہ ان کو بخش دے گا۔ گویا اس حدیث میں بھی اسی حالت کی جانب اشارہ ہے۔

فائدہ :۔ تمام گناہوں کی بنیاد دل کی سختی ہے دل کی سختی ہی سے اللہ کی جانب سے غفلت اور نفسانی رذائل کی پیدائش ہوتی ہے اور اس سے درندگی اور ہوس پرستی کی تخلیق ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آدمیوں کے بدن کے اندر ایک بوٹی ایسی ہے کہ جب وہ ٹھیک ہوتی ہے تو سارا بدن ٹھیک ہوتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتی ہے تو سارے جسم کا انتظام بگڑ جاتا ہے وہ بوٹی دل ہے اللہ نے فرمایا ہے وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدتُّكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ ۖ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُم مِّن سُلْطَانٍ إِلَّا أَن دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي ۖ فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوا أَنفُسَكُم (جب آخری فیصلہ ہو جائے گا تو شیطان کہے گا کہ اللہ تعالیٰ نے بلاشبہ تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے جو تم سے وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا مگر تم پر میری کوئی زبردستی نہ تھی میں نے تو تم کو صرف دعوت دی تھی تم نے میری دعوت قبول کر لی اب تم مجھے برا نہ کہو خود اپنے آپ کو ملامت کرو) گناہوں سے بچاؤ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک دلوں اور نفسوں میں پاکیزگی اور ہمہ وقت حضور نہ پیدا ہو جائے مگر ایسا اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک مشائخ طریقت کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کشش نہ ہو لہٰذا تم کو مشائخ کا دامن پکڑ لینا چاہئے ان کے ساتھ بیٹھنے والا بد نصیب نہیں ہو سکتا، اور نہ ان کا ندیم نامرادرہ سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ ہم تم سے تمہارے گناہ دور کر دیں گے یعنی چھوٹے گناہ جیسے نامحرم کی طرف نظر کرنا، اس کو چھونا، اس کا بوسہ لینا وغیرہ وغیرہ معاف کر دیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دونوں آنکھیں زنا کرتی ہیں، اور دونوں ہاتھ زنا کرتے ہیں، اور دونوں پاؤں زنا کرتے ہیں (مگر آخر میں) شرمگاہ ان کی تصدیق کر دیتی ہے یا تکذیب کر دیتی

ہے۔ انشاء اللہ ان سب کا اتار نماز روزہ سے ہو جائے گا۔ بلا شبہ نیکیاں برائیوں (کے عذاب) کو دور کر دیتی ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچوں نمازیں (اپنے درمیانی اوقات کے لئے) اور جمعہ کی نماز (پچھلے) جمعہ کی نماز تک کے تمام گناہوں کا اتار کر دیتی ہے بشرطیکہ آدمی کبائر سے بچا رہے۔ رواہ مسلم۔

وَّنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾ یعنی ہم تم کو عمدہ جنت میں داخل کریں گے یا یہ ترجمہ ہے کہ ہم تم کو جنت میں خوبی کے ساتھ داخل کریں گے (اول صورت میں مُدْخَلًا ظرف مکان ہوگا اور دوسری صورت میں مفعول مطلق)۔

مجاہد نے بیان کیا کہ حضرت ام سلمہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مرد تو جہاد کرتے ہیں اور ہم جہاد نہیں کرتیں اور مردوں کا میراث میں ہم سے دوگنا حصہ ہے۔ اگر ہم بھی مرد ہوتیں تو ان کی طرح ہم بھی جہاد کرتیں اور ان کے برابر ہمارا بھی میراث میں حصہ ہوتا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔ رواہ الترمذی والحاکم وصححہ بعض روایات میں آیا ہے کہ جب میراث کے متعلق آیت لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ نازل ہوئی تو عورتوں نے کہا مرد قوی ہیں ہم کمزور ہیں ہم زیادہ ضرورت مند ہیں ان کو کمائی کی قوت ہم سے زیادہ ہے اس لئے میراث کا حق ہم کو زیادہ ہونا چاہئے اس وقت آیت ذیل وَلَا تَتَمَنَّوْا نازل ہوئی۔ قتادہ اور سدی نے بیان کیا ہے کہ جب آیت لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ نازل ہوئی تو مردوں نے کہا ہم کو امید ہے کہ آخرت میں بھی ہماری نیکیوں کا ثواب عورتوں کی نیکیوں سے دوگنا ہوگا جس طرح اللہ تعالیٰ نے میراث کے اندر ہمارا حصہ عورتوں سے زیادہ رکھا ہے۔ (اسی طرح آخرت میں بھی ہمارا حصہ زائد ہوگا) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ جو بیشی تم میں سے بعض کو بعض پر اللہ نے عطا فرمائی ہے تم اس کی آرزو مت کرو (یعنی خداداد فضیلت والوں کے برابر پہنچنے کی تمنا نہ کرو) کیونکہ یہ برتری اور بیشی تو خداداد ہے تدبیر اور حکمت الٰہیہ کے تحت ایسا ہوا ہے۔ آرزو کرنے سے سوائے جلنے کے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ بلکہ ہر شخص پر لازم ہے کہ نیکیاں کرنے کی امکانی کوشش کرے اس سے ہی اللہ کا قرب اور آخرت میں ثواب کی بیشی حاصل ہوگی۔

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ مردوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ مقرر ہے اور عورتوں کے لئے ان کے اعمال کا یعنی مرد جو جہاد کرتے مخصوص عبادات بجالاتے نیز عام عبادات ادا کرتے ہیں اور مال غنیمت و میراث و منافع تجارت ان کو حاصل ہوتے ہیں یہ سب اللہ کے پاس سے مقرر کردہ ہیں اسی طرح عورتوں کو مال اور ثواب کا جو حصہ ملتا ہے وہ ان کے خصوصی و عمومی اعمال کے عوض مقرر کردہ ہے شوہروں کی اطاعت، اولاد کی پرورش حفاظت آبرو وغیرہ نیز عام عبادات کے عوض ان کے لئے مہر، نان نفقہ، میراث اور ثواب آخرت اللہ کی طرف سے مقرر کر دیا گیا ہے۔

وَسْـَٔـلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اور اللہ سے اس کے فضل کی درخواست کرو یعنی اللہ کے بے انتہا خزانوں میں سے دنیا اور آخرت میں بیش از بیش ثواب و اجر ملنے کی درخواست کرو اللہ ایک نیکی کا ثواب دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک بلکہ بے حساب جس کو چاہے گا دے گا دنیا میں بھی وہی کمائی میں برکت عطا فرماتا ہے اور ایک کو دوسرے سے رزق کی بیشی دیتا ہے اس لئے خواہ مخواہ تمنا اور حسد جائز نہیں۔ [1]

---

[1] ترمذی نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ سے اس کے فضل کی درخواست کرو کیونکہ اللہ کو یہ امر پسند ہے کہ اس سے مانگا جائے، ابن جریر نے ایک صحابی کی روایت سے جن کا نام نہیں بتایا بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ سے اس کے فضل کی درخواست کرو اللہ اس امر کو پسند کرتا ہے کہ اس سے مانگا جائے اور کشائش کا انتظار بہترین عبادت ہے، امام احمد نے حضرت انسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب بھی مسلمان بندہ اللہ سے تین مرتبہ جنت کی دعا کرتا ہے جنت کہتی ہے کہ اے اللہ اس کو جنت میں داخل کر دے اور جب بھی مسلمان بندہ اللہ سے تین بار دوزخ سے محفوظ رہنے کی درخواست کرتا ہے دوزخ کہتی ہے، اے اللہ اس کو دوزخ سے بچالے، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر کا قول نقل کیا ہے کہ وَسْـَٔـلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ کی تشریح میں آپ نے فرمایا، دعا دنیوی امور میں سے نہیں ہے (یعنی دعا بجائے خود عبادت ہے) از مولف رحمۃ اللہ

إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿۳۲﴾ بلاشبہ اللہ سب کچھ جانتا ہے پس وہ ان فضائل سے بھی واقف ہے جس کا ہر انسان کو استحقاق ہے اور استحقاق کی بناء اس فطری استعداد پر ہے جو اللہ نے ہر شخص کو اپنی مہربانی سے عطا فرمائی ہے لیکن استعداد کا فرق نتیجہ ہے اس امر کا کہ تمام اشیاء چربہ اور عکس ہیں اعیان ثابتہ (حقائق امکانیہ یا اللہ کے علم اجمالی) کا (اعیان ثابتہ کی تنقیح ہم نے سورۂ عم کے تفسیری نوٹس میں کردی ہے)۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ اور ہر مال یا ہر میت کے ہم نے وارث مقرر کردیئے ہیں جو مال لیتے اور میت کے وارث ہوتے ہیں۔

مِمَّا تَرَكَ اس مال میں سے جو چھوڑا ہو یا وارث ہوں گے اس مال کے جو چھوڑا ہو، اول ترجمہ پر یہ فقرہ مال کی صفت ہوگی اور دوسرے ترجمہ پر یرثون محذوف سے اس کا تعلق ہوگا۔

الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ماں باپ اور اقارب نے (بر تقدیر ترجمہ اول) یا وہ وارث ماں باپ اور اقارب ہیں (بر تقدیر ترجمہ دوئم) مفسر قدس سرہٗ نے اس آیت کی ترکیب نحوی ایک اور طرح سے بھی کی ہے جو تطویل غیر مفید کی حد سے خارج نہیں اس لئے ہم ترک کرتے ہیں۔[1]

وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ اور جن لوگوں سے تمہارے عہد بندھے ہوں، اس فقرہ کا عطف الوالدان والاقربون پر ہے۔

فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ تو ان کو ان کا حصہ دے دو، جملہ سابقہ یعنی لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ کی یہ تشریح

(حاشیہ از مولف) [1] ابوداؤد نے ناسخ میں داؤد بن حصین کا قول لکھا ہے کہ میں ام سعدؓ بنت ربیع کو قرآن سناتا تھا آپ (ایام طفولیت میں) یتیم ہونے کی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ کے زیر تربیت رہی تھیں، میں نے آپ کے سامنے یہ آیت وَالَّذِينَ عَاقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ، اسی طرح تلاوت کی ام سورؓ نے کہا یوں نہیں ہے بلکہ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ ہے اس کا نزول حضرت ابوبکرؓ صدیق اور آپ کے بیٹے عبدالرحمٰنؓ کے حق میں ہوا تھا جب عبدالرحمٰنؓ نے مسلمان ہونے سے انکار کردیا تو حضرت ابوبکرؓ نے قسم کھا کر اپنی میراث سے ان کو عاق کردیا لیکن جب عبدالرحمٰنؓ مسلمان ہوگئے تو اللہ نے ابوبکر کو حکم دیا کہ ان کو اپنا وارث قرار دیں، میں کہتا ہوں اس روایت کی صحت کی صورت میں اس آیت سے مولیٰ موالات کا وارث ہونا ثابت نہ ہو سکے گا، عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم نے ابو مالکؒ کا قول نقل کیا ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں بعض آدمی کسی دوسری برادری سے جا کر مل جاتے تھے اس برادری والے اس شخص سے معاہدہ کرلیتے تھے کہ تو ہم میں سے ہے ضرر ہو یا فائدہ یا خون (دیت وغیرہ) بہر طور تو ہماری برادری کا ایک فرد ہوگیا اس شخص سے یہ لوگ اسی طرح کا قول کرالیتے تھے لیکن ضرورت کے وقت اگر وہ شخص امداد کا طالب ہوتا تھا تو وہ لوگ اپنوں کی طرح اس کی مدد نہیں کرتے تھے اور اگر اس پر کوئی وقت پڑتا تھا تو اس میں سے کوئی تو اس کو دیتا تھا اور کوئی نہیں دیتا تھا غرض اس کی ویسی امداد نہیں کرتے تھے جیسی اس سے لیتے تھے، دور اسلام میں ان کو اس میں کچھ خرابی محسوس ہوئی اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسئلہ دریافت کیا اور یہ بھی عرض کیا کہ جاہلیت کے زمانہ میں جو ہم نے معاہدے کرلئے ہیں ان کا کیا حکم ہے اس پر آیت وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ نازل ہوئی یعنی مخالفین سے لین دین برابر کار کھو (جتنا حق ان پر اپنا سمجھتے ہو اتنا ہی حق ان کا اپنے پر سمجھو عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم نے دوسری سند سے ابو مالک کا قول نقل کیا ہے کہ وہ قوم کا حلیف ہوتا ہے جو قوم کے تمام معاملات اور مشوروں میں اپنی موجودگی کی درخواست کرتا تھا، عبد بن حمید اور ابن جریر نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا جاہلیت کے حلف کو پورا کرو، اسلام اس حلف کو مزید قوت پیدا کرتا ہے مگر حالت اسلام میں جدید معاہدۂ تحالف نہ کرو، احمد اور مسلم نے حضرت جبیر بن مطعمؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسلام میں تحالف (کا جواز) نہیں لیکن جو تحالف جاہلیت کے زمانہ میں ہوگیا ہو اسلام اس میں مزید قوت پیدا کرتا ہے، عبد بن حمید نے حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ عہد جاہلیت میں جو تحالف ہوا، اسلام نے اس میں مزید قوت اور شدت پیدا کردی عبدالرزاق اور عبد بن حمید نے زہری کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسلام میں تحالف (جائز) نہیں۔

ہے بعض لوگوں نے اَلَّذِیْنَ کو مبتدا اور فَاٰتُوْھُمْ کو خبر قرار دیا ہے مگر اس صورت میں خبر کا جملہ طلبیہ ہونا لازم آئے گا (کیونکہ خبر امر کا صیغہ ہے اور یہ ناجائز ہے) بعض نے اَلَّذِیْنَ کو فعل محذوف کا مفعول اور فَاٰتُوْھُمْ کو فعل محذوف کی تفسیر قرار دیا ہے لیکن اس صورت میں مفعول کے اختصاص کی ضرورت ہے اور اختصاص کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے اس لئے ہمارے نزدیک فَاٰتُوْھُمْ کو سابقہ جملہ کی تشریح قرار دینا ہی مناسب ہے اور الذین کا اَلْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ پر عطف ہونا ہی صحیح ہے، یہ تفسیر امام اعظمؒ کے مسلک کے بھی مناسب ہے کیونکہ امام اعظمؒ کے نزدیک نسبی ذوی الفروض اور عصبات اور ذوی الارحام اگر موجود نہ ہوں تو سب سے اونچے درجہ کے مولیٰ موالات کو کل ترکہ یا احد الزوجین کا حق دینے کے بعد جو ترکہ باقی رہ جائے وہ سارا کا سارا دے دیا جائے گا، لیکن اگر ذوی الفروض یا ذوی الارحام یا عصبات میں سے کوئی ہو گا تو مولیٰ موالات باجماع علماء محروم ہو گا۔

جمہور کا قول ہے کہ مولیٰ موالات کو وارث قرار دینے کا دستور جاہلیت میں تھا اور ابتداء اسلام میں بھی میت کے ترکہ کا چھٹا حصہ حلیف کو دینے کا حکم تھا لیکن جب وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُھُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ کِتٰبِ اللّٰہِ نازل ہو گئی مولیٰ موالات کو وارث بنانے کا حکم منسوخ ہو گیا اگر دوسرے وارث ہوں گے تب بھی مولیٰ موالات کو کچھ نہیں دیا جائے گا بلکہ کل مال بیت المال میں داخل کر دیا جائے گا۔

جمہور کے قول پر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اگر دو آیتوں میں تعارض اور تضاد ہو (کہ دونوں پر ایک زمانہ میں عمل نہ ہو سکتا ہو) تو اس وقت ایک کو ناسخ اور دوسری کو منسوخ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن زیر بحث دونوں آیتوں میں تو تضاد موجود نہیں ہے (کیونکہ اگر دوسرے وارث موجود ہوں تو بالاجماع مولیٰ موالات محروم ہو گا، آیت واولوا الارحام کا یہی مصداق ہے اور اگر کوئی وارث موجود نہ ہو یا وارث کو دینے سے مال بچ جائے تو مولیٰ موالات کو ملے گا آیت وَالَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ کا یہی تقاضا ہے کہ اب تضاد کہاں رہا)۔

میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ آیت واولوا الارحام بعضھم، صراحت کے ساتھ مولیٰ موالات کے وارث نہ ہونے کو بتا رہی ہے (یعنی اس آیت نے مولیٰ موالات کا وارث ہونا قطعاً منسوخ کر دیا خواہ کوئی دوسرا نسبی یا عصبی وارث موجود ہو یا کوئی نہ ہو) کیونکہ آیت کا آخری حصہ ہے اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِکُمْ مَّعْرُوْفًا (مگر یہ کہ تم اپنے حلیفوں کے ساتھ کچھ نیک سلوک کرو، تو تمہارے مرنے کے بعد ان کو حسب وصیت شرعیہ کچھ مل جائے گا) یہ جملہ صراحت کے ساتھ دلالت کر رہا ہے کہ حلیف کے لئے اگر کچھ وصیت کی ہو گی تو اس کو مل جائے گا اور بغیر وصیت کے اس کو کچھ نہیں مل سکتا۔

ہاں امام اعظمؒ قائل ہیں کہ اولوا الارحام میں سے اگر کوئی موجود ہو تو مولیٰ موالات کا وارث ہونا منسوخ کر دیا گیا اور ہم بھی اس کے قائل ہیں لیکن اگر اولوا الارحام نہ ہوں تو مولیٰ موالات کا حکم وراثت باقی رہے گا حقیقت یہ ہے کہ مال میت کی زندگی میں میت کا تھا اس کو ہر قسم کا تصرف کرنے کا حق تھا (وہ دوستوں کو بھی دے سکتا تھا اور دینے کا معاہدہ بھی کر سکتا تھا) بیت المال میں تو مال مجبوراً داخل کیا جاتا ہے جب کہ کوئی مستحق باقی ہی نہیں ہوتا بجائے خود بیت المال وارث نہیں کیونکہ بیت المال سے مال پانے والے لوگ غیر معین اور مجہول ہیں (یعنی ضرورت شرعیہ رکھنے والی جماعت مسلمین کو بیت المال سے دیا جاتا ہے) اور مجہول مستحق نہیں ہو سکتا (پس اگر نسبی عصبی اور وارث اور دوسرے اولوا الارحام نہ ہوں اور مولیٰ موالات ہو تو بیت المال کے مقابلہ میں وہی قابل ترجیح ہے کیونکہ میت نے اپنا مال دینے کا اس سے معاہدہ کر رکھا تھا اور اس کو اس معاہدہ کا بشرطیکہ دوسرے اہل استحقاق کا حق فوت نہ ہوتا ہو استحقاق تھا لہٰذا اس کا معاہدہ واجب العمل ہے بیت المال کا کوئی حق نہیں ہے)۔

اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدًا ﴿۳۳﴾ بیشک اللہ ہر چیز پر مطلع ہے، اولوا الارحام کو ان کا حصہ نہ دینے والوں کو اس جملہ میں تہدید ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ مرد عورتوں کے سرپرست ہیں، ابن ابی حاتم نے حسن کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں دعویٰ کیا کہ میرے شوہر نے میرے طمانچہ مارا حضور صلعم نے فرمایا، بدلہ

(لیا جائے) اس پر یہ پوری آیت نازل ہوئی اور عورت بغیر بدلہ لئے واپس چلی گئی، یہ روایت ابن ابی شیبہ نے (مصنف میں) اور ابو داؤد نے مراسیل میں نقل کی ہے اور ابن جریر نے بھی حسنؒ کی روایت سے اسی طرح کی حدیث بیان کی ہے۔

لیکن ثعلبی، واحدی اور بغوی کا بیان ہے کہ آیت کا نزول سعد بن ربیع اور ان کی بیوی کے حق میں ہوا تھا، سعد کا شمار نقباء میں تھا اور ان کی بیوی حبیبہ بنت زید بن ابی زہیر تھی یہ نام مقاتل نے بیان کیا ہے لیکن کلبی نے کہا سعد کی بیوی محمدؓ بن مسلمہ کی بیٹی تھی، واقعہ یہ ہوا کہ سعد کی بیوی نے سعد کے حکم کے خلاف کوئی بات کی سعد نے اس کے طمانچہ مار دیا، اس کا باپ بیٹی کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا آپؐ نے میری بیٹی سعدؓ کو دی اور اس نے اس کو طمانچے مارے، حضور نے فرمایا اس کو اس سے بدلہ لینے کا حق ہے، پھر فوراً ہی فرمایا، واپس چلے جاؤ یہ جبرئیلؑ آگئے اور اللہ نے یہ آیت نازل فرمادی۔ حضور (صلعم) نے فرمایا ہم نے کچھ چاہا تھا اور اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا اور منظور خدا ہی بہتر ہے اس کے بعد حضور (ﷺ) نے بدلہ لینے کا حکم روک دیا۔

ابن مردویہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک انصاری اپنی بیوی کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے عورت نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس نے مجھے ایسا مارا کہ میرے چہرے پر نشان پڑ گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اس کو یہ حق نہیں ہے اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت الرجال قوامون علی النساء نازل فرمائی، یعنی جیسے حکام رعایا پر مسلط ہوتے ہیں اسی طرح مرد عورتوں کے حاکم ہیں (یہ ترجمہ مترجم کے کئے ہوئے ترجمہ کے خلاف ہے) عورتوں کو ادب سکھانے کا ان کو اختیار ہے قوام مبالغہ کا صیغہ ہے اور قیم کا ہم معنی ہے یعنی منتظم ادب آموز، مرد کے قوام ہونے کی اللہ تعالیٰ نے دو وجہیں بیان فرمائیں ایک تخلیقی وہبی دوسری کسبی اختیاری۔

بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اس لئے کہ اللہ نے بعض کو یعنی مردوں کو، بعض پر یعنی عورتوں پر (تخلیقی) برتری عطا فرمائی ہے پہلے بعض سے مراد اور دوسرے بعض سے عورتیں مراد ہیں یہ مرد کے قوام ہونے کی پہلی وجہ کا بیان ہے کہ اللہ نے مرد کو کمال عقل حسن تدبیر، وسعت علم، عظمت جسم، زیادتی قوت اور صلاحیت واستعداد کی بیشی تخلیقی طور پر عطاء کی ہے اتنی کہ عورت کو یہ چیزیں نہیں دی گئیں، اسی لئے مندرجہ ذیل خصوصیات واحکام مرد کے لئے ہیں عورتیں ان احکام و خصوصیات سے محروم ہیں، نبوت، امامت، حکومت، قضاء، تعزیری جرائم کی شہادت وجوب جہاد، وجوب جمعہ، وجوب عیدین، اذان، خطبہ، نماز کی جماعت، میراث میں حصہ کی زیادتی، نکاح کی مالکیت، تعداد ازدواج، اختیار طلاق، پورے رمضان کے روزوں کی اور ہر زمانہ میں پوری نمازوں کی فرضیت وغیرہ، اسی برتری کی بناء پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر میں کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے، رواہ احمد عن معاذؓ عن عائشہؓ، والترمذی عن ابی ہریرہ۔ و ابو داؤد عن قیس بن سعد۔

وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ اور اس لئے بھی کہ مرد اپنا مال عورتوں پر صرف کرتے ہیں۔ نان نفقہ اور مہر وغیرہ ادا کرتے ہیں۔ یہ مرد کی برتری کی اختیاری اور کسبی وجہ کا بیان ہے۔ اس سے آگے عورتوں کی دو قسمیں بیان فرمائیں۔ پہلی قسم مندرجہ ذیل ہے۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ پس نیک عورتیں (اللہ کی) اطاعت کرتی ہیں اور مردوں کی غیر موجودگی میں بحفاظت خداوندی (مال آبرو وغیرہ کی) نگہداشت کرتی ہیں قٰنِتٰتٌ سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے شوہروں کے حقوق کو ادا کرنے کا جو حکم دیا ہے اس کو مانتی اور اس پر چلتی ہیں اور حفاظت رکھنے کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی عزت آبرو اور شوہر کے مال و اسرار کی نگہداشت کرتی ہیں۔ غیب سے مراد یا شوہروں کا سامنے نہ ہونا ہے یا شوہروں کے وہ اسرار و اموال ہیں جو دوسرے لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوں۔

بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ میں ما مصدری ہے اس وقت حفظ خداوندی کا یہ مطلب ہوگا کہ اللہ نے عورتوں کو حفاظت غیب کا حکم دیا

اور توفیق عنایت کی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ عورتوں کی طرف حفاظت کرنے کی نسبت اس لئے کی کہ عورتوں کے کسب و عمل پر یہ حفاظت مبنی ہے اور اللہ کی طرف حفاظت کی نسبت اس لئے کی کہ اللہ ہر چیز کا خالق ہے عورتوں کو قوت حفاظت بھی اسی نے دی ہے۔ تخلیق خداوندی ہی کسب و عمل کا سبب ہے۔

یا ما موصولہ ہے یعنی اللہ نے عورتوں کے حقوق کی جو محافظت کی ہے مہر نفقہ عورتوں کی نگہداشت و حفاظت اور ان کی ضروریات کی فراہمی مردوں کے ذمہ کردی ہے اس کے عوض وہ مردوں کی غیر موجودگی میں اپنی عصمت اور مردوں کے مال، اولاد کی حفاظت کرتی ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا سب سے اچھی بیوی وہ ہے کہ اگر تو اس کی طرف دیکھے تو خوش ہو۔ اگر تو کسی کام کا اس کو حکم دے تو وہ تیرا حکم مانے اگر تو غیر حاضر ہو تو تیری غیر موجودگی میں وہ اپنے مال و آبرو کی حفاظت رکھے پر حضور ﷺ نے آیت اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ آخر تک تلاوت فرمائی۔ رواہ البخاری۔

ابن جریرؒ کی روایت میں اپنے مال و آبرو کی بجائے تیرے مال اور اپنی آبرو کا لفظ آیا ہے۔ نسائی نے (سنن میں حکام نے (مستدرک میں) اور بیہقی نے شعب الایمان میں لکھا ہے کہ حضور صلعم سے دریافت کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ سب سے اچھی عورت کون سی ہے فرمایا جس کو دیکھنے سے (اس کا شوہر) خوش ہو۔ شوہر کے حکم کی اطاعت کرے اور اپنے مال و جان میں شوہر کی ایسی مخالفت نہ کرے جو شوہر کو ناگوار ہو۔ دوسری روایت میں ہے اپنی آبرو اور شوہر کے مال کی حفاظت کرے۔ سیوطیؒ نے لکھا ہے روایت کے اکثر سلسلوں میں یہی موخر الذکر الفاظ آئے ہیں۔ حضرت ابوامامہ کی روایت سے ابن ماجہ نے بھی یہ حدیث انہی الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے طیبی نے لکھا ہے کہ اپنے مال سے مراد بھی شوہر ہی کا مال ہے چونکہ عورت مرد کے مال میں تصرف کرتی ہے اس مناسبت سے مرد کے مال کو عورت کا مال کیا۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو عورت پانچوں نمازیں پڑھے مہینہ کے مقررہ روزے رکھے اپنی عصمت کی حفاظت رکھے اور شوہر کا حکم مانے تو جنت کے اندر جس دروازہ سے چاہے چلی جائے۔ رواہ ابونعیم فی الحلیۃ۔ حضرت ام سلمہؓ کی مرفوع حدیث ہے کہ اگر عورت ایسی حالت میں مری کہ اس کا شوہر اس سے راضی تھا تو جنت میں گئی۔ رواہ الترمذی۔ [۱]

عورتوں کی دوسری قسم مندرجہ ذیل ہے۔

وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ اور جن عورتوں کی بددماغی کا تم کو اندیشہ ہو یعنی نافرمانی اور نک چڑھے پن کا خوف ہو نشوز کا اصل لغوی معنی ہے اوپر کو اٹھنا، اونچی جگہ کو نشز اسی مناسبت سے کہتے ہیں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ تَخَافُوْنَ کا معنی اس جگہ تعلمون ہے قاموس میں خوف کا ایک معنی علم بھی آیا ہے۔ آیت وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا میں خوف کرنے کا معنی جاننا ہی ہے۔ بعض علماء نے کہا آیت میں خوف کا معنی اندیشہ کرنا ہی ہے لیکن خوف نشوز سے مراد ہے دوام نشور کا

---

[۱] ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ایمان کے بعد آدمی کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں کہ خوش خلق شوہر سے محبت کرنے والی اور بچے دینے والی عورت اس کو مل جائے اور کفر کے بعد آدمی کے لئے اس سے بری کوئی چیز نہیں کہ اس کو تیز زبان اور بد خلق عورت ملے۔

یہ بھی حضرت عمرؓ نے ہی فرمایا کہ عورتیں تین طرح کی ہوتی ہیں، ایک وہ جو پاک دامن، نرم خو، خوش اخلاق شوہر کی پرستار اور بکثرت بچے دینے والی ہوتی ہے مصیبت کے وقت شوہر کی مدد کرتی ہے، مصیبت میں مزید اضافہ کا سبب نہیں بنتی ایسی عورتیں کم ہیں، دوسری وہ عورت ہے جو صرف بچے جنتی ہے اس سے آگے کچھ نہیں، تیسری وہ عورت ہے جو کینہ توز تو ندیلی ہوتی ہے جس کے گلے میں اللہ چاہتا ہے باندھ دیتا ہے اور جب خدا ہی کا ارادہ ہوتا ہے تو وہ اس کو گلے سے اتار دیتا ہے (ورنہ وہ کم بخت گلے کا ہار بنی رہتی ہے نہ چھوڑے بنتی ہے نہ رکھتے)۔

خوف اور نافرمانی پر پیہم جمے رہنے کا اندیشہ لیکن جب تک نشوز ظاہر نہ ہو جائے سزا دینا جائز نہیں۔

میں کہتا ہوں اندیشہ نشوز نصیحت کرنے کے لئے کافی ہے (اگرچہ سزا دینا بغیر عملی نافرمانی کے درست نہیں۔

فَعِظُوْهُنَّ تو ان کو (زبانی) نصیحت کرو۔ یعنی اللہ کے عذاب سے اور ان کو بستروں پر تنہا چھوڑ دینے سے اور مارنے کی دھمکی سے ڈراؤ۔ اور جب زبانی نصیحت مفید نہ ہو تو

وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ ان کو ان کی خواب گاہوں میں تنہا چھوڑ دو یعنی جب تم خواب گاہوں میں اور بستروں پر ہو تو عورتوں کو اپنے لحافوں اور چادروں کے اندر نہ آنے دو۔ بعض علماء کے نزدیک بستر پر تنہا چھوڑ دینے سے بطور کنایہ ترک جماع مراد ہے یا منہ پھیر کر لیٹ رہنا مقصود ہے۔ یہی زیادہ ظاہر ہے کیونکہ فی المضاجع (خوابگاہوں میں) فرمایا عن المضاجع (خواب گاہوں سے) نہیں فرمایا۔

وَاضْرِبُوْهُنَّ (اور ترک تعلق سے بھی نتیجہ نہ نکلے) تو ان کو مارو، اکثر مفسرین نے حکم ضرب کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایسا مارو کہ مار کا نشان یعنی بدھی نہ پڑ جائے مطلب یہ کہ خفیف مار دو مت مار نہ دو اس قید کی وجہ یہ ہے کہ مسلم نے حضرت جابرؓ کی روایت سے حج وداع کے خطبہ کے ذیل میں لکھا ہے۔ عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں اللہ سے ڈرتے رہو تم نے ان کو اللہ کی امانت کے طور پر لیا ہے اور اللہ کے حکم سے ان کی شرم گاہوں کو اپنے لئے حلال بنایا ہے ان پر تمہارا حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستروں کو کسی دوسرے سے پامال نہ کرائیں کہ تم کو ناگوار ہو اگر وہ ایسا کریں تو ان کو ایسا مارو کہ بدھی نہ اچھلے اور ان کا بھی تم پر حق ہے نان نفقہ کا اور لباس کا دستور کے مطابق

میں کہتا ہوں یہ خبر آحاد ہے اور قرآن کی آیت مطلق ہے اور آیت مطلقہ کو خبر واحد سے مقید کرنا درست نہیں۔ پھر قرآنی آیت کی رفتار اور اطلاق بھی مقتضی ہے کہ سزا بقدر جرم ہو اگر صرف علامات نشوز موجود ہوں عورت بد خلقی اور بد دماغی کا اظہار کرنے لگے تو اس کو صرف زبانی نصیحت کر دی جائے لیکن اگر نافرمانی کرنے لگے تو ترک تعلق کر لے اس پر بھی اگر نہ مانے اور نافرمانی کرتی ہی رہے تو بقدر نافرمانی مارے یہاں تک کہ اگر اس سے زنا کا ظہور ہو جائے یا فرض نماز، روزہ کی تارک ہو یا غسل جنابت اور غسل حیض نہ کرے تو مارے اور بند کر دے کہ وہ اپنی حرکت سے باز آ جائے لیکن اگر نافرمانی اس سے کم درجہ کی ہو اور زبانی نصیحت سے کوئی نتیجہ نہ نکلا ہو اور ترک تعلق سے بھی عورت نے اپنی سرتابی نہ چھوڑی ہو تو ہلکی مار مارے کہ نشان نہ ابھرے

فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ پس اگر عورتیں شروع سے ہی تمہاری فرماں بردار ہوں یا نافرمانی کے بعد توبہ کر چکی ہوں۔

فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭ تو خواہ مخواہ ان کو دکھ دینے کا کوئی بہانہ نہ ڈھونڈو۔ یعنی توبہ کے بعد ان کی پچھلی نافرمانی کو کالعدم قرار دیدو گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کی طرح ہو جاتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ۝ بے شک اللہ بڑی عظمت اور کبریائی والا ہے، لہٰذا تم اپنے زیر دستوں پر ظلم نہ کرو کیونکہ اللہ تم پر اتنا قابو رکھتا ہے۔

کہ تم اپنے زیر دستوں پر اتنا قابو نہیں رکھتے یا یہ مطلب ہے کہ اللہ باوجود بزرگ ترین عظمت و کبریائی رکھنے کے تمہارے گناہوں سے در گزر فرماتا ہے اس لئے تم بھی اپنے ان حقوق کو معاف کر دو جو عورتوں پر لازم ہیں حضرت عبداللہ بن زمعہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی اپنی بیوی کو غلام کی طرح کوڑے سے نہ مارے (یعنی یہ حرکت بڑی نازیبا ہے کہ صبح کو تو بیوی کو غلام کی طرح کوڑے سے مارا) پھر پچھلے دن میں اس سے صحبت کرنے پر تیار ہونے) لگے۔ متفق علیہ۔

حضرت معاویہؓ قشیری کا بیان ہے میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلعم ہم پر بیوی کے کیا حقوق ہیں فرمایا جب اس کو کھانے کی ضرورت ہو تو کھانے کو دینا پہننے کی ضرورت ہو تو پہننے کو دینا۔ چہرہ پر نہ مارنا اس کو گالیاں نہ دینا۔ اور سوائے گھر (یعنی کسی محفوظ جگہ) کے کہیں اس کو تنہا نہ چھوڑ بیٹھنا۔ رواہ احمد وابوداؤد وابن ماجہ۔

حضرت ایاسؓ بن عبداللہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی بندیوں کو نہ مارو، یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ

نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا (حضور) عورتیں شوہروں کی نافرمان ہو گئیں۔ اس پر حضور اقدس ﷺ نے مارنے کی اجازت دے دی۔ ادھر بکثرت عورتوں نے امہات المومنین کے گھروں کے چکر لگانے شروع کئے اور اپنے شوہروں کے شکوے کئے۔ حضور صلعم نے فرمایا محمدؐ کے گھر والوں کے پاس بہت عورتوں نے چکر لگائے جو اپنے شوہروں کی شکایتیں کر رہی ہیں ایسے لوگ تم میں اچھے آدمی نہیں ہیں (جو عورتوں کو دکھ پہنچاتے اور شکایت کا موقع دیتے ہیں) رواہ ابو داؤد وابن ماجہ و الدارمی، حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سب سے اچھا شخص وہ ہے جو اپنی بیوی کے لئے اچھا ہے اور میں اپنے گھر والوں کے لئے تم سب سے اچھا ہوں۔ رواہ الترمذی والدارمی۔ ابن ماجہ نے یہ حدیث حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کی ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا اور اگر تم (اوپر والوں) کو میاں بیوی کے درمیان کشاکش کا اندیشہ ہو۔ [1] خِفْتُمْ میں خطاب حکام کو ہے شقاق سے مراد ہے اختلاف اور دشمنی چونکہ ہر دشمن ایسا کام کرتا ہے جو اس کے مخالف کو شاق ہو اس لئے عداوت کو شقاق کہتے ہیں یا یوں کہا جائے کہ ہر فریق، دوسرے فریق کے مخالف شق کی طرف مائل ہوتا ہے اس لئے اختلاف کو شقاق کہتے ہیں۔ بینھما کی ضمیر میاں بیوی کی طرف راجع ہو مرجع ضمیر لفظ نشوز کے ذیل میں معنوی طور پر مذکورہ ہے کیونکہ نشوز کا معنی ہی ہے عورت کی طرف سے شوہر کی نافرمانی یا یوں کہا جائے کہ عورت نیز شوہر کی ضمیر کا ذکر آیت وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ میں موجود ہے۔ بینھما کی طرف شقاق کی اضافت مجازی ہے جیسے مکر اللیل میں (یعنی فی محذوف ہے)۔

خوف کا معنی ہے غالب خیال یعنی میاں بیوی کے حالات اگر ایسے ہو جائیں کہ تم کو ان کے باہمی جھگڑے اور نفرت کا غالب گمان علامات دیکھ کر ہو جائے اور یہ معلوم نہ ہو کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔

فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا تو بھیجو ایک سمجھدار پنچ کو مرد کے قرابتداروں میں سے اور ایک سمجھدار پنچ کو عورت کے قرابتداروں میں سے۔ حَکَمًا سے مراد ہے سمجھدار۔ منصف شخص جس میں فیصلہ کرنے کی قابلیت ہو یعنی مرد کے قرابتداروں میں سے کسی منصف سمجھدار آدمی کو مرد کے پاس بھیجو اور عورت کے قرابتداروں میں سے کسی منصف سمجھدار شخص کو عورت کے پاس بھیجو کیونکہ اقارب ہی اندرونی حالات سے بخوبی واقف ہوتے اور معاملہ کو سلجھانے کے درپے ہوتے ہیں۔ قرابتدار ہونے کی شرط استحبابی ہے اگر غیر لوگوں کو بھی مقرر کر دیا جائے تو کوئی ہرج نہیں ہے تحقیق حال کے بعد اگر مرد کی زیادتی معلوم ہو تو اس کو حکم دیں یا دستور کے مطابق اور حسن سلوک کے ساتھ بیوی کو رکھے یا خوش اسلوبی کے ساتھ آزاد کر دے اور اگر عورت کی نافرمانی اور سرکشی ثابت ہو تو اس کو حکم دیں کہ یا شوہر کی اطاعت کرے اور نہ خلع کر کے آزاد ہو جائے۔

بغوی نے اپنی سند سے بحوالہ شافعی عبیدہ کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ کی خدمت میں ایک مرد اور ایک عورت حاضر ہوئے دونوں کے سرپرست بھی ساتھ تھے حضرت علیؓ نے حکم دیا کہ ہر فریق کے قرابتداروں میں سے ایک ایک پنچ مقرر کرو حکم کی تعمیل کی گئی آپ نے دونوں پنچوں سے فرمایا کیا تم اپنے فرائض کو جانتے ہو تمہارا کام یہ ہے کہ اگر دونوں کا نبھاؤ ہوتا دیکھو تو اختلاف دور کر کے دونوں کو یکجا کر دینا اور نبھاؤ نہ ہوتا دیکھو تو تفریق کرا دینا عورت نے کہا میرا نفع ہو یا نقصان میں اللہ کی کتاب کے فیصلہ کو تسلیم کرتی ہوں مرد نے کہا علیحدگی تو نہیں ہوگی (باقی معاملات کا اختیار پنچوں کو ہے) حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا خدا کی قسم تو نے غلط کہا (پنچایت اس وقت تک نہ ہوگی) جب تک تو اسی طرح اقرار نہ کرے جس طرح عورت نے کیا ہے۔ [2]

---

[1] حضرت مولانا اشرف علی رحمتہ اللہ علیہ نے خفتم کا مخاطب اوپر والوں کو قرار دیا ہے اس لئے ہم نے مخاطب کو قوسین کے درمیان لکھ دیا لیکن مفسرؒ نے حکام کو مخاطب قرار دیا ہے بعض احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جیسا کہ اسی آیت کی تشریح میں حضرت مفسرؒ نے نقل کیا ہے۔

اسی بناء پر امام مالکؒ کے نزدیک مرد کے پنچ کو طلاق دینے کا حق ہے خواہ مرد راضی نہ ہو اور عورت کے پنچ کو خلع کرنے کا اختیار ہے خواہ عورت راضی نہ ہو اور بدل خلع عورت کے مال سے ادا کیا جائے گا کیونکہ حضرت علیؓ نے علیحدگی اور ملاپ دونوں کا اختیار پنچوں کو دیا تھا اور علیحدگی کا اختیار نہ دینے کی تردید کردی تھی۔

جمہور کا مسلک ہے کہ جب تک مرد طلاق کا اور عورت خلع کا اختیار نہ دیں، پنچ از خود نہ تفریق کرا سکتے ہیں نہ خلع۔ بغیر اختیار دیئے تو ان کا فرض سلجھاؤ کرانا اور بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا ہے اگر دونوں میں سے کوئی اپنی ضد پر قائم رہے تو پنچوں کا کام یہ ہے کہ حاکم کو اپنی تحقیقات کی رپورٹ کردیں اور حاکم شوہر کو حسن سلوک کے ساتھ اور دستور کے مطابق عورت کو رکھنے یا طلاق دینے کا حکم دے اور عورت کو مجبور کرے کہ وہ یا مرد کی نافرمانی چھوڑ دے یا خلع کرالے اور بدل خلع ادا کرے۔ رہا حضرت علی کرم اللہ وجہ کا فیصلہ تو اس میں صاف موجود ہے کہ آپ نے شوہر سے فرمایا جب تک تو ایسا اقرار نہ کرے جیسا عورت نے کیا ہے۔ تیسرا قول غلط ہے اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ طلاق کے لئے مرد کی رضامندی شرط ہے۔ پنچوں کو از خود طلاق و تفریق کا اختیار نہیں ہے۔ اگر پنچ از خود ایسا کرے گا تو اس کا فیصلہ تفریق نافذ نہ ہوگا۔

اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ اگر دونوں پنچ (صحیح نیت کے ساتھ) میاں بیوی کے درمیان سلجھاؤ کرانا چاہیں گے تو اللہ دونوں میں موافقت پیدا کردے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اصلاح سے مراد ہو تصفیہ اور معاملہ کو طے کرانا خواہ اتفاق کی شکل میں ہو یا جدائی کی صورت میں یعنی اگر دونوں پنچ کوشش کریں گے کہ معاملہ کسی بہتر صورت سے طے ہو جائے خواہ نکاح کو باقی رکھنے کی شکل میں ہو یا طلاق کی صورت میں تو اللہ اس مناسب صورت کو ان کے درمیان پیدا کردے گا۔ یہ مطلب اس وقت ہوگا جب یریدا کی ضمیر پنچوں کی طرف اور بینہما کی ضمیر میاں بیوی کی طرف راجع کی جائے لیکن اگر دونوں ضمیریں پنچوں کی طرف لوٹائی جائیں تو یہ مطلب ہوگا کہ اگر پنچوں کے پیش نظر مظلوم کی حمایت ہو اور کسی فریق کی جنبہ داری مقصود نہ ہو تو اللہ دونوں کو متفق الرائے بنادے گا اور مقصد پورا ہو جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں ضمیریں زوجین کی طرف راجع ہوں یعنی زوجین اگر آپس میں معاملہ کو سلجھانا چاہیں گے یا اس چیز کے طلب گار ہوں گے جو دونوں کے لئے مناسب ہو تو اللہ ان کے درمیان الفت پیدا کردے گا یا ایسے فیصلہ کی توفیق عنایت کردے گا جو دونوں کے لئے مناسب ہو۔ آیت مذکورہ میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ اگر خلوص نیت کے ساتھ کوئی شخص کام کرتا ہے تو اللہ اس کا نتیجہ اچھا ہی کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا یعنی اللہ دلوں کی نیتوں اور نتائج عمل سے بخوبی واقف ہے۔

خَبِيْرًا ۝ اور باخبر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میاں بیوی میں سے کون ناحق پر ہے جو ناحق پر ہوگا اللہ اس کو سزا دے گا۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ اور اللہ کی عبادت کرو (جوہری کی) صحاح میں ہے کہ عبودیت کا معنی ہے کمزوری اور عجز کا اظہار لیکن عبادت کے معنی میں عبودیت کے مفہوم سے زیادہ زور ہے عبادت کا معنی ہے انتہائی کمزوری اور عاجزی کا اظہار (اسی لئے عبودیت کا اطلاق انسانوں پر بھی ہو سکتا ہے مگر) عبادت کا استحقاق صرف اسی کیلئے ہے جو عظمت و ربوبیت کی چوٹی پر فائز ہے۔

وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا اور کسی چیز کو (عبادت میں) اس کا شریک نہ قرار دو۔ شیئا میں تنوین تحقیر کو ظاہر کرنے کے لئے ہے یعنی اللہ کی بزرگی غیر متناہی ہے اس کے مقابلہ میں ہر ممکن خواہ کتنا ہی بڑا ہو حقیر ہے (پس تم حقیر کو الٰہ اعظم کی عبادت میں شریک نہ بناؤ) اس مطلب پر شیئا مفعول بہ ہوگا یہ بھی ممکن ہے کہ مفعول مطلق محذوف ہو اور شیئا اس کی صفت ہو یعنی اللہ کے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کرو نہ ظاہر نہ پوشیدہ۔

عبادت کی دو قسمیں ہیں (۱) اضطراری۔ یعنی ہر چیز چار و ناچار اللہ کے حکم سے وابستہ ہے کسی کو اس سے (تخلیقی طور پر)

(حاشیہ پچھلے صفحہ پر ۲) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مجھے اور معاویہؓ کو پنچ بنا کر بھیجا گیا اور ہم سے کہہ دیا گیا کہ تمہاری رائے میں نبھاؤ ممکن ہو تو ملاپ کرادینا اور جدائی بہتر ہو تو علیحدگی کرادینا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے (اپنے دور خلافت میں) یہ حکم دیا تھا، ۱۲

سر تابی کی مجال نہیں (۲) اختیاری۔ آیت میں عبادت اختیاری کا یہ حکم دیا گیا ہے عبادت الٰہی سے مراد ہے اللہ کے اوامر و نواہی کی پابندی۔

صوفیہ کا قول ہے کہ عبادت کا معنی یہ ہے کہ جس طرح غسال کے ہاتھوں میں مردہ ہوتا ہے اسی طرح اللہ کے احکام کی تعمیل میں بندہ اپنے کو بے اختیار و بے ارادہ بنا دے رب کے ہر حکم پر راضی ہو یہاں تک کہ اس کی نظر میں اللہ کے احکام تکونیہ (تخلیقیہ اور خطریہ) اور احکام تشریعیہ (اوامر و نواہی) کا مرتبہ ایک جیسا ہو (یعنی جس طرح اللہ کے احکام تخلیقیہ میں بندہ کے اختیار کو کوئی دخل نہیں اسی طرح اللہ کے احکام تشریعیہ کی پابندی کے لئے بھی وہ اپنے کو مجبور سمجھے)

اللہ نے فرمایا ہے جب اللہ اور اللہ کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیتے ہیں تو پھر کسی مومن مرد و عورت کی اپنی اختیاری مرضی نہیں رہتی۔ حضرت معاذؓ بن جبل کا بیان ہے میں او نٹنی پر رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سوار تھا کہ حضورؐ نے فرمایا معاذؓ کیا تجھے معلوم ہے کہ بندوں پر اللہ کا کیا حق ہے میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی جانے فرمایا بندوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ اس کی عبادت کریں کسی کو اس کا ساتھی نہ قرار دیں۔ معاذؓ کیا تو جانتا ہے کہ اللہ پر بندوں کا کیا حق ہے جب کہ انہوں نے ایسا کیا ہو (یعنی اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنایا ہو) میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی جانے فرمایا بندوں کا اللہ پر حق یہ ہے کہ (ایسے لوگوں کو) عذاب نہ دے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا میں لوگوں کو اس کی بشارت نہ دیدوں فرمایا ان کو عمل کرنے دے (اگر یہ بشارت دیدی تو بھروسہ کر بیٹھیں گے اور اعمال کو ترک کر دیں گے) رواہ البغوی۔ صحیحین میں بھی یہ حدیث مذکور ہے صوفیہ کے نزدیک عذاب دینے سے مراد ہے ہجر و فراق کا عذاب دینا۔ یعنی اللہ پر غیر مشرک بندوں کا حق یہ ہے کہ ان کو ہجر و فراق کا دکھ نہ دے۔

وَّبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا اور ماں باپ سے اچھا سلوک کرو، حضرت معاذؓ کا بیان ہے مجھے رسول اللہ ﷺ نے دس باتوں کی نصیحت فرمائی تھی۔ اللہ کا ساجھی نہ قرار دینا خواہ تجھے قتل کر دیا جائے یا جلا دیا جائے۔ ماں باپ کی نافرمانی نہ کرنا۔ خواہ وہ بیوی اور مال کو چھوڑ دینے کا حکم دیں۔ الحدیث رواہ احمد۔

وَّبِذِي الْقُرْبٰى اور قرابتداروں سے اچھا سلوک کرو۔ حضرت سلمانؓ بن عامر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسکین کو خیرات دینا تو (صرف) خیرات ہے اور (مسکین) قرابتداروں کو دینا خیرات بھی ہے اور صلہ رحم بھی (یعنی دوہرا ثواب ہے) رواہ احمد والنسائی وابن حبان والحاکم والترمذی وابن ماجہ وابن خزیمہ، ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور ابن خزیمہ نے صحیح کہا ہے ابن خزیمہ کی روایت کے الفاظ بھی اسی کے قریب ہیں۔

اس آیت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ غنی پر والدین اور اقارب کا نان نفقہ واجب ہے کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ راہ خدا میں کیا خرچ کریں آپ کہہ دیجئے کہ جو حاجت سے زیادہ ہو وہ سب دیدو۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بہترین خیرات وہ ہے جو غنی (یعنی اپنی حاجب پوری ہونے) کے بعد ہو اور دینا اس سے شروع کرو جس کی کفالت تمہارے ذمہ ہو۔ رواہ البخاری عن حکیم وابی ہریرۃؓ ورواہ مسلم عن حکیم۔

والدین کے علاوہ دوسرے قرابتداروں کے مصارف کے لئے دینا اس وقت واجب ہے کہ وہ کمائی سے عاجز ہوں مثلاً کوئی بچہ ہو، لنگڑا ہو اپاہج ہو یا عورت ہو، والدین کو دینے کی یہ شرط نہیں ہے۔ کوئی شخص مال دار ہو اور اس کے اقربا بھوکے مر رہے ہوں اور یہ ان کو نہ دے یہ حرکت تقاضائے احسان کے خلاف ہے ایسے وقت میں دینا واجب ہے۔

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ اور یتیموں اور مسکینوں سے اچھا سلوک کرو۔ یتیموں اور مسکینوں کو مال کی زکوٰۃ دینی تو واجب ہے اور زکوٰۃ کے علاوہ کچھ خیرات کرنی مستحب ہے۔ حضرت سہل بن سعدؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت کے اندر میں اور یتیم کی سرپرستی کرنے والا اس طرح ہوں گے حضورؐ نے کلمہ کی انگلی اور بیچ کی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے یہ الفاظ فرمائے تھے اور دونوں انگلیوں کے درمیان قدرے شگاف چھوڑ دیا تھا۔ رواہ البخاری۔

حضرت ابوامامہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے محض اللہ واسطے یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا تو جس حصہ پر اس کا ہاتھ لگا ہوگا اس کے ہر بال کے عوض اس کو دس نیکیاں ملیں گی اور جس نے کسی یتیم لڑکے یا لڑکی سے اچھا سلوک کیا جو اس کے پاس ہو تو وہ اور میں جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح (قریب قریب) ہوں گے، حضور صلعم نے دونوں انگلیوں کو (قدرے) الگ الگ کر کے بتایا۔ رواہ البغوی۔

وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى اور قربت رکھنے والے پڑوسی سے اچھا سلوک کرو قربی سے مراد یا قربت مکانی ہے یعنی متصل ہمسایہ یا قربت نسبی یعنی قرابتدار پڑوسی یا قربت دینی مراد ہے یعنی مسلمان پڑوسی۔

وَالْجَارِ الْجُنُبِ اور دور کے پڑوسی سے بھی اچھا سلوک کرو اس سے مراد یا وہ شخص ہے جو متصل ہمسایہ نہ ہو بلکہ مکان دور ہو (مگر محلہ اور گلی وغیرہ ایک ہو) یا ہو ہمسایہ مراد ہے جو قرابت دار نہ ہو یا وہ پڑوسی مراد ہے جو مسلمان نہ ہو۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پڑوسی تین ہیں ایک پڑوسی وہ ہے جس کے تین حق ہیں، ہمسائیگی کا حق قرابتداری کا حق اور مسلمان ہونے کا حق۔ دوسرا پڑوسی وہ ہے جس کے دو حق ہیں۔ ہمسائیگی کا حق اور اسلام کا حق تیسرا پڑوسی وہ ہے جس کا صرف ایک حق ہے یعنی ہمسایہ ہونے کا اور یہ شخص وہ ہے جو کتابی کافر ہو (یعنی ایک پڑوسی وہ ہے جو مسلمان اور رشتہ دار بھی ہو دوسرا وہ ہے جو مسلمان ہو۔ تیسرا وہ ہے جو کافر ہو، فقط پڑوس میں رہتا ہو اول تین وجوہ سے حق دار ہے، دوسرا دو وجوہ سے اور تیسرا صرف ہمسایہ ہونے کی وجہ سے) رواہ الحسن بن سفیان والبزار وابوالشیخ فی کتاب الثواب وابو نعیم فی الحلیہ۔ ابن عدی نے کامل میں حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت سے ایسی ہی حدیث بیان کی ہے مگر دونوں حدیثیں ضعیف ہیں۔

حضرت عائشہؓ نے بیان کیا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے دو پڑوسی ہیں میں کس کے گھر بطور ہدیہ کچھ بھیجوں (یعنی دونوں میں زیادہ مستحق کون ہے) فرمایا جس کا دروازہ تجھ سے زیادہ قریب ہو۔ (بخاری) حضرت ابوذرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تو شوربا پکائے تو اس میں پانی بڑھا دے اور اپنے پڑوسیوں کا لحاظ رکھ۔ مسلم۔

حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جبرئیلؑ مجھے پڑوسی کے متعلق برابر نصیحت کرتے رہے یہاں تک کہ میں نے خیال کیا کہ یہ پڑوسی کو میراث کا حق دار بنا دیں گے۔ بخاری۔

وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ مجاہد، عکرمہ اور قتادہ کے نزدیک اس سے مراد ہے رفیق سفر ابن جریج اور ابن زید نے کہا جو اپنے فائدہ کے لئے تیرے ساتھ ہو وہ صاحب الجنب ہے اس وقت یہ لفظ شاگرد اور استاد بھائی دونوں کو شامل ہوگا۔ حضرت علیؓ، عبداللہ اور ابراہیم نخعی کا قول ہے کہ اس سے مراد بیوی ہے جو مرد کے پہلو کے ساتھ ہوتی ہے۔

وَابْنِ السَّبِيْلِ بعض علماء کے نزدیک اس سے مراد مسافر ہے اور اکثر علماء کے نزدیک مہمان۔ حضرت ابوشریح خزاعی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کو اپنے ہمسایہ سے اچھا سلوک کرنا چاہئے اور جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کو اپنے مہمان کی خاطر تواضع کرنی چاہئے اور جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ زبان سے کلمہ خیر نکالے یا خاموش رہے۔ رواہ البغوی۔

حضرت ابوشریح کعبی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کا اللہ اور روز آخرت پر ایمان ہو اس کو اپنے مہمان کی ایک شبانہ روز ضیافت کرنی چاہئے اور مہمانی (کا حکم) تین دن تک ہے اس کے بعد خیرات ہے مہمان کے لئے جائز نہیں کہ میزبان کو تنگ کرنے کے لئے اس کے پاس پڑا ہی رہے۔ صحیحین۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کو مہمان کی خاطر تواضع کرنی چاہئے اور جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کو اپنے ہمسایہ کو دکھ نہ دینا چاہئے اور جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ بھلائی کی بات کہے یا خاموش رہے۔ صحیحین۔

وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اور اپنے باندی غلام کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

میں کہتا ہوں اس حکم میں مویشی بھی داخل ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ باندی غلام کے کھانے پہننے کا حق (آقا پر) ہے اور اس بات کا بھی حق ہے کہ طاقت کی برداشت سے زائد اس پر کام کا بوجھ نہ ڈالا جائے۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (باندی غلام) تمہارے بھائی ہیں جن کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے تمہارے زیردست کر دیا ہے۔ پس جس کے زیردست اللہ نے اس کے بھائی کو کر دیا ہو تو اس پر لازم ہے کہ جو کھانا خود کھائے وہی اپنے زیردست بھائی کو کھلائے اور جو خود پہنے وہی اس کو پہنائے اور طاقت سے زیادہ اس پر کام نہ ڈالے اگر اس کی طاقت سے زیادہ کام ہو تو خود بھی اس کی مدد کرے۔ بخاری و مسلم۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی کا خادم آگ کی گرمی اور دھواں برداشت کر کے کھانا پکا کر لائے تو اس کو ساتھ بٹھا کر کھلانا چاہئے اگر کھانا بہت ہی کم ہو تو ایک دو لقمے ہی اٹھا کر ضرور اس کو دینا چاہئے۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابو مسعودؓ انصاری کا بیان ہے کہ میں اپنے غلام کو مار رہا تھا پیچھے سے میں نے کسی کی آواز سنی ابو مسعود سمجھ لے کہ جتنا قابو تیرا اس پر ہے تیرے اوپر اللہ کا اس سے زیادہ قابو ہے میں نے منہ پھیر کر دیکھا تو رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے میں نے فوراً کہا یا رسول اللہ صلعم یہ اللہ واسطے آزاد ہے۔ فرمایا اگر تو ایسا نہ کرتا تو آگ کی لپیٹ تجھے پہنچ ہی گئی تھی یا یہ فرمایا کہ آگ نے تجھے چھو ہی لیا تھا۔ رواہ مسلم۔

حضرت ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ مرض (وفات) میں فرما رہے تھے۔ نماز اور باندی غلام (کا لحاظ رکھو) رواہ البیہقی فی شعب الایمان، امام احمد اور ابو داؤد نے حضرت علیؓ کی روایت سے اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین باتیں ہیں جس کے اندر یہ تینوں ہوں گی۔ اللہ اس کی موت آسان کر دے گا اور اس کو جنت میں داخل فرما دے گا۔ کمزور سے نرمی کرنا ماں باپ پر شفقت کرنا اور باندی غلام سے اچھا سلوک کرنا۔ رواہ الترمذی۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم خادموں کو کتنی بار معاف کریں، یہ سن کر حضورؐ خاموش رہے۔ اس نے دوبارہ عرض کیا۔ آپ پھر بھی خاموش رہے جب تیسری مرتبہ اس نے عرض کیا فرمایا روزانہ ستر بار معاف کرو۔ رواہ الترمذی۔

ابو داؤد نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ اور حضرت سہلؓ بن حنظلہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اثناء راہ میں رسول اللہ ﷺ نے ایک (لاغر) اونٹ دیکھا جس کا پیٹ پیٹھ سے لگ گیا تھا فرمایا ان بے زبان جانوروں کے معاملہ میں خدا کا خوف کرو۔ اگر یہ سواری کے قابل ہوں تو سوار ہو اور چھوڑ دینے کے قابل ہوں تو چھوڑ دو (سوار مت ہو) حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تم کو بتاؤں کہ تم میں سب سے برے کون لوگ ہیں (برے ہیں وہ لوگ) جو تنہا خور ہوں۔ غلام کو کوڑے سے مارتے ہوں اور اپنا عطیہ روک کر رکھتے ہوں (کسی کو کچھ نہ دیتے ہوں) رواہ رزین۔

حضرت ابو سعیدؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خادم کو مارتے وقت آدمی اللہ کو یاد کر لے (کہ وہ کتنا قادر اور طاقتور ہے اور اس کے باوجود بندہ کے قصوروں سے درگزر فرماتا ہے) پس تم بھی (باندی غلام کو مارنے سے) ہاتھ اٹھالو۔ رواہ الترمذی۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ اللہ پسند نہیں کرتا یعنی نفرت کرتا ہے عدم محبت سے مراد بغض و نفرت ہے۔

مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۙ ایسے لوگوں کو جو اپنے کو بڑا سمجھتے اور شیخی کی باتیں کرتے ہوں۔ مُختال سے مراد وہ شخص ہے جو تکبر کرتا اپنے قرابتداروں، پڑوسیوں اور ساتھیوں سے ناک چڑھاتا اور ان کی طرف التفات نہ کرتا ہو۔ اور فخور وہ شخص ہے جو دوسروں پر اپنی فوقیت جتاتا ہو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک

آدمی دو چادریں (یعنی پورا سوٹ) پہنے مٹکتا اتراتا چلا جارہا تھا۔ اللہ نے اس کو زمین میں دھنسا دیا اور وہ قیامت کے دن تک اس میں گھستا چلا جائے گا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص غرور سے اپنا کپڑا (زمین پر) گھسیٹتا چلتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ اس کی طرف نظر (رحمت) نہیں فرمائے گا۔ بخاری مسلم

حضرت عیاضؓ بن حمار اشجعی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے میرے پاس وحی بھیجی ہے کہ تم لوگ آپس میں تواضع کرتے رہو۔ (یعنی ایک دوسرے کے سامنے جھکا رہے) کوئی کسی پر بڑائی نہ کرے، نہ زیادتی کرے۔ راوہ مسلم۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اے گروہ اہل اسلام اللہ سے ڈرتے رہو۔ کوئی شبہ نہیں کہ جنت کی ہوا ہزار سال کی مسافت سے محسوس کی جائے گی مگر نہ ماں باپ کی نافرمانی کرنے والا اس کو پائے گا نہ رشتہ داری قطع کرنے والا نہ بوڑھا زانی اور نہ وہ شخص جو غرور سے اپنا تہبند گھسیٹتا چلتا ہے۔ بڑائی صرف رب العلمین کو زیبا ہے۔ الحدیث رواہ الطبرانی فی الاوسط۔

اِلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ جو خود بخل کرتے ہیں یعنی حق واجب ادا نہیں کرتے۔

وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ اور لوگوں کو بھی کنجوسی کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اور ابن زید کے قول پر اس آیت کا نزول مندرجہ ذیل یہودیوں کے متعلق ہوا۔ کردم بن زید حیی بن اخطب، رفاعہ بن زید بن تابوت۔ اسامہ بن حبیب۔ نافع بن ابی نافع بحری بن عمرو۔ یہ لوگ انصاریوں کے پاس ان سے گھل مل کر کہتے تھے کہ (راہ خیر میں) اپنے مال خرچ نہ کرو۔ ہم کو تمہارے مفلس ہو جانے کا اندیشہ ہے تم کو نہیں معلوم کہ آئندہ کیا ہوگا۔ رواہ ابن اسحاق وابن جریر بسند صحیح۔

اس روایت پر آیت میں بخل سے مراد ہوگا مالی بخل لیکن سعید بن جبیرؒ کا قول ہے کہ بخل سے مراد ہے علم کو چھپانا۔ عطیہ عوفی کی وساطت سے ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس قول کی نسبت کی کہ اس آیت کا نزول ان لوگوں کے حق میں ہوا جو رسول اللہ ﷺ کے اوصاف (جو توراۃ میں آئے ہیں لوگوں سے) چھپا کر رکھتے تھے اور ایک دوسرے کو بھی اس اخفاء کا مشورہ دیتا تھا اور اس علم کو بند رکھنے سے بڑھ کر کنجوسی اور کون سی ہو سکتی ہے۔ یہ روایت ضعیف ہے کیونکہ عطیہ عوفی ضعیف ہے۔

وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ اور جو چیز اللہ نے ان کو اپنے فضل سے عطا کی ہے اس کو چھپاتے ہیں۔ چیز سے مراد ہے مال (بروایت اول) یا علم (بروایت دوئم)۔

وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ اور ہم نے کافروں کے لئے تیار کر رکھا ہے۔ بجائے ضمیر کے لفظ الکافرین کا صراحت کے ساتھ ذکر اس امر کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ مذکورہ بالا اوصاف قبیحہ کے حامل اللہ کی نعمت کے کافر (ناشکرے اور منکر) ہیں اور ایسے ناشکروں کے لئے ہم نے تیار کر رکھا ہے۔

عَذَابًا مُّهِيْنًا ذلیل کرنے والا عذاب یعنی جس طرح اس نے اللہ کی نعمت کو چھپا کر اور بخل کر کے اس کی توہین کی ہے اسی طرح اللہ نے بھی اس کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ عذاب کی عظمت اور ہولناکی کو ظاہر کرنے کے لئے ضمیر غائب (یعنی اعتد بصیغہ واحد مذکر غائب) کی جگہ ضمیر متکلم (یعنی اعتدنا) ذکر فرمائی۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا سخی اللہ سے قرب رکھنے والا جنت سے قرب رکھنے والا اور لوگوں سے قرب رکھنے والا (یعنی) ہر دلعزیز اور محبوب خلق ہوتا ہے) دوزخ سے دور ہوتا ہے اور بخیل اللہ سے دور جنت سے اور لوگوں سے دور اور دوزخ کے قریب ہوتا ہے اور جاہل سخی عابد بخیل سے اللہ کو زیادہ پیارا ہے۔ رواہ الترمذی۔

حضرت ابو سعید خدری کی مرفوع حدیث ہے کہ مومن کے اندر دو (بری) خصلتیں یعنی کنجوسی اور بدخلقی اکٹھی نہیں ہوتیں۔ رواہ الترمذی۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا جنت میں داخل نہ ہوگا۔ مکار مفسد نہ بخیل اور احسان

جتلانے والا۔ رواہ الترمذی۔

وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ اور جو اپنے مال لوگوں کو دکھانے کے لئے صرف کرتے ہیں۔ رِئَاءَ غرض انفاق اور مفعول لہ ہے یعنی دنیا میں سخی کہلانے کے لئے خرچ کرتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ کا عطف الذین یبخلون پر ہے دکھاوٹ اور طلب شہرت کے لئے دینا بھی ایسا ہی مذموم ہے جیسے نہ دینا۔ بخل مرتبہ تفریط ہے اور اسراف مرتبہ افراط اور دونوں مذموم اور موجب عذاب ہیں۔ یا الکافرین پر عطف ہے کیونکہ دکھاوٹ کے لئے دینا بھی کفر اور شرک خفی ہے اسی لئے آئندہ آیت کا اس پر عطف کیا گیا ہے۔

وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اور ایمان، نہیں رکھتے اللہ پر نہ روز آخرت پر۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ فرماتا ہے۔ میں شرک سے بہت ہی زیادہ بے نیاز ہوں۔ (یعنی مجھے کسی کو شریک بنانے کی قطعاً ضرورت نہیں) اگر کوئی ایسا عمل کرے گا جس میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کر لے گا تو میں اس کے شرک آمیز عمل کو چھوڑ دوں گا۔ دوسری روایت میں ہے میں اس سے بیزار ہوں اس کا عمل اسی کے لئے ہوگا۔ جس کے لئے اس نے کیا ہوگا۔ رواہ مسلم

حضرت معاذ کی مرفوع حدیث ہے کہ تھوڑی ریاکاری بھی شرک ہے۔ سدی کا قول ہے کہ یہ آیت منافقوں کے متعلق نازل ہوئی تھی۔ بعض علماء کے نزدیک اس آیت کا نزول مکہ کے مشرکوں کے حق میں ہوا تھا جو رسول اللہ ﷺ کی دشمنی کے راستوں میں اپنا مال خرچ کرتے تھے۔

وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا اور شیطان جس کا ساتھی اور دوست ہو تو وہ برا ساتھی ہوگا۔

اس جملہ میں شیطان کے اتباع اور دوستی سے باز داشت کی گئی ہے اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ بخل ریاکاری اور دوسری خباثتیں ان کے اندر شیطان کی قربت وصحبت کی وجہ سے ہیں۔

ممکن ہے کہ آیت میں اس بات کی وعید ہو کہ شیطان ان کو اپنے ساتھ دوزخ میں لے جائے گا۔

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ان کا کیا ہرج ہوتا ان پر کیا آفت آجاتی اگر یہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان لے آتے۔ محسن کا شکریہ تو فی نفسہ اچھا فعل ہے اس میں نقصان کا تو احتمال ہی نہیں ہو سکتا نہ عقلاً نہ نقلاً۔

وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ اور جو کثیر مال اللہ نے ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں اس کی خوشنودی حاصل کرنے اور دس گنے سے سات سو گنے تک ثواب پانے کی امید میں صرف کر دیتے۔ کچھ مال خرچ کرنے سے مراد ہے سونے چاندی کا چالیسواں حصہ اور جانوروں میں اس سے بھی کم اور وہ بھی اس صورت میں کہ اپنی ضرورتوں اور ضروری حاجتوں سے زائد ہو (اور مال پر سال بھی گزر جائے) اتنا اور اس غرض سے دینا تو کسی کیلئے بھی دشوار نہیں نہ اس میں کسی کا کوئی ہرج ہوتا ہے۔

جملہ کو بصورت سوال ذکر کرنے سے اس بات پر تنبیہ ہے کہ یہ لوگ جہل مرکب میں مبتلا ہیں جس چیز میں نفع ہے اس کو نقصان سمجھتے ہیں۔ اس امر کی بھی تلقین ہے کہ جس شخص کو کسی بات کا حکم دیا جائے اور اس میں کم از کم کوئی ضرر نہ ہو (خواہ فائدہ ہو یا نہ ہو) تب بھی بنظر احتیاط کر لینا چاہئے اور جب نفع کھلا ہوا ہو تو کرنا بہت ہی ضروری ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا اور اللہ ان کو خوب جانتا ہے۔ اس جملہ میں کافروں کو عذاب کی دھمکی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ یہ امر یقینی ہے کہ اللہ ذرہ برابر ظلم نہیں کرے گا۔ مثقال ثقل سے ماخوذ ہے۔ ذرہ سرخ چھوٹی چیونٹی۔ یا روشن دان میں دھوپ کے رخ پر جو ذرے سے اڑتے دکھائی دیتے ہیں اور جن کا کوئی وزن نہیں ہوتا مراد یہ ہے کہ اللہ بالکل ظلم (حق تلفی) نہیں کریگا یعنی اللہ نے کافروں کے لئے جو عذاب مہیا تیار کر رکھا ہے وہ ظلم نہیں ہے سراسر انصاف ہے بلکہ اگر ان کو عذاب نہ دیگا تو یہ ظلم ہوگا کیونکہ انہوں نے اللہ کی توحید اور عبادت سے منہ موڑا، والدین اور اقارب واجانب کے حقوق کی ادائیگی کو چھوڑا تو اگر ان کو عذاب نہ ہو تو گویا یہ ظلم

(اور نازیبا معاملہ) ہوگا۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ کفار چونکہ عذاب کے مستحق ہیں اور ان کو عذاب نہ دیا جائے تو گویا ان کی حق تلفی ہو جائے گی۔ ظلم کا معنی ہے غیر جگہ میں کسی چیز کو رکھ دینا اور بیجا ناجائز کام کرنا مگر اللہ کے لئے کوئی کام ناجائز نہیں ہے وہ خالق کل ہے مالک الملک ہے اگر بغیر جرم کے سارے جہان کو عذاب دے تب بھی ظلم ہو سکتا ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ اللہ کوئی ایسا کام بھی نہیں کرے گا کہ دوسرے اگر وہی کام کریں تو اس کو ظلم کہا جائے خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کسی کی طاعت کے ثواب میں کمی نہیں کرے گا اور نہ کسی کے گناہ میں بیشی کرے گا۔

بغوی نے حضرت انسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کی کسی نیکی (کے اجر) کو کم نہیں کیا جائے گا دنیا میں اس کے عوض رزق (زیادہ) ملے گا اور آخرت میں بھی اس کی اچھی جزا ملے گی۔ اور کافر کی نیکی کا بدلہ اس کو بصورت رزق دنیا میں ہی ملے گا آخرت میں پہنچے گا تو اس کی کوئی نیکی باقی ہی نہ رہے گی کہ ثواب پا سکے۔ رواہ احمد و مسلم۔

حضرت ابو سعید خدری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مومن دوزخ سے نجات پا کر مامون ہو جائیں گے تو اپنے ان بھائیوں کے متعلق جو دوزخ میں داخل کر دیئے گئے ہوں گے اپنے رب سے اتنا سخت جھگڑیں گے کہ اتنا سخت جھگڑا تم میں سے کوئی اپنے حق کے متعلق بھی کسی سے نہیں کرتا عرض کریں گے پروردگار وہ ہمارے ساتھ نمازیں پڑھتے تھے روزے رکھتے تھے حج کرتے تھے اللہ فرمائے گا جاؤ اور جس کو پہچانتے ہو دوزخ میں سے نکال لو مومن جا کر چہروں سے پہچان لیں گے کیونکہ چہروں کو آگ نے نہ کھایا ہوگا۔ کسی کے نصف پنڈلیوں تک آگ نے جلایا ہوگا اور کسی کے ٹخنوں تک۔ یہ ان کو نکال لیں گے اور عرض کریں گے پروردگار تو نے جن کو نکالنے کا حکم دیا تھا۔ ہم نے ان کو نکال لیا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا (پھر جاؤ) اور جس کے دل میں دینار کے برابر ایمان ہو اس کو بھی نکال لو (مومن حکم کی تعمیل کریں گے) پھر (حکم ہوگا) جس کے دل میں نصف دینار کے برابر ایمان ہو (اس کو بھی نکال لو مومن حکم کی تعمیل کریں گے آخر) یہاں تک (حکم ہوگا کہ) جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہو (اس کی بھی نکال لو)۔

راوی نے کہا اگر کوئی اس بات کو سچ نہ مانتا ہو تو اس آیت کو پڑھے اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً یُّضٰعِفْهَا وَ یُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِیْمًا مومن عرض کریں گے پروردگار تو نے جن کو نکال لینے کا حکم دیا تھا ان کو ہم نے نکال لیا اب دوزخ میں کوئی بھی ایسا نہیں رہا جس کے (دل کے) اندر کوئی بھی خیر ہو۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا ملائکہ سفارش کر چکے انبیاء سفارش کر چکے، مومن سفارش کر چکے اور ارحم الراحمین باقی رہا۔

حضور ﷺ نے فرمایا پھر اللہ دوزخ کے اندر سے ایک مٹھی بھر یا دو مٹھی بھر ایسے لوگوں کو نکال لے گا جنہوں نے اللہ کے لئے کبھی کوئی نیکی نہ کی ہوگی اور جل کر کوئلہ ہو گئے ہوں گے ان کو لا کر آب حیات ان پر ڈالا جائے گا جس کی وجہ سے وہ ایسے اگیں گے جیسے سیلاب کی کیچڑ میں دانہ اگتا ہے اور موتی کی طرح ان کے بدن جھلکنے لگیں گے ان کی گردنوں پر مہر لگی ہوگی کہ یہ اللہ تعالیٰ کے آزاد کردہ ہیں (یعنی ان کی کوئی نیکی ہی نہیں تھی) حکم ہوگا جنت میں داخل ہو جاؤ تمہاری جو تمنا ہو اور جس چیز پر تمہاری نظر پڑے وہ تمہاری ہے وہ عرض کریں گے پروردگار تو نے ہم کو ایسا کچھ عطا فرمایا جو کسی کو جہان میں نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرے پاس تمہارے لئے اس سے بھی بڑھ کر (نعمت) ہے وہ عرض کریں گے پروردگار وہ کیا ہے اللہ تعالیٰ فرمائے گا میری خوشنودی آئندہ کبھی میں تم سے غصے نہ ہوں گا۔ رواہ البغوی بسندہ بخاری و مسلم نے بھی اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے لیکن اس میں حضرت ابو سعیدؓ کا یہ قول نہیں ہے کہ اگر کوئی اس بات کو سچ نہ مانتا ہو تو اس آیت کو پڑھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہما) راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کے ایک شخص کو اللہ تعالیٰ لوگوں کے سامنے علی الاعلان لائے گا اس کے اعمال ناموں کے ننانوے دفتر کھولے جائیں گے ہر دفتر اتنا لمبا ہوگا جتنی دور نظر پہنچتی ہے اور اللہ فرمائے گا کیا تجھے اس میں سے کسی چیز کا انکار ہے کیا میرے نگراں کاتبوں نے تیری کوئی حق تلفی کی ہے بندہ عرض کرے گا نہیں میرے مالک (کوئی حق تلفی نہیں کی نہ مجھے اس کا انکار ہے) اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا (گناہ کرنے کا

تیرے پاس کوئی عذر یا تیری کوئی نیکی اور ہے (جو لکھنے سے رہ گئی ہو) بندہ لاجواب اور متحیر ہو کر عرض کرے گا نہیں پروردگار۔ اللہ فرمائے گا کیوں نہیں ہمارے پاس تیری ایک نیکی ہے تجھ پر آج ظلم نہ ہوگا اس کے بعد ایک چھوٹا سا پرچہ نکالا جائے گا۔ جس میں اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ لکھا ہوگا اللہ فرمائے گا وزن کے وقت تو موجود رہنا بندہ عرض کرے گا میرے مالک! یہ چھوٹا سا پرچہ ان لمبے دفتروں کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تیری حق تلفی نہیں ہوگی اس کے بعد تمام دفتروں کو ایک پلڑے میں اور پرچہ کو دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے گا تو دفتروں والا پلڑا اوپر اٹھ جائے گا اور پرچہ والا پلڑا بھاری نکلے گا حضورؐ نے فرمایا اللہ کے نام کے مقابلے میں کوئی چیز وزنی نہیں ہوگی۔ رواہ ابن ماجہ وابن حبان والحاکم۔ حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

بعض علماء کا کہنا ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کسی پر حق رہنے نہ دیگا بلکہ ضرور وصول کرے گا اور کسی کا ذرہ برابر حق ایسا باقی نہیں چھوڑے گا کہ اس کا اجر نہ دے اور چند گنا نہ دے جیسے آگے فرمایا ہے۔

وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا اگر ذرہ برابر تول نیکی ہوگی تو اللہ تعالیٰ اس کو کئی گنا کر دے گا یعنی کتنے ہی گنا بڑھا دے گا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے قسم کھا کر بیان کیا کہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ کوئی شک نہیں کہ اللہ ایک نیکی کو بڑھا کر ہزاروں ہزار نیکیاں کر دے گا۔ رواہ ابن جزیر ءابن ابی شیبہ۔

وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا اور اپنے پاس سے یعنی اپنی مہربانی سے اس ایک نیکی والے کو مقررہ موعودہ ثواب سے الگ اجر عظیم عنایت فرمائے گا۔ بغوی نے حضرت ابوہریرہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اجراً عظیما فرمایا تو اب اس کی مقدار کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا قیامت کا دن ہوگا تو اللہ اگلوں پچھلوں کو جمع کرے گا اور ایک منادی ندا دے گا خبردار ہو جاؤ جس کسی کا کوئی حق ہو وہ اپنا حق لینے آجائے یہ سن کر آدمی خوش ہوگا کہ باپ یا اولاد یا بھائی پر اس کا جو حق ہوگا وہ اس کو ملے گا خواہ حق کتنا ہی تھوڑا ہو رشتہ داروں سے حق وصول کرنے کا ثبوت اس آیت میں موجود ہے فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ۔

اور (ہر) شخص کو طلب کیا جائے گا اور ایک منادی تمام اگلوں پچھلوں کے سامنے ندا دے گا یہ فلاں شخص ہے جس کا اس پر حق ہو وہ اپنا حق لینے آجائے پھر اس شخص سے کہا جائے گا ان کے حقوق ادا کر وہ شخص کہے گا میرے رب دنیا جاتی رہی اب کہاں سے دوں اللہ فرشتوں سے فرمائے گا اس کے اعمال دیکھو ان میں سے ان لوگوں کے حقوق دیدو۔ اب اگر ذرہ برابر نیکی رہ جائے گی تو فرشتے عرض کریں گے اے ہمارے مالک اس کی ذرہ برابر نیکی باقی رہی ہے اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ میرے بندہ کے لئے اس کو چند گنا کر دو اور اس کو میری رحمت کے طفیل جنت میں داخل کر دو، اس کا ثبوت اس آیت میں موجود ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا۔ اور اگر بندہ بدبخت ہوگا اور فرشتے کہیں گے کہ اے ہمارے معبود اس کی نیکیاں ختم ہو گئیں اور حقدار ابھی باقی ہیں تو اللہ فرمائے گا ان کی کچھ بدیاں لے کر اس کے گناہوں میں بڑھا دو پھر اس کے لئے دوزخ کا پروانہ کاٹ دو (یا اس کو خوب مارتے ہوئے دوزخ کو لے جاؤ) رواہ البغوی وابن المبارک وابو نعیم وابن ابی حاتم۔

فَكَيْفَ پس ان کافروں کی کیا حالت ہوگی یعنی جب یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرے گا اور ہر مظلوم کا ظالم سے حق دلوائے گا تو اس ہولناک وقت میں ان کافروں کا کیا حال ہوگا۔ جنہوں نے نہ اللہ کے حقوق ادا کئے نہ بندوں کے۔

اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ جب ہر ہر امت میں سے ایک گواہ کو ہم حاضر کریں گے یعنی ہر امت کے پیغمبر کو حاضر کریں گے جو امت کے اچھے برے اعمال اور تصدیق و تکذیب کی شہادت دے گا۔

وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا اور اس تمام امت پر آپ کو شہادت دینے کے لئے حاضر کریں گے۔

ھٰؤُلَاءِ سے مراد ہے امت اسلامیہ۔ رسول اللہ ﷺ تمام امت اسلامیہ پر شہادت دیں گے جس نے حضور ﷺ کو دیکھا ہوگا اور جس نے نہ دیکھا ہوگا سب کے متعلق گواہی دیں گے۔

ابن مبارک نے سعید بن مسیب کا قول نقل کیا ہے کہ ہر روز صبح شام رسول اللہ ﷺ کے سامنے آپ کی امت پیش کی جاتی ہے اور آپ اس کی خصوصی علامات اور اعمال کو پہچانتے ہیں اسی لئے (قیامت کے دن) آپ ساری امت کے متعلق شہادت دیں گے۔

بخاری نے حضرت ابن مسعودؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا (کچھ قرآن) پڑھ کر مجھے سناؤ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ پر ہی نازل ہوا اور آپ کو میں پڑھ کر سناؤں فرمایا ہاں حسب الحکم میں نے سورہ نساء پڑھی جب آیت فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا پر پہنچا تو فرمایا اب بس کرو۔ میں نے منہ اٹھا کر دیکھا تو حضورؐ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

بعض کے نزدیک هٰٓؤُلَآءِ سے مراد انبیاء ہیں کیونکہ تمام انبیاء اپنی اپنی امتوں پر شہادت دیں گے اور رسول اللہ ﷺ ان انبیاء کی سچائی کے گواہ ہوں گے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ مومن مراد ہیں اس امت کا ایماندار گروہ انبیاء کی طرف سے شہادت دے گا کہ یہ سچ کہتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ ان مومنوں کی تصدیق کریں گے۔ اہل اسلام کی انبیاء پر شہادت کا ذکر ہم نے سورہ بقرہ کی آیت لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ کی تفسیر میں کیا ہے۔

يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ۭ اس روز جن لوگوں نے کفر کیا ہوگا اور پیغمبر کا کہنا نہ مانا ہوگا آرزو کریں گے کہ کاش وہ زمین کا پیوند ہو جائیں یعنی جن لوگوں نے رسول کی رسالت کا انکار کیا ہوگا اور رسول کا حکم نہ مانا ہوگا یا صرف ایک جرم کیا ہوگا یعنی انکار کیا ہوگا یا رسول کا کہنا نہ مانا ہوگا وہ آرزو کریں گے کہ زمین پھٹ جائے اور وہ سما جائیں اور پھر زمین برابر کر دی جائے یا خاک کے ساتھ خاک ہو گئے ہوتے اور جانوروں کی طرح ان کو معدوم کر دیا جاتا۔

اول مطلب قتادہ اور ابو عبیدہ نے بیان کیا ہے اور دوسرا مطلب کلبی نے بیان کیا ہے کلبی نے لکھا ہے کہ چوپایوں، مویشیوں، درندوں اور پرندوں کو اللہ حکم دے گا خاک ہو جاؤ وہ فوراً خاک ہو کر زمین میں مل جائیں گے اس وقت کافر بھی یہی تمنا کرے گا۔

وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۝ اور اللہ سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے۔

عطاء نے کہا کہ لَا يَكْتُمُوْنَ کا عطف تُسَوّٰى پر ہے اور مضارع کا صیغہ ماضی کے معنی میں ہے یعنی وہ تمنا کریں گے کہ کاش وہ زمین میں سما جاتے مٹی کے ساتھ مٹی ہو جاتے اور رسول صلعم کے اوصاف و حالات (جو توریت میں مذکور ہیں) انہوں نے نہ چھپائے ہوتے جمہور کے نزدیک لا یکتمون کا عطف یود الذین پر ہے یعنی وہ اپنی کوئی بات اللہ تعالیٰ سے چھپا نہ سکیں گے۔ اللہ سے کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں ان کے ہاتھ پاؤں خود شہادت دیں گے۔

سعید بن جبیرؒ کا بیان ہے کہ ایک آدمی نے حضرت ابن عباسؓ سے عرض کیا۔ قرآن کی چند آیات میں مجھے اشتباہ ہے باہم اختلاف نظر آتا ہے۔ فرمایا پیش کرو تم کو کیا اشتباہ ہے اس نے عرض کیا آیت فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ (سے معلوم ہو رہا ہے کہ اس روز کوئی کسی کو نہیں پوچھے گا) اور آیت اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ (سے باہم پوچھ تاچھ کا ثبوت مل رہا ہے) اور آیت وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا (میں نفی اخفاء کی صراحت ہے) اور آیت وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (سے دل میں اظہار کے خلاف مطلب کو چھپائے رکھنا ثابت ہو رہا ہے اور آیت اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا .... تا وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا میں آسمان کی تخلیق پہلے اور زمین کی تخلیق پیچھے ذکر کی ہے لیکن آیت اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ میں آسمان کی تخلیق سے پہلے زمین کو پیدا کرنے کا ذکر کیا ہے اور آیت كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا میں لفظ کان بتا رہا ہے کہ اللہ غفور رحیم تھا۔ اب نہیں ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے جواب میں فرمایا آیت فلا انساب کے مصداق کا حدوث پہلا صور پھونکا جانے کے بعد ہوگا جب کہ

صور کی آواز سے سب بے ہوش ہو جائیں گے پھر دوسرا صور پھونکا جائے گا تو (اٹھ کھڑے ہوں گے اور) ایک دوسرے سے پوچھ تاچھ کرے گا۔ (لہٰذا سوال اور عدم سوال میں کوئی تضاد باقی نہیں رہا) رہا ماکنا مشرکین اور وَلَا یَکْتُمُوْنَ اللّٰہَ حَدِیْثًا کا تعارض (تو یہ بھی حقیقت میں تعارض نہیں ہے)۔

جب مشرک اور کافر مسلمانوں کے گناہ معاف ہوتے اور مشرکوں کے جرائم معاف نہ ہوتے دیکھیں گے تو بخشش کی امید میں مشرک ہونے سے انکار کر دیں گے پھر اللہ ان کے منہ پر مہر لگا دے گا اور ان کے ہاتھ پاؤں بولنے لگیں گے اور ان کے اعمال کو ظاہر کر دیں گے اس وقت رسول کا فرمان نہ ماننے والے اور رسالت کا انکار کرنے والے تمنا کریں گے کہ کاش وہ زمین میں سما جائیں اور اللہ سے کوئی بات (یعنی اپنا شرک) مخفی نہ رکھ سکیں گے۔

باقی تخلیق زمین و آسمان کے اول بعد ہونے کا مسئلہ تو اس کی صورت یہ ہوئی کہ اللہ نے دوروز میں زمین کو پیدا کیا، پھر دو روز میں میں سات آسمان پیدا کئے پھر دوروز میں زمین کو بچھایا اور ہموار کیا۔

اس حساب سے زمین اپنی موجودات سمیت چار روز میں پیدا کی گئی۔ رہا کَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا تو (اس میں کان بمعنی ماضی نہیں ہے بلکہ بمعنی استمرار ہے) اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے غَفُوْرٌ الرَّحِیْم ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ تم کو قرآن پاک میں اشتباہ نہ ہونا چاہئے یہ سب اللہ تبارک و تعالیٰ کے پاس سے آیا ہے۔ کذا اخرجہ البخاری وغیرہ۔

حسن نے (آیات کے ظاہری اختلاف کو دور کرنے کے لئے) فرمایا کہ ان آیات میں مختلف مواقع کے واقعات کا اظہار کیا گیا ہے ایک موقع پر وہ بات نہیں کر سکیں گے اور لَا تَسْمَعُ اِلَّا ھَمْسًا اور سوائے پھس پھس کے کچھ سنائی نہیں دے گا۔ دوسرے مقام پر وہ بول سکیں گے اور جھوٹ بولیں گے اور کہیں گے مَا کُنَّا مُشْرِکِیْنَ مَا کُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْءٍ ایک موقع پر وہ اپنے گناہ کا اقرار کریں گے فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْبِہِمْ ایک جگہ پر وہ باہم سوال نہیں کریں گے اور دوسرے موقع پر دنیا میں دوبارہ لوٹائے جانے کی درخواست کریں گے اور سب سے آخری موقع پر ان کی زبانوں پر مہر لگا دی جائے گی اور ہاتھ پاؤں شہادت دیں گے اور اللہ تعالیٰ سے وہ کوئی بات چھپا نہ سکیں گے وَلَا یَکْتُمُوْنَ اللّٰہَ حَدِیْثًا۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ابوداؤد، حاکم اور ترمذی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول نقل کیا ہے اور ترمذی نے اس کو حسن کہا ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ہمارے لئے کھانا تیار کرایا اور ہم کو بلایا اور شراب پلائی۔ یہ واقعہ شراب حرام ہونے سے پہلے کا ہے اور شراب کا نشہ ہم کو چڑھا اور نماز کا وقت آگیا تو لوگوں نے مجھ کو آگے بڑھایا میں نے پڑھا قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ ۔ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۔ آخر تک اسی طرح (بغیر لا کے) پڑھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی تم نشہ کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ۔

حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ یہاں تک کہ جو کچھ منہ سے نکال رہے ہو اس کو سمجھ لو۔ نشہ جس حد تک مانع نماز ہے اس کی تعین اس لفظ سے کر دی (یعنی تھوڑا نشہ مانع صلوۃ نہیں جب تک نشہ اتنا نہ ہو کہ آدمی یہ سمجھ ہی نہ سکے کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں نماز پڑھ سکتا ہے)۔

﴿ ایک سوال ﴾

جب نشہ اس حد تک پہنچ جائے کہ آدمی کو اپنے کہے ہوئے الفاظ کو سمجھنے کا بھی ہوش نہ رہے تو ایسے بے ہوش آدمی کو خطاب کرنا ہی درست نہیں ہے پھر اللہ نے نشہ والوں کو اس آیت میں کس طرح مخاطب بنایا۔

جواب: نشہ اترنے کے بعد خطاب کا رخ شراب پینے والوں کی طرف کیا گیا ہے مراد یہ ہے کہ (نماز تو فرض ہے اور اس کا وقت بدلا نہیں جا سکتا لہٰذا) نماز کے اوقات میں تم نشہ آور چیز کے قریب نہ جاؤ۔ بغوی نے لکھا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد لوگ نماز کے اوقات میں شراب سے اجتناب رکھتے تھے (دوسرے اوقات میں پیتے تھے) یہاں تک کہ حرمت شراب کا حکم نازل ہو گیا یعنی آیت مائدہ نازل ہو گئی۔

یوں بھی جواب دیا جاسکتا ہے کہ لا تقربوا اگرچہ صیغہ نہی کا ہے لیکن نہی سے اس جگہ مراد نفی ہے یعنی حالت نشہ میں نماز نہیں ہوتی جب تک اپنے کہے ہوئے الفاظ سمجھنے نہ لگو اس وقت حَتّٰی تَعْلَمُوْا نفی صلوٰۃ کی انتہاء ہو گی (یعنی کہے ہوئے الفاظ کو جاننے اور سمجھنے کی حد پر نفی۔ صلوٰۃ ختم ہو جائے گی) لیکن اگر نہی کو اصلی معنی میں رکھا جائے گا تو حَتّٰی تَعْلَمُوْا نہی کی علت ہو گی اور حتی کے۔ کے معنی میں ہو گا (تاکہ تم سمجھ لو)۔

ضحاک بن مزاحم کے نزدیک نشہ سے نیند کا نشہ مراد ہے گویا نیند کے غلبہ کے وقت نماز پڑھنے کی ممانعت فرمادی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نماز کے اندر اگر کوئی اونگنے لگے تو سو جائے تاکہ نیند جاتی رہے کیونکہ اونگھتے میں نماز پڑھتا رہے گا تو ممکن ہے کہ استغفار کرنا چاہتا ہو اور اپنے کو گالیاں دینے لگے۔ بخاری و مسلم۔ ابوداؤد۔ ترمذی، ابن ماجہ۔

آیت میں اس بات کی تنبیہ ہے کہ نمازی کو حضور قلب کے ساتھ نماز پڑھنی چاہئے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہو اس کو جانے آیات کے معانی سمجھے اور ان پر غور کرے اور توجہ بٹانے والی چیز سے پرہیز رکھے۔

حضرت اسلع کا بیان ہے میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت کرتا اور اونٹ پر آپ کیلئے کجاوہ رکھ دیتا تھا۔ ایک روز حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا۔ اسلع اٹھ کر کجاوہ رکھ دو میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ مجھے جنابت ہو گئی ہے، ٹھنڈی رات ہے، ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے سے مجھے مر جانے یا بیمار ہو جانے کا ڈر ہے۔ اس پر حضرت جبرئیل (علیہ السلام) آیت تیمّم لے کر نازل ہوئے اور حضور ﷺ نے مجھے تیمّم کر کے دکھایا ایک ضرب کے بعد چہرہ پر مسح، اور ایک ضرب کے بعد دونوں ہاتھوں پر کہنیوں تک، میں نے اٹھ کر تیمّم کیا۔ پھر کجاوہ کس دیا۔ رواہ الطبرانی وابن مردویہ فریابی اور ابن المنذر۔ اور ابن ابی حاتم نے حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت اس مسافر کے لئے نازل ہوئی جس کو سفر میں جنابت ہو گئی ہو اس کو تیمّم کرنے کا حکم دیا گیا۔

ہم سورۂ مائدہ میں انشاء اللہ بیان کریں گے کہ حکم تیمم کی سب سے پہلی آیت وہی ہے جو سورۂ مائدہ میں مذکور ہے اور وہ اس سے پہلے نازل ہوئی ہے ممکن ہے کہ جواز تیمّم کی یہ آیت اس شخص کے لئے اتاری گئی ہو جس کو ٹھنڈی رات میں ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے سے مرنے یا بیمار ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ حدیث اسلع سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا اور نہ حالت جنابت میں نماز کے قریب جاؤ، تاوقتیکہ غسل نہ کر لو۔ ہاں راستہ سے گزرتے ہوئے (جاسکتے ہو خواہ غسل نہ کیا ہو یعنی جنابت کی حالت میں بغیر غسل کئے مسجد کے اندر سے گزر سکتے ہو)۔

جنب وہ شخص جس کو جنابت ہو گئی ہو۔ عورت ہو یا مرد اس میں واحد جمع برابر ہے (جمع پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے) قاموس میں جنابت کا معنی منی لکھا ہے حنفیہ کا قول ہے کہ لغت میں جنابت کا معنی ہے منی کا شہوت کے ساتھ خارج ہونا۔ اجنب الرجل فلاں شخص نے فلاں عورت سے اپنی شہوت پوری کر لی یعنی انزال کے ساتھ۔

بعض علماء کا قول ہے کہ جنابت کا اطلاق صرف جماع پر ہوتا ہے انزال ہو یا نہ ہو۔ حافظ ابن حجرؒ نے امام شافعیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ حقیقت میں جنابت کا اطلاق جماع پر ہوتا ہے خواہ انزال نہ ہو۔ جنابت کا اصل لغوی معنی ہے دور ہونا۔ جنب بھی لوگوں سے دور اور الگ ہوتا ہے۔ چونکہ داؤدؒ ظاہری کے نزدیک جنابت کا معنی ہے خروج منی اس لئے ان کے نزدیک صرف جماع کرنے سے جب تک انزال نہ ہو غسل واجب نہیں ہوتا۔ داؤد نے حضرت ابی بن کعبؓ کی روایت سے استدلال کیا ہے۔ حضرت ابیؓ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ اگر مرد عورت سے جماع کرے اور انزال نہ ہو تو کیا حکم ہے فرمایا جتنے حصہ (عضو) سے عورت کو چھوا ہے اس کو دھو لے (یعنی استنجا کر لے) پھر وضو کر کے نماز پڑھ لے۔ (رواہ البخاری و مسلم)

حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی انصاری کو بلوایا وہ (فوراً) آگئے اس وقت ان کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا یہ حالت دیکھ کر حضور صلعم نے فرمایا شاید ہم نے تم پر عجلت کر دی انصاری نے عرض کیا جی ہاں! فرمایا اگر تم پر

جلدی کردی جائے (یعنی بغیر انزال کے کسی فوری ضرورت کی وجہ سے الگ ہو جانا پڑے) یا خشکی ہو جائے تو تم پر وضو ہے (یعنی غسل نہیں ہے) رواہ البخاری و مسلم۔ مسلم میں بھی یہ قصہ مذکور ہے اس میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان اتنا مزید ہے کہ پانی (یعنی غسل) صرف پانی سے (یعنی انزال سے) ہوتا ہے۔

مسئلہ :۔ چاروں اماموں کا اور عام جمہور اہل اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ محض جماع سے غسل واجب ہو جاتا ہے انزال ہو یا نہ ہو اب اگر جنابت کے معنی جماع قرار دیئے جائیں جیسا کہ امام شافعیؒ نے فرمایا اور اشتقاق کا تقاضا بھی یہی ہے۔ تو آیت سے ہی صرف جماع کا موجب غسل ہونا ثابت ہو رہا ہے۔ اور اگر جنابت کا معنی شہوت کے ساتھ خروج منی قرار دیا جائے تو یہ معنی بھی ہر جماع میں پائے جاتے ہیں خواہ حقیقتاً ہوں یا حکماً۔ حکماً کا یہ مطلب ہے کہ جماع عام طور پر بغیر انزال کے نہیں ہوتا اور خروج منی کا سبب جماع ہی ہے۔ پھر شرم گاہ میں غائب ہونے کے وقت کبھی رقت مادہ کی وجہ سے خروج محسوس بھی نہیں ہوتا لہٰذا سبب کو مسبب کے قائم مقام قرار دیدیا گیا جیسے نیند کو ناقص وضو اس لئے کہا گیا ہے کہ سوتے میں ریح کا خروج ہو سکتا ہے اور سونیوالے کو محسوس بھی نہیں ہوتا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ آنکھیں بندھن ہیں جب سو جاتی ہیں تو بندھن آزاد ہو جاتا ہے۔ رواہ احمد و ابو داؤد و ابن ماجہ والدار قطنی عن علیؓ نیز بکثرت احادیث اور اجماع سے ثابت ہے کہ صرف جماع سے غسل واجب ہو جاتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مرد عورت کی چاروں شاخوں کے درمیان بیٹھ گیا اور اس کو مشقت میں ڈال دیا تو غسل واجب ہو گیا۔ بخاری و مسلم

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا راوی ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا جب مرد چاروں شاخوں (اطراف اربعہ) کے درمیان بیٹھ گیا اور شرم گاہوں کے منہ مل گئے تو غسل واجب ہو گیا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایسا ہی کیا اور ہم نے غسل کیا۔

داؤدؒ ظاہری نے جن دو حدیثوں سے استدلال کیا ہے وہ منسوخ ہیں امام احمدؒ اور مولفین سنن نے حضرت سہلؓ بن سعد کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا انصاریؓ کہتے ہیں کہ انما الماء من الماء کی (یعنی انزال کے بغیر جماع کے بعد صرف استنجا کر لینا کافی تھا) اجازت تھی شروع اسلام میں رسول اللہ ﷺ نے اس کی اجازت دے دی تھی۔ پھر ہم کو غسل کرنے کا حکم دے دیا۔ اس روایت کو ابن خزیمہ اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور اسماعیل نے کہا ہے کہ صحیح بر شرط بخاری ہے۔

اگر شبہ کیا جائے کہ ابن ہارون اور دار قطنی نے بالجزم بیان کیا ہے کہ زہری نے یہ حدیث خود حضرت سہلؓ بن سعد سے نہیں سنی (بلکہ حضرت سہلؓ اور زہریؒ کے درمیان ایک راوی اور ہے) اور ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ ابو داؤد نے جس سند سے اس کو لکھا ہے اس میں انقطاع ہے کیونکہ عمرو بن حرب نے بروایت ابن شہاب (زہری) بیان کیا اور ابن شہاب نے کہا کہ مجھ سے ایسے شخص نے بیان کیا جو میرے نزدیک پسندیدہ ہے اور اس پسندیدہ شخص نے حضرت سہل کا قول بیان کیا (یہ پسندیدہ شخص کون تھا زہری نے اس کا نام نہیں بیان کیا۔ بہر حال زہری کا کوئی راوی تھا جو زہری کی نظر میں ثقہ تھا اور اس راوی سے حضرت سہل نے حضرت ابی بن کعب کا قول بیان کیا)۔

ہم اس شبہ کو دور کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ ابو داؤد کی سند صحیح ہے کیونکہ اگر ثقہ راوی یہ کہے کہ مجھ سے ایک ثقہ نے کہا یا ایسے شخص نے کہا جو میرے نزدیک پسندیدہ تھا تو ایسی روایت سے جو حدیث آتی ہے اس کو صحیح مانا گیا ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ امام احمد اور ابن ماجہ نے جس سند سے اس کو بیان کیا ہے وہ سند منقطع ہو کیونکہ ممکن ہے زہری نے کسی ثقہ شخص سے بھی حضرت سہل کا قول سنا ہو اور خود بھی حضرت سہل سے سنا ہو۔

مسئلہ :۔ باتفاق علماء خروج منی سے غسل واجب ہو جاتا ہے لیکن امام اعظم امام محمد امام مالک اور امام احمدؒ کے نزدیک انفصال کے وقت کود کر جدا ہونا شرط ہے (خواہ نکلنے کے وقت کود کر نہ نکلے) امام ابو یوسف کے نزدیک مقام سے جدا ہونے اور

خارج ہونے یعنی انفصال و خروج دونوں کے وقت کود کر جدا ہونا اور کود کر نکلنا ضروری ہے۔ امام شافعی صرف خروج منی کو موجب غسل قرار دیتے ہیں۔ خواہ لذت کے ساتھ ہو یا بغیر لذت کے۔ کود کر ہو یا بہہ کر۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے جب مذی کا حکم پوچھا گیا تو فرمایا اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور منی میں غسل ہے۔ رواہ الطحاوی۔

ایک شبہ

پہلے حدیث ذکر کی جاچکی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اِنَّمَا الْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ (اس حدیث میں کود کر یا شہوت سے نکلنے کی کوئی شرط نہیں ہے) دوسری حدیث حضرت ام سلمہؓ کی روایت سے آئی ہے کہ ام سلیمؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا اگر عورت کو احتلام ہو جائے تو کیا اس پر غسل ہے فرمایا ہاں اگر (بیدار ہونے کے بعد) پانی دیکھے، بخاری و مسلم۔ (اس حدیث میں بھی پانی کا لفظ عام ہے کود کر یا شہوت سے خارج ہونے کی کوئی قید نہیں)۔

جواب :۔ دونوں حدیثوں میں الماء میں الف لام عہد کا ہے اور معہود وہی پانی ہے جو کود کر اور شہوت کے ساتھ خارج ہو۔ امام شافعیؒ الف لام کو جنسی کہتے ہیں۔ ان کا قول زیادہ محتاط ہے۔

مسئلہ :۔ بیدار ہو کر اگر رقیق پانی نظر آئے، احتلام ہونا یاد نہ ہو اور نہ یہ معلوم ہو کہ یہ منی ہے یا مذی تو غسل واجب ہے۔ نیند میں انسان غافل ہو جاتا ہے ممکن ہے احتلام ہو گیا ہو اور منی میں زیادہ مدت تک بندش یا غذا کی خرابی کی وجہ سے رقت پیدا ہو گئی ہو۔ لہٰذا اس احتمال اور شک کو ظن کے قائم مقام قرار دے کر وجوب غسل کا حکم دیا جائے گا۔

ترمذی نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا اگر کسی شخص کو (بیدار ہونے کے بعد) کپڑے پر تری محسوس ہو اور احتلام ہونا یاد نہ ہو تو کیا کرے فرمایا غسل کرے۔ دریافت کیا گیا کہ اگر کوئی خواب میں احتلام ہو تا دیکھے مگر (بیدار ہو کر) تری نہ پائے تو کیا کرے فرمایا اس پر غسل نہیں ہے۔ اس روایت کی سند میں عبداللہ بن عمر از عبیداللہ بن عمر از قاسم بن محمدؒ آیا ہے اور بقول ترمذی یحییٰ بن سعید نے ان کو ضعیف الحفظ کہا ہے۔

اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ کا مطلب یہ ہے کہ جنابت کی حالت میں نماز کے قریب نہ ہو جاؤ مگر سفر کی حالت ہو اور پانی نہ ملے یا پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو تو تیمم کر کے نماز پڑھ لی جائے۔ آیت کے اس مطلب کی تائید مندرجہ بالا شان نزول سے ہوتی ہے پھر اس کے بعد تیمم کا ذکر بھی کیا گیا ہے گویا عابر سبیل سے مراد تیمم کرنے والا ہے کیونکہ مسافر کو عام طور پر پانی نہیں ملتا تیمم کرنا پڑتا ہے۔

آیت میں دلیل ہے اس امر کی کہ تیمم ساتر حدث ہے (وقتی اور ہنگامی طور پر ناپاکی کو چھپا دیتا ہے) حدث (ناپاکی) کو دور نہیں کرتا۔ جمہور علماء کا یہی قول ہے لیکن داؤد ظاہری تیمم کو رافع حدث (یعنی کامل طور پر پاک کر دینے والا) کہتے ہیں حنفیہ کی بعض کتابوں میں آیا ہے کہ داؤد کے نزدیک تیمم رافع حدث ہے اگر پانی مل جائے تو تیمم ٹوٹ جاتا ہے جس طرح وضو شکن اسباب سے تیمم بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ تیمم رافع حدث نہیں ہے ورنہ پانی ملنے سے تیمم کے ٹوٹ جانے کے کوئی معنی نہیں، کیا پانی کا وجود موجب ناپاکی ہے؟ جب ایسا نہیں ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مٹی سے طہارت عارضی ہوتی ہے (ناپاکی چھپی رہتی ہے پانی ملتے ہی مخفی حدث کا ظہور ہو جاتا ہے نئی ناپاکی نہیں پیدا ہو جاتی۔

داؤد ظاہری کے قول کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پاک مٹی (سے تیمم) مسلمان کا وضو ہے خواہ دس برس تک پانی نہ ملے۔ یہ حدیث اصحاب سنن نے حضرت ابوذرؓ کی روایت سے نقل کی ہے اور ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دوسری حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے لئے تمام زمین مسجد کر دی گئی ہے اور زمین کی مٹی کو طہور (پاک کن) بنا دیا گیا ہے۔ رواہ مسلم وابن خزیمۃ وغیرہما۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ دونوں حدیثیں اور ان جیسی دوسری حدیثیں مجاز پر محمول ہیں کیونکہ اول الذکر حدیث میں آخری جملے

یہ ہیں کہ جب پانی مل جائے تو استعمال کرنا ضروری ہے۔ اگر تیمم سے واقعی اور حقیقی طہارت ہو جاتی اور ناپاکی بالکل دور ہو جاتی تو پھر طہارت کے لئے پانی کے استعمال کو کیوں ضروری قرار دیا جاتا۔

صحیحین میں حضرت عمران بن حصینؓ کی روایت سے ایک حدیث آئی ہے کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں رسول اللہ ﷺ نے جنابت والے کو تیمم کرنے کا حکم دیا تھا پھر جب پانی مل گیا تو اس کو غسل کرنے کا حکم دیا اگر تیمم سے جنابت بالکل (جڑ سے) جاتی رہتی تو غسل کا حکم حضور ﷺ نہ دیتے۔

فائدہ :۔ عابری سبیل کا مندرجہ بالا مطلب حضرت علیؓ حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ اور سعیدؒ بن جبیر کی تفسیر کے اعتبار سے ہے۔ لیکن بعض اہل تفسیر کے نزدیک الصلوٰۃ سے مواضع الصلوٰۃ یعنی مساجد مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ جنابت کی حالت میں مسجدوں کے قریب بھی نہ جاؤ ہاں مسجد کے اندر سے گزرتے ہوئے نکل سکتے ہو ٹھہرنا نہ چاہئے۔

ابن جریرؒ نے حضرت یزید بن ابی حبیبؒ کی روایت سے لکھا ہے کہ کچھ انصاریوں کے گھروں کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے ان کو جنابت ہوتی اور پانی اندر مکانوں میں موجود نہ ہوتا تو ان کو پریشانی ہوتی کیونکہ گزرنے کا راستہ مسجد میں ہو کر ہی تھا اس پر اللہ نے نازل فرمایا وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ۔ آیت کی یہ تفسیر حضرت ابن مسعودؓ، سعید بن المسیبؒ، ضحاکؒ، حسنؒ بصری، عکرمہؒ نخعی اور زہری نے بیان کی ہے اسی تفسیر کی بناء پر امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک جنب آدمی ہر وقت مسجد کے اندر سے گزر سکتا ہے حسن بصری کا بھی یہی قول ہے، کیونکہ سبب نزول اگرچہ خاص ہے مگر لفظ عام ہے لہٰذا حکم بھی عام ہوگا۔ خواہ مسجد کے اندر ہو کر گزرنے کی کوئی اضطراری ضرورت نہ ہو۔ ہمارے نزدیک جنب کے لئے مسجد میں گزرنا جائز نہیں۔ خواہ نخواہ مضاف کو محذوف ماننے کی ضرورت نہیں۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر صلوٰۃ سے مراد مواضع صلوٰۃ ہوں تو گھروں کے اندر جو نماز کی جگہ مقرر کرلی جاتی ہے اس میں بھی جنب کا داخلہ ممنوع ہونا چاہئے حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں۔ پھر حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ کے الفاظ صراحتاً بتا رہے ہیں کہ صلوٰۃ سے نماز ہی مراد ہے۔ مقام صلوٰۃ مراد نہیں ہے اور یہ درست نہیں ہے کہ معطوف میں وہ چیز مقدر مانی جائے جو معطوف علیہ میں مذکور یا مقدر نہ ہو۔

مسئلہ :۔ مسجد میں جنب کا ٹھہرنا حنفیہ کی طرح امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک بھی ناجائز ہے مگر امام احمدؒ کے نزدیک جائز ہے۔ تینوں اماموں کے مسلک کی دلیل یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان گھروں کے رخ مسجد کی طرف سے پھیر دو۔ میں مسجد (میں ٹھیرنے یا داخل ہونے) کو نہ حیض والی کے لئے جائز قرار دیتا ہوں نہ جنابت والے کے لئے۔ رواہ ابوداؤد، وابن ماجہ، والبخاری فی التاریخ والطبرانی عن جسرۃ بنت دجاجۃ عن عائشہؓ، حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو ابوداؤد نے بروایت جسرۃ عن ام سلمہؓ (بھی) لکھا ہے ابوزرعہ نے اول روایت کو صحیح کہا ہے۔

خطابی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اور صراحت کی ہے کہ اس کی سند میں افلت بن خلیفہ عامری مجہول شخص ہے۔ ابن رفعہ نے اس کو متروک کہا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ابن رفعہ کا قول قابل قبول نہیں آئمہ حدیث میں سے کسی نے بھی افلت کو متروک نہیں کہا بلکہ امام احمدؒ نے اس کے متعلق کہا ہے کہ میں اس میں کوئی خرابی نہیں پاتا۔ ابن خزیمہ نے اس کی تصحیح کی ہے اور ابن قطان نے حسن کہا ہے اب اگر بعض لوگ اس کو نہیں جانتے تو ان کے نہ جاننے سے افلت متروک یا مجہول نہیں ہو جائے گا۔

یہ حدیث امام احمد کے خلاف جمہور کے مسلک کو ثابت کر رہی ہے بلکہ امام شافعیؒ (جو مسجد میں سے گزرنے کو جائز قرار دیتے ہیں) کے قول کے خلاف بھی اس حدیث میں صراحت ملتی ہے کیونکہ کلام کی رفتار ہی مسجد کے اندر سے گزرنے کو روکنے کے لئے ہے۔

مسئلہ :۔ جنب کے لئے کعبہ کا طواف جائز نہیں کیونکہ طواف مسجد میں ہوتا ہے اور مسجد میں جنب کا داخلہ درست نہیں۔ جنابت والے کے لئے قرآن پڑھنا بھی جمہور علماء کے نزدیک ناجائز ہے۔ امام مالک کے نزدیک تعوذ کے لئے چند آیات

کی تلاوت جائز ہے، داؤد کے نزدیک تمام قرآن کی تلاوت جنب کے لئے جائز ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے حائضہ اور جنب قرآن کا کچھ حصہ بھی نہ پڑھیں۔ سورہ بقرہ کی آیت وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ کی تفسیر میں اس کی تحقیق گزر چکی ہے۔ پھر جنب کے لئے قرآن کو چھونا ناجائز ہے آیت لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ کی تفسیر میں اس کی تفصیل آئے گی اور نقوش حروف کو چھونا ناجائز ہے تو قرآن کے الفاظ زبان پر لانا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔

شبہ :۔ بے وضو آدمی کے لئے آیت لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ کے حکم کے مطابق قرآن کو چھونا جائز نہیں مگر آیات قرآنی کو پڑھنا تو جائز ہے اس کی کیا وجہ ؟

ازالہ :۔ بے وضو ہونے کا اثر ظاہر بدن پر ہوتا ہے منہ کے اندر نہیں پہنچتا (اور جنابت کا اثر منہ کے اندر ہوتا ہے) اس کے علاوہ دونوں میں یہ فرق ہے کہ بے وضو ہونا عمومی اور ہمہ وقتی چیز ہے اور جنابت اتنی کثیر الوقوع نہیں۔ اگر بے وضو کے لئے آیات کو پڑھنا ناجائز قرار دیا جاتا تو بڑی دشواری ہو جاتی۔ جنابت کی حالت میں قرأت قرآن کی ممانعت سے کوئی دشواری پیدا نہیں ہوتی۔

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ سوائے جنابت کے اور کوئی چیز رسول اللہ ﷺ کو قرآت قرآن سے نہیں روکتی تھی۔ رواہ احمد واصحاب السنن وابن خزیمہ وابن حبان وابن الجارود والبیہقی والترمذی وابن السکن وعبدالحق والبغوی فی شرح السنة۔ ترمذی اور بیہقی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وضو سے پہلے سورۂ آل عمران کی آخری دس آیات پڑھیں حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا کا مطلب یہ ہے کہ مسافر معذور کے علاوہ کسی اور جنب کیلئے تاوقتیکہ غسل نہ کرے نماز پڑھنا جائز نہیں، مسافر معذور کیلئے تیمم کر کے نماز پڑھنا جائز ہے یا یوں کہا جائے کہ حالت جنابت میں نماز نہیں ہوتی تاوقتیکہ غسل نہ کر لے۔

ایک اعتراض

حالت جنابت میں نماز پڑھنے کی ممانعت یا نماز نہ پڑھنے کی انتہا غسل کو کیسے قرار دیا جا سکتا ہے غسل کرنے سے تو جنابت دور ہو جاتی ہے۔

جواب :۔ لفظ حتی اس حصہ کلام پر داخل ہوتا ہے جو اول کلام کے آخری جزء کے بعد ہوتا ہے جیسے نِمْتُ الْبَارِحَةَ حَتَّى الصَّبَاحِ یعنی رات کے آخری جزء کے بعد جو صبح کی حد آتی ہے میں اس وقت تک سویا، یہ ہی صورت اس جگہ ہے (کہ حالت جنابت میں نماز کی ممانعت جنابت کے آخر جزء کے بعد آنے والے غسل تک ہے اس کے بعد جائز ہے)۔

...... مزید شبہ ......

حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا کہنے کا فائدہ کیا نکلا جب کہ حالت جنابت میں نماز پڑھنے کی ممانعت کر دی (تو اس سے ظاہر ہو گیا کہ جب جنابت دور ہو جائے یعنی غسل کر لو تو نماز پڑھ سکتے ہو)۔

ازالہ :۔ یہ بات بتانی مقصود ہے کہ غسل سے جنابت دور ہو جاتی ہے غسل کے مسائل کی تفصیل سورہ مائدہ کی آیت وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا کی تفسیر کے ذیل میں آئے گی۔

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو۔

بیمار یا مسافر ہونے کا ذکر محض اتفاقی ہے کیونکہ عموماً پانی کا استعمال انہی دونوں وجہوں سے معدوم ہوتا ہے (مسافر کو پانی ملتا نہیں اور بیمار استعمال نہیں کر سکتا) لہٰذا جمہور کے نزدیک ان دونوں شرطوں کا کوئی مفہوم (احترازی) نہیں ہے۔ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ اگر کسی بستی کا پانی ختم ہو جائے اور وہاں کے باشندوں کو پانی نہ مل سکے تو تیمم سے نماز پڑھ لیں لیکن پانی ملنے پر نماز کو دوبارہ

پڑھنا لازم ہے کیونکہ تیمّم کی اجازت آیت مذکورہ میں صرف بیمار اور مسافر کے لئے ہے۔
ہم کہتے ہیں بیماری اور سفر کی شرط تیمّم کے لئے باجماع علماء نہیں ہے یہ شرط اتفاقی ہے اسی لئے تیمم سے نماز پڑھنی بالاجماع واجب ہے لہٰذا دوبارہ پڑھنا واجب نہیں ہو سکتا سبب وجوب ایک ہے واجب کیسے دوبار ہو سکتا ہے اور چونکہ بیماری یا سفر کی شرط نہیں ہے اس لئے اگر کوئی تندرست ایسی بستی میں مقیم ہو جہاں اکثر پانی ختم (یا خشک) ہو جاتا ہے اور پانی نہ ملے تو تیمّم کر کے نماز پڑھ لے پھر اگر پانی مل بھی جائے تو دوبارہ پڑھنا واجب نہ ہو گا۔ حضرت ابوذرؓ ربذہ میں مقیم تھے۔ ربذہ میں چند روز تک پانی دستیاب نہیں ہوتا تھا آپ نے رسول اللہ ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا۔ حضور (ﷺ) نے فرمایا تیرے لئے مٹی کافی ہے خواہ دس برس تجھے پانی نہ ملے۔ دوسری روایت میں ہے پاک مٹی مسلمان کا وضو ہے اگرچہ دس برس تک ہو۔ رواہ اصحاب السنن۔ ابوداؤد نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔
اگر عَابِرِیْ سَبِیْل سے مراد مسافر ہوں تو دوبارہ عَلٰی سَفَرٍ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ بیمار اور مسافر کو ایک ہی حکم کے تحت لانا مقصود ہے پانی موجود ہونے کے باوجود استعمال کرنے سے مجبور ہونا اور پانی نہ ملنا دونوں کا ایک ہی حکم ہے۔
اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ یا تم میں سے کوئی ٹٹی سے آیا ہو۔ غائط نشیبی زمین۔ گڑھا۔ غائط سے آنے سے بطور کنایہ مراد ہے۔ بول و براز سے فارغ ہو کر آنا (دیہات میں) دستور عموماً یہی ہے کہ بول و براز کے لئے لوگ پست گڑھوں کی طرف ہی جاتے ہیں (تاکہ آڑ رہے) مطلب یہ کہ اگر کوئی بول و براز کی وجہ سے بے وضو ہو جائے۔
مسئلہ :۔ اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ حسب معمول دونوں راستوں سے خارج ہونے والی چیز کے خروج سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ اگر کوئی غیر معمولی چیز (مثلاً پیپ، کیڑے، لہو وغیرہ) ان دونوں راستوں سے خارج ہو تو وضو نہیں ٹوٹتا۔ امام مالکؒ کا مسلک اس آیت کی روشنی میں یہ ہے کہ اگر کوئی غیر معمولی چیز ان راستوں سے خارج ہو تو وضو نہیں ٹوٹتا۔
مسئلہ :۔ جمہور کے نزدیک ان راستوں سے غیر معمولی چیز کا خروج بھی وضو کو توڑ دیتا ہے ایک قول امام مالک کا بھی یہی مروی ہے۔ حضرت عائشہؓ کی حدیث استحاضہ کے سلسلہ میں اس پر دلالت کر رہی ہے اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ بنت جیش سے فرمایا تھا (استحاضہ کا) خون دھو دیا کر اور ہر نماز کے لئے وضو کر لیا کر صحیح بخاری و صحیح مسلم۔
امام شافعیؒ نے اس آیت سے استنباط کیا ہے کہ قے اور خون وغیرہ جو ان دونوں معمولی راستوں سے خارج نہ ہو اس کے نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا، امام احمدؒ کے نزدیک اگر دونوں راستوں کے علاوہ کسی اور جگہ سے مذکورہ بالا چیزیں قلیل مقدار میں خارج ہوں تو وضو نہیں ٹوٹتا مگر آیت سے ان دونوں قولوں میں سے کسی کا استنباط نہیں کیا جا سکتا اس لئے امام اعظمؒ کا قول ہے کہ جو نجس چیز کہیں سے کسی مقدار میں خارج ہو وضو کو توڑ دیتی ہے اور چونکہ غیر سیال خون نجس نہیں ہے اور تھوڑی قے، بلغم اور تھوک کے حکم میں ہے اس لئے ان کا خروج ناقض وضو نہیں۔ ہمارے مسلک کا ثبوت قیاس سے ہوتا ہے۔ دونوں راستوں سے خارج ہونے والی چیز نجس ہوتی ہے اور اس کا خروج ناقض وضو ہے۔ معلوم ہوا کہ بدن کے اندر سے جو نجس چیز خارج ہو اس کا خروج ناقض ہے۔ خواہ کہیں سے ہو مگر نجس ہو اور خواہ دونوں راستوں سے بول و براز کے علاوہ کوئی اور نجس چیز خارج ہو۔
اگر شبہ کیا جائے کہ نجس چیز کے خارج ہونے سے پورے وضو کا وجوب صرف نقلی ہے۔ تقاضائے عقل کے خلاف ہے اور جو حکم غیر عقلی ہو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا (کیونکہ خلاف قیاس حکم کا اقتصار اس کے مورد اور مقام پر ہونا مسلمہ مسئلہ ہے) ہم کہتے ہیں اتنی بات تو تقاضائے عقل کے مطابق ہے کہ نجاست کے خروج سے طہارت جاتی رہتی ہے۔ ہاں صرف چار اندام کا نجس ہو جانا اور ان کی طہارت کا وجوب ضرور غیر عقلی ہے۔ لیکن اول کی طرح یہ بھی متعدی قرار پائے گا، ہمارے مسلک کا اثبات متعدد احادیث سے بھی ہوتا ہے۔
ایک روایت معدان کی ہے کہ حضرت ابودرداءؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کو قے ہوئی تو آپ نے وضو کیا۔ دمشق کی

مسجد میں میں نے اس حدیث کا ذکر حضرت ثوبان سے کیا تو انہوں نے فرمایا ابودرداءؓ نے سچ کہا۔ میں نے حضور ﷺ کو وضو کرایا تھا۔ رواہ احمد۔ اس روایت کا سلسلہ سند اس طرح امام احمدؒ نے بیان کیا ہے۔ حسین معلم۔ یحییٰ بن کثیر۔ اوزاعی۔ یعیش بن ولید مخزومی۔ معدان۔ ابودرداء۔

معترضین کا کہنا ہے کہ یہ سلسلہ مضطرب ہے کیونکہ دوسری روایت میں راویوں میں اختلاف ہے معمر نے یحییٰ بن کثیر از یعیش از خالد بن معدان از ابودرداء بیان کیا ہے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ بعض راویوں کا مضطرب ہونا، دوسروں سے ضبط و حفظ پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ اثرم کا بیان ہے میں نے امام احمد سے کہا لوگ اس حدیث میں مضطرب ہیں فرمایا حسین معلم نے تو بغیر اضطراب کے بیان کی ہے ترمذی نے بھی اس کو حسن اور صحیح ترین کہا ہے۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم میں سے کسی کو نماز میں قے ہو جائے تو (نماز چھوڑ کر) جا کر اس کو وضو کرنا چاہئے پھر (آکر) اپنی گزشتہ نماز پر بناء کرے (یعنی جتنی پڑھ چکا ہے اس سے آگے پڑھے) بشرطیکہ اس نے کلام نہ کیا ہو۔ دار قطنی نے یہ حدیث اسماعیل بن عیاش کی روایت سے متصلاً بیان کی ہے اس کی سند میں ایک شخص عبداللہ بن ابی ملیکہ ہیں جنہوں نے حضرت عائشہؓ سے یہ حدیث سنی۔ دار قطنی ہے لکھا ہے کہ حفاظ حدیث نے اس حدیث کو ابن جریج سے مرسلاً بیان کیا ہے متصلاً بیان صرف اسماعیل بن عیاش کی روایت میں ہے اور ابو حاتم رازی نے اسماعیل کو ہیچ قرار دیا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ یحییٰ بن معین نے اسماعیل بن عیاش کو ثقہ کہا ہے اور ثقہ کی طرف سے اگر زیادتی ہو تو وہ قابل قبول ہوتی ہے اور علماء حدیث کا طریقہ ہی ہے کہ (بنظر احتیاط) مرسل کو مقدم قرار دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ (اس حدیث کو اگر مرسل ہی مانا جائے تو) مرسلؒ ہمارے نزدیک حجت ہے۔ اس موضوع کی متعدد احادیث اور بھی ہیں جن کو طوالت کے خوف سے ہم نے ذکر نہیں کیا۔

امام احمد نے قلیل و کثیر کا جو فرق قائم کیا ہے تو اسکے ثبوت میں انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث پیش کی ہے حضرت ابو ہریرہؓ کی مرفوع حدیث ہے کہ ایک دو قطرے خون (کے نکلنے) سے وضو (لازم) نہیں ہاں اگر سیال خون ہو (تو ایک قطرہ خون بھی ناقص وضو ہے)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پھوڑوں سے (رسنے والے) خون میں اجازت دیدی تھی۔ یہ دونوں حدیثیں دار قطنی نے نقل کی ہیں۔ اول حدیث کی سند میں ایک راوی محمد بن فضل بن عطیہ ہے جس کو امام احمد اور یحییٰ بن حبان نے جھوٹا کہا ہے اور دوسری روایت عطیہ نے لفظ عن سے روایت کی ہے اور یہ مدلس ہے۔

امام مالکؒ اور شافعیؒ نے اپنے استدلال میں حضرت انسؓ کی روایت کردہ حدیث پیش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پچھنے لگوائے اور بغیر (جدید) وضو کئے نماز پڑھی صرف پچھنے لگنے کی جگہ کو دھو ڈالا اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا۔ رواہ الدار قطنی والبیہقی۔ اس کی سند میں صالح بن مقاتل راوی ہے جو ضعیف ہے۔ نووی نے اس کو ضعفاء کی فہرست میں ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے ابن عربی کا قول لکھا ہے کہ دار قطنی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے مگر یہ واقعہ کے خلاف ہے کیونکہ صالح قوی نہیں ہے۔

حضرت ثوبانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قے کی پھر وضو کا پانی طلب فرما کر وضو کیا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا قے سے وضو فرض ہو جاتا ہے فرمایا اگر فرض ہو جاتا تو تجھے قرآن میں ملتا۔ رواہ الدار قطنی۔ اس کی سند میں عتبہ بن السکن راوی ہے جو متروک الحدیث ہے۔ بیہقی نے لکھا ہے کہ اس کو واضع حدیث (حدیثیں خود ساختہ بیان کرنے والا) کہا گیا ہے۔

اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ یا تم عورتوں سے لگے ہو۔ لگنے اور چھونے سے بطور کنایہ جماع مراد ہے حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابو موسیٰؓ اشعری، حسنؒ، مجاہدؒ اور قتادہ کا یہی قول ہے۔ ابو حنیفہؒ اور سفیانؒ ثوری بھی

اسی کے قائل ہیں۔ اس صورت میں جنابت بمعنی انزال ہوگا۔ بمعنی جماع نہ ہوگا ورنہ عطف صحیح نہ ہوگا (کیونکہ معطوف اور معطوف علیہ کا مفہوم جدا جدا ہونا چاہئے اور جنباً سے مراد بھی جب جماع ہوگا اور لمس نساء سے تو جماع مراد ہی ہے لہٰذا معطوف علیہ کا مفہوم ایک ہی ہوا)۔

حضرت ابن مسعودؓ، حضرت عمر بن خطابؓ، حضرت ابن عمرؓ اور شعبیؒ کا قول ہے کہ ملامستِ نساء سے مراد حقیقی معنی ہے یعنی بیرونی جلد سے لگ جانا اور چھو دینا۔ اسی بنیاد پر یہ حضرات قائل ہیں کہ عورت کو چھو دینے سے وضو، ٹوٹ جاتا ہے بشرطیکہ دونوں کے درمیان کوئی (کپڑا وغیرہ) حائل نہ ہو۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس سے مراد ہے جماع کے علاوہ (ہر قسم کا لمس اور مس) بیہقی نے حضرت ابن مسعود کا قول نقل کیا ہے کہ بوسہ بھی ایک قسم کا لمس ہے اور اس میں وضو لازم ہے۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ جس نے اپنی بیوی کا بوسہ لیا یا اس کو ہاتھ سے چھوا تو اس پر وضو لازم ہے۔ امام احمد زہری اور اوزاعی بھی عورت کے چھونے کو وضو شکن قرار دیتے ہیں[1] ایک روایت میں امام شافعیؒ کا قول بھی یہی آیا ہے۔

امام مالکؒ امام شافعیؒ اسحاق اور ایک روایت میں امام احمدؒ کا بھی قول ہے کہ شہوت کے ساتھ مشتہاۃ عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے ورنہ نہیں ٹوٹتا۔ (یعنی شہوت کے ساتھ نہ چھوئے یا عورت مشتہاۃ نہ ہو تو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا) امام شافعیؒ کے نزدیک شرط یہ ہے کہ ہاتھ کے اندرونی حصہ سے چھوئے اگر ہاتھ کا بیرونی بالائی حصہ لگ جائے گا تو وضو نہ ٹوٹے گا۔ آپ نے مس ذکر پر قیاس کیا ہے کیونکہ مطلق کو مقید پر محمول کیا جاتا ہے (یعنی اگر ایک حکم بلا شرط اور بغیر قید کے ہو اور دوسری روایت میں شرط اور قید کا بھی ذکر ہو تو بلا قید حکم کو بھی مقید مانا جائے گا) خواہ دونوں کا تعلق الگ الگ واقعہ سے ہو اور مس ذکر کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد موجود ہے کہ اگر تم میں سے کوئی اپنا ہاتھ اپنی شرم گاہ تک پہنچا دے (تو دوبارہ وضو کرے) علماء نے لکھا ہے کہ لفظ افضاء اسی معنی (یعنی باطن کف سے مس) کو مفید ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ لفظ افضاء کے ساتھ مس ذکر والی حدیث صحیح نہیں ہے پھر افضاء کا یہ معنی بھی ہم کو تسلیم نہیں ہے اور مطلق و مقید کا تعلق دو واقعوں سے ہو تو مطلق کو مقید پر محمول کرنا ہمارے نزدیک درست نہیں۔ لہٰذا امام اعظمؒ کے مسلک پر آیت کا توضیحی مطلب اس طرح ہوگا کہ اگر تم جنب ہو یعنی تم کو انزال ہو گیا ہو۔ بیماری کی حالت ہو یا سفر کی یا بول و براز وغیرہ سے تمہارا وضو ٹوٹ گیا ہو۔ یا بغیر انزال کے تم نے جماع کیا ہو تو تیمم کر سکتے ہو۔

امام شافعی کے مسلک پر توجیہ اس طرح ہوگی اگر تم جنب ہو یعنی تم نے عورتوں سے جماع کیا ہو بیمار ہو یا سفر کی حالت میں، یا بول و براز کی وجہ سے یا عورت کو چھونے کی وجہ سے بے وضو ہو گئے ہو تو تیمم کر لو۔ اگر مرضیٰ کے ساتھ جنبا کو محذوف نہ مانا جائے۔ تو آئندہ آیت اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ میں او کو واو عاطفہ کے معنی میں لینا ہوگا اور کلام کا مطلب اس طرح ہوگا کہ تم اگر بیمار یا مسافر ہو اور تم میں سے کوئی ٹٹی سے آئے یا تم نے جماع کیا ہو۔ اس وقت ملامست سے جماع مراد ہوگا عورت کو چھونا مراد نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ حقیقت و مجاز کا اجتماع درست نہیں یعنی حقیقی اور مجازی معنی بیک وقت مراد لینا ناجائز ہے۔

حضرت عمرؓ کے نزدیک چونکہ لمس سے مراد چھونا ہی ہے اور آپ ﷺ نے جنبا کو مرضیٰ سے پہلے محذوف نہیں قرار دیا ہے اس لئے جنب کے لئے تیمم آپ کے نزدیک جائز نہ تھا۔ جیسا کہ حضرت عمارؓ سے مناظرہ کے وقت آپ نے بیان کیا تھا۔ (مناظرہ کا یہ قصہ آگے آئے گا)۔

ابن جوزیؒ نے بیان کیا ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ خدمت گرامی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک شخص نے حاضر

---

[1] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا بوسہ بھی ایک طرح کا لمس ہے اس کے بعد بھی وضو کرو، حضرت عثمانؓ نے فرمایا چھونا، (صرف) ہاتھ سے ہوتا ہے۔ (از مولف رحمۃ اللہ)

ہو کر عرض کیا یارسول اللہ ﷺ ایک مرد نے ایک عورت سے وہ تمام حرکتیں کیں جو مرد عورت سے کرتا ہے۔ صرف جماع نہیں کیا، حضور ﷺ کا اس کے متعلق کیا حکم ہے فرمایا اچھی طرح وضو کر کے کھڑا ہو کے نماز پڑھ لے۔ ابن جوزی نے کہا اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ مگر ابن جوزی کا اس جگہ یہ استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ سائل کے سوال کی یہ غرض نہ تھی کہ عورت کے چھونے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں۔ اس کا مقصد تھا اس جرم کی معافی کی صورت دریافت کرنا اور یہ معلوم کرنا کہ ایسے شخص کی شرعی سزا کیا ہے؟ چنانچہ رسول ﷺ نے اس کو بتا دیا کہ اچھی طرح وضو کرنا اور نماز پڑھنا اس کے گناہ کا کفارہ ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں آیا ہے کہ مسلمان وضو کرتے وقت جب منہ دھوتا ہے تو اس کے چہرہ کے سب گناہ دھل کر نکل جاتے ہیں الخ حضرت عثمانؓ کی بھی مرفوع روایت ہے کہ جس شخص نے میرے وضو کی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھی جس کے اندر کوئی دوسرا خیال اپنے دل میں نہ لایا تو اس کے گزشتہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ صحیحین۔ ایک اور روایت میں حضرت انسؓ کا بیان آیا ہے کہ ایک شخص نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میں نے شرعی حد کے قابل جرم کیا ہے۔ مجھ پر حد جاری فرما دیجئے۔ حضور ﷺ نے اس سے جرم کچھ نہ پوچھا اور نماز کا وقت آ گیا تو اس نے حضور ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی الحدیث۔ اس حدیث میں وضو کا حکم نہیں ہے۔ صحیحین۔

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص خدمت گرامی میں حاضر ہوا اور عرض کیا یارسول اللہ ﷺ مدینہ کے آخری حصہ میں ایک عورت سے میری ملاقات ہوئی اور جماع کے علاوہ میں نے اس سے ہر حرکت کی۔ الحدیث۔ اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ۔

ہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ (رات کو) نماز پڑھتے تھے اور میں حضور ﷺ کے سامنے جنازہ کی طرح پڑی رہتی تھی جب آپ سجدہ کرتے تھے تو مجھے ہاتھ سے دبا دیتے تھے تو میں پاؤں سمیٹ لیتی تھی۔ دوسری روایت میں ہے کہ اس زمانہ میں گھروں کے اندر چراغ نہیں ہوتے تھے۔ متفق علیہ یہ حدیث بہت طریقوں سے آئی ہے۔

حضرت عائشہ راوی ہیں ایک رات رسول اللہ ﷺ کو میں نے موجود نہ پایا ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا تو میرا ہاتھ آپ کے قدم پر لگا اس وقت آپ سجدہ میں تھے اور کہہ رہے تھے اے اللہ میں تیرے غضب سے تیری رضامندی کی اور تیرے عذاب سے تیری معافی کی اور تجھ سے تیری ہی پناہ لیتا ہوں میں تیری حمد پوری پوری نہیں کر سکتا تو ایسا ہی ہے جیسی تو نے اپنی تعریف کی ہے۔ رواہ البخاری۔ طبرانی کی روایت میں (حضرت عائشہؓ کا قول) ہے میں نے آپ کے بالوں میں اپنا ہاتھ ڈالا تا کہ یہ معلوم کر لوں کہ آپ نے غسل کیا ہے یا نہیں حافظ نے کہا بظاہر یہ دونوں واقعے جدا جدا ہیں۔ کلام کی رفتار تغایر کی مقتضی ہے۔

حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ اعتکاف کی حالت میں ہوتے تھے اور میں آپ کے بالوں میں کنگھا کرتی تھی۔ رواہ البخاری۔ ظاہر ہے کہ مسجد کے اندر رسول اللہ ﷺ کا اعتکاف کی حالت میں ہونا بغیر وضو کے نہ ہو گا۔

حضرت عائشہ، حضرت میمونہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ ان میں سے ہر ایک رسول اللہ ﷺ کے ساتھ (ایک پردہ بیچ میں ڈال کر) ایک برتن سے پانی لے کر غسل کرتی تھی۔

میں کہتا ہوں غسل سے پہلے وضو کرنا سنت ہے اور اشتراک کی صورت میں ناممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ بی بی کے ہاتھ سے نہ لگے۔

حضرت ابوقتادہؓ کی روایت ہے کہ حضرت زینب کی صاحبزادی امامہ کو (پشت پر) اٹھائے ہوئے حضور ﷺ نماز میں مشغول ہوتے تھے۔ صحیحین۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے میں حیض کی حالت میں ہوتی تھی رسول اللہ ﷺ کا سر میری گود میں

ہوتا تھا اور اسی حالت میں آپ قرآن پڑھتے تھے۔ صحیحین۔

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ میری گود میں حضور ﷺ کی وفات ہوئی اور بداہت عقل کا تقاضا ہے کہ وفات کے وقت آپ ﷺ بے وضو نہیں ہوں گے۔

انہی احادیث کی وجہ سے امام شافعیؒ اور ان کے ساتھیوں نے آیت میں مزید شرط یہ لگادی ہے کہ عورت کو چھونا اس وقت ناقض وضو ہوتا ہے جب شہوت کے ساتھ ہو لیکن اس قول کے خلاف بھی حضرت عائشہ کی وہ حدیث ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی بعض بیویوں کا بوسہ لے کر بغیر (تازہ وضو کئے نماز کو تشریف لے گئے۔ رواہ البزار۔ بزار نے اس حدیث کو حسن کہا ہے اور ترمذی وابن ماجہ نے بھی یہ حدیث بیان کی ہے اور سلسلہ سند وکیع از اعمش از حبیب بن ابی ثابت از عروہ از ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کیا ہے۔ اگر شبہ کیا جائے کہ بخاری نے اس کو ضعیف کہا ہے اور صراحت کی ہے کہ حبیب نے عروہ سے نہیں سنا تو یہ شبہ غلط ہے کیونکہ اس حدیث کے راوی سب ثقہ ہیں اور نہ سننے کی شہادت نفی کی شہادت ہے جو قابل قبول نہیں۔

امام احمد اور ابن ماجہ نے حضرت عائشہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ وضو کرنے کے بعد بوسہ لیتے تھے پھر بغیر (جدید) وضو کئے نماز پڑھ لیتے تھے۔ (اس روایت کا سلسلہ حجاج از عمرو بن شعیب از زینب سہمیہ از ام المومنین عائشہؓ ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ زینب نامعلوم ہے۔

میں کہتا ہوں اگر زینب مجہول بھی ہے تب بھی اس کی روایت مقبول ہے کیونکہ وہ دوسرے قرن کی عورت ہے اور دوسرے قرن کے مجہول راوی کی روایت معتبر ہے۔ اس روایت میں حجاج اگرچہ بعض لوگوں کے نزدیک مجروح ہے لیکن اوزاعیؒ نے اس کی طرح براہ راست عمرو بن شعیب کی روایت بیان کی ہے۔ دار قطنی نے یہی کہا ہے اور اوزاعیؒ بہت ثقہ تھے۔ دار قطنی نے یہ حدیث سفیان ثوریؒ کے طریق سے بھی بیان کی ہے۔ اس سند میں ابراہیم تیمی سے حضرت عائشہؓ کا فرمانا منقول ہے جس پر ترمذی نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ سے ابراہیمؒ کا سننا ثابت نہیں اور نہ اس موضوع کی کوئی حدیث مرفوع صحیح ہے میں کہتا ہوں ابراہیمؒ جلیل القدر تابعی ہیں ان کا سننا ممکن تو ہے اور صحت کے لئے امکان سماع ہی کافی ہے۔ ثبوت سماع کی ضرورت نہیں پھر اگر اس کا رفع صحیح نہ بھی ہو تو حدیث مرسل ہو جائے گی اور ہمارے نزدیک مرسل قابل استدلال ہے۔ رہا ترمذی کا قول کہ اس موضوع کی کوئی حدیث رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں تو غالباً ترمذی کی مراد یہ ہے کہ کوئی حدیث متصل السند مرفوع صحیح بذاتہ ثابت نہیں ورنہ یہ حدیث مرسل موجود ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

سوال :۔ اگر سوال کیا جائے کہ ابوروق اور عطیہ بن حارث کے علاوہ ابراہیمؒ کے بیان کا کوئی اور ناقل نہیں اور ابوروق کی روایت نقل کرنے والے صرف سفیانؒ ثوری اور ابو حنیفہؒ ہیں پھر ان دونوں میں بھی اختلاف ہے ثوریؒ نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے اور ابو حنیفہؒ کی روایت سے نقل کیا ہے اور ان دونوں کے قول کو نقل کرنے والا صرف ابراہیم ہے حالانکہ ابراہیمؒ کی سماعت ان دونوں سے ثابت نہیں۔

جواب :۔ ہم اس کے جواب میں کہیں گے یہ چاروں آئمہ ثقہ ہیں یہ ممکن ہے کہ ابراہیمؒ نے دو مرسل حدیثیں بیان کی ہوں ایک حضرت عائشہؓ کی روایت سے اور دوسری حضرت حفصہؓ کی روایت سے پہلی حدیث ثوری کو پہنچی ہو اور دوسری امام ابو حنیفہؒ کو اور فقہاء کے نزدیک اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ثوری کی دوسری روایت کے سلسلہ میں اتصال ہے کیونکہ ابراہیمؒ تیمی نے اپنے باپ کی وساطت سے حضرت عائشہ کا قول نقل کیا ہے۔

اگر یہ شبہ ہو کہ حدیث کے الفاظ میں اختلاف ہے کیونکہ عثمان بن ابی شیبہ کی روایت میں حدیث کے یہ الفاظ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ روزہ کی حالت میں بوسہ لیتے تھے اور دوسرے لوگوں کی روایت اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ بوسہ کے بعد وضو نہیں کرتے تھے۔

توہمارے نزدیک یہ شبہ بھی بے بنیاد ہے جب دونوں روایتوں کے راوی ثقہ ہیں تو دونوں کو صحیح قرار دینا ممکن ہے کیونکہ ممکن ہے یہ دو حدیثیں الگ الگ ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی حدیث ہو کہ رسول اللہ ﷺ روزہ کی حالت میں بوسہ لیتے تھے پھر وضو نہیں کرتے تھے اب ایک روایت میں صرف روزہ کی حالت کا ذکر ہے اور دوسری روایت میں وضو نہ کرنے کا (پوری حدیث کسی نے نہیں نقل کی) اور یہ بخاری کے نزدیک جائز ہے۔

حافظ ابن حجرؒ کا بیان ہے کہ امام شافعی نے فرمایا ہم سے سعید بن بنانہ نے بحوالہ محمد بن عمر عطاء بیان کیا کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ بوسہ لیتے اور (پھر) وضو نہیں کرتے تھے۔ امام شافعی نے فرمایا مجھے سعیدؒ کا حال معلوم نہیں اگر وہ ثقہ ہیں تو یہ حدیث نبوی حجت ہے، حافظ نے کہا کہ بیہقی نے دس طریقوں سے یہ حدیث نقل کی ہے اور سب کو ضعیف قرار دیا ہے۔

میں کہتا ہوں حدیث کی روایت کے اگر ضعیف طریقے متعدد ہوں تو حسن کے درجہ تک ایسی حدیث پہنچ جاتی ہے اور ان سلسلوں کے راویوں میں سے کوئی بھی مہتم بالکذب نہیں ہے (معلوم ہوا کہ حدیث حسن ہے) حضرت ابوامامہؓ کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ کوئی آدمی نماز کا وضو کرنے کے بعد اپنی بیوی کا بوسہ لیتا ہے یا اس سے تفریح کرتا ہے کیا اس کا وضو ٹوٹ جائے گا۔ فرمایا نہیں۔ رواہ الدار قطنی اس روایت کے سلسلہ میں ایک راوی رکن بن عبد اللہ ہے جو متروک الحدیث ہے۔

جب اس حدیث کے متعدد طرق سب کے سب حسن ہیں اور ایک دوسرے کا مؤید ہے یا مرسل صحیح ہیں تو یہ کہنا صحیح ہے کہ بوسہ لینے کے بعد رسول اللہ ﷺ (جدید) وضو نہیں کرتے تھے معلوم ہوا کہ عورت کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اگر نقض وضو ہوتا تو روایت میں کہیں آتا خواہ کسی ایک صحابی کی ہی روایت ہوتی خصوصاً امہات المومنینؓ بیان کرتیں کیونکہ ان کی تعداد کثیر تھی ان کو اظہار مسائل شریعت کی غیر معمولی رغبت تھی اور رسول اللہ ﷺ کا ان سے اختلاط اور ملامست بکثرت ہوتا تھا۔ دیکھو حاکم کی روایت میں آیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کوئی دن نہ جاتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس آکر ہمارا بوسہ نہ لیتے ہوں اور لمس نہ کرتے ہوں اس سے صاف ظاہر ہے کہ آیت میں لمس سے مراد جماع ہے۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر آیت میں لمس سے مراد جماع کے علاوہ اور ہر طرح سے چھونا ہو تو خواہ مخواہ عبارت میں طول ہوگا کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا بے وضو آدمی کے لئے تیمم کا جواز تو آیت اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ سے سمجھ لیا جاتا ہے پھر لامستم کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ آیت کا مقصود تو یہ ہے کہ مٹی پانی کے قائم مقام ہو سکتی ہے وضو توڑنے والی چیزوں کی گنتی بتانا تو مقصود ہی نہیں ہے کیونکہ آیت میں بہت سی وضو شکن چیزوں کا بیان کیا ہی نہیں گیا ہے مثلاً خواب بیہوشی جنون، بول و براز کے راستوں کے علاوہ دوسرے راستوں سے کسی چیز کا خروج، قہقہہ، اونٹ کا گوشت کھانا، شرمگاہ کو چھونا (وغیرہ) لیٹ کر یا تکیہ لگا کر سو جانا یا بیہوش ہو جانا یا دیوانگی کا دورہ پڑ جانا عموماً نقض وضو ہے اور یہ فیصلہ اجماعی ہے۔ حضور اقدس ﷺ کے فرمان میں آیا ہے وَلٰكِنْ مِّنْ غَائِطٍ وَبَوْلٍ وَنَوْمٍ۔ اس حدیث کے راوی حضرت صفوانؓ بن عسال ہیں اور ابن خزیمہ و ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ اسی طرح رکوع اور سجدہ میں سو جانا امام مالکؒ کے نزدیک اور کھڑے کھڑے سو جانا امام شافعی کے نزدیک اور بہر ہیئت سو جانا بشرطیکہ نیند طویل ہو امام احمد کے نزدیک ناقض وضو ہے مگر امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک نماز کے اندر کسی حالت اور کسی رکن میں سو جانے سے وضو نہیں ٹوٹتا (بشرطیکہ سہارے کے ساتھ نہ سو جائے) کیونکہ حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سجدہ میں جو شخص سو جائے اس پر (جدید) وضو نہیں جب تک لیٹ نہ جائے جب لیٹ جائے گا تو اس کے جوڑ ڈھیلے پڑ جائیں گے۔ رواہ عبد اللہ بن احمد۔

ابوداؤد اور ترمذی کی روایت میں ہے جو شخص بیٹھا بیٹھا سو جائے اس پر وضو نہیں بیہقی کی روایت میں ہے جو شخص بیٹھے بیٹھے یا کھڑے کھڑے یا سجدہ میں سو جائے اس پر وضو واجب نہیں۔ ان تمام روایات میں ایک راوی یزید بن خالد دالانی آتا ہے جس کو بعض اماموں نے ضعیف کہا ہے۔ لیکن حقیقت میں ذہبی کا فیصلہ صحیح ہے کہ یزید حسن الحدیث ہے۔ امام احمد نے فرمایا اس

میں کوئی خرابی نہیں۔

اور چونکہ بیہوشی اور جنون میں غفلت نیند سے زیادہ ہوتی ہے اس لئے باجماع علماء یہ ناقض وضو ہے خواہ کسی حالت میں اور کسی ہیئت پر ہو۔

مسئلہ :۔ امام اعظمؒ کے نزدیک رکوع سجود والی نماز میں قہقہہ ناقض وضو ہے کیونکہ ارشاد گرامی ہے جو شخص نماز کے اندر ٹھٹھا مار کر ہنسے اس کو دوبارہ وضو اور نماز ادا کرنا چاہئے۔ رواہ ابن عدی عن ابن عمرؓ اس حدیث کا کچھ حصہ مزید بطور متابعت مسلم نے بھی لکھا ہے۔ ابن عدی کے معتبر اور غیر معتبر ہونے میں اختلاف ہے تحقیق یہ ہے کہ ابن عدی ثقہ مدلس ہے اور ثقہ مدلس اگر لفظ حدثنا کہہ کر کسی ثقہ راوی کا بیان نقل کرے تو معتبر ہے اس روایت میں یہی ہے لہٰذا یہ حدیث معتبر ہے۔

ایک نابینا کے قصہ میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا تم میں سے جس نے ٹھٹھا مارا ہو وہ وضو بھی دوبارہ کرے اور نماز کا بھی (اعادہ کرے) یہ حدیث معبد خزاعی کی روایت سے دار قطنی نے لکھی ہے صحیح یہ ہے کہ یہ معبد صحابیؓ ہیں اور ام معبد کے بیٹے ہیں۔ اس حدیث کے راویوں میں سے ایک امام ابو حنیفہؒ بھی ہیں لیکن ابن جوزی کو وہم ہو گیا کہ وہ امام ابو حنیفہؒ کے متعلق لکھتا ہے کہ ابو حنیفہؒ کو اس حدیث (کی عدم صحت) کا وہم ہو گیا (حالانکہ یہ حدیث صحیح ہے) دار قطنی نے اس حدیث کو ایک انصاری کی روایت سے نقل کیا ہے اس سند میں ایک شخص خالد بن عبداللہ واسطی ہیں اور ہم نہیں جانتے کہ کسی نے ان پر جرح کی ہو صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث مرسل ابو العالیہ ہے اور مرسل (تابعی) ہمارے نزدیک حجت ہے۔ قہقہہ کو ناقض وضو نہ سمجھنے والوں نے حضرت جابرؓ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ ہنسی نماز کو توڑ دیتی ہے وضو کو نہیں توڑتی (ہم کہتے ہیں کہ ہنسی سے مراد معمولی ہنسی ہے ٹھٹھہ نہیں ہے بین الاحادیث موافقت اسی طرح پیدا ہو سکتی ہے اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ اس روایت میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن اسحاق ہے جس کے متعلق یحییٰ نے کہا ہے کہ ابو شیبہ (عبدالرحمٰن بن اسحاق) ضعیف ہے اور امام احمدؒ نے کہا ہے یہ کچھ نہیں ہے منکر ہے۔ یعنی غیر معروف)

مسئلہ :۔ امام احمد کے نزدیک اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو کرو۔ یہ حدیث حضرت براء کی روایت سے اصحاب سنن نے نقل کی ہے اور اہل حدیث نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے اور امام احمد نے حضرت اسید بن حضیر اور ذی العزۃ کی روایت سے یہ حدیث بیان کی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع روایت ہے کہ وضو اس چیز سے واجب ہوتا ہے جو (بدن کے) اندر سے باہر نکلے اس چیز سے واجب نہیں ہوتا جو باہر سے اندر داخل ہو (اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ کا گوشت ہو یا کوئی اور چیز کسی چیز کو کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا) دار قطنی اور بیہقی نے اس حدیث کو بیان کیا ہے لیکن یہ حدیث ضعیف منکر ہے۔

مسئلہ :۔ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک شرم گاہ کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ امام شافعی نے کہا اگر ہاتھ کے اندرونی حصہ (یعنی ہتھیلی یا انگلیوں کی اندرونی سطح) سے چھوئے گا تو وضو ٹوٹ جائے گا (اور ہاتھ کا بالائی حصہ چھو جانے سے نہیں ٹوٹتا) کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے جس نے اپنی شرم گاہ کو چھو لیا ہو وہ بغیر (جدید) وضو کئے نماز نہ پڑھے۔ اس حدیث کو عروہؓ کی وساطت سے حضرت بسرہؓ کی روایت سے تینوں اماموں نے اور چاروں اصحاب السنن نے نیز دوسرے علماء نے نقل کیا ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں یہ حدیث منقطع ہے، لیکن تحقیق یہ ہے کہ یہ حدیث متصل صحیح ہے۔ عروہ نے بروایت مروان حضرت بسرہؓ کا بیان نقل کیا پھر عروہ نے خود جا کر بسرہؓ سے یہ حدیث سنی۔ اس حدیث کے تمام راوی وہ ہیں جو صحیحین میں موجود ہیں امام احمد ترمذی یحییٰ اور دار قطنی نے اس کو صحیح کہا ہے۔ بخاری نے تو موضوع بحث کی سب سے زیادہ صحیح حدیث اس کو کہا ہے۔

اس موضوع کی ایک مرفوع حدیث حضرت زید بن خالدؓ کی روایت سے ترمذی اور امام احمد نے نقل کی ہے جو شخص اپنی شرم گاہ کو چھولے اس کو وضو کرنا چاہئے۔ ترمذی احمد اور بیہقی نے عمرو بن شعیب کے دادا کی روایت سے ایسی ہی حدیث نقل کی

ہے جس کی تصحیح بخاری نے بقول ترمذی کی ہے۔

اسی باب کی ایک حدیث حضرت ابوایوب کی روایت سے ابن ماجہ نے اور حاکم نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت ام سلمہؓ کی روایت سے اور بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھی ہے مگر یہ تمام احادیث ضعیف ہیں۔

طبرانی نے حضرت علیؓ بن طلق کی روایت سے اسی مضمون کی حدیث بیان کی ہے اور اس کو صحیح کہا ہے اسی طرح ابن مندہؒ نے حضرت نعمانؓ حضرت انسؓ حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت معاویہؓ بن جندبؓ اور حضرت قبیصہؓ کی روایت کردہ احادیث اور ترمذی نے حضرت اروی بنت انسؓ کی حدیث بیان کی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ نے استدلال میں حضرت طلق بن علیؓ کی حدیث پیش کی ہے کہ حضور ﷺ سے عرض کیا گیا یارسول اللہ ﷺ اگر کوئی شخص اپنی شرم گاہ کو چھولے تو کیا وضو کرے فرمایا وہ تو تیرے بدن ہی کا ایک ٹکڑا ہے (اس کو چھونے سے وضو کیسے ٹوٹ جائے گا) یہ حدیث اصحاب سنن اور امام احمدؒ نے نقل کی ہے اور عمرو بن علی فلاس اور ابن المدینی اور ابن حبان اور طبرانی اور ابن حزم نے اس کو صحیح کہا ہے لیکن امام شافعی ابوزرعہ، ابوحاتم، دار قطنی اور بیہقی نے اس کو ضعیف کہا ہے۔

میں کہتا ہوں اس حدیث کی پانچ سندیں ہیں چار ضعیف ہیں۔ ایک سند کے راوی ثقہ ہیں سوائے قیس بن طلق کے جس نے اپنے باپ کا بیان نقل کیا ہے اس کے متعلق اختلاف ہے امام نے اس کی تضعیف اور عجلی نے توثیق کی ہے یحییٰ کے دونوں قول روایت میں آئے ہیں۔ پس جو علماء قیس کو ثقہ کہتے ہیں ان کے نزدیک حدیث صحیح ہے ورنہ غیر صحیح۔ میرے نزدیک حدیث یقیناً حسن ہے لیکن بسرہ کی حدیث اس سے قوی ہے۔

مس ذکر سے وضو نہ ٹوٹنے کی احادیث حضرت ابوامامہ حضرت عصمہ بن مالکؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایت سے بھی آئی ہیں جو سب کی سب ضعیف ہیں۔ ابن حبان نے دعویٰ کیا ہے کہ طلق والی حدیث منسوخ ہے کیونکہ حضرت ابوہریرہؓ ۶ھ میں اسلام لائے تھے اور انہوں نے ہی مس ذکر کو ناقض وضو قرار دینے والی حدیث روایت کی ہے اور طلق رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آغاز ہجرت میں اس وقت حاضر ہوئے تھے جب مسجد نبوی کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ کذا رواہ الدار قطنی۔

میں کہتا ہوں دار قطنی کی اس روایت کی سند ہی ضعیف ہے اس کے علاوہ اگر حضرت طلقؓ پہلی مرتبہ مسجد نبوی کی تاسیس کے وقت حاضر ہوئے تھے تو اس سے یہ لازم نہیں (بلکہ بعید از عقل ہے) کہ ابوہریرہؓ کے مسلمان ہونے کے بعد پھر کبھی نہ آئے ہوں (اور اول حاضری کے وقت ہی حدیث مذکور سنی ہو) پھر ابوہریرہؓ والی حدیث خود ضعیف ہے جس سے طلق والی حدیث کو منسوخ نہیں کہا جاسکتا۔

فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً اور تم کو پانی نہ ملے یعنی پانی استعمال نہ کر سکو۔ حدیث اور اجماع سے اس جملہ کا توضیحی مطلب یہی ثابت ہے۔ پانی کو استعمال کرنے کی قدرت نہ ہونا عام ہے خواہ پانی موجود ہی نہ ہو یا ایک میل دور میں ہو یا یہ ڈر ہو کہ اگر پانی لینے جائے گا اور وضو کرے گا تو قافلہ غائب ہو جائے گا یا کنویں سے پانی بھرنے کا کوئی برتن نہ ہو یا پانی پر کوئی درندہ۔ سانپ اور دشمن موجود ہو یا پیاس کا خوف ہو (کہ اگر وضو کرے گا تو پیاسا رہ جائے گا) یا مرض پیدا ہو جانے کا ڈر ہو یا زیادہ لاغری اور کمزوری ہو یا ایسی بیماری ہو کہ حرکت نہ کر سکتا ہو اور کوئی دوسرا کام کرنے والا بھی نہ ہو یا پانی کے استعمال یا جسمانی حرکت سے مرض کی شدت کا یا ہلاکت کا یا کسی عضو کے مفلوج ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ ایک روایت میں امام شافعی کا قول ہے کہ ہلاکت اور عضو کے مفلوج ہو جانے کا اندیشہ ہی تیمم کو جائز کر دیتا ہے (باقی مرض کی شدت کا اندیشہ مانع نہیں مانا جائے گا)۔

ابن ابی حاتم نے مجاہدؒ کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک انصاری بیمار تھے نہ خود اٹھ کر وضو کرنے کی طاقت تھی نہ کوئی خادم تھا کہ پانی دے کر وضو کرا دیا کرے اس کا تذکرہ حضور ﷺ کی خدمت میں کیا گیا اس پر اللہ نے آیت وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى نازل فرمائی۔

ابن جریر نے ابراہیم نخعی کا بیان نقل کیا ہے کہ صحابہؓ کو کچھ زخم لگے جن سے وہ بیہوش ہو گئے اور اسی دوران میں جنابت میں بھی مبتلا ہو گئے لوگوں نے یہ شکایت حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کی اس پر آیات وَ اِنْ كُنْتُمْ مرضٰے الٰی اخرھا نازل

ہوئیں۔

حضرت عمرو بن عاصؓ کا بیان ہے کہ غزوہ ذات السلاسل میں ایک ٹھنڈی رات کو مجھے احتلام ہو گیا غسل کرتا تو مر جانے کا ڈر تھا اس لئے تیمّم کر کے ساتھیوں کو فجر کی نماز پڑھا دی۔ اس کا تذکرہ حضور ﷺ کی خدمت میں کیا گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا عمروؓ تو نے اپنے ساتھیوں کو جنابت کی حالت میں نماز پڑھا دی۔ میں نے عرض کیا (جی ہاں) میں نے خود اللہ کا یہ فرمان سنا تھا کہ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ حضور یہ سن کر ہنس دیئے اور مجھ سے کچھ نہیں فرمایا۔ بخاری نے اس بیان کو تعلیق کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ابوداؤد اور حاکم نے بھی اس کو بیان کیا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق روایت میں آیا ہے کہ آپ اپنی زمین واقع جرف سے آ رہے تھے۔ مربد النعم میں پہنچے تو عصر کی نماز تیار تھی آپ نے تیمّم کر لیا یعنی چہرے اور دونوں ہاتھوں پر مسح کر لیا اور عصر کی نماز پڑھ لی۔ نماز کے بعد مدینہ میں پہنچے تو اس وقت سورج کچھ اونچا تھا لیکن آپ نے نماز نہیں لوٹائی۔ رواہ الشافعی امام مالکؒ نے اس کو مؤطا میں مختصراً نقل کیا ہے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ جرف مدینہ سے ایک فرسخ پر ہے۔ اور مربد کا فاصلہ مدینہ سے ایک میل ہے۔

بیہقی کا بیان ہے حضرت ابن عمرؓ کا قاعدہ تھا کہ جب سفر میں ہوتے اور نماز تیار ہوتی اور پانی ایک یا دو پر تیر کے فاصلہ سے ہوتا (تو نماز پڑھ لیتے اور) پانی کی طرف نہیں مڑتے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ قافلہ کے چلے جانے کے اندیشہ سے کرتے تھے۔ لفظ مڑنا (عدول) بتا رہا ہے کہ پانی دائیں یا بائیں ہاتھ کو ہوتا تھا۔ سامنے کے رخ پر نہیں ہوتا تھا۔

مسئلہ :۔ امام شافعیؒ نے فرمایا، مسافر کو اگر پانی نہ ملے تو تیمّم کے لئے یہ شرط ہے کہ پڑاؤ پر اور ساتھیوں کے پاس پانی کی تلاش کرے اگر میدان میں ہو اور نظر کے سامنے کوئی اوٹ نہ ہو تو چاروں طرف نظر دوڑائے اور اگر نظر کے سامنے دیوار یا ٹیلہ کی اوٹ ہو تو (دائیں بائیں) مڑ کر دیکھے کیونکہ آیت میں فَلَمْ تَجِدُوْا کا لفظ آیا ہے یعنی تم کو پانی نہ ملے اور پانی نہ ملنے کا اطلاق اسی وقت ہوتا ہے جب تلاش کر لے اور نہ ملے۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا ساتھی سے پانی مانگنے کی شرط نہیں ہے جب پانی اپنی ملک میں نہ ہو تو اس کو پانی نہ پانے والا ہی کہا جائے گا۔

فَتَيَمَّمُوْا تو قصد (یعنی تیمّم) کر لو۔ قاموس میں ہے تیمّم کا معنی ہے قصد و ارادہ تیمّم کی یاء ہمزہ کے عوض آئی ہے (مادہ اَمَّمْ ہے) تَيَمَّمَهٗ اس کا قصد کیا۔ یَمَامَۃً قصد کرنا۔ اسی لئے امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تیمّم میں نیت شرط ہے اگرچہ وضو اور غسل میں نیت واجب نہیں ہے۔ امام زفر کے نزدیک وضو اور غسل کی طرح تیمّم میں بھی نیت واجب نہیں ہے یہ آیت امام زفر کے خلاف ہماری دلیل ہے۔ باقی تینوں اماموں کے نزدیک غسل اور وضو میں بھی نیت شرط ہے سورۂ مائدہ میں انشاء اللہ اس کی تفصیل آئے گی۔

صَعِيْدًا روئے زمین کا صعید روئے زمین خواہ مٹی ہو یا ریت یا گچ یا چونہ یا پتھر وغیرہ۔ زجاج نے کہا اس لغوی مفہوم میں اہل لغت کا کوئی اختلاف میرے علم میں نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں یہی وجہ ہے کہ بیضاوی نے باوجود شافعی ہونے کے صعید کا ترجمہ مٹی نہیں کیا۔ بغوی کا بیان ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا صعید مٹی ہی ہے۔ قاموس میں ہے صعید (بمعنی) مٹی یا روئے زمین۔

ہدایہ میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے صَعِيْدًا طَيِّبًا کی تفسیر کی ہے وہ مٹی جس میں (سبزہ وغیرہ کی) روئیدگی ہو سکتی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے مجھے یہ روایت نہیں ملی۔ لیکن بیہقی اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ پاک ترین مٹی کھیت (یعنی قابل زراعت زمین) کی مٹی ہے۔ ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ کی یہ حدیث مرفوعاً نقل کی ہے۔

پاک ترین کا لفظ بتا رہا ہے کہ کھیت کی مٹی کے علاوہ دوسری مٹی پاک ہے (اگرچہ پاک ترین نہیں ہے)۔

میں کہتا ہوں کہ اگر لفظ صعید کو مشترک مان بھی لیا جائے جیسا کہ صاحب قاموس نے لکھا ہے تب بھی اس جگہ صعید

سے مراد روئے زمین ہی ہوگا۔ کیونکہ سورۂ مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے مَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ اللہ تمہارے لئے کسی قسم کی تنگی کرنی نہیں چاہتا۔ اب اگر کھیت کی مٹی کی شرط لگائی جائے گی تو بڑی دشواری ہوگی خصوصاً ان لوگوں کے لئے جو وادی غیر ذی زرع کے رہنے والے ہیں۔ یا شور زمین یا ریگستان یا سنگلاخ پہاڑوں کے باشندے ہیں ان کو تو کھیت کی مٹی بڑی دشواری سے دستیاب ہوگی۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ صعید سے مراد روئے زمین ہے حضور ﷺ نے فرمایا تھا مجھے انبیاء پر چھ چیزوں کی وجہ سے فضیلت عطا کی گئی ہے کلمات جامعہ (یعنی کلام کا انتہائی بلیغ ایجاز) مجھے عطا کئے گئے (دشمن پر) رعب ڈال کر میری مدد کی گئی۔ مال غنیمت میرے لئے حلال بنایا گیا۔ زمین کو میرے لئے طہور (پاک اور پاک کن) اور مسجد کر دیا گیا۔ مجھے تمام مخلوق (انس و جن) کی جانب بھیجا گیا اور مجھ پر نبوت کو ختم کر دیا گیا۔ رواہ مسلم والترمذی۔ ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

طبرانی نے صحیح سند سے حضرت سائب بن یزید کی روایت سے لکھا ہے کہ مجھے پانچ چیزوں کی وجہ سے برتری عطا کی گئی اس حدیث میں کلمات جامعہ عطا ہونے اور نبوت ختم ہونے کا ذکر نہیں بلکہ پانچویں چیز یہ ہے کہ امت کے لئے میری شفاعت کو ذخیرہ بنا کر رکھ لیا گیا ہے۔ باقی حدیث بدستور سابق ہے۔

بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوامامہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ مجھے چار چیزوں کی وجہ سے فضیلت عطا کی گئی ہے تمام زمین کو میرے اور میری امت کے لئے مسجد اور طہور بنا دیا گیا اب میری امت کا جو شخص نماز پڑھنا چاہے اور کوئی جائے نماز نہ ملے تو وہ زمین کو اپنے لئے جاء نماز اور طہور پائے گا۔ اس حدیث میں تمام انسانوں کے لئے بعثت کا ہونا اور دو مہینے کی راہ سے دشمن پر رعب پڑنا اور مال غنیمت کے حلال کئے جانے کا ذکر ہے۔ حضرت عمرو بن شعیبؒ کی روایت میں ہے۔ جہاں بھی مجھے نماز پہنچے گی۔ میں تیمّم کرلوں گا۔

صحیحین میں حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں عطا کی گئیں حضور ﷺ نے ان پانچ چیزوں میں سے ایک بات یہ بھی شمار کی کہ زمین کو میرے لئے مسجد اور طہور بنا دیا گیا ہے۔

ابن جارود اور ابن المنذر کے نزدیک حضرت انسؓ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ تمام پاک زمین میرے لئے مسجد اور طہور بنادی گئی۔ ان تمام احادیث کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ زمین اپنے تمام اجزاء سمیت پاک ہے جیسا کہ باجماع علماء تمام زمین مسجد ہے کیونکہ الارض میں الف لام جنسی ہے۔ خصوصاً حضرت ابوامامہؓ کی حدیث تو بہت زیادہ صراحت کے ساتھ اسی مضمون پر دلالت کر رہی ہے۔ لہٰذا آیت میں امام ابوحنیفہؒ کے قول کا ثبوت ہے کہ جو چیز زمین کی جنس سے ہو اس سے تیمّم جائز ہے خواہ شور ہو یا ریت یا ایسا پتھر جس پر غبار بھی نہ ہو۔ امام مالکؒ تو لکڑی (درخت) سے بھی تیمّم کو جائز قرار دیتے ہیں بشرطیکہ وہ زمین میں جما ہوا (لگا ہوا) ہو، کیونکہ قدرتاً اس پر بھی صعید کا اطلاق ہوتا ہے امام ابویوسفؒ کے نزدیک صرف ریت اور مٹی سے جائز ہے اور امام شافعیؒ و امام احمدؒ کے نزدیک صرف مٹی سے۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے حسب ذیل احادیث سے استدلال کیا ہے۔ حضرت حذیفہؒ کی روایت میں آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہم کو تین خصوصیات کی وجہ سے لوگوں پر فضیلت دی گئی ہے ہماری صفیں ملائکہ کی صفوں کی طرح مقرر کی گئیں۔ اور تمام زمین کو ہمارے لئے مسجد بنا دیا گیا اور مٹی کو ہمارے لئے طہور کر دیا گیا جب کہ ہم کو پانی نہ ملے۔ رواہ مسلم۔

حضرت علی کرم اللہ وجہ کی حدیث میں آیا ہے کہ مٹی کو میرے لئے طہور بنا دیا گیا۔ چونکہ ان دونوں حدیثوں میں خصوصیت کے ساتھ صرف مٹی کا لفظ ذکر کیا گیا ہے اس لئے وہ حدیثیں جن کے اندر عام الفاظ ہیں ان کو بھی خاص پر محمول کیا جائے گا۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ استدلال تو مفہوم لقب کے اعتبار سے کیا گیا اور جمہور کے نزدیک مفہوم لقب معتبر نہیں، پھر خاص کی وجہ سے عام کو بھی خاص قرار دینے کا جواز اس صورت میں ہوتا ہے کہ دونوں میں تعارض ہو (اور دونوں پر عمل ممکن نہ ہو) اور اس جگہ تعارض موجود ہی نہیں ہے اگر مٹی سے تیمّم جائز ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسری ارضی چیزوں سے ناجائز ہے

بلکہ باقی چیزوں سے اس حدیث میں سکوت اختیار کیا گیا ہے (اور دوسری حدیث میں ان غیر مذکور موجودات ارضی کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے) رہا تراب کا خصوصی ذکر تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مٹی سے تیمّم افضل ہے۔

امام ابو یوسفؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث سے استدلال کیا ہے کہ بعض سکان بادیہ (صحراء) نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم ریگستان میں تین چار مہینے (کبھی) رہتے ہیں اور ہم میں جنابت والے اور زچہ اور حائضہ بھی ہوتی ہیں پانی ملتا نہیں ہم کیا کریں فرمایا زمین کو اختیار کرو (یعنی تیمّم کرو) پھر حضور ﷺ نے دست مبارک ایک بار زمین پر چہرہ پر تیمّم کرنے کے لئے مارا اور دوسری ضرب سے ہاتھوں پر کہنیوں تک تیمّم کیا۔ ابن جوزی نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد اس کو غیر صحیح کہا ہے کیونکہ اس کی روایت میں ایک راوی مثنی بن صباح ہے جس کے متعلق امام احمد اور رازی نے کہا ہے یہ کچھ نہیں ہے اور نسائی نے کہا یہ متروک الحدیث ہے۔

طَيِّبًا پاک۔ اس لفظ سے قابل روئیدگی مراد نہیں ہو سکتی کیونکہ باتفاق علماء صعید کی طہارت ضروری ہے اب اگر قابل روئیدگی ہونا بھی مراد ہوگا تو حقیقی اور مجازی دونوں معنی کا ایک ہی وقت میں مراد ہونا لازم آئے گا اور یہ ناجائز ہے۔ چونکہ صراحت قرآنی اور اجماع سے طہارت کی شرط لازم ہے اس لئے امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ اگر زمین نجس ہو جائے پھر خشک ہو جانے کی وجہ سے پاک ہو جائے تو اس پر نماز جائز ہے مگر اس سے تیمّم ناجائز ہے کیونکہ خشک ہو جانے سے زمین کا پاک ہو جانا حدیث آحاد سے ثابت ہے اور جس چیز (یعنی طہارت) کی شرط دلیل قطعی سے ثابت ہے وہ اس سے ادا نہیں ہو سکتی لیکن باقی تینوں امام ایسی زمین پر نماز پڑھنے کو بھی جائز نہیں قرار دیتے۔ رہی وہ حدیث جس میں زمین کے خشک ہو جانے کو طہارت زمین کہا گیا ہے وہ منکر ہے (غیر معروف) میرے نزدیک خشک ہو جانے کو زمین کی طہارت قرار دینے کا حکم حضرت حمزہؓ بن عبد اللہ کی اس روایت سے ثابت ہے جس کو بخاری نے نقل کیا ہے کہ کتے مسجد کے اندر رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں آتے جاتے اور پیشاب کرتے تھے اور لوگ اس جگہ پانی نہیں دھارتے تھے۔ سنن ابو داؤد و اسماعیلی و ابو نعیم و بیہقی میں بھی یونہی آیا ہے۔

فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ تو اپنے (پورے) چہروں کا مسح کرو۔ بِوُجُوهِكُمْ میں باء زائد ہے اور پورے چہرہ پر مسح کرنا باجماع علماء فرض ہے۔

وَأَيْدِيكُمْ اور اپنے ہاتھوں پر انگلیوں کے سروں سے مونڈھے تک پورے عضو کا نام ہاتھ ہے اسی لئے زہری کا قول منقول ہے کہ بغل تک مسح کرنا واجب ہے صحابہؓ کے متعلق بھی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی عملی تشریح سے پہلے وہ بغلوں اور مونڈھوں تک تیمّم میں مسح کرتے تھے۔

حضرت عمارؓ بن یاسر راوی ہیں کہ ذات الجیش میں رسول اللہ ﷺ نے آخری شب پڑاؤ کیا بی بی عائشہ بھی ساتھ ہیں۔ بی بی کا پوتھ کا ایک ظفاری (یمنی) ہار ٹوٹ کر گر گیا۔ ہار کی تلاش کے لئے لوگ روانگی سے رک گئے صبح ہوئی تو لوگوں کے پاس (وضو کے لئے) پانی نہیں تھا اس پر اللہ نے پاک مٹی سے تطہیر کی اجازت نازل فرما دی مسلمان فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور زمین پر (تیمّم کے لئے) ہاتھ مارے پھر ہاتھ اٹھائے ان پر کچھ مٹی نہیں لگی تھی پھر چہرہ پر اور ہاتھوں کے اندرونی حصہ سے لے کر مونڈھوں اور بغلوں تک مسح کیا۔ یہ روایت بوساطت امام احمد ابن جوزی نے نقل کی ہے ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ ہم نے مونڈھوں تک مسح کیا۔ دوسری روایت میں ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مونڈھوں تک تیمّم کیا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کی تعلیم اور اجماع جمہور سے ثابت ہے کہ پورا ہاتھ مراد نہیں ہے اس لئے ہم آیت کو تعین مقداری کے لحاظ سے مجمل کہتے ہیں جس کی توضیح رسول اللہ ﷺ کی تعلیم ہے کہ تیمّم میں ہاتھ کی مقدار اتنی ہی ہے جتنی وضو میں دھونے کی یعنی کہنیوں تک۔

حضرت عمارؓ کا بیان ہے کہ آیت تیمّم کے نزول کے وقت میں قوم کے ساتھ موجود تھا ہم کو رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا اور ہم نے ایک تھپکی سے چہرہ پر مسح کیا اور دوسری تھپکی سے دونوں ہاتھوں پر کہنیوں تک رواہ البزار حافظ ابن حجر نے بھی اس کو بغیر

جرح کے ذکر کیا ہے۔ ابوداؤد نے بھی حضرت عمار کے اس بیان میں اِلَى الْمِرْفَقَيْنِ (کہنیوں تک) نقل کیا ہے لیکن اس کی سند میں قتادہ کا بیان اس طرح ہے کہ مجھ سے ایک محدث نے کہا جس نے شعبی کا قول نقل کیا تھا۔ محدث کی کوئی تعین قتادہ نے نہیں کی لیکن محدث کا لفظ بتارہا ہے کہ قتادہ اس کو ثقہ جانتے تھے اس لئے اس ابہام میں کوئی ہرج نہیں ہے۔

آیت کے سبب نزول کے متعلق اسلع کی حدیث پہلے گزر چکی ہے جس میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے تیمم کر کے دکھایا ایک تھپکی چہرہ پر مسح کرنے کے لئے ماری اور ایک تھپکی کہنیوں تک ہاتھوں پر مسح کرنے کے لئے لیکن اس روایت کی سند میں ایک راوی ربیع بن بدر ہے جو ضعیف ہے مگر اس کی تائید میں حضرت عمار والی حدیث موجود ہے اس لئے دونوں حدیثیں آیت کے ابہام کی توضیح بن گئیں۔

مسئلہ :۔ اسی بناء پر امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ قائل ہیں کہ تیمّم میں کہنیوں تک مسح واجب ہے اس قول کی تائید حضرت جابرؓ کی روایت سے بھی ہوتی ہے کہ ایک شخص نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے جنابت ہو گئی تھی تو میں نے مٹی میں لوٹ لگائی۔ حضور ﷺ نے فرمایا تیمّم تو ایک تھپکی چہرہ کے لئے اور ایک تھپکی کہنیوں تک دونوں بانہوں کے لئے ہے۔ ایک اور روایت میں آیا ہے کہ حضورؐ نے زمین پر دست مبارک سے ایک تھپکی ماری اور اس سے چہرہ مبارک کا مسح کیا، پھر دونوں ہاتھوں سے ایک تھپکی ماری اور کہنیوں تک دونوں ہاتھوں پر پھیر لیا۔ رواہ الحاکم۔ حاکم نے اس روایت کو صحیح الاسناد کہا ہے اور دار قطنی کا بیان ہے کہ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں مگر شیخین نے یہ روایت نہیں بیان کی۔

حضرت ابن الصمہؓ کا بیان ہے میرا گزر حضور ﷺ کی طرف سے ہوا آپ اس وقت پیشاب کر رہے تھے میں نے سلام کیا آپ نے جواب نہیں دیا پیشاب سے فراغت کے بعد جب کھڑے ہو گئے تو اس لاٹھی سے جو آپ کے پاس موجود تھی ایک دیوار کو جھاڑا پھر دست مبارک دیوار پر رکھا (یعنی تھپکی دی) پھر چہرہ کا اور دونوں بانہوں کا مسح کیا۔ رواہ الشافعی والنسائی۔ نسائی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

اگر شبہ کیا جائے کہ اس کی سند میں ابو عصمہؓ اور اس کا تابع ابو خارجہ ہے اور ان دونوں کے متعلق ابن جوزی نے جرح کی ہے اور ایک تیسرا راوی ابوالحویرث ہے جس کو حافظ ابن حجر نے کسی قدر ضعیف کہا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی نے ان تینوں کو جھوٹے ہونے کا الزام نہیں دیا لہٰذا حدیث درجہ حسن تک پہنچ گئی صحیحین میں اس حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں کہ حضور ﷺ نے اپنے چہرہ مبارک اور دونوں ہاتھوں کا مسح کیا، حضرت عبداللہ بن ابی اوفی سے تیمّم کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے بیان کیا رسول اللہ ﷺ نے عمارؓ کو اس طرح کرنے کا حکم دیا تھا دونوں ہاتھوں کو زمین پر مارا پھر ان کو جھاڑا اور جھاڑ کر چہرہ پر اور دونوں ہاتھوں پر مسح کیا۔ دوسری روایت میں ہاتھوں کی جگہ کہنیوں کا لفظ آیا ہے۔ رواہ ابن ماجہ۔ ذہبی نے ضعفاء میں اس سند کے کسی راوی کا نام ذکر نہیں کیا مگر اتنا ضرور کہا کہ عثمان بن ابی شیبہ جو بخاری کے شیخ تھے ان کے متعلق ضرور کلام کیا گیا ہے مگر وہ سچے تھے اس سے ثابت ہوا کہ یہ حدیث حسن ہے۔ اس مبحث کی کچھ اور حدیثیں بھی ہیں جو ضعیف ہیں۔ حضرت ابن صمہؓ کی حدیث کی طرح حضرت ابن عمرؓ کی حدیث ابوداؤد نے نقل کی ہے اس کی سند کا مدار محمدؒ بن ثابت پر ہے جو ضعیف ہے حضرت ابن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث دار قطنی اور حاکم اور بیہقی نے نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تیمّم دو تھپکیاں ہیں ایک تھپکی چہرہ کے لئے اور ایک تھپکی کہنیوں تک دونوں ہاتھوں کے لئے حضرت ابن عمر والی حدیث میں ایک راوی علی بن ظبیان ہے جس کو قطان اور ابن معین نے ضعیف اور حاکم نے صدوق کہا ہے۔ ایک سلسلہ روایت میں سلیمان بن داؤد راوی آتا ہے جو متروک الحدیث ہے۔ حضرت عائشہؓ والی روایت میں حریش بن حریث راوی آتا ہے جس کو ابو حاتم نے منکر الحدیث کہا ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کی ایک روایت یہ ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تیمّم کیا اپنے ہاتھوں کو پاک مٹی پر مارا۔ پھر ہاتھوں کو جھاڑ کر چہروں پر مسح کیا پھر دوبارہ تھپکی ماری تو ہتھیلیوں سے کہنیوں تک مسح کیا۔ رواہ الدار قطنی۔ اس کی سند میں سلیمان بن ارقم متروک الحدیث ہے۔ اس بحث کی ایک حدیث حضرت ابو امامہ کی روایت سے طبرانی نے ذکر کی ہے جس کی اسناد

ضعیف ہے۔

امام مالکؒ اور امام احمد کے نزدیک تیمّم کے لئے صرف ایک تھپکی کافی ہے اور صرف چہرہ اور دونوں ہاتھوں کا پہنچوں تک مسح کیا جائے گا کیونکہ حضرت عمارؓ کا بیان ہے کہ میں ایک فوجی دستہ کے ساتھ تھا مجھے جنابت ہو گئی تو میں نے مٹی میں لوٹ لگائی اور خدمت گرامی میں حاضر ہوا تو واقعہ عرض کر دیا حضور ﷺ نے فرمایا تیرے لئے اس طرح کافی تھا آپ نے یہ فرمانے کے بعد دست مبارک زمین پر مارا پھر ہاتھ پر پھونک ماری اور چہرے پر اور دونوں ہاتھوں پر پہنچوں تک مسح کر لیا۔ حضرت عمارؓ کی دوسری روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تیمّم صرف ایک تھپکی ہے چہرے اور دونوں ہاتھوں پر پہنچوں تک مسح کرنے کے لئے یہ دونوں حدیثیں امام احمد نے نقل کی ہیں اور صحیحین میں مختلف طریقوں سے آئی ہیں بخاری کی روایت کے بعض الفاظ اس طرح ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا تیرے لئے صرف اتنا کافی تھا۔ پھر حضور ﷺ نے دونوں ہاتھ زمین پر مارے اور ان پر پھونک ماری پھر انسے چہرہ اور دونوں ہاتھوں پر پہنچوں تک مسح کر لیا۔ مسلم کی روایت بایں الفاظ ہے تیرے لئے یہ کافی تھا کہ دونوں ہاتھوں کو زمین پر مارتا پھر ان پر پھونک مار کر اپنے چہرے اور پہنچوں تک دونوں ہاتھ پر مسح کر لیتا ہے بخاری کی روایت ہے تیرے لئے چہرہ اور پہنچوں تک دونوں ہاتھ کافی تھے۔ میں کہتا ہوں کہ صحیحین کی حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ نزول آیت کے وقت عمارؓ یہ سمجھے ہی نہ تھے کہ جنابت والے کے لئے تیمّم کافی ہے بلکہ صرف بے وضو کے لئے تیمّم کا جواز سمجھے تھے اسی لئے مٹی میں انہوں نے لوٹ لگائی تھی۔

اہل حدیث کہتے ہیں کہ شیخین کی روایت کردہ عمار والی حدیث زیادہ قوی ہے۔ ہم کہتے ہیں بے شک شیخین کی حدیث ہماری روایت کردہ ہر حدیث سے انفرادی موازنہ کے وقت زیادہ قوی ہے لیکن ہماری روایت کردہ احادیث کثیر ہیں اور روایت کے متعدد طریقوں سے آئی ہیں اور سب طریقے صحیح ہیں مگر ضعیف ہیں اور سب مل کر صحیحین کی روایت کی قوت کو پہنچ جاتی ہیں اس لئے ہماری مجموعی روایات اور شیخین کی روایت میں تعارض اور تقابل ہوتا ہے اب ہم کو وجہ ترجیح تلاش کرنا ہے اور وجہ ترجیح یہ ہے کہ امام احمدؒ کی پیش کردہ حدیث کا وقت نزول آیت کے وقت سے بعد کو ہے (یعنی کافی مدت کے بعد ہے) لہٰذا مجمل آیت کا بیان اس حدیث کو نہیں قرار دیا جا سکتا۔ وقت حاجت سے بیان کی تاخیر جائز نہیں اور اگر حدیث کو ظاہر پر محمول کیا جائے تو اس سے آیت کا حکم منسوخ ہو جائے گا حالانکہ خبر آحاد سے کتاب اللہ کو منسوخ قرار دینا جائز نہیں لامحالہ صحیحین کی حدیث ساقط ہو جائے گی اور آیت اپنی جگہ قائم رہے گی۔ باقی ہماری روایت کردہ احادیث تو ان میں سے بعض کا وقت ٹھیک نزول آیت کا وقت ہے اس لئے حدیث کو مجمل آیت کا بیان قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ صحیحین کی حدیث کی تاویل بھی اس طرح کی جا سکتی ہے کہ حدیث میں جو لفظ کف (پہنچوں تک ہاتھ) آیا ہے اس سے مراد ید (ہاتھ) ہے جز بول کر کل مراد لینا مجاز کا مسلمہ ضابطہ ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ رسول اللہ ﷺ کی مراد صورت ضرب کا اظہار اور لوٹنے کی نفی ہے تیمّم۔ کے اجزاء کاملہ کا بیان مقصود نہیں ہے۔ جیسے غسل کے متعلق فرمایا تھا تیرے لئے یہ کافی ہے کہ تین لپ پانی سر پر ڈال لیتا۔ اس میں حضور ﷺ نے نہ کلی کرنے کا ذکر کیا نہ ناک میں پانی ڈالنے کا نہ تمام بدن کو دھونے کا کیونکہ آپ کی مراد صرف یہ تھی کہ بٹے ہوئے اور گتھے ہوئے بالوں کو کھولنے کی ضرورت نہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ جب دونوں حدیثوں میں تعارض واقع ہو گیا تو دونوں ساقط ہو جائیں گی اور ہم وضو پر تیمم کو قیاس کریں گے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ کہنیوں تک مسح کرنا زیادہ احتیاط کا طریقہ ہے۔

مسئلہ :۔ اگر ایسی نماز کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو جس کا عوض ممکن نہ ہو تو ایسے وقت میں تیمم کر لینا جائز ہے جیسے عید کی نماز کے فوت کا اندیشہ خواہ ابتداء ہو یا بناء کے طور پر۔ اور جیسے ولی کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لئے جنازہ کی نماز فوت ہو جانے کا اندیشہ (دونوں صورتوں میں تیمم کر کے نماز میں شریک ہو جانا جائز ہے) لیکن (نماز کا) وقت یا نماز جمعہ فوت ہو جانے کا اندیشہ ہونے کی صورت میں تیمّم جائز نہیں (کیونکہ وقت نکلنے کے بعد قضاء صلوٰۃ ممکن ہے اور جمعہ ہونے کے بعد ظہر کی نماز

پڑھی جاسکتی ہے۔

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک جنازہ اور عید کی نمازیں فوت ہو جانے کا اگر اندیشہ ہو تب بھی تیمم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان نمازوں کا وجوب ہی نہیں ہے۔ نماز عید تو سنت ہے اور نماز جنازہ فرض کفایہ ہے دوسروں کے پڑھنے سے سب کی طرف سے ادا ہو جاتی ہے البتہ نماز کا وقت اور جمعہ کی نماز فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو تیمّم کر لینا جائز ہے۔ مگر امام شافعیؒ کے نزدیک تیمّم سے نماز پڑھنے کے بعد (وضو کر کے) دوبارہ ادا کرنا بھی واجب ہے۔ امام احمدؒ نے کہا مذکورہ بالا چاروں صورتوں میں تیمم جائز نہیں کیونکہ صعید کے پاک اور پاک کن ہونے کی شرط ہے پانی نہ ملنا اور یہ شرط ان چاروں صورتوں میں موجود نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کا استدلال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سلام کا جواب دینے کے لئے بھی تیمّم کیا تھا۔ یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے۔ (حالانکہ سلام کا جواب بغیر وضو اور تیمّم کے بھی دینا جائز ہے اس سے معلوم کہ ادائے واجب کے لئے ہی تیمم جائز نہیں بلکہ جواز تیمّم عام ہے پس صلوٰۃ عید کا واجب نہ ہونا اور صلوٰۃ جنازہ کا فرض کفایہ ہونا مانع تیمّم نہیں)۔

مسئلہ:۔ اگر وقت کے اندر تیمّم سے نماز پڑھ لی پھر پانی مل گیا تو دوبارہ نماز پڑھنی واجب نہیں خواہ وقت باقی ہی ہو۔ عطاء، طاؤس، مکحول، ابن سیرین اور زہری وجوب اعادہ کے قائل ہیں۔ ہماری دلیل حضرت ابو سعید خدری کی روایت کردہ حدیث ہے کہ دو آدمی سفر کو گئے نماز کا وقت آگیا تو دونوں نے تیمّم کر کے نماز پڑھ لی کیونکہ پانی موجود نہ تھا۔ پھر وقت کے اندر ہی پانی مل گیا تو ایک نے وضو کر کے نماز لوٹالی دوسرے نے نہیں لوٹائی جب دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو واقعہ عرض کیا جس نے دوبارہ نہیں پڑھی تھی اس سے حضورؐ نے فرمایا تو نے سنت کے موافق کیا، تیری نماز پوری ہو گئی اور جس نے دوسری بار نماز لوٹائی تھی اس سے فرمایا تجھے دوہرا ثواب ملے گا۔ رواہ ابوداؤد والنسائی والحاکم والدارمی۔

مسئلہ:۔ اگر بعض اعضا زخمی ہوں اور بعض زخمی نہ ہوں تو امام شافعی اور امام احمدؒ کا قول ہے کہ زخمی کے لئے تیمم کرے اور صحیح کو دھولے۔ میرے نزدیک یہی مختار ہے۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام مالک کا قول ہے کہ اگر عضو کا بڑا حصہ صحیح ہو اور چھوٹا حصہ زخمی تو صحیح کو دھولے اور زخمی پر مسح کرلے تیمّم نہ کرے اگر بڑا حصہ صحیح نہ ہو تو تیمّم کرلے دھونے کی ضرورت نہیں۔

ہم کہتے ہیں جب عضو کا کچھ حصہ صحیح ہے اور پانی موجود ہے تو ایک اعتبار سے وہ بیمار نہیں ہے لہٰذا دھونے کا حکم ساقط نہ ہوگا اور ایک اعتبار سے وہ بیمار ہے تمام بدن کے لئے پانی استعمال نہیں کرسکتا لہٰذا تیمم کرنا درست ہے اس قول کی تائید حضرت جابرؓ کی حدیث سے ہوتی ہے حضرت جابرؓ کا بیان ہے ہم ایک سفر کو گئے دوران سفر میں ایک شخص کے پتھر لگ گیا اور سر زخمی ہو گیا۔ پھر اس کو احتلام بھی ہو گیا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کیا تمہارے خیال میں میرے لئے تیمّم کی اجازت ہے ساتھیوں نے کہا ہمارے خیال میں تم کو اجازت نہیں ہے کیونکہ تم پانی استعمال کر سکتے ہو مجبوراً اس نے غسل کیا نتیجہ میں وہ مر گیا (حضور ﷺ کو اطلاع ملی تو) آپ ﷺ نے فرمایا ان لوگوں نے اس کو مارا ان پر اللہ کی مار ہو معلوم نہ تھا تو دریافت کیوں نہ کرلیا عاجز (یعنی نہ جاننے والے) کے لئے تسکین کا ذریعہ دریافت کرنا ہے اس شخص کے لئے کافی تھا کہ وہ تیمّم کر لیتا زخم پر پٹی باندھ کر اس پر مسح کر لیتا اور باقی بدن کو دھولیتا۔ رواہ الدار قطنی و من طریق الدار قطنی ابن جوزی۔

مسئلہ:۔ ایک تیمّم سے جتنی نمازیں چاہے پڑھتا رہے جب تک حدث نہ ہو (یعنی وضو توڑنے والی کوئی چیز نہ پیدا ہو) اور جب تک پانی نہ ملے (ہر وقت کے لئے الگ الگ تیمّم کرنے کی ضرورت نہیں) امام شافعیؒ وامام احمد کے نزدیک ہر وقت کی نماز کے لئے الگ تیمّم کرنا لازم ہے ہماری دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پاک مٹی مسلمان کا وضو ہے خواہ دس برس پانی نہ ملے اصحاب السنن نے یہ حدیث حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کی ہے اور ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے۔

امام شافعیؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول سے استدلال کیا ہے ابن عباسؓ نے فرمایا تھا ایک تیمم سے ایک نماز سے زیادہ نہ پڑھنا سنت سے ہے رواہ الدار قطنی والبیہقی۔ رافعی نے کہا اگر صحابی کے قول میں من السنۃ آیا ہو تو اس سے مراد

رسول اللہ ﷺ کی سنت ہوتی ہے لہٰذا یہ اثر حدیث مرفوع کے حکم میں ہو گیا۔ اسی مضمون کا ایک قول حضرت علیؓ کا بھی آیا ہے جس کو ابن ابی شیبہ نے نقل کیا ہے حضرت عمرو بن عاصؓ ہر نماز کے لئے تیمّم کرتے تھے اور یہی فتویٰ دیتے تھے رواہ الدار قطنی سندہ عن قتادہ۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی ہر نماز کے لئے تیمّم کرتے تھے۔ رواہ البیہقی۔ ہم کہتے ہیں ان آثار صحابہؓ میں سے کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے اثر کی سند میں ابو یحییٰ اور حسن بن عمارہ راوی ہیں جن کو ابن جوزی نے متروک کہا ہے اور حسنؒ نے بہت ضعیف قرار دیا ہے حضرت علیؓ کے اثر کی سند میں حجاج بن ارطاۃ ہے جس کو ابن مہدی اور قطان نے متروک قرار دیا ہے اور امام احمدؒ نیز دار قطنیؒ نے کہا کہ اس کی حدیث نا قابل استدلال ہے اور ابن معین و نسائی نے کہا۔ یہ قوی نہیں ہے حضرت عمرو بن عاص کا اثر منقطع ہے قتادہ اور حضرت عمروؓ کے درمیان بڑا ارسال ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کے اثر کی سند میں عامر احول ہے جس کے متعلق علماء حدیث کے اقوال مختلف ہیں۔ امام احمد وغیرہ نے اس کو نرم کہا ہے اور ابو حاتم و مسلم نے ثقہ۔ پھر یہ تمام آثار صحابہ اس قابل نہیں کہ خبر مرفوع صحیح کے مقابلہ پر لائے جا سکیں۔ اس کے علاوہ (ہر نماز کے لئے جدا تیمّم کو) ہم استحباب پر محمول کرتے ہیں اور حضرت ابن عباسؓ نے جو مِنَ السُّنَّۃِ فرمایا تو اس سے مراد یہ ہے کہ مستحب ہے واجب نہیں ہے (سنت رسول اللہ مراد نہیں ہے)

مسئلہ :۔ اگر پانی بھی نہ ملے (یعنی وضو یا غسل نہ کر سکے) اور صعید طیب بھی نہ ملے (یعنی تیمم بھی نہ کر سکے) گویا فاقد الطہورین ہو تو امام صاحب کے نزدیک نماز ترک کر دے مگر قضاء لازم ہے امام مالکؒ کے نزدیک نماز ترک کر دے اور قضاء بھی واجب نہیں۔ امام شافعیؒ کے نزدیک یونہی نماز پڑھ لے اور جب پانی مل جائے تو اعادہ واجب ہے۔ امام احمد کے نزدیک یونہی نماز پڑھ لے اور اعادہ بھی واجب نہیں۔ ہماری دلیل یہی آیت ہے اس آیت میں فرمایا ہے ولا جنبا یعنی جنابت کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اس آیت میں جنابت کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی اور ممانعت صلوٰۃ کا خاتمہ غسل پر کیا، اگر پانی مل جائے اور تیمم پر کیا اگر پانی نہ ملے۔ اب رہا فاقد الطہورین جو نہ غسل کر سکے نہ تیمّم، اس کے لئے ممانعت صلوٰۃ کا خاتمہ نہیں ہوا (جب حکم کی غایت نہیں تو حکم ممانعت باقی رہے گا) لہٰذا وہ نماز ہی نہیں پڑھے گا۔

اگر شبہ کیا جائے کہ مسافر حکم ممانعت سے خارج ہے تو ہم کہیں گے تیمّم کرنے والا مسافر حکم ممانعت سے خارج ہے اگر ایسی بات نہ ہو گی تو مسافر کے لئے بغیر تیمّم کے نماز جائز ہو جائے گی۔ امام شافعی کی طرف سے کہا جا سکتا ہے کہ مطلقاً مسافر حکم ممانعت سے خارج تھا پھر اس کے لئے تیمّم واجب کر دیا گیا اور وجوب تیمّم کی شرط پاک مٹی دستیاب ہونے کو قرار دیا تاکہ تکلیف بالمحال لازم نہ آئے اور جب پاک مٹی میسر نہ آئے تو تیمم کا حکم بھی ساقط ہو جائے گا اور مطلقاً مسافر حکم ممانعت سے خارج ہو جائے گا۔ ہماری دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ اللہ بغیر پاکی کے کوئی نماز نہیں قبول کرتا۔ رواہ الترمذی۔

اس حدیث میں لفظ صلوٰۃ کو بصورت نکرہ دائرہ نفی میں ذکر کیا ہے جو مفید عموم ہے یعنی بغیر طہارت کے کوئی نماز اللہ قبول نہیں کرتا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ حدیث میں مراد یہ ہے کہ جو شخص طہارت پر قادر ہو اس کی نماز بغیر طہارت کے اللہ قبول نہیں کرتا تو یہ لفظ حدیث کی خود ساختہ تخصیص ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔

ہماری دوسری دلیل وہ حدیث ہے جس میں حضرت عمار بن یاسرؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا تھا آپ کو یاد ہو گا کہ میں اور آپ سفر میں تھے اور ہم کو جنابت ہو گئی جس کی وجہ سے آپ نے تو نماز ہی نہیں پڑھی اور میں نے مٹی میں لوٹ لگا کر نماز پڑھ لی۔ پھر جب میں نے حضور ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا تیرے لئے اس طرح کافی تھا۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے اس میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ کے نماز نہ پڑھنے کی تردید نہیں فرمائی۔

امام شافعیؒ نے اپنے مسلک کے استدلال میں حضرت عائشہؓ کی حدیث پیش کی ہے حضرت عائشہؓ نے حضرت اسماء کا ایک

ہار عاریت کے طور پر لیا تھا وہ (سفر میں) گم ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے کچھ صحابہؓ کو تلاش کے لئے بھیجا (راستہ میں) نماز کا وقت آ گیا تو ان صحابہؓ نے بغیر وضو کئے نماز پڑھ لی (کیونکہ پانی موجود نہ تھا) اور حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس کی شکایت پیش کر دی۔ اس وقت آیت تیمم نازل ہوئی اسید بن حضیر نے عرض کیا اللہ آپ کو جزائے خیر دے خدا کی قسم کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ پر کوئی دشواری آئی ہو اور اللہ نے اس سے نکلنے کا راستہ آپ کے لئے نہ پیدا کر دیا ہو اور مسلمانوں کے لئے اس میں برکت نہ عطا کر دی ہو۔ متفق علیہ۔

دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اٹھ کھڑے ہوئے یہاں تک کہ صبح ایسے مقام پر ہوئی جہاں پانی نہ تھا اس پر آیت تیمم نازل ہوئی اور لوگوں نے تیمم کیا اسید بن حضیر نقیب رسول اللہ ﷺ نے کہا اے خاندان ابو بکر تمہاری یہ پہلی برکت ہی نہیں ہے۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے جس اونٹ پر میں سوار تھی جب ہم نے اس اونٹ کو اٹھایا تو اس کے نیچے ہار مل گیا۔

اس حدیث کا جواب یہ ہے کہ اس میں تو ہماری تائید موجود ہے ہمارے خلاف کوئی دلیل نہیں نکلتی کیونکہ اس میں یہ بات مذکور نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بلا وضو، خود نماز پڑھی تھی بلکہ صحابہؓ نے ایسا کیا تھا تو اپنی رائے سے کیا تھا (حضور ﷺ کا کوئی حکم مذکور نہیں) اگر نماز بغیر وضو جائز ہوتی تو نزول آیت کے بعد لوگ تیمم نہ کرتے۔

رہا امام شافعیؒ کا یہ قول کہ نماز بغیر طہارت کے واجب ہے اور پھر اس کا اعادہ بھی واجب ہے یہ اصول کے قاعدہ کے خلاف ہے کیونکہ سبب وجوب یعنی وقت ایک ہی ہے اور جب تک سبب مکرر نہ ہو واجب ہے یہ اصول کے قاعدہ کے خلاف ہے کیونکہ سبب مکرر نہ ہو واجب کیسے مکرر ہو جائے گا۔

باقی امام مالکؒ جو عدم قضاء کے قائل ہیں اور دلیل یہ بیان کرتے ہیں کہ قصور اس شخص کا نہیں ہے اس لئے قضا واجب نہیں ہے تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جو نماز تم سے فوت ہو جائے اس کی قضا کر لو، اس میں کوئی تخصیص نہیں کہ اپنے قصور سے فوت ہوئی ہو یا بلا قصور فوت ہوئی ہو۔ دیکھو سوتا رہنے سے اگر نماز فوت ہو جائے تو قضاء واجب ہے باوجودیکہ سونے والے کا کوئی قصور نہیں (کیونکہ نیند اختیاری نہیں سونے والا قصداً نماز ترک نہیں کرتا)۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا بے شک اللہ بڑا معاف کرنے والا ہے اس نے تمہارے لئے آسانی کر دی اور تیمم کی اجازت دے دی۔

غَفُوْرًا بہت بخشنے والا ہے۔ نزول آیت سے پہلے جو تم نے شرابیں پیں اور نشہ کی حالت میں نمازیں پڑھیں اور جنابت کے ساتھ نماز ادا کی سب کو بخش دیا، واللہ اعلم۔

اَلَمْ تَرَ محمد ابن اسحاق نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ یہودیوں کا ایک بڑا سردار جس کا نام رفاعہ بن زید بن تابوت تھا جب رسول اللہ ﷺ سے کلام کرتا تھا تو زبان موڑ کر کہتا تھا محمد ذرا اپنے کان ہماری طرف کیجئے۔ تاکہ ہم آپ کو سمجھائیں پھر اسلام پر نکتہ چینی کرتا اور عیب نکالتا تھا۔ اس پر اس آیت کا نزول ہوا۔ آیت میں مخاطب عام ہے کیونکہ آگے جمع مخاطب کی ضمیریں آئی ہیں اور) فرمایا ہے تَضِلُّوْا اور اَعْدَآئِكُمْ یا یوں کہا جائے کہ قوم کے سردار سے خطاب پوری قوم سے خطاب ہوتا ہے اس لئے اس جگہ واحد مخاطب کی ضمیر اور آگے جمع مخاطب کی ضمیریں ذکر کیں۔ رویت مجاز اً بمعنی نظر ہے اسی لئے اس کے بعد الیٰ آیا ہے ورنہ رویت آنکھوں سے ہو یا دل سے اس کے مفعول پر الیٰ نہیں آتا یا یوں کہا جائے کہ نظر کے معنی کا اس میں احتمال ہے یا یوں تاویل کی جائے کہ رویت خواہ آنکھوں سے ہو یا ویسے معنی انتہا کو متضمن ہے اسی لئے مفعول پر الیٰ آیا ہے۔

اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ اے مخاطب کیا تو نے ان لوگوں کی طرف نظر نہیں کی جن کو کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا ہے۔ اس سے مدینہ کے یہودی مراد ہیں۔ نصیباً کی تنوین تحقیر کیلئے ہے اور الکتاب سے مراد ہے تورات کا ایک ادنیٰ حصہ مراد یہ ہے کہ دل کا یقین اور معنی کا فہم تو ان کو نہیں دیا گیا صرف زبان سے قرآت ان کو نصیب ہوئی

يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وہ خریدتے ہیں گمراہی یعنی بعثت سے پہلے تو ان کو یقین تھا کہ نبی امی آخر زمانہ میں مبعوث ہوں گے اور کافروں کے خلاف یہ نبی امی کے طفیل سے فتح کی دعا بھی کرتے تھے لیکن جب وہ نبی مبعوث ہو گئے تو انہوں نے ان کی نبوت کو نہیں مانا تو سابق ایمان کے عوض کفر کو لے لیا۔ یا یہ مراد ہے کہ وہ ہدایت جو ان کے قبضہ میں تھی اور پیغمبر کا اتباع کر کے وہ اس کو حاصل کر سکتے تھے انہوں نے اس ہدایت کو چھوڑ کر اس کے عوض گمراہی کو لے لیا۔

وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ۝ اور ان کی خواہش ہے کہ مسلمانو تم بھی راہ حق سے بہک جاؤ۔

اَلَمْ تَرَ میں استفہام کا حاصل ہے۔ تقریر مدعی اظہار تعجب اور مخاطب کو بچنے کی ہدایت کرنا یعنی تم دیکھ رہے ہو تم کو معلوم ہو کہ ان کو تم سے اور مسلمانوں سے عداوت ہے باوجودیکہ یہ تمہاری صداقت کو جانتے بھی ہیں لہٰذا ان سے بچے رہو کیونکہ تمہارا سب سے بڑا دشمن وہی ہے جو تم کو دوامی تباہی میں ڈالنا چاہتا ہے تم اپنے معاملات میں ان کو خیر خواہ نہ سمجھو۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ اور تم سے زیادہ تمہارے دشمنوں کو اللہ جانتا ہے، یہ جملہ تحذیر کی تاکید کیلئے ہے

وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا اور اللہ (تمہارا) پورا کارساز ہے تمہاری کارسازی کرے گا اور نفع پہنچائے گا۔ باللہ میں باء الصاق زائد ہے، جار مجرور فاعل ہے۔ اتصال اسنادی (یعنی نسبت فاعلی) کو اتصال اضافی (یعنی نسبت اضافیہ) کی وجہ سے محکم کرنے کے لئے لائی گئی ہے۔

وَكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ۝ اور اللہ پورا پورا مددگار ہے۔ ضرر کو دفع کریگا ان کی مکاریوں کو روکے گا ان کے خلاف تمہاری مدد کرے گا اور نصرت عطا کرے گا لہٰذا تم بھی اللہ کی کارسازی اور نصرت پر بھروسہ رکھو۔ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف نہ جاؤ دوسروں کو اپنا کارساز مت بناؤ اور کسی اور سے نصرت مت طلب کرو۔ ولیاً اور نصیرًا ترکیب کلام میں حال ہیں یا تمیز۔

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ ان یہودیوں میں سے کچھ لوگ (توراۃ کے) بعض الفاظ کو (ان کے مقام سے) پھیر دیتے ہیں۔ مِنَ الَّذِيْنَ یا الَّذِيْنَ اُوْتُوْا کا بیان ہے۔ یعنی یہ تحریف کرنے والے یہودی انہی میں سے ہیں جن کو کتاب دی گئی ہے۔ یا اَعْدَآئِكُمْ کا بیان ہے یعنی تمہارے دشمن ان تحریف کرنے والوں میں سے ہیں۔ یا اس کا تعلق نَصِيْرًا سے ہے یعنی اللہ تمہاری نصرت ان یہودیوں سے کرنے والا ہے جو تحریف کرتے ہیں۔ الْكَلِم جمع ہے کلمہ کی یا اسم جنس ہے جمع نہیں ہے۔ کیونکہ آئندہ لفظ میں واحد مذکر کی ضمیر آئی ہے جو الْكَلِمَ کی طرف راجع ہے۔

عَنْ مَّوَاضِعِهٖ اس کے مقامات سے جو لوگ الْكَلِمَ کو جمع کہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ الکلم سے پہلے لفظ بعض محذوف ہے اسی لئے مواضعہٖ میں واحد غائب کی ضمیر ذکر کی یعنی بعض الفاظ کو اس کی جگہ سے بدل ڈالتے ہیں۔ تفتازانی نے الکلم کو اسم جنس قرار دیا اور صراحت کی ہے کہ جو لوگ اس لفظ کو جمع نہیں کہتے ان کی مراد یہ ہے کہ یہ اصطلاحی جمع کا صیغہ نہیں ہے اور جو جمع کہتے ہیں ان کی مراد یہ ہے کہ اس کے اندر جمعیت کا معنی ہے (گویا یہ لفظ لفظاً مفرد اور معنی جمع ہے)۔

مطلب یہ ہے کہ توریت میں اللہ نے جو لفظ رکھے ہیں یہودی ان الفاظ کو ان کی جگہ سے ہٹا دیتے ہیں اور بدل ڈالتے ہیں۔ الکلم سے مراد ہیں رسول اللہ ﷺ کے اوصاف۔ بیہقی نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ توریت میں محمد ﷺ کا حلیہ اس طرح تھا وہ سرمگین کشادہ چشم، میانہ قامت، گھونگریالے بالوں والے خوبصورت ہوں گے جب مدینہ میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو علماء یہود جل گئے اور انہوں نے کتاب کے اندر مندرجہ حلیہ بدل ڈالا اور کہنے لگے ہم اپنے پاس نبی کا حلیہ یہ نہیں پاتے بلکہ ان کا حلیہ اس طرح ہوگا۔ دراز قامت، نیلگوں چشم اور لٹکتے ہوئے بالوں والے، اور اپنے زیردست لوگوں سے کہا کہ یہ ویسا نہیں ہے زیردستوں کو دھوکہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ عوام سے ان کی روزی وابستہ تھی ان کو اندیشہ ہوا کہ ان کے زیر اثر یہودی اگر مسلمان ہو جائیں گے تو ان کی روزی بند ہو جائے گی۔

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ یہودی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کچھ دریافت کرتے تھے آپ بتادیتے تھے آپ کا جواب سن کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مطمئن ہوگئے اور انہوں نے مان لیا لیکن جب حضور ﷺ کے پاس سے اٹھ کر باہر جاتے تو حضور ﷺ کے کلام کو بدل ڈالتے تھے اس روایت پر **تحریف کلمات** سے مراد (صرف کلمات توریت کی تحریف نہ ہوگی بلکہ) عام الفاظ کی تحریف مراد ہوگی (خواہ توریت کے الفاظ ہوں یا رسول اللہ ﷺ کے الفاظ۔

بعض علماء نے کہا کہ **تحریف کلمات** سے مراد یہ ہے کہ وہ کلام الٰہی کے معنی اپنی خواہش اور منشاء کے مطابق بیان کرتے تھے اللہ کی مراد نہیں بیان کرتے تھے جیسے اس امت کے بدعتی فرقے قرآن کی تفسیر کرتے ہیں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تحریف حکم سے مراد ہو دورخی بات کہنا جس میں مدح بھی نکلتی ہو اور مذمت بھی تعظیم بھی اور توہین بھی۔ تعریف ظاہر کرتے تھے اور مذمت کو پردہ کے اندر رکھتے تھے۔

وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا اور وہ کہتے ہیں ہم نے سن لیا مگر ہم (اس کو) مانتے نہیں۔ اگر تحریف سے مراد توریت کی تحریف ہو تو یہ قول تحریف کا جز (اور بیان) نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے وہ یہ بات کہتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کہنے سے مراد ہو اپنے ساتھیوں سے کہنا کہ ہم نے محمد ﷺ کا قول سن تو لیا مگر ہم ایسا کریں گے نہیں۔ یا یہ مراد ہو کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے تو کہتے ہیں کہ ہم نے آپ کی بات سن لی اور اپنی قوم سے جا کر کہتے ہیں کہ ہم ان کی بات نہیں مانتے اس صورت میں آیت مذکورہ میں یہودیوں کی بعض تحریفات کا اظہار کرنا مقصود ہو کہ وہ دورخی بات کہتے ہیں سَمِعْنَا کا لفظ ذومعنی ہے سن لیا یعنی قبول کر لیا اور سن لیا یعنی تسلیم نہیں کیا۔ ظاہر میں اول معنی اور دل میں دوسرا معنی چھپانا مقصود ہو۔

وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ اور ہماری سنو نہ سنائے جاؤ۔ بعض علماء کا بیان ہے کہ یہودی رسول اللہ ﷺ سے کہتے تھے سنو پھر اپنے دل میں کہتے تھے خدا کرے تم نہ سنو گویا اپنے دلوں میں رسول اللہ ﷺ کو بہرے ہو جانے یا مر جانے کی بددعا دیتے تھے۔ ظاہر مطلب یہ ہے کہ غَيْرَ مُسْمَعٍ کا لفظ بھی وہ رو در رو علی الاعلان کہتے تھے اور یہ لفظ ذومعنی ہے تعظیم اور بددعا دونوں کا احتمال رکھتا ہے اول صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ سنو خدا کرے تم کو کوئی بری بات سننی نہ پڑے۔ اس وقت اسماع (سنانا) سے مراد ہوگا بری بات سنانا جیسے محاورہ میں بولا جاتا ہے فلاں شخص نے فلاں شخص کو (خوب) سنائیں یعنی بری بھلی باتیں اور گالیاں (اور بددعا کا مفہوم تو ظاہر ہی ہے کہ تم کو سنایا جانا نصیب نہ ہو تم بہرے ہو جاؤ مر جاؤ وغیرہ)۔

یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہماری سنو ہم تمہارے لئے کہہ رہے ہیں غَيْرَ مُسْمَعٍ یعنی بہرے، ہونے کی بددعا کر رہے ہیں (اس صورت میں غیر مسمع، اسمع کا مفعول ہوگا) یا یہ مطلب ہے کہ سنو تم کو ایسا جواب نہیں سنایا جائے گا جس سے تم کو خوشی ہو یا سنو تمہاری بات نہیں سنی جائے گی اور تمہارا قول قبول نہیں کیا جائے گا۔ یا یہ مطلب کہ ہماری بات سنو جو تم کو سنائی نہیں دے گی کیونکہ تمہارے کان اس کو سننا پسند نہیں کریں گے ان سب صورتوں میں غیر مسمع اسمع کا مفعول یہ ہوگا۔

وَرَاعِنَا اور وہ رَاعِنَا کہتے ہیں یہ لفظ ذومعنی ہے عربی زبان میں اس کا معنی ہے ہماری رعایت کی جائے ہمارا انتظار کیجئے اور عبرانی یا سریانی زبان میں یہ لفظ گالی ہے یہودی باہم گالیاں دیتے تو اسی سے ملتا جلتا لفظ راعینا کہا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ سے یہ لفظ کہنے کا مقصد تھا آپ کی توہین کرنا اور دین کا مذاق بنانا۔

لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ اپنی زبانیں گھما گھما کر یعنی یہودی اپنی زبانوں سے حق کو باطل کے ساتھ اور ظاہری تعظیم کو باطنی توہین کے ساتھ لپیٹنے کے لئے یہ لفظ کہتے ہیں۔

وَطَعْنًا فِي الدِّينِ اور دین (اسلام) میں طعن کرنے کے لئے یعنی یہودی اسلام پر طعن کرنے کے لئے لفظ رَاعِنَا کہتے ہیں ان کا مقولہ ہے کہ اگر یہ سچے نبی ہوتے تو اس لفظ کو کہنے سے جو ہمارا پوشیدہ مقصد ہے اس کو ظاہر کر دیتے۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ قَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ وَأَقْوَمَ اور اگر یہ بات ثابت ہو جاتی کہ انہوں نے سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَ اسْمَعْ وَانْظُرْنَا (ہم نے سنا اور مانا اور ہماری بات سن لیجئے اور ہماری رعایت

کیجئے) کہا ہے یعنی ظاہر اور باطن میں انہوں نے یہی بات کہی ہے (اور ان کی نیتیں خبیث نہیں ہیں تو ان کے لئے بہتر ہوتا اور بات ٹھیک ہوتی مراد یہ کہ عَصَیْنَا کی جگہ اَطَعْنَا کہتے غیر مسمع نہ کہتے اور انظر نا کہتے راعنا نہ کہتے تو ان کے لئے بہتر ہوتا اور بات درست ہوتی (الفاظ کے دو متضاد معنی نہ ہوتے)۔

وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ مگر ان کے کفر کی وجہ سے اللہ کی لعنت ان پر ہو گئی ہے۔ اللہ نے ان کو بے مدد چھوڑ دیا اور ہدایت سے دور کر دیا ہے۔

فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا اسی لئے یہ ایمان نہیں لاتے مگر تھوڑا سا۔ یعنی ان کا ایمان شرعاً نا قابل اعتبار ہے بعض پیغمبروں اور بعض کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں یا ظاہر میں ایمان رکھتے ہیں۔ اور باطن میں کفر چھپائے رکھتے ہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قلت کا معنی عدم ہو یعنی بالکل ایمان نہیں لاتے بعض علماء نے بیان کیا کہ قَلِيْلًا سے مراد ہیں عبداللہ بن سلام جیسے مخلص مومن یعنی بعض مخلص مومنوں کے علاوہ عام طور پر یہ ایمان نہیں لاتے۔

مگر اس مطلب پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ کلام منفی ہے اور منفی کلام میں مستثنیٰ (فاعل) کا منصوب ہونا جمہور کے نزدیک درست نہیں اگرچہ ابن حاجب نے اس کو جائز قرار دیا ہے مگر عام اہل نحو اس کو جائز نہیں کہتے۔ پھر اس صورت میں گزشتہ آیت لَعَنَهُمُ اللّٰهُ سے اکثر پر لعنت کرنا مراد ہو گا اور کل یہودیوں کی طرف ضمیر راجع نہ ہو گی (جو تفسیر جمہور کے خلاف ہے)۔

علامہ تفتازانی نے بیان کیا ہے کہ اِلَّا قَلِيْلًا کا استثناء لَا يُؤْمِنُوْنَ سے نہیں ہے بلکہ لَعَنَهُمْ کی ضمیر مفعول سے ہے یعنی اللہ نے سوا تھوڑے آدمیوں کے باقی سب پر لعنت کر دی ہے۔

ابن اسحاق نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ عبداللہ بن صوریا، کعب بن اسید اور انہی جیسے بعض دوسرے علماء یہود سے رسول اللہ ﷺ نے گفتگو کی اور فرمایا تم لوگ خوب جانتے ہو کہ جو کچھ میں لے کر آیا ہوں وہ سراسر حق ہے انہوں نے جواب دیا محمد ﷺ! ہم اس کو نہیں جانتے (ہماری کتاب میں اس کے خلاف ہے اور تم وہ نبی نہیں ہو جس کا ذکر توریت میں ہے) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ اے اہل کتاب اس قرآن کو مانو جو ہم نے محمد ﷺ پر نازل کیا ہے اور وہ تمہاری کتاب یعنی توریت کی تصدیق کرتا ہے (کہ توریت واقعی خدا کی کتاب ہے)۔

مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو بالکل مٹا ڈالیں اور پشت پر ان کو الٹا دیں۔ وُجُوْهًا میں تنوین مضاف الیہ کے عوض آئی ہے یعنی تمہارے چہروں کو۔ طمس کا حقیقی معنی ہے نشان کو مٹا دینا یہاں مراد ہے ناک، آنکھیں، ابرو اور منہ کے نشانات کو مٹا دینا۔

بعض علماء نے نَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَا کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ ہم چہروں پر گدی کی طرح بال پیدا کر دیں جیسے بندروں کے چہرے ہوتے ہیں کیونکہ آدمیوں کے بال چہروں کے بالمقابل گدی کی طرف پیدا ہوتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا قبل اس کے کہ ہم تمہارے چہروں کو اونٹ کے موزے کی طرح بنا دیں قتادہ اور ضحاک نے کہا اس سے نابینا کر دینا مراد ہے اور چہروں سے مراد ہیں آنکھیں۔

......ایک شبہ......

اس آیت میں ان یہودیوں کیلئے طمس کر دینے کی وعید ہے جو ایمان نہ لائیں۔ مندرجہ ذیل روایات بھی اسی کی تائید کرتی ہیں۔ روایت میں آیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے جب یہ آیت سنی تو گھر جانے سے پہلے ہی خدمت گرامی میں حاضر ہو گئے اور اس اندیشہ سے کہ کہیں چہرہ بگڑ نہ گیا ہو۔ چہرہ پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض

کیا یارسول اللہ ﷺ مجھے امید نہ تھی کہ (صحیح سالم) گدی کی طرف منہ پلٹ جانے سے پہلے میں یہاں تک پہنچ سکوں گا یہ کہہ کر مسلمان ہو گئے۔

اسی طرح حضرت کعب احبار کے متعلق روایت میں آیا ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں انہوں نے یہ آیت سنی تو فوراً مسلمان ہو گئے اور خوف سے کہ کہیں اس آیت کی وعید ان پر نہ پڑ جائے عرض کیا اے رب میں مسلمان ہو گیا۔ اے رب میں ایمان لے آیا۔ لیکن اللہ کی یہ وعید پوری نہ ہوئی۔ یہودی ایمان نہیں لائے تب بھی مندرجۂ آیت عذاب ان پر نہیں آیا۔

......ازالۂ شبہ......

یہ وعید ضرور پوری ہوگی اور قیامت سے پہلے یہودیوں کی صورتیں مسخ کر دی جائیں گی۔ یہ بھی جواب دیا گیا کہ مندرجہ آیت عذاب کی وعید کی شرط یہ تھی کہ کوئی یہودی ایمان نہ لائے جب بعض ایمان لے آئے تو شرط وعید جاتی رہی اور پوری قوم سے عذاب اٹھا لیا گیا۔ یا یوں کہا جائے کہ آیت میں دو عذابوں میں سے کسی ایک کے واقع ہونے کی وعید ہے طمس یا لعنت طمس نہیں ہوا لعنت محقق ہو گئی۔ اس لئے وعید پوری ہو گئی۔

میرے نزدیک کافر یہودیوں کی شکلوں کا بگاڑ قیامت کے دن ہوگا (یعنی صورتوں کے بگاڑ دینے سے مراد ہے قیامت کے دن شکلیں مسخ کر دینا چنانچہ کافر یہودیوں کی شکلیں قیامت کے دن مسخ کی جائیں گی)

ابن عساکر اور خطیب نے حضرت معاذ بن جبل کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَأْتُوْنَ اَفْوَاجًا تلاوت کی اور فرمایا میری امت (دعوت) کے بوقت حشر دس گروہ ہوں گے ایک قسم کے گروہ کا حشر بندوں کی صورت پر ایک کا خنزیروں کی صورت پر ایک کا کتوں کی صورت پر اور ایک کا گدھوں کی صورت پر ہوگا۔ الحدیث۔

مجاہدؒ نے کہا چہروں کے مسخ سے مراد ہے گمراہی میں چھوڑ دینا۔ دلوں کو الٹ دینا اور بصیرت کے رخ کو پلٹ دینا لیکن اس مطلب پر یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید ایمان سے پہلے یہودی پاک تھے۔

ابن زید نے کہا آیت میں طمس سے مراد یہ ہے کہ مدینہ سے ہم ان کا نشان مٹا دیں گے اور پشت کے بل اسی طرف کو لوٹا دیں گے جس طرف سے آئے تھے یعنی ملک شام۔ گویا بنی نضیر کو ملک شام کے علاقہ اذرعات اور اریحا میں جلاوطن کر دینا اس آیت کی تفسیری وضاحت ہے۔

اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ یا ان پر ہم ایسی لعنت کریں جیسی ان ہفتہ والوں پر کی تھی۔[1]

اصحاب السبت یہودیوں پر اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰؑ کی زبانی لعنت کرائی تھی۔

---

[1] سنیچر والے، ملک شام میں کچھ بنی اسرائیل کسی بستی میں سمندر کے ساحل پر آباد تھے اور ان کا گزارا مچھلی کے شکار پر تھا، سنیچر کا دن بنی اسرائیل کی عبادت کا دن تھا اس روز دنیوی کاروبار کرنے کی ممانعت تھی لیکن اللہ کو ان کا امتحان کرنا مقصود تھا کچھ اتفاق ایسا ہوتا تھا کہ سنیچر کے دن ہی سمندر کی موجوں پر مچھلیاں زیادہ تیرتی نظر آتی تھیں باقی چھ روز میں اتنی کثرت نہیں ہوتی تھی لیکن یہ لوگ مذہب کی ممانعت کی وجہ سے مجبور تھے آخر طمع غالب آئی اور انہوں نے مچھلیوں کے شکار کا ایک شرعی حیلہ نکال لیا، سمندر سے فاصلہ پر بڑے بڑے گہرے حوض اور تالاب بنائے اور حوضوں سے سمندر تک نالیاں اس طرح بنائیں کہ جب سمندر میں چڑھاؤ ہو تو نالیوں کے ذریعہ سے پانی آ کر حوضوں میں بھر جائے اور اتار کے وقت بالائی پانی اتر جائے اور حوضوں کے گہراؤ کے پانی میں مچھلیاں جمع رہیں ان کو واپسی کی ضرورت نہ پڑے چنانچہ حوض تیار ہو گئے اور سمندر کا چڑھاؤ مچھلیاں ساتھ لا کر حوضوں میں گرانے لگا اس طرح سنیچر کے دن مچھلیاں حوضوں میں بہت زیادہ جمع ہو جاتیں اور اتوار کا دن ہوتا تو سب شکاری ان کو پکڑ لیتے، پیغمبر وقت اور دیندار علماء نے ان حیلہ بازوں کو حکم خدا کی مخالفت سے روکا لیکن وہ لوگ باز نہ آئے بلکہ اور اڑ گئے، دنیاوی عالموں نے اس کو موافق شرع فعل قرار دیا بعض لوگ بالکل غیر متعلق رہے، نہ ممانعت کی نہ ان کے شریک کار ہوئے غرض سوائے حق گو صالحین کے باقی لوگ عذاب میں مبتلا ہوئے اور ان کی صورتیں مسخ کر دی گئیں۔

وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝ اور اللہ تعالیٰ کا حکم ضرور پورا ہوتا ہے کوئی اس کو دفع نہیں کر سکتا۔

طبرانی اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابوایوب انصاریؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک شخص نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرا ایک بھتیجہ ہے جوار تکاب ممنوعات سے باز نہیں آتا فرمایا اس کا دین کیا ہے اس نے عرض کیا نماز پڑھتا ہے اور توحید کا قائل ہے فرمایا (اس کے دین کا اس سے سودا کر داول) اس سے کہو کہ وہ اپنا دین تم کو بطور ہبہ دے دے اگر انکار کرے تو اس سے اس کا دین خرید و (یعنی اس سے کہو کہ وہ اپنی دینداری نماز توحید وغیرہ تمہارے ہاتھ فروخت کر دے اگر وہ بیچنے سے بھی انکار کر دے گا تو معلوم ہو جائے گا کہ اس کو اپنا دین دنیا سے زیادہ پیارا ہے) اس شخص نے حکم کی تعمیل کی مگر اس نے اپنی دینداری کا سودا کرنے سے انکار کر دیا وہ شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا حضور دینی معاملہ میں تو میں نے اس کو بڑا حریص پایا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں کرے گا خواہ شرک اس طرح ہو کہ کسی دوسرے کو واجب الوجود (ازلی ابدی لافانی) مانا جائے یا معبود قرار دیا جائے لیکن شرک کی عدم مغفرت اس شرط پر ہے کہ مرتے دم تک مشرک شرک پر قائم رہا ہو لیکن اگر شرک سے توبہ کر لی ہو اور ایمان لے آیا ہو تو گذشتہ شرک و معصیت کو بخش دیا جائے گا۔ اجماع علماء یہی ہے۔

گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کی طرح ہو جاتا ہے گویا اس سے کبھی گناہ ہوا ہی نہ تھا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ کافروں سے کہہ دو کہ اگر وہ کفر سے باز آجائیں گے تو گزشتہ کفر و گناہ معاف کر دیا جائے گا۔

وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ اور شرک کے علاوہ (دوسرے گناہ اللہ) جس کے چاہے گا بخش دے گا۔ دوسرے گناہ چھوٹے ہوں یا بڑے قصداً کئے گئے ہوں یا غلطی سے۔ گناہ کرنے والا خواہ بغیر توبہ کے ہی مر جائے مگر یہ مغفرت اللہ کی مشیت پر موقوف ہے اس سے فرقہ مرجیہ کے قول کی غلطی ثابت ہوتی ہے کہ مومن کا ہر گناہ واجب المغفرت ہے اور ایمان کے ہوتے ہوئے کوئی گناہ ضرر نہیں پہنچائے گا جیسے شرک کی موجودگی میں ہر نیک عمل ناکارہ ہے۔

فرقۂ معتزلہ قائل ہے کہ گناہ کی مغفرت کے لئے توبہ شرط ہے آیت سے اس قول کی بھی تغلیط ہوتی ہے کیونکہ آیت میں مغفرت کو توبہ کے ساتھ مشروط نہیں کیا گیا۔ کلام کی رفتار کی غرض مشرک اور دوسرے موحد گناہ گار میں فرق بیان کرنا ہے۔ چونکہ مغفرت کو مشیت کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے اس لئے توبہ کرنے والے کی مغفرت واجب نہیں نہ غیر تائب کو عذاب دینا ضروری ہے ورنہ اس مشیت کا کوئی فائدہ نہیں۔

خارجیوں کا قول ہے کہ ہر قسم کا گناہ شرک ہو یا کوئی اور دوامی دوزخی بنا دیتا ہے (جس کی مغفرت نہیں ہو سکتی)۔

آیت میں ان کے قول کے خلاف بھی صراحت ہے۔ ابویعلی ابن منذر اور ابن عدی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ہم (پہلے) کبیرہ گناہ کرنے والوں کے لئے استغفار کرنے سے رکتے تھے جب رسول اللہ ﷺ سے ہم نے آیت اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ سنی اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے دعا شفاعت اپنی امت کے اہل کبائر کے لئے مخصوص کر رکھی ہے تو پھر ہم اپنے بہت سے باطنی خیالات سے رک گئے اور دعا کرنے لگے اور قبول کی امید بھی رکھتے ہیں۔

بغوی نے کلبی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ آیت وحشی بن حرب اور اس کے ساتھیوں کے متعلق نازل ہوئی تھی وحشی نے حضرت حمزہؓ کو شہید کر دیا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے پر اس سے آزادی کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن یہ وعدہ پورا نہیں کیا گیا جب وہ لوٹ کر مکہ پہنچا تو اس کو اور اس کے ساتھیوں کو حضرت حمزہؓ کو شہید کرنے پر بڑی پشیمانی ہوئی اور ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو لکھا کہ ہم کو اپنی کی ہوئی حرکت پر پشیمانی ہے اور مسلمان ہونے سے ہم کو صرف یہ امر مانع ہے کہ جب آپ مکہ میں

تھے تو (یہ آیت) کہتے تھے۔ وَالَّذِیْنَ لَایَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ الخ ہم نے دوسروں کو معبود بھی بنایا ہے اور ناحق قتل بھی کیا ہے اور زنا بھی کیا ہے اگر یہ آیات نہ ہوتیں تو ہم آپ کے پیچھے ہو جاتے اس پر آیت اِلَّا مَنْ تَابَ وَعَمِلَ عَمَلاً صَالِحاً دو آیت نازل ہوئیں رسول اللہ ﷺ نے یہ دونوں آیات وحشی اور اس کے ساتھیوں کو لکھ بھیجیں ان لوگوں نے پھر حضور ﷺ کو لکھا کہ یہ شرط بہت سخت ہے ہم کو خوف ہے کہ ہم نے کوئی نیک عمل کیا ہی نہ ہوگا اس پر آیت اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ نازل ہوئی اور حضور ﷺ نے یہ آیت ان کو بھیج دی اس پر انہوں نے کہا اس آیت میں تو مغفرت کو مشیت کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے) ہم کو اندیشہ ہے کہ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہوں گے جن کی مغفرت کی مشیت ہوگی اس پر آیت یَاعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِہِمْ نازل ہوئی اور حضور ﷺ نے یہ آیت ان کو بھیج دی یہ سن کر وہ لوگ مسلمان ہو گئے اور حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے آپ نے ان کا اسلام قبول کر لیا۔ پھر وحشی سے فرمایا بتا تو نے حمزہ کو کس طرح قتل کیا وحشی نے کیفیت بیان کی سن کر حضور ﷺ نے فرمایا تیرا برا ہو مجھے اپنا منہ نہ دکھا چنانچہ وحشی شام کو چلا گیا اور مرتے دم تک وہیں رہا۔

اگر شبہ کیا جائے کہ اس قصہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مغفرت کے لئے مشیت کی شرط منسوخ ہو گئی اس سے فرقہ مرجئہ کا قول ثابت ہو گیا کہ مومن کی مغفرت واجب ہے اور ایمان کے بعد کوئی گناہ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے ہم کہتے ہیں کہ مشیت کے ساتھ مغفرت کی وابستگی تو منسوخ ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ مغفرت ہو یا کوئی اور چیز ہر ایک مشیت سے وابستہ ہے۔ مشیت کے بغیر تو کچھ ہو ہی نہیں سکتا البتہ آیت یَاعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِہِمْ کا وحشی کے حق میں نزول اس بات پر ضرور دلالت کر رہا ہے کہ وحشی مجملہ ان لوگوں کے ہے جن کی مغفرت کی مشیت ہو چکی ہے۔

بغوی نے بحوالۂ ابو مجلز حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ جب آیت قُلْ یَاعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِہِمْ نازل ہوئی تو ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کیا، اور شرک یا رسول اللہ ﷺ حضور ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا اس نے پھر دو یا تین بار کھڑے ہو کر یہی سوال کیا تو آیت اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ نازل ہوئی۔ بغوی نے مطرف بن عبداللہ بن شخیر کی روایت سے حضرت ابن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں کوئی شخص گناہ کبیرہ کی حالت میں (بغیر توبہ کئے) مر جاتا تھا تو ہم کہتے تھے یہ دوزخی ہوا۔ یہاں تک کہ آیت مذکورہ نازل ہوئی اس کے بعد ہم (صاحب کبیرہ کے دوزخی ہونے کی) شہادت دینے سے رک گئے۔ بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول روایت میں آیا ہے کہ قرآن مجید میں سب سے زیادہ پر امید یہ آیت ہے۔ [1]

وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدِ افْتَرٰی اِثْمًا عَظِیْمًا ○ جس نے اللہ کے ساتھ (صفات و ذات میں) کسی کو شریک قرار دیا اس نے اپنی طرف سے بنایا بڑا جھوٹ۔

افراء (باب افعال) بگاڑنا، فساد کرنا، افتراء (باب افتعال) کا استعمال جھوٹ شرک اور ظلم میں ہوتا ہے صحاح جوہری۔

---

[1] ابو یعلی اور ابن ابی حاتم نے حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو بندہ شرک نہ کرنے کی حالت میں مر گیا اس کے لئے مغفرت جائز ہو گئی اگر اللہ چاہے اس کی مغفرت (بغیر عذاب کے) کر دے اور چاہے تو عذاب دے دے (پھر سزا کے بعد اس کو جنت میں بھیج دے) اللہ نے (غیر مشرک کا) استثناء کر دیا ہے اور فرمایا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَاءُ۔ ابو یعلی نے حضرت انسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص سے اللہ نے کسی عمل کے ثواب کا وعدہ کیا ہے تو وہ ضرور اس کو پورا کرے گا اور جس شخص کو کسی عمل کی سزا سے ڈرایا ہے تو اس کو اختیار ہے (سزا دے یا نہ دے) طبرانی نے حضرت سلمانؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک گناہ نہیں بخشا جائے گا ایک گناہ (بغیر بدل کے) چھوڑا نہیں جائے گا اور ایک گناہ بخش دیا جائے گا، نہ بخشا جانے والا گناہ شرک ہے اور بخشا جانے والا گناہ وہ ہے جو بندے اور خدا کے درمیان کا ہو۔ اور نہ چھوڑا جانے والا گناہ وہ ہے جس میں بندوں کی آپس میں حق تلفیاں کی گئی ہوں۔

مراد یہ ہے کہ اس نے فاسد حرکت کی اور جھوٹ کہا۔ اثما مفعول مطلق ہے یا مفعول بہ اول صورت میں معنی ہوگا اس نے جھوٹ اور فساد کا ارتکاب کیا، بڑے جھوٹ و فساد کا۔ دوسری صورت میں اس طرح ترجمہ ہوگا اس نے اپنی طرف سے بنایا بڑا گناہ عظیما سے مراد ہے اتنا بڑا کہ اس کے مقابلہ میں تمام گناہ حقیر ہیں۔ شرک اور دوسرے گناہوں میں یہی فرق ہے۔

حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو باتیں لازم کر دینے والی ہیں ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ لازم کرنے والی کیا ﷺ فرمایا جو شخص شرک نہ کرنے کی حالت میں مرا وہ جنت میں گیا اور جو شخص شرک ہی کی حالت میں مرا وہ دوزخ میں گیا۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ ﷺ اس وقت سفید کپڑا اوڑھے سو رہے تھے (میں واپس آگیا دوبارہ) پھر گیا تو آپ ﷺ بیدار ہو چکے تھے۔ ارشاد فرمایا جو بندہ لا الہ الا اللہ کا قائل ہو پھر اسی پر مر جائے وہ ضرور جنت میں جائے گا۔ میں نے عرض کیا خواہ اس نے زنا اور چوری کی ہو فرمایا خواہ اس نے زنا اور چوری کی ہو، میں نے عرض کیا، خواہ اس نے زنا اور چوری کی ہو فرمایا خواہ اس نے زنا اور چوری کی ہو۔ میں نے کہا خواہ اس نے زنا اور چوری کی ہو فرمایا خواہ اس نے زنا اور چوری کی ہو (پھر بھی جنت میں جائے گا) ابوذرؓ کی ناک خاک آلود ہونے پر بھی (یعنی ابوذرؓ کی مرضی کے کتنا ہی خلاف ہو وہ جنت میں ضرور جائے گا۔ حضرت ابوذرؓ جب اس حدیث کو بیان کرتے تھے تو (آخری جملہ) اگرچہ ابوذرؓ کی ناک خاک آلود ہو ضرور کہتے تھے۔ بخاری و مسلم۔ اس موضوع کی احادیث بہت آئی ہیں۔

ابن ابی حاتمؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول اور ابن جریر نے عکرمہ، ابو مالک اور مجاہد وغیرہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ یہودی اپنے بچوں کو افضل سمجھتے تھے ان کو ساتھ لے کر نمازیں پڑھتے اور ان کی قربانیاں پیش کرتے تھے اور دعویٰ کرتے تھے کہ (ہمارا کوئی گناہ، قصور باقی نہیں رہتا) ہم سے کوئی گناہ قصور نہیں ہوتا۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی (یعنی جس طرح وہ بچوں کو معصوم اور بے گناہ سمجھتے تھے اسی طرح اپنے آپ کو بھی گناہوں سے پاک قرار دیتے تھے اس کی تفصیل آئندہ سطور میں آرہی ہے)۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی عجیب حالت ہے جو اپنے آپ کو گناہوں سے پاک قرار دیتے ہیں۔ استفہام تعجب کے لئے جو شخص اپنے نفس کو گناہوں سے پاک قرار دیتا ہو اس پر بڑا تعجب ہے معصومیت کا دعویٰ کرنے سے اس کا مقصد ہے دوسروں پر اپنی فوقیت اور برتری قائم کرنا لیکن برتری خود ساختہ دعوے سے حاصل نہیں ہوتی اس دعوے سے تو ایسے شخص کی دنائت اور کمینگی کا اظہار ہوتا ہے فوقیت اور گناہوں سے پاکیزگی تو اس پر موقوف ہے کہ اللہ کسی کو بزرگ و برتر اور گناہوں سے پاک کر دے۔

بغوی اور ثعلبی نے کلبی کا قول لکھا ہے کہ کچھ یہودی جن میں بحری بن عمرو، نعمان بن اوفی اور مرحب بن مذید بھی تھے اپنے چھوٹے بچوں کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا محمد ﷺ کیا ان پر کوئی گناہ ہو سکتا ہے حضور ﷺ نے فرمایا نہیں کہنے لگے تو ہم بھی انہی کی طرح ہیں دن میں ہم جو کچھ کرتے ہیں ان کو رات میں معاف کر دیا جاتا ہے اور رات کو جو کام کرتے ہیں دن میں ان کا کفارہ ہو جاتا ہے اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

حسنؒ، ضحاکؒ اور قتادہؒ کا بیان ہے کہ جب یہودیوں اور عیسائیوں نے نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں) کہا اور یہ بھی کہ لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى (یہودیوں اور عیسائیوں کے علاوہ جنت میں کوئی نہیں جائے گا۔ اول یہودیوں کا دعویٰ تھا اور دوسرا عیسائیوں کا) تو آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

میں کہتا ہوں کہ آیت کا سبب نزول اگرچہ خاص ہو مگر حکم عام ہے حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا اہل کتاب آپس میں تزکیہ کرتے تھے یعنی ایک دوسرے کو گناہوں سے پاک کہتا تھا چنانچہ طارق بن شہاب کی روایت میں حضرت ابن مسعودؓ کا قول آیا ہے کہ بعض دیندار آدمی صبح کو اپنے گھر سے نکلتے تھے اور کسی ایسے شخص سے جا کر ملتے جس سے ان کا نہ جانی نفع نقصان وابستہ

ہوتا تھا نہ ملی لیکن (اس کے منہ پر) اس کو خوش کرنے اور اس کی تعریف کرنے) کے لئے کہتے تھے خدا کی قسم آپ تو ایسے ہیں ویسے ہیں نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ گھر لوٹ کر آتے تھے تو دین کا کوئی حصہ ان کے پاس باقی نہ ہوتا تھا یہ فرمانے کے بعد حضرت ابن مسعودؓ نے آیت اَلَمْ تَرَاِلَی الَّذِیْنَ یُزَکُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ تلاوت فرمائی۔

مسئلہ :۔ کسی کے لئے جائز نہیں کہ (سوائے پیغمبروں کے) کسی اور کا تزکیہ کرے اور گناہوں سے اس کو پاک قرار دے کیونکہ بغیر علم کے کوئی فیصلہ درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ ہاں مومن کے متعلق حسن ظن رکھنے کا چونکہ حکم ہے اس لئے حسن ظن کے طور پر کسی کے پاک ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ کسی کو گناہوں سے پاک کہنے سے تو اس کے اندر غرور اور پندار پیدا ہو جاتا ہے جس کی شریعت میں ممانعت کر دی گئی ہے۔ پھر یہ بات واقعی بھی ہے کہ کسی کو اللہ کا قرب اور اس کی طرف سے ثواب حاصل ہوا یا نہیں اور کتنا حاصل ہوا اس کا علم تو سوائے خدا کے کسی کو بھی نہیں۔ اسی لئے فرمایا۔

بَلِ اللّٰهُ یُزَکِّیْ بلکہ اللہ پاک کرتا ہے یا پاک قرار دیتا ہے یعنی گناہ بخش کر پاک کر دیتا ہے اور اصلاح حال کر دیتا ہے۔

مَنْ یَّشَآءُ جسکو چاہتا ہے وہی پاک کر دینے پر قادر ہے اور انسان کے اندرونی حالات سے وہی باخبر اور واقف ہے اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی اور الہام کے ذریعہ سے اگر اللہ کسی کو کسی کے تزکیہ و تطہیر کی واقفیت عطا فرما دے تو اپنی یا دوسرے کی تطہیر کا فیصلہ وہ آدمی کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ غرور و تکبر کے طور پر نہ ہو کیونکہ پندار و غرور بڑا نفسانی عیب ہے ۔ یہی مصداق ہے ان احادیث کا جن میں حضور ﷺ نے اپنے بعض خصوصی اوصاف بغیر غرور و تکبر کے فرمائے ہیں مثلاً فرمایا ہے کہ میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور (میرا یہ قول) بطور فخر نہیں ہے یہ حدیث سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

جب منافقوں نے تعریض کے طور پر حضور ﷺ کو تقسیم میں غیر منصف قرار دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا خدا کی قسم میرے بعد تم کو اپنے لئے مجھ سے زیادہ کوئی عادل نہیں ملے گا۔ یہ حدیث طبرانی اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے اور امام احمد نے حضرت ابو سعیدؓ کی روایت سے بیان کی ہے۔ ایک اور حدیث میں حضور ﷺ والا نے فرمایا ابو بکرؓ اور عمرؓ متوسط عمر والے جنتیوں کے سردار ہیں اور حسنؓ و حسینؓ جوان جنتیوں کے سردار ہیں اور فاطمہؓ اہل جنت کی عورتوں کی سردار ہیں۔ اولیاء کرام نے بھی بحکم الہامی اسی طرح کے بعض کلام کہے ہیں مثلاً حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ میرا یہ قدم ہر ولی اللہ کی گردن پر ہے۔

وَلَا یُظْلَمُوْنَ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا یعنی اللہ جن کا تزکیہ کرنا چاہتا ہے ان کو ان کی پاکی کے مطابق ثواب ملے گا ان کے ثواب میں کمی نہیں کی جائے گی۔ یا یہ مطلب ہے کہ گناہوں سے تطہیر کے سلسلہ میں کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا جو تطہیر کا اہل ہوتا ہے اللہ اس کی تطہیر کرتا ہے اور جو کے لائق نہیں ہوتا صرف اسی کی تطہیر نہیں کرتا۔ یا یہ مطلب ہے کہ جو لوگ اپنے نفوس کو پاک کہتے ہیں ان کے جرم کے موافق سزا دی جائے گی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

فَتِیْلًا ادنیٰ ظلم، لغت میں فتیل۔ (بٹا ہوا) وہ دھاگہ یا میل کی بتی ہے جو آدمی دو انگلیوں کے درمیان بٹتا ہے کسی حقیر چیز کی تمثیل بیان کرنے کے لئے اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے کذا فی الصحاح۔

بعض اہل لغت نے لکھا ہے کہ کھجور کی گٹھلی کے شگاف میں جو ریشہ یا سونتا ہوتا ہے اس کو فتیل کہتے ہیں گویا مطلب یہ ہوگا کہ فتیل برابر ادنیٰ ظلم بھی ان پر نہیں کیا جائے گا۔

اُنْظُرْ کَیْفَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْکَذِبَ (اے محمدؐ) دیکھو (یہودی) اللہ پر کیسی دروغ بندی کرتے ہیں کہ اپنے کو اللہ کا بیٹا اور چہیتا قرار دیتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے دن کے گناہ رات کو اور رات کے گناہ دن کو معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

وَکَفٰی بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِیْنًا اور یہ افتراء بس گناہ کی انتہا ہے جس کا غلط ہونا ظاہر ہے اس کو غلط قرار دینے کے لئے

کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں ہے اس کا گناہ ہونا بالکل بدیہی ہے کَفٰی سے پہلے قد محذوف ہے اور پورا جملہ یَفْتَرُوْنَ کے فاعل سے حال ہے۔

اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ واقعہ احد کے بعد کعب بن اشرف ستر یہودیوں کو لے کر قریش کے پاس مکہ کو گیا تاکہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف قریش سے امداد و حمایت کا عہد و پیمان کرے اور جو معاہدہ رسول اللہ ﷺ سے یہودیوں نے کر رکھا تھا اس کو توڑ دے مکہ پہنچ کر کعب ابوسفیان کے پاس جا کر ٹھیرا اور دوسرے یہودی قریش کے مختلف اشخاص کے پاس اترے، اہل مکہ نے کہا محمد ﷺ بھی اہل کتاب ہیں اور تم بھی اہل کتاب ہو ہم کو اعتبار نہیں اندیشہ یہ ہے کہ کہیں یہ تمہاری چال نہ ہو۔ اگر تم ہم کو اپنے ساتھ ملا کر جنگ کرنا چاہتے ہو تو ان دونوں بتوں کو سجدہ کرو اور ان کو مانو۔ کعب نے سجدہ کر لیا پھر بولا تدبیر یہ ہے کہ تیس آدمی ہمارے اور تیس آدمی تمہارے کعبہ سے چمٹ کر معاہدہ کرلیں کہ محمد ﷺ کے خلاف جنگ کرنے کی ہم مل کر کوشش کریں گے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جن لوگوں کو اللہ کی کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا ہے وہ بتوں پر اور شیطان پر ایمان رکھتے ہیں۔ بیہقی نے دلائل میں اور طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ وغیرہ کے حوالہ سے لکھا ہے اور جبت و طاغوت کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ عکرمہ کا قول ہے کہ جبت و طاغوت دو بت تھے مشرک ان کی پوجا کرتے تھے اس کی تائید مذکورہ بالا قصہ سے ہوتی ہے۔ عکرمہ کا ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ حبشی زبان میں جبت کا معنی ہے شیطان۔ میں کہتا ہوں شاید بت کا نام اسی کے نام پر رکھ دیا گیا ہو۔

ابو عبیدہؒ کا بیان ہے کہ جبت و طاغوت اللہ کے علاوہ ہر باطل معبود کو کہتے ہیں۔ مگر طاغوت کا جبت پر عطف چاہتا ہے کہ دونوں الگ الگ ہوں (کیونکہ عطف میں اصل یہ ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ مغایر ہوں)

تحقیق (مولف کے نزدیک) یہ ہے کہ جبت اصل میں جبس تھا اس شخص کو کہتے ہیں جس میں کوئی خیر اور بھلائی نہ ہو سین کو تاء سے بدل دیا گیا ہے۔ اور طاغوت بروزن فعلوت طغیان سے مشتق ہے طغیان کا معنی ہے کفر اور عصیان میں حد سے آگے بڑھ جانا۔ طاغوت کی اصل طغووت تھی (قاموس و صحاح) اسی لئے حی بن اخطب کو جبت اور کعب بن اشرف کو طاغوت کہا گیا ہے کذا قال الضحاک۔ عمر، شعبی اور مجاہد کا قول ہے کہ جبت کا معنی ہے جادو اور طاغوت کا معنی شیطان محمد بن سیرین نے کہا جبت کاہن اور طاغوت جادوگر۔ سعید بن جبیر اور ابوالعالیہ نے اس کے برعکس کہا ہے۔

بغوی نے اپنی سند سے حضرت قبیصہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عیافت (پرندوں کے نام، آواز اور گزرنے سے شگون حاصل کرنا) اور طرق (پتھریاں مارنا اور اس کو شگون جاننا) اور پرندوں کے دائیں بائیں سے اڑ کر جانے کو اپنے مقصد کے لئے اچھا بر اور مضر مفید سمجھنا (یا عام بدشگونی) جبت میں سے ہے جس کے اندر کوئی خیر نہیں۔ [1]

میں کہتا ہوں بظاہر اس جگہ جبت سے مراد ہیں بت جن کے اندر کوئی خیر نہیں ہوتی اور طاغوت سے مراد ہیں بتوں کے شیطان۔ ہر بت کا ایک شیطان ہوتا تھا جو بت کے اندر سے بولتا تھا اور اس سے لوگوں کو دھوکہ ہو جاتا تھا (ممکن ہے کوئی پجاری پس پردہ بیٹھا ہو اور بت تک اس نے کوئی تار پوشیدہ لگا رکھا ہو اور تار کے ذریعہ سے وہ بولتا ہو جس سے لوگ سمجھتے ہوں کہ بت بول رہا ہے۔

---

[1] عیافۃ پرندوں کے ناموں آوازوں اور اڑنے کے راستوں سے اچھا برا شگون لینا عَافَ یَعِیْفُ عَیْفاً (باب ضرب) بدشگونی لی، گمان کیا، ظن کیا (نہایہ) طرق پتھریاں اور کنکریاں پھینکنا (اور اس کو شگون قرار دینا) جیسے عورتیں کرتی ہیں (نہایہ) طیرۃ بدشگونی لینا اصل میں اسی لفظ کا معنی ہے دائیں بائیں سے پرندوں یا ہرنوں کے گزرنے سے اچھا یا برا شگون لینا (عرف عام میں عام بدشگونی پر اطلاق ہونے لگا) نہایہ خبل جنون تباہی اصل میں اس کا معنی ہے نقصان خرابی، پھر ہر تباہی کو خبال کہنے لگے، (نہایہ)۔

بیہقی نے حضرت ابو الطفیل کی روایت سے لکھا ہے کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ نے خالدؓ بن ولید کو عزی کو ڈھا دینے کے لئے بھیجا خالدؓ نے جا کر ببول کے درخت کاٹ دیئے اور واپس آ کر رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دیدی۔ حضور ﷺ نے فرمایا تجھے کوئی چیز بھی دکھائی دی، خالدؓ نے عرض کیا۔ نہیں۔ فرمایا تو تو نے عزی کو ڈھایا ہی نہیں خالد دوبارہ لوٹ کر گئے۔ پجاریوں نے جب خالدؓ کو دیکھا تو پہاڑ پر چلے گئے اور بھاگتے میں یہ کہتے جارہے تھے۔ عزی اس کو پٹ کر دے ورنہ ذلت کے ساتھ مرجا! اتنے میں ایک کالی ننگی عورت برآمد ہوئی جس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ اپنے سر اور چہرہ پر خاک اڑا رہی تھی۔ خالدؓ نے یہ کہتے ہوئے تلوار سونتی۔ عزی اب میں تیرا منکر ہوں۔ تیری پاکی کا اقرار نہیں کر سکتا۔ میں دیکھ چکا کہ اللہ نے تجھے ذلیل کر دیا۔ پھر تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر دے اور واپس آ کر رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دیدی۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہاں وہ عزی تھی اب ہمیشہ کے لئے تمہارے ملک میں اپنی پوجا کی جانے سے ناامید ہو گئی۔ کذا فی سبیل الرشاد۔

امام احمد اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب کعب بن اشرف (یہودی) مکہ میں پہنچا تو قریش نے اس سے کہا دیکھو یہ ناٹھا لنگوڑا اپنی قوم سے کٹا ہوا دعویٰ کرتا ہے کہ وہ ہم سے بہتر ہے حالانکہ ہم حج کے متولی ہیں کعبہ کے دربان ہیں اور حاجیوں کو پانی پلانے والے ہیں کعب نے کہا تم اس سے بہتر ہو اس پر آیت اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ نازل ہوئی اور مندرجہ ذیل آیت بھی اتری۔

وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا اور وہ (کعب بن اشرف اور اس کے ساتھی) مکہ کے کافروں سے (جیسے ابوسفیان وغیرہ) کہتے ہیں۔

هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا سَبِيلًا ﴿۵۱﴾ وہ (یعنی مکہ کے کافر) محمد ﷺ پر ایمان لانے والوں سے زیادہ سیدھے راستہ پر ہیں یعنی دین کے لحاظ سے محمد بن اسحاق نے حضرت ابن عباس کی روایت سے لکھا ہے۔ کہ قریش بنی غطفان اور بنی قریظہ کی جماعتوں کو مسلمانوں پر جو لوگ چڑھا کر لائے تھے وہ حی بن اخطب، سلام بن ابی الحقیق، ابو رافع، ربیع بن ابی الحقیق، ابو عمارہ اور ہودہ بن قیس تھے اور یہ سب بنی نضیر کے قبیلے سے تھے جب یہ لوگ قریش کے پاس پہنچے تو قریش نے کہا یہ علماء یہود ہیں پہلی کتابوں کا علم رکھتے ہیں ان سے دریافت کرو کہ ہمارا مذہب بہتر ہے۔ یا محمد ﷺ کا (جب یہودیوں سے قریش نے یہ سوال کیا تو) یہودیوں نے کہا تمہارا مذہب اس کے مذہب سے بہتر ہے اور تم اس سے اور اس کے ساتھیوں سے زیادہ صحیح راستہ پر ہو اس پر اللہ نے یہ آیت مُلْكًا عَظِيمًا تک نازل فرمائی۔ بغوی نے لکھا ہے کہ ابوسفیان نے جب کعب سے مذکورۂ بالا سوال کیا تو کعب نے کہا میرے سامنے اپنا مذہب پیش کرو ابوسفیان نے کہا۔ ہم حاجیوں کیلئے کوہان والی اونٹیاں ذبح کرتے ہیں۔ ان کو پانی پلاتے ہیں مہمانوں کو ٹھہراتے ہیں۔ قیدیوں کو رہا کراتے ہیں۔ رشتہ داری کو جوڑے رکھتے ہیں۔ اپنے رب کے گھر کو آباد رکھتے ہیں اور اس کا طواف کرتے ہیں۔ اور ہم اہل حرم ہیں اور محمد ﷺ نے باپ دادا کا دین چھوڑ دیا۔ رشتہ داریاں کاٹ دیں۔ حرم کو چھوڑ گیا۔ ہمارا مذہب قدیم ہے۔ محمد ﷺ کا مذہب نیا ہے یہ سن کر کعب بولا خدا کی قسم تم محمد ﷺ کے راستے سے زیادہ صحیح راستہ پر ہو۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے۔

وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيرًا ﴿۵۲﴾ اور جس کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے دور کر دے (اے مخاطب) تم کو اس کا کوئی مددگار نہ دنیا میں ملے گا نہ آخرت میں جنگ میں دنیا میں اس کی کوئی مدد نہیں کرے گا اور آخرت میں شفاعت وغیرہ کے ذریعہ سے کوئی عذاب کو دفع نہ کر سکے گا۔

یہودیوں کے مدد مانگنے اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف قریش کے ساتھ جنگی معاہدہ کرنے کا رد اس آیت میں ہے۔

کنجوسی اور حسد انسان کے بدترین خصائل ہیں یہودیوں کے انہی اوصاف کا آئندہ آیات میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے۔

اَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ ہاں! ان کے پاس کوئی حصہ سلطنت کا نہیں ہے اَمْ منقطعہ ہے اور ہمزہ انکاری ہے۔ یہودیوں کا خیال تھا کہ عنقریب ان کی سلطنت ہو جائے گی اس خیال کی نفی کر دی گئی۔ یا نصیب ملکی سے مراد ہے قومی سیادت وسرداری جس کے فوت ہونے کے اندیشہ سے یہودیوں نے نبوت کا انکار کیا تھا۔ سرداری کے لوازم میں سے سخاوت ہے اور یہودی بڑے کنجوس تھے سخاوت نام کو بھی ان میں نہ تھی اس لئے پرزور طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کی سرداری کا انکار کر دیا۔ ممکن ہے بطور تعریض یہ بیان کرنا مقصود ہو کہ جن کو اقرار نبوت سے اپنی سرداری فوت ہونے کا اندیشہ تھا تو خیر ان کے انکار کی ایک وجہ بھی ہے (اگرچہ یہ وجہ بھی قابل پذیرائی عذر نہیں ہے) لیکن جن لوگوں کو قومی سیادت حاصل ہی نہیں ہے ان کا انکار تو انتہائی حماقت ہے۔

فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ایسی حالت میں تو یہ لوگوں کو ذرا سی چیز بھی نہ دیتے۔ نقیر کھجور کی گٹھلی کے شگاف کا گڑھا۔ مراد حقیر چیز جیسے فتیل (دو انگلیوں کے درمیان بٹی ہوئی میل کی بتی یا ذرا سا بٹا ہوا دھاگہ مگر مراد حقیر چیز ہوتی ہے) یعنی اگر ان کو حکومت وسلطنت کا کوئی حصہ مل جاتا تو انتہائی کنجوسی کی وجہ سے یہ لوگوں کو حقیر ترین ذرا سی چیز بھی نہ دیتے ایسی حالت میں اللہ ان کو سلطنت کیسے عنایت کر سکتا ہے۔

یا یہ مطلب ہے کہ اگر یہ بادشاہ بھی ہوتے تب بھی لوگوں کو ذرا سی چیز نہ دیتے اور اب تو ذلیل محتاج ہیں ایسی حالت میں ان کے بخل کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں ہے۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اہل کتاب کہتے تھے محمد ﷺ کا دعویٰ تو یہ ہے کہ ان کو جو کچھ ملا ہے وہ عاجزی اور فروتنی کی وجہ سے ملا ہے، حالانکہ ان کی نو بیویاں ہیں کوئی بادشاہ بھی ان سے زیادہ عیش میں کیا ہوگا اس پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔

اَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ لیکن اللہ نے دوسرے لوگوں کو جو چیزیں اپنے فضل سے عنایت کی ہیں ان سے ان کو جلن ہوتی ہے۔ ام بل کے معنی میں ہے۔ یَحْسُدُوْنَ کی ضمیر یہودیوں کی طرف راجع ہے لیکن ابن سعد نے عفرہ کے غلام عمرؒ کا قول نقل کیا ہے کہ علم اہل کتاب مراد ہیں۔ الناس سے مراد صرف رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ، حسن اور ایک جماعت کا یہی قول ہے کہ اللہ نے اپنے رسول ﷺ کے لئے جو عورتیں حلال کر دی تھیں یہودیوں کو اس سے جلن ہوتی تھی بعض علماء کے نزدیک رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ مراد ہیں قتادہ نے کہا کہ عام عرب مراد ہیں یہودیوں کو عربوں سے جلن تھی کہ اللہ نے ان کے اندر نبی کیوں پیدا کیا اور کیوں عزت عطا فرمائی۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ الناس سے مراد سب لوگ ہیں کیونکہ جو شخص نبوت سے حسد کرتا ہے وہ گویا سب لوگوں کے کمالات اور ہدایت یاب ہونے سے جلتا ہے مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ سے مراد ہے نبوت، کتاب، اللہ کی خوشنودی، دشمنوں پر فتح، دنیا میں عزت عورتیں اور وہ تمام حلال مرغوبات جن کے لوگ طلب گار ہوتے ہیں ایسے ہی لوگوں میں اللہ نے نبی موعود کو پیدا کیا (اس پر یہودیوں کو جلن ہوئی)۔

فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا سو ہم نے ابراہیمؑ کی نسل کو کتاب بھی دی اور علم بھی اور بڑی سلطنت بھی دی۔ آل ابراہیمؑ سے مراد ہیں محمد ﷺ کے اسلاف اور آپ کے جد اعلیٰ کی اولاد یعنی حضرت اسماعیلؑ، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور تمام انبیاء بنی اسرائیل۔ الکتاب میں لام جنسی ہے اس سے مراد ہے توریت، انجیل، زبور۔ الحکمۃ سے مراد ہے علم وہبی (لدنی) یا وہ علوم جو کتاب کے علاوہ ان کو دیئے گئے تھے۔ بڑی سلطنت دینے سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ نے حضرت یوسف کو۔ طالوت کو، حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کو سلطنتیں عطا فرمائی تھیں تو اگر محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو اللہ ان کے اسلاف جیسی یا اس سے بڑھ کر سلطنت عطا فرما دے تو کیا بعید ہے۔

حضرت سلیمانؑ کی ایک ہزار عورتیں تھیں تین سو مہر والی بیویاں اور سات سو باندیاں اور حضرت داؤد کی سو عورتیں تھیں ان کے

مقابلہ میں رسول اللہ ﷺ کی تو صرف نو عورتیں ہی تھیں۔
بغوی نے لکھا ہے کہ اس آیت کے بعد یہودی خاموش ہو گئے یعنی پھر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی بیویوں کی کثرت اور دوسری نعمتوں کا تذکرہ چھوڑ دیا (اور طعنہ دینے کا ان کو موقع نہ ملا)۔
آیت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نسل ابراہیم کو ہم نے نبوت، حکمت اور سلطنت عطا کی ان کے دشمن طاقتور بھی تھے اور جلتے بھی تھے نمرود، فرعون، (ہامان وغیرہ) ان سے حسد کرتے تھے مگر حاسدوں کا حسد اولاد ابراہیم کا کچھ نہ بگاڑ سکا (پس اسی طرح تمہارا حسد محمد ؐ اور ان کے ساتھیوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا)۔
فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ پس کچھ یہودی تو رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئے جیسے عبداللہ ؓ بن سلام ؓ اور ان کے ساتھی یا یہ مراد ہے کہ نسل ابراہیم کو نبوت، حکمت اور سلطنت عطا کرنے کا جو ذکر کیا گیا کچھ یہودیوں نے تو اس کی تصدیق کی۔
وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ اور کچھ یہودیوں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا نہ مانا۔ سدی نے لکھا ہے کہ بہ اور عنہ کی ضمیریں ابراہیمؑ کی طرف راجع ہیں (یعنی کچھ لوگ ابراہیمؑ پر ایمان لائے اور کچھ نہ لائے) بات یہ ہوئی کہ ایک بار حضرت ابراہیمؑ نے کھیتی بوئی اور دوسرے لوگوں نے بھی بوئی اوروں کی کھیتیاں تو تباہ ہو گئیں حضرت ابراہیمؑ کی کھیتی خوب پیدا ہوئی لوگ محتاج ہو کر آپ کے پاس آئے آپ نے فرمایا جو میری نبوت کو مانے گا میں اس کو دوں گا یہ سن کر کچھ لوگ ایمان لے آئے ان کو آپ نے غلہ دیا کچھ ایمان نہ لائے آپ نے ان کو نہیں دیا۔ اس وقت آیت کی مراد یہ ہوگی کہ جس طرح بعض لوگوں کا ابراہیمؑ پر ایمان نہ لانا ابراہیم کے معاملہ کو کمزور نہ کر سکا اسی طرح ان بدبختوں کا کفر آپ کے کام کو کمزور نہ کر سکے گا۔
وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا اور جہنم کی بھڑکتی دہکتی آگ ہی (ان کے عذاب کے لئے) کافی ہے آخرت سے پہلے دنیا میں بالفعل عذاب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔
اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کیا بلاشبہ ہم ان کو آگ میں جھونک دیں گے۔ اس آیت کا مفہوم سابق آیت کے مفہوم کی توضیح اور تاکید کی طرح ہے۔
كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا ہر دفعہ جب ان کی کھال جل چکے گی تو ہم فوراً پہلی کھال کی جگہ دوسری کھال بنا دیں گے یعنی کھال تو وہی ہوگی دوبارہ اس کی نئی صورت بنا دی جائے گی جیسے عرب کہتے ہیں بَدَّلْتُ الْخَاتَمَ قُرْطًا میں نے انگوٹھی کو بالی کی شکل سے بدل دیا۔ یعنی انگوٹھی کی شکل نہ رہی بالی کی ہو گئی۔ یا یہ مراد ہے کہ جلنے کا اثر کھال سے دور کر دیا جائے گا تاکہ دوبارہ عذاب کا احساس (کھال میں) پیدا ہو جائے۔ حضرت ابن عباسؓ نے آیت کی تشریح میں فرمایا تھا کاغذ کی طرح ان کی کھالیں سفید کر دی جائے گی۔ رواہ البغوی اس قول کا مطلب بھی یہی ہے۔ ابن ابی حاتم نے آیت کی یہی تفسیر حضرت ابن عمرؓ کی طرف بھی منسوب کی ہے طبرانی، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کے سامنے یہ آیت تلاوت کی گئی حضرت معاذؓ نے فرمایا مجھے اس کی تفسیر معلوم ہے وہ یہ ہے کہ ایک ساعت میں سو بار کھال تبدیل کی جائے گی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہی سنا ہے۔ دوسری روایت میں معاذؓ کی جگہ اس تفسیر کی نسبت حضرت ابیؓ کی طرف کی گئی ہے۔
ابو نعیم نے حلیہ میں اور ابن مردویہ نے دوسری سند سے روایت کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ ایک ساعت میں ایک سو بیس بار کھالیں تبدیل کی جائیں گی بیہقی کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے کہ کھالیں جلا دی جائیں گی اور ان کی تجدید بھی کی جائے گی اور ایسا ایک ساعت میں چھ ہزار مرتبہ کیا جائے گا۔ آیت کی تفسیر کے ذیل میں بیہقی نے حسنؒ بصری کا قول نقل کیا ہے کہ ایک ساعت میں ستر ہزار بار ان کو آگ کھائے گی۔ ہر مرتبہ حکم ہوگا دوبارہ ویسے ہی ہو جاؤ حسب الحکم وہ جیسے تھے دوبارہ ویسے ہی ہو جائیں گے۔
ابن ابی الدنیا نے حضرت حذیفہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جہنم کے اندر آگ کے درندے، آگ کے کتے، آگ کے

آنکڑے اور آگ کی تلواریں ہوں گی۔ اللہ فرشتوں کو حکم دے گا وہ دوزخیوں کے پچھلے حصہ میں آنکڑے ڈال کر لٹکادیں گے اور ان تلواروں سے بند بند کاٹ کر ان درندوں اور کتوں کے سامنے ڈال دیں گے جونہی ایک عضو کو کاٹیں گے ایک نیا عضو اس کی جگہ دوبارہ پیدا ہو جائے گا۔

میں کہتا ہوں اس سے مراد یہ ہے کہ عضو سابق کے اجزاء سے ایک نیا عضو بن کر اور سابق کھال کے اجزاء سے ایک نئی کھال تیار ہو کر نمودار ہو جائے گی۔ بعض علماء نے کہا از سر نو نئی کھال دی جائے گی (یعنی سابق کھال کی صورت ہی نہیں بلکہ اجزاء ساخت ہی دوسرے دیئے جائیں گے) حقیقت میں احساس کرنا نفس کا کام ہے ظاہری اعضاء تو احساس کے آلات ہیں اس لئے (اجزاء جلد کی تبدیل ہو یا ہیئت جلد کی بہر حال) کوئی دشواری نہیں۔

عبدالعزیز بن یحییٰ کا قول ہے کہ اللہ دوزخیوں کو ایسی کھالوں کا لباس پہنائے گا جو خود الم سے متاثر نہ ہوں گی (بلکہ بدن کو دکھ پہنچائیں گی) اور اس طرح دکھ میں زیادتی ہوتی رہے گی ایک کھال جل جائے گی تو دوسری کھال اس کی جگہ دیدی جائے گی جیسے دوسری آیت میں آیا ہے سَرَابِيلُهُم مِّن قَطِرَانٍ پس کرتوں کو کوئی دکھ نہ ہوگا بلکہ وہ بدن کو دکھ پہنچائیں گے۔

لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ تاکہ کافر عذاب کا مزہ چکھتے رہیں۔

لِيَذُوقُوا کی ضمیر چونکہ کفار کی طرف راجع ہے اس لئے عبدالعزیز کے قول مذکور کی اس فقرہ سے تائید ہوتی ہے اور ان لوگوں کی تفسیری رائے بھی درست ثابت ہوتی ہے جن کا قول ہے کہ عذاب نفس کو ہوگا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کافر کے دونوں مونڈھوں کے درمیان کا فاصلہ تیز رفتار سوار کی تین روز کی مسافت سیر کے برابر ہوگا صحیحین حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کافر کی ڈاڑھ کوہ احد کے برابر ہوگی اور اس کی کھال کی موٹائی تین روز کی راہ کے برابر ہوگی۔ رواہ مسلم۔ ابن مبارک کی روایت کے یہ الفاظ ہیں قیامت کے دن کافر کی ڈاڑھ (کوہ) احد سے بڑی ہوگی تاکہ جہنم کافروں سے بھر جائے اور وہ عذاب کا مزہ چکھیں۔ ترمذی اور بیہقی کی روایت میں ہے کافر کی کھال کی چوڑائی (یعنی موٹائی) ستر ذراع (باہنہ) ہوگی اس کا بازو (کوہ) بیضاء کے برابر اور ران (کوہ) ورقان کی طرح ہوگی۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ دوزخ کے اندر دوزخیوں کی جسامت بڑی ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ بعض آدمیوں کے کان کی لو سے گردن کی جڑ تک کا فاصلہ سات سو برس کی راہ کے برابر ہوگا، کھال کی موٹائی ستر ذراع اور ڈاڑھ (کوہ) احد کے برابر ہوگی۔

ترمذی بیہقی اور ہناد نے حضرت ابن عمرؓ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ کافر اپنی زبان دو فرسخ تک کھینچتا جائے گا (یعنی دو فرسخ لمبی زبان ہوگی) ترمذی کی روایت میں ایک دو فرسخ کا لفظ آیا ہے۔ احمد اور حاکم نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ بعض دوزخیوں کے کان کی لو سے کندھے تک کا فاصلہ چالیس سال کی راہ کے برابر ہوگا جس کے اندر لہو اور خون کے وادی بہتے ہوں گے۔ راوی سے پوچھا گیا کیا لہو اور خون کے دریا بہتے ہوں گے جواب دیا نہیں۔ بلکہ وادی۔

إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا یقیناً اللہ تعالیٰ غالب ہے جو کچھ وہ چاہے اس کو کوئی روک نہیں سکتا۔

حَكِيمًا حکمت والا ہے اپنی حکمت کے موافق سزا دے گا۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا لَّهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ (اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے ان کو ہم ضرور جنتوں میں داخل کریں گے جن کے (درختوں کے) نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان جنتوں کے اندر وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے وہاں ان کے لئے پاک ستھری بیویاں ہوں گی۔

حاکم نے حضرت ابوسعید خدری کی روایت سے بیان کیا اور روایت کو صحیح قرار دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ حیض،

پاخانہ، ناک کی ریزش اور تھوک سے پاک ہوں گی۔ ہناد نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے وہ حیض، پاخانہ پیشاب، ناک کی ریزش، تھوک، بلغم، اولاد اور منی سے پاک ہوں گی۔ عطاء کی روایت بھی اسی طرح ہے۔

وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا ۝ اور ہم ان کو وسیع سایہ میں داخل کریں گے حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت میں ایک درخت ہے جس کے سایہ میں سوار سو برس چلے گا پھر بھی اس کو قطع نہ کر سکے گا اگر تم (اس کا ثبوت) چاہتے ہو تو پڑھو وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ۔ بخاری و مسلم۔

ابن ابی حاتم نے اس آیت کے ذیل میں ربیع بن انسؒ کا قول لکھا ہے کہ یہ عرش کا سایہ ہوگا جس کو کبھی زوال نہ ہوگا۔

ظَلِيل صیغہ صفت (بروزن فعیل) ظل سے مشتق ہے اور مفید تاکید ہے جیسے شَمْسٌ شَامِسٌ (بہت روشن سورج) لَيْلٌ لَيْلٌ (بہت تاریک رات) يَوْمٌ اَيْوَمُ (بہت لمبا دن) صفت کو ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ جنت کی نعمت لازوال ہوگی (ہمیشہ رہے گی)۔

ابن مردویہ نے کلبی کی سند سے بروایت ابو صالح ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ فتح کرنے کے بعد عثمانؓ بن طلحہ کو طلب فرمایا عثمانؓ حاضر ہو گئے تو حکم دیا مجھے کنجی دلا کر دیدو۔ عثمان کنجی لے کر حاضر ہوئے حضور ﷺ نے کنجی لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو حضرت عباسؓ نے فوراً کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ نثار ہوں، حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت کے ساتھ یہ (دربانی) بھی مجھے عنایت کر دیجئے عثمانؓ نے ہاتھ کھینچ لیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا عثمانؓ کنجی لاؤ۔ عثمان نے عرض کیا لیجئے مگر اللہ کی امانت میں۔ حضور ﷺ نے کھڑے ہو کر کعبہ کا دروازہ کھولا پھر (اندر داخل ہوئے کچھ دیر کے بعد) باہر نکل کر طواف کیا پھر عثمانؓ بن طلحہ کو طلب فرما کر کنجی ان کو دیدی اور آیت ذیل تلاوت فرمائی۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو ادا کردو۔ سنید نے اپنی تفسیر میں حجاج بن جریج کی وساطت سے مجاہدؒ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول عثمان بن طلحہؓ کے حق میں ہوا۔ فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ کعبہ کی کنجی عثمانؓ سے لے کر اندر داخل ہوئے پھر یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے باہر نکل آئے۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ پر میرے ماں باپ قربان اس سے پہلے میں نے حضور ﷺ کو یہ آیت پڑھتے نہیں سنا۔ ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس آیت کا نزول کعبہ کے اندر ہوا۔ سعید بن مسیب کی روایت بھی اسی کی مثل آئی ہے اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ (حضور ﷺ نے فرمایا) اے اولاد طلحہؓ اس کو ہمیشہ کے لئے لے لو سوائے کافر کے تم سے اور کوئی ظلم کر کے اس کو نہیں لے گا۔

ابن سعد نے ابراہیم بن محمد عبدری کے بزرگوں کی روایت سے لکھا ہے کہ عثمان بن طلحہؓ نے بیان کیا ہجرت سے پہلے مکہ میں میری ملاقات رسول اللہ ﷺ سے ہوئی آپ نے مجھے اسلام کی دعوت دی میں نے کہا محمد ﷺ مجھے تعجب ہے تم اپنی قوم کے دین کو چھوڑ کر نیا مذہب لائے اب تم کو یہ لالچ ہو گیا کہ میں بھی تمہارے نقش قدم پر چلوں۔ عثمانؓ نے کہا ہم پیر اور جمعرات کو دور جاہلیت میں کعبہ کھولا کرتے تھے ایک روز رسول اللہ ﷺ دوسرے لوگوں کے ساتھ کعبہ میں داخل ہونے کے ارادہ سے آئے میں نے ان سے سخت کلامی کی اور برا بھلا کہا آپؐ نے تحمل سے کام لیا پھر فرمایا عثمان امید ہے کہ ایک روز تم اس کنجی کو میرے ہاتھ میں دیکھو گے میں جہاں چاہوں گا اس کا استعمال کروں گا میں نے کہا تو اس وقت قریش تباہ اور ذلیل ہو جائیں گے فرمایا نہیں۔ وہ آباد اور باعزت ہوں گے۔ یہ فرما کر کعبہ میں داخل ہو گئے مگر آپ کی بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ جیسا آپ نے فرمایا ہے ضرور ایسا ہو جائے گا۔ اس لئے مسلمان ہونے کا ارادہ کیا۔ لیکن قوم والوں نے مجھے سخت سست خوب کہا اور روک دیا۔ فتح مکہ کا دن ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا عثمان رضی اللہ عنہ کنجی لا۔ میں کنجی لے کر حاضر ہوا۔ حضور ﷺ نے لے لی اور پھر مجھے واپس دے کر فرمایا یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لے لو تم سے اس کو سوائے ظالم کے اور کوئی نہیں چھین سکتا عثمانؓ اللہ نے تم لوگوں کو اپنے گھر کا امین بنایا ہے لہٰذا اس گھر کے ذریعہ سے تم کو جو کچھ ملے اس کو دستور کے مطابق کھاؤ

جب میں منہ پھیر کر جانے لگا تو حضور ﷺ نے آواز دی میں لوٹ کر گیا تو فرمایا کیا وہی نہیں ہیں جو تم سے میں نے پہلے کہا تھا اس فرمانے سے مجھے وہ بات یاد آگئی جو ہجرت سے پہلے آپؐ نے فرمائی تھی میں نے عرض کیا بے شک میں شہادت دیتا ہوں کہ یقیناً آپ اللہ کے رسول ہیں۔

فاکہانی نے حضرت جبیرؓ بن مطعم کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب عثمانؓ کو کنجی دیدی تو فرمایا اس کو چھپا کر رکھنا۔ زہری نے کہا اسی حکم کی وجہ سے عثمان کنجی کو چھپا کر رکھتے تھے۔ میں کہتا ہوں کنجی کو چھپا کر رکھنے کا حکم شاید اس وجہ سے بھی دیا گیا تھا کہ لوگ کنجی اپنے پاس رکھنے کے خواستگار تھے جیسا کہ ابن مردویہ کی روایت سے ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ حضرت عباسؓ کی اپنے پاس کنجی رکھنے کی خواہش تھی۔ ابن عابد اور ازرقی نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تھا کعبہ کی دربانی اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت دونوں کو ہمارے لئے یکجا کر دیجئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ حضور ﷺ نے عثمان کو بلوا کر فرمایا اے بنی طلحہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کو لے لو جو کوئی تم سے اس کو چھینے گا وہ ظالم ہی ہوگا۔

عبدالرزاق اور طبرانی نے زہری کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کعبہ سے برآمد ہوئے تو حضرت علیؓ نے فرمایا ہم کو ہی نبوت حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت اور کعبہ کی دربانی دی گئی ہم سے بڑے نصیب والی کوئی قوم نہیں رسول اللہ ﷺ کو حضرت علیؓ کا یہ قول ناگوار گزرا اور عثمانؓ بن طلحہ کو بلوا کر کنجی دے کر فرمایا اس کو چھپائے رکھو۔

بغوی نے ذکر کیا ہے کہ فتح مکہ کے دن جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو عثمانؓ کعبہ کا دروازہ بند کر کے چھت پر چڑھ گئے حضور ﷺ نے کنجی طلب فرمائی۔ عرض کیا گیا کنجی عثمان کے پاس ہے اور اس نے دینے سے انکار کر دیا اور کہا اگر مجھے یقین ہوتا کہ وہ اللہ کے رسول ہیں تو میں کنجی دینے سے انکار نہ کرتا۔ حضرت علیؓ نے یہ سن کر عثمانؓ کی گردن مروڑ دی اور کنجی لے لی اور دروازہ کھول دیا۔ رسول اللہ ﷺ کعبہ میں داخل ہو گئے اور اندر دو رکعت نماز پڑھی جب باہر نکلے تو حضرت عباسؓ نے کنجی مانگی اور درخواست کی کہ حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت کے ساتھ دربانی بھی مجھے عطا کر دی جائے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ کنجی عثمانؓ کو واپس کر دو اور اس سے معذرت بھی کرو۔ حضرت علیؓ نے حکم کی تعمیل کی عثمانؓ نے کہا تم نے مجھ پر جبر کیا، دکھ دیا اور اب پچکارنے آئے ہو۔ حضرت علیؓ نے فرمایا تمہارے معاملہ میں اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے پھر آپ ﷺ نے آیت پڑھی عثمانؓ نے کہا میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں کعبہ کی کنجی عثمان کے پاس رہی مرتے وقت انہوں نے اپنے بھائی شیبہؓ کو دیدی قیامت تک کعبہ کی کنجی اور دربانی انہی کی اولاد کے پاس رہے گی۔

فائدہ :۔ آیت مذکورہ کا نزول اگرچہ بنی طلحہ کو کنجی دیدینے کے سلسلہ میں ہوا تھا مگر الفاظ کا حکم عام ہے، ہر امانت والے کو اس کی امانت واپس کر دینا واجب ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ایسا بہت ہی کم ہوا کہ حضور ﷺ نے خطبہ دیا ہو اور یہ نہ فرمایا ہو کہ جس میں امانت داری نہیں اس میں ایمان نہیں اور جس میں عہد کی پاسداری نہیں اس میں دین نہیں۔ شعب الایمان بیہقی۔ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمر کی مرفوع روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نفاق کی علامات میں اس بات کا بھی ذکر کیا کہ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے، صحیحین۔ [1]

فائدہ :۔ ادائے امانت کا حکم صرف مال ودیعت سے ہی تعلق نہیں رکھتا بلکہ جو حق بھی کسی کا کسی پر ہو وہ امانت ہے جس

---

[1] حضرت زیدؓ بن ثابت نے فرمایا میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ سب سے پہلے لوگوں سے امانت اٹھالی جائے گی اور سب سے آخر نماز باقی رہے گی اور بہت نمازی ایسے ہوں گے کہ ان کے اندر کوئی خیر نہ ہوگی (یعنی نماز دکھاوٹ کی ہوگی اسلامی محاسن مفقود ہوں گے)۔

ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ (مندرجہ ذیل امور کی) اجازت نہیں دی گئی نہ مالدار کو نہ نادار کو بیہقی نے میمون ابن مہران کا قول نقل کیا ہے کہ تین چیزیں ہیں جو نیک بد (ہر ایک) کو لوٹا دی جائیں، (۱) رشتہ داری کو جوڑ رکھا جائے خواہ رشتہ داری نیک (باقی اگلے صفحہ پر)

کا ادا کرنا واجب ہے جیسا کہ آیت کے شان نزول سے ظاہر ہو رہا ہے۔
صوفیہ صافیہ کا بیان ہے کہ ممکنات کا وجود اور لوازم وجود اور تمام کمالات ممکن کے ذاتی (از خود) نہیں بلکہ مرتبہ وجوب سے مستفاد اور باری تعالیٰ کی طرف سے ایک مستعار ودیعت ہے ورنہ بذات خود ہر ممکن ان کمالات سے خالی ہے اور اس آیت کا اقتضاء ہے کہ امانت کو امانت والے کے سپرد کر دینا اور اپنی ذات کو اس کا مالک نہ قرار دینا واجب ہے اگر بادشاہ کسی بھنگی کو خلعت فاخرہ اور لباس امیرانہ پہنا دے تو بھنگی کی یہی دانشمندی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ویسا ہی تصور کرے جیسے پہلے تھا اور خلعت کو بادشاہ کی عاریت سمجھے صوفی پر بھی جب اس تصوری حالت کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ اپنے کو اپنی ذات کے اعتبار سے معدوم اور فاقد الوجود سمجھتا ہے اور تمام کمالات سے خالی جانتا ہے بلکہ اپنے کو تمام مفاسد اور شرور کا مبدا خیال کرتا ہے یہی مرتبہ فنا ہے اس سے آگے ایسی کھوئی کھوئی حالت بھی ہو جاتی ہے کہ اپنی ذاتی فناء اور کمالات سے خالی ہونے کا بھی اس کو خیال نہیں رہتا، یہ مرتبہ فنا الفناء کا ہوتا ہے لیکن فناء ذاتی کے تصور کے ساتھ کبھی یہ خیال بھی شہودی مرتبہ تک پہنچ جاتا ہے کہ میرا وجود ہے میں موجود ہوں مگر میری یہ ہستی اور ہستی کے صفات میرے نہیں اللہ تعالیٰ نے بطور رعایت مجھے عطا فرمائے ہیں۔ ذات خداوندی اور صفات الٰہیہ کی وجہ سے میری ہستی اور ہستی کی صفات کی بقاء ہے (گویا واجب اصل ہے اور ممکن اس کا عکس) یہ مرتبہ بقاء (باللہ) کا ہے یہی مطلب ہے اس فرمان خداوندی کا جس کو حدیث قدسی میں بیان کیا گیا ہے کہ میں مومن کے کان ہو جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے۔
اسی مرتبہ فنا و بقاء کا نام صوفی کی نظر میں ادائے امانت ہے اس مرتبہ پر پہنچنے کے بعد کوئی صوفی تصور بھی نہیں کر سکتا ہے کہ خود وہ اپنے نفس کا تزکیہ کرتا ہے کیونکہ اس کو اپنا نفس معدوم الوجود اور تمام کمالات سے خالی نظر آتا ہے ہاں اللہ نے جو فضائل و کمالات عطا فرمائے ہیں ان کو تذکرۂ انعام کے طور پر بیان کرنا اس کے لئے جائز ہوتا ہے کیونکہ کوئی فضیلت اس کی ذاتی نہیں ہوتی ہر کمال اور فضیلت کا رجوع اللہ کی طرف ہوتا ہے پس کسی فضیلت کے ذکر سے مراد ہوتا ہے اللہ کی عنایت کا اظہار اور کمال خداوندی کا بیان۔ فالحمد للہ۔
گویا اس آیت کا ربط گزشتہ آیت اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ سے ہے اور دونوں کے درمیان جتنا کلام ہے وہ معترضہ ہے (یعنی ما قبل اور ما بعد کسی سے مربوط نہیں) دونوں آیات کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنے نفسوں کو پاک نہ قرار دو تمہارا کوئی کمال تمہارا نہیں ہے اللہ جس پر چاہتا ہے اپنے نور کا ایک چمکار اور اپنے سمندر کا ایک چھینٹا ڈال دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ پاک ہو جاتا ہے۔ اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ جو کمالات و فضائل اللہ نے تم کو بطور امانت عطا فرمائے

(بقیہ پچھلے صفحہ پر) ہو یا بد، (۲) امانت ادا کی جائے خواہ نیک کی ہو یا بد کی، (۳) وعدہ پورا کیا جائے خواہ نیک سے کیا ہو یا بد سے، عبد الرزاق، ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور بیہقی نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ کی راہ میں شہادت سوائے امانت کے باقی تمام گناہوں کو ساقط کر دیتی ہے، قیامت کے دن بعض لوگوں کو (پیشی میں) لایا جائے گا خواہ وہ راہ خدا میں شہید ہوئے ہوں پھر بھی ان کو حکم دیا جائے گا اپنی امانت واپس کر، وہ شخص عرض کرے گا دنیا جاتی رہی اب کہاں سے ادا کروں حکم ہوگا اس کو ہاویہ میں لے جاؤ حکم کی تعمیل کی جائے گی قعر جہنم کے اندر امانت اپنی اپنی اصلی شکل میں (اس کے سامنے) آئے گی وہ امانت کو اپنے اوپر اٹھا کر اوپر کو چڑھنے لگے گا چڑھتے چڑھتے جب اس کو یقین ہو جائے گا کہ اب میں امانت کا بوجھ اٹھائے باہر نکل جاؤں گا دفعتہً امانت پھسل کر نیچے گر پڑے گی اور اس کے ساتھ وہ شخص بھی ہمیشہ کے لئے اندر کو گر پڑے گا۔ راذان راوی کا بیان ہے حضرت ابن مسعودؓ سے یہ بیان سن کر میں حضرت براءؓ بن عازب کے پاس گیا اور ان سے عرض کیا، کیا آپ نے نہیں سنا کہ آپ کے بھائی ابن مسعودؓ نے کیا فرمایا، حضرت براءؓ نے فرمایا ابن مسعودؓ نے سچ کہا کیونکہ اللہ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا، اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں واپس کرو، امانت نماز میں بھی ہوتی ہے اور غسل جنابت میں بھی اور بات میں بھی اور ناپ تول میں بھی اور دین میں بھی اور ان سب سے زیادہ سخت وہ امانت ہے جس کا تعلق ودیعت (کے مال) سے ہو۔ (منہ)

ہیں ان کا رجوع اللہ ہی کی طرف کرو طہارت نفس کو اپنی کارگزاری نہ سمجھو بلکہ اللہ کا شکر اور حمد کرو کہ اس نے تم کو پاک کیا۔
بعض مشائخ کی زبان سے بعض اوقات اپنے فضائل کا اظہار بظاہر فخر کے لہجہ میں ہوا ہے جس سے جاہلوں کو اعتراض کا موقع ملا ہے مگر ان نادانوں کو معلوم نہیں کہ مشائخ جب اپنے تمام کمالات و فضائل کو بطور اداء امانت اللہ کی طرف لوٹا دیتے ہیں تو پھر ان کا ذکر کرنا انعام الٰہی کا اظہار ہوتا ہے فخر نہیں ہوتا بلکہ حکمت و مصلحت کے زیر اثر وہ اپنے مقامات و احوال کا اظہار کرتے ہیں۔ واللہ اعلم

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اور اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ جب لوگوں کے باہمی معاملات کا فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو۔

انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا بھی ادائے امانت کی ایک شاخ ہے اور انصاف نہ کرنا خیانت ہے۔ اسی طرح اللہ، رسول اور اولی الامر کی اطاعت جس کا حکم آئندہ آیت میں دیا گیا ہے اداء امانت ہے۔

حضرت ابوذرؓ کا بیان ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے عامل (حاکم) بنا دیجئے (یعنی کوئی انتظامی کام مجھ سے لیجئے) فرمایا تم کمزور ہو اور یہ (حکومت) ایک امانت ہے قیامت کے دن یہ رسوائی اور پشیمانی کا ذریعہ ہو گی۔ ہاں جس شخص نے اس کو اس کے حق کے ساتھ لیا اور پھر اس کے حق کو ادا کیا (وہ رسوا نہ ہو گا)

دوسری روایت میں اس طرح آیا ہے حضور (ﷺ) نے فرمایا ابوذرؓ میں تم کو کمزور پاتا ہوں، میں تمہارے لئے وہی بات پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں۔ دو آدمیوں پر بھی حکومت نہ کرنا اور یتیم کے مال کا متولی نہ بننا۔ رواہ مسلم۔

اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ یعنی ادائے امانت اور انصاف حکم بہت اچھی چیز ہے جس کی اللہ تم کو نصیحت کر رہا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا ۢ بے شک اللہ (تمہارے اقوال و احکام کو) سننے والا اور

بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾ (امانتوں کے سلسلہ میں تم جو کچھ کرتے ہو اس کو) دیکھنے والا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی مرفوع روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انصاف کرنے والے (قیامت کے دن) رحمٰن کے دائیں ہاتھ کی طرف نور کے ممبروں پر ہوں گے اور رحمٰن کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں۔ یہ وہی لوگ ہوں گے جو فیصلوں میں اور فیصلہ کے فریقوں میں اور اپنے زیر حکومت امور میں انصاف کرتے ہیں۔ رواہ مسلم۔ حضرت ابو سعیدؓ خدری راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ کا سب سے زیادہ محبوب و مقرب منصف حاکم ہو گا۔ اور قیامت کے دن اللہ کا سب سے زیادہ مبغوض اور سخت ترین عذاب کا مستحق ظالم حاکم ہو گا۔ دوسری روایت میں سخت ترین عذاب والا کی جگہ قرب الٰہی سے بعید ترین کا لفظ آیا ہے، ترمذی نے اس حدیث کو حسن غریب کہا ہے۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ کے سایہ (رحمت) کی طرف سبقت کرنے والے کون لوگ ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی جانے۔ فرمایا وہ لوگ (رحمت کے سایہ کی طرف سب سے آگے ہوں گے) جن کو اگر ان کا حق دیا جائے تو قبول کر لیتے ہیں اور اگر ان سے حق مانگا جائے تو دیدیتے ہیں اور لوگوں کا فیصلہ اس طرح کرتے ہیں جیسا اپنی ذات کے لئے کرتے ہیں۔ رواہ احمد بیہقی نے شعب الایمان میں بھی حضرت عمر بن خطابؓ کی روایت سے اسی طرح مرفوع حدیث نقل کی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ اے اہل ایمان اللہ کا حکم مانو اور رسول ﷺ کا حکم مانو اور تم میں سے جو حاکم ہوں (ان کا حکم مانو)۔

بخاری۔ مسلم اور اصحاب سنن (ابن ماجہ، نسائی۔ ابو داؤد وغیرہ) نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت عبداللہ بن حذافہ کے حق میں ہوا تھا جن کو ایک دستہ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے بھیجا تھا۔

ابن جریرؒ اور ابن ابی حاتم نے سدی کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو ایک فوجی دستہ کے ساتھ بھیجا اس دستہ میں حضرت عمار بن یاسر بھی تھے فوجی دستہ ان لوگوں کی طرف روانہ ہو گیا جن پر چڑھائی کرنی مقصود تھی۔ صبح کو جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو سارے آدمی بھاگ چکے تھے۔ صرف ایک شخص باقی تھا۔ اس نے حضرت عمارؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر اظہار اسلام کر دیا اور کلمہ شہادت پڑھ دیا حضرت عمارؓ نے فرمایا تم ٹھہرو تم کو مسلمان ہونے سے فائدہ ہو گا۔ صبح کو جب حضرت خالدؓ نے (اس بستی پر) حملہ کیا تو حضرت عمار نے فرمایا۔ اس شخص کو رہنے دو یہ مسلمان ہو چکا ہے اور میری پناہ میں آ گیا ہے دونوں میں سخت کلامی ہوئی اور (واپسی کے بعد) دونوں نے معاملہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضور ﷺ نے حضرت عمارؓ کی پناہ دہی کو قائم رکھا مگر آئندہ سردار کے خلاف ایسا کرنے کی ممانعت فرما دی۔ حضور ﷺ کے سامنے بھی دونوں میں درشت کلامی ہوئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا خالدؓ، عمارؓ کو گالی نہ دو جو عمارؓ کو گالی دے گا اللہ تعالیٰ اس کو برا کہے گا اور جو عمارؓ سے بغض رکھے گا اللہ تعالیٰ اس سے نفرت کرے گا اور جو عمارؓ پر لعنت کرے گا اللہ اس پر لعنت کرے گا۔ یہ فرمان سن کر حضرت خالد فوراً حضرت عمارؓ سے معذرت خواہ ہوئے اور حضرت عمارؓ ان سے راضی ہو گئے۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

ابو شیبہؒ وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہؓ کا قول بیان کیا ہے کہ اولی الامر سے مراد ہیں حکام۔ دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں فوجی دستوں کے سردار (مراد) ہیں۔ اولی الامر کا لفظ عام ہے اس میں بادشاہ بھی داخل ہیں اور شہروں کے حکام بھی اور جج مجسٹریٹ بھی اور فوجی دستوں اور لشکروں کے کمانڈر بھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے امام (حاکم) پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ کرے اور امانت کو ادا کرے جب وہ ایسا کرے تو رعیت پر لازم ہے کہ اس کی بات سنیں اور حکم مانیں۔ حضرت حذیفہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان لوگوں کا اتباع کرنا جو میرے بعد ہوں گے یعنی ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما۔ رواہ الترمذی۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی جو حاکم کی اطاعت کرتا ہے وہ میری اطاعت کرتا ہے جو حاکم کی نافرمانی کرتا ہے وہ میری نافرمانی کرتا ہے۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم۔

حضرت عبادہؓ بن صامت کا بیان ہے ہم نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی تھی اس امر پر کہ حضور ﷺ کا حکم سنیں گے اور مانیں گے۔ دشواری میں بھی اور آسانی میں بھی خوشی میں بھی اور ناخوشی میں بھی اور حکام سے ان کے حکم میں کوئی کشاکشی نہیں کریں گے اور جہاں ہوں گے حق کو قائم کریں گے اور حق بات کہیں گے اور اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ صحیح بخاری و مسلم حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا (حاکم کا حکم) سننا اور ماننا خواہ کسی ایسے (حقیر) حبشی غلام کا حکم ہو جس کا سر کشمش کی طرح ہو۔ رواہ البخاری۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے، میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ نے حج وداع کے خطبہ میں فرمایا تھا، اللہ سے ڈرو، پانچوں نمازیں پڑھو، اپنے مہینے کے روزے رکھو، اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرو اور جب بھی کوئی تم کو حکم دے اس کو مانو تو اپنے رب کی طرف سے عطا کی ہوئی جنت میں داخل ہو گے۔ رواہ الترمذی

شوہر بیوی کو حکم دیتا ہے آقا غلام کو حکم دیتا ہے باپ اولاد کو حکم دیتا ہے یہ سب اولی الامر کی فہرست میں داخل ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خوب سن لو تم میں سے ہر ایک (ذمہ دار) نگراں ہے اور جس کی نگرانی اس کے سپرد ہے اس کے متعلق وہ جواب دہ بھی ہو گا۔ حاکم رعایا کا نگراں ہے رعایا کے متعلق باز پرس اس سے ہو گی۔ مرد اپنے گھر والوں کا نگراں ہے گھر والوں کے متعلق سوال اس سے ہو گا۔ غلام اپنے آقا کے مال (مویشی وغیرہ) کا نگراں ہے اس کی باز پرس اس سے ہو گی (بہر حال) تم میں سے ہر ایک (کسی نہ کسی کا ذمہ دار) نگراں ہے اور اس سے اسی کی باز پرس ہو گی۔ صحیح

بخاری و مسلم۔ ۱؎

اولی الامر کا لفظ فقہاء، علماء اور مشائخ کو بدرجہ اولیٰ شامل ہے کیونکہ یہی گروہ انبیاء کا وارث اور خدا اور رسول کے احکام کا امین ہے۔ ابن جریر اور حاکم وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اولی الامر ہیں فقہ اور دین والے۔ دوسری روایت میں ہے اولی الامر میں اہل علم۔ ابن ابی شیبہ اور حاکم وغیرہ نے بھی اسی طرح حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے۔ ابو العالیہ اور مجاہد کی روایت بھی اسی طرح ہے اور اللہ نے خود ہی فرمایا ہے وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا (تمام) لوگ تمہارے پیرو ہیں اور بہت سے لوگ دنیا کے کناروں سے تمہارے پاس دین کے مسائل سمجھنے کے لئے آئیں گے۔ رواہ الترمذی عن ابی سعید الخدری۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ :۔ حاکم کی اطاعت صرف اس وقت واجب ہے جب اس کا حکم شرع کے خلاف نہ ہو آیت کی رفتار سے یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ پہلے اللہ نے انصاف کرنے کا حکم دیا اس کے بعد حاکموں کی اطاعت کا امر کیا اس سے معلوم ہوا کہ جب تک حکام عدل پر قائم ہوں ان کی اطاعت واجب ہے اس سے آگے خود صراحت فرما دی فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ الخ اگر کسی مسئلہ میں تمہارے آپس میں اختلاف ہو جائے تو (صحیح فیصلہ کے لئے) اللہ اور رسول ﷺ کے (احکام کی طرف رجوع کرو۔

بعض علماء کا بیان ہے کہ اولی الامر کا لفظ بتا رہا ہے کہ جن امور کا حکام کو اختیار دیا گیا ہے اور جن چیزوں کا ان کو حاکم بنایا گیا ہے یعنی حکم میں اگر وہ عدل کریں تو ان امور میں اطاعت واجب ہے اور جن امور کو واجب کرنے کا اللہ نے ان کو اختیار نہیں دیا ہے ان امور میں اطاعت واجب نہیں (بلکہ بعض صورتوں میں اطاعت حرام ہے) اس لئے اگر کوئی حاکم کسی کو حکم دے کہ اپنے مال میں سے ہزار روپیہ فلاں شخص کو دیدو تو حکم کی تعمیل ضروری نہیں۔

مسئلہ :۔ اگر قاضی کسی سے کہے میں نے فلاں شخص کو سنگسار کرنے یا مارنے یا اس کا ہاتھ کاٹ دینے کا حکم دے دیا ہے تم یہ خدمت انجام دو تو جس شخص کو حکم دیا جا رہا ہے وہ (بلا تحقیق) حکم کی تعمیل کر سکتا ہے لیکن ایک روایت میں آیا ہے کہ امام محمد نے اس فتویٰ سے رجوع کر لیا تھا اور فرمایا تھا جب تک قاضی کے فیصلہ کی اطمینان بخش دلیل نہ معلوم ہو جائے صرف حکم کی تعمیل جائز نہیں۔ مشائخ نے اسی قول کو پسند کیا ہے کیونکہ اس زمانہ میں قاضیوں کے حالات بگڑ چکے ہیں۔

امام ابو منصور (ماتریدی) نے فرمایا اگر قاضی متقی اور عالم ہو اس کا حکم واجب القبول ہے کیونکہ غلطی اور بددیانتی کا احتمال نہیں ہے اور اگر جاہل متقی ہو تو فیصلہ کی (مدلل) تشریح اس سے پوچھی جائے گی اگر وہ صحیح تشریح کر دے گا تو حکم قبول کیا جائے گا ورنہ تعمیل نہیں کی جائے گی اگر فاسق ہو (خواہ عالم ہی ہو) تو چونکہ بددیانتی اور غلطی کا احتمال ہے اس لئے بغیر تحقیقی دلیل سمجھے اس کا حکم قبول نہیں کیا جائے گا۔ ہدایہ۔

۱؎ عکرمہ نے اولی الامر کی تفسیر میں کہا ابو بکر و عمر (اولی الامر) تھے کلبی نے کہا ابو بکر و عمر و عثمان و علی اور ابن مسعود (رضی اللہ عنہم) مراد ہیں، عکرمہ سے دریافت کیا گیا کہ جن باندیوں کے اولاد ہو جائے ان کا کیا حکم ہے، عکرمہ نے کہا وہ آزاد ہو جاتی ہے سائل نے سوال کیا آپ کے قول کی دلیل کیا ہے، عکرمہ نے کہا قرآن لوگوں نے پوچھا قرآن کی کونسی آیت ہے فرمایا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم، حضرت عمرؓ نے جو اولی الامر میں (سے تھے فرمایا ہے کہ باندی خواہ ناتمام بچہ ہی جنے مگر (جننے کے بعد) آزاد ہو جاتی ہے۔ حضرت عمرانؓ بن حصین کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب کسی کو کہیں کا حاکم بنا کر بھیجتے تو فرمان میں یہ لکھ دیتے تھے کہ اس کا حکم سنو اور جب تک یہ انصاف کرے اس کا حکم مانو۔

حضرت عمرؓ نے یہ بھی فرمایا تھا سننا اور (حاکم کا) حکم ماننا خواہ کسی حبشی نکٹے غلام کو تمہارا حاکم بنا دیا جائے اگر وہ تم کو مارے تو صبر کرنا، اگر وہ تم کو مارے تو صبر کرنا اور اگر وہ کوئی ایسا حکم دے جس سے تمہارے دین کی شکست ہوتی ہو تو کہہ دینا اپنا خون دیدیں گے، دین نہیں دینگے

بخاری وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول عبداللہ بن حذافہ بن قیس کے متعلق ہوا تھا۔ عبداللہ کو رسول اللہ ﷺ نے ایک دستہ کا امیر بنا کر بھیجا تھا۔

داؤدی نے (اس کی تشریح میں اس طرح) بیان کیا کہ عبداللہ بن خدافہ ایک لشکر کے قائد بنا کر بھیجے گئے۔ کسی جگہ پہنچ کر اپنے لشکر پر عبداللہ کو غصہ آگیا اور آگ بھڑکا کر آپ نے حکم دیا اس میں (سب) گھس جاؤ اس حکم کی تعمیل سے بعض لوگوں نے انکار کر دیا اور بعض نے تعمیل کا ارادہ کر لیا۔ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ اس قصہ میں اس آیت کے نزول کا مقصد ہے یہ حکم جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِىۡ شَىۡءٍ کہ اگر کسی بات میں تمہارا اختلاف ہو جائے (تو اللہ اور رسول کے حکم کی طرف رجوع کرو) یہ قول مجاہد کا ہے کہ اگر علماء کا کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے تو اللہ اور رسول کے حکم کی طرف رجوع کرو۔

شئی (بات یا مسئلہ) سے مراد ہے امیر کا حکم یعنی امیر کے حکم کے متعلق اختلاف ہو جائے کوئی اس مسئلہ میں اطاعت امیر کو ناجائز کہتا ہو اور کوئی واجب قرار دیتا ہو۔

فَرُدُّوۡهُ اِلَى اللّٰهِ تو اس مسئلہ کو اللہ کی طرف یعنی اللہ کی کتاب کی طرف موڑ دو۔

وَالرَّسُوۡلِ اور رسول اللہ ﷺ کی طرف پھیر دو جب تک رسول ﷺ زندہ ہیں اور وفات کے بعد ان کی سنت کی جانب رجوع کرو۔

رہے وہ مسائل جن کی صراحت نہ قرآن میں ہے نہ فرمان رسول (ﷺ) میں تو ان میں اجماع اور قیاس کی طرف رجوع کرنا چاہئے کیونکہ اجماع اور قیاس (خود مستقل حیثیت نہیں رکھتے بلکہ) کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی طرف لوٹتے ہیں۔ رجوع کے بعد اگر شرعاً اس کی اطاعت واجب ہوتی ہو تو اطاعت کرو ورنہ مت کرو۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (امیر کا حکم) سننا اور اس کو ماننا مسلمان شخص پر واجب ہے خواہ پسند ہو یا ناپسند بشرطیکہ اللہ کی نافرمانی کا حکم نہ دیا گیا ہو اگر معصیت کا حکم دیا گیا ہو تو نہ سننا جائز ہے نہ ماننا (صحیحین) حضرت علی کرم اللہ وجہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا گناہ کے کام میں کسی کی اطاعت درست نہیں، اطاعت صرف نیکی میں ہونی چاہئے۔ صحیحین۔

حضرت عمرانؓ بن حصین اور حضرت حکیم بن عمرو غفاری کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خالق کی نافرمانی ہو تو مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔ رواہ احمد والحاکم۔ حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

مسلمہ بن عبدالملک بن مروان نے ابوحازم سے کہا۔ کیا تم کو آیت وَ اُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ میں ہماری اطاعت کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ ابوحازم نے فرمایا آیت فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِىۡ شَىۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ میں تمہاری اطاعت کے حکم کی نفی نہیں کر دی گئی جب کہ تم حق کی مخالفت کرو (یعنی تم حق کے خلاف کرتے ہو تو اس آیت میں تمہاری اطاعت نہ کرنے کا حکم ہے) (مدارک)۔

مسئلہ :۔ اگر کسی حاکم کا حکم قاضی کے پاس اجراء کی غرض سے آئے تو اس کو جاری کر دینا چاہئے بشرطیکہ قرآن کے مخالف نہ ہو مثلاً مدعی کی قسم اور ثبوت کی ایک شہادت پر اگر حاکم نے کسی کو ڈگری دیدی ہو تو ایسے حکم کو جاری نہ کرنا چاہئے کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے فَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ

اگر حدیث مشہور کے خلاف ہو تب بھی جاری نہ کرنا چاہئے جیسے اگر کسی نے بیوی کو تین طلاقیں دیدی ہوں اور (حلالہ کے طور پر) کسی دوسرے مرد نے نکاح کر لیا اور بغیر قربت صنفی کے اس نے طلاق دیدی ہو اور حاکم حکم دے کہ اب اس عورت سے پہلے شوہر کے لئے نکاح حلال ہو گیا تو ایسا حکم جاری نہ کرنا چاہئے کیونکہ حضرت رفاعہؓ کی بیوی کے متعلق حضرت عائشہؓ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تیرا نکاح اس سے درست نہیں ہو سکتا۔ جب تک دوسرا شوہر تیری چاشنی نہ چکھ

لے اور تو اس کی چاشنی نہ چکھ لے۔ ہم نے یہ حدیث سورۂ بقرہ میں ذکر کر دی ہے۔
اگر حاکم کا حکم اجماع کے خلاف ہو تب بھی قاضی اس کا اجراء نہ کرے جیسے حاکم نے اگر حکم دیا ہو کہ جس جانور کو ذبح کرتے وقت قصداً اگر بسم اللہ پڑھنی ترک کر دی تو ایسا ذبیحہ حلال ہے یہ حکم صحابہؓ کے اجماع کے خلاف ہے اس لئے نا قابل اجراء ہے۔ ہدایہ

مسئلہ :۔ اگر مجتہد کا فتویٰ قرآن اور حدیث کے خلاف ہو اور یہ معلوم بھی ہو جائے تو قرآن و حدیث پر چلنا (اور اجتہادی فتوی کو ترک کرنا) ہم پر لازم ہے۔ بیہقی نے مدخل میں صحیح اسناد کے ساتھ لکھا ہے کہ عبداللہ بن مبارک نے بیان کیا۔ میں نے خود سنا امام ابو حنیفہ فرما رہے تھے اگر رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث آجائے (یعنی مل جائے) تو بسر و چشم (میں اس کو قبول کروں گا) روضۃ العلماء میں ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا، میرے قول کو رسول اللہ ﷺ کے فرمان اور صحابہؓ کے قول کے مقابلہ میں ترک کر دو۔ امام صاحبؒ کا یہ قول بھی روایت میں آیا ہے کہ اگر حدیث صحیح ہو تو وہی میرا مذہب ہے۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ میں خطاب حکام کو بھی ہو سکتا ہے پہلے بصیغہ غائب ذکر تھا اس جگہ بصورت خطاب ہو گا۔

اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اگر اللہ اور روز آخرت پر تم ایمان رکھتے ہو۔ کلام سابق جزاء پر دلالت کر رہا ہے اس لئے جزاء (کو ذکر کرنے یا محذوف قرار دینے) کی ضرورت نہیں۔

ذٰلِكَ یہ یعنی اللہ اور رسول کی طرف رجوع۔

خَيْرٌ تمہارے لئے بہتر ہے۔ یعنی اپنے ذہنی خیال پر جمے رہنے سے بہتر ہے۔

وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾ اور تاویل کے اعتبار سے بہتر ہے۔

ع ۸
۵

ابن جریر نے بحوالہ شعبی لکھا ہے کہ ایک یہودی اور ایک منافق میں کچھ جھگڑا تھا۔ یہودی معاملہ کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے جانا چاہتا تھا کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ حضور ﷺ فیصلہ رشوت کھا کر نہیں کر سکتے اور منافق یہودیوں سے فیصلہ کرانا چاہتا تھا کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ وہ رشوت لے لیں گے اور رشوت لے کر فیصلہ میں جنبہ داری کر سکیں گے۔ بالآخر دونوں باتفاق رائے قبیلہ جہینہ کے ایک کاہن کے پاس گئے اور دونوں نے اپنا مقدمہ فیصلہ کے لئے اس کے سامنے رکھا۔

ثعلبی نے ابن عباسؓ سے اور ابن ابی حاتم نے ابوالاسود سے مرسلاً نیز بغوی نے کلبی کا قول بواسطۂ ابو صالح از حضرت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ ایک یہودی سے ایک منافق کا جس کا نام بقول کلبی بشر تھا۔ کچھ جھگڑا تھا یہودی نے فیصلہ کرانے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کی منافق کو دعوت دی اور منافق نے کعب بن اشرف یہودی سے فیصلہ کرانے کے لئے یہودی سے خواہش کی یہودی نے کعب بن اشرف کے پاس جانے سے انکار کر دیا اور رسول اللہ ﷺ سے فیصلہ کرانے پر اصرار کیا مجبوراً منافق کو بھی حضور اقدس ﷺ کی طرف آنا پڑا۔ غرض دونوں خدمت گرامی میں حاضر ہوئے۔ حضور ﷺ نے یہودی کے حق میں فیصلہ کر دیا جب دونوں خدمت اقدس سے اٹھ کر باہر آئے تو منافق یہودی کو چمٹ گیا اور بولا (فیصلہ کے لئے) عمرؓ کے پاس چل۔ دونوں حضرت عمرؓ کے پاس پہنچے یہودی نے عرض کیا میں اور یہ شخص اپنا باہمی مقدمہ لے کر محمدؐ کے پاس گئے تھے انہوں نے اس کے خلاف مجھے ڈگری دیدی لیکن یہ ان کے فیصلہ پر راضی نہ ہوا اور مجھے آپ کے پاس لے کر آیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منافق سے فرمایا کیا ایسا ہی ہے۔ منافق نے کہا جی ہاں! حضرت عمرؓ نے فرمایا ذرا ٹھہرو میں (اندر جا کر ابھی) باہر آتا ہوں چنانچہ آپ گھر میں گئے۔ وہاں سے تلوار لی۔ پھر باہر نکل کر منافق کو قتل کر دیا۔ اور فرمایا جو شخص اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ پر راضی نہ ہو میں اس کا فیصلہ اسی طرح کرتا ہوں اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ جو کتاب آپ پر نازل ہوئی اور جو کچھ آپ سے پہلے نازل ہوا سب پر ایمان رکھتے ہیں ان سے مراد منافق ہیں۔

يُرِيدُونَ أَنْ يَّتَحَاكَمُوٓا إِلَى الطَّاغُوتِ (پھر بھی) طاغوت کے پاس اپنا فیصلہ کرانے کیلئے جانا چاہتے ہیں
حضرت جبرئیلؑ نے کہا تھا کہ عمر (رضی اللہ عنہ) نے حق کو باطل سے جدا کر دیا اسی لئے آپ کا نام فاروق ہو گیا۔
طاغوت سے مراد ہے کعب بن اشرف یا قبیلہ جہینہ کا کاہن (طغیان کا معنی ہے حد سے تجاوز کرنا) چونکہ یہ دونوں حق کی حدود سے متجاوز تھے اس لئے ان کو طاغوت کہا گیا یا یوں کہا جائے کہ (طاغوت شیطان کو کہا جاتا ہے) یہ دونوں شیطان، شیطان سے مشابہ تھے۔ یا یہ کہا جائے کہ ان دونوں کے پاس فیصلہ کے لئے جانا حقیقت میں شیطان کے پاس فیصلہ کے لئے جانا تھا۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ابو برزہ اسلمی ایک کاہن تھا جو یہودیوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرتا تھا (یہودیوں کی تقلید میں) کچھ مسلمان بھی اس کے پاس فیصلہ کرانے گئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔
ابن ابی حاتم نے عکرمہ یا سعید کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حلاس بن صامت اور معتب بن قشیر اور رافع بن زید اور بشر اسلام کے مدعی تھے ان کی قوم والوں کا کچھ ان سے جھگڑا تھا۔ قبیلہ کے مسلمانوں نے ان کو دعوت دی کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں چل کر جھگڑے کا تصفیہ کرالیں لیکن ان لوگوں نے کہا کہ جاہلیت کے زمانہ میں جو حکام تھے یعنی کاہن انہی سے چل کر فیصلہ کراؤ۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ بغوی نے سدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کچھ یہودی (دل سے سچے) مسلمان ہو گئے تھے اور کچھ منافق تھے جاہلیت کے زمانہ میں بنی قریظہ اور بنی نضیر کا یہ باہمی دستور تھا کہ کوئی قریظی اگر کسی نضیری کو قتل کر دیتا تو اس سے قصاص لیا جاتا، یا دیت میں سو وسق چھوارے لئے جاتے اور نضیری اگر کسی قریظی کو قتل کر دیتا تو قصاص نہیں لیا جاتا بلکہ صرف ساٹھ وسق چھوارے خون بہا میں دیئے جاتے۔ نضیر قبیلہ اوس کے ہم عہد تھے اور بنی قریظہ خزرج کے حلیف۔ نضیر قریظہ سے مرتبہ میں بھی اونچے تھے اور تعداد میں بھی زیادہ تھے۔
جب اسلام آیا اور رسول اللہ ﷺ مدینہ میں رونق افروز ہوئے تو ایک بار کسی نضیری نے کسی قریظی کو قتل کر دیا تھا مقدمہ چلا تو بنی نضیر نے کہا ہمارا تمہارا یہ مسلمہ دستور تھا کہ ہم تم کو قتل کر دیں تو تم قصاص نہیں لے سکتے بلکہ خونبہا میں ساٹھ وسق چھوارے لوگے اور تم قتل کرو گے تو دیت میں سو وسق چھوارے دینے ہوں گے لہٰذا تم ہم سے ساٹھ وسق چھوارے لے لو۔ قبیلہ خزرج والوں نے (اپنے ہم عہد قریظہ کی طرف سے) کہا یہ تو جاہلیت کا عمل تھا ہم کم تھے تمہاری تعداد زیادہ تھی تم ہم پر غالب تھے اب تو ہم تم بھائی بھائی ہیں۔ ہمارا تمہارا مذہب ایک ہے تم کو ہم پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ دونوں طرف کے کچھ منافق بولے ابو برزہ اسلمی کاہن کے پاس فیصلہ کرانے چلو لیکن دونوں فریقوں کے مسلمانوں نے کہا واہ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں چلو منافق اپنی بات پر جم گئے اس پر اللہ نے آیت قصاص اور یہ آیت نازل فرمائی۔
وَقَدْ أُمِرُوٓا أَنْ يَّكْفُرُوا بِهٖ باوجودیکہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ طاغوت کو نہ مانیں یعنی اس کی مخالفت اور اظہار بیزاری کریں۔ آیت يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ میں بھی کفر کا معنی مخالفت اور اظہار بیزاری ہے۔ اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ یہودیوں کی، کاہنوں کی اور شیطانوں کی مخالفت کریں اور ان سے علیحدگی اختیار کریں اللہ نے فرمایا ہے لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصٰرٰىٓ أَوْلِيَاءَ یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے کاہن کے پاس جا کر اس کے بیان کی تصدیق کی یا حیض کی حالت میں عورت سے صنفی قربت کی یا عورت سے لواطت کی وہ اس (حکم) سے الگ ہو گیا جو محمد ﷺ پر نازل کیا گیا ہے۔ رواہ احمد واصحاب السنن بسند صحیح عن ابی ہریرہؓ۔
طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت واثلہ کی روایت سے لکھا ہے کہ جو شخص کاہن کے پاس جا کر اس سے کچھ پوچھتا ہے چالیس دن تک اس کی توبہ روک دی جاتی ہے (یعنی توبہ کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے توبہ قبول نہیں ہوتی) اس کے بعد اگر اس نے کاہن کے قول کی تصدیق کی تو کافر ہو گیا۔
وَيُرِيدُ الشَّيْطٰنُ اور شیطان چاہتا ہے یعنی شیطان جن اور شیطان آدمی چاہتے ہیں۔
أَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيدًا ۝۶۰ کہ (حق سے) دور ان کو بہکا کرلے جائیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اور جب ان سے کہا جاتا ہے یعنی جب ان منافقوں سے جو اسلام کے مدعی ہیں کہا جاتا ہے کہ **تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ** اس قرآن کی طرف آؤ جو اللہ نے اتارا ہے اور رسول (کے فیصلہ) کی طرف آؤ۔ اِلَى الرَّسُوْلِ کا عطف مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ پر ہے اس عطف سے ظاہر ہوتا ہے کہ کبھی رسول اللہ ﷺ قرآن کے علاوہ وحی خفی اور اجتہاد کے ذریعہ سے بھی فیصلہ کرتے تھے۔

رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿٦١﴾ تو آپ منافقوں کو دیکھیں گے کہ وہ آپ کی طرف سے بالکل منہ موڑ لیتے ہیں۔ بجائے ضمیر کے صراحت کے ساتھ المنافقین کہنے سے ان لوگوں کی برائی اور رسوائی کا اظہار مقصود ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف راغب ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ان کو دوسرے لوگوں سے امید تھی کہ رشوت دے کر غلط فیصلہ کرالیں گے۔

صدود مصدر ہے یا اسم مصدر (روگردانی کرنا یا روگردانی) صحاح میں جوہری نے لکھا ہے کہ صدود کا معنی ہے پھر جانا باز رہنا (یعنی لازم ہے) لیکن کبھی متعدی بھی آتا ہے (روکنا باز رکھنا) جیسے فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ ان کو راستہ سے پھیر دیا۔ روک دیا۔

روایت میں آیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب منافق کو قتل کر دیا تو اس کے ورثاء حضور ﷺ کی خدمت میں خون کا عوض طلب کرنے کے لئے حاضر ہوئے اور قسمیں کھا کر عرض کیا کہ عمرؓ کی طرف مقدمہ لے جانے کی غرض یہ تھی کہ وہ ہمارے آدمی سے کچھ اچھا معاملہ کریں گے اور دونوں فریقوں میں صلح کرادیں گے (حضور ﷺ کے فیصلہ کی خلاف ورزی مقصود نہ تھی) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ یہ عجیب بات ہے کہ جب ان پر مصیبت پڑی یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ کیف استفہام تعجب کے لئے ہے یعنی تعجب ہے کہ واضح طور پر روگردانی کرنے کے بعد بھی قسمیں کھاتے ہیں ان کی قسمیں کھانے میں کوئی جھجک نہیں ہوتی۔ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ میں لفظ اذا صرف استقبالی مفہوم کے لئے ہے (یعنی شرط کا مفہوم مراد نہیں ہے)۔

بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اس حرکت کے عوض جو پہلے انہوں نے خود کو یعنی رسول اللہ ﷺ سے روگرداں ہو کر دوسروں سے فیصلہ کرانے گئے۔

ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ پھر (عذر پیش کرنے اور خون کا بدلہ مانگنے کے لئے) آپؐ کے پاس اللہ کی قسمیں کھاتے ہوئے آئے باوجودیکہ ان کی دروغ گوئی کھلی ہوئی تھی۔

اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ﴿٦٢﴾ (فیصلہ کے لئے دوسروں کے پاس جانے سے) ہمارا مقصد صرف یہ تھا کہ اچھے طور پر فیصلہ ہو جائے اور فریقین میں موافقت پیدا ہو جائے آپ کی مخالفت مقصود نہ تھی نہ آپ کے فیصلہ سے ناراض ہونا مقصود تھا بلکہ ہم کو یہ اندیشہ تھا کہ سخت فیصلہ سے آپس کی عداوت پیدا ہو گی (اور ہم چاہتے تھے کہ باہمی عداوت نہ پیدا ہو) بے شک رسول اللہ ﷺ ہمارے آپس کے تعلقات کے لئے مصلح ہیں لیکن عمرؓ کے پاس بھی تو ہم طلب مصالحت کے لئے گئے تھے تاکہ آپس کی صلح صلاح اور الفت قائم رہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ میں اذا (محض استقبال کے لئے نہ ہو بلکہ شرط استقبالی کے لئے ہو اور مصیبت سے مراد ہو اللہ کا (دینوی و اخروی) عذاب اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے انتقام۔

اس صورت میں اس حلف پر تعجب کا اظہار مقصود ہو گا جو آئندہ زمانہ میں وہ لوگ کھائیں گے (یعنی تعجب ہے کہ جب ان پر عذاب آئے گا تو کیسی قسمیں کھائیں گے) یا یہ مطلب ہے کہ جب ان پر اللہ کی طرف سے کوئی عذاب آئے گا یا آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے ہاتھوں ان سے انتقام لیا جائے گا تو ان کا حال کیسا عجیب ہو گا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اذا صرف شرط کے لئے ہو اور يَحْلِفُوْنَ جزا ہو۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ق یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کے اندرونی خیال (نفاق) کو اللہ جانتا ہے۔ ان کو پختہ قسمیں سوائے دوزخی بنانے کے اور کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتیں۔

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ سو آپ ان سے تغافل کر جایا کریں۔

یعنی ان کی عذر نہ قبول کیجئے نہ مقتول کے خون کے مطالبہ کی طرف کوئی توجہ کیجئے۔ مقتول کا خون قابل قصاص نہیں۔

وَعِظْهُمْ اور ان کو نصیحت کیجئے کہ نفاق سے باز آجائیں اور سچے دل سے مسلمان ہو جائیں۔

وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا ﴿۶۳﴾ اور ان سے خاص ان کی ذات کے متعلق موثر بات کہہ دیں یعنی ایسی بات کہہ دیجئے جو ان کے دلوں کے اندر اتر جائے۔ حسنؒ بصری نے کہا قول بلیغ یہ ہے کہ منافقوں سے کہا جائے تم اسی نفاق پر مارے جاؤ گے۔ اس بات کا ان کے دلوں پر پورا اثر ہوگا۔

بعض علماء نے کہا کہ قول بلیغ سے مراد ہے اللہ کے عذاب سے ڈرانا۔ زمخشری نے کشاف میں لکھا ہے کہ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ کو بلیغًا سے متعلق کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ایسا قول کہو جو ان کے دلوں میں پہنچ جائے۔ بیضاویؒ نے صاحب کشاف کے اس قول کو ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ بلیغًا قولًا کی صفت ہے اور صفت کا معمول (جار مجرور وغیرہ) موصوف پر مقدم نہیں ہو سکتا۔ بیضاوی کے اس اعتراض کا جواب اس طرح دیا گیا ہے کہ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ سے پہلے قولًا بلیغًا محذوف ہے اور اسی سے فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ کا تعلق ہے جو قولًا بلیغًا مذکور ہے وہ تو محذوف کی تفسیر ہے۔

آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ منافقوں کو باقی رکھنے میں مصلحت ہے (کم از کم مدعیان اسلام کی ظاہری تعداد میں ہی اضافہ ہوتا ہے جس کا اثر کافروں پر پڑتا ہے) اس لئے ان کو سزا دینے کی طرف توجہ نہ کرو، زبان سے ان کو نصیحت کردو اور اثر آفریں ہدایت تنہائی میں کرو۔ تنہائی کی نصیحت زیادہ کارگر ہوتی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ط اور ہم نے ہر رسول اسی لئے بھیجا کہ حکم خدا کے مطابق اس کی بات مانی جائے یعنی رسالت کا مقصود ہی یہ ہے کہ پیغمبر ﷺ کی اطاعت لوگوں پر لازم کردی جائے۔ اذن سے مراد ہے حکم یعنی اللہ کا حکم ہے کہ جس پیغمبر کو بھیجا جائے لوگ اس کے حکم کو مانیں اور جو اس کے فیصلہ پر راضی نہ ہو اور اس کے حکم کو نہ مانے اس کو قتل کردیا جائے کیونکہ فیصلۂ رسول کو نہ ماننے کا مطلب ہی یہ ہوگا کہ رسول ﷺ کی رسالت کو قبول نہیں کیا۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ اور جب (نفاق کی وجہ سے اور طاغوت کے پاس فیصلہ کرانے کے لئے جانے کے سبب) انہوں نے خود اپنا نقصان کرلیا تھا۔ آپ کے پاس آجاتے یعنی یہ بات ثابت ہو جاتی کہ وہ سچے دل سے توبہ کر کے آپؐ کے پاس آئے ہیں۔

فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ اور (نفاق سے توبہ کر کے سچے دل سے رسول اللہ ﷺ کے سامنے معذرت کرنے کے بعد) اللہ سے معافی کے طالب ہوتے۔

وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ اور رسول بھی ان کے لئے معافی کے طلب گار ہوتے۔ بجائے خطاب کے الرسول کا لفظ استعمال کرنے میں عظمت رسول کا اظہار اور اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ شان رسول کا تقاضا ہی یہ ہے کہ کتنا ہی بڑا جرم ہو سچی معذرت کو قبول کرلیا جائے۔

لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾ تو جان لیتے کہ اللہ توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔ وجدوا کا معنی صادفوا بھی ہو سکتا ہے یعنی وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پاتے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ پس قسم ہے آپ کے رب کی وہ ایماندار نہیں ہوں گے۔

صحاح ستہ (صحیح بخاری و مسلم و سنن ابی داؤد و جامع ترمذی و نسائی و سنن ابن ماجہ) میں مذکور ہے کہ حرہ کے کسی پہاڑی

نالے سے کھیتوں کو پانی دینے کے متعلق حضرت زبیر بن عوام کا کسی انصاری سے جھگڑا تھا دونوں خدمت گرامی میں حاضر ہوئے آپ نے حکم دیا زبیر تم (پہلے) سینچ لو پھر اپنے ہمسایہ کی طرف پانی چھوڑ دو۔ انصاری اس فیصلہ سے ناراض ہو گیا اور اس نے کہا یا رسول اللہ اس فیصلہ کی وجہ یہ ہے کہ زبیر آپ کی پھوپھی کا بیٹا ہے یہ سن کر حضور کا رنگ بدل گیا اور فرمایا زبیر! سینچنے کے بعد پانی کو اتنا روکے رکھو کہ پانی مینڈھوں تک پہنچ جائے شروع میں حضور ﷺ نے ایسا مشورہ دیا تھا کہ حضرت زبیر اور انصاری دونوں کا کام ہو جائے اور بعد کو حضرت زبیرؓ کو اپنا پورا حق وصول کرنے کا حکم دے دیا (اگرچہ انصاری کا اس سے نقصان ہو گیا یعنی پہلا حکم استحبابی تھا اور دوسرا حکم استحقاقی) حضرت زبیرؓ کا بیان ہے کہ انصاری نے جب رسول اللہ ﷺ کو ناراض کر دیا اور آپ نے صراحت کے ساتھ میرا پورا حق ملنے کا حکم صادر فرما دیا تو خدا کی قسم میرا خیال ہے کہ اسی معاملہ کے سلسلہ میں آیت بالا کا نزول ہوا۔ طبرانی نے کبیر میں اور حمیدی نے مسند میں حضرت ام سلمہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت زبیر کا ایک شخص سے جھگڑا ہو گیا دونوں معاملہ لے کر حضورؐ کی خدمت میں پہنچے آپؐ نے زبیرؓ کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ وہ شخص بولا زبیرؓ کو اس لئے ڈگری دی گئی کہ وہ ان کی پھوپھی کا بیٹا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ ایک انصاری کا حضرت زبیر سے جھگڑا ہو گیا۔ انصاری کا نام حاطب بن ابی بلتعہ تھا۔ ابن ابی حاتم نے سعید بن مسیبؒ کی روایت سے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت زبیر بن عوام اور حاطب بن ابی بلتعہ کے متعلق ہوا ایک پانی کے معاملہ میں دونوں کا باہم جھگڑا تھا اور رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ کیا تھا کہ پہلے بالائی زمین کو پانی دیا جائے پھر نشیبی حصہ کو۔

میں کہتا ہوں اس قصہ میں حاطب بن ابی بلتعہ کا نام لینا سراسر وہم ہے کیونکہ حاطب مہاجر تھے انصاری نہ تھے۔ بدر کے جہاد میں شریک تھے۔ بلکہ یہ کوئی منافق تھا اوس یا خزرج سے نسبی اشتراک رکھنے کی وجہ سے اس کو انصاری کہہ دیا گیا۔

بغوی نے لکھا ہے فیصلہ کے بعد جب دونوں باہر آئے اور مقدادؓ کی طرف سے گزرے اور حضرت مقدادؓ نے پوچھا کس کے حق میں فیصلہ ہوا تو انصاری نے منہ بگاڑ کر کہا ان کی پھوپھی کے بیٹے کے حق میں۔ حضرت مقداد کے پاس ایک یہودی موجود تھا اس نے انصاری کی حرکت محسوس کر لی اور بولا ان کو خدا کی مار شہادت بھی دیتے ہیں کہ (محمد) اللہ کے رسول ہیں پھر جو فیصلہ وہ کر دیتے ہیں اس پر (جانب داری کی) تہمت بھی لگاتے ہیں۔ خدا کی قسم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ہم سے ایک گناہ ہو گیا تھا اور موسیٰؑ نے ہم کو توبہ کی طرف بلایا اور حکم دیا کہ خود آپس میں ایک دوسرے کو قتل کر دو ہم نے حکم کی تعمیل کی کہ مقتولوں کی تعداد ستر ہزار تک پہنچ گئی آخر ہمارا رب ہم سے راضی ہو گیا۔ حضرت ثابتؓ بن شماس بن قیسؓ نے فرمایا سنو اللہ میری سچائی کا گواہ ہے۔ خدا کی قسم اگر محمد ﷺ مجھے خودکشی کا حکم دیدیں تو میں ضرور حکم کی تعمیل کروں گا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ مجاہدؒ اور شعبیؒ کے قول پر اس آیت کا نزول بشر منافق اور ایک یہودی کے حق میں ہوا تھا جو رسول اللہ ﷺ سے فیصلہ کرانے اور یہودی کو ڈگری ملنے کے بعد حضرت عمر کے پاس گئے تھے۔ پورا قصہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ کلام کی رفتار کا تقاضا بھی یہی ہے (کہ ان ہی دونوں کے متعلق آیت نزول مانا جائے)

آیت (میں اگر لا کو نافیہ قرار دیا جائے تو اس) کا مطلب یہ ہوگا کہ واقعہ ایسا نہیں جیسا یہ جھوٹے مدعیان ایمان دعویٰ کرتے ہیں کہ اقرار ایمان کے بعد بھی آپ کے فیصلہ پر راضی نہیں ہوتے۔ قسم ہے آپ کے رب کی یہ ایماندار نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ ...الخ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فَلَا وَرَبِّكَ میں لا زائد (تاکید قسم کے لئے) ہو (یعنی آپ کے رب کی قسم یہ امر یقینی ہے کہ یہ لوگ ایماندار نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ .... الخ)۔

حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ تاوقتیکہ اپنے اندرونی اختلافات اور گڑبڑ کا (فیصلہ کن) حاکم آپ کو نہ قرار دیں۔ شجر سے مراد ہے اختلاف اور آپس کی گڑبڑ۔ درخت کو شجر اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ اس کی شاخیں باہم گتھی ہوئی اور گڑبڑ ہوتی ہیں۔

ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ پھر اپنے دلوں میں آپ کے کئے ہوئے فیصلہ سے تنگی

بھی محسوس نہ کریں۔ مجاہد نے کہا حرجاً سے مراد ہے شک۔ کیونکہ شک کرنے والا ہمیشہ اپنے معاملہ میں تنگی محسوس کرتا ہے۔

وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿٦٥﴾ اور آپ کے حکم کو بلا کراہت بخوشی نہ مان لیں۔

وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اور اگر ہم ان پر فرض کر دیتے یعنی اگر ان منافقوں پر جو ایمان کے دعویدار ہیں اور پھر آپ کے فیصلہ سے ناخوش بھی ہیں ہم فرض کر دیتے۔

عَلَيْهِمْ میں ہُم کی ضمیر منافقوں کی طرف راجع ہے صحابہؓ کی طرف راجع نہیں ہے کیونکہ کلام کی رفتار منافقوں ہی کے متعلق ہے پھر اس کا امکان بھی نہ تھا کہ اگر صحابہؓ پر خودکشی فرض کر دی جاتی تو وہ تعمیل حکم نہ کرتے اللہ نے تو ان کی تعریف میں فرمایا ہے کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ دوسری آیت میں صحابہؓ کے متعلق فرمایا ہے يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ۔ خود رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا تھا خَيْرُ الْقُرُونِ قَرْنِي۔ دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا تھا إِنَّ اللّٰهَ اخْتَارَنِي وَاخْتَارَ لِي أَصْحَابًا اس کے علاوہ اگر صحابہؓ کی طرف ضمیر کو راجع کیا جائے گا تو حضرت موسیٰ علیہ اسلام کے ساتھیوں کی فضیلت اصحاب محمدی پر لازم آئے گی کہ ان کو جب توبہ کا حکم دیا گیا اور خودکشی کا امر ہوا تو انہوں نے تعمیل حکم کی اور صحابہؓ کرام ایسے نہیں کہ اگر ان کو خودکشی کا حکم دیا جاتا تو وہ تعمیل کرتے۔[۱]

أَنِ اقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ کہ اپنے آپ کو خود قتل کرو۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کے حکم کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف رجوع کرنے کے جرم سے توبہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو خود قتل کرو۔

كَتَبْنَا (ہم نے فرض کیا) کے اندر قول کا معنی ہے اور اس مقولہ کی تفسیر اَنْ کے ذریعہ سے کر دی گئی ہے یا اَنْ مصدری ہے یعنی ہم نے ان کو اپنے آپ کو قتل کرنے کا حکم دیا جیسا بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی کے جرم کی وجہ سے دیا تھا۔

أَوِ اخْرُجُوا مِنْ دِيَارِكُمْ یا اپنے دیس سے نکل جاؤ۔ جیسے بنی اسرائیل کو مصر سے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جہاد کیلئے اپنے گھروں سے نکلنے اور شہادت کے لئے اپنے کو پیش کرنے کا حکم اگر ہم ان کو دے دیں۔

مَا فَعَلُوهُ تو اس کو کوئی نہ کرے گا یعنی فرض کو کوئی ادا نہیں کرے گا اپنے نفس کو قتل نہیں کرے گا یا بستی سے نہیں نکلے گا۔

إِلَّا قَلِيلٌ مِنْهُمْ مگر ان میں سے تھوڑے شخص۔ یعنی نفاق کے بعد اللہ جن کو اخلاص کی توفیق دے دے گا وہ حکم کی تعمیل کریں گے۔ ابن جریر نے سدی کی روایت سے لکھا ہے کہ جب آیت وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ أَنِ اقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ أَوِ اخْرُجُوا مِنْ دِيَارِكُمْ مَا فَعَلُوهُ إِلَّا قَلِيلٌ نازل ہوئی تو ثابتؓ بن قیس بن شماس اور ایک یہودی کے درمیان مباحثہ چھڑ گیا یہودی (بطور فخر) کہنے لگا اللہ نے ہم پر خودکشی کو واجب کیا تو ہم نے خود اپنے آپ کو قتل کر دیا ثابتؓ بولے خدا کی قسم اگر اللہ ہم پر بھی خودکشی کو فرض کر دیتا تو ہم بھی اپنے کو قتل کر دیتے اس پر اللہ نے مندرجہ ذیل آیت نازل فرمائی۔

---

[۱] یہ فقیر حضرت مولف قدس سرہٗ کے اس کلام کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہے کیونکہ گر صرف منافقوں کی طرف ضمیر کو راجع مانا جائے تو اس کا مطلب یہ نکلے گا کہ خودکشی کا حکم ملنے کے بعد عام منافق تعمیل نہیں کریں گے مگر کچھ منافق ایسے بھی ہوں گے جو حکم کی تعمیل میں خودکشی کر لیں گے استثناء کا یہی تقاضا ہے کہ نفی سے استثناء کے بعد مستثنیٰ میں حکم کا اثبات ضرور ہونا چاہیے مگر یہ مطلب روایت اور درایت دونوں کے خلاف ہے اگر منافق رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل میں خودکشی کر لیتے تو وہ منافق ہی کیوں ہوتے اور صرف صحابہؓ کو ضمیر کا مرجع قرار دینے سے تنقیص صحابہؓ لازم آئے گی جیسا کہ حضرت مولف نے صراحت فرمائی ہے اس لئے اس ہیچمدان کی نظر میں ضمیر کے مرجع کو اگر عام قرار دیا جائے تو زیادہ مناسب ہے اور ہر اعتراض سے محفوظ یعنی وہ لوگ جو ایمان کے دعویدار ہیں خواہ منافق اور جھوٹے ہیں یا سچے اور مخلص اگر ان کو خودکشی کا حکم دے دیا جاتا تو بعض لوگ حکم کی تعمیل کرتے یعنی مخلص مومن اور صحابہؓ حکم کی تعمیل کرتے اور جھوٹے منافق تعمیل نہ کرتے، اسلام کا دعویٰ کرنے والے تو سب ہی تھے سچائی اور جھوٹ کی جانچ اس حکم کی تعمیل و عدم تعمیل سے ہو جاتی، واللہ اعلم۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿۶۶﴾ اور اگر یہ لوگ جو کچھ ان کو نصیحت کی جاتی ہے اس پر عمل کیا کرتے تو ان کے لئے بہتر ہوتا اور ایمان کو زیادہ پختہ کرنے والا ہوتا۔ یا ان کے اعمال کے ثواب کو پختہ کرنے والا ہوتا۔

حسن اور مقاتل راوی ہیں کہ اس آیت کے اترنے پر حضرت عمرؓ، حضرت عمارؓ بن یاسر، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور کچھ دوسرے صحابیوں نے کہا خدا کی قسم اگر اللہ ہم کو ایسا حکم دیتا تو ہم ضرور تعمیل کرتے لیکن الحمدللہ کہ اللہ ہی نے ہم کو محفوظ رکھا۔ اس قول کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو بھی پہنچ گئی تو آپ نے فرمایا میری امت کے کچھ لوگ ایسے ہیں کہ زمین میں گڑے ہوئے پہاڑوں سے بھی زیادہ ایمان ان کے دلوں میں جما ہوا ہے۔

وَّاِذًا اور اس حالت میں اس کا عطف لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ پر ہے یا جد اکلام ہے اور واو استیناف کلام کے لئے ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وَاِذًا میں واو قسم کے لئے ہو یعنی بخدا اس وقت۔

لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ ہم خاص اپنی طرف سے عطا فرماتے یعنی اعمال کی جزا سے زیادہ محض اپنی مہربانی سے ان کو دیتے۔

اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۶۷﴾ بڑا ثواب۔

وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۶۸﴾ اور ہم ان کو ضرور سیدھا راستہ بتا دیتے جس پر چل کر وہ بارگاہ قدس تک پہنچ جاتے۔

طبرانی نے قابل قبول سند سے اور ابو نعیم وضیاء نے حضرت عائشہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ مجھے اپنی جان اور اولاد سے بھی زیادہ پیارے ہیں میں گھر میں ہوتا ہوں اور آپ کی یاد آجاتی ہے تو جب تک حاضر ہو کر شرف زیارت حاصل نہ کرلوں قرار نہیں آتا لیکن جب مجھے اپنی اور آپ کی موت کا تصور ہوتا ہے تو جانتا ہوں کہ (مرنے کے بعد یہ شرف زیارت حاصل نہ ہو سکے گا کیونکہ) آپ جنت میں انبیاء کے ساتھ اونچے درجہ میں ہوں گے اور میں اگر جنت میں پہنچ بھی گیا تو اندیشہ ہے کہ آپ کو نہ دیکھ سکوں گا۔ حضورؐ نے یہ کلام سن کر کوئی جواب نہیں دیا۔ یہاں تک کہ جبرئیلؑ آیت ذیل لے کر آئے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ اور جو لوگ اللہ اور رسول کے حکم پر چلیں گے یعنی اللہ کے فرائض ادا کریں گے اور رسول کی سنت کی پیروی کریں گے۔

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن کو اللہ تعالیٰ اپنے انعام سے سرفراز فرمائے گا یعنی انبیاء اور صدیق اور شہداء اور نیک اعمال لوگ۔

طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔ ابن ابی حاتم نے مسروق کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ نے عرض کیا تھا (اب تو تھوڑی دیر کے لئے بھی) آپ سے جدا رہنا ہمارے لئے مناسب نہیں کیونکہ وفات کے بعد تو آپ کو اتنے اونچے درجہ پر پہنچا دیا جائے گا۔ ہم آپ کو دیکھ بھی نہ سکیں گے۔

ابن جریر نے ربیع کا قول نقل کیا ہے کہ صحابہؓ نے کہا ہم کو معلوم ہے کہ جنت کے اندر دوسرے اہل ایمان پر رسول اللہ ﷺ کو بڑی فضیلت حاصل ہوگی پھر جن لوگوں نے حضور ﷺ کا اتباع کیا ہوگا اور آپ پر ایمان لائے ہوں گے اور جنت میں سب جمع ہوں گے تو ایک دوسرے کو کیسے دیکھ سکے گا (کیونکہ سب کے درجات میں فرق ہوگا) اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اوپر کے درجوں والے نیچے والوں کے پاس اتر کر آئیں گے اور جنت کے باغات میں جمع ہو کر اللہ کے انعامات کا تذکرہ کریں گے اور اللہ کی ثناء کریں گے۔

مسلم۔ ابو داؤد اور نسائی نے لکھا ہے کہ حضرت ربیعہ بن کعب اسلمی نے فرمایا میں خدمت گرامی میں حاضر ہوتا تھا اور آپ ﷺ کے وضو اور استنجاء کے لئے پانی کا برتن لے جاتا تھا۔ حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا مجھ سے مانگ (کیا مانگتا ہے) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ جنت کے اندر حضور ﷺ کے ساتھ رہنے کا خواست گار ہوں فرمایا، یا اس کے علاوہ اور کچھ، میں نے عرض کیا بس یہی فرمایا سجدوں کی کثرت سے اپنے معاملہ میں میری مدد کر (یعنی سجدے بہت کیا کر تاکہ اپنی رفاقت کے لئے میں تیری شفاعت کر سکوں)۔

حضرت عکرمہ کی روایت ہے کہ ایک جوان خدمت گرامی میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ دنیا میں تو ہم کو آپ کی زیارت ہو جاتی ہے مگر قیامت کے دن ہم کو حضور ﷺ کا دیدار نصیب نہ ہوگا کیونکہ آپ اونچے درجات پر ہوں گے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو انشاء اللہ تعالیٰ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ ابن جریرؒ نے یہ حدیث مرسلاً سعید بن جبیر، مسروق، ربیع، قتادہ اور سدی کی روایت سے بیان کی ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ ان آیات کا نزول رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبانؓ کے متعلق ہوا تھا ثوبانؓ کو حضور ﷺ سے بڑی محبت تھی ان کو حضور ﷺ کے بغیر قرار ہی نہ آتا تھا۔ ایک روز خدمت گرامی میں حاضر ہوئے تو چہرہ کا رنگ اترا ہوا تھا غم کے آثار نمودار تھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ثوبانؓ چہرہ کا رنگ بدلا ہوا کیوں ہے؟

ثوبانؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے کوئی دکھ درد نہیں بس اتنی بات ہے کہ حضور ﷺ کی زیارت نہیں ہوتی تو جی بالکل اچاٹ ہو جاتا ہے اور جب تک زیارت نہ کرلوں چین نہیں آتا پھر آخرت کا تصور کرتا ہوں تو ڈر لگتا ہے کہ وہاں مجھے آپ کا دیدار ہی نہ ہوگا کیونکہ انبیاء کے ساتھ آپ تو اونچے درجہ پر ہوں گے اور میں اگر جنت میں چلا بھی گیا تو آپ کے درجہ سے بہت نیچے مقام پر ہوں گا اور جنت میں داخلہ نہ ملا تو پھر تو کبھی دیدار میسر ہی نہیں آئے گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اللہ نے اس آیت میں انعام یافتہ لوگوں کی چار قسمیں بیان کی ہیں اور قرب کے لحاظ سے ان کی ترتیب قائم کی ہے اور سب لوگوں کو (در پردہ) ترغیب دی ہے کہ (موخر الذکر تینوں گروہوں میں سے کسی گروہ میں) شامل ہو جائیں (۱) انبیاء ان کا مبداء تعین (و تشخص) اللہ کی صفات قدسیہ ہیں بغیر حجاب صفات کے یہ دوامی انوار ذاتیہ میں غرق ہوتے ہیں۔ تجلیات ذاتیہ کا ہی دوسرا نام کمالات نبوت ہے بغیر کسی کی وساطت کے یہ گروہ اس مقام پر فائز اور راسخ ہوتا ہے تاکہ دوسرے انسانوں کی تکمیل انسانیت کر کے ان کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق اللہ کی منشاو مشیت کے زیر اثر قرب الٰہی کی طرف مختلف لوگوں کو کھینچ کر لے آئے[1] یہی گروہ اللہ کے احکام بندوں تک پہنچاتا ہے تاکہ بندوں کی دنیا اور آخرت دونوں سنور جائیں۔

(۲) صدیقوں کا گروہ۔ یہ لوگ انبیاء کے کامل پیرو اور ظاہر باطن ہر طرح سے اتباع انبیاء کرنے والے بڑے سچے۔ کمالات نبوت یعنی تجلیات ذاتیہ میں ڈوبے ہوئے۔ اور بوراثت انبیاء بغیر حجاب صفات کے محض پیغمبروں کا کامل اتباع کرنے کی وجہ سے بحر انوار قدسیہ میں غرق ہوتے ہیں۔

(۳) شہداء یہ گروہ راہ خدا میں اپنی جانیں دے دیتا ہے تاکہ جانی قربانی کے عوض اس کو تجلیات ذاتیہ کا ایک مخصوص حصہ حاصل ہو جائے اور اس پر انوار ذاتیہ کی خصوصی شعاع پڑ جائے۔

(۴) صالحین۔ یعنی وہ لوگ جو تمام رذائل اور بری باتوں سے اپنے نفوس کو پاک رکھتے اور ہمیشہ یاد خداوندی میں غرق رہ

---

[1] یعنی دعوت انبیاء بجائے خود کوئی مستقل اور بالاصالت موجب ہدایت نہیں اور نہ انبیاء کسی کو اپنی مرضی سے قرب الٰہی تک پہنچا سکتے ہیں بلکہ قرب الٰہی کے مقام پر فائز ہونے کی اصل علت فاعلہ تو اللہ کی مشیت ہے، وہی موثر اور موجب حقیقی اور علت متاثرہ یا منفعلہ آدمی کی اپنی اپنی فطری صلاحیت ہے جیسی قابلیت سرشت میں ملی ہے اور جیسی مشیت غیبی ہے اسی لحاظ سے پیغمبروں کی دعوت لوگوں کو اللہ کی طرف کھینچنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ (مترجم)

کر غیر اللہ کے ساتھ وابستگی سے پرہیز رکھتے ہیں اور گناہوں کی کثافت سے اپنے جسم کو بھی آلودہ نہیں کرتے جب فناء ذاتی اور بقاء باللہ کے کمال پر پہنچ جاتے ہیں تو تجلیات ذاتیہ کا کچھ پر تو ان پر پڑ جاتا ہے اگرچہ تجلی ذاتی کی یہ پر تو اندازی حجاب صفات کے پیچھے سے ہوتی ہے انہی کو لوگ اولیاء کرام کہتے ہیں۔ ۲ؐ

اللہ تعالیٰ نے تمام مومنوں سے وعدہ فرمایا ہے کہ اطاعت خدا اور رسول کے تفاوت کے لحاظ سے جنت کے اندر کم و بیش سب کو اپنے دیدار سے سرفراز فرمائے گا۔ یوں تو انبیاء بھی صدیق ہوتے ہیں لیکن اس جگہ صدیقوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو مرتبہ صدیقیت پر فائز ہوں اور نبی نہ ہوں اسی طرح صالحین سے مراد وہ صالحین ہیں جو انبیاء اور صدیقین نہ ہوں اگرچہ تمام انبیاء اور صدیق اہل صلاح ہوتے ہیں۔ گویا صدیق کا لفظ نبی اور غیر نبی دونوں کو شامل ہے اور صالح کا لفظ سب سے عام ہے۔ اسی لئے صدیق اور صالح کا اطلاق انبیاء پر بھی آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے متعلق فرمایا ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا اور حضرت یحییٰ کے متعلق فرمایا ہے وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ اور حضرت عیسیٰ کے متعلق فرمایا ہے وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ۔

فائدہ:۔ جب میرے مرشد و امام شہید ہو گئے تو میں تاریخ وفات پر غور کرنے لگا اچانک اللہ کی طرف سے میرے دل پر آیت اُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ کا القاء ہو گیا میں نے جو حساب لگایا تو سنہ وفات یعنی ۱۱۹۵ھ پورا نکلا والحمد للہ۔

وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾ اور یہ لوگ بہت اچھے رفیق ہیں یعنی مذکورۂ بالا چاروں اقسام کے لوگوں کی رفاقت اچھی ہے رفیقاً تمیز یا حال ہے چونکہ اس کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے اس لئے حال ہونے میں کوئی قباحت نہیں۔

ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ یہ مہربانی اللہ تعالیٰ کی ہے یعنی انعام یافتہ لوگوں کے جیسے اعمال نہ ہونے کے باوجود ان کی رفاقت میسر آجانا اللہ کی مہربانی ہے۔

وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿۷۰﴾ اور اللہ پورا پورا جاننے والا ہے۔

یعنی اللہ اس رفاقت کے سبب اور انعام یافتہ گروہ کے ساتھ شمول کی وجہ کو خوب جانتا ہے رفاقت کا اصل سبب محبت ہے محبّ کے اعمال اگرچہ محبوب کے اعمال کی طرح نہ ہوں مگر محبوب کی محبت محبوب کے ساتھ رفاقت کا سبب ہے اور محبت ایک ایسی چیز ہے جس کو سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا یہاں تک کہ اعمال لکھنے والے فرشتے بھی واقف نہیں ہوتے حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ایک شخص کو ایک قوم سے محبت ہے مگر (اس کے ساتھ اس شخص کا شمول نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ (عمل میں) اس قوم کو نہ پہنچ سکا۔ فرمایا آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہوگی۔ احمد بخاری۔ مسلم

صحیحین میں حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث آئی ہے حضرت انسؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا

ع ۹
۶

ل خلاصہ یہ کہ انبیاء کو بلا واسطہ تجلیات ذاتیہ یعنی کمالات نبوت حاصل ہوتے ہیں اور صدیقوں کو انبیاء کی وساطت سے ان کے نقش قدم پر چلنے کی وجہ سے تجلیات ذاتیہ بغیر حجاب صفات کے حاصل ہوتی ہے اور وہ ہر وقت دوامی تجلیات ذاتیہ میں غرق رہتے ہیں اور شہداء کو تجلیات ذاتیہ کا ایک مخصوص حصہ حاصل ہوتا ہے، عمومی اور دوامی تجلیات ان پر فائض نہیں ہوتیں بلکہ نورانیت کی ایک مخصوص شعاع ان پر پر تو انداز ہوتی ہے مگر یہ تجلی ذاتی ہوتی ہے اور عام اولیاء کو ذاتی تجلی کا جو حصہ ملتا ہے وہ صفات کی اوٹ سے ہوتا ہے براہ راست نہیں ہوتا، ۱۲۔

یارسول اللہ ﷺ قیامت کی گھڑی کب ہوگی۔ فرمایا ارے تو نے اس کے لئے کیا تیاری کی ہے اس نے عرض کیا میں نے تیاری تو کچھ نہیں کی صرف اللہ اور اللہ کے رسول سے مجھے محبت ہے فرمایا تو اسی کے ساتھ ہوگا جس سے تجھے محبت ہوگی۔ راوی کا بیان ہے مسلمانوں کو جتنی خوشی یہ الفاظ سن کر ہوئی اتنا خوش اسلام کے بعد میں نے مسلمانوں کو ہوتے نہیں دیکھا۔ صحیح بخاری و مسلم۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ذلک سے اشارہ انعام یافتہ لوگوں کے مرتبہ کی طرف ہوگا یعنی انعام یافتہ لوگوں کے مرتبہ پر ان کا فائز ہونا محض اللہ کی مہربانی سے ہے ان کے عمل کو اس میں دخل نہیں ہے کیونکہ ان مراتب تک پہنچنا عموماً اللہ کے انتخاب سے ہوگا۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

اعمال درست رکھو (مگر) یہ بھی سمجھے رہو کہ کسی کو عمل کی وجہ سے نجات نہیں ملے گی۔ صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ کیا آپ کو بھی۔ فرمایا نہ مجھے سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت و فضل سے ڈھانک لے۔ صحیحین۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ اے اہل ایمان اپنے بچاؤ کا سامان لے لیا کرو (احتیاط رکھو) حَذَر اور حِذر دونوں صحیح ہیں جیسے اثَر اور اِثر مَثل اور مِثل۔ حذر بچاؤ کی چیز کو کہتے ہیں جیسے اسلحہ وغیرہ۔

فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِیْعًا ﴿۷۱﴾ پھر (جہاد کو) نکلو متفرق ٹولیاں بنا کر یا نکلو اکٹھے ہو کر جیسی مصلحت ہو۔ ثبات جمع ہے ثُبَۃٌ کی ثبۃ منفرد ٹولی۔ اس کی جمع ثُبِیْنٌ بھی آتی ہے۔ [1]

وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّیُبَطِّئَنَّ اور تم میں سے بعضا...... تو وہ ہے جو ہٹار ہتا ہے یعنی جہاد سے ہٹار ہتا ہے اور ست پڑ جاتا ہے اس جگہ باب تفعیل باب افعال کا ہم معنی ہے اور لازم ہے یا متعدی ہے اور یہ معنی ہے کہ بعض لوگ دوسروں کو جہاد سے روکتے ہیں جیسے جنگ احد کے دن۔ ابن ابی نے کچھ لوگوں کو روکا تھا۔ اس وقت لیبطئن اس بطا سے مشتق ہوگا جو بطوء سے بنا ہے جیسے ثَقُلَ ثِقل سے بنا ہے بہر حال اس سے منافق مراد ہیں۔

فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِیْدًا ﴿۷۲﴾ پس (اے مسلمانو) اگر تم پر (قتل یا شکست کی) کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ (منافق) کہتا ہے مجھ پر اللہ کا کرم ہو گیا کہ میں مسلمانوں کے ساتھ موجود نہ تھا (اس لئے مجھ پر وہ آفت نہ آئی جو مسلمانوں پر آئی)۔

وَلَىِٕنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ اور اگر اللہ کی کوئی مہربانی تم کو ملتی ہے یعنی فتح یا مال غنیمت۔

لَیَقُوْلَنَّ تو (وہ انتہائی حسرت سے) کہتا ہے۔

كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَیْنَكُمْ وَ بَیْنَهٗ مَوَدَّةٌ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے اور اس کے درمیان کوئی دوستی ہی نہ تھی۔

یٰلَیْتَنِیْ كُنْتُ مَعَهُمْ اے کاش میں بھی مسلمانوں کے ساتھ (اس جنگ میں شریک) ہوتا۔

فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِیْمًا ﴿۷۳﴾ تو مجھے بھی بڑی کامیابی ہوتی یعنی مال غنیمت کا بڑا حصہ مل جاتا۔

جملہ کَاَنْ لَّمْ تَکُنْ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَہٗ مَوَدَّۃٌ جملہ معترضہ ہے جو لَیَقُوْلَنَّ اور یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ مَعَھُمْ کے درمیان منافقوں کے عقیدہ کی کمزوری پر تنبیہ کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ رہنے سے ان کا اصل مقصد صرف حصول مال ہے اگر مسلمان کامیاب ہو جاتے ہیں تو ان کو حسد ہوتا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ جملہ کَاَنْ لَّمْ تَکُنْ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَہٗ مَوَدَّۃٌ کا تعلق پہلے جملہ سے ہے اس صورت میں مطلب اس طرح ہوگا کہ مسلمانو! جب تم پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو منافق کہتا ہے اللہ کا مجھ پر کرم ہو گیا کہ میں مسلمانوں کے ساتھ موجود نہ تھا۔ گویا تمہارے اور اس کے درمیان کوئی دوستی کا رشتہ ہی نہ تھا (اسی لئے وہ اپنے بچ جانے کو غنیمت سمجھتا ہے خواہ تم مصیبت میں گرفتار ہوگئے ہو) بیضاوی نے لکھا ہے بغوی کی یہ تشریح ضعیف ہے کیونکہ ایک جملہ کے اجزاء میں ایسی عبارت سے تفریق

---

[1] ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول آیا ہے، انفروا ثباتٍ یعنی دس دس اور دس سے زائد، مجاہد نے کہا چھوٹی ٹولیاں، (از مفسر)۔

کرنا جس کا تعلق ان اجزاء سے نہ لفظی ہو نہ معنوی درست نہیں۔

فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ پھر اللہ کی راہ میں لڑیں۔ اس کا عطف خُذُوا حِذْرَكُمْ پر ہے یعنی اپنے بچاؤ کے لئے ہتھیار وغیرہ لے لو پھر اللہ کی راہ میں لڑو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فاء کو جزائیہ قرار دیا جائے یعنی منافق اگر پیچھے ہٹتے ہیں تو ہٹیں اہل ایمان کو اللہ کی راہ میں لڑنا چاہئے۔

الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ط جو آخرت کے عوض دنیوی زندگی فروخت کرتے ہیں یعنی وہ مخلص جو آخرت کی طلب میں اپنی جانیں دیتے ہیں۔

بعض لوگوں نے کہا یَشْرُوْنَ کا معنی ہے یَشْتَرُوْنَ اس وقت منافق مراد ہوں گے جو آخرت کے عوض دنیوی زندگی کو پسند کرتے ہیں ان کو چاہئے کہ خلوص کے ساتھ ایمان لائیں۔ نفاق کو چھوڑ دیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کریں تاکہ دنیا اور آخرت میں ان کو افسوس و حسرت سے دوچار ہونا نہ پڑے۔

وَمَنْ يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿۷۴﴾ اور جو اللہ کی راہ میں لڑے گا خواہ وہ مارا جائے یا (دشمنوں پر) غالب آجائے ہم (آخرت میں) اس کو بڑا اجر عطا کریں گے۔ اللہ نے مجاہد سے اجر عظیم کا وعدہ فرمایا خواہ اللہ کا بول بالا کرنے کی کوشش میں وہ شہید ہو جائے اور اللہ کا بول بالا نہ کر سکے یا غالب اور کامیاب ہو جائے اور اس کو اقتدار و مال حاصل ہو جائے کیونکہ وہ اپنی امکانی کوشش سے تو دریغ نہیں کرتا یہاں تک کہ ناکامیابی کی صورت میں اپنی جان دیدیتا ہے اور کامیابی کی شکل میں اس کو اگرچہ مال دولت اور اقتدار مل جاتا ہے لیکن اس سے اس کے اخروی اجر میں کوئی کمی نہیں آسکتی کیونکہ حصول مال اس کا اصل مقصد نہ تھا اللہ کے بول کو بالا کرنا اور دین کا اعزاز قائم کرنا اس کا مقصود تھا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو شخص نکلتا ہے اور محض اللہ پر ایمان اور اللہ کے پیغمبروں کی تصدیق اس کو گھر سے نکالتی ہے (کوئی اور دنیوی غرض اس کے پیش نظر نہیں ہوتی) تو اللہ نے اس کا ذمہ لے لیا ہے کہ (یا) ثواب اور مال غنیمت کے ساتھ اس کو (جنگ سے) لوٹا دوں گا یا جنت میں داخل کر دوں گا۔ بخاری و مسلم۔

حضرت ابوہریرہؓ کی دوسری روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے (دن کو) روزہ رکھنے والا (رات کو) عبادت میں کھڑا رہنے والا خشوع خضوع سے اللہ کا کلام پڑھنے والا کہ نہ روزہ سے تھکتا ہے نہ نماز سے (یعنی سستی نہیں کرتا) مجاہد کی یہ حالت اس وقت تک رہتی ہے کہ جہاد سے لوٹ آئے۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ اللہ اس کو مال غنیمت اور ثواب آخرت کے ساتھ لوٹا دے۔ یا اس کو شہادت عطا کرے اور جنت میں داخل فرمادے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ

اور تمہارے پاس کیا عذر ہے کہ تم جہاد نہ کرو اللہ کی راہ میں اور ان کمزوروں کی خاطر جن میں کچھ (کمزور) مرد ہیں اور کچھ عورتیں اور کچھ بچے۔ استفہام انکاری ہے یعنی ترک جہاد کی کوئی وجہ موجود نہیں۔ اَلْمُسْتَضْعَفِیْنَ کا عطف لفظ اللہ پر ہے یا لفظ سبیل پر۔ مراد یہ ہے کہ (مکہ میں) جو کمزور مسلمان رہ گئے ہیں ان کو مشرکوں کے پنجے سے رہا کرانے کے لئے جہاد نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اَلْمُسْتَضْعَفِیْنَ کا نصب اختصاص کی وجہ سے ہو یوں تو سَبِیْلِ اللّٰہِ کا لفظ ہر خیر اور نیکی کو شامل ہے مگر کمزور مسلمانوں کی رہائی کا درجہ سب سے بڑا ہے اس لئے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کیا۔

الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا جو (دعا کرتے ہیں اور) کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم کو اس بستی (یعنی مکہ) سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں۔

الظالم اھلھا۔ القریۃ کی صفت ہے لیکن اھلھا چونکہ الظالم کا فاعل ہے اس لئے الظالم کو مذکر لایا گیا۔

وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ﴿۷۵﴾ اور ہمارے لئے غیب سے کسی دوست کو کھڑا کر دے اور ہمارے لئے غیب سے کسی حامی کو بھیج دے یعنی کوئی ہمارا سرپرست اور مددگار بنادے جو مشرکوں سے ہماری حفاظت کر سکے۔[۱]

اللہ تعالیٰ نے ان ضعیفوں کی دعا قبول فرمائی اور مکہ کی فتح عنایت کر دی رسول اللہ ﷺ نے فتح کے بعد حضرت عتابؓ بن اسید کو مکہ کا حاکم مقرر کر دیا جو مظلوموں کے حامی اور منصف تھے۔

اَلَّذِينَ اٰمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ۚ جو مومن ہیں وہ اللہ کی راہ میں (یعنی اللہ کی اطاعت کی راہ میں) لڑتے ہیں (اللہ کی اطاعت ہی ایسا راستہ ہے جس پر چل کر مومن اللہ تک پہنچتا ہے)۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ اور جو کافر ہیں وہ شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں یعنی شیطان کی اطاعت کی راہ میں لڑتے ہیں جو ان کو شیطان سے ملا دیتی اور طبقات جہنم میں پہنچا دینے والی ہے۔

فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ ۚ پس اے مسلمانو! تم شیطان کی فوج (یعنی کافروں) سے لڑو۔ اس سے آگے جرات دلاتے ہوئے فرمایا۔

إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا ﴿۷۶﴾ درحقیقت شیطان کا فریب کمزور ہے سوائے دل میں وسوسہ پیدا کرنے کے وہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ بدر کی لڑائی کے دن اس نے کافروں سے کہا تھا۔ میں تمہارا پشت پناہ ہوں آج تم پر کوئی شخص غالب نہیں آسکتا لیکن فرشتوں (کے لشکر) کو دیکھ کر بھاگ پڑا اور سب کو بے مدد چھوڑ گیا اور ایڑیوں کے بل پلٹ کر کہنے لگا، میرا تمہارا کوئی تعلق نہیں مجھ کو وہ چیز نظر آرہی ہے جو تم کو نظر نہیں آتی مجھے اللہ سے ڈر لگتا ہے۔ اللہ کی مار بہت سخت ہے۔

نسائی اور حاکم نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ ہجرت سے پہلے جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں تشریف فرما تھے تو حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور کچھ دوسرے صحابیوں نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا نبی اللہ ﷺ ہم مشرک ہونے کی حالت میں تو عزت والے تھے جب سے مسلمان ہوئے ذلیل ہو گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا مجھے (ظالم کافروں کو) معاف کر دینے کا حکم دیا گیا ہے اس لئے تم (کافروں سے) لڑائی نہ کرو ہجرت کے بعد جب اللہ نے حضور ﷺ کو مدینہ منتقل فرما دیا تو اس وقت کافروں سے لڑنے کا حکم دے دیا مگر اس وقت لوگ پست ہمت ہو گئے اور لڑائی سے انہوں نے ہاتھ روک لئے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا کہ ان سے کہا گیا تھا اپنے ہاتھوں کو تھامے رہو۔ یہ تعجب آفریں سوال ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ جب قتال نہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا تو سب قتال کے درپے تھے اور جب جہاد کا حکم دیا گیا تو ایک گروہ بیٹھ رہا اور کافروں سے ڈرنے لگا۔

ہاتھ روک لینے کا حکم بتا رہا ہے کہ جن کو حکم دیا گیا تھا وہ لڑائی کے درپے تھے۔ اَلَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ سے بر قول کلبی حسب نقل بغوی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری، حضرت مقداد بن اسود کندی، حضرت قدامہ بن مظعون جمحی سعدؓ بن ابی وقاص اور صحابہؓ کی وہ جماعت ہے جو مکہ میں کافروں کے ہاتھوں بہت دکھ اٹھا رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ سے انہوں نے عرض کیا تھا کہ ہم کو کافروں سے لڑنے کی اجازت دیدیجئے کافر ہم کو ستاتے ہیں مگر حضور ﷺ فرماتے تھے اپنے ہاتھ روکے رکھو۔ مجھے ان سے لڑنے کا حکم ابھی نہیں دیا گیا ہے۔

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ۚ اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔ اور جو کچھ تم کو حکم دیا گیا ہے اس کی تعمیل میں مشغول رہو۔ اس آیت میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ اپنے قلب اور نفس کی حالت کو درست کرنے کے لئے نفس سے جہاد کرنا، کافروں سے جہاد کرنے سے افضل ہے کیونکہ اول جہاد کا مقصد ہے اپنے نفس کی اصلاح اور دوسرے جہاد کی غرض ہے

[۱] حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ میں اور میری والدہ بھی مستضعفین میں سے تھے، بخاری (از مفسرؒ)

کافروں کی اصلاح اور دنیا کو بگاڑ سے خالی کر دینا اور ظاہر ہے کہ اپنی ذات کو بگاڑ سے بچانا دوسروں کو خرابی سے بچانے پر مقدم ہے) اسی لئے اللہ تعالیٰ نے جہاد نفس کو فرض عین اور جہاد کفار کو فرض کفایہ قرار دیا ہے۔

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ پھر جب (مدینہ کو ہجرت ہو گئی اور) ان پر (مشرکوں سے) جہاد کرنا فرض کر دیا گیا تو بعض لوگوں پر اس کی تعمیل دشوار ہو گئی اور پست ہمت ہو بیٹھے اور

إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ یکدم ان (طلب گاران جہاد) میں سے ایک گروہ لوگوں سے ایسا ڈرنے لگا جیسا اللہ سے ڈرنا چاہئے تھا۔ خشیۃ اللہ میں مصدر کی اضافت مفعول کی جانب ہے۔ یا یخشون کے فاعل سے کخشیۃ اللہ حال ہے یعنی خوف خدا رکھنے والوں کی طرح ہوتے ہوئے وہ لوگوں سے ڈرتے ہیں۔

أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً یا اس سے بھی زیادہ ڈرنے والے۔ اگر خشیۃ اللہ کو حال قرار دیا جائے تو معنی اس طرح ہو گا وہ لوگوں سے ڈرتے ہیں حالانکہ وہ اللہ کا خوف رکھنے والوں سے بھی زیادہ خشیۃ رکھنے والے ہیں۔ لیکن اگر کخشیۃ اللہ کو بجائے مفعول مطلق کے مانا جائے تو اس وقت اشد کا عطف کخشیۃ اللہ پر نہ ہو گا بلکہ لفظ اللہ پر عطف ہو گا یعنی ان کا انسانوں سے خوف اللہ کے خوف کی طرح ہے یا اللہ کے خوف سے بھی زیادہ۔ اس فقرہ میں لفظ اَوْ شک کے لئے نہیں ہے بلکہ تخییر کے لئے ہے یعنی جس قدر وہ انسانوں سے ڈرتے ہیں اس کو اگر خوف خدا کی طرح کہا جائے تب بھی ٹھیک ہے اور خوف خدا سے زائد کہا جائے تب بھی درست ہے کلام کا حقیقی معنی مراد نہیں ہے کیونکہ خدا سے زیادہ بندوں سے خوف کرنا اگر واقعۃً ہو تو کفر ہے بلکہ ارتکاب معصیت کی بناء کبھی عذاب کی طرف سے غفلت اور مغفرت کی طمع ہوتی ہے باوجودیکہ یقین ہوتا ہے کہ انسانوں کا عذاب اللہ کے عذاب سے زیادہ تکلیف دہ نہیں ہوتا۔ پس آیت میں مجازی معنی مراد ہے جب بزدلی اور پستی ہمت کی وجہ سے لوگ جہاد سے بیٹھ رہے اور حکم جہاد کی تعمیل چستی کے ساتھ نہیں کی تو اللہ نے فرمادیا یہ لوگ اللہ سے زیادہ بندوں سے ڈرتے ہیں۔

آیت کے ظاہری مفہوم کی وجہ سے خوارج نے مرتکب کبیرہ کو کافر قرار دیا ہے کیونکہ آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ جہاد سے بیٹھ رہنے والے اللہ سے زیادہ بندوں سے ڈرتے ہیں اور یہ کفر ہے۔

خارجیوں نے اپنے دعوے کی ایک عقلی دلیل بھی بیان کی ہے کہ سمجھدار آدمی کو جب کسی سوراخ کے اندر سانپ کے موجود ہونے کا یقین ہوتا ہے تو ہرگز اس کے اندر انگلی نہیں ڈالتا اگر انگلی ڈال دے تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کو سانپ کے موجود ہونے اور کاٹ کھانے کا یقین ہی نہیں ہے (یا یہ پاگل اور بے شعور ہے) مرتکب کبیرہ کی بھی یہی حالت ہوتی ہے گناہ کبیرہ کرنا بتا رہا ہے کہ آیات عذاب پر اس کو یقین نہیں اگر یقین ہوتا تو گناہ نہ کرتا۔

ہماری توضیح سے اس دلیل کا ابطال ہو جاتا ہے (سوراخ کے اندر سمجھدار آدمی کا انگلی ڈالنا کبھی اس وجہ سے بھی ہوتا ہے کہ سانپ کی موجودگی کا یقین ہونے کے باوجود اس کوڈسے جانے کی امید نہیں ہوتی۔ نفس کی غفلت ذہن کا ذہول اور امید کی غلطی بھی تو کوئی چیز ہے۔

غفلت، ذہول اور طمع خام عدم تیقن پر دلالت نہیں کرتی۔

وَقَالُوا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ اور یوں کہنے لگے اے ہمارے رب تو نے ہم پر جہاد کیوں فرض کر دیا۔

لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ہم کو اور تھوڑی مدت مہلت دے دی ہوتی۔

یعنی دنیا میں (طبعی) موت تک رہنے کی تو نے مہلت دی ہوتی۔ کہ ہم اپنے بستروں پر مرتے۔ میدان جہاد میں نہ مارے جاتے۔ دونوں جملوں کے درمیان حرف عطف نہیں لایا گیا اس سے معلوم ہوا کہ کبھی وہ ایک بات کہتے تھے کبھی دوسری۔

سوال کی غرض یہ نہیں کہ جہاد کی علت بیان کی جائے حکمت جہاد تو معلوم ہی تھی بلکہ سوال سے مقصود ہے تمنا کو ظاہر کرنا اور تاخیر جہاد کی خواہش کرنا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے اپنے دلوں میں ہی یہ خواہش و تمنا کی ہو زبانوں سے اظہار نہ کیا ہو

اور اندرونی تمنا کو اللہ نے بیان فرمادیا۔

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ آپ کہہ دیں کہ منافع آخرت کے مقابلہ میں دنیوی منفعت اور فائدہ اندوزی تھوڑی سی ہے پھر جلد ختم ہونے والی بھی ہے ایسی حالت میں زیادتی عمر کی تمنا بے سود ہے کیونکہ بالفرض اگر عمر لمبی بھی ہو گئی تو کیا حاصل۔

وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى قف اور آخرت (کا ثواب شرک اور گناہ سے) بچنے والے کے لئے (دنیا کے ثواب سے) بہتر (اور پائیدار) ہے لہٰذا حکم جہاد کی تعمیل میں سستی کرنے اور بیٹھ رہنے سے پرہیز کرنا چاہئے تاکہ ثواب آخرت کی طلب میں زیادتی ہو۔ گویا یہ جملہ لِمَ كَتَبْتَ کے سوال کا جواب ہے یعنی ہم نے تم پر جہاد اس لئے فرض کیا ہے کہ آخرت میں تم کو ثواب زیادہ دیا جائے۔ یہ تشریح اس صورت میں ہو گی کہ لِمَ كَتَبْتَ کو جملہ سوالیہ قرار دیا جائے جس میں جہاد کے فرض ہونے کی حکمت اور مصلحت دریافت کی گئی ہے۔

وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝ اور تمہاری حق تلفی ذرہ بھر نہ ہو گی یعنی تمہارے ثواب میں ادنیٰ ترین کمی بھی نہیں کی جائے گی۔ یا یہ مطلب ہے کہ تمہاری عمر جتنی مقدر ہو چکی ہے اس میں جہاد سے کوئی کمی نہیں ہو گی۔

شہداء کے متعلق منافقوں نے کہا تھا کہ اگر وہ لوگ ہمارے ساتھی ہوتے اور ہمارے ساتھ راستہ سے لوٹ آتے) تو نہ مرتے نہ مارے جاتے اس کی تردید میں آیت ذیل نازل ہوئی۔

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا تم جہاں کہیں ہو۔ اَيْنَ (اسم ظرف مکان) کے اندر شرط کا معنی ہے اور معنی شرط کی تاکید کے لئے لفظ ما ذکر کیا گیا ہے۔

يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ تم کو موت پہنچے گی۔

وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ خواہ تم اونچی کوٹھیوں یا قلعوں میں ہو۔ قتادہؒ نے بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ کا ترجمہ مضبوط محلات کیا ہے اور عکرمہ نے چونے اور مصالحہ سے جڑا ہوا ترجمہ کیا ہے۔

اس جگہ اس آیت کو ذکر کرنے سے آیت لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ کے جواب کی طرف اشارہ ہے یعنی جہاد سے موت قریب نہیں آجاتی نہ احتیاط موت مقدرہ کو دور کر سکتی ہے حکم تقدیری لوٹایا نہیں جا سکتا۔

جب رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تشریف فرما ہوئے تو یہودیوں اور منافقوں نے کہا جب سے یہ شخص اور اس کے ساتھی یہاں آئے ہیں ہمارے پھلوں اور کھیتوں میں برابر نقصان ہوتا چلا جاتا ہے (یہ ان لوگوں کی نحوست ہے) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ اور اگر ان کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ خدادادہے یعنی ارزانی اور ان کے مال کی کثرت ہوتی ہے تو یہودی اور منافق کہتے ہیں یہ ہمارے لئے خدا کی طرف سے (مقدر) ہے (یعنی ہماری صلاحیت اور قابلیت کی وجہ سے اللہ نے ہم کو مال کی کثرت اور رزق کی وسعت دی ہے۔ مترجم)۔

وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ اور اگر ان کو کوئی برائی (قحط یا مصیبت) پہنچتی ہے۔

يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ تو کہتے ہیں یہ تیری نحوست کی وجہ سے ہے اگرچہ فاعل اس کا بھی اللہ ہی ہے۔

قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اے محمد ﷺ! آپ کہہ دیں بھلائی برائی سب اللہ کی طرف سے ہے۔ [1]

یعنی اللہ نے اپنے ارادہ سے بطور مہربانی بھلائی (کسی کے لئے) پیدا کی اور (کسی کے لئے) بطور انتقام اپنی مصلحت کے مطابق برائی مقرر کر دی، کسی شخص سے انتقام دوسرے کی نحوست کی وجہ سے نہیں ہو سکتا لہٰذا منافقوں اور یہودیوں کا یہ خیال کہ رسول اللہ ﷺ کی نحوست کی وجہ سے وہ مبتلائے مصیبت ہوئے اور اپنے کفر و معاصی کا خیال نہ کرنا سراسر غلط ہے۔

---

[1] اس تشریحی ترجمہ پر کل کی تنوین مضاف الیہ محذوف کی جگہ مانی جائے گی یعنی ہر بھلائی برائی اللہ کی طرف سے ہے۔

فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ پس اس قوم یعنی کافروں کو کیا ہو گیا ہے۔
لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا که بات سمجھ بھی نہیں سکتے یعنی سمجھنا تو درکنار سمجھنے کے قریب بھی نہیں ہیں۔ حَدِيْثًا سے مراد ہے قرآن مجید کیونکہ اگر قرآن پر وہ غور کرتے اور سمجھتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ خیر و شر سب اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور ایک کے عمل پر خدا دوسرے کو عذاب نہیں دیتا۔

یا حدیث سے مراد ہے بات یعنی چوپایوں کی طرح یہ لوگ بات بھی نہیں سمجھتے۔ یا نئی پیدا ہونے والی چیز مراد ہے یعنی وہ غور نہیں کرتے کہ ان کے اعمال نیک ہیں کہ مستحق انعام ہوں یا برے ہیں کہ سزاوار عذاب ہوں۔

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ تجھے جو بھلائی ملتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ یہ ہر انسان کو خطاب ہے۔ یعنی انسان کو جو بھلائی پہنچتی ہے وہ محض اللہ کی مہربانی سے پہنچتی ہے انسان کا کوئی استحقاق نہیں۔ نہ خدا پر بھلائی دینا لازم ہے کیونکہ انسان جو طاعت بھی کرتا ہے اگر ہم فرض کرلیں کہ وہ بالکل معصیت سے پاک ہے اور ساری عمر انسان اسی میں مشغول رہے اور وہ قابل قبول بھی ہے پھر بھی وہ پیدا کی ہوئی تو خدا ہی کی ہے اسی کے کرم کا نتیجہ ہے اللہ ہی نے تو اس کو ناپسندیدہ اعمال سے محفوظ رکھا اور پسندیدہ کاموں کی توفیق دی اور نیک کام کی توفیق دینا محض اس کی عنایت ہے پھر نیکی کرنے سے دنیا یا آخرت کے ثواب کا استحقاق کیسے پیدا ہو سکتا ہے اس کے علاوہ بجائے خود وجود اور لوازم وجود خواہ ان پر صدور طاعت کا مدار ہو یا نہ ہو اللہ ہی کی اتھاہ نعمت ہے طاعت سے تو اس کا شکر بھی ادا نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ استحقاق ثواب پیدا ہو سکے[1] اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ کوئی شخص بغیر اللہ کی رحمت کے جنت میں نہیں جا سکے گا۔ عرض کیا گیا کیا آپ بھی: فرمایا نہ میں۔ بخاری و مسلم۔ از روایت ابوہریرہؓ۔

وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ اور اے انسان تجھے جو برائی یعنی مصیبت پہنچتی ہے وہ تیری طرف سے ہے۔ تیرے بعض گناہوں کی سزا اور بدلہ ہے۔ دوسرے کی نحوست کو اس میں دخل نہیں ہے بلکہ یہ مصیبت تیرے نفس کی نحوست کا ہی نتیجہ ہوتی ہے۔ اگر انسان کافر ہوتا ہے تو اس پر پڑنے والی مصیبت، عذاب آخرت کا دنیا میں اس کے لئے ایک نمونہ بن جاتی ہے اور مومن پر واقع ہونے والی مصیبت اس کے کچھ گناہوں کا کفارہ اور بلندی درجات آخرت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو مصیبت مسلمان پر آتی ہے اللہ تعالیٰ اس کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے یہاں تک کہ جو کانٹا بھی چبھتا ہے (وہ گناہوں کی سزا کی تخفیف کا ذریعہ ہو جاتا ہے) متفق علیہ۔

حضرت ابوسعیدؓ خدری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو دکھ یا بیماری (مسلمان پر آتی) ہے یہاں تک کہ جو کانٹا بھی چبھتا ہے اللہ اس کے ذریعہ سے گناہوں کا اتار کر دیتا ہے۔ متفق علیہ۔

حضرت ابوموسیٰؓ اشعری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ کو جو ٹھوکر لگتی ہے یا اس سے کم و بیش مصیبت آتی ہے وہ گناہ کی وجہ سے آتی ہے اور جتنے حصہ گناہ کو اللہ معاف کر دیتا ہے وہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ترمذی

رسول اللہ ﷺ کی طرف جو منافق و کافر مصائب کی نسبت کرتے تھے ان کے قول کا جواب اس آیت سے ہو گیا۔

وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا اور لوگوں کے لئے ہم نے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ رَسُوْلًا یا مفعول مطلق ہے (اگر اس کو مصدر کہا جائے جیسے قبول دبور) یا حال ہے (اگر رسولاً کو صفت کا صیغہ قرار دیا جائے) بہرحال اگر للناس کو ارسلنا سے متعلق کیا جائے گا تو رسولاً محض تاکید فعل کے لئے ہوگا اور اگر رسولا سے متعلق کیا جائے گا تو تعمیم کا

---

[1] مطلب یہ ہے کہ انسان کی زندگی اور بقاء زندگی محض خداداد ہے، ظاہر ہے کہ اس میں کسی کے عملی استحقاق کو دخل نہیں پھر زندگی کو طاعت میں لگا دینا بھی اللہ کی توفیق پر موقوف ہے اور یہ توفیق بھی بلا استحقاق ہے اس لئے انسان اگر ساری عمر خالص نیکی کرے تو نعمت الٰہی کا شکر بھی ادا نہ ہو گا۔

مفہوم پیدا ہو جائے گا یعنی سب لوگوں کے لئے رسول بنا کر ہم نے آپ کو بھیجا ہے جیسے دوسری آیت میں آیا ہے وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ خلاصہ مضمون کافروں کے خیال کی تردید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کافر تو رسول اللہ ﷺ کی طرف نحوست کی نسبت کرتے ہیں حالانکہ آپ اللہ کے رسولؐ ہیں تمام لوگوں کے لئے ہمہ گیر رحمت بنا کر آپ کو بھیجا گیا ہے۔ البتہ کفار اس رحمت سے محروم ہیں اور دنیوی و اخروی عذاب میں اپنے اعمال کی نحوست کی وجہ سے مبتلا ہیں اور رسول کی اطاعت نہ کرنا اس مصیبت کا اصل سبب ہے۔

وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۷۹﴾ اور اللہ تعالیٰ شہادت دینے کے لئے کافی ہے وہی دنیا میں آپ کو معجزات عطا فرما کر آپؐ کی رسالت کی شہادت دے رہا ہے اور قیامت کے دن جھگڑے کے وقت وہی شہادت دے گا کہ رسول اللہ ﷺ حق پر تھے اور کفار گمراہ تھے)۔

قیامت کے دن اللہ کی شہادت کافروں کو لاجواب بنانے اور مستحق عذاب قرار دینے کے لئے ہو گی اس روز حکومت (ظاہری اور حقیقی سب) اسی کی ہو گی وہی اپنے علم کے مطابق فیصلہ کر دے گا کسی دوسرے کی شہادت کی ضرورت نہ ہو گی (اسی کی شہادت کافی ہو گی) بغوی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے جس نے میری اطاعت کی اس نے در حقیقت اللہ کی اطاعت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی اس نے بلاشک اللہ تعالیٰ سے محبت کی اس پر بعض منافق کہنے لگے یہ شخص تو بس ہم سے یہ چاہتا ہے کہ جس طرح عیسائیوں نے مسیح ابن مریمؑ کو رب بنا لیا تھا اسی طرح ہم بھی اس کو اپنا رب بنا لیں اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ جو رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ حقیقت میں اللہ کی اطاعت کرتا ہے کیونکہ رسول تو صرف حکم پہنچانے والے ہیں حکم دینے والا تو اللہ ہی ہے۔

وَمَنْ تَوَلّٰى اور جو اطاعت سے روگردانی کرتا ہے اس کی آپ پرواہ نہ کریں اور کوئی فکر نہ کریں۔

فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿۸۰﴾ کیونکہ (اے محمد ﷺ) ہم نے آپ ﷺ کو ان کا کنٹرولر بنا کر نہیں بھیجا۔ آپ کی ذمہ داری تو صرف پہنچانے کی ہے حساب فہمی ہمارا کام ہے ان کے اعمال کی نگرانی اور کنٹرولنگ آپ کے ذمہ نہیں۔

وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ز اور (جب آپ ان کو کوئی حکم دیتے ہیں تو) وہ کہتے ہیں (ہمارا تو کام ہی) اطاعت ہے۔ طَاعَةٌ حقیقت میں مفعول تھا دوام اور ثبات کا مفہوم ظاہر کرنے کے لئے بصورت خبر ذکر کیا (کیونکہ جملہ فعلیہ اقتران زمانی کی وجہ سے حدوث پر دلالت کرتا ہے اور جملہ اسمیہ زمانہ پر دلالت نہ کرنے کی وجہ سے عام کا مفہوم ظاہر کرتا ہے۔ جملہ فعلیہ سے جملہ اسمیہ کی طرف رجوع اسی غرض سے کیا جاتا ہے)۔

فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ پھر جب آپؐ کے پاس سے نکل کر جاتے ہیں تو

بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۭ ان میں کی ایک جماعت رات کو مشورہ کرتی ہے اس کے خلاف جو (آپ کے سامنے) کہا تھا۔ قتادہ اور کلبی نے کہا کہ تبییت (بروزن تفصیل) کا معنی ہے بدل ڈالنا اس لئے بیت (صیغہ ماضی) کا ترجمہ ہوا بدل ڈالتی ہے۔

اخفش نے کہا بیت کا ترجمہ ہے اندازہ کرتی ہے منصوبہ بنا لیتی ہے، اگر کوئی منصوبہ بنا لے تو عرب کہتے ہیں بیت فلان۔ گویا اس محاورہ کا اصل ماخذ بیت شعر یا بیت مبنی (بنا یا ہوا مکان) ہے (جس طرح شاعر کسی مضمون کو چند موزوں الفاظ ملا کر ادا کرتا ہے یا کوئی شخص مختلف لکڑی لوہا اینٹ مصالحہ جمع کر کے مکان بناتا ہے اور اس کو بیت کہا جاتا ہے) اسی مناسبت سے مشورہ کے بعد منصوبہ قائم کرنے کو تبییت کہا جاتا ہے۔ ابو عبیدہؒ اور قتیبی نے کہا اس کا ماخذ بیتوتت (شب گزاری) ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رات کو مشورہ کر کے وہ بات طے کرتے ہیں جو دن میں کئے ہوئے وعدہ کے خلاف ہوتی ہے۔

تقول کی ضمیر طَآئِفَةٌ کی طرف راجع ہے (مذکورہ بالا مطلب اسی تقدیر پر ہو گا) لیکن ہو سکتا ہے کہ غائب مونث کی

ضمیر نہ ہو بلکہ) رسول اللہ ﷺ کو خطاب ہو یعنی آپ نے جوان کو حکم دیا تھا اور وعدہ لیا تھا اس کے خلاف مشورہ کرتے ہیں۔

وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ اور اللہ لکھتا رہتا ہے جو کچھ وہ راتوں کو مشورہ کرتے ہیں۔ یعنی اللہ کی طرف سے اعمالنامے لکھنے والے فرشتے اللہ کے حکم سے لکھتے رہتے ہیں۔ تاکہ ان کو ان کے کئے کی پوری پوری سزا دی جائے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ ان کے مشورۂ شبینہ کو اس وحی کے اندر مندرج کرلیتا ہے جو آپ کے پاس بھیجی جاتی ہے تاکہ ان کے اندرونی اسرار کی آپ کو اطلاع ہو جائے۔

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ پس آپ ان سے الگ رہیں ان کی پرواہ نہ کریں یا یہ مطلب ہے کہ آپ ان پر غصہ نہ کریں اور ان کے نام ظاہر نہ کریں۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اور (تمام امور میں خصوصاً ان کے معاملہ میں) اللہ پر بھروسہ رکھیں۔

وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۸۱﴾ اور اللہ کی کارسازی و ذمہ داری کافی ہے۔ اگر اپنے معاملات اللہ کے سپرد کردیں گے تو وہی آپ کی طرف سے ان سے بدلہ لے لے گا اور وہ آپ کا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ پھر کیا یہ قرآن پر غور نہیں کرتے۔ یعنی منافق کیا قرآن کی عبارت اور مضامین پر غور نہیں کرتے اور قرآن کے اندر جو عجائب و غرائب ہیں ان کو نہیں سمجھتے کہ کلام اللہ ہونا اور انسانی کلام نہ ہونا ان پر واضح ہو جاتا اور ان کو ایمان حاصل ہو جاتا اور یہ نفاق ترک کردیتے۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ کا لفظ بتا رہا ہے کہ (شرعاً) مسائل شریعت میں قیاس سے کام لینا جائز ہے۔

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾ اور اگر قرآن اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں یہ بکثرت تفاوت پاتے۔ یعنی معنی میں تناقض اور عبارت میں تفاوت ہوتا کچھ حصہ فصیح ہوتا کچھ رکیک کسی حصہ کا مقابلہ دشوار ہوتا اور کسی کا آسان۔ مستقبل کے متعلق اس کی پیش گوئی کوئی صحیح ہوتی کوئی غلط کیونکہ انسان کا علم ناقص ہے ہمہ گیر نہیں ہے۔

یہاں یہ شبہ نہ کرنا چاہئے کہ قرآن کے اندر بعض احکام منسوخ ہیں اور بعض ناسخ ہیں۔ یہ تفاوت و تناقض تو موجود ہے۔ کیونکہ حقیقت میں نسخ نہ اختلاف ہے نہ تناقض معنی۔ نسخ کا معنی تو یہ ہے کہ حکم سابق ایک خاص مدت کے لئے تھا (جس کی تعیین اللہ کو معلوم تھی ہم کو معلوم نہ تھی) وہ مدت پوری ہونے اور حال و زمان بدلنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس حکم کی مدت ختم ہو جانے کا اظہار فرما دیا۔ واللہ اعلم۔

بغوی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ملک کے اندر اور باہر مختلف اطراف میں کچھ فوجی دستے بھیجتے تھے۔ وہ پہنچ کر غالب ہوتے یا مغلوب بہرحال منافق ان کی خبریں قبل از وقت معلوم کرنے کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے اور پتہ لگتے ہی رسول اللہ ﷺ کے بیان کرنے سے پہلے بیان کرنا شروع کردیتے تاکہ شکست کی خبریں سنا کر اہل ایمان کے دلوں میں ضعف پیدا کردیں۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ کچھ کمزور رائے رکھنے والے مسلمانوں کو جب فوجی دستوں کی کوئی اچھی بری اطلاع ملتی یا رسول اللہ ﷺ وحی سے اطلاع پاکر فتح یابی کے وعدہ کا یا تخویف کا اظہار فرما دیتے تو یہ ضعیف الرائے طبقہ اس کی اشاعت کردیتا اور اس اشاعت سے کام بگڑ جاتا اگر دشمن کو امن کی اطلاع ملتی تو وہ اپنے تحفظ کی کوشش کرنے لگتے اور خوف کی خبر ملتی تو جنگ و جدال اور فساد کی طرف دوڑتے، اس پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اور جب ان کو یعنی منافقوں یا کمزور رائے رکھنے والے مسلمانوں کو

اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ امن کی کوئی خبر مل جاتی ہے یعنی فتح و سلامتی کی اطلاع ہو جاتی ہے۔

اَوِ الْخَوْفِ یا خوف یعنی شکست و ہزیمت کی

اَذَاعُوْا بِهٖ تو اس کو پھیلا دیتے ہیں۔

وَلَوْ رَدُّوْهُ إِلَى الرَّسُوْلِ وَإِلٰٓى أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ اور اگر وہ اس خبر کو رسول ﷺ کے اور جو ان میں ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان کے حوالہ پر رکھتے۔ یعنی عقلمند صحابہؓ جیسے حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ وغیر ہم کی طرف رجوع کرتے۔ چونکہ یہ جلیل القدر صحابہؓ معاملات میں بصیرت رکھتے تھے اس لئے ان کو اولی الامر فرمایا یا یہ وجہ کہ اکثر اوقات انہی میں سے امیر بنائے جاتے تھے یا یوں کہا جائے کہ لوگوں کو کوئی حکم دینے سے پہلے رسول اللہ ﷺ ان سے مشورہ لے لیا کرتے تھے یا اولی الامر کہنے کی یہ وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو ان کی اقتداء کرنے کا حکم دیدیا تھا۔ ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ (زمین والوں میں سے) میرے دووزیر ابو بکرؓ و عمرؓ ہیں۔ رواہ الترمذی۔ حضرت ابو سعیدؓ خدری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان دونوں کی اقتداء کرو جو میرے بعد ہوں گے ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما۔ رواہ الترمذی۔

لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ تو اس کو وہ لوگ تو پہچان ہی لیتے جو ان میں اس کی تحقیق کر لیا کرتے۔ اِستِنبَاط کا معنی ہے نکال لینا استنبط الما پانی نکال لیا یعنی شائع کرنا یا چھپانا جو بھی مناسب ہوتا وہ لوگ غور کرنے کے بعد ویسا کرتے۔ اَلَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ سے مراد ہیں رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے دانشور صحابی۔

علم یہاں ایک ہی مفعول چاہتا ہے کیونکہ اس جگہ علم (جاننے) کا معنی ہے معرفت یعنی پہچاننا اور سمجھنا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ خبر کے معاملہ کو اہل دانش یعنی رسول اللہ ﷺ اور جلیل القدر صحابہؓ کے سپرد کر دیتے تو وہ اہل الرائے نتیجۂ خبر کو پہچان لیتے کہ اس کو پھیلانا مناسب ہے یا چھپانا۔ یا استنباط کرنے والوں سے مراد ہیں خبر کی اشاعت کرنے والے اس وقت مِنْهُمْ اَلَّذِيْنَ سے حال نہ ہوگا بلکہ فعل کا صلہ ہوگا۔ مطلب اس طرح ہوگا کہ اشاعت خبر کرنے والے جو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہؓ سے استنباط علم کرتے ہیں جان لیتے کہ خبر کی اشاعت مناسب ہے یا اخفاء۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ اور تم پر اگر اللہ کا فضل ورحمت نہ ہوتی۔ فضل ورحمت سے مراد ہے مخصوص فضل ورحمت کیونکہ اضافت عہدی ہے یعنی پیغمبر کو بھیجنے اور کتاب کو نازل کرنے کی شکل میں جو اللہ کا فضل و کرم ہے اگر یہ نہ ہوتا۔

لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ تو بلا شبہ (کفر و معصیت کی صورت میں) تم شیطان کی پیروی کرتے۔

اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾ مگر تھوڑے سے۔ عَلَيْكُمْ کی ضمیر مخاطب سے یہ استثناء ہے یعنی بغیر نزول قرآن وبعثت رسول کے تم سب شیطان کی پیروی کرتے۔ ہاں بعض لوگ جیسے زید بن عمرو بن نفیل اور ورقہ بن نوفل اس سے مستثنیٰ ہیں وہ خدا داد عقل سلیم اور اللہ کی طرف سے ملی ہوئی عصمت فکری کی وجہ سے (نزول کتاب و بعثت سے پہلے) اتباع شیطان سے محفوظ تھے۔ یا استثناء مفرغ ہے یعنی نزول قرآن کے بغیر تم شیطان کا اتباع کرتے مگر بعض باتوں میں نہ کرتے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ چونکہ تمہاری دانش و عقل اکثر چیزوں کی اچھائی برائی پہچاننے سے قاصر ہے اس لئے اتباع شیطان سے محفوظ رہنے کا مدار بعثت رسول اور نزول قرآن پر ہے اگر بعثت اور نزول نہ ہوتا تو تم اتباع شیطان سے محفوظ نہ رہتے اس لئے رسول ﷺ کی اجازت کے بغیر مسلمانوں کی خبریں شائع کرنے میں جلدی نہ کرو۔ مسلم نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ بن خطاب نے فرمایا جس زمانہ میں رسول اللہ ﷺ امہات المومنین سے بالکل الگ ہو کر گوشہ گیر ہو گئے تھے۔ میں مسجد میں داخل ہوا میں نے دیکھا کہ لوگ (پریشانی اور رنج میں) پتھریوں سے زمین کرید رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق دیدی۔ میں نے فوراً مسجد کے دروازہ پر کھڑے ہو کر بہت چیخ کر کہا رسول اللہ ﷺ نے بیویوں کو طلاق نہیں دی۔ اور آیت وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ الخ نازل ہوئی پس میں نے استنباط معاملہ کیا۔ واللہ اعلم

جہاد میں ٹال مٹول کرنے والوں کے بزدلانہ مقولہ کا ذکر اوپر ہو چکا اب مندرجہ ذیل آیت میں رسول اللہ ﷺ کو جہاد کا حکم دیا جاتا ہے خواہ آپ تنہا ہی ہوں کوئی بھی ساتھ نہ دے اور نصرت کا وعدہ کیا گیا ہے خواہ سب بیٹھ رہیں اور رسول اللہ ﷺ تنہا رہ جائیں اور صراحت کر دی گئی ہے کہ کسی کا مدد نہ کرنا آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا ان کے فعل کا مواخذہ آپ سے نہ ہوگا۔

فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ پس آپ اللہ کی راہ میں لڑیں خواہ سب لوگ بیٹھ رہیں کوئی آپ کا ساتھ نہ دے۔
لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ آپ مکلف صرف اپنی ذات کے ہیں دوسروں کی مخالفت اور مدد سے بیٹھ رہنا آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ؎ بغوی نے لکھا ہے کہ غزوہ احد کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان سے وعدہ کر لیا تھا کہ ماہ ذیقعدہ میں بدر صغریٰ پر دونوں فریقوں کا پھر مقابلہ ہوگا۔ جب وقت مقرر آیا تو رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی مگر بعض لوگوں نے اس دعوت کو قبول نہیں کیا اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، نقلہ ابن جریر عن ابن عباسؓ
وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ اور مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کیجئے (آپ کی ذمہ داری صرف پہنچانے اور ترغیب دینے کی ہے)۔
عَسَى اللَّهُ أَن يَكُفَّ بَأْسَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ امید رکھو کہ اللہ کافروں کی جنگ کو روک دے گا (یعنی کافر جنگ سے باز رہیں گے مترجم) چنانچہ رسول اللہ ﷺ صرف ستر سواروں کو ساتھ لے کر بدر صغریٰ پر پہنچے اور اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کیا فَانقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ اللہ کے فضل و کرم سے بغیر کسی قسم کا دکھ اٹھائے سب لوگ (صحیح سالم) واپس آگئے (اور کافر پست ہمت ہو کر رہ گئے) پورا قصہ آل عمران میں گزر چکا ہے۔
وَاللَّهُ أَشَدُّ بَأْسًا اور اللہ بڑی طاقت اور بڑے دبدبہ والا ہے۔
وَأَشَدُّ تَنكِيلًا ﴿٨٤﴾ اور بڑا عذاب دینے والا بھی ہے یعنی قریش وغیرہ کی طرف سے جس سختی کا خطرہ اور خوف ہے اس سے زیادہ سخت اللہ کا عذاب ہے۔ اس آیت میں ان لوگوں کو دھمکی ہے جو کافروں کے خوف کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کا اتباع کرنے سے گریز کرتے تھے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ فقاتل میں فاء جوابیہ ہے یہ آیت وَمَن يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا کا جواب ہے (یعنی راہ خدا میں جو شخص لڑکر مارا جائے یا فتح یاب ہو جائے بہر حال ہم اس کو اجر عظیم عطا کریں گے لہٰذا آپ خود اللہ کی راہ میں جہاد کیجئے اور مسلمانوں کو بھی ترغیب دیجئے)۔
مَّن يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً جو اچھی شفاعت (سفارش) کرے جس میں مسلمان کے حق کی رعایت کرے مسلمان پر سے ضرر کو دفع کرے اور اس کے فائدہ کی تدبیر کرے اور یہ سب کوشش محض اللہ واسطے ہو۔
يَكُن لَّهُ نَصِيبٌ مِّنْهَا ۖ تو شفاعت کرنے والے کے لئے شفاعت (کے ثواب) کا کچھ حصہ ہوگا۔ مجاہد نے کہا اس سے باہمی سفارش مراد ہے۔ سفارشی کی سفارش اگر قبول نہ بھی کی جائے گی۔ تب بھی سفارشی کو اس کی سفارش کا ثواب ملے گا۔ رواہ ابن ابی حاتم وغیرہ عن الحسن۔

حضرت ابو موسیٰؓ اشعری راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جب کوئی شخص کچھ مانگنے یا کسی اور کام کے لئے حاضر ہوتا تو آپ ہماری طرف متوجہ ہو کر فرماتے۔ سفارش کرو۔ تم کو ثواب ملے گا اور اللہ اپنے نبی کی زبان پر جو (الفاظ) چاہے گا جاری فرمادے گا۔ مسلم و بخاری۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خیر کا راستہ بتانے والا بھی بھلائی کرنے والے کی طرح ہے۔ رواہ البزار عن ابن مسعودؓ یہ روایت طبرانی نے حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت سہل بن سعد کے حوالہ سے نقل کی ہے۔

فائدہ :- مسلمان کیلئے دعا کرنے کا شمار بھی شفاعت حسنہ میں ہے۔ حضرت ابو درداء کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب کوئی شخص اپنے بھائی کے لئے اس کے پس پشت (یعنی سامنے نہ ہونے کے وقت) دعا کرتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں اے اللہ ایسا ہی کردے اور تیرے لئے بھی ایسا ہی ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا لوگوں میں باہم صلح کرانا شفاعت

؎ ابن سعدؓ نے حضرت خالدؓ بن معدان کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، مجھے سب لوگوں کی طرف (رسول ﷺ بناکر) بھیجا گیا ہے اگر سب نہ مانیں تو میری بعثت عرب کے لئے ہوگی وہ بھی نہ مانیں تو فارس کے لئے ہوگی اور وہ بھی انکار کر دیں تو (صرف) بنی ہاشم کے لئے ہوگی اور بنی ہاشم بھی نہ مانیں تو میری رسالت تنہا میرے لئے ہوگی۔

حسنہ ہے بعض علماء نے کہا لوگوں کے درمیان اچھی بات کہنا شفاعت حسنہ ہے جس سے خیر اور ثواب کا حصول ہوتا ہے۔

وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً اور جو بری شفاعت کرے۔ جس سے مسلمان اپنے حق سے محروم ہوتا ہو۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، بری شفاعت چغلی کھاتے پھرنا ہے بعض علماء نے کہا غیبت کرنی اور لوگوں میں بری بات کہنی جس سے شر اور برائی پیدا ہوتی ہو بری شفاعت ہے۔

يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا اس کے لئے بری سفارش کے گناہ کا ایک حصہ ہوگا، حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے مومن کو قتل کرنے کی اعانت میں آدھا لفظ بھی زبان سے نکالا جب اللہ کے سامنے جائے گا تو اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لکھا ہوگا یہ اللہ کی رحمت سے محروم ہے۔ رواہ ابن ماجہ۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا اور اللہ ہر چیز پر قابو رکھتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے مُقِیت کا ترجمہ کیا۔ مقتدر (قابو والا) یہ لفظ اَقَاتَ علی الشئی سے ماخوذ ہے اقات علی الشئی کا معنی ہے اس چیز پر قابو پالیا۔ اصل مادہ قوت (روزی غذا) ہے قوت سے بھی بدن کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ مجاہدؒ نے مقیت کا ترجمہ شاہد (حاضر ناظر) کیا اور قتادہ نے نگراں بعض علماء نے کہا ہر جان دار کو روزی دینے والا مقیت ہے۔

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ اور جب تم کو کسی طرح کا سلام کیا جائے۔ تحیت حَيَّاكَ اللّٰهُ کا مصدر ہے یہ اگرچہ جملہ خبریہ ہے لیکن (انشائیہ) دعائیہ کے مواقع پر استعمال ہوتا ہے۔ عرب حیاک اللہ (اللہ تیری زندگی دراز کرے) اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ سلام کے موقع پر کہتے تھے۔ عہد اسلامی میں یہ لفظ۔ لفظ سلام سے بدل گیا اور مسلمانوں کا باہم دستور تحیت لفظ سلام ہوگیا۔ حضرت عمرانؓ بن حصین نے فرمایا ہم جاہلیت کے زمانہ میں (سلام کے موقعہ پر) کہتے تھے اَنْعَمَ اللّٰهُ بِكَ عَيْنًا اور انعم صباحا جب اسلام آیا تو ہم کو ایسا کہنے کی ممانعت کر دی گئی (اور سلام کا دستور ہوگیا) رواہ ابوداؤد۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے آدمؑ کو اپنی صورت (شکل یا صفات) پر پیدا کیا اس کے قد کی لمبائی ساٹھ ہاتھ تھی پیدا کر چکا تو فرمایا جا اس جماعت کو سلام کر فرشتوں کی جماعت (وہاں بیٹھی ہوئی تھی اور جو وہ جواب دیں اس کو سن کیونکہ وہی تیرا اور تیری نسل کا سلام ہوگا۔ حضرت آدمؑ نے جا کر (ملائکہ سے) کہا السلام علیکم فرشتوں نے جواب دیا اسلام علیک ورحمۃ اللہ۔ رحمۃ اللہ کا لفظ فرشتوں نے زیادہ کر دیا۔ بخاری ومسلم۔

فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا پس تم اس سے بہتر جواب دو یا (کم سے کم) اسی کو لوٹا دو یعنی ویسے ہی الفاظ کہہ دو امر وجوب کے لئے ہے اور لفظ او اختیار دینے کے لئے ہے لہٰذا سلام کا جواب اتنے اور ویسے ہی الفاظ میں لوٹا دینا تو واجب ہے اور رحمت وبرکت کے الفاظ بڑھا کر جواب دینا مستحب ہے۔ سلام یا جواب سلام میں جتنا اضافہ کیا جائے گا اتنا ہی ثواب زیادہ ہوگا۔

حضرت عمران بن حصین راوی ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا السلام علیکم آپؐ نے (ویسا ہی) جواب دے دیا۔ اور فرمایا دس (نیکیوں کا ثواب ہوا) وہ بیٹھ گیا پھر ایک اور شخص آیا اور اس نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ حضور ﷺ نے اس کو جواب دے کر فرمایا بیس (نیکیوں کا ثواب اس کو ملے گا) وہ بھی بیٹھ گیا اس کے بعد ایک اور شخص آیا اور اس نے اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا آپ نے اس کو جواب دے کر فرمایا تیس (نیکیوں کا ثواب ہوا) وہ بھی بیٹھ گیا۔ رواہ الترمذی وابوداؤد۔ حضرت معاذ بن انسؓ کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ پھر ایک اور شخص آیا اور اس نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ۔ حضور ﷺ نے فرمایا چالیس فضائل میں (اضافہ) اسی طرح ہوتا ہے۔

بعض علماء کا قول ہے کہ سلام کامل زیادہ سے زیادہ اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ہے (اس سے آگے کوئی اضافہ نہ ہونا چاہئے) کیونکہ روایت میں آیا ہے کہ ایک شخص نے آکر حضرت ابن عباسؓ کو سلام کیا اور کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ اور اس سے آگے بھی کچھ بڑھایا حضرت نے فرمایا سلام برکت (یعنی برکاتہ) پر ختم ہوگیا ذکرہ البغوی۔

امام احمد نے الزہد میں طبرانی نے الکبیر میں اور ابن ابی حاتم نے اور ابن مردویہ نے حضرت سلمانؓ فارسی کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا اور کہا السلام علیک آپؐ نے فرمایا وعلیک السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ پھر دوسرے نے عرض کیا۔ السلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہ آپؐ نے فرمایا وعلیک السلام اس شخص نے عرض کیا آپ نے میرا حصہ گھٹا دیا اللہ کا وہ حکم کہاں گیا۔ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا۔ حضور ﷺ نے فرمایا تو نے کوئی زیادتی باقی نہیں چھوڑی اس لئے میں نے تجھ پر وہی لوٹا دیا (جو تو نے کہا تھا) میں کہتا ہوں یہ حدیث بتا رہی ہے کہ اگر کوئی السلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہے تو اس کے جواب میں وعلیک السلام کہنا کافی ہے (بظاہر یہ آیت کے مفہوم کے خلاف ہے کیونکہ آیت میں تو کم سے کم سلام کے مثل جواب دینا واجب ہے اور اس حدیث سے اصل سلام سے گھٹا کر جواب دینے کا جواز معلوم ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ) نفس سلام میں مثل ہونا کافی ہے (باقی الفاظ میں مثل ہونا ضروری نہیں)۔

یا یوں کہا جائے کہ علیک السلام میں الف لام عہدی ہے (پس مطلب یہ ہوگا کہ جو سلام تفصیل یا اجمال کے ساتھ تو نے کیا وہی تیرے لئے ہو) اس صورت میں جواب کے اندر وہ تمام چیزیں آگئیں جو ابتدائی سلام کرنے والے کے سلام میں تھیں۔

مسئلہ :۔ سلام کا جواب فرض کفایہ ہے اگر جماعت میں سے کسی ایک نے دیدیا تو کافی ہے۔ کذافی السراجیہ۔ حضرت علیؓ کا ارشاد منقول ہے کہ ایک جماعت گزرے اور ان میں سے ایک سلام کر لے تو کافی ہے اسی طرح بیٹھی ہوئی جماعت میں سے بھی اگر ایک شخص جواب دیدے تو کافی ہے۔ ذکرہ البغوی فی المصابیح۔ موقوفاً والبیہقی فی شعب الایمان مرفوعاً۔ ابوداؤد نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ حسنؓ بن علیؓ نے اس کو مرفوعاً بیان کیا ہے۔ حسنؓ بن علیؓ ابوداؤد کے شیخ تھے۔

لیکن اگر بیٹھی ہوئی جماعت میں سے کسی شخص کا خصوصیت کے ساتھ نام لے کر آنے والا سلام کرے تو اسی شخص پر جواب دینا واجب ہے کوئی دوسرا آدمی جواب دے دے گا تو کافی نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر جماعت کو سلام کیا جائے اور کوئی بیرونی آدمی جواب دیدے تب بھی کافی نہ ہوگا۔ کذافی بیان الاحکام۔

مسئلہ :۔ اول سلام کرنا سنت ہے اور یہی افضل ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم جب تک ایمان نہ لاؤ گے جنت میں نہیں جاؤ گے اور جب تک آپس میں محبت نہ کرو گے ایمان دار نہ ہو گے کیا میں تم کو ایسی بات بتاؤں کہ اگر تم اس کو کرو گے تو تمہارے درمیان محبت ہو جائے گی اپنے آپس میں سلام (کا دستور) پھیلاؤ۔ رواہ مسلم۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اول سلام کرنے والا غرور سے پاک ہے۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ حضرت ابوامامہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ سے تعلق رکھنے والا وہ شخص ہے جو اول سلام کرے۔ رواہ احمد والترمذی وابوداؤد۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کون سا اسلام سب سے بہتر ہے یعنی خصائل اسلامی میں کون سی خصلت سب سے اچھی ہے فرمایا کھانا کھلانا اور (ہر شخص کو) سلام کرنا جان پہچان ہو یا نہ ہو۔ بخاری ومسلم۔

مسئلہ :۔ سوار پیدل کو، پیدل چلنے والا بیٹھے ہوئے کو اور تھوڑے بہت کو سلام کریں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع روایت کے یہ الفاظ صحیحین میں آئے ہیں لیکن بخاری نے اتنا اور بھی نقل کیا ہے کہ چھوٹا بڑے کو سلام کرے۔

مسئلہ :۔ لڑکوں اور عورتوں کو (بھی) سلام کیا جائے کیونکہ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ لڑکوں کی طرف سے گزرے اور ان کو سلام کیا۔ بخاری ومسلم۔ حضرت جریرؓ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ عورتوں کی طرف سے گزرے اور ان کو سلام کیا۔ رواہ احمد۔ فتاویٰ الغرائب میں مذکور ہے کہ جوان (اجنبی) عورت اور امرد (لڑکے کو سلام کرنا مکروہ ہے اور اگر یہ خود سلام کریں تو جواب دینا واجب نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں یہ حکم فتنہ کے اندیشہ کے وقت ہے۔

مسئلہ :۔ گھر والا گھر میں داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کرے۔ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے بیٹے تو اپنے گھر میں داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کر تیرے لئے اور تیرے گھر والوں کیلئے برکت ہوگی۔ رواہ الترمذی۔

مسئلہ :۔ اگر خالی گھر میں کوئی داخل ہو تو کہے اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَ فرشتے سلام کا جواب دیں گے۔ کذا فی الشرعۃ۔ اللہ نے فرمایا ہے فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰی اَنْفُسِکُمْ تَحِیَّۃً مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ مُبٰرَکَۃً طَیِّبَۃً (اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مفسرؒ کے نزدیک آیت میں بیوتا سے خالی مکان اور انفسکم سے خود اپنی ذات مراد ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ :۔ کلام کرنے سے پہلے سلام کرنا مسنون ہے۔ حضرت جابرؓ کی مرفوع حدیث ہے السلام قبل الکلام (رواہ الترمذی)۔

مسئلہ :۔ مسلمان بھائی کو ہر مرتبہ سامنا ہونے پر سلام کرنا مسنون ہے۔ اگر سلام کرنے کے بعد درخت یا دیوار کی آڑ ہو جائے اور پھر سامنا ہو جائے تو از سر نو سلام کرے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کوئی اپنے بھائی سے ملے تو اس کو سلام کرے (سلام کے بعد) اگر کسی درخت یا دیوار کی دونوں کے درمیان آڑ ہو جائے اور پھر سامنا ہو تو پھر سلام کرے۔ رواہ ابوداؤد

مسئلہ :۔ رخصت کے وقت سلام کرنا مسنون ہے۔ قتادہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم کسی گھر میں داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کرو پھر وہاں سے نکلو تو سلام کر کے رخصت ہو۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان مرسلاً۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی اگر کسی مجلس پر پہنچے تو سلام کرے پھر اگر بیٹھنا ہو تو بیٹھ جائے لیکن اٹھتے وقت پھر سلام کرے۔ اول سلام دوسرے سلام سے زیادہ ضروری نہیں ہے (یعنی اول کی طرح دوسرا سلام بھی ضروری ہے) رواہ الترمذی وابوداؤد۔

مسئلہ :۔ اگر کوئی کسی کا سلام پہنچائے تو جس کو سلام پہنچایا ہو وہ کہے عَلَیْکَ وَعَلَیْہِ السَّلَامُ غالب نے اپنے باپ کی وساطت سے دادا کا مقولہ نقل کیا ہے کہ مجھے میرے باپ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا اور کہا حضور ﷺ سے جا کر میرا سلام کہہ دیجئے (میں نے حاضر ہو کر سلام پہنچا دیا) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تجھ پر اور تیرے باپ پر سلام ہو۔ رواہ ابوداؤد۔

مسئلہ :۔ کافروں کو ابتداء سلام کرنا ناجائز ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہودیوں اور عیسائیوں کو اول سلام نہ کرو۔ اگر راستہ میں مل جائیں تو ان کو تنگ راستہ میں چلنے کے لئے مجبور کرو (یعنی خود کشادہ راستہ پر چلو) رواہ مسلم۔ اگر جماعت میں مسلمان اور بت پرست مشرک اور یہودی ملے جلے ہوں تو ان کو سلام کیا جائے۔ شیخین نے حضرت اسامہؓ بن زید کی مرفوع حدیث اس مضمون کی نقل کی ہے لیکن سلام کرتے وقت نیت مسلمان کو سلام کرنے کی ہو تا کہ کافر کو ابتدائی سلام نہ ہو۔

مسئلہ :۔ ذمی کافروں کے سلام کا جواب دینے میں کوئی ہرج نہیں مگر صرف وَعَلَیْکَ کہے، اس سے زیادہ نہ کہے کیونکہ انسؓ کی روایت سے شیخین نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم کو اہل کتاب سلام کریں تو وعلیکم کہہ دو۔ [1]

مسئلہ :۔ نماز اور خطبہ کے اندر سلام کا جواب دینا جائز نہیں۔ اگر دے دیا تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ بلند آواز سے قرآن پڑھتے وقت، حدیث نقل کرتے وقت، علمی مذاکرہ کے وقت، اذان اور اقامت کہتے وقت سلام کا جواب دینا واجب نہیں صرف جائز ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ حَسِیْبًا ﴿۸۶﴾ یقینی طور پر اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے اور بدلہ دینے والا ہے۔
مجاہدؒ نے حسیباً کا ترجمہ حفیظاً (نگراں) کیا ہے یعنی اللہ بندوں کے تمام باہمی حقوق کی حساب فہمی کرے گا جیسے سلام کرنا، چھینکنے والے کو دعا، دینا وغیرہ۔

[1] حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مخلوق خدا میں سے جو بھی تجھے سلام کرے خواہ یہودی ہو یا عیسائی یا مجوسی تو سلام کا جواب ضرور دے کیونکہ اللہ فرماتا ہے اِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّۃٍ، رواہ ابن ابی شیبۃ والبخاری فی الادب المفرد، از مفسرؒ۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کے مومن پر چھ حق ہیں اگر بیمار ہو تو اس کی بیمار پرسی کو جائے، مرجائے تو جنازہ میں شرکت کرے، دعوت کرے تو قبول کرے، ملاقات کے وقت سلام کرے، اس کو چھینک آجائے تو دعا دے، حاضر غائب اس کی خیر خواہی کرے۔ رواہ النسائی۔ ترمذی اور دارمی نے حضرت علیؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث نقل کی ہے لیکن اس روایت میں خیر خواہی کرنے کا ذکر نہیں ہے بلکہ چھٹے نمبر پر یہ ہے کہ جو بات اپنے لئے پسند کرے وہی اس کے لئے پسند کرے۔ حاصل دونوں کا ایک ہی ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ سر راہ بیٹھنے سے اجتناب کرو۔ ہم نے عرض کیا ہماری تو بیٹھکیں ہی سر راہ ہیں ہم وہاں بیٹھ کر باتیں کرنے پر مجبور ہیں فرمایا اگر وہاں بیٹھے بغیر نہیں رہ سکتے تو راستہ کا حق ادا کرو۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ راستہ کا کیا حق ہے فرمایا آنکھ نیچی رکھنا، تکلیف دہ چیز کو راستے سے ہٹا دینا۔ سلام کا جواب دینا۔ بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔ متفق علیہ۔ اسی قصہ میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آیا ہے اور راستہ بتانا۔ رواہ ابوداؤد۔ اسی قصہ میں حضرت عمرؓ کی روایت سے آیا ہے اور مصیبت زدہ کی مدد کرو اور بھٹکے ہوئے کو راستہ بتاؤ۔ رواہ ابوداؤد۔

مسئلہ :۔ سلام کی تکمیل مصافحہ اور معانقہ ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے باہم سلام کا تکملہ مصافحہ ہے۔ رواہ احمد والترمذی عن ابی امامہؓ۔

حضرت ابوذرؓ کا بیان ہے کہ جب کبھی میں رسول اللہ ﷺ سے ملا آپؐ نے مجھ سے مصافحہ ضرور کیا ایک روز حضورؐ نے مجھے بلانے کو میرے گھر کسی کو بھیجا۔ میں گھر پر موجود نہ تھا۔ گھر آکر مجھے اطلاع ملی میں فوراً خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ تخت پر تشریف فرما تھے، مجھے چمٹا لیا اور یہ معانقہ بہت ہی عمدہ اور اعلیٰ تھا۔ رواہ ابوداؤد۔

شعبی کا بیان ہے کہ جعفرؓ بن ابی طالب (جب سفر سے) واپس آئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کا استقبال کیا اور ان کو چمٹا لیا اور ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان چوما۔ رواہ ابوداؤد، والبیہقی فی شعب الایمان مرسلاً لیکن شرح السنۃ میں بیاضی کی روایت سے یہ حدیث متصلاً آئی ہے۔

شرح السنۃ میں حضرت جعفر بنؓ ابی طالب کا بیان آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا استقبال کیا اور معانقہ فرمایا۔

عطاء خراسانی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا باہم مصافحہ کرو کینہ دور ہوگا، ایک دوسرے کو ہدیہ دو آپس میں محبت ہوگی اور دشمنی جاتی رہے گی۔ رواہ مالک مرسلاً

حضرت براء بن عازب کا بیان ہے کہ دو مسلمان جب باہم مصافحہ کرتے ہیں تو دونوں کے درمیان جو گناہ ہوتا ہے جھڑ جاتا ہے باقی نہیں رہتا۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اللہ ایسا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود ہونے کے قابل نہیں۔ لفظ اللہ مبتدا ہے اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خبر۔ یا جملہ معترضہ تاکیدیہ ہے سابق اور لاحق میں جو تہدید کا مضمون ہے اس کی تاکید اس جملہ سے ہو رہی ہے اور مبتدا (اللہ) کی خبر لَيَجْمَعَنَّكُمْ ہے۔

لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وہ ضرور ضرور تم کو (قبروں سے نکال کر) قیامت کے دن جمع کرے گا۔ آیت سابقہ میں حَسِيْبًا آیا تھا اس جملہ کا مفہوم بھی حَسِيْبًا کی طرح ہے۔ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ میں اِلٰى یا فی کے معنی میں ہے (اسی کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے) یا اس کا متعلق محذوف ہے یعنی تم قیامت کے دن کی طرف جاؤ گے۔ قیام اور قیامت دونوں مصدر ہیں جیسے طلاب اور طلابۃ۔ اس سے مراد ہے حساب کے لئے کھڑا ہونا۔

لَا رَيْبَ فِيْهِ ط اس میں یعنی قیامت ہونے میں یا تمہارے جمع کرنے میں کوئی شک نہیں۔

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾ اور اللہ سے زیادہ سچی بات والا کون ہے استفہام (انکاری ہے یعنی اللہ سے زیادہ سچا کوئی نہیں۔ یہ جملہ گویا لَا رَيْبَ فِيْهِ کی علت ہے کیونکہ اللہ کی خبر میں تو کسی طور پر دروغ گوئی کا احتمال ہی نہیں ہے

ع ۱۱
۸

جھوٹ عیب ہے اور اللہ کی شان میں عیب محال ہے اس لئے جب اس نے قیامت کے متعلق لَارَیْبَ فِیْہِ فرمادیا تو یقیناً قیامت ہو گی اور سب لوگ جمع ہوں گے۔

بخاری وغیرہ نے حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ احد کی جانب (قریش سے مقابلہ کرنے) چلے تو ساتھیوں میں کچھ (منافق) لوگ راستہ سے ہی لوٹ آئے لوٹنے والوں کے متعلق صحابہ کے دو فرقے ہو گئے ایک فرقہ کا خیال تھا کہ ہم کو ان سے لڑنا چاہئے دوسرا فرقہ کہتا تھا نہ لڑنا چاہئے۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ پس تمہیں کیا ہو گیا کہ منافقوں کے بارے میں دو گروہ ہو گئے۔ فمالکم میں فاء تفریع کے لئے ہے مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا۔ پر مابعد فاء متفرع ہے مطلب یہ ہے کہ تم آپس میں تفرقہ اور اختلاف کیوں کرتے ہو اپنا معاملہ اس خدا کے سپرد کیوں نہیں کر دیتے جو سب سے زیادہ سچا ہے جو کچھ اس نے بیان کیا اس پر یقین رکھو اور جو بھی حکم دے اس کی تعمیل کرو۔

سعید بن منصور اور ابن ابی حاتم نے حضرت سعد بن معاذ کی روایت سے بیان کیا[1] کہ (ایک روز) رسول اللہ ﷺ نے تقریر کی اور فرمایا جو شخص مجھے دکھ پہنچا رہا ہے اور اپنے گھر میں ایسے لوگوں کو جمع کرتا ہے جو مجھے ایذا دیتے ہیں۔ میری حمایت میں ان سے نمٹنے کیلئے کون تیار ہے۔ سعد بن معاذ نے کہا اگر وہ شخص قبیلہ اوس میں سے ہے تو ہم اس کو قتل کر دیں گے اور اگر ہمارے خزرجی بھائیوں میں سے ہے تو آپ حکم دیں ہم حکم کی تعمیل کریں گے۔ یہ سن کر سعدؓ بن عبادہ کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے ابن معاذیہؓ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی طاعت نہیں ہے کیونکہ تم جانتے ہو کہ وہ شخص تم میں سے نہیں ہے اس پر اسید بن حضیر نے کھڑے ہو کر کہا اے ابن عبادہ تو منافق ہے منافق سے تجھے محبت ہے۔ یہ اختلاف دیکھ کر محمد بن مسلمہ نے کھڑے ہو کر کہا لوگو خاموش ہو جاؤ۔ رسول اللہ ﷺ ہمارے اندر موجود ہیں وہ ہم کو جو حکم دیں ہم اس کی تعمیل کریں گے اس پر آیت مذکورہ کا نزول ہوا۔

امام احمدؒ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی روایت سے بیان کیا ہے کہ عرب کے کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مدینہ میں آگئے لیکن مدینہ اور اس کی چراگاہوں کی (مرطوب ہوا سے پیدا شدہ) وباء (ملیریا) میں مبتلا ہو گئے لہٰذا ان کو لوٹا دیا گیا، وہ مدینہ سے نکل گئے راستہ میں کچھ صحابیوںؓ سے ملاقات ہوئی۔ صحابہؓ نے ان سے واپسی کی وجہ دریافت کی انہوں نے جواب دیا مدینہ کی وبا ہم کو لگ گئی۔ صحابہؓ نے کہا تم نے رسول اللہ ﷺ کی پیروی نہیں کی (کہ حضورؐ تو ہجرت کے بعد مدینہ رہ پڑے اور تم بیماری سے گھبرا کر واپس لوٹ رہے ہو) چنانچہ صحابہؓ کے ان کے متعلق دو خیال ہو گئے۔ بعض نے کہا وہ لوگ منافق ہو گئے بعض نے کہا انہوں نے نفاق نہیں کیا اس پر اللہ نے آیت مذکورہ نازل فرمائی۔

اس روایت کی اسناد میں تدلیس بھی ہے اور انقطاع بھی (اس لئے قابل قبول نہیں)۔

بغوی نے مجاہد کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کچھ لوگ مدینہ آئے مسلمان ہوئے لیکن پھر مرتد ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ سے مکہ واپس جا کر اپنا تجارتی مال لانے کی اجازت طلب کی (اجازت کے بعد) چلے گئے اور جا کر مکہ میں رہ پڑے ان لوگوں کے متعلق مسلمانوں کی رائے مختلف ہو گئی بعض نے کہا وہ منافق تھے اور بعض نے ان کو مومن خیال کیا۔

بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ کچھ قریشی مدینہ آکر مسلمان ہو گئے پھر ان کو پشیمانی ہوئی اور تفریح کرنے والوں کے طریقہ پر مدینہ سے باہر نکل گئے جب مدینہ سے دور ہو گئے تو وہاں سے رسول اللہ ﷺ کو خط لکھا کہ ہم اپنے سابق ایمان پر قائم

---

[1] ابن ابی حاتم نے زید بن اسلم کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تقریر کی اور فرمایا تمہاری ایسے شخص کے متعلق کیا رائے ہے جو رسول اللہ ﷺ کے صحابیوں میں لڑائی کراتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی بی بی کے بارہ میں بدگوئی کرتا (اور تہمت لگاتا) ہے حالانکہ اس بی بی کو اللہ نے خود پاک قرار دے دیا ہے اس کے بعد حضور ﷺ نے وہ آیات تلاوت کیں جن کے اندر حضرت عائشہؓ کی پاکدامنی کا اظہار کیا گیا ہے اور اس کے بعد آیت فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ نازل ہوئی۔

ہیں مگر مدینہ کے اندر ہم کو پیٹ کا روگ لگ گیا اور اپنے وطن کا بھی شوق غالب آیا (اس لئے ہم چلے آئے) کچھ مدت کے بعد یہ لوگ تجارت کیلئے ملک شام کو گئے۔ مسلمانوں کو ان کی روانگی کی اطلاع مل گئی اس پر بعض لوگوں نے کہا ہم کو چاہئے کہ جا کر ان سے لڑیں اور ان کو لوٹ لیں کیونکہ وہ ہمارے مذہب سے پھر گئے ہیں دوسروں نے کہا تم ایسے لوگوں سے جو تمہارے مذہب پر ہیں صرف اس وجہ سے کیسے لڑ سکتے ہو کہ انہوں نے اپنی بستیاں نہیں چھوڑیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ بعض روایات میں آیا ہے یہ وہ لوگ تھے جو مکہ میں مسلمان ہو گئے تھے مگر ہجرت نہیں کی تھی اور مشرکوں کی مدد کرتے تھے انہی کے متعلق آیت کا نزول ہوا۔

وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ اور اللہ نے ان کو (کفر کی طرف لوٹا دیا۔ رکس کا معنی لغت میں کسی چیز کو پلٹا دینے کے ہیں۔

بِمَا كَسَبُوْا ان کے اعمال کی وجہ سے یعنی مرتد ہونے اور دار الحرب میں چلے جانے کی وجہ سے

اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ کیا تم چاہتے ہو کہ جس کو خدا نے گمراہ کر دیا ہے اس کو ہدایت یاب بنا دو۔

یا یہ مطلب ہے کہ کیا جس کو خدا نے گمراہ قرار دیا ہے اس کو تم ہدایت یافتہ کہو۔ اس آیت میں اس امر کی دلیل ہے کہ بندوں کے تمام افعال کا خالق اللہ ہے اور بندہ کاسب ہے (یعنی فاعل بندہ اور خالق خدا ہے)۔ [۱]

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾ اور جس کو اللہ گمراہ کر دے تم کو اس کے لئے (حق تک پہنچانے والا) راستہ نہیں ملے گا۔

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً (جو لوگ کفر کی طرف لوٹ گئے) وہ تو دل سے چاہتے ہیں کہ کاش تم بھی ایسے کافر ہو جاؤ جیسے وہ ہو گئے یعنی اپنے کفر کی طرح تمہارے کافر ہو جانے کی ان کو تمنا ہے تاکہ (گمراہی میں) تم سب برابر ہو جاؤ۔

فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ پس ان میں سے (کسی کو) تم دوست نہ بناؤ۔ ان مرتدوں کی دوستی سے اس آیت میں ممانعت فرما دی۔

حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ تاوقتیکہ (خالص مومن ہو کر محض ثواب کی امید پر بغیر کسی دنیوی لالچ کے وہ تمہارے ساتھ مل کر) اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں۔

عکرمہ کا قول ہے کہ ہجرت تین طرح کی ہوتی ہے۔ (۱) وہ ہجرت جو آغاز اسلام میں مسلمانوں نے کی تھی (۲) مجاہدوں کی ہجرت یعنی رسول ﷺ کے ہمراہ صرف ثواب کی امید کے زیر اثر جہاد کے لئے نکلنا۔ [۲] (۳) باقی مسلمانوں کا تمام ممنوعات الٰہیہ کو ترک کر دینا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا پس اگر یہ (ایمان کے بعد اسلام سے یا ہجرت سے) پھر جائیں۔ چونکہ اس زمانہ میں ہجرت فرض تھی اس لئے پھر جانے سے مراد ہجرت سے پھر جانا بھی ہو سکتا ہے۔

فَخُذُوْهُمْ تو ان کو قیدی بنا لو۔

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ اور (دوسرے کافروں کی طرح) جہاں پاؤ ان کو قتل کرو۔

وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا اور ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ۔ دوست نہ بنانے کی یہ ممانعت تاکیدی ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ سابق کی ممانعت دوستی گرفتار کرنے سے قبل تھی اور یہ ممانعت گرفتار کرنے کے بعد ہے۔

وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾ اور نہ مددگار۔ اس لفظ سے ثابت ہو رہا ہے کہ کافروں سے (جنگی) امداد لینا جائز نہیں۔

---

[۱] گویا اس سے اشاعرہ کا دعویٰ ثابت ہوتا ہے کہ تمام افعال کا خالق ایک ہی ہے اور بندہ کو جزا سزا اس کے کاسب ہونے کی وجہ سے ہے اور معتزلہ کا قول غلط ہے کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے یا خیر کا خالق اللہ ہے اور شر کا خالق بندہ۔

[۲] اسی دوسری ہجرت کو حتی یہاجروا میں ذکر کیا جس پر ان کو دوست بنانا اور ان سے سوالات کرنا موقوف ہے۔

زہری نے بیان کیا ہے۔ ابن اُبی جب احد سے لوٹ آیا تو صحابہؓ نے رسول ﷺ سے اجازت طلب کی کہ جو یہودی ہمارے معاہد ہیں ہم اون سے مدد طلب کریں۔ حضور ﷺ نے فرمایا وہ خبیث ہیں ہم کو ان کی ضرورت نہیں۔

اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ سوائے ان کے جو ایسے لوگوں کے پاس پہنچ جائیں جن سے تمہارا معاہدہ ہے۔ یہ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ سے استثناء ہے۔

ایک سوال :۔ مستثنیٰ اور مستثنیٰ منہ کے درمیان جملہ معترضہ (وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا) لانے کی کیا ضرورت تھی استثناء میں تو اس کا کوئی دخل نہیں۔

جواب :۔ لَا تَتَّخِذُوْا کا ذکر تاکید قتل کے لئے ہے گویا یوں فرمایا کہ ان کو قتل کرو اور دوستی یا مدد کی طمع میں ان کے قتل کو ترک نہ کرو۔ بغوی نے لکھا ہے کہ معاہد قوم سے مراد بنی اسلم کا قبیلہ ہے۔ قصہ یہ ہوا تھا کہ ہلال بن عویمر اسلمی کے مکہ کو جانے سے پہلے رسول اللہ ﷺ اور اس کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا تھا کہ ہلال نہ رسول اللہ کی مدد کرے گا نہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف دشمنوں کی مدد کرے گا اور ہلال کے پاس اگر کوئی شخص اس کے قبیلہ کا ہو یا غیر پہنچ کر پناہ گزین ہو جائے گا تو ہلال کی طرح وہ بھی مامون رہے گا۔ (نہ اس کو گرفتار کیا جائے گا نہ قتل) کذا روی ابن ابی حاتم عن مجاہد۔

ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حسن کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سراقہ بن مالک نے بیان کیا کہ جب بدر اور احد میں رسول اللہ ﷺ کو غلبہ حاصل ہو گیا اور ارد گرد کے لوگ مسلمان ہو گئے تو مجھے اطلاع ملی کہ آپ خالدؓ بن ولید کو میری قوم بنی مدلج کے پاس (جنگ کے ارادہ سے) بھیجنا چاہتے ہیں میں فوراً خدمت گرامی میں حاضر ہوا اور عرض کیا مجھے اطلاع ملی ہے کہ آپ خالدؓ کو میری قوم کی طرف بھیجنا چاہتے ہیں میں آپ کو احسان کا واسطہ دے کر عرض کرتا ہوں کہ آپ میری قوم کو اسی حالت پر رہنے دیں۔ اگر آپ کی قوم مسلمان ہو گئی تو وہ بھی مسلمان ہو جائیں گے اور آپ کی قوم مسلمان نہ ہوئی تو ان سے کوئی اندیشہ نہیں۔ حضور ﷺ نے خالدؓ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا ان کے ساتھ چلے جاؤ اور جیسا چاہو کرو چنانچہ خالدؓ نے جا کر بنی مدلج سے اس شرط پر صلح کر لی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف کسی کو مدد نہیں دیں گے اور اگر قریش مسلمان ہو گئے تو وہ بھی مسلمان ہو جائیں گے اور اللہ نے آیت اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ نازل فرمائی۔ پس اس صراحت کے موافق جو شخص ان کے پاس جا پہنچتا اس کا شمار انہی میں سے کیا جاتا اور وہ بھی معاہدہ میں شریک قرار دیا جاتا۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آیت اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ ہلال بن عویمر اسلمی اور سراقہ بن مالک مدلجی اور بنی خزیمہ بن عامر بن عبد مناف کے متعلق نازل ہوئی۔

ضحاک نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ معاہد لوگ بنی بکر بن زید مناۃ تھے مقاتل نے کہا یہ بنی خزاعہ تھے۔

اَوْ جَآءُوْكُمْ یا تمہارے پاس آجائیں۔ جَآءُوْكُمْ کو ماضی کے معنی میں لیا جائے یا مضارع کے معنی میں بہر حال اس کا عطف اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ پر ہے یا قوم کی صفت پر عطف یعنی وہ تم سے معاہدہ رکھنے والی قوم کے پاس پہنچ جائیں یا ان لوگوں کے پاس جو غیر جانبدار ہیں۔ اول عطف زیادہ مناسب ہے کیونکہ آگے فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ آتا ہے اور مرتدوں سے تعرض نہ کرنے کا حکم اس وجہ سے دیا گیا ہے کہ وہ جنگ سے دست بردار ہو جاتے ہیں اسلئے نہیں ہے کہ وہ غیر جانبداروں سے جا کر مل جاتے ہیں۔

حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ وہ تمہارے پاس ایسی حالت میں آتے ہیں کہ وہ تم سے اور اپنی قوم کے ساتھ لڑنے سے نفرت کرتے ہیں۔ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ سے پہلے لفظ عن یا لفظ کراہت محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ تمہارا اور ان کا معاہدہ ہے اس لئے تم سے وہ لڑنا پسند نہیں کرتے اور تمہارے ساتھ مل کر اپنی قوم قریش سے بھی نہیں لڑتے (کیونکہ قریش ان کی قوم ہے) یہ لوگ یقیناً بنی مدلج (سراقہ بن مالک کے قبیلہ والے) تھے بنی مدلج نے معاہدہ کر لیا تھا کہ مسلمانوں سے جنگ نہیں کریں گے اور قریش سے بھی نہ لڑنے کا عہد کر لیا تھا۔ اللہ نے اس آیت میں ان مرتدوں سے لڑنے کی ممانعت فرما دی جو مسلمانوں سے معاہدہ رکھنے والی قوم کے پاس چلے جائیں ایسے مرتدوں کا حکم بھی اہل

معاہدہ کا حکم ہے اگر ان سے جنگ کی جائے تو گویا یہ اہل معاہدہ سے جنگ ہو گی۔

وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا (تمہارا رعب ان کے دلوں سے زائل کر دیتا) اور وہ تم سے جنگ کرتے لڑائی سے باز نہ رہتے لَقٰتَلُوْكُمْ میں دوبارہ لام کو اس لئے ذکر کیا کہ مسلط اور قاتلوا دونوں کا مجموعہ جزاء شرط نہیں ہے بلکہ ہر ایک مستقل جزا ہے کیونکہ مسلط کر دینے کے بعد لڑنا لازم نہیں ہے قتال پھر بھی مشیت پر موقوف ہے۔

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ پھر اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں اور تم سے نہ لڑیں اور تم سے آشتی کا سلوک رکھیں۔ سَلَم سے مراد ہے صلح و آشتی۔

فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾ تو اللہ نے تم کو ان پر کوئی راہ نہیں دی یعنی ان کو قید اور قتل کرنے کی راہ تمہارے لئے جائز نہیں کی۔

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ بعض ایسے بھی تم کو ملیں گے جو تم سے بھی بے خطر ہو کر رہنا چاہتے ہیں اور اپنی قوم سے بھی بے خطر ہو کر۔

کلبی نے ابو صالح کے حوالہ سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ لوگ بنی اسد اور بنی غطفان کے اشخاص تھے مدینہ میں آکر رہنے لگے تھے دکھاوٹ کے لئے اسلام کا کلمہ پڑھتے تھے مگر واقع میں مسلمان نہ تھے جب ان میں سے کسی سے اس کی قوم والے کہتے تھے کہ تو کیوں مسلمان ہو گیا تو جواب دیتا میں اس بندر اور بچھو پر ایمان لایا ہوں (یعنی بندر اور بچھو سے امن پانے کے لئے ایمان لایا ہوں) لیکن جب صحابہؓ سے اس کی ملاقات ہوتی تو کہتا میں آپ لوگوں کے دین پر ہوں اس دوغلے پن سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دونوں طرف سے بے خطر ہو جائے۔

كُلَّمَا رُدُّوْا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا جب بھی ان کو کفر اور مسلمانوں سے لڑنے کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ بدترین صورت سے الٹ پڑتے ہیں۔

فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْا اَيْدِيَهُمْ پس اگر تم سے (لڑنے سے) علیحدہ نہ رہیں اور (طالب صلح ہو کر) تم سے آشتی نہ کریں اور (شرارت سے) اپنے ہاتھ نہ روکیں۔

فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ تو ان کو پکڑو اور جہاں ہاتھ لگ جائیں قتل کرو۔ (یعنی جہاں تم کو موقع مل جائے اور تمہارے پنجہ میں آجائیں قتل کر دو)۔

وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾ ایسے لوگوں کے خلاف ہم نے تم کو کھلی ہوئی دلیل دیدی ہے۔ ان سے لڑنے کے جواز کی دلیل موجود ہے کہ ان کی عداوت کھل گئی ان کا حال معلوم ہو گیا۔ ان کا کافر ہونا مسلمانوں سے غداری کرنا اور دکھ پہنچانا سامنے آگیا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ عیاش بن ربیعہ مخزومی (ابو جہل کا ماں جایا بھائی) ہجرت سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مکہ میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گیا لیکن پھر اس کو اندیشہ ہوا کہ گھر والوں سے میرا مسلمان ہو جانا مخفی نہیں رہے گا اس لئے بھاگ کر مدینہ چلا گیا اور وہاں پہنچ کر ایک گڑھی میں قلعہ بند ہو گیا۔ عیاش کے جانے سے ماں کو بڑی بے تابی ہوئی اور اس نے اپنے دونوں بیٹوں ابو جہل اور حارث سے (جو ہشام کے نطفے سے تھے) کہا اللہ کی قسم جب تک تم عیاش کو نہ لاؤ گے میں نہ کسی چھت کے سایہ میں جاؤں گی نہ کھانا چکھوں گی نہ پانی۔ ماں کی قسم سن کر دونوں عیاش کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور حارث بن زید بن ابی انیسہ بھی ان کے ساتھ ہو لیا عیاش کے پاس پہنچے تو دیکھا وہ گڑھی میں پہاڑ پر قلعہ بند ہے اس سے کہا تم نیچے آجاؤ تمہارے بعد تمہاری ماں نے قسم کھا لی ہے کہ جب تک تم نہ پہنچ جاؤ گے وہ چھت کے سایہ میں نہ جائے گی اور نہ کچھ کھائے پیئے گی اور ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تم کو کسی بات پر مجبور نہیں کریں گے نہ تمہارے مذہب سے تم کو روکیں گے جب ان لوگوں نے ماں کی

بیتابی کا تذکرہ کیا اور اللہ کی قسمیں کھائیں تو عیاش گڑھی سے اتر آیا۔ یہ لوگ اس کو مدینہ سے نکال کر لے چلے پھر اس کو نواڑ سے باندھ دیا اور ہر ایک نے سو سو تسمے اس کے مارے اور لے جا کر ماں کے پاس پہنچا دیا ماں نے دیکھ کر کہا خدا کی قسم میں تیری بندش اس وقت تک نہیں کھولوں گی جب تک تو اس چیز کا انکار نہ کر دے گا جس پر ایمان لایا ہے۔ پھر (بیچارے کو) یونہی بندھا ہوا دھوپ میں ڈال دیا اور جب تک اللہ کی مشیت تھی وہ پڑا رہا آخر کار جو بات وہ لوگ چاہتے تھے عیاش نے (بظاہر) وہی کر دی (اور عیاش کو کھول دیا گیا) اتنے میں حارث بن زید آگیا اور بولا عیاش کیا یہی وہ بات تھی جو تو نے اختیار کی تھی (یعنی بس تیرے ایمان کے یہی کس بل تھے کہ ذرا سی تکلیف سے اپنا خیال چھوڑ بیٹھا) خدا کی قسم جس بات کو تو نے اختیار کیا تھا اگر وہ ہدایت تھی تو تو نے ہدایت چھوڑ دی اور اگر وہ گمراہی تھی تو اب تک گمراہی پر تھا۔ عیاش کو اس کی بات پر غصہ آگیا اور کہنے لگا خدا کی قسم اگر تنہائی میں تو میرے ہاتھ لگ گیا تو قتل کئے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔

کچھ مدت کے بعد عیاش پھر مسلمان ہو گیا اور مکہ چھوڑ کر مدینہ کو چلا گیا۔ عیاش کے کچھ زمانہ کے بعد حارث بن زید بھی مسلمان ہو گیا اور ہجرت کر کے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ حارث کے پہنچنے کے وقت عیاش وہاں موجود نہ تھا نہ اس کو حارث کے مسلمان ہونے کی اطلاع ملی ایک روز عیاش قبا کے باہر جا رہا تھا کہ سامنے سے حارث آگیا اور عیاش نے حارث کو قتل کر دیا۔ لوگوں نے کہا ارے تو نے یہ کیا کیا حارث تو مسلمان ہو گیا تھا۔ یہ سنتے ہی عیاشؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرا اور حارثؓ کا یہ واقعہ ہوا تھا اور آپ واقف ہیں کہ مجھے اس کے مسلمان ہونے کا علم نہ تھا اور اسی لاعلمی میں میں نے اسے مار ڈالا۔

ابن جریر نے عکرمہ کا قول نقل کیا ہے کہ حارث بن زید بن عامر بن لوی ابو جہل کے ساتھ شریک ہو کر عیاش کو عذاب دیا کرتا تھا پھر حارثؓ ہجرت کر کے چلا آیا اور حرہ میں عیاش سامنے سے آگیا۔ عیاش سمجھتا تھا کہ حارثؓ کافر ہے اس لئے تلوار سے اس کو مار ڈالا۔ اور پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ عرض کر دیا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اور کسی مومن کو زیبا نہیں کہ کسی ایماندار کو (ناحق) قتل کر دے۔ مجاہد اور سدی کی روایت سے بھی مذکورہ بالا واقعہ مروی ہے ابن اسحاق اور ابو یعلی اور حارث بن ابی اسامہ اور ابو مسلم کجی نے قاسم بن محمد کی روایت سے بھی اسی طرح بیان کیا ہے اور ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر کے حوالہ سے حضرت ابن عباسؓ کا بیان بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ مومن کے ایمان کی شان یہ نہیں یعنی نہ اس سے یہ فعل سرزد ہوا نہ سرزد ہوتا ہے نہ اس کے ہاتھوں سے کسی مومن کا (قصداً) ناحق قتل ہوتا ہے۔ قتل مومن دینی ممنوعات میں سرفہرست ہے اور ایمان کا تقاضا ایسی حرکت سے روکتا ہے۔ کلام ظاہری اعتبار سے اخباری (اور منفی) ہے لیکن اس سے پرزور ممانعت مقصود ہے گویا مومن کو ناحق قصداً قتل کرنے والے کے ایمان کو عدم ایمان کی طرح قرار دے دیا حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بخاری نے جو رسول اللہ ﷺ کا فرمان نقل کیا ہے کہ لَا يَقْتُلُ حِيْنَ يَقْتُلُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ حالت ایمان میں رہتے ہوئے مومن کا کوئی قاتل قتل نہیں کرتا (یعنی قتل کرنا تقاضائے ایمان کے خلاف ہے)۔

صحاح میں ہے کہ اگر ایک چیز دوسری چیز کی صفت لازمہ ہو اور عموماً اس سے جدا نہ ہوتی ہو تو عربی میں ایسے موقع پر لفظ کان بولتے ہیں جیسے كَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا۔ كَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا۔ میں کہتا ہوں کہ صاحب صحاح کے بیان کی روشنی میں یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ اگر کوئی چیز کسی دوسری چیز سے اکثر الگ اور خالی رہتی ہو خواہ کبھی ساتھ نہ پائی جاتی ہو یا عموماً ساتھ نہ رہتی ہو۔ اتفاقاً کبھی پائی بھی جاتی ہو تو ایسے موقع پر مَا كَانَ بولا جاتا ہے جیسے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ باوجود یکہ اللہ نے احد کے دن بھاگ پڑنے کی وجہ سے مسلمانوں کو قتل و شکست کی سزا دی تھی۔ لیکن یہ سزا اتفاقی تھی اللہ کا عمومی عمل رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں ایسا نہ تھا۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ آیت میں اگرچہ نفی کا صیغہ ہے لیکن مقصود نہی ہے جیسے آیت مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ (میں نفی بمعنی ممانعت ہے) یعنی تمہارے لئے جائز نہیں کہ رسول اللہ کو دکھ دو اور ان کی وفات کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو مطلب یہ کہ ایسی حرکت مت کرو۔

اِلَّا خَطَـٔـًا لیکن غلطی سے۔ یعنی غلطی کی حالت میں یا غلطی کی وجہ سے یا غلط طور پر (اول ترجمہ کی صورت میں خطا حال ہوگا اور دوسرے ترجمہ پر مفعول لہ اور تیسرے ترجمہ پر مفعول مطلق) اس صورت میں استثناء مفرغ ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لِمُؤْمِنٍ سے استثنا ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ استثناء کو منقطع قرار دیا جائے کیونکہ اَنْ يَّقْتُلَ کا لفظ قتل عمد پر دلالت کر رہا ہے۔ افعال اختیار یہ قصداً ہی ہوتے ہیں اور قتل خطاء قتل عمد میں داخل ہی نہیں ہے۔ اس وقت مطلب اس طرح ہوگا لیکن اگر غلطی سے مار ڈالے (آیت کا شروع ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا ہے)۔

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـٔـًا اور جس نے مومن کو بلا قصد قتل کر دیا۔

قتل دو طرح کا ہوتا ہے قتل عمد (قصداً قتل) اور قتل خطا قتل عمد کی تشریح میں اختلافی اقوال قصاص کا حکم اور کیفیت اور وجوب مال کا حکم ہم نے سورۂ بقرہ کی آیت كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ کی تفسیر کے ذیل میں بیان کر دیا ہے۔ اس جگہ صرف یہ بتانا ہے کہ کیا قتل عمد کا کفارہ (جس سے آخرت کا گناہ معاف ہو جائے گا) واجب ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک واجب نہیں۔ امام شافعیؒ کے نزدیک واجب ہے امام احمد کے دونوں قول روایت میں آئے ہیں۔

امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ قتل خطا میں جب کفارہ واجب ہے تو قتل عمد میں بدرجہ اولیٰ واجب ہونا چاہئے پھر حضرت واثلہ بن اسقع کی روایت بھی ہے کہ ہم اپنے ایک ساتھی کا جو قتل کی وجہ سے دوزخ کا مستحق ہو گیا تھا حکم دریافت کرنے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے فرمایا اس کی طرف سے ایک بردہ آزاد کردہ بردہ کے ہر عضو کی آزادی کی وجہ سے اس کا ہر عضو دوزخ سے آزاد ہو جائے گا کذا ذکرہ الرافعی (اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قتل عمد کا کفارہ دوزخ سے آزاد ہونے کے لئے واجب ہے اور ایک بردہ آزاد کرنا چاہئے)۔

ہم کہتے ہیں یہ حدیث امام احمد، ابو داؤد نسائی، ابن حبان اور حاکم نے بھی روایت کی ہے لیکن اس روایت میں صرف اتنا ہے کہ ہمارا ساتھی مستحق ہو گیا تھا (قصاص کا یا دیت کا یا دوزخ کا اس کی کوئی تفصیل نہیں کی گئی) دوزخ کا لفظ اس روایت میں نہیں ہے لہٰذا دعوے کی دلیل حدیث سے نہیں نکلتی۔

رہا دلالت النص سے قیاس کرنا (اور یہ کہنا کہ جب قتل خطا میں کفارہ واجب ہے تو قتل عمد میں بدرجہ اولیٰ ہونا چاہئے تو قیاس قابل تسلیم نہیں کیونکہ قتل عمد خالص گناہ کبیرہ ہے کفارہ دیکر اس سے طہارت نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسا حکم دیدیا جائے گا تو قتل عمد کا دروازہ کھل جائے گا۔ قتل خطا کی حالت اس سے جدا ہے اس کے دو رخ ہیں ایک اباحت کا (کیونکہ خطا اور چوک قابل مواخذہ نہیں) اور دوسرا گناہ ہونے کا کہ احتیاط کیوں نہ کی لہٰذا اس سے طہارت کی تو ایک شکل ہے جو عبادت اور عذاب کے درمیان دائر ہے (یعنی بردہ کی آزادی کہ فی الجملہ عبادت بھی ہے اور آزاد کرنے والے کے لئے سزا بھی)۔

ہمارے نزدیک یہی فرق یمین غموس (کسی بات کو دانستہ قسم کھا کر غلط بیان کرنا) اور یمین منعقدہ (آئندہ کے متعلق کوئی قسم کھانا) کے درمیان ہے کہ اول کا کوئی کفارہ نہیں اور دوسری قسم کا کفارہ ہے قتل خطا کئی طرح کا ہوتا ہے۔ [ا] شبہ عمد۔ اس

[ا] یمین غموس اور قتل عمد کا کفارہ نہ ہونے کی دلیل ایک حدیث بھی ہے جس کو ابن ابی شیبہ، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ کے سامنے ایسی حالت میں جائے گا کہ (مرتے وقت) وہ مشرک نہ ہو اور اپنے مال کی زکوٰۃ محض ثواب کی امید پر بخوشی خاطر اس نے دی ہو اور اللہ کے احکام سنے اور مانتے ہوں تو اس کے لئے جنت ہوگی اور پانچ چیزیں ہیں جن کا کوئی کفارہ نہیں، ناحق کسی کو قتل کرنا، مومن پر بہتان لگانا، جہاد سے بھاگنا، کسی کا مال مارنے کے لئے بغیر حق کے جھوٹی قسم کھانا، (از مولف) (پانچویں چیز کا ذکر نہیں فرمایا مترجم)

کی تشریح میں آئمہ کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا قتل شبہ عمد وہی قتل عمد ہے بشرطیکہ ایسے آلہ سے ہو جو قتل کرنے کے لئے موضوع نہ ہو (جیسے بڑا پتھر یا بڑی لکڑی) امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے فرمایا قصداً ایسی چیز سے قتل کرنا۔ امام شافعیؒ نے فرمایا ایسی چیز سے قصداً مارنا کہ اکثر اس سے موت واقع نہیں ہوتی پس اگر ایک یا دو کوڑے مارے اور موت واقع ہو گئی تو سب کے نزدیک یہ قتل شبہ عمد ہے اور اگر چھوٹے کوڑے سے یہ پیہم اتنا مارا کہ مر گیا تو شافعیؒ کے نزدیک قتل عمد ہو گا اور امام اعظمؒ نیز صاحبین کے نزدیک شبہ عمد اور اگر کسی بڑے پتھر یا بڑے تختہ سے قتل کر دیا (جو پھسلواں ہو) اکثر ٹھیر تا نہ ہو تو امام صاحب کے نزدیک شبہ عمد ہے اور باقی کے نزدیک قتل عمد۔ امام صاحبؒ نے فرمایا اگر پہاڑ بھی پھینک کر مار دیا اور مر گیا تو قصاص نہ ہو گا۔

جو ضرب قتل کے معاملہ میں شبہ عمد ہے وہ قتل سے کم باقی جسمانی نقصان رسانی میں عمداً قرار دی جائے گی۔ یہ فیصلہ باتفاق آئمہ ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سن لو قتل خطا شبہ عمد کوڑے اور لاٹھی سے قتل کرنا ہے۔ عنقریب آئندہ بیان کیا جائے گا کہ کوڑے اور لاٹھی کا لفظ عام ہے چھوٹی ہو یا بڑی سب کو شامل ہے۔ جمہور کا قول ہے کہ لاٹھی کا اطلاق صرف چھوٹے پر ہوتا ہے (جو لوگ عموماً ہاتھ میں لیتے ہیں کسی بڑے لکڑ یا بلی کو لاٹھی نہیں کہا جاتا)۔

(۲) دوسرا قتل خطایہ ہے کہ نشانہ چوک جائے مار دیا ہو شکار سمجھ کر اور ہو وہ آدمی یا مار رہا ہو کسی کو کافر حربی سمجھ کر اور نکلے وہ مسلمان۔ (۳) فعل میں چوک جائے مار رہا ہو نشانہ پر اور لگ جائے کسی مسلمان کے (۴) قائم مقام خطا (یعنی غلطی بھی نہیں ہے بلکہ غلطی جیسی حرکت ہے) جیسے کوئی شخص سو رہا ہو سوتے میں کروٹ لے اور کسی مسلمان کے اوپر گر پڑے اور وہ مر جائے (۵) قتل سببی جیسے کسی نے اپنی ملک سے باہر کسی جگہ کنواں کھدو لیا (اور کوئی اس میں گر کر مر گیا) یا پتھر نصب کر دیا (اور کوئی اس سے ٹھوکر کھا کر یا ٹکرا کر مر گیا)۔

ان تمام اقسام کا حکم یہ ہے کہ عاقلہ پر بالاتفاق دیت (خون بہا) واجب ہے کیونکہ قصاص تو بہر حال نہیں ہے اگر دیت بھی نہ ہو گی تو ناحق خون ہو گا اور معصوم خون رائیگاں جائے گا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سب کے نزدیک قاتل پر کفارہ واجب ہے اور قاتل میراث سے بھی بالاجماع محروم ہو جائے گا۔ صرف پانچویں قسم میں امام ابو حنیفہؒ کی رائے الگ ہے۔ امام صاحب کے نزدیک یہ حقیقت میں قتل ہی نہیں ہے۔ قتل نام ہے مقتول کے جسم پر خاص تصرف کرنے کا اور پانچویں قسم میں مقتول کے جسم پر قاتل کوئی تصرف نہیں کرتا بلکہ اس کا محل فعل زمین یا کنواں یا کوئی اور چیز ہے۔ جمہور کے قول کی دلیل یہ ہے کہ (یہ حقیقت میں قتل ہو یا نہ ہو) شریعت نے اس کو قتل قرار دیا ہے یہاں تک کہ بالاجماع دیت واجب ہے پس مذکورہ آیت کے حکم کا عموم چاہتا ہے کہ کفارہ بھی واجب ہو بلکہ آیت کا اقتضا تو یہ ہے کہ دیت کبھی واجب ہوتی ہے اور کبھی واجب نہیں ہوتی مگر کفارہ تو بہر حال واجب ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کفارہ کا وجوب تو گناہ کو دور کرنے کیلئے ہوتا ہے اور سوتا ہوا آدمی اگر کروٹ لے کر کسی پر گر جائے اور وہ مر جائے تو گرنے والے کا کیا قصور ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تین آدمیوں سے قلم اٹھا لیا گیا (یعنی ان کا گناہ نہیں لکھا جاتا گویا دہ گناہ ہی نہیں ہوتا اگر گناہ ہوتا تو ضرور اعمال نامہ میں لکھا جاتا) ایک سوتا ہوا آدمی بیدار ہونے تک۔

لہٰذا جس نے دوسرے کی زمین میں ظلماً کنواں کھدوایا اور اس میں کوئی مومن گر کر مر گیا ضرور موجب کفارہ ہے اس صورت میں کفارہ نہ ہونا (جب کہ مجرمانہ اور غاصبانہ فعل کرنے کی وجہ سے مومن کی ہلاکت ہوئی ہے) ناپسندیدہ حکم ہے۔

فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ پس اس کا کفارہ کسی مسلمان بردہ کو آزاد کرنا ہے۔

مسئلہ :۔ ایک روایت میں امام اعظمؒ کا قول آیا ہے کہ شبہ عمد میں کفارہ واجب نہیں۔ کفایہ شرح ہدایہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ جرجانی نے کہا ہمارے علماء کا ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ شبہ عمد میں کفارہ واجب نہیں۔ میں کہتا ہوں یہی فتویٰ زیادہ مناسب بھی ہے کہ آلہ (قاتلہ) نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہونے والے شبہ کی وجہ سے شبہ عمد میں قصاص تو ساقط ہو جاتا ہے لیکن معصیت کاملہ تو ہوتی ہے کیونکہ معصیت کے کامل ہونے کا مدار نیت اور ارادہ پر ہے (آلہ پر نہیں) آلہ کوئی ہو یہاں تک کہ گھونسے مارتے مارتے اگر قصد کے ساتھ مار ڈالے تو معصیت کامل ہو جاتی ہے لہٰذا شبہ عمد خالص گناہ کبیرہ ہے بلکہ تلوار سے

قتل کرنے سے بھی زیادہ برا ہے۔ دیکھو واجب القتل قاتل سے قصاص صرف تلوار سے لیا جاتا ہے (تاکہ مرنے والے کو سہولت ہو) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر کام کو خوبی سے کرنا اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا ہے لہٰذا اگر تم (قصاص میں) قتل کرو تو خوبی سے قتل کرو۔ (زیادہ ایذا رساں طریقے سے نہ کرو) اور ذبح کرو تو خوبی کے ساتھ کرو۔ چھری تیز کر لی جائے اور ذبحہ کو زیادہ تکلیف نہ دی جائے۔ رواہ احمد و مسلم واصحاب السنن الاربعہ من حدیث شداد بن اوسؓ۔

فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ خبر ہے مبتدا محذوف ہے یعنی اس کے عوض ایک بردہ کو آزاد کرنا واجب ہے۔ تحریر کا معنی ہے آزاد کرنا۔ ہر عمدہ اعلیٰ چیز کو حر کہا جاتا ہے۔ قاموس میں ہے ہر بہتر چیز کو حر کہتے ہیں۔ آزاد کو حر کہنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ حر میں شرافت اور خیر ہوتی ہے۔

رقبتہ (گردن) سے مراد جان ہے جیسے راس (سر) بول کر جان مراد لی جاتی ہے۔ بردہ کی آزادی کا یہ مطلب ہے کہ جو باندی غلام کامل طور پر مملوک ہو اس کو آزاد کیا جائے لہٰذا جس باندی کے بطن سے مالک کا بچہ ہو جائے وہ یونہی آزاد ہو جاتی ہے۔ قتل کے عوض اس کو آزاد کرنا درست نہیں۔ نہ اس کو بیچنا جائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے ام ولد کو اس کے بچہ نے آزاد کرا دیا۔ اسی طرح امام صاحب کے نزدیک مدبر غلام کو بھی آزاد کرنا جائز نہیں (کیونکہ آقا کے مرنے کے بعد وہ خود ہی آزاد ہو جائے گا گویا اس کی مملوکیت ناقص ہے) امام شافعیؒ کے نزدیک جائز ہے۔ مکاتب غلام نے اگر بدل کتابت (زر قیمت) میں سے کچھ ادا نہ کیا ہو تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس کو آزاد کرنا جائز ہے کیونکہ عقد کتابت تراضی باہمی سے فسخ ہو سکتا ہے امام شافعی کے نزدیک ناجائز ہے جیسے اس مکاتب کو آزاد کرنا بالاتفاق ناجائز ہے جس نے بدل کتابت میں سے کوئی حصہ ادا کر دیا ہو۔ پاگل، نابینا، گونگے اور نپٹ بہرے کو آزاد کرنا جائز نہیں۔ جس کے دونوں ہاتھ یا دونوں پاؤں کٹے ہوں یا ایک ہی طرف کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کٹا ہو اس کو بھی آزاد کرنا جائز نہیں ایسے لوگ حقیقت میں مردہ کی طرح ہیں اور بالکل بیکار ہیں۔ اگر ایک جانب کا ہاتھ اور دوسری جانب کا پاؤں کٹا ہو یا کانا یا چوندھا یا مبروص یا شب کور ہو تو اس کو آزاد کرنا جائز ہے کیونکہ ایسے لوگ بالکل ناکارہ نہیں ہیں اگرچہ کامل طور پر کار آمد بھی نہیں ہیں۔ پیدائشی نامرد خصی اور نس کٹے کو آزاد کرنا درست ہے کیونکہ اگرچہ مردیت سے یہ محروم ہوتے ہیں اور نسل آفریں نہیں ہوتے مگر غلاموں سے جو خدمت مقصود ہوتی ہے اس میں نسل آفرینی کو کوئی دخل نہیں۔ اسی طرح اس باندی کو آزاد کرنا جائز ہے جو نپٹ ہو کیونکہ وہ خدمت کے کام کی بہر حال ہوتی ہے (اگرچہ صنفی قربت کی اہل نہیں ہوتی)۔

مسئلہ :۔ قاتل کا عاقل بالغ مسلمان ہونا ضروری ہے کیونکہ کفارہ عبادت ہے اس لئے عبادت کی شرطیں اس میں ہونی ضروری ہیں امام شافعیؒ کفارہ کو مالی ضمان (جیسے دیت وغیرہ) پر قیاس کرتے ہیں۔ اور دیت ادا کرنے کے لئے نہ بالغ ہونا شرط ہے نہ عاقل ہونا نہ مسلمان ہونا (اس لئے) کفارہ میں بھی ان کے نزدیک کوئی شرط نہیں۔

مسئلہ :۔ امام شافعی کے نزدیک کفارۂ قتل کے لئے اپنے اختیار سے آزاد کرنا شرط ہے اس لئے بہ نیت کفارہ اگر کسی نے اپنے باپ کو خریدا تو جائز نہیں (کیونکہ باپ تو خریدتے ہی بغیر خریدنے والے کے اختیار کے خود ہی آزاد ہو جائے گا) امام صاحب کے نزدیک باپ یا کسی اور قریبی رشتہ دار کو (جو خریدتے ہی خود آزاد ہو جائے) بنیت کفارہ خریدنا کافی ہے کیونکہ آپ کے نزدیک سبب اختیاری کے ساتھ نیت کا اقتران موجب آزادی ہے (خریدنا سبب آزادی ہے اور خریدنا مشتری کا اختیاری فعل ہے۔ پس خریدتے وقت کفارہ کی نیت ہونا ضروری ہے)، اسی طرح اگر (کسی کا باپ زید کا غلام ہو اور زید) عمرو کو اس کا باپ بطور ہبہ دیدے یا باپ کی ملکیت بطور وصیت مل جائے دونوں صورتوں میں امام شافعی کے نزدیک کفارۂ قتل کے لئے اس کی آزادی جائز نہ ہوگی اور امام صاحبؒ کے نزدیک کافی ہو جائے گی ہاں اگر باپ بیٹے کو یا بیٹا باپ کو میراث میں مل جائے (اور آزاد ہو جائے) تو یہ آزادی کفارۂ قتل کے لئے بالاجماع کافی نہ ہوگی خواہ کفارہ کی نیت کر لی ہو۔

آیت میں چونکہ مومنہ کا لفظ آیا ہے اس لئے بالاجماع کفارۂ قتل کے لئے باندی غلام کا مسلمان ہونا ضروری ہے کفارۂ

مسلمان ہونے کی شرط نہیں ہے۔
قسم، کفارۂ ظہار اور کفارۂ صوم کے لئے مسلمان ہونے کی شرط نہیں ہے۔
قسم، کفارۂ ظہار اور کفارۂ صوم کے لئے مسلمان ہونے کی شرط نہیں ہے۔ مسلمان باپ یا مسلمان ماں نے اپنے
مسلمان ہونے کے لئے اتنا کافی ہے کہ (شرعاً) اس کو مسلمان مان لیا گیا ہو مثلاً کسی مسلمان باپ یا مسلمان ماں نے اپنے
چھوٹے بچہ کو (خرید کر کفارہ قتل میں) آزاد کر دیا تو جائز ہے (کیونکہ بچہ مذہب کے اعتبار سے شرعاً اشرف کے تابع مانا گیا ہے اور
اس بچہ کے ماں باپ میں سے کوئی ایک مسلمان ہے لہٰذا اس بچہ کو مسلمان قرار دیا جائے گا) ابن منذر اور ابن جریر اور ابن ابی حاتم
نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے کہ مومنہ سے مراد وہ بردہ ہے جس کو ایمان کا شعور ہو اور نماز روزہ کرتا
ہو لیکن قرآن میں جہاں رقبہ کے ساتھ مومنہ کی قید نہیں لگائی ہے۔ وہاں نوزائیدہ بچہ یا اس سے بڑا جو قاتل شعور نہیں وہ بھی
جائز ہے کذا اخرج عبدالرزاق عن قتادہ۔ حضرت ابیؓ کی قرات میں لا یجزی فیہا صبی بھی زیادہ آیا ہے۔
وَّدِيَةٌ اور خون بہا بھی (خون کا مالی عوض) اس کا عطف فَتَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ پر ہو۔ قاموس میں ہے دیت بکسر دال
مقتول کا (مالی) حق دیت کی مقدار مجمل ہے اور کس پر دیت واجب ہے اس کا بیان بھی آیت میں نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے
اس کو بیان فرما دیا ہے۔

مسئلہ :۔ دیت عاقلہ (قاتل کے عصبی رشتہ دار) پر واجب ہے اور جتنا چندہ ادا کرنا ایک ایک شخص پر لازم ہوگا اتنا ہی
قاتل پر بھی ہوگا یہ قول امام اعظمؒ کا ہے امام شافعیؒ کے نزدیک قاتل پر کچھ واجب نہ ہوگا۔
عاقلہ پر دیت واجب ہونا اگرچہ قرآن سے مستنبط نہیں ہے لیکن احادیث مشہور سے اس کا ثبوت ملتا ہے اور اس پر اجماع
بھی ہے، یہ احادیث اگرچہ آحاد ہیں لیکن اجماع سے ان کی تائید ہونے کے بعد قرآن جیسی قوت ان میں پیدا ہو جاتی ہے۔ (گویا
عاقلہ پر دیت کا وجوب قطعی ہے) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ بنی ہذیل کی دو عورتوں میں لڑائی ہو گئی۔ ایک نے دوسری
کے پتھر مارا وہ حاملہ تھی مضروب مر گئی اور پیٹ کا بچہ بھی مر گیا رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ کیا کہ بچہ کی دیت ایک بردہ ہے۔ غلام
ہو یا باندی اور مقتول عورت کی دیت قاتلہ کے عاقلہ پر ہوگی۔ حدیث کے دوسرے الفاظ اس طرح آئے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ
نے مقتولہ کی دیت قاتلہ کے عصبات پر مقرر کر دی اور ایک بردہ کی آزادی پیٹ کے بچہ کے عوض۔
بیہقی نے امام شافعی کے طریق سے نقل کیا ہے کہ ہم نے تمام علماء میں یہ اجماعی مسئلہ پایا کہ رسول اللہ ﷺ نے حر
مسلمان کی دیت جب غلطی سے اس کو کسی حر نے قتل کیا ہو سو اونٹ قرار دی ہے اور یہ دیت مجرم کے عاقلہ پر ہوگی اور یہ بات
بھی ہم نے علماء کے اجماع میں پائی کہ کل دیت تین سال میں وصول کی جائے گی ہر سال ایک تہائی ادا کرنی ہوگی۔
بیہقی نے باسناد ابن لہیعہ سعید بن مسیب کا قول نقل کیا ہے کہ قسط وار تین سال میں دیت وصول کرنا سنت ہے۔ امام
شافعیؒ کے مذکورۂ بالا قول سے قسط وار دیت وصول ہونے پر علماء کا اجماع ثابت ہوتا ہے۔ ترمذی نے جامع میں اور ابن منذر نے
بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ ابن ابی شیبہ اور عبدالرزاق اور بیہقی نے باسناد شعبی منقطعاً نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے پوری دیت
کے لئے تین سال اور آدھی دیت کے لئے دو سال اور آدھی سے کم کے لئے ایک سال کی مدت مقرر کی ہے۔ بیہقی نے یزید بن
ابی حبیب کی روایت سے منقطعاً حضرت علی (کرم اللہ وجہ) کا بھی یہی فیصلہ نقل کیا ہے۔
مسئلہ :۔ قتل عمد میں اگر کچھ مال پر صلح ہو جائے یا بعض وارثوں کے معاف کر دینے سے قصاص ساقط ہو جائے اور مال
ادا کرنا لازم ہو جائے یا کسی اور وجہ سے قتل عمد میں قصاص کی جگہ مال دینا پڑے تو یہ ادائیگی قاتل کے مال سے ہوگی۔ عاقلہ پر دیت کا
وجوب نہ ہوگا۔ اسی طرح قاتل کے اقرار سے اگر دیت کا وجوب ہوتا ہو تو عاقلہ پر اس کی ادائیگی واجب نہیں۔ اور غلام مقتول ہو
یا قاتل بہر حال اس سلسلہ میں بھی عاقلہ پر دیت نہیں۔ مجرم کے مال سے وصول کی جائے گی۔
دار قطنی اور طبرانی نے مسند الشامیین میں حضرت عبادہؓ بن صامت کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا
عاقلہ پر (واجب) نہ قرار دو۔ اقرار کرنے والے (کے اقرار) کی دیت میں سے کچھ بھی۔ اس حدیث کی اسناد بہت ضعیف ہے اس
کی اسناد میں محمد بن سعید کذاب اور حارث بن نبہان منکر الحدیث ہے۔ دار قطنی اور بیہقی نے موقوفاً حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے

کہ غلام کے سلسلہ میں (خواہ غلام قاتل ہو یا مقتول) اور قتل عمد میں (اگر قصاص ساقط ہو گیا ہو) اور مصالحت میں اور (قاتل کے) اقرار میں (جو دیت لازم ہوتی ہو وہ) عاقلہ ادا نہیں کرے گا۔ اس حدیث کی سند منقطع ہے پھر اس میں عبدالملک بن حسین راوی بھی آیا ہے جو ضعیف ہے۔ بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قتل عمد میں یا مصالحت یا اقرار کی صورت میں اور غلام کے جرم کی صورت میں عاقلہ کچھ برداشت نہیں کرے گا۔ مؤطا میں زہری کا قول منقول ہے سنت (صحابہؓ یا سنت رسول اللہ ﷺ) اس بات پر گزری ہے کہ عاقلہ ان صورتوں میں کچھ برداشت نہیں کرے گا۔ بیہقی نے ابوالزناد کی وساطت سے فقہاء اہل مدینہ کی رائے بھی یہی نقل کی ہے۔

مسئلہ :۔ امام شافعی کے نزدیک کسی شخص کے عاقلہ اس کے قبیلہ والے اور عصبات ہوتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس کی پنچایت والے اور وہ نہ ہوں تو پھر قبیلہ والے حسب تفاوت قرابت عاقلہ شمار ہوں گے اور آزاد کردہ غلام کے عاقلہ وہ ہوں گے جو آزاد کرنے والے کے عاقلہ ہیں اور مولی الموالات (یعنی وہ دو شخص جنہوں نے باہم طے کر لیا ہو کہ ہم دونوں کا جان مال ایک ہی ہے جو ایک کا ہے وہی دوسرے کا) کے عاقلہ دوسرے کے عاقلہ ہوں گے اور اگر وہ خود موجود ہو تو وہ مع اپنے عاقلہ کے قاتل کے عاقلہ ہوں گے۔

مسئلہ :۔ عاقلہ میں سے ایک شخص پر ہر سال چار درہم سے زائد چندہ امام صاحب کے نزدیک نہیں ہو سکتا ہے دوسری روایت میں ہر سال کی جگہ تین سال کا لفظ آیا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک آدھے دینار سے زائد ایک شخص پر (تاوان) نہ ہو گا۔

مسئلہ :۔ جس کا عاقلہ نہ ہو اس کے مقتول کی دیت بیت المال میں داخل کی جائے گی (صحیح ترجمہ اس جگہ کی عبارت کا یہی ہے لیکن اس فقیر کی نظر میں اس جگہ مسئلہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ جس کے عاقلہ نہ ہوں تو مقتول کی دیت بیت المال سے ادا کی جائے گی مگر مفسر کی عبارت اس مطلب کو ادا کرنے سے قاصر ہے)۔

فصل مقدار دیت

مسئلہ :۔ علماء کا اجماع ہے کہ شبہ عمد میں دیت مغلظہ ہے اور یہی دیت مغلظہ اس قتل عمد میں بھی ہے جس میں کسی وجہ سے قصاص ساقط ہو گیا ہو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شبہ عمد کی دیت مغلظہ ایسی ہی ہے جیسے قتل عمد کی مگر شبہ عمد کے قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا اور اس کی صورت یہ ہے کہ لوگوں میں شیطان کود پڑے اور اندھا دھند سنگ باری کی گئی ہو مگر فتنہ نہ ہو اور ہتھیار کا استعمال نہ ہو۔ رواہ احمد

قتل خطا کی دوسری قسموں میں دیت خفیفہ ہے اور دیت مغلظہ صرف اونٹوں میں ہو گی۔ (چاندی سونے وغیرہ میں نہ ہو گی)۔

امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک دیت مغلظہ میں سو اونٹ اس طرح دیئے جائیں گے کہ ۲۵ بنت مخاض ۲۵ بنت لبون ۲۵ حقہ اور ۲۵ جذعہ۔ امام محمدؒ اور امام شافعی کے نزدیک ۳۰ جذعہ ۳۰ حقہ اور ۴۰ ثنیہ ادا کرنے ہوں گے۔ ثنیہ سب کے سب اونٹنیاں ہوں گی جن کے پیٹ میں بچے ہوں۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سنو قتل شبہ عمد یعنی کوڑے اور لاٹھی کے قتل میں سو ہیں جن میں سے ۴۰ ایسی ہوں جن کے پیٹ میں بچے ہوں۔ رواہ احمد و ابو داؤد والنسائی ابن حبان نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ (رسول اللہ ﷺ نے فرمایا) جس نے قصداً قتل کیا اس کو مقتول کے وارثوں کے سپرد کر دیا جائے گا۔ اگر وہ چاہیں تو اس کو (قصاص میں) قتل کر دیں اور چاہیں تو دیت لے لیں۔ ۳۰ حقہ، ۳۰ جذعہ اور چالیس باکھر جن کے پیٹ میں بچے ہوں۔ حضرت عبادہ بن صامت کی روایت میں (فرمان نبوی) آیا ہے۔

سنو سب سے بڑی دیت میں سو اونٹ ہیں جن میں سے چالیس باکھر ہوں جن کے پیٹ کے اندر بچے ہوں۔ رواہ الدار قطنی والبیہقی۔ اس حدیث کی سند میں انقطاع ہے۔

امام ابو حنیفہؒ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کے قتل میں سو اونٹ ہیں۔ لیکن اونٹنی کے پیٹ کے اندر بچہ کی موجودگی یقین کے ساتھ معلوم نہیں ہو سکتی اور معلوم بھی ہو جائے تو حمل بعض اعتبار سے خود ایک ایسا جانور ہے جو عنقریب پیٹ سے الگ ہو کر مستقل طور پر باہر جائے گا اس لئے اگر اونٹنی کے گابھن ہونے کی شرط لگائی جائے گی تو اونٹوں کی تعداد سو سے زائد ہو جائے گی لیکن امام ابو حنیفہؒ کی یہ عقلی دلیل بعض شرعی کے مقابل ہے (جو قابل قبول نہیں) یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پیٹ میں بچہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اونٹنی حاملہ ہونے کے قابل ہو۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ :۔ اونٹوں میں دیت خفیفہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس طرح ہے۔ ۲۰ جذعہ۔ ۲۰ حقہ۔ ۲۰ بنت لبون، ۲۰ بنت مخاض اور ۲۰ ابن مخاض، امام احمد کا بھی یہی قول ہے۔ امام شافعی اور امام مالک کا بھی اس سے اتفاق ہے۔ مگر ان کے نزدیک ابن مخاض کی جگہ ابن لبون ہونا چاہئے۔[۱]

امام ابو حنیفہؒ کی دلیل وہ حدیث ہے جو امام احمد اور بزار اور دار قطنی اور بیہقی اور اصحاب السنن نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے بیان کی ہے کہ قتل خطا کی دیت میں رسول اللہ ﷺ نے (سو اونٹوں کی) ڈگری دی۔ ۲۰ بنت مخاض۔ ۲۰ ابن مخاض نر، ۲۰ بنت لبون، ۲۰ حقہ اور ۲۰ جذعہ۔ اس حدیث کے سلسلۂ روایت میں حجاج بن ارطاۃ پھر زید بن جبیر پھر حشف بن مالک پھر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ آتے ہیں۔

اور امام شافعیؒ نے دار قطنی کی بیان کردہ حدیث سے استدلال کیا ہے جس کے راوی ابو عبیدہؓ ہیں ابو عبیدہؓ نے کہا کہ میرے باپ عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا قتل خطا کی دیت (سو اونٹ) پانچ حصے کر کے ہیں ۲۰ حقہ، ۲۰ جذعہ، ۲۰ بنت مخاض، ۲۰ بنت لبون، ۲۰ ابن لبون نر، دار قطنی نے لکھا ہے یہ سند حسن ہے اس کے راوی ثقہ ہیں اور مندرجہ فوق حدیث کے راویوں میں سے حشف بن مالک ضعیف راوی ہے۔ اہل علم کے نزدیک قابل ثبوت نہیں کیونکہ اول تو حشف بن مالک کی روایت ابو عبیدہؓ کی روایت کے خلاف ہے۔ ابو عبیدہؓ نے براہ راست اپنے باپ کا قول نقل کیا ہے جس کی سند صحیح ہے۔ حشف بن مالک سے زیادہ ابو عبیدہ اپنے باپ کے قول اور مسلک سے واقف تھے۔ پھر یہ بھی حضرت عبداللہؓ کی دینداری اور تقویٰ سے بعید ہے کہ کسی مسئلہ میں رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ معلوم ہونے اور اس کو خود نقل کرنے کے بعد اپنا فتویٰ اس کے خلاف دیں۔ اس کے علاوہ حشف مجہول شخص ہے اس سے روایت کرنے والا صرف زید بن جبیر ہے اور زید بن جبیر کا قول صرف حجاج بن ارطاۃ نے بیان کیا ہے اور حجاج مدلس ہے پھر حجاج کی روایت اس کے بعد والے لوگوں نے مختلف طور پر نقل کی ہے۔

ابن جوزی نے لکھا ہے کہ دار قطنی نے تو کہا تھا کہ ابو عبیدہ نے کسی حدیث کی سماعت اپنے باپ سے نہیں کی لیکن اس حدیث میں خود کہتے ہیں کہ ابو عبیدہ نے اپنے باپ سے سنا یہ کلام کا تضاد ہے پھر ثقہ راوی کی حدیث کو مجہول کہنا (صرف اس وجہ سے کہ اس سے سننے والا صرف ایک شخص ہے) غلط ہے علماء حدیث کی یہ شرط کی ہر راوی سے سننے والے اور نقل کرنے والے (کم سے کم) دو شخص ہوں بجائے خود بے دلیل بات ہے۔

حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ بیہقی نے دار قطنی کی گرفت کرتے ہوئے کہا ہے کہ دار قطنی کو وہم ہو گیا اور اسپ تازی کو کبھی ٹھوکر لگ ہی جاتی ہے۔ حافظ نے کہا میں نے خود جامع سفیان ثوری میں اول الذکر حدیث تین سلسلوں سے منقول دیکھی ہے ایک منصوبہ از ابراہیم از عبداللہ بن مسعود۔ دوسرے ابو اسحاق از علقمہ از ابن مسعود۔ تیسرے عبدالرحمٰن بن یزید بن ہارون

---

[۱] بنت مخاض ایک سال عمر کی اونٹنی جو دوسرے سال میں شروع ہو گئی ہو اگر نر ہو تو ابن مخاض کہا جائے گا، بنت لبون (مادہ) ابن لبون (نر) دو سالہ اونٹنی اور اونٹ جو تیسرے سال میں لگ گیا ہو، حقہ نر اور مادہ اونٹ جو چوتھے سال میں لگ گیا ہو جذعہ وہ نر یا مادہ اونٹ جو چار چھوڑ کر پانچویں سال میں لگ گیا ہو۔

از سلیمان تیمی از ابو مجلز از ابو عبیدہ از ابن مسعودؓ اور ان سب سلسلوں میں ابن مخاض (نر) کا ذکر آیا ہے۔
مسئلہ :۔ اگر نقد کی شکل میں دیت دی جائے تو ہزار دینار طلائی یا بارہ ہزار درہم نقرئی امام احمد کے نزدیک اور دس ہزار درہم نقرئی امام ابو حنیفہؒ کے قول پر ہونا چاہئے۔ امام شافعی نے کہا اصل تو اونٹ ہیں اگر اونٹ نہ ہوں تو پھر دو قول ہیں (۱) ہزار دینار طلائی یا ۱۲ ہزار درہم نقرئی (۲) قبضہ کے وقت اونٹوں کی قیمت کا اندازہ اور اندازہ کے مطابق روپیہ کی ادائیگی خواہ ہزار دینار اور بارہ ہزار درہم سے زائد ہو یا کم۔
ہزار دینار طلائی کا ثبوت اس حدیث سے ملتا ہے جو ابو بکر بن محمد عمرو بن خرم نے بیان کی ہے ہم آئندہ اسکو بیان کریں گے۔ نقرئی دیت کے مقدار حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دیت کے بارہ ہزار مقرر کئے۔ یہ حدیث عکرمہؒ کی روایت سے اصحاب السنن نے بیان کی ہے۔ البتہ عکرمہ سے نیچے عمرو بن دینار پر راویوں کا اختلاف ہو گیا۔ محمد بن مسلمہ طائفی نے عمرو بن دینار کی روایت سے اس کو مرفوعاً ذکر کیا ہے اور سفیان بن عیینہ نے عکرمہؒ کی روایت سے مرسلاً رواہ عبد الرزاق فی مصنفہ ابن ابی حاتم نے اپنے باپ کا قول نقل کیا ہے کہ اس کو مرسل کہنا زیادہ صحیح ہے۔ ابن حزم نے لکھا ہے کہ سفیان بن عیینہ کے مشہور شاگردوں نے اس کو مرسلاً ہی ذکر کیا ہے۔
امام ابو حنیفہؒ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک درہم کا وزن چھ وانگ تھا اور حضرت عمرؓ کے زمانہ سے سات ہو گیا، اس لئے چھ (وانگ) کے حساب کے بارہ ہزار، سات کے حساب کے تقریباً دس ہزار ہو جاتے ہیں۔
امام شافعیؒ کے (دوسرے) قول کی وجہ یہ ہے کہ عمرو بن شعیب کی حدیث میں آیا ہے کہ بستیوں والوں پر حضور ﷺ قیمت مقرر کرتے تھے اگر اونٹ گراں ہوئے تو قیمت اونچی کر دیتے تھے اور ارزاں ہوئے تو قیمت گھٹا دیتے تھے۔ یہ حدیث امام شافعیؒ نے بحوالہ مسلم بروایت ابن جریح بیان کی ہے اور ابو داؤد و نسائی نے بسلسلہ محمد بن راشد از سلیمان بن موسیٰ از عمرو بن شعیب۔
مسئلہ :۔ جمہور کے نزدیک دیت میں صرف مذکورہ بالا تین چیزیں (اونٹ دینار درہم) دینے کا ثبوت ہے لیکن امام ابو یوسفؒ و امام محمدؒ و امام احمد کے نزدیک دو سو گائیں یا دو ہزار بکریاں یا دو سو جوڑے کپڑے (ہر جوڑے میں دو کپڑے) بھی دیئے جا سکتے ہیں کیونکہ عطاء نے حضرت جابرؓ بن عبد اللہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دیت میں اونٹ والوں پر سو اونٹ اور گائے والوں پر دو سو گائیں اور بکریاں والوں پر دو ہزار بکریاں اور کپڑوں والوں پر دو سو جوڑے کپڑوں کے مقرر فرمائے۔ رواہ ابو داؤد۔
ابن جوزی نے بھی اپنے سلسلہ سے یہ حدیث نقل کی ہے اور اس پر کوئی جرح نہیں کی۔ ابو داؤد نے اس کو عطا کی روایت سے مراسیل میں ذکر کیا ہے اور حضرت جابرؓ بن عبد اللہ کا نام ذکر نہیں کیا۔
مسئلہ :۔ قتل کو چھوڑ کر عام طور پر زخمی کرنے کی دیت ابو بکر بن محمد بن عمرو بن خرم کی روایت کردہ حدیث میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل یمن کو نامہ مبارک بھیجا جس میں لکھا تھا کہ جو شخص کسی مومن کو مار ڈالے اس کو پکڑ کر (وارثوں کو) قصاص کے لئے دیا جائے مگر مقتول کے وارث اگر راضی ہوں (تو دیت دی جائے) مرد کو عورت کے عوض قتل کیا جائے۔ قتل کی دیت سو اونٹ ہے اور سونے والوں پر ایک ہزار دینار (طلائی) ناک پوری کاٹ لی جائے تو (پوری) دیت سو اونٹ ہیں دانتوں کے توڑنے میں دیت ہے، لبوں کو کاٹ ڈالنے میں دیت ہے، دونوں خصیوں (کو بیکار کر دینے) میں دیت ہے، ذکر (کاٹ دینے یا بیکار کر دینے) میں دیت ہے، پشت (توڑ دینے) میں دیت ہے، دونوں آنکھوں کے (پھوڑ دینے) میں دیت ہے۔ دونوں ہاتھ (کاٹ ڈالنے یا توڑ دینے) میں سو اونٹ ہیں اور ایک ہاتھ میں پچاس، دونوں پاؤں (توڑنے یا کاٹنے) میں پوری دیت ہے اور ایک ٹانگ میں آدھی دیت ہے۔ اور جو چوٹ ام الدماغ (دماغی جھلی) تک پہنچ جائے اس میں کل دیت کا ایک تہائی حصہ ہے اور جو ضرب جوف کے اندر پہنچ جائے اس میں ایک تہائی دیت ہے اور ہڈی کو جگہ سے ہٹا دینے والی ضرب میں پندرہ اونٹ ہیں اور

میں پانچ اونٹ ہیں۔ رواہ النسائی
ہاتھ یا پاؤں کی کوئی انگلی (ٹوٹ یا کٹ گئی) ہو تو دس اونٹ ہیں اور دانت (ٹوٹ گیا ہو تو اس) میں پانچ اونٹ ہیں۔ رواہ النسائی والدارمی۔ مالکؒ کی روایت میں اتنا زائد ہے اور آنکھ (پھوٹنے) میں پچاس اونٹ ہیں اور ہڈی کو کھول دینے والی چوٹ میں پانچ ہیں۔
اس حدیث کی صحت کے متعلق علماء حدیث کا اختلاف ہے۔ ابوداؤد نے مراسیل میں کہا ہے کہ اس حدیث کی سند بیان کی گئی ہے مگر وہ صحیح نہیں ہے حاکم، ابن حبان اور بیہقی نے اس کو صحیح کہا ہے۔ امام احمدؒ نے فرمایا مجھے امید ہے کہ یہ حدیث صحیح ہو گی۔
آئمہ کی ایک جماعت نے اگرچہ سند کے اعتبار سے اس کو صحیح نہیں مانا ہے مگر رسول اللہ ﷺ کی تحریر کی وجہ سے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور حضور کا خط مشہور ہی ہے تو (گویا) شہرت کی وجہ سے اس کو صحیح مانا گیا۔ امام شافعی نے اپنے رسالہ میں کہا ہے کہ علماء نے اس حدیث کو اس وقت تک قبول نہیں کیا جب تک ان کو ثابت نہیں ہو گیا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی تحریر کردہ ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا یہ تحریر مشہور ہے اور اس کا مضمون اہل علم خوب جانتے ہیں اس کی شہرت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ سند کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ لوگوں نے اس کو قبول کر لیا اور مان لیا ہے گویا یہ متواتر کے مشابہ ہو گئی (ہمہ گیر شہرت کی وجہ سے بغیر سند کے قابل قبول ہے) حاکم نے لکھا ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ اور امام زمانہ زہری نے اس تحریر کی صحت کی شہادت دی ہے۔
عبدالرزاق نے اپنی سند سے سعید بن مسیب کا بیان نقل کیا ہے کہ ضرب جب جوف کے اندر پار ہو گئی تو حضرت ابو بکرؓ نے دو تہائی (دیت دینے) کا فیصلہ کیا۔ ابن ابی شیبہ نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے دار قطنی نے موقوفاً حضرت زید بن ثابتؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ہڈی کو توڑنے والی ضرب میں دس اونٹ ہیں۔ عبدالرزاق اور بیہقی نے بھی اس حدیث کا استخراج کیا ہے اور بیہقی نے اس کو مرفوع کیا ہے مگر مرفوع ہونا صحیح نہیں ہے۔
ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے بحوالہ ابن ابی اسحاق مکحول کی روایت نقل کی ہے کہ ہڈی کھول دینے والی چوٹ میں رسول اللہ ﷺ نے پانچ اونٹ دینا مقرر کیا ہے اور اس سے کم چوٹ میں مقدار دیت کی تعین نہیں فرمائی۔ عبدالرزاق نے حسن کی روایت سے لکھا ہے کہ کھول دینے والی چوٹ سے کم میں رسول اللہ ﷺ نے کچھ دینے کا فیصلہ نہیں کیا۔ اس حدیث کو بیہقی نے زہری، ربیعہ ابوالزناد اور اسحاق بن ابی طلحہ کی روایت سے مرسلاً بیان کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کو برابر قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ (سب) دانت برابر ہیں۔ دانت اور ڈاڑھ برابر ہے اور یہ اور یہ برابر ہیں اس حدیث کو ابوداؤد اور بزار نے مکمل اور ابن ماجہ نے مختصر نقل کیا ہے اور ابن حبان نے بھی لکھا ہے صحیح بخاری میں ہے یہ اور یہ برابر ہیں یعنی چھنگلی اور انگوٹھا برابر ہیں۔
ابوداؤد نسائی اور ابن ماجہ نے عمرو بن شعیب کی روایت سے حدیث کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں، انگلیاں اور دانت برابر ہیں، ہر انگلی میں دس اونٹ ہیں اور ہر دانت میں پانچ اونٹ۔ ابن ابی شیبہ نے زمانہ حجاج کے ایک بوڑھے آدمی کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک شخص نے دوسرے کے سر پر پتھر مارا چوٹ سے اس کی شنوائی اور قوت فہم اور گویائی اور مردمی جاتی رہی مگر زندہ رہا عورتوں سے قربت صنفی نہیں کر سکتا تھا حضرت عمرؓ نے اس کے معاملہ میں چار دیتیں نافذ فرمائیں (یعنی مضروب کو چار گنی دیت دلوائی)۔
مسئلہ :۔ عورت کو قتل اور زخمی کرنے کی دیت مرد کو قتل اور زخمی کرنے کی دیت سے آدھی ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا تہائی دیت سے کم کی تنصیف ہو گی۔ آخر میں شافعیؒ نے اس قول سے رجوع کر لیا اور جمہور کا مسلک اختیار کر لیا۔
امام شافعی نے بروایت امام محمد بن حسن از امام ابو حنیفہ از حماد از ابراہیم نخعی بیان کیا کہ حضرت علیؓ نے فرمایا عورت کے قتل اور قتل سے کم (ضرب) کی دیت مرد کی دیت سے آدھی ہے۔ سعید بن منصور نے زیادہ وغیرہ کی وساطت سے شعبی کا قول نقل کیا کہ حضرت علی فرماتے تھے عورتوں کی چوٹ کی دیت مرد کی چوٹ کی دیت سے نصف ہے دیت کم ہو یا زیادہ۔

بغوی نے حضرت زید بن ثابتؓ کا قول نقل کیا ہے کہ مردوں اور عورتوں کی چوٹ کی دیت ایک تہائی تک برابر ہے (یعنی کمی بیشی نہ ہوگی) اور تہائی سے زائد ہو تو عورت کی دیت مرد کی دیت سے آدھی ہوگی، حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا مگر دانت اور ہڈی کھول دینے والی ضرب (کی دیت) اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس میں دونوں کی دیت برابر ہے لیکن حضرت علیؓ نے (اس میں بھی) نصف دیت قرار دی ہے۔

سعید بن منصور نے بحوالہ منصور بوساطت ہشیم بروایت مغیرہ از ابراہیم نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا چھنگلی اور انگوٹھا برابر ہیں اور مرد و عورت دانت کی شکستگی اور ہڈی کو کھول دینے والی ضرب کی دیت میں برابر ہیں۔ اس کے علاوہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے آدھی ہے۔ بیہقی نے بروایت سفیان از جابر از شعبی نقل کیا ہے کہ شریح نے کہا مجھے حضرت عمرؓ نے یہی لکھ کر بھیجا تھا۔

نسائی نے بروایت اسماعیل بن عیاش از ابن جریج از عمرو بن شعیب لکھا ہے کہ تہائی دیت تک عورت کی ضرب کی دیت مرد کی ضرب کی دیت کی طرح ہے۔ امام مالکؒ نے حضرت زید بن ثابت، حضرت عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کے قول کو اختیار کیا۔ امام شافعیؒ نے فرمایا امام مالک کہتے تھے کہ یہ سنت ہے میں اس فیصلہ میں ان کا اتباع تو کرتا تھا مگر سنت ہونے میں مجھے کچھ شبہ تھا پھر مجھے معلوم ہوا کہ سنت کہنے سے امام مالکؒ کی مراد یہ ہے کہ اہل مدینہ کی سنت ہے یہ معلوم ہونے کے بعد میں نے اپنا شبہ دور کر دیا۔ شعبی کے نزدیک سب سے زیادہ عجیب فتویٰ حضرت علیؓ کا ہے مگر جمہور نے اسی کو اختیار کیا ہے کیونکہ عورت کے احوال مرد کے احوال سے بہر حال ناقص ہیں اور اس کی افادیت مرد کی افادیت سے کم ہے۔ قتل کے معاملہ میں دیت کا آدھا ہونا تو اجماعاً ثابت ہے لہٰذا اجزاء جسمانی کی ضرب کی صورت میں بھی بدل مالی نصف ہونا چاہئے اور تہائی یا تہائی سے زائد کی صورت پر بھی قیاس کا تقاضا یہی ہے۔

مسئلہ :۔ امام شافعیؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک غلام اور باندی کی دیت اتنی ہی ہے جتنی ان کی قیمت ہو خواہ کتنی ہی ہو امام اعظمؒ اور امام محمدؒ کا بھی یہی قول ہے مگر ان کے نزدیک اتنی بات زائد ہے کہ اگر غلام کی قیمت دس ہزار یا اس سے زائد ہو اور باندی کی قیمت پانچ ہزار یا اس سے زائد ہو تو ہر ایک کی قیمت میں سے دس درہم کم کر دیئے جائیں گے۔ اسی طرح غلام کے زخمی ہونے کی دیت اس کی قیمت کے تناسب سے اور آزاد کے زخمی ہونے کا معاوضہ اس کی پوری دیت کے تناسب سے ہوگا۔ بیہقی نے حضرت عمر و حضرت علیؓ کا فرمان نقل کیا ہے۔ دونوں نے فرمایا کہ جو آزاد غلام کو قتل کر دے اس پر غلام کی قیمت ادا کرنا لازم ہے خواہ کتنی ہی ہو۔ عبدالرزاق نے لکھا ہے کہ غلام کی قیمت کو آزاد کی دیت کی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قرار دیا۔ یہ روایت منقطع ہے۔

ابن ابی شیبہ نے حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے اور امام شافعیؒ نے صحیح سند کے ساتھ زہری کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے کہ غلام کے زخمی ہونے کا معاوضہ اس کی قیمت کے تناسب سے ایسا ہی ہے جیسے آزاد کے زخمی ہونے کا معاوضہ اس کی دیت کے تناسب سے۔

امام اعظمؒ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ یہ حکم آزاد کو بھی شامل ہے اور غلام کو بھی۔ اسی لئے غلام کو قتل کرنے سے کفارہ واجب ہوتا ہے پس غلام کو غلطی سے قتل کرنے پر دیت اور بحیثیت آدمیت اس کی جان کا عوض لازم ہے لہٰذا حر کی دیت سے زائد یا برابر غلام کی دیت نہ ہونی چاہئے کیونکہ غلام کی آدمیت ناقص ہے بعض حیثیتوں سے وہ مال ہے اور بعض جہات سے آدمی، دیکھو آزاد عورت کی دیت باوجودیکہ وہ کامل آدمی ہوتی ہے آزاد مرد کی دیت سے کم ہے لیکن اگر کسی غلام کو جس کی قیمت ۲۰ ہزار تھی غصب کر لیا اور غلام غاصب کے قبضہ میں آکر مر گیا تو پوری قیمت دینی ہوگی خواہ کتنی ہی ہو غصب کا تاوان محض مالیت کے لحاظ سے ہوتا ہے (ضمان نفس نہیں ہوتا)۔

مسئلہ :۔ اگر غلام نے کسی کو غلطی سے قتل کر دیا تو آقا سے کہا جائے گا غلام کو اس جرم کے عوض مضروب یا اولیاء

مقتول کو دیدو یا تاوان ادا کرو امام شافعیؒ نے فرمایا غلام کا جرم اس کی گردن سے وابستہ رہے گا۔ ہاں اگر اس کا آقا تاوان ادا کردے تو خیر! اس اختلاف کا حاصل اس وقت نکلے گا کہ آزادی کے بعد (تاوان ادا کرنے سے پہلے) وصول دیت کے لئے غلام کو پکڑا جائے گا یا آقا کو۔ امام شافعیؒ کے نزدیک غلام کو پکڑا جائے گا۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا اگر آقا کو غلام کے جرم کا علم ہو گیا تھا اور علم کے بعد اس نے آزاد کیا تو آقا کو غلام کے جرم کا عوض ادا کرنے کا اختیار ہے اور اگر جرم کا علم حاصل ہونے سے پہلے آزاد کیا ہو تو آقا پر تاوان لازم ہے یا ادائے قیمت جو بھی کم ہو وہی دیا جائے گا۔

مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰٓ أَهْلِهِۦٓ مقتول کے گھر والوں کو یعنی وارثوں کو دی جائے دوسرے ترکہ کی طرح وارث اس میں تصرف کریں گے یعنی اول کفن دفن میں صرف ہو گا پھر مقتول کا قرض ادا کیا جائے گا۔ پھر جتنا مال باقی رہے گا اس کے ایک تہائی کو وصیت میں دیا جائے گا (بشرطیکہ ایک تہائی یا تہائی سے زائد کی وصیت ہو اور اگر ایک تہائی سے کم کی وصیت ہو تو جتنی وصیت ہو گی اس کو پورا کیا جائے گا) اور اگر وارث چاہیں تو ایک تہائی سے زائد مال بھی وصیت میں دے سکتے ہیں۔ اس کے بعد وارثوں کو تقسیم کیا جائے۔

إِلَّآ أَن يَصَّدَّقُوا۟ ۚ مگر اگر وارث دیت کو صدقہ کر دیں یعنی معاف کر دیں (اور قاتل سے نہ لیں) یا مرنے سے پہلے مقتول معاف کر دے۔ معافی کو صدقہ سے تعبیر کرنے سے غرض ہے معاف کر دینے کی ترغیب دینا اور معافی کی فضیلت ظاہر کرنا (کہ معافی ایک قسم کا اپنی طرف سے صدقہ ہے لہٰذا معاف کر دینا بہتر ہے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر بھلائی صدقہ ہے۔ بخاری بروایت جابرؓ و مسلم بروایت حذیفہ جو لوگ صدقہ کے مال کو مال کا میل کچیل سمجھتے ہیں اسی لئے صدقہ قبول نہیں کرتے ان کو (بصورت معافی) دینے کی آیت میں ترغیب ہے۔

فَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ پس اگر مقتول خود تو مسلمان ہو مگر ہو تمہارے دشمن کی قوم میں سے یعنی کافروں کی قوم میں سے۔

فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۖ تو (قتل کا) عوض مسلمان بردہ کو آزاد کرنا ہے یعنی دیت نہیں دی جائے گی۔

آیت کا مطلب دو طرح سے بیان کیا گیا ہے (۱) کوئی مسلمان دار الحرب میں رہ گیا ہو ہجرت کر کے دار الاسلام میں نہ آیا ہو یا ہجرت کر کے آ گیا پھر دار الحرب کو واپس چلا گیا ہو مگر اسلام سے نہ پھرا ہو اور اس کو کوئی مسلمان غلطی سے مار ڈالے تو چونکہ اس نے گناہ کیا اس لئے کفارہ واجب ہے مگر دیت واجب نہیں کیونکہ عصمت دم کی قیمت دار الاسلام پر موقوف ہے اور دار الاسلام تھا نہیں (واقعہ دار الحرب کا ہے) اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ عاقلہ کو جو دیت ادا کرنی پڑتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مقتول کو بچانا ان کا فرض تھا جو انہوں نے ادا نہیں کیا مگر نصرت و امداد کا وقوع تو دار الاسلام میں ممکن ہے دار الحرب میں تو تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

ابن المنذرؒ نے حضرت جریرؓ بن عبد اللہ البجلی کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو مشرکوں کے ساتھ اقامت پذیر رہا اس سے (ہماری) ذمہ داری الگ ہے۔

(۲) مقتول مسلمان تھا دار الاسلام میں تھا مگر تھا کافر خاندان میں سے اس کا خاندان کنبہ کافر تھا اور دار الحرب میں تھا جس سے مسلمانوں کی جنگ تھی جیسے حارث بن زید تھے اس صورت میں قتل کا کفارہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا ہے دیت واجب نہیں کیونکہ مسلمانوں کا اس قوم سے کوئی معاہدہ نہیں اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ مسلمان اور کافر کے درمیان (اختلاف دین کی وجہ سے) وراثت کا قانون بھی جاری نہیں۔

اول مطلب زیادہ صحیح ہے کیونکہ اگر مقتول کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کی دیت بیت المال میں داخل کر دی جائے گی۔ لیکن آیت کے عموم سے موخر الذکر مطلب کی ترجیح ہو رہی ہے۔

وَإِن كَانَ مِن قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَٰقٌ اور اگر مقتول اس قوم میں سے ہو جس کا تم سے

معاہدہ ہے یعنی اہل معاہدہ اور اہل ذمہ میں سے ہو۔ [1]

فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ تو قتل کے عوض دیت ادا کرنی اور مقتول کے وارثوں کو دینی واجب ہے۔ ادائے دیت کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ مقتول کافر ذمی یا معاہد ہو یا مقتول مسلمان ہو اور اس کا وارث بھی مسلمان ہو۔ ان دو صورتوں کے علاوہ مقتول کے وارثوں کو دیت دینے کی کوئی شکل نہیں۔ بیت المال میں داخل کر دی جائے گی۔

صاحب مدارک نے لکھا ہے اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ ذمی کی دیت مسلمان کی دیت کی طرح ہے۔ میں کہتا ہوں آیت میں کوئی ایسی دلیل نہیں۔ دیت تو (قرآن میں) مجمل ہے اس کی توضیح احادیث میں مختلف طور پر منقول ہے۔ مرد و عورت اور آزاد و غلام کی دیت میں جو اختلاف ہے ہم اوپر لکھ چکے ہیں پس ہو سکتا ہے کہ مسلم اور کافر کی دیت میں بھی اختلاف ہو۔

مسئلہ :- امام اعظمؒ کے نزدیک مسلمان اور کافر کی دیت برابر ہے۔ امام مالکؒ نے کہا کافر جس قسم کا بھی ہو اس کی دیت مسلمان کی دیت سے آدھی ہے یعنی چھ ہزار درہم۔ امام شافعیؒ نے کہا یہودی اور عیسائی کی دیت چار ہزار درہم ہے اور مجوسی نیز بت پرست کی دیت آٹھ سو درہم۔ امام احمدؒ نے کہا اگر قتل عمد ہو تو، تو مسلمان پر اس کی دیت ایسی ہی ہے جیسے مسلمان کی اور اگر قتل خطا ہو تو مجوسی اور وثنی کی دیت آٹھ سو درہم ہے اور کتابی کے متعلق امام احمد کے دو قول آئے ہیں ایک قول امام مالک کے قول کی طرح ہے اور دوسرا قول امام شافعی کے قول کی طرح ہے۔ امام مالکؒ کی دلیل وہ حدیث ہے جس کے راوی عمرو بن شعیب از شعیب از والد شعیب ہیں یہ حدیث دو طرح سے آئی ہے ایک کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کافر کی دیت مسلمان کی دیت سے آدھی ہے۔ دوسری حدیث بایں الفاظ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کتابی عیسائی اور یہودی کی دیت مسلمان کی دیت سے آدھی ہونے کا فیصلہ کیا۔

امام شافعی نے جو اہل کتاب یعنی عیسائیوں اور یہودیوں کی دیت بیان کی ہے اس کی دلیل عمرو بن شعیبؒ از شعیبؒ از والد شعیبؒ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دیت کی قیمت سو دینار یا آٹھ ہزار درہم تھی اور اہل کتاب کی دیت مسلمان کی دیت سے آدھی ہوتی تھی حضرت عمرؓ کے آغاز خلافت تک یہ بات رہی جب آپ خلیفہ ہوئے تو آپ نے ایک تقریر کی اور فرمایا اونٹ گراں ہو گئے ہیں چنانچہ آپ نے نقد دیت دینے والوں پر ہزار دینار طلائی یا بارہ ہزار درہم نقرئی مقرر کئے اور گائے والوں پر دو سو گائیں اور بکریاں والوں پر دو ہزار بکریاں اور کپڑے والوں پر دو سو جوڑے لیکن ذمیوں کی دیت نہیں بڑھائی۔ رواہ ابو داؤد۔ امام شافعیؒ نے فضیل بن عیاض کے سلسلہ سے سعید بن المسیب کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہودی اور نصرانی کی دیت چار ہزار درہم اور مجوسی کی آٹھ سو درہم مقرر کی۔ دار قطنی نے بھی اپنی سند سے سعید بن میبّب کا یہ بیان نقل کیا ہے۔

بیہقی نے جو امام شافعی کے طریق سے روایت نقل کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سعید بن میبّب نے معاہد کی دیت کے سلسلہ میں فرمایا حضرت عثمانؓ نے (معاہد کی دیت میں) چار ہزار درہم کا فیصلہ کیا تھا۔ بیہقی اور دار قطنی نے مجوسی عورت (کے قتل کی دیت) کے متعلق حضرت عمرؓ کا فرمان نقل کیا ہے کہ مجوسیہ (کی دیت) چار سو درہم ہے۔ ابن حزم نے ایصال میں حضرت عقبہ بن عامر کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ مجوسی کی دیت آٹھ سو درہم ہے طحاوی اور ابن عدی اور بیہقی نے بھی یہ حدیث بیان کی ہے مگر اس کی سند ضعیف ہے کیونکہ اس سند میں ایک راوی ابن لہیعہ ہے۔ حضرت عقبہ بن

---

[1] ابن ابی شیبہ، ابن ابی حاتم، حاکم، طبرانی اور بیہقی نے سنن میں لکھا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے آیت فَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ کے ذیل میں فرمایا بعض لوگ حاضر ہو کر مسلمان ہو جاتے پھر واپس جا کر اپنی قوم کے پاس رہنے لگتے اور قوم والے کافر ہوتے، مسلمان جب اس قوم پر چڑھائی کرتے تو وہ مسلمان بھی نادانستگی میں ان کے ہاتھ سے مارا جاتا، نتیجہ میں غلطی سے قتل کرنے والا ایک بردہ آزاد کر دیتا، اور آیت وَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ کی تشریح میں حضرت ابن عباس نے فرمایا بعض لوگ معاہد ہوتے تھے اور ان کی قوم بھی مسلمانوں کی معاہد ہوتی تھی مگر کسی کے ہاتھ سے معاہد قوم کا کوئی شخص مارا جاتا تو مارنے والا اس کی قوم کی دیت دیتا اور ایک بردہ بھی آزاد کرتا تھا۔

عامرؒ نے فرمایا حضرت عثمان کی خلافت میں ایک شخص نے ایک بے نظیر شکاری کتے کو قتل کر دیا جس کی قیمت آٹھ سو درہم جانچی گئی حضرت عثمان نے یہی قیمت دلوادی پس مجوسی کی قیمت کے برابر ہو گئی۔

بیہقی نے زہری کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ مجوسی کی دیت آٹھ سو درہم سونے کے قائل تھے۔ امام ابو حنیفہؒ کی دلیل حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ذمی کی دیت مسلمان کی دیت (کے برابر) ہے۔ رواہ الطبرانی فی الاوسط۔ ہدایہ میں یہ الفاظ آئے ہیں۔ ہر معاہد کی دیت معاہد ہونے کی حالت میں ہزار دینار ہے۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمرؓ نے یہی فیصلہ کیا تھا۔ میں کہتا ہوں طبرانی کی روایت کردہ حدیث دار قطنی نے بھی نقل کی ہے لیکن یہ بھی صراحت کی ہے کہ نافع (حضرت ابن عمرؓ کے شاگرد) سے سوائے ابو بکر قرشی نہدی عبداللہ بن عبدالملک کے اور کسی نے یہ حدیث نقل نہیں کی اور نہدی متروک الحدیث ہے۔ دار قطنی نے صراحت کر دی ہے کہ یہ حدیث باطل اور بے اصل ہے ابن حبان نے بھی کہا یہ حدیث باطل، اس کے کلام رسول اللہ ﷺ ہونے کی کوئی اصل نہیں اور ابو بکر قابل استناد نہیں۔

دار قطنی نے حضرت اسامہ بن زیدؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے معاہد کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر مقرر کی، دار قطنی نے کہا اس کی سند میں عثمان بن عبدالرحمن وقاصی ہے جو متروک الحدیث ہے دار قطنی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ قبیلہ بنی عامر کے دو شخصوں کی دیت رسول اللہ ﷺ نے مسلمان کی دیت کے برابر قرار دی تھی۔ اس حدیث کا ایک درمیانی راوی ابو بکر عیاش ہے۔ عیاش نے کہا یہ دونوں شخص معاہد تھے۔ دار قطنی نے کہا اس حدیث کی سند میں ایک راوی ابو سعید بن مرزبان بقال ہے جس کو یحییٰ نے ہیچ کہا ہے اور فلاس نے متروک۔

رہا حضرت عمرؓ کا اثر اس کو عبدالرزاق نے مصنف میں رباح کی وساطت سے بروایت عبیداللہ از حمید از انسؓ بیان کیا۔ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ ایک یہودی بلا قصد مارا گیا۔ حضرت عمرؓ نے بارہ ہزار درہم (دیت کا) فیصلہ کیا۔ اس سلسلہ میں رباح ضعیف ہے۔

طحاوی اور حاکم نے جعفر بن عبداللہ بن حکم کی روایت سے لکھا ہے کہ رفاعہ بن اشموئل یہودی ملک شام میں مارا گیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کی دیت ایک ہزار دینار مقرر کی۔ امام احمد نے ان احادیث کو جن سے امام ابو حنیفہ نے استدلال کیا ہے قتل عمد پر اور دوسرے لوگوں نے جو احادیث پیش کی ہیں ان کو قتل خطا پر محمول کیا ہے۔

وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ اور ایک مسلمان بردہ آزاد کرنا۔ یعنی قاتل کے پاس اگر موجود ہو یا ضروریات کی تکمیل اور ادائے قرض کے بعد اتنا روپیہ بچ رہے کہ وہ بردہ خرید سکتا ہو تو اس کو ایک بردہ آزاد کرنا چاہئے۔

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ لیکن جس کو بردہ نہ ملے۔

فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تو اس پر دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا واجب ہے۔

اگر دو ماہ میں ایک دن بھی بلا عذر روزہ رکھنے سے رہ گیا یا نیت کرنا بھول گیا یا کسی دوسرے روزے کی نیت کر لی تو اجماعی فیصلہ ہے کہ اس کو از سر نو روزے رکھنا چاہئے کیونکہ پے در پے تسلسل کے ساتھ روزے رکھنا ضروری ہے لیکن حیض کی وجہ سے اگر عورت کو روزے ناغہ کرنے پڑ جائیں تو باتفاق علماء اس کو از سر نو روزے رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر بیماری یا سفر کی وجہ سے روزہ نہیں رکھا تو جمہور کے نزدیک از سر نو رکھنا چاہئے لیکن شافعی کا قدیم قول ہے کہ نئے سرے سے رکھنا ضروری نہیں۔ ابن ابی حاتم نے مجاہد کا قول بھی یہ ہی نقل کیا ہے۔ اگر روزہ رکھنے سے عاجز ہو تو صرف کھانا کھلانا۔ امام اعظمؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک کافی نہیں اور شافعی کا بھی صحیح ترین قول یہی ہے لیکن شافعیؒ کا دوسرا قول اور امام احمد کا مسلک یہ ہے کہ ظہار کی طرح اس صورت میں بھی کھانا کھلانا کافی ہوگا۔ ابن ابی حاتم نے مجاہد کا قول اس طرح بھی نقل کیا ہے۔

ہم کہتے ہیں یہ ظہار پر قیاس کرنا بغیر کسی قیاسی وجہ کے ہے۔ آیت میں تو واجب مجموعہ کو قرار دیا ہے (قیاس اور وہ بھی بغیر

علت جامعہ کے نص کے مقابلہ میں متروک ہے)۔
تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ بطور توبہ کے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کی ہوئی ہے توبۃ یا علت حکم (مفعول لہ) ہے یعنی سابق حکم اس لئے دیا گیا تاکہ اللہ تم پر مہربانی فرمائے۔ یا مفعول مطلق ہے (شروع ترجمہ اسی مفہوم کو ظاہر کر رہا ہے) یا مضاف محذوف ہے اور اس وقت صیام شہرین سے حال ہوگا یعنی روزے رکھنا ایسی حالت میں ہے کہ قبول توبہ ہو وغیرہ وغیرہ۔
وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾ اور اللہ بڑے علم و حکمت والا ہے یعنی وہ قاتل کی حالت کو جانتا ہے اور جو کچھ اس نے مقرر کیا ہے اس کی مصلحت سے واقف ہے۔
بغوی نے لکھا ہے کہ مقیس بن ضبابہ کندی اور اس کا بھائی ہشام مسلمان ہوگئے ایک روز مقیس کو محلہ بنی النجار میں ہشام کی لاش ملی وہ خدمت گرامی میں حاضر ہوا اور واقعہ عرض کیا۔ حضور ﷺ نے اس کے ساتھ ایک فہری شخص کو بھیج دیا اور بنی نجار کو کہلا بھیجا کہ رسول اللہ ﷺ کا حکم ہے اگر تم ہشام کے قاتل سے واقف ہو تو اس کو مقیس کے حوالہ کرو تاکہ وہ اپنے بھائی کا قصاص لے لے اور نہیں جانتے ہو تو ہشام کی دیت ادا کرو۔ فہری نے رسول اللہ ﷺ کا پیام پہنچا دیا۔ بنی نجار نے جواب دیا اللہ کے رسول کا حکم سر آنکھوں پر ہم کو ہشام کا قاتل تو معلوم نہیں۔ ہاں ہم دیت ادا کرتے ہیں چنانچہ انہوں نے مقیس کو سو اونٹ دیدیئے۔ مقیس اور فہری لوٹ آئے راستہ میں مقیس کو شیطان نے بہکایا اس نے خیال کیا کہ اگر میں دیت لے کر بیٹھ رہوں گا تو یہ بڑی ذلت کی بات ہوگی۔ بہتر یہ ہے کہ میں فہری کو قتل کردوں تاکہ جی کا بدلہ جی ہو جائے اور دیت مزید بچ رہے چنانچہ اس نے فہری کو غافل پا کر زور سے ایک پتھر مارا اور اس کا سر پھاڑ دیا (فہری مر گیا) پھر اونٹ پر سوار ہو کر باقی اونٹوں کو ہنکا کر مکہ لے گیا اور مرتد ہو گیا۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔
وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا اور جو مسلمان کو قصداً مار ڈالے۔ یعنی مومن کو مومن ہونے کی وجہ سے قتل کردے یا اس کے قتل کو حلال سمجھتے ہوئے قتل کردے۔ جیسے مقیس نے فہری کے ساتھ کیا تھا۔
امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا کسی بھاری پتھر سے قتل کرنا شبہ عمد ہے۔ بغوی کے بیان کردہ قصہ سے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ فہری کا پتھر سے قتل عمد تھا کیونکہ اسی کے سلسلے میں وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا نازل ہوا اس لئے امام ابو حنیفہؒ کا قول غلط ہے۔
اس کا جواب حسب روایت جرجانی اس طرح دیا جا سکتا ہے کہ گناہ میں شبہ عمد بھی قتل عمد کی طرح ہے اسی لئے شبہ عمد کا کفارہ نہیں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ قتل عمد کا قصاص ہوتا ہے اور شبہ عمد میں چونکہ شبہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے موجب قصاص نہیں ہے اور اس آیت کا اقتضاء گناہ میں مساوات ہے۔ قصاص میں برابری نہیں۔
فائدہ :- بغوی نے لکھا ہے کہ مقیس بن ضبابہ وہی شخص ہے کہ فتح مکہ کے دن عمومی حکم امن سے رسول اللہ ﷺ نے اس کو مستثنیٰ کر دیا تھا (یعنی اس کے متعلق امن دینے کا حکم نہ تھا) چنانچہ جس وقت یہ کعبہ کا پردہ پکڑے ہوئے تھا اس کو قتل کر دیا گیا (کیونکہ بغیر جنگ کے دھوکہ سے فہری کو قتل کیا تھا اور مرتد ہو گیا تھا۔
ابن جریر نے ابن جریج کی وساطت سے عکرمہ کا قول نقل کیا ہے کہ ایک انصاری نے مقیس بن ضبابہ کے بھائی کو مار ڈالا رسول اللہ ﷺ نے مقیس کو اس کے بھائی کی دیت عطا فرما دی اور اس نے قبول بھی کر لی، پھر مدت کے بعد اپنے بھائی کے قاتل پر حملہ کر دیا اور اس کو مار ڈالا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق فرمایا میں اس کو پناہ نہیں دیتا نہ حرم کے اندر نہ حرم کے باہر (جہاں ملے قتل کر دیا جائے) چنانچہ فتح مکہ کے دن اس کو قتل کر دیا گیا۔ ابن جریج نے کہا اسی کے متعلق آیت کا نزول ہوا۔
یہ روایت بظاہر مرسل ہے لیکن ابو داؤد نے بیان کیا ہے کہ عکرمہ نے کہا میں تفسیر کے سلسلہ میں جو بات کہتا ہوں وہ حضرت ابن عباسؓ کی کہی ہوئی ہوتی ہے (خواہ میں ان کا نام لوں یا نہ لوں) اس صورت میں روایت متصل ہو جائے گی۔ اس روایت کا تقاضا ہے کہ ہشام کا قاتل معلوم ہو اور قتل (عمد نہ ہو) خطا ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے دیت کا حکم دیا تھا اور بغوی کی راویت سے معلوم ہوتا ہے کہ قاتل معلوم نہ تھا اور قاتل معلوم نہ ہو تو قسامت اور دیت کا حکم دیا جائے گا۔ قسامت کے مسائل اور

شرائط اور ان میں اختلاف کی تفصیل اپنی جگہ مذکور ہے یہاں اس کی گنجائش نہیں۔

فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ چونکہ ایمان سے وہ نفرت کرتا ہے یا قتل کو جائز سمجھتا ہے اس لئے اس کا کافر ہونا ضروری ہو گیا اور کفر کی سزا دوامی جہنم ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ خلود سے مراد ہے لمبی مدت تک رہنا۔ ضعیف سند سے طبرانی نے ابوہریرہؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ نے اس آیت کے بعد فرمایا اگر اللہ اس کو سزا دے (تو اس کی سزا دوامی جہنم ہے)۔

وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيمًا ﴿۹۳﴾ اور اللہ کا غضب اس پر ہو گا، اور اللہ اپنی رحمت سے اس کو دور کر دے گا اور اللہ نے اس کے لئے بڑا عذاب تیار کیا ہے۔

شیخین نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قصداً مومن کو قتل کرنے والے کی توبہ قبول نہیں۔ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا ہے کہ عمداً مومن کے قاتل کے لئے توبہ نہیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے سوال کیا گیا، اللہ تو فرماتا ہے وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ...... اِلٰى قَوْلِهٖ ...... وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا اِلَّا مَنْ تَابَ (یعنی آیت میں تو صراحت ہے کہ قاتل کی توبہ قبول کی جائے گی اور توبہ کرنے والا قاتل دوامی سزا سے مستثنیٰ ہے) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہ جاہلیت میں تھا کچھ مشرک جنہوں نے قتل وزنا کے جرائم کا ارتکاب کیا تھا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا آپ ہم کو جس بات کی دعوت دے رہے ہیں وہ ہے تو اچھی کاش آپ یہ بھی بتا دیتے کہ جو کچھ ہم کر چکے ہیں یہ اس کا کفارہ ہو جائے گا اس پر نازل ہوا والذین لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ...... اِلٰى قَوْلِهٖ ...... اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ پس یہ وہی لوگ ہیں۔ باقی سورۂ نساء میں یعنی فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا جو آیا ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ جو شخص مسلمان ہو گیا اور اسلام کے احکام سے اس کو واقفیت ہو گئی اور پھر اس نے (مومن کو) قتل کر دیا تو اس کی سزا جہنم ہے۔ (اور توبہ نامقبول ہے)۔

حضرت ابن عباسؓ کا قول اس آیت کی تشریح میں مذکورۂ بالا صراحت کے خلاف بھی روایت میں آیا ہے آپ نے فرمایا قاتل مومن کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اگر اللہ اس کو سزا دے لیکن اللہ مہربانی فرمائے گا اور ایمان کی وجہ سے ہمیشہ اس کو جہنم میں نہیں رکھے گا۔

سعید بن منصور نے اور سنن میں بیہقی نے لکھا ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا میں اپنے حوض میں پانی بھر کر اپنے مویشی کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ آئیں گے تو پئیں گے اسی عرصہ میں سو گیا اور بیدار ہوا تو دیکھا کہ ایک شخص تیزی کے ساتھ اپنی اونٹنی دوڑاتا لایا اور حوض (کا کنارہ) اس نے ڈھا دیا جس کی وجہ سے پانی بہ گیا۔ میں بیتاب ہو کر اٹھا اور تلوار سے اس کو مار دیا (میرے لئے کیا حکم ہے) حضرت ابن عباسؓ نے اس کو توبہ کرنے کا حکم دیا۔

سعید بن منصورؒ نے کہا ہم سے سفیان بن عیینہؒ نے بیان کیا کہ علماء سے جب دریافت کیا جاتا تھا تو کہتے تھے مومن کے قاتل کی توبہ نہیں لیکن جب کوئی شخص (اس جرم میں) مبتلا ہو جاتا تھا تو اس سے کہتے تھے توبہ کر۔ ابن عباسؓ اور دوسرے علماء کے ان دو متضاد اقوال میں میرے نزدیک موافقت پیدا کرنے کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ قتل عمد میں دوہرا جرم ہے۔ ایک تو بندہ کا خون ہے دوسرا حق خداوندی میں جنایت ہے علماء جو کہتے ہیں کہ قتل عمد کے مرتکب کی توبہ نہیں اس کی مراد یہ ہے کہ اس سے قصاص ضرور لیا جائے گا۔ بندہ کا حق (اگر وہ یا اس کے وارث معاف نہ کریں تو) ضرور دلوایا جائے گا یا دنیا میں یا آخرت میں۔ نصوص میں اسی کی صراحت کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔ ہر گناہ کو امید ہے اللہ معاف فرما دے سوائے اس شخص کے جو شرک کی حالت میں مرا ہو یا کسی مومن کو عمداً قتل کر دے۔ حضرت ابودرداءؓ کی روایت سے یہ حدیث ابوداؤد نے بیان کی ہے۔ نسائی اور حاکم نے معاویہؓ کی روایت سے اس کو بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے اس حدیث کا مطلب یہی ہے کہ قصاص ضرور دیا جائے گا۔ اور قاتل مومن کی توبہ قبول ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ اپنا حق معاف کر دے گا اور

آخرت میں عذاب نہیں دے گا)۔
حضرت زید بن ثابتؓ نے فرمایا جب آیت وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ نازل ہوئی تو ہم کو اس کی نرمی پر تعجب ہوا۔ (کہ توبہ کرنے اور ایمان لانے سے یہ جرائم معاف ہو جاتے ہیں) سات مہینے ہم اسی حالت میں رہے اس کے بعد (سورہ نساء کی) سخت آیت نازل ہوئی اور نرم حکم والی آیت منسوخ کر دی گئی لیکن اس آیت کو نرم حکم والی آیت کا ناسخ قرار دینا اور (سات مہینے پہلے نازل ہونے والی آیت کو) منسوخ ماننا صرف حضرت زید بنؓ ثابت کا خیال ہے کیونکہ اس آیت سے قتل عمد کے مرتکب کی توبہ قبول نہ ہونا معلوم نہیں ہوتا۔ اس میں عمداً قاتل کی سزا کا بیان ہے اور یہ سزا اس وقت ملے گی جب بغیر توبہ کے مر گیا ہو توبہ کرنے والا تو بے گناہ ہو جاتا ہے یعنی اللہ اپنا حق توبہ کے بعد معاف کر دیتا ہے البتہ بندہ کا حق باقی رہتا ہے اس کے لئے صاحب حق کو راضی کرنا یا سزا پانا ضروری ہے۔
فائدہ :۔ اس آیت سے فرقہ معتزلہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ اور خارجیوں نے یہ سمجھ لیا کہ کبیرہ گناہ کرنے والا کافر ہے۔
اہل السنّت والجماعت آیت کی جو تاویل کرتے ہیں ہم نے اوپر درج کر دی۔ اس تاویل کی سب سے بڑی وجہ اجماع امت ہے کہ کوئی مومن ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا خواہ بغیر توبہ کے مرا ہو۔ گناہ کبیرہ ایمان سے خارج نہیں کر دیتا۔ اجماع کی سند آیات قرآنی اور متواتر احادیث ہیں دیکھو اللہ نے فرمایا ہے مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (اور ایمان خواہ گناہ آلود ہو بہر حال بجائے خود خیر ہے عقیدہ کی درستی بجائے خود مستقل حیثیت رکھتی ہے اور عملی گناہ اس سے الگ چیز ہے بس خیر ایمانی کا بدلہ ضرور ملنا چاہئے) اس آیت کی تفسیر ہم نے اس کے مقام پر کر دی ہے۔
دوسری آیت ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اس آیت میں مسلمان کو خطاب کیا گیا ہے اور اہل ایمان کے لفظ سے قاتلوں کو خطاب کر کے قصاص کا حکم دیا گیا ہے۔
حدیث مبارک ہے جس نے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا جنت میں جائے گا خواہ اس نے زنا کی ہو خواہ چوری کی ہو۔ رواہ ابوذرؓ، متفق علیہ۔ دوسری حدیث ہے جو شخص غیر مشرک ہونے کی حالت میں مرا ہو وہ جنت میں جائے گا۔ رواہ مسلم عن جابرؓ، ایک اور حدیث ہے حضور ﷺ نے فرمایا مجھ سے ان شرطوں پر بیعت کرو کہ کسی چیز کو اللہ کا ساجھی نہ قرار دو گے، چوری نہ کرو گے، زنا نہ کرو گے، اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے، دیدہ و دانستہ کھلم کھلا کسی پر تہمت تراشی اور افترا بندی نہ کرو گے اور کسی بھلائی میں نافرمانی نہ کرو گے جو شخص اس وعدہ کو پورا کرے گا اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہو گا اور جو ان چیزوں میں سے کسی کا ارتکاب کرے گا اور اس کی سزا دنیا میں مل جائے گی تو اس کے گناہ کا کفارہ ہو جائے گا اور جو (گناہ کا) ارتکاب کرے گا پھر اللہ اس کے گناہ پر پردہ ڈالے رکھے گا تو اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہو گا۔ خواہ معاف کر دے یا عذاب دے (راوی کا بیان ہے) ہم نے ان شرطوں پر رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی۔ صحیح بخاری و مسلم از عبادہؓ بن صامت۔

فصل

عمداً قتل کرنے والے کے متعلق احادیث۔ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلے باہمی خونوں کا فیصلہ کیا جائے گا۔ متفق علیہ۔
حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ سب سے بڑا گناہ کون سا ہے فرمایا کسی کو اللہ کی مثل قرار دینا باوجودیکہ اللہ ہی نے تجھے پیدا کیا ہے۔ سائل نے عرض کیا اس کے بعد فرمایا اپنی اولاد کو اس اندیشہ سے مار ڈالنا کہ وہ تیرے کھانے میں شریک ہو جائے گی الی آخر الحدیث رواہ الشیخان۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا سات ہلاکت آفریں باتوں سے بچو حضور ﷺ نے ان سات مہلکات میں ناحق کسی کو مار ڈالنے کو بھی شمار

کیا تھا۔ متفق علیہ۔ حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع روایت ہے مومن جب قتل کرتا ہے تو بحالت ایمان قتل نہیں کرتا۔ رواہ البخاری۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (ساری) دنیا کا ٹل جانا اللہ کے نزدیک ایک مرد مسلمان کے قتل کے مقابلہ میں حقیر ہے۔ رواہ الترمذی والنسائی۔

ابن ماجہ نے یہ حدیث حضرت براء بن عازب کی روایت سے بیان کی ہے نسائی نے حضرت بریدہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مومن کا قتل دنیا کے ٹل جانے سے بھی بڑا ہے۔ حضرت ابو سعیدؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر (تمام) آسمان و زمین والے مومن کے خون میں شریک ہو جائیں تو اللہ ان سب کو اوندھے منہ دوزخ میں پھینک دے گا۔ رواہ الترمذی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو کا بیان ہے میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کعبہ کا طواف کر رہے ہیں اور فرما رہے ہیں تو کیسا پاکیزہ ہے تیری خوشبو کیسی لطیف ہے تو کیسا عالی قدر ہے اور تیری حرمت کیسی عظیم الشان ہے (لیکن) قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے مومن کے مال و جان کی حرمت تیری حرمت سے بڑی ہے۔ رواہ ابن ماجہ۔

حضرت ابو درداء کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن برابر (دوزخ سے) آزاد اور نیکوکار (اس وقت تک) رہتا ہے جب تک کسی حرام قتل کا مرتکب نہ ہو جب حرام قتل کا مرتکب ہو جاتا ہے تو ہلاک ہو جاتا ہے۔ رواہ ابو داؤد حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ جس نے کسی مسلمان کے قتل میں آدھی بات کہہ کر بھی اعانت کی وہ جب اللہ کے سامنے جائے گا تو اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لکھا ہوگا۔ اللہ کی رحمت سے مایوس (محروم) رواہ ابن ماجہ طبرانی نے یہ حدیث حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھی ہے اور ابن الجوزی نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے ابو نعیم نے حلیہ میں ایسی ہی حدیث حضرت عمر بن خطابؓ کی روایت سے موقوفاً لکھی ہے۔ واللہ اعلم۔

بخاری، ترمذی اور حاکم وغیرہ نے بحوالہ عکرمہ حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ قبیلہ بنی سلیم کا ایک آدمی اپنی بکریاں چراتے صحابہؓ کی ایک جماعت کی طرف سے گزرا اور ان کو سلام کیا صحابہ نے کہا اس نے ہم کو سلام صرف اس غرض سے کیا ہے کہ ہمارے ہاتھ سے بچ جائے (واقع میں یہ مسلمان نہیں ہے) یہ خیال کر کے اس کو مار ڈالا اور اس کی بکریاں لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا — اے ایمان والو جب تم اللہ کی راہ میں (جہاد کے لئے) سفر کیا کرو تو (دوران سفر میں) تحقیقات کر لیا کرو۔

تَبَيَّنْتُ الْاَمْرَ میں نے اس امر پر غور کر لیا۔ اس کی تحقیق کر لی۔ مطلب یہ ہے کہ معاملہ کے انکشاف کامل سے پہلے عجلت سے کام نہ لیا کرو۔ بغوی نے کلبی کی وساطت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ مقتول مسلمان تھا۔ فدک کا باشندہ تھا اور اس کا نام مرداس بن نہیک تھا مگر اس کی قوم والے مسلمان نہیں ہوئے تھے جب قوم والوں نے اسلامی کمپنی کی آمد کی خبر سنی تو سب بھاگ گئے مگر مرداس چونکہ مسلمان تھا اس لئے وہیں مقیم رہا۔ جب سواروں کو دیکھا تو اسے ڈر ہوا کہ کہیں یہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کے علاوہ کہیں اور کوئی نہ ہوں اس لئے اس نے اپنی بکریاں تو پہاڑ کے کسی محفوظ مقام میں پہنچا دیں اور خود پہاڑ پر چڑھ گیا۔ جب سوار آدمی پہنچے اور مرداس نے ان کی تکبیر کی آواز سنی تو پہچان گیا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھی ہیں فوراً کلمہ پڑھتا ہوا نیچے اتر آیا اور آکر کہا السلام علیکم۔ لیکن حضرت اسامہؓ بن زید نے اس پر تلوار چھوڑ دی اور قتل کر دیا اور بکریاں ہنکا کر لے گئے۔ جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لوٹے (اور واقعہ کی اطلاع دی) لیکن حضور ﷺ کو یہ خبر پہلے ہی مل چکی تھی، اور آپ کو اس حرکت سے بڑا رنج ہوا تھا اس لئے آپ نے فرمایا تم نے اس کے مال کے لالچ میں اس کو مار ڈالا پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ حضرت اسامہ بن زید نے کہا یا رسول اللہ میرے لئے دعا مغفرت کر دیجئے فرمایا

لاالہ الا اللہ کا کیا ہوگا (یعنی اس نے تو لاالہ الا اللہ کہہ دیا اور تم نے اس کو قتل کر دیا۔ اب میں کیسے دعا کر سکتا ہوں حضور ﷺ نے یہ کلمہ تین بار فرمایا حضرت اسامہؓ کا بیان ہے حضور ﷺ یہ الفاظ بار بار فرماتے رہے یہاں تک کہ میں نے دل میں خیال کیا کاش میں آج سے پہلے مسلمان نہ ہوا ہوتا (آج ہی اسلام لاتا تو گزشتہ جرم مجھ پر عائد نہ ہوتا کیونکہ اسلام سے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں) آخر تین مرتبہ (انکار) کے بعد حضور ﷺ نے میرے لئے دعا مغفرت کردی اور فرمایا ایک بردہ آزاد کردے۔ رواہ الثعلبی من طریق الکلبی۔

لیکن ابوظبیانؓ کی روایت ہے کہ حضرت اسامہؓ نے بیان کیا میں نے عرض کیا یارسول اللہ اس نے تو ہتھیار سے ڈر کر کلمہ پڑھا تھا حضور ﷺ نے فرمایا تو نے اس کا دل چیر کر کیوں نہ دیکھا کہ تجھے معلوم ہو جاتا کہ اس نے دل سے کہا ہے یا نہیں۔ بزار نے دوسری سند سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک فوجی دستہ بھیجا جس میں مقداد بھی تھے جب یہ لوگ پہنچے تو وہ لوگ (یعنی کافر) منتشر ہو چکے تھے صرف ایک شخص رہ گیا تھا جس کے پاس بہت مال تھا۔ اس نے فوجی دستہ کو دیکھ کر اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا مگر مقداد نے اس کو قتل کر دیا اور رسول اللہ ﷺ نے مقداد سے فرمایا کل (قیامت کے دن) لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا تیرے پاس کیا جواب ہوگا اور اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی امام احمد اور طبرانی نے عبداللہ بن ابی حدرد اسلمی کی روایت سے اور ابن جریر نے ابوعمرہ کے حوالہ سے لکھا ہے حضرت عبداللہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو مسلمانوں کے ایک جہادی دستہ کے ساتھ بھیجا۔ مجاہدین میں ابوقتادہؓ اور محلم بن خثامہ بن قیس لیثی بھی شامل تھے (اتفاقاً) ہماری طرف سے عامر بن اضبط اشجعی گزرا اور سلام کیا۔ محلم نے اس پر حملہ کر کے قتل کر دیا پھر جب ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ کی اطلاع دی تو ہمارے متعلق قرآن (یعنی اس آیت) کا نزول ہوا۔

ابن مندہ نے بیان کیا کہ جزو بن حدرجان نے کہا میرا بھائی خداد، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میں مومن ہوں مگر لوگوں نے اس کے اسلام کو نہیں مانا اور اس کو قتل کر دیا مجھے اطلاع ملی تو میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گیا اور اس کے سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی اور حضور ﷺ نے مجھے میرے بھائی کی دیت عطا فرما دی۔

ابن جریر نے سدی کے طریق سے اور عبد نے قتادہ کے سلسلہ سے اور ابن ابی حاتم نے ابن لہیعہ کی سند سے ابوزبیر کا قول نقل کیا ہے کہ آیت وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ مرداس کے حق میں نازل ہوئی اس بیان سے اس روایت کی تائید ہوتی ہے جو ثعلبیؒ نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے بیان کی ہے۔ [1]

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ اور جو شخص تمہارے سامنے اطاعت پیش کرے یا السلام علیکم کہے تم اس کو یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں ہے بلکہ پناہ لینے کے لئے تو نے یہ الفاظ کہے ہیں۔

تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ (کیا) تم دنیوی زندگی کے (فانی) سامان کے طلب گار ہو یعنی دنیوی منافع اور مال غنیمت کی طلب میں (مذکورہ بالا شخص کو) بے ایمان نہ کہو (ہم نے آیت کا ترجمہ استفہامیہ جملہ قرار دے کر کیا ہے لیکن حضرت مفسر علیہ الرحمۃ نے جملہ کو حال کہا ہے بر تقدیر حالیت یعنی کے بعد مطلب بیان کیا گیا ہے) عَرَضٌ کا معنی عارضی چیز

---

[1] ابن جریرؒ نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے محلم بن خثامہ کو کسی جماعت میں بھیجا، راستہ میں ان کی ملاقات عامرؓ بن اضبط سے ہوئی، عامر نے محلم کو اسلامی سلام کیا چونکہ محلم اور عامر کے درمیان دور جاہلیت میں کچھ دشمنی تھی اس لئے محلمؓ نے عامرؓ کے تیر مارا اور اس کو قتل کر دیا اس کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو پہنچ گئی (محلم جب خدمت گرامی میں حاضر ہوئے تو) انہوں نے حضور ﷺ سے دعاء مغفرت کرنے کی درخواست کی حضور ﷺ نے فرمایا تجھے اللہ معاف نہ کرے، محلم روتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور ایک ساعت گزرنے بھی نہ پائی تھی کہ مر گئے، لوگوں نے ان کو دفن کر دیا مگر زمین نے ان کی لاش کو اگل دیا، صحابہؓ نے حاضر ہو کر اس کا تذکرہ حضور ﷺ سے کیا آپ نے فرمایا زمین تو ایسے لوگوں کو بھی قبول کر لیتی ہے جو تمہارے اس ساتھی سے بھی برے ہوتے ہیں مگر اللہ کو عبرت دلانا مقصود ہے آخر لوگوں نے اس کو ایک پہاڑ (کے کھڈ) میں ڈال دیا اور اس پر پتھر رکھ دیئے، اور یہ آیت نازل ہوئی۔

جس کو بقاء نہ ہو، دنیوی مال بھی فانی ہے اس لئے اس کو عرض کہا گیا۔

فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ تو اللہ کے پاس (دنیا اور آخرت میں) بہت غنیمت کے مال ہیں۔ اللہ تم کو دنیا میں مال کی خاطر ایسی حرکات کرنے سے مستغنی کر دے گا اور متقی مومن کیلئے اس نے آخرت میں بکثرت ثواب تیار کر رکھا ہے۔

كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلُ پہلے تم بھی ایسے ہی تھے یعنی اس سے پہلے جب تم اسلام میں داخل ہوئے تھے اور اسلام کا کلمہ پڑھا تھا۔ صرف کلمہ پڑھنے سے تمہاری جان مال کی حفاظت ہو گئی تھی اور کوئی تفتیش نہیں کی گئی کہ تمہارے دل بھی زبانی شہادت کی تصدیق کر رہے ہیں یا نہیں۔

فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ پھر اللہ نے تم پر احسان کیا کہ ایمان پر ثبات اور دینی استقامت عطا فرمائی۔ یا یہ مطلب ہے کہ ہجرت سے پہلے تم اپنی قوم میں رہتے ہوئے صرف لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی شہادت کی وجہ سے مسلمانوں سے بے خطر تھے پھر اللہ نے تم پر ہجرت کا حکم دے کر احسان کیا۔ قتادہ نے مطلب کی توضیح اس طرح کی ہے کہ تم بھی پہلے اسی طرح گمراہ تھے پھر اللہ نے تم پر احسان کیا اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنے کی تم کو توفیق دی۔ سعید بن جبیرؒ نے یہ معنی بیان کئے کہ اسی طرح پہلے تم بھی مشرکوں سے اپنا ایمان چھپاتے تھے پھر اللہ کا کرم ہوا کہ تم اسلام کا اظہار کرنے لگے۔

فَتَبَيَّنُوا سو غور کر لو۔ یہ سابق تَبَيَّنُوا کی تاکید اور غور کرنے کی عظمت کا اظہار ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ فَتَبَيَّنُوا کی تفریع فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ پر ہے یعنی مال غنیمت حاصل کرنے پر غور کر لیا کرو تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ حاصل شدہ غنیمت کیا اللہ کی طرف سے حلال ہے یا حرام متاع دنیا ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ اول الذکر غور کرنے کا حکم اس لئے تھا کہ کسی کے قتل میں عجلت سے کام نہ لیا جائے یہاں تک کہ اسلام کی نشانیاں اس سے نمودار ہو جائیں اور دوسرا غور کرنے کا حکم اس لئے ہے کہ علامات اسلام ظاہر ہونے کے بعد (محض بدگمانی کی وجہ سے) قتل میں جلدی نہ کی جائے تاوقتیکہ اس کا کفر اور نفاق ظاہر نہ ہو جائے۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾ یقیناً اللہ تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہے۔ اور تمہاری نیتوں سے واقف ہے تم کو تمہارے اعمال کا تمہاری نیتوں کے مطابق بدلہ دے گا۔

فائدہ :۔ آیت سے مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے۔

اگر کوئی شخص مجبور ہو کر ایمان کا اظہار کرے تو دنیوی احکام اسلام جاری ہونے کے لئے اس کا ایمان صحیح مانا جائے گا۔

مجتہد سے کبھی فکری غلطی ہو جاتی ہے لیکن اگر اس نے حق کی جستجو میں انتہائی کوشش سے دریغ نہیں کیا اور پھر بھی حق تک نہ پہنچ سکا تو غلطیٔ فیصلہ معاف ہے۔

مجتہد کو انتہائی غور و فکر سے کام لینا چاہئے۔ ابتدائی نظر میں جو بات سامنے آجائے اسی پر فیصلہ نہ کر لینا چاہئے غور کرنا واجب ہے غور کرنے کے بعد بھی غلطی ہو جائے تو (غور کرنے کا) اس کو ثواب ملے گا۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا اقرار اگرچہ دوسرے اہل کتاب اور مسلمانوں میں مشترک ہے اس کے باوجود اگر کوئی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا قائل ہو جائے تو اس کے کافر ہونے کا فیصلہ نہ کر دیا جائے (تاوقتیکہ دریافت کے بعد وہ ضروریات دین میں سے کسی بات کا منکر نہ ہو) اور اس کو قتل کر دینے میں عجلت سے کام نہ لیا جائے یہاں تک کہ اس کا معاملہ واضح طور پر سامنے نہ آجائے اور پوری تحقیق نہ ہو جائے۔

اگر مجاہدین کو کسی شہر یا بستی میں اسلام کی خصوصی علامات نظر آجائیں تو وہاں کے باشندوں (کو قتل کرنے اور لوٹنے) سے دست کش رہنا واجب ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی قوم پر لشکر کشی کرتے تھے اور وہاں اذان کی آواز کان میں آجاتی تھی تو حملہ کرنے سے دست کش ہو جاتے تھے اور اذان نہ سنائی دیتی تھی تو حملہ کر دیتے تھے۔

بغوی نے بطریق شافعی ابن عصام کی وساطت سے ان کے باپ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی فوجی

دستہ کو بھیجتے تو ہدایت فرمادیتے کہ اگر تم کو (وہاں) مسجد نظر آئے یا موذن کی اذان سن لو تو کسی کو قتل نہ کرنا۔ واللہ اعلم۔

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ بلا عذر (قوی جسمانی ہو یا مالی) بیٹھ رہنے والے مسلمان برابر نہیں۔ بخاری، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے حضرت زید بن ثابت کی روایت سے اور صرف بخاری نے حضرت براء بن عازبؓ کی روایت سے اور طبرانی نے حضرت زیدؓ بن ارقم کی روایت سے اور ابن حبان نے حضرت ابن عاصم کی روایت سے اور صرف ترمذی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت زید بن ثابت سے لکھوا رہے تھے۔ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (یعنی شروع میں من المومنین کے بعد غیر اولی الضرر کا لفظ نہ تھا) حضور ﷺ لکھوا ہی رہے تھے کہ حضرت ابن ام مکتوم آگئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر میں جہاد کر سکتا تو ضرور کرتا حضرت ابن ام مکتوم نابینا تھے۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن جحش اور حضرت ابنؓ ام مکتوم دونوں (آئے اور دونوں) نے کہا ہم تو نابینا ہیں۔ اس پر اللہ نے (آیت مذکورہ اس طرح) نازل کی لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ۔ حضرت زید بن ثابت کا بیان ہے جس وقت یہ آیت نازل ہوئی اس وقت حضور ﷺ کی ران میری ران پر تھی (نزول وحی کا) مجھ پر اتنا بوجھ پڑا کہ مجھے اندیشہ ہوا کہیں میری ران ٹوٹ نہ جائے اس کے بعد وحی ختم ہو گئی اور موجودہ آیت نازل ہوئی۔

آیت میں غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ اَلْقٰعِدُوْنَ کی صفت ہے یا بدل ایسے بیٹھ رہنے والے جو دکھی نہ ہوں یا بیٹھ رہنے والے یعنی جو دکھی نہ ہوں (اول ترجمہ صفت کی صورت میں ہوگا اور دوسرا ترجمہ بدل کی صورت میں)۔

ایک سوال

(القاعدون معرفہ ہے اور لفظ غیر نکارت میں اتنا مستغرق ہے کہ اہل علم کے نزدیک معرفہ کی طرف مضاف ہونے کے بعد بھی معرفہ نہیں ہو سکتا پھر معرفہ کی صفت کس طرح ہو سکتا ہے ہاں بدل بن سکتا تھا، معرفہ سے نکرہ بدل ہو سکتا ہے مگر اسی وقت ہو سکتا ہے جب نکرہ خود موصوفہ ہو یعنی اس کی کوئی صفت مذکور ہو جیسے بِالنَّاصِيَةِ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ اور یہاں نکرہ موصوفہ نہیں ہے لہٰذا بدل بھی نہیں ہو سکتا)۔

جواب :۔ القاعدون اگرچہ معرفہ ہے لیکن حکم نکرہ میں ہے کیونکہ (اس میں الف لام جنسی ہے عہدی نہیں ہے) اس سے کوئی معین قوم مراد نہیں ہے۔

یہ جواب ضعیف ہے کیونکہ معرفہ اگرچہ (بعض وقت) نکرہ کے حکم میں ہوتا ہے لیکن اس وقت اس کی صفت کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جو نکرہ کی صفت بن سکتی ہے۔ صرف جملہ فعلیہ بفعل مضارع اس معرفہ کی صفت بن سکتا ہے جو نکرہ کے حکم میں ہوتا ہے جیسے وَلَقَدْ اَمُرُّ عَلَى اللَّئِيْمِ يَسُبُّنِيْ (اس مصرعہ میں کوئی خاص لئیم مراد نہیں اور یسبنی جو جملہ فعلیہ بفعل مضارع ہے اس کی صفت ہے اور جملہ فعلیہ بجائے خود نکرہ کی صفت ہو سکتا ہے پس اللئیم جو معرفہ ہونے کے باوجود نکرہ کے حکم میں ہے اس کی صفت جملہ فعلیہ بن گیا) اس لئے صحیح جواب یہ ہے کہ اس جگہ غیر (نکرہ نہیں ہے بلکہ) اضافت کی وجہ سے معرفہ بن گیا ہے کیونکہ غیر اولی الضرر کا معنی ہے ایسا شخص جس کو دکھ نہ ہو (یعنی غیر عام طور پر اضافت کے بعد بھی معرفہ نہیں ہوتا لیکن علماء نے صراحت کی ہے کہ اگر غیر کی اضافت ایسی چیز کی طرف ہو جس کی ایک ہی ضد ہے تو معرفہ ہو جاتا ہے جیسے غَيْرُ السُّكُوْنِ میں غیر معرفہ ہے کیونکہ سکون کی ایک ہی ضد ہے یعنی حرکت یا جیسے غَيْرُ اللَّيْلِ معرفہ ہے کیونکہ لیل کی ایک ہی ضد ہے یعنی نہار اور یہاں بھی اُولِي الضَّرَرِ کی ایک ہی ضد ہے یعنی جس کو ضرر نہ ہو دکھ کی ضد سکھ ہی ہے پس دکھی نہ ہونے کا معنی ہے سکھی ہونا۔ لہٰذا اس جگہ غیر معرفہ ہے جوہری نے صحاح میں لکھا ہے کہ ضُرٌّ کا معنی ہے بدحالی خواہ واقعی اور حقیقی ہو مال فضل اور عفت کی وجہ سے یا بدنی بدحالی ہو کسی عضو ظاہری کے کم ہونے یا ناقص ہونے کی

وجہ سے یا صرف ظاہری بدحالی مال یا مرتبہ کے کم ہونے کی وجہ سے۔
قاموس میں ہے ضُرٌّ کی طرح ضَرَرٌ کا معنی بھی بدحالی ہے اسی لئے نابینا کو ضریر کہتے ہیں (کیونکہ اس کی آنکھیں مفقود ہو جاتی ہیں) میں کہتا ہوں اس جگہ اُولِی الضَّرَرِ سے مراد ہیں اپاہج لنگڑے لولے یا بیمار یا جسمانی طور پر بہت کمزور یا ضعیف النظر یا قلیل المال کیونکہ آگے آیا ہے۔

وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اور جان مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے یعنی اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرنے والے اور جان و مال سے بلا عذر کے جہاد نہ کرنے والے برابر نہیں ہیں۔
جو لوگ اپاہج یا نابینا ہونے یا کسی اور مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے یا راہ خدا میں خرچ کرنے کے قابل مال نہ رکھنے کی وجہ سے جہاد نہ کر سکیں لیکن ان کی نیت یہ ہو کہ اگر خدا ان کو قدرت عطا فرما دے گا تو ضرور جہاد کریں گے تو ایسے لوگ بھی مجاہدوں کے ہم مرتبہ ہو جاتے ہیں۔ بخاری نے حضرت انسؓ کی روایت سے اور ابن سعدؒ نے حضرت انسؓ اور حضرت جابرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب غزوہ تبوک سے لوٹے اور مدینہ کے قریب پہنچے تو فرمایا مدینہ کے اندر کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جتنی مسافت تم نے طے کی اور جس وادی کو تم نے قطع کیا وہ (برابر) تمہارے ساتھ رہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا مدینہ میں رہتے ہوئے فرمایا ہاں وہ مدینہ میں ہی رہے ان کو عذر نے روک رکھا تھا۔
مقسم نے بیان کیا کہ حضرت ابن عباسؓ نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا کہ بدر کو نہ جانے والے مسلمان اور بدر کو جانے والے مسلمان برابر نہیں ہیں۔

فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ اللہ نے جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو (بغیر عذر کے) بیٹھ رہنے والوں پر ایک درجہ فضیلت عطا فرمائی ہے۔ القاعدین سے مراد وہی لوگ ہیں جو غیر اولی الضرر ہوں کیونکہ (بلاغت کا قاعدہ یہ ہے کہ) معرفہ کو اگر دوبارہ بصورت معرفہ ذکر کیا جائے تو دوسرا بعینہ اول ہوتا ہے (اور اگر بصورت نکرہ ذکر کیا جائے تو دوسرا اول سے غیر ہوتا ہے)
درجۃ کا نصب یا اس بناء پر ہے کہ حرف جر حذف کر دیا گیا ہے یعنی ایک درجہ کے ساتھ مجاہدوں کو اللہ نے فضیلت دی ہے۔ یا مفعول مطلق ہے اور ایک بار کا مفہوم ظاہر کر رہا ہے یعنی مجاہدوں کو ایک درجہ فضیلت دی ہے جیسے ضَرَبْتُهٗ سَوْطًا میں نے اس کو ایک کوڑا مارا۔ یا حال ہے اور مضاف محذوف ہے یعنی مجاہد درجہ والے ہیں۔ سابق جملہ میں مساوات کی نفی کی گئی تھی اس جملہ نے نفی مساوات کی وضاحت کر دی۔

سوال :۔ یہ جملہ کافی تھا اس سے پہلے نفی مساوات کی ضرورت کیا تھی؟

جواب :۔ نفی مساوات میں اجمالاً تفضیل کا مفہوم آجاتا ہے اس کے بعد تفضیل کی صراحت کر دی تاکہ مزید تاکید ہو جائے اور مخاطب کے ذہن میں جم جائے۔

ایک شبہ :۔ کسی قسم کی اطاعت کرنے والا ہو بہر حال یہ بات بالکل کھلی ہوئی ہے کہ طاعت گزار طاعت نہ کرنے والے سے افضل ہوتا ہے پھر مجاہدین کے غیر مجاہدین پر فضیلت رکھنے کا خصوصیت کے ساتھ اظہار کیوں کیا گیا۔

جواب :۔ اس فضیلت خصوصی پر تنبیہ کرنا اور جہاد کی رغبت دلانا مقصود ہے۔ زیادہ صحیح جواب یہ ہے کہ کبھی جہاد نہ کرنے میں انسان فراغت خاطر کے ساتھ یکسوئی میں ایسی طاعت گزاریاں کرتا ہے اور اللہ اور بندوں کے حقوق ادا کرتا ہے کہ جہاد کی حالت میں نہ وہ طاعت گزاریاں ہو سکتی ہیں نہ اللہ اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی۔ اس سے خیال ہو سکتا تھا کہ شاید جہاد سے بیٹھ رہنے والے کو مجاہد پر فضیلت ہو سکتی ہے اس آیت نے اس خیال کو دفع کر دیا۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وقت واپسی تک مجاہد فی سبیل اللہ کی حالت اس شخص کے مثل ہوتی ہے جو (ہمیشہ دن کو) روزہ رکھے اور (رات بھر) نماز پڑھے اور اللہ کی آیات سے اس پر قنوت طاری ہو جائے۔ متفق علیہ۔

وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ اور ہر ایک سے (خواہ مجاہد ہو یا بغیر عذر کے جہاد سے بیٹھ رہنے والا) اللہ نے اچھے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔ یعنی ایمان کی وجہ سے جنت دینے کا۔

اس جملہ میں دلیل ہے اس امر کی کہ جہاد فرض کفایہ ہے (اگر بعض لوگ اس فرض کو ادا کردیں تو سب کے سر سے ساقط ہو جاتا ہے) کیونکہ اگر فرض عین ہوتا تو جہاد سے بلا عذر بیٹھ رہنے والا ثواب کا مستحق نہ ہوتا عذاب کا مستحق ہوتا۔

فصل

علماء کا اجماع ہے کہ کفار اگر اپنے ملک میں (ہی) برقرار ہوں اور مسلمانوں پر حملہ نہ کر رہے ہوں تب بھی) خلیفہ پر واجب ہے کہ کوئی سال بغیر جہاد کے نہ چھوڑے خواہ خود بھی شریک ہو یا فوجی دستوں کو بھیج دے ورنہ جہاد معطل ہو جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین نے ترک جہاد بالکل کبھی نہیں کیا۔

اگر مسلمانوں کا ایک گروہ جہاد کے لئے کھڑا ہو جائے جس کی وجہ سے کافروں کا شر دفع اور اللہ کا بول بالا ہو جائے تو باقی (شریک نہ ہونے والے) لوگوں کے سر سے فرض ساقط ہو جاتا ہے ایسی حالت میں آقا کی اجازت کے بغیر غلام، شوہر کی اجازت کے بغیر بیوی، قرض خواہ کی اجازت کے بغیر قرض دار، اور ماں باپ کی اجازت کے بغیر لڑکا جہاد کو نہیں جاسکتا۔ شریک ہونے والی جماعت جب کافی ہے تو پھر حقوق عباد کو تلف کرنے کی کیا ضرورت ہے اور اگر جہاد کے لئے کوئی بھی کھڑا نہ ہوگا تو سب گناہ گار ہوں گے، البتہ عذر والے گناہ گار نہ ہوں گے۔

علماء کا اجماع ہے کہ کفار کی ہر بستی اور ہر شہر سے متصل رہنے والے مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنے متصل کافروں سے جہاد کریں اگر ان کی جماعت کمزور ہو تو جو مسلمان ان سے قریب رہتے ہوں وہ ان کی مدد کریں اور وہ بھی کافی نہ ہوں تو ان سے متصل رہنے والے مدد کریں اسی طرح اقرب فالاقرب کا سلسلہ چلا جائے گا۔ یہی حالت اس وقت ہوگی جب کفار سے متصل رہنے والے مسلمان سست پڑ جائیں اور جہاد نہ کریں تو ان سے قریب رہنے والوں پر پھر ان سے قریب رہنے والوں پر پھر اسی ترتیب سے مسلسل زمین کے آخری کنارہ تک مسلمانوں پر جہاد کرنا واجب ہے۔

مسئلہ :- علماء کا اس امر پر بھی اتفاق ہے کہ جب دونوں صفوں کا باہم مقابلہ ہو جائے تو جو مسلمان وہاں موجود ہوں ان کا مقابلہ سے منہ پھیر کر بھاگنا جائز نہیں ہاں داؤں کرنے کیلئے یا اپنی جماعت میں آکر شامل ہونے کے لئے مقابلہ سے کنی کاٹنا جائز ہے اور اگر کفار کی تعداد مسلمانوں کے دوگنے سے بھی زائد ہو تو مقابلہ سے بھاگ جانا جائز ہے مگر اس وقت بھی جما رہنا افضل ہے۔

مسئلہ :- دوسرے اسباب و آلات کے ساتھ ساتھ جہاد کے لئے راشن اور سواری علاوہ امام مالک کے باقی تینوں اماموں کے نزدیک شرط ہے صرف امام مالک اس شرط کے قائل نہیں۔ اول قول کی دلیل یہ ہے کہ اللہ نے غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ فرمایا اور جس کے پاس کھانا پینا اور سواری نہ ہو وہ اہل ضرر میں سے ہے۔ دوسری آیت میں آیا ہے وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ اور ان لوگوں پر کہ جب سواری مانگنے آپ کے پاس آئیں تو آپ جواب دیدیں کہ تمہاری سواری کے لئے میرے پاس کچھ نہیں ہے (اس آیت میں سواری کے مہیا ہونے کی شرط لگائی ہے)۔

مسئلہ :- علماء کا اتفاق ہے کہ اگر مسلمانوں کی بستی پر کافر دشمن حملہ کردے تو اس بستی کے ہر بالغ مرد پر جہاد کو نکلنا فرض عین ہو جاتا ہے (فرض کفایہ نہیں رہتا) آزاد ہو یا غلام مالدار ہو یا نادار۔ اس وقت جہاد کا حکم نماز روزہ کی طرح ہو جاتا ہے آقا کا غلام پر، قرض خواہ کا قرضدار پر اور ماں باپ کا اولاد پر جو حق ہے اس وقت اس کی کوئی پرواہ نہیں کی جائے گی (اگر آقا غلام کو، قرض خواہ قرضدار کو اور ماں باپ اولاد کو جہاد میں نکلنے سے روکیں تو ان کے احکام کی تعمیل نہیں کی جائے گی جیسے فرض نماز روزہ سے ممانعت ناقابل تعمیل ہوتی ہے) بلکہ امام ابو حنیفہؒ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر بیوی کو بھی جہاد

میں جانا لازم ہے۔ اب اگر بستی والے مقابلہ کے لئے کافی ہوں تو خیر ورنہ برابر کی بستی والوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ مدد کریں اور اگر وہ مدد نہ کریں تو پھر ان کے متصل رہنے والوں کو اعانت کرنی چاہئے وغیرہ وغیرہ علی ہذا لیکن معذور لوگ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ ان پر اس حالت میں بھی کوئی فرض جہاد عائد نہیں ہوتا۔

وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ اور اللہ نے مجاہدوں کو جہاد سے بیٹھ رہنے والوں پر اجر عظیم یعنی بہت درجے برتری کے عطا کئے ہیں۔ یعنی اپنے قرب اور جنت کے درجات۔

مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ اپنی طرف سے اور مغفرت ورحمت۔

درجات اور مغفرۃً اور رحمۃً تینوں اجرا سے بدل ہیں یعنی جو گناہگار نہ ہو تو اس کے لئے درجات ہیں اور گناہ گار کے لئے مغفرت رہی رحمت تو وہ دونوں فرقوں کے لئے عمومی ہے۔ اگر درجات کو مفعول مطلق فضّل کا اور مغفرۃً ورحمۃً کو مفعول مطلق محذوف فعلوں کا اور اجرًا حال مقدم قرار دیا جائے تب بھی کوئی حرج نہیں۔ چونکہ ذوالحال نکرہ تھا اس لئے حال کو مقدم کر دیا یعنی مجاہدوں کو اللہ نے درجات اور مغفرت اور رحمت سے برتری عطا فرمائی ہے اور یہ انعامات اجر عظیم کی حالت میں ملیں گے۔

جہاد کی ترغیب دینے اور عظمت ظاہر کرنے کے لئے مجاہدوں کی فضیلت کا بار بار ذکر کیا گیا ہے اول تو مجاہدین اور غیر مجاہدین کی مساوات نہ ہونے کی صراحت کی گئی جس سے اجمالاً معلوم ہو گیا کہ مجاہدوں کو فضیلت حاصل ہے پھر صراحت کے ساتھ مجاہدوں کی فضیلت کا اظہار کیا مگر اجمالاً اور صرف درجۃ فرمایا آخر میں پھر فضیلت کی صراحت کی اور تفصیل کے ساتھ اجراً عظیمًا درجاتٍ مِنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً فرمایا۔

ایک شبہ :- پہلے تو صرف درجۃ (یعنی ایکدرجہ فضیلت عطا کرنے کا اظہار کیا) اور دوبارہ درجات (بہت درجے فضیلت دینے کی) صراحت فرمائی دونوں میں منافات ہے۔

ازالہ :- دونوں میں کوئی منافات نہیں کیونکہ اول صراحت کا مقصد یہ ہے کہ ہر مجاہد کو ہر غیر مجاہد پر برتری عطا کی گئی ہے اور دوسری صراحت کا مقصود یہ ہے کہ مجاہدوں کی جماعت کو غیر مجاہدوں کی جماعت پر درجات کی برتری حاصل ہے ظاہر ہے کہ جماعت کے لئے درجات کا لفظ ہونا چاہئے اور جب فرد کا فرد سے مقابلہ ہو گا تو ایک فرد کا ایک ہی درجہ ہو گا۔

یہ بھی جواب دیا گیا ہے کہ ایک درجہ فضیلت دینے سے مراد ہے دنیوی برتری، مال غنیمت، فتح ونصرت، سلطنت اور ذکر خیر اور دنیا کی یہ ساری نعمتیں چونکہ (آخرت کے مقابلہ میں) بے مقدار تھیں اس لئے ان کو ایکدرجہ کی فضیلت فرمایا اور آخرت کے فضائل کو درجات سے تعبیر کیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ درجہ سے مراد ہے قرب خداوندی کا درجہ بلند ہونا اور درجات سے مراد ہیں جنت کے اندر مراتب۔

بعض علماء نے کہا کہ کافروں سے جہاد کرنے والوں کے لئے ایک درجہ ہے اور اپنے نفس سے جہاد کرنے والوں کے لئے اللہ اجر عظیم یعنی درجات اور مغفرت اور رحمت عطا فرمائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجاہد یعنی کامل مجاہد۔ وہ ہے جو اللہ کی طاعت میں اپنے نفس سے جہاد کرتا ہے اور مہاجر (یعنی کامل مہاجر) وہ ہے جس نے خطاؤں اور گناہوں کو چھوڑ دیا ہو۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان عن فضالۃ۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ پہلی آیت میں معذوری کی وجہ سے جہاد میں شرکت نہ کرنے والے مراد ہیں ان پر مجاہدوں کو ایک درجہ کی فضیلت حاصل ہے۔ اہل عذر کی نیت تو جہاد کی تھی مگر دکھی ہونے کی وجہ سے شرکت نہیں کر سکتے اور مجاہدوں کی نیت بھی جہاد کی تھی اور عملاً انہوں نے جہاد کیا بھی لیکن مجاہد ہوں یا معذور غیر مجاہد اللہ نے ہر ایک سے بھلائی کا وعدہ کیا ہے (مجرم کوئی نہیں۔ البتہ مجاہد کو معذور غیر مجاہد پر ایک درجہ کی برتری حاصل ہے) اور دوسری جگہ قاعدین سے مراد وہ لوگ جو بلا عذر جہاد سے غیر حاضر رہے (گو ایمان کی وجہ سے جنت ان کو بھی مل جائے گی مگر) ان پر مجاہدین کو بدرجات فضیلت حاصل ہے۔ کذا

قال مقاتل۔

حضرت ابو سعیدؓ خدری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ کے رب ہونے پر اور اسلام کے دین ہونے پر اور محمد ﷺ کے نبیؐ ہونے پر راضی ہو اس کے لئے جنت واجب ہو گئی۔ حضرت ابو سعیدؓ کو یہ سن کر تعجب ہوا اور دوبارہ ارشاد کی درخواست کی۔ حضور ﷺ نے دوبارہ ارشاد فرمادیا (پھر) فرمایا ایک اور بات بھی ہے جس کی وجہ سے اللہ جنت کے اندر بندہ کے سو درجے بلند فرمائے گا اور ہر دو درجوں کے درمیان اتنی اونچائی ہوگی جیسے آسمان کی زمین سے ہے حضرت ابو سعیدؓ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ وہ کیا بات ہے فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد، اللہ کی راہ میں جہاد۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لایا اور نماز باقاعدہ ادا کی اور رمضان کے روزے رکھے اللہ پر حق ہے کہ اس کو جنت میں داخل کرے راہ خدا میں اس نے جہاد کیا ہو یا اپنی جنم بھومی میں بیٹھا رہا ہو صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ کیا لوگوں کو ہم یہ خوشخبری نہ سنادیں۔ فرمایا جنت میں سو درجات ہیں جو اللہ نے اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لئے تیار کر رکھے ہیں ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جیسے آسمان وزمین کے درمیان جب تم اللہ سے مانگو تو جنت الفردوس مانگو یہ اوسط اور اعلیٰ جنت ہے (ہر چیز کا اوسط اعلیٰ ہوتا ہے) اس سے اوپر رحمٰن کا عرش ہے اور عرش سے ہی جنت کے دریا نکلتے ہیں۔ رواہ البخاری۔

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٩٦﴾ اور اللہ (ان کے گناہوں کو) معاف کرنے والا اور (ان پر) بڑا مہربان ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ کچھ مکہ کے باشندوں نے اسلام کا کلمہ تو پڑھ لیا تھا مگر ہجرت نہیں کی تھی ان میں سے قیس بن فاکہ بن مغیرہ اور قیس بن ولید بن مغیرہ اور ان جیسے دوسرے لوگ بھی تھے۔ جب مشرک بدر کو لڑنے آئے تو وہ مسلمان بھی مشرکوں کے ساتھ آگئے اور کافروں کے ساتھ مارے گئے۔

بخاری نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ کچھ مسلمان مشرکوں کے ساتھ ان کی تعداد بڑھانے کے لئے ہوگئے تھے اور (مسلم لشکر کا) کوئی تیر ان کے بھی لگ جاتا تھا اور وہ مر جاتا تھا یا تلوار سے مار دیا جاتا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ مشرکوں کی تعداد بڑھانے کے لئے آنے سے یہ معلوم ہوا وہ لڑتے نہ تھے۔ ابن مندہ نے ان لوگوں کے نام بھی اپنی روایت میں ذکر کئے ہیں۔ قیس بن ولید بن مغیرہ، ابو القیس بن فاکہ بن مغیرہ، ولید بن عتبہ بن ربیعہ، عمرو بن امیہ سفیان، علی بن امیہ بن خلف، ابن مندہ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ لوگ بدر کو مکہ سے آئے تھے جب انہوں نے مسلمانوں کی تعداد کم دیکھی تو ان کے دلوں میں شک پیدا ہو گیا اور بولے ان لوگوں کو ان کے دین نے دھوکہ دے رکھا ہے۔ آخر یہ لوگ بدر میں مارے گئے۔

میں کہتا ہوں کہ دلوں میں شک پیدا ہو جانے کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ وہ مرتد ہو گئے تھے لیکن قرآنی عبارت ان کے کفر پر دلالت نہیں کرتی۔ ابن ابی حاتم نے بھی یہ قصہ نقل کیا ہے اور حارث بن ربیعہ بن اسود اور عاص بن عتبہ بن حجاج کا نام بھی بیان کیا ہے۔

طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ مکہ میں کچھ لوگ مسلمان تو ہو گئے تھے مگر جب حضور ﷺ نے ہجرت کی تو وہ ڈر گئے اور ہجرت کرنا گوارا نہ ہو۔ ابن جریر اور ابن منذر نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ مکہ کے کچھ باشندے مسلمان تو ہو گئے مگر اپنا ایمان چھپا رکھا تھا مشرک ان کو ساتھ لے کر بدر کو گئے ان میں سے کچھ لوگ مارے گئے۔ مسلمانوں نے کہا وہ مسلمان تو تھے مجبور کر کے ان کو لایا گیا تھا۔ لہٰذا ان کے لئے دعا مغفرت کرو اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ بے شک جب ایسے لوگوں کی جان فرشتے قبض کرتے ہیں جنہوں نے اپنے کو گناہ گار کر رکھا تھا، تَوَفّی روح قبض کرنا، تَوَفّٰی ماضی کا صیغہ بھی ہو سکتا ہے اور مضارع کا بھی۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ ملائکہ سے مراد ہے تنہا موت کا فرشتہ۔ اللہ نے فرمایا ہے قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ عرب کبھی واحد کو صیغہ جمع سے خطاب کر لیتے ہیں صحیح یہ ہے کہ موت کا فرشتہ اور اس کے مددگار کارندے مراد ہیں۔

امام احمد اور نسائی نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے ایک طویل حدیث نقل کی ہے جس کے اندر یہ بھی مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ مومن کے مرنے کے وقت ملائکہ رحمت سفید ریشمین پارچہ لے کر آتے ہیں اور کہتے ہیں (اے روح پاک) باہر آ۔ تو اللہ سے خوش اور اللہ تجھ سے خوش۔ چل اللہ کی رحمت و راحت اور اس مالک کی طرف جو (تجھ سے) ناخوش نہیں ہے اور کافر کے مرنے کے وقت عذاب کے فرشتے ٹاٹ کا ایک ٹکڑا لے کر آموجود ہوتے ہیں اور کہتے ہیں (اے ناپاک نفس) تو (آنے والے عذاب یا اللہ سے) ناراض اور تجھ سے خدا ناراض ہے چل نکل اللہ کے عذاب کی طرف۔

حضرت براء بن عازب کی روایت سے امام احمد نے ایک طویل حدیث نقل کی ہے جس میں مذکور ہے کہ مومن بندہ جب دنیا سے جاتا ہوتا ہے اور آخرت سامنے آتی ہوتی ہے تو سورج کی طرح نورانی سفید چہروں والے فرشتے جنت کا کفن اور خوشبو لے کر اتر کر اس کے پاس آتے ہیں پھر بقدر مسافت نگاہ اس سے فاصلہ پر بیٹھ جاتے ہیں پھر موت کا فرشتہ آکر اس کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے اے پاکیزہ نفس نکل کر چل اللہ کی مغفرت اور خوشنودی کی طرف فوراً روح اس طرح بہتی ہوئی نکل آتی ہے جیسے مشک سے پانی کا قطرہ، موت کا فرشتہ اس کو لے لیتا ہے مگر وہ بیٹھے ہوئے فرشتے ملک الموت کے پاس اس کو لمحہ بھر نہیں چھوڑتے بلکہ فوراً لے کر کفن میں لپیٹ کر خوشبو لگا کر چل دیتے ہیں اور کافر بندہ جب دنیا سے جاتا ہوتا ہے اور آخرت سامنے سے آتی ہوتی ہے تو سیاہ منہ والے کچھ فرشتے ٹاٹ لئے آسمان سے اتر کر اس کے پاس بقدر مسافت نظر بیٹھ جاتے ہیں پھر موت کا فرشتہ آکر اس کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے اے ناپاک روح چل نکل اللہ کے غضب کی طرف روح جسم کے اندر ڈرتی (اور بھاگتی) ہے لیکن فرشتہ اس کو پکڑ کر اس طرح کھینچتا ہے جیسے بھیگے ہوئے اون سے آنکڑہ جب موت کا فرشتہ اس کو لے لیتا ہے تو وہ بیٹھنے والے لمحہ بھر اس کے پاس روح کو نہیں چھوڑتے اور فوراً لے کر ٹاٹ میں لپیٹ دیتے ہیں۔

ابن جریر اور ابن المنذر نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد مسلمانوں نے ان لوگوں کو جو مکہ میں ان کے ساتھیوں میں سے رہ گئے تھے لکھا کہ اب تمہارے لئے (وہاں رہنے میں) کوئی فائدہ نہیں (چلے آؤ) وہ لوگ نکل آئے لیکن پیچھے سے مشرکوں نے آکر ان کو پکڑ لیا اور واپس لے گئے اس پر انہی لوگوں کے متعلق نازل ہوا فَاِذَآ اُوْذِیَ فِی اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ (مدینہ کے) مسلمانوں نے پھر ان کو یہ آیت لکھ کر بھیج دی اس وقت مکی مسلمانوں نے فیصلہ کیا ہم (ضرور) نکلیں گے اگر کسی نے ہمارا پیچھا کیا تو ہم اس سے لڑیں گے چنانچہ نکل کھڑے ہوئے پیچھے سے مشرک بھی آپہنچے (لڑائی ہوئی) جو بچنے والا تھا بچ گیا اور جو مارا جانے والا تھا مارا گیا اس پر نازل ہوا ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِیْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا۔

ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ ترکیب کلام میں حال ہے اپنی جان پر ظلم کرنے سے مراد ہے فرض ہجرت کو ترک کرنا شرکستان میں رہنا، گناہ کا ارتکاب کرنا اور کافروں کی موافقت کرنا۔

بغوی نے لکھا ہے ہجرت کے بعد بغیر ہجرت کے اسلام قبول نہیں ہوتا تھا۔ فتح مکہ کے بعد یہ حکم منسوخ کر دیا گیا، حضور ﷺ نے فرمادیا فتح مکہ کے بعد ہجرت (کالازمی حکم) نہیں۔ رواہ احمد و ابوداؤد بسند صحیح عن مجاشع بن مسعودؓ۔ ابن جریر نے یہ حدیث ضحاک کی روایت سے لکھی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ جو شخص ہجرت کی قدرت رکھتا ہو اس پر کفرستان سے ہجرت کر جانا باجماع علماء محکم فرض ہے اور یہ ہجرت منسوخ نہیں ہے یہ آیت بتا رہی ہے کہ جہاں مسلمان اسلامی قوانین قائم کرنے سے عاجز ہوں وہاں سے ہجرت واجب ہے۔ رہا حدیث لَا ھِجْرَةَ بَعْدَ فَتْحِ مَكَّةَ کا جواب تو ظاہر ہے کہ فتح مکہ کے بعد مکہ دار الاسلام ہو گیا تھا اس لئے مکہ سے ہجرت واجب نہیں رہی اور فتح کے بعد جس نے مکہ کی سکونت چھوڑ دی اس کا شمار مہاجرین میں نہیں کیا جاتا نہ مہاجرین کا ثواب اس کو مل سکتا ہے پھر ہجرت کا فرض ہونا بھی اس امر کو نہیں چاہتا کہ غیر مہاجر کا اسلام بھی مقبول نہ ہو اور اس کو مومن نہ مانا جائے بلکہ ایسے شخص کو گناہ گار کہا جائے گا اور اس سے موالات نہیں کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَایَتِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰی یُهَاجِرُوْا وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ

فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ؕ جو لوگ ایمان لے آئے اور ہجرت نہ کی تمہاری ان سے کوئی موالات نہیں تاوقتیکہ وہ ہجرت نہ کریں لیکن اگر وہ دین کے سلسلہ میں تم سے مدد طلب کریں تو تم پر ان کی مدد کرنی لازم ہے بشرطیکہ یہ مدد ان لوگوں کے خلاف نہ ہو جن سے تمہارا معاہدہ ہے۔

قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ تو وہ ان سے کہتے ہیں تم کس کام میں تھے یعنی فرشتے ان کو ڈانٹ کر کہتے ہیں تم کس حال میں تھے کیا اسلام کی حالت میں تھے جیسا کہ تمہارے اقرار سے معلوم ہو رہا ہے یا کفر کی حالت میں تھے جیسا کہ کافروں کے ساتھ تمہارے مقام اور بلا عذر ان کی موافقت کرنے سے پتہ چل رہا ہے۔

قَالُوْا فریضۂ ہجرت کو ترک کرنے والے مردے کہتے ہیں۔

كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِى الْاَرْضِ ؕ ہم اس زمین میں محض مغلوب تھے یعنی مکہ میں ہم مغلوب تھے، کافروں سے مقابلہ کرنے کی ہم میں طاقت نہ تھی یا یہ مطلب کہ ہم دین کو ظاہر کرنے اور دین کا بول بالا کرنے سے عاجز تھے۔

قَالُوْۤا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فرشتے ان سے کہتے ہیں کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ ہجرت کر کے تم وہاں چلے جاتے یعنی جب وہ مردے اپنی کمزوری کا عذر پیش کرتے ہیں تو فرشتے ان کی تکذیب اور تذلیل کے لئے کہتے ہیں کہ کیا خدا کا ملک وسیع نہ تھا کہ تم مکہ کو چھوڑ کر وہاں چلے جاتے۔ مقصد یہ کہ مکہ چھوڑ کر ایسے مقام پر چلے جانے کی تو تم میں طاقت تھی جہاں اسلام کے اظہار کافروں کی مخالفت اور اعلاء کلمہ دین کی روک ٹوک نہ تھی جیسے مکہ چھوڑ کر حبشہ اور مدینہ کو جانے والوں نے کیا۔

فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ سو ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اس جملہ میں فاء تعقیب اور سببیت کے لئے ہے یعنی ترک ہجرت کے سبب اور ترک ہجرت کے نتیجہ میں ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اس جملہ سے غیر مہاجرین کا کافر اور دوامی جہنمی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۹۷﴾ اور جانے کے لئے وہ بری جگہ ہے۔ ثعلبی نے حسینؓ کی روایت سے مرسل حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنے دین کو لے کر ایک زمین سے دوسری زمین کی طرف بھاگا خواہ وہ زمین ایک ہی بالشت کے فاصلہ پر ہو (بہر حال اس کو اپنا دینی بچاؤ مقصود ہو) تو جنت اس کے لئے واجب ہو گئی اور اس کے دادا ابراہیمؑ اور اللہ کے نبی محمد ﷺ (جنت میں) اس کے ساتھی ہوں گے۔ بخاری وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان کا بہترین مال وہ بکریاں ہیں جن کو لے کر وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر۔ فتنوں سے بچنے کے لئے۔ اپنے دین کے ساتھ بھاگ کر چلا جائے۔ مسلم نے عمروؓ بن عاص کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بلاشبہ اسلام مسلمان ہونے سے پہلے کے جرائم کو ڈھا دیتا ہے بلاشبہ ہجرت، ہجرت سے پہلے کے گناہوں (کی عمارت) کو ڈھا دیتی ہے یقیناً حج پہلے کے گناہوں (کی عمارت) کو ڈھا دیتا ہے۔

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لیکن جو مرد اور عورتیں اور بچے قادر نہ ہوں۔ یہ استثناء منقطع ہے کیونکہ ہجرت پر قدرت نہ رکھنے والے مرد عورتیں اور بچے اَلَّذِيْنَ یا اس کی ضمیر کے تحت داخل ہی نہیں ہیں (وہ غیر معذور ہیں قادر ہیں اور یہ معذور اور عاجز ہیں) یہ لوگ اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے ہی نہیں ہیں حکم کا وجوب بغیر تعمیل کی قدرت کے کسی پر نہیں ہوتا لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔

عاجز مردوں کی مثال ایسی ہے جیسے بہت زیادہ بوڑھا فرتوت بہت بیمار بہت کمزور لاپاہج کہ پیدل سفر کر نہیں سکتا اور سواری کی استطاعت نہ ہو یا کوئی عیال دار ہو کہ سب کو لیکر جانے کی استطاعت نہ ہو اور تنہا جانے میں پیچھے اہل وعیال کی تباہی کا خطرہ ہو۔

استثناء میں بچوں کا ذکر صرف کلام میں زور پیدا کرنے اور یہ ظاہر کرنے کے لئے ہے کہ (ہجرت کا حکم اتنا اہم ہے کہ بچوں پر بھی لاگو ہے اگر وہ بالغ ہو جائیں اور ہجرت کر سکیں۔ یا بچوں سے مراد ان کے ولی ہیں کیونکہ بچوں کے ولی اگر بچوں کو لے

کر منتقل ہو سکتے ہوں توان پر مع بچوں کے ہجرت واجب ہے ورنہ ان کو عاجز قرار دیا جائے گا۔ آیت میں غلاموں کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ اگر غلام میں ہجرت کی قدرت ہو تو اس پر ہجرت واجب ہے۔ آقا کا حق اس کے لئے سنگ راہ نہیں ہو سکتا، فرض عینی سے حق عباد مانع نہیں ہے۔

محمد بن اسحاق نے یونس بن بکیر کی روایت میں بیان کیا کہ محاصرۂ طائف کے وقت رسول اللہ ﷺ کے منادی نے ندا دی جو غلام قلعہ سے اتر کر ہمارے پاس آجائے گا وہ آزاد ہے یہ سن کر قلعہ سے کچھ اوپر دس آدمی نکلے حافظ محمد بن یوسف صالحی شافعی نے سبیل الرشاد میں ان کے نام ذکر کئے ہیں۔

امام احمدؒ نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا غلاموں میں سے جو نکل کر ہمارے پاس آجائے گا وہ آزاد ہے یہ سن کر غلام نکل آئے جن میں ابو بکرہ بھی تھے حضور ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا۔ صحیحین میں ابو عثمانؒ نہدی کی روایت سے نقل کیا گیا ہے۔ بقول سعد ابو عثمانؓ نہدی ہی پہلے شخص تھے جنہوں نے اللہ کی راہ میں تیر چلایا تھا ابو بکرہؓ جو طائف کے قلعہ کی فصیل پر تھے، اتر کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آگئے آپ طائف کے قلعہ سے نکل کر آنے والوں میں تیسویں آدمی تھے یہ بات اہل طائف کو بہت ہی شاق گزری اور غلاموں پر ان کو سخت غصہ آیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا اور ایک ایک غلام سپرد کر دیا تاکہ اس کی ضروریات کی دیکھ بھال رکھے اور سوار کرلے) آپ نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ غلاموں کو قرآن پڑھاؤ اور مسائل اسلام سکھاؤ۔ آخر جب بنی ثقیف مسلمان ہو گئے تو ان کے سردار نے ان آزاد کردہ غلاموں کے بارے میں درخواست کی کہ ان کو دوبارہ غلامی کی طرف لوٹا دیا جائے (اور ہم کو دیدیا جائے) انہی میں سے حارثؓ بن کلدہ بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ اللہ کے آزاد کردہ ہیں، اب ان تک رسائی نہیں ہو سکتی۔

لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۹۸﴾ کہ نہ کوئی تدبیر کر سکتے ہیں۔ نہ راستہ سے واقف ہیں۔ حِیْلَۃً کا معنی ہے مہارت اچھی نظر اور کام کرنے کی قدرت یعنی ہجرت کرنے کی ان کو قدرت نہیں نہ اسباب ہجرت ان کے پاس ہے اور راستہ سے خود واقف نہیں نہ کوئی راہ نما ملتا ہے۔

فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ سو ان کے لئے امید ہے کہ اللہ معاف کر دے۔

(ایک سوال۔ معذورین کی مجبوری ظاہر ہے وہ مکلف نہیں۔ پھر یقین کی جگہ امید کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا اور جب وہ مکلف ہی نہیں تو پھر معافی کی صراحت کیوں فرمائی۔

جواب :۔ امید اور عفو کا لفظ استعمال کرنے سے اس امر پر تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ ترک ہجرت کا معاملہ اتنا اہم ہے کہ معذور کو بھی بے خطر نہ ہونا چاہئے، موقع کی تاک میں لگا رہے اور ہجرت سے دل کو وابستہ رکھے۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾ اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔ میں اور میری ماں ان لوگوں میں سے تھے جن کو اللہ نے معذور قرار دیا ہے یعنی مستضعفین میں سے تھے اور رسول اللہ ﷺ ان مستضعفین کے لئے نماز میں دعا کرتے تھے۔

بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ عشاء کی نماز کی آخری رکعت میں سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ کہنے کے بعد رسول اللہ دعا کرتے تھے اَللّٰهُمَّ اَنْجِ عَيَّاشَ بْنَ اَبِيْ رَبِيْعَةَ اَللّٰهُمَّ اَنْجِ الْوَلِيْدَ بْنَ الْوَلِيْدِ اَللّٰهُمَّ اَنْجِ سَلَمَةَ بْنَ هِشَامٍ۔ اَللّٰهُمَّ اَنْجِ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ اَللّٰهُمَّ اشْدُدْ وَطْاَتَكَ عَلٰى مُضَرَ۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا سِنِيْنَ كَسِنِيْ يُوْسُفَ اے اللہ عیاش بن ابی ربیعہ کو رہائی عطا کر، اے اللہ ولیدؓ بن ولید کو نجات دے، اے اللہ سلمہؓ بن ہشام کو خلاصی دے، اے اللہ مغلوب مسلمانوں کو بچا، اے اللہ (قبائل) مضر کو سخت پامال کر دے اے اللہ ان کے سالوں کو یوسف کے سالوں کی طرح (قحط کے) بنا دے۔

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا اور جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا

اس کو زمین پر بہت سے منتقل ہونے کے مقام مل جائیں گے یا جانے کی بہت جگہ مل جائے گی۔
علیؒ بن ابی طلحہ کی روایت سے حضرت ابنؓ عباس کا قول آیا ہے کہ مُرَاغَمًا کا معنی ہے منتقل ہونے کی جگہ جہاں منتقل ہو کر جا سکے، یہ لفظ رغام سے مشتق ہے اور رغام کا معنی ہے مٹی۔
بعض علماء نے کہا مُرَاغَمًا یعنی ایسا راستہ مل جائے گا کہ وہ اپنی قوم کی ناک خاک آلود کر دے مطلب یہ ہے کہ ان کی مرضی کے خلاف ترک وطن کر کے چلا جائے۔ اس مطلب پر بھی یہ رغام سے مشتق ہوگا اور رغام کا معنی خاک ہوگا۔ مجاہد نے کہا مراغما یعنی ناگوار امور سے ہٹنے کا مقام ابو عبیدہؓ نے کہا مراغما یعنی ہجرت کا مقام بولا جاتا ہے مَرَاغَمْتُ قَوْمِیْ میں نے اپنی قوم کو چھوڑ دیا۔ قاموس میں ہے مَرَاغَمْتُہٗ چھوڑ دینا دور ہو جانا مُرَاغَم جانے کی جگہ بھاگنے کی جگہ، پناہ گاہ حرکت کا مقام۔
وَّسَعَةً ط اور وسعت یعنی رزق میں معاش میں اور بے خوف و خطر ہو جانے اور دین کو ظاہر کر سکنے کی وجہ سے سینہ میں کشائش۔
بغوی نے لکھا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو قبیلہ بنی لیث کے ایک بہت بوڑھے بیمار شخص نے جس کا نام جندع بن ضمرہ تھا اس کو سن کر کہا خدا کی قسم میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جن کا اللہ نے استثناء کر دیا ہے مجھے تدبیر بھی آتی ہے اور میرے پاس اتنا مال بھی ہے کہ میں مدینہ تک بلکہ مدینہ سے بھی دور پہنچ سکتا ہوں بخدا آج رات میں مکہ میں نہیں گزاروں گا۔ مجھے مکہ سے باہر نکال لے چلو چنانچہ ایک چارپائی پر ڈال کر لوگ اٹھا کر مکہ سے تنعیم تک لے آئے۔ تنعیم میں پہنچ کر اس کا پیام موت آ گیا تو تالی بجا کر بولا اے اللہ یہ تیرے اور تیرے رسول کے لئے ہے، میں تجھ سے وہی عہد کرتا ہوں جو تیرے رسولؐ نے تجھ سے کیا ہے اس کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی اطلاع حضور ﷺ کو پہنچی تو صحابہؓ نے کہا اگر وہ مدینہ تک پہنچ جاتا تو اس کا ثواب بالکل پورا اور کامل ہو جاتا۔ مشرک یہ حالت دیکھ کر ہنسنے اور کہنے لگے اس کا مقصد پورا نہ ہوا۔
ابن ابی حاتم اور ابو یعلے نے عمدہ سند کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ ضمرہؓ بن جندب اپنے گھر سے ہجرت کر کے نکلا اور گھر والوں سے کہا مجھے سواری پر بٹھا دو اور شرکستان سے نکال کر رسول اللہ ﷺ تک پہنچا دو (لوگ لے چلے) مگر وہ راستہ میں ہی مر گیا۔ رسول اللہ ﷺ تک نہ پہنچ سکا اس پر آیت نازل ہوئی۔

وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ

اور جو شخص اپنے گھر سے اس نیت سے نکل کھڑا ہو کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف (یعنی جہاں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہو) ہجرت کروں گا پھر اس کو موت آ پکڑے تب بھی اس کا ثواب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ثابت ہو گیا۔ یعنی اللہ اور اس کے رسول نے ترک وطن کر کے جہاں جانے کا حکم دیا ہے اگر وہاں جانے کے لئے وہ نکل کھڑا ہوا پھر مقام ہجرت تک پہنچنے سے پہلے اس کو موت آ جائے تو اللہ کے ذمے اس کا ثواب واجب ہو گیا۔ وقوع بمعنی وجوب ہے یعنی اللہ کے وعدہ کی وجہ سے اس کا اجر لازم ہو گیا واقع میں تو اللہ پر کوئی چیز واجب نہیں (کیونکہ مخلوق کا اللہ پر کوئی استحقاق نہیں نہ اللہ عاجز ہے کہ اس پر کسی کا حق واجب ہو اور وہ ادا کرنے پر مجبور ہو)۔

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۰﴾ اور اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔

ع ۱۴

ابن ابی حاتم نے سعیدؓ بن جبیر کی روایت سے لکھا ہے کہ ابو ضمرہ زرقی ایک نابینا مکہ میں رہتا تھا۔ جب آیت اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ نازل ہوئی تو اس نے کہا حکم مجھے پہنچ گیا اور میں صاحب استطاعت ہوں یہ کہہ کر اس نے رسول اللہ ﷺ تک پہنچنے کی تیاری کر لی (اور روانہ ہو گیا) تنعیم تک پہنچا تھا کہ موت آ پہنچی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن جریرؒ نے بھی یہ قصہ سعید بن جبیرؓ اور عکرمہ اور قتادہ اور سدی اور ضحاک وغیرہ کی روایت سے لکھا ہے لیکن مختلف روایات میں نام کا اختلاف ہے کسی میں ضمرہ بن عیص کسی میں عیص بن ضمرہ کسی میں جندب بن ضمرہ جندعی کسی میں ضمری کسی میں بنی ضمرہ کا ایک شخص

کسی میں بنی خزاعہ کا ایک آدمی کسی میں بنی لیث کا کسی میں بنی کنانہ کا اور کسی میں بنی بکر کا ایک شخص آیا ہے۔

ابن سعدؒ نے طبقات میں یزید بن عبد اللہ بن قسیط کی روایت سے لکھا ہے کہ جندع بن ضمیرہ ضمری جندعی مکہ میں تھا اس نے اپنے لڑکوں سے کہا مجھے مکہ سے باہر لے چلو یہاں کی فکر مجھے کھائے جاتی ہے لڑکوں نے کہا کہاں اس نے ہاتھ سے مدینہ کی طرف اشارہ کیا۔ مقصد تھا مدینہ کو ہجرت کرنا، لڑکے اس کو لے چلے اضاءۃ بنی عمارہ میں پہنچے تو اس کا انتقال ہو گیا اور اللہ نے اس کے متعلق یہ آیت نازل فرمائی۔ ابن ابی حاتم، ابن مندہ اور باوردی نے ہشام بن عروہ کی روایت سے حضرت زبیر بن عوام کا قول نقل کیا ہے کہ خالد بن ہشام حبشہ کو ہجرت کرنے کے ارادہ سے چل دیئے۔ راستہ میں سانپ نے کاٹ لیا اور ان کا انتقال ہو گیا۔ انہی کے متعلق اس آیت کا نزول ہوا۔

اموی نے مغازی میں عبد الملک بن عمیر کی روایت سے لکھا ہے کہ اکثم بن صیفی کو جب رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی اطلاع ملی تو اس نے خدمت گرامی میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا مگر قوم والوں نے (اس کی کمزوری اور پیری کی وجہ سے) جانے کی اجازت نہیں دی، اکثم نے کہا تو کوئی آدمی ایسا ہونا چاہئے جو میرا پیام ان کو اور ان کا پیام مجھے پہنچادے۔ اس پر دو آدمیوں نے ذمہ لے لیا اور دونوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا ہم اکثم بن صیفی کے قاصد ہیں اکثم نے آپ سے پوچھا ہے کہ آپ کون ہیں آپ کی کیا حالت ہے اور کیا (تعلیم) آپ لائے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں عبد اللہ کا بیٹا محمد ہوں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں پھر آپ نے آیت اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ الخ تلاوت فرمائی قاصد لوٹ کر اکثم کے پاس گئے اور یہ بات کہہ دی اکثم نے کہا قوم والو وہ اعلیٰ خصائل کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے بازداشت کرتے ہیں اس معاملہ میں تم سر بن جاؤ دم نہ بنو (یعنی سب سے پہلے ایمان لے آؤ ایسا نہ ہو کہ اور لوگ سبقت کر جائیں۔ اور تم پیچھے رہ جاؤ) یہ کہہ کر اونٹ پر سوار ہو کر مدینہ کا رخ پکڑ لیا۔ لیکن راستہ میں انتقال ہو گیا۔ اسی کے متعلق اس آیت کا نزول ہوا۔ یہ روایت مرسل ہے اس کی سند ضعیف ہے۔

ابو حاتم نے کتاب المعمرین میں دو طریقوں سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا گیا آپ نے فرمایا اس کا نزول اکثم بن صیفی کے متعلق ہوا تھا۔ لوگوں نے کہا تو لیثی کہاں گیا (یعنی اس آیت کا نزول تو قبیلہ بنی اللیث کے ایک آدمی کے سلسلہ میں ہوا تھا) فرمایا یہ تو لیثی سے ایک مدت پہلے کا واقعہ ہے۔ یہ آیت (سبب نزول کے ساتھ) خاص بھی ہے اور (حاکم کے اعتبار سے) عام بھی ہے۔

فائدہ :- علماء کا قول ہے کہ اگر طلب علم یا حج یا جہاد، یا پاکیزہ رزق کی کمائی کے لئے یا ایسے شہر میں جانے کے لئے جہاں طاعت قناعت اور زہد میں ترقی ہو سکے ہجرت کرے گا اور راستہ میں موت آجائے گی تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہو جائے گا۔

ابن جریر نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت سے لکھا ہے کہ بنی نجار کے کچھ لوگوں نے خدمت گرامی میں عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم سفر پر جاتے ہیں نماز کس طرح پڑھیں اس پر آیت ذیل کا نزول ہوا۔

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ جب تم سفر کو جاؤ تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔ جُناح کا معنی ہے گناہ۔ کذا فی القاموس۔

اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ کہ نماز میں قصر کر دو یعنی چار رکعت والی نماز میں دو رکعت کم کر دو۔ تین اور دو رکعت والی نماز میں باتفاق علماء قصر نہیں۔ اس لئے الصلوۃ سے مراد چار رکعت والی نماز ہے۔ سیبویہ کے نزدیک من الصلوۃ صفت ہے اور موصوف جو مفعول ہے (حذوف ہے یعنی شَيْئًا كَائِنًا مِّنَ الصَّلٰوةِ۔ اخفش کے نزدیک الصلوۃ ہی مفعول ہے من زائد ہے۔

چند مباحث

بحث......ا:- جس سفر میں قصر کی اجازت ہے اس کی مقدار کیا ہے۔ یہ مفصل بحث سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے جہاں روزہ نہ رکھنے کی اجازت کا بیان کیا گیا ہے۔

بحث......۲:- کیا سفر میں پوری نماز (بغیر قصر کے) پڑھنی جائز ہے یا نہیں امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے بعض رفقاء کے نزدیک ناجائز ہے۔ بغوی نے لکھا ہے حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت جابرؓ اور حضرت ابن عباسؓ کا مسلک روایات میں یہی آیا ہے حسن بصریؒ، عمر بن عبدالعزیزؒ، قتادہؒ اور امام مالکؒ کا یہی مذہب ہے امام شافعیؒ امام احمدؒ نے کہا اور مشہور قول امام مالکؒ کا بھی یہی ہے کہ پوری نماز سفر میں جائز ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ غنی اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا مسلک یہی مروی ہے۔ امام شافعیؒ نے جواز کا قول ظاہر آیت کو دیکھ کر اختیار کیا کیونکہ گناہ کی نفی اجازت ہی کی صورت میں ہوتی ہے جہاں قطعی حکم ہو وہاں نفی جناح نہیں (بلکہ اس کام کو نہ کرنا وجوبی ہوتا ہے) حضرت عائشہؓ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سفر میں قصر بھی کرتے تھے اور پوری بھی پڑھتے تھے اور روزہ نہیں بھی رکھتے تھے اور رکھتے بھی تھے۔ رواہ الشافعی وابن ابی شیبۃ والبزار والدار قطنی۔ دار قطنی نے اس حدیث کی سند کو صحیح کہا ہے لیکن اس پر اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ روایت مغیرہ بن زیاد کی ہے جس نے عطاء بن رباح کے حوالہ سے اس کو بیان کیا ہے اور امام احمد نے مغیرہ کو ضعیف کہا ہے اور ابوزرعہ نے اس کی حدیث کو نا قابل استدلال قرار دیا ہے۔

مگر ابن جوزی نے یہ حدیث عمر بن سعید کی وساطت سے بحوالہ عطاء بیان کی ہے (جس میں مغیر واقع نہیں ہوتا) پھر مغیرہ کو وکیع اور یحییٰ بن معین نے ثقہ قرار دیا ہے۔

عبدالرحمٰن بن اسود راوی ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا میں رمضان میں عمرہ کرنے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گئی حضور ﷺ نے روزہ نہیں رکھا مگر میں نے رکھا۔ حضور ﷺ نے نماز میں قصر کیا اور میں نے پوری پڑھی۔ میں نے عرض کیا۔ میرے ماں باپ قربان، آپ نے روزہ نہیں رکھا اور میں نے رکھا۔ آپؐ نے قصر کیا اور میں نے پوری نماز پڑھی۔ فرمایا عائشہؓ تم نے اچھا کیا۔ رواہ النسائی والدار قطنی۔ دار قطنی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ بیہقی نے بھی نقل کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے۔ اس پر اعتراض کیا گیا ہے کہ عبدالرحمٰن بن اسود حضرت عائشہؓ کی خدمت میں بچہ پن میں گئے تھے انہوں نے حضرت عائشہؓ سے کسی حدیث کی سماعت نہیں کی۔

دار قطنی نے بلوغ کے قریب حضرت عائشہؓ کی خدمت میں جانے کی صراحت کی ہے۔ تاریخ بخاری وغیرہ سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ پھر دار قطنی نے کہا یہ حدیث عبدالرحمٰنؒ بن اسود نے اپنے باپ کی وساطت سے بھی بیان کی ہے گویا دار قطنی کے قول میں اختلاف ہو گیا۔ ایک قول سے حدیث کا مسند ہونا اور دوسرے قول سے مرسل ہونا معلوم ہوتا ہے المبیر میں مسند ہونے کو صحیح کہا ہے اور العلل میں مرسل ہونے کو اشبہ بالصواب کہا ہے اس روایت پر اعتراض کیا گیا ہے کہ تمام اہل سیر کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی رمضان میں عمرہ نہیں کیا ہے صرف دار قطنی کی روایت میں عمرۂ رمضان کی صراحت ہے کسی اور راوی نے عمرۂ رمضان کا ذکر نہیں کیا۔ واللہ اعلم۔

امام ابو حنیفہؒ کا استدلال حسب ذیل ہے۔

یعلی بن امیہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت عمر بن خطابؓ سے دریافت کیا اللہ نے فرمایا ہے لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اور اب لوگ امن سے ہیں (تو کیا امن کی حالت میں سفر کے اندر بھی قصر جائز ہے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے بھی اس پر تعجب تھا اور میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق دریافت کیا تھا تو حضور ﷺ نے فرمایا یہ صدقہ ہے جو اللہ نے تم کو عطا فرمایا ہے لہٰذا اللہ کے صدقہ (یعنی احسان) کو قبول

کرو۔ رواہ مسلم۔

اس حدیث میں قصر کو صدقہ فرمایا ہے اور جہاں کسی کو مالک کرنے کا احتمال ہی نہ ہو وہاں تصدق کرنے کا معنی ہوتا ہے محض ساقط کر دینا (تو قصر جب تصدق ہوا اور قصر سے کسی چیز کی تملیک نہیں ہوتی لا محالہ دو رکعت کو ساقط کر دینا ہی مراد ہو گا اور اللہ کی طرف سے جو حکم ساقط ہو گیا اس کو کرنا ناجائز ہے لہٰذا پوری نماز پڑھنا ناجائز ہے) دیکھو جس شخص کی اطاعت واجب نہیں جیسے ولی قصاص اگر وہ تصدق کر دے یعنی قصاص کو معاف کر دے تو قصاص ساقط ہو جاتا ہے چہ جائیکہ تصدق کرنے والی اگر وہ ہستی ہو جس کی اطاعت واجب ہے (اس کے تصدق کے حکم کی تعمیل کس طرح لازم نہ ہو گی)۔

قبیلہ بنی عبد اللہ بن کعب میں انسؓ بن مالک ایک شخص تھے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی مندرجہ ذیل حدیث بیان کی اس کے علاوہ کسی اور حدیث رسول اللہ ﷺ کی روایت ان سے ثابت نہیں۔ انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سواروں نے ہم پر لوٹ مچائی (یعنی حملہ کیا) میں فوراً خدمت گرامی میں حاضر ہوا حضور ﷺ دن کا کھانا تناول فرما رہے تھے فرمایا قریب آؤ اور کھاؤ میں نے عرض کیا میں روزہ سے ہوں فرمایا قریب آؤ میں روزہ کے متعلق تم سے ایک بات کہوں، اللہ نے مسافر سے روزہ اور نماز کا آدھا حصہ ساقط کر دیا ہے اور حاملہ و مرضعہ سے روزہ۔ (انسؓ کا بیان ہے) افسوس کہ میں رسول اللہ ﷺ کا کھانا نہ کھا سکا۔ رواہ ابن الجوزی من طریق الترمذی۔ امام شافعیؒ نے اسی حدیث سے اپنے مسلک پر استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں روزہ کو نماز کے ساتھ بیان کیا ہے اور مسافر کو سفر میں روزہ نہ رکھنے کا باتفاق علماء جواز ہے وجوب نہیں (لہٰذا نماز میں قصر کرنے کا بھی جواز ہو گا وجوب نہ ہو گا)۔

وجہ یہ ہے کہ وضع کا حقیقی معنی ہے ساقط کر دینا لیکن رخصت صوم میں چونکہ اس کا استعمال کیا گیا ہے اس لئے صوم کے معاملہ میں مجازاً اس کا استعمال تخییر کے لئے ہو گیا (اور قصر صلوٰۃ کا ذکر صوم کے ساتھ اسی لفظ کے تحت کیا گیا ہے اس لئے قصر میں بھی تخییر کا معنی مراد ہو گا۔ قصر صلوٰۃ میں وجوب کیلئے اور ترک صوم میں تخییر کے لئے ہو یہ ممکن نہیں ورنہ ایک ہی وقت میں ایک ہی لفظ کے دو معنی مراد لینے ہوں گے ایک حقیقی دوسرا مجازی اور یہ حقیقت و مجاز کے درمیان اجتماع ہے جو ناجائز ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق پوری پوری بغیر کمی کے سفر کی نماز دو رکعت ہے اور عید الاضحیٰ کی نماز دو رکعت ہے اور عید الفطر کی نماز دو رکعت ہے اور جمعہ کی نماز دو رکعت ہے۔ اخرجہ النسائی وابن ماجہ۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ نے تمہارے نبی پر اقامت کی حالت میں چار رکعت اور سفر میں دو رکعت اور خوف کے وقت ایک رکعت فرض کی۔ رواہ مسلم۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا (شروع میں) نماز کی دو رکعتیں ہی فرض کی گئی تھیں پھر سفر کی حالت میں تو اس کو قائم رکھا گیا اور اقامت کی حالت میں اس میں (دو رکعت کی) زیادتی کر دی گئی۔ رواہ البخاری و مسلم۔

زہری کا بیان ہے میں نے عروہؓ سے پوچھا پھر حضرت عائشہؓ سفر میں پوری نماز کیوں پڑھتی تھیں عروہؓ نے جواب دیا انہوں نے حضرت عثمانؓ کی طرح تاویل کی تھی۔ بخاری کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں۔ نماز دو رکعت فرض کی گئی تھی پھر جب رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کی تو چار رکعتیں (اقامت کی حالت میں) فرض کر دی گئیں اور سفر کی حالت میں اول صورت پر نماز باقی رکھی گئی۔

حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے میں سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہا حضور صلعم نے وقت وفات تک (سفر میں) دو رکعت سے زائد نہیں پڑھی۔ حضرت عمرؓ کے بھی ساتھ رہا، آپ نے بھی وقت وفات تک دو رکعت سے زائد نہیں پڑھی (یعنی سفر میں) حضرت عثمانؓ کے بھی ساتھ رہا آپ نے بھی (سفر میں) وقت وفات تک دو رکعت سے زائد نہیں پڑھی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ رواہ البخاری

صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ان الفاظ کے ساتھ منقول ہے۔ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہا آپ

سفر میں دو رکعتوں پر اضافہ نہیں کرتے تھے اور میں ابو بکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ کے ساتھ بھی رہا یہ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ صحیحین میں حضرت ابن عمر کا قول اس طرح بھی آیا ہے کہ منیٰ میں رسول اللہ ﷺ نے دو رکعتیں پڑھیں اور آپ کے بعد ابو بکر نے بھی اور ابو بکرؓ کے بعد عمرؓ نے بھی اور عثمانؓ نے اپنی خلافت کے شروع حصہ میں بھی لیکن کچھ مدت کے بعد عثمانؓ نے چار رکعتیں پڑھیں۔

امام احمدؒ کی روایت ہے کہ حضرت عثمانؓ نے منیٰ میں چار رکعتیں پڑھیں تو لوگوں نے اعتراض کیا آپ نے فرمایا لوگو میں جب سے مکہ میں آیا ہوں میں نے مکہ میں گھر کر لیا ہے اور میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ فرما رہے تھے کہ جو شخص کسی شہر میں گھر کرے تو وہ مقیم کی ایسی نماز پڑھے۔ دیکھو حضرت عثمانؓ کے پوری نماز پڑھنے پر لوگوں نے اعتراض کیا اور آپؓ نے مکہ میں گھر کر لینے کا عذر پیش کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری نماز پڑھنی جائز نہیں ورنہ لوگ اعتراض نہ کرتے اور نہ آپ عذر پیش کرتے بلکہ فرمادیتے کہ مجھے اختیار دیا گیا ہے (کہ سفر میں قصر کروں یا نہ کروں)۔

امام شافعیؒ کی طرف سے جواب میں کہا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ بن خطاب کے قول میں آیا ہے کہ سفر میں دو رکعتیں ہیں پوری پوری بغیر قصر (کمی) کے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ دو رکعتیں ثواب میں پوری ہیں (صرف دو رکعت پڑھنے سے) نماز میں کوئی نقصان نہیں آتا کیونکہ غیر قصر سے مراد اگر یہ ہوتی کہ اصل نماز دو رکعت ہے سفر میں قصر نہیں کیا گیا تو یہ آیت فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا کے خلاف ہے اس آیت میں قصر صلوٰۃ ہونے کی صراحت ہے۔ اور حدیث احاد خواہ مرفوع ہی ہو لیکن جب اس کا مقابلہ صراحت قرآنی سے ہو تو واجب الترک ہے یہ تو حدیث موقوف ہے۔

رہا حضرت ابن عباسؓ کا اثر تو وہ بالاجماع واجب الترک ہے کیونکہ صلوٰۃ خوف کے ایک رکعت ہونے کا کوئی قائل نہیں۔

باقی حضرت عائشہؓ کی روایت تو وہ بھی نا قابل عمل ہے کیونکہ راوی کا عمل اگر اسی کی روایت کے خلاف ہو تو ایسی روایت مجروح مانی گئی ہے۔ اور یہ یقینی ہے کہ حضرت عائشہ ﷺ (سفر میں) پوری نماز پڑھتی تھیں۔ اور رخصت اختیاری کا قول انہوں نے نقل بھی کیا ہے لہٰذا ان کے یہ الفاظ کہ سفر میں نماز اول حالت پر چھوڑ دی گئی اس کا مطلب یہ ہے کہ جو دو رکعت پڑھنا پسند کرے تو گویا اس کے لئے نماز اول حالت پر چھوڑ دی گئی (اس کو زیادہ کا مکلف نہیں بنایا گیا)

رہا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول تو وہ نفی کی شہادت دے رہا ہے اور حضرت عائشہؓ کی حدیث اثبات پر دلالت کر رہی ہے لہٰذا حضرت عائشہؓ کی حدیث کو ترجیح دی جائے گی۔ یا یوں کہا جائے گا کہ حضرت ابن عمرؓ نے جو فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو رکعت پر اضافہ نہیں کیا۔ اس سے مراد ہے اکثر اوقات میں دو رکعت سے زائد نماز نہیں پڑھی (کبھی زیادہ بھی پڑھ لی) پھر خود ہی حضرت ابن عمرؓ نے بیان کیا کہ حضرت عثمانؓ نے اپنی خلافت کے شروع میں دو رکعتیں پڑھیں پھر چار پڑھیں اس میں لوگوں کے اعتراض کرنے کا ذکر نہیں ہے اس سے بجائے خود ثابت ہوتا ہے کہ دو یا چار رکعت پڑھنے کا اختیار ہے (دو کا وجوب نہیں)۔

رہی آیت لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ جو حضرت ابن عمرؓ نے ذکر کی تھی تو یہ وجوب پر دلالت نہیں کرتی۔ اولیٰ ہونا بتاتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت عثمان پر لوگوں کا اعتراض اور آپ کی معذرت صرف ترک اولیٰ کی وجہ سے ہو (ترک واجب کی وجہ سے نہ ہو) امام ابو حنیفہؒ نے ایک عقلی استدلال بھی کیا ہے کہ قصر کی نماز کے آخری شفعہ (آخری دو رکعتوں) کی قضاء کا حکم نہیں اور نہ ان کو ترک کرنے سے گناہ گار ہو گا (معلوم ہوا کہ پہلی دو رکعتیں ہی فرض ہیں اور آخری شفعہ نفل ہے، روزہ کی یہ حالت نہیں ہے۔ اس کی قضا واجب ہے اور فقیر کے حج کی حالت بھی اس سے جدا ہے (فقیر پر حج اگرچہ فرض نہیں۔ لیکن اگر میقات میں داخل ہو جائے تو فرض ہو جاتا ہے۔

تخییر (کرنے نہ کرنے کا اختیار) کا حکم تو اس وقت ہوتا ہے جب فعل اور ترک دونوں میں کسی خاص قسم کی سہولت ہو جیسے مسافر کے لئے رمضان کا روزہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ایسی سہولت سے گزر جاتا ہے جو تنہا روزہ رکھنے میں مفقود ہے دو

تین کے ساتھ روزہ رکھنے میں آسانی ہے۔ رہا مسافر کا جمعہ اور اس کے ظہر کی نماز تو یہ دونوں الگ الگ جنس کی نمازیں ہیں اور ہر ایک میں وہ سہولت ہے جو دوسرے میں نہیں ہے جمعہ میں (باوجود دو رکعت کی سہولت حاصل ہونے کے) ایسی شرطیں بھی ہیں جو ظہر میں نہیں ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر مکلف کی سہولت کی رعایت نہ ہو تو ایسی صورت میں تخییر شان عبودیت کے منافی ہے (عبودیت کا تقاضا وجوب ہے نہ کہ اپنی مرضی پر چلنا)۔

امام صاحبؒ کے اس استدلال کا جواب

اس طرح دیا گیا ہے کہ اگر قلیل وکثیر میں تخییر دی جاتی ہے تو دونوں صورتوں کی وجہ الگ الگ ہوتی ہے۔ قلیل میں تو سہولت ہوتی ہے اور کثیر میں ثواب کی زیادتی اور کثیر میں اجر کے زیادہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ قلیل میں (معیار مقرر کے درجہ سے) ثواب کم ہے دیکھو نماز میں مقدار قرات کم سے کم اتنی کہ جس سے نماز ہو جائے (کامل ثواب کے لئے کافی ہے) اور پورے قرآن کی ایک رکعت میں قرات (جو زیادتی ثواب کی موجب ہے) دونوں کا اختیار ہے اول الذکر کی نماز میں کوئی نقصان نہیں آتا اور نہ پورا قرآن پڑھنے والا فرض سے زائد (بطور نفل) پڑھتا ہے کیونکہ حکم قرات قرآن کا ہے اور جس طرح مقدار ادنیٰ ما یجوز بہ الصلوٰۃ مامور بہ کا فرد ہے۔ اسی طرح پورا قرآن بھی فرد ہے۔

اس پر شبہ کیا جا سکتا ہے کہ

یہ تقریر تو اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ اگر مسافر پوری نماز پڑھے تو ثواب زیادہ ہوگا اور قصر سے پڑھنے میں اتنا ثواب نہ ہوگا (گو فرض ادا ہو جائے گا) جیسے نماز میں قرات کی زیادتی سے بالاجماع ثواب زیادہ ہوتا ہے۔ سنت سے زیادہ قرات امام کے لئے اس وقت مکروہ ہے جب مقتدی پسند نہ کرتے ہوں۔ تنہا نماز پڑھنے میں زیادتی قرات افضل ہے اور اگر قوم راغب ہو تو امام کے لئے بھی زیادہ قرآن پڑھنا زیادتی ثواب کا باعث ہے لیکن بالاجماع سفر میں قصر کرنا پوری نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ امام شافعیؒ کا ایک قول ضرور آیا ہے کہ سفر میں پوری نماز پڑھنی افضل ہے مگر آپ نے اس سے رجوع کر لیا تھا۔

رہا امام شافعیؒ کا لفظ جناح سے تخییر کا استنباط کرنا تو یہ غلط ہے وجہ یہ ہے کہ لوگ پوری نماز پڑھنے کے عادی تھے اور اسی سے مانوس تھے۔ قصر کے حکم سے ان کے دلوں میں یہ خطرہ ضرور پیدا ہوتا کہ اس سے نماز میں کمی آجائے گی اس خیال کو دفع کرنے کے لئے گناہ کی نفی کی تاکہ لوگ قصر سے کوئی خطرہ محسوس نہ کریں اور اطمینان قلب سے قصر کے ساتھ نمازیں پڑھیں جیسے دوسری آیت میں آیا ہے اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا (جاہلیت کے زمانہ میں لوگ صفا و مروہ کے درمیان چکر لگاتے تھے اور دونوں پہاڑیوں پر اس زمانہ میں دو بت رکھے تھے جب اسلام کا دور آیا اور صفا و مروہ کے درمیان طواف کا وجوبی حکم دینا مقصود ہوا لیکن اس طور پر کہ لوگوں کو یہ خیال نہ ہو کہ یہ تو بت پرستی اور جاہلیت کی رسم ہے اس لئے لفظ لا جناح استعمال کیا)۔

اس کے رد میں شافعیہ کی طرف سے کہا گیا ہے کہ یہ تو خواہ مخواہ بے وجہ ظاہر آیت کا ترک ہے۔ واللہ اعلم۔

بحث ...... ۳ :- آیت کے عموم کے پیش نظر امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک گناہ کے سفر میں بھی قصر کیا جائے گا۔ باقی تینوں اماموں کے نزدیک سفر معصیت میں قصر جائز نہیں مگر ان کے پاس کوئی قابل اعتماد دلیل نہیں (کہ آیت کے عموم کے مقابل اس کو تسلیم کیا جائے)۔

بحث ...... ۴ :- مسافر جب شہر کی آبادی سے نکل جائے تو قصر کرے یہ فیصلہ چاروں اماموں کے نزدیک بالاتفاق ہے، البتہ ایک روایت میں امام مالکؒ کا قول آیا ہے کہ جب آبادی سے تین میل پر پہنچ جائے تو قصر کرے۔ ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ جب حارثؓ بن ربیعہ نے سفر کا ارادہ کیا تو اپنی فرودگاہ میں ہی انہوں نے دو رکعتیں پڑھائیں۔ حاضرین میں اسود اور حضرت عبد اللہ کے متعدد شاگرد موجود تھے۔ مجاہد کا قول آیا ہے کہ دن کو سفر کو نکلے تو رات آنے تک قصر نہ کرے اور رات کو

نکلے تو دن شروع ہونے سے پہلے قصر نہ کرے۔
ابن ابی شیبہ کی روایت ہے کہ حضرت علیؓ جب بصرہ سے نکلنے لگے تو ظہر کی چار رکعتیں پڑھیں یعنی آبادی چھوڑنے سے پہلے پھر فرمایا اگر ہم اس چھاؤنی سے آگے نکل جاتے تو دو رکعت پڑھتے۔ اسی طرح جب آپ سفر سے واپس آتے اور شہر میں داخل ہونے کا ارادہ کرتے تو جب تک آبادی میں داخل نہ ہو جاتے دو رکعت پڑھتے۔
آبادی میں داخل ہو جائے تو چار رکعت پڑھے یہ اجماعی فیصلہ ہے۔ بخاری نے تعلیقاً ذکر کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے آبادی سے نکل کر قصر کیا آبادی کے گھر سامنے نظر آرہے تھے جب واپس آئے تو لوگوں نے کہا یہ کوفہ آگیا آپ نے فرمایا نہیں، جب تک اندر داخل نہ ہو جائیں۔ مراد یہ کہ دو رکعتیں پڑھیں حالانکہ کوفہ نظر کے سامنے تھا۔
عبدالرزاق نے بروایت ثوریؒ، وفا بن ایاس اسدی کا قول نقل کیا ہے وفا نے کہا ہم حضرت علیؓ کے ساتھ (کوفہ سے) نکلے، کوفہ ہم کو دکھائی دے رہا تھا۔ مگر حضرت علیؓ نے دو رکعتیں پڑھیں پھر لوٹے تب بھی دو رکعتیں پڑھیں حالانکہ آبادی ان کو نظر آرہی تھی ہم نے عرض کیا کیا ہم چار نہ پڑھیں فرمایا نہیں۔ تاوقتیکہ اندر داخل نہ ہو جائیں۔
بحث...... ۵ :- دوران سفر میں اگر کسی شہر یا گاؤں میں چار روز قیام کی نیت کر لے تو امام مالک وشافعیؒ کے نزدیک چار رکعت پڑھے، داخل ہونے اور نکلنے کے دن ان چار کی گنتی میں نہیں آئیں گے۔ امام احمد کا قول مروی ہے کہ اگر کہیں ٹھیر کر ۲۰ نمازوں سے زائد پڑھنے کا ارادہ ہو تو پوری نماز پڑھے۔ امام ابو حنیفہؒ عدم قصر کے لئے کسی شہر یا گاؤں میں پندرہ روز کے قیام کی نیت کو ضروری قرار دیتے ہیں اور جنگل میں یا (بدویوں کے) خیموں میں ٹھہرنے کی نیت کا اعتبار نہیں کرتے۔
حنفیہ کی دلیل یہ ہے کہ حج وداع میں ۴ ذی الحجہ کی صبح کو اتوار کے دن رسول اللہ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے۔ روز ترویہ یعنی ۸ ذی الحجہ کو جمعرات کے دن منیٰ کو گئے۔ بروز عرفہ یعنی ۹ ذی الحجہ کو طلوع آفتاب کے بعد منیٰ سے عرفہ کو تشریف لے گئے پھر حج سے فارغ ہو کر چہار شنبہ کی رات محصب میں گزاری اور صبح سے پہلے پہلے تڑکے میں طواف وداع کر لیا اور ۱۴ کی صبح کو (مکہ سے) نکل گئے اس طرح دس راتیں پوری ہو گئیں۔ یوم الترویہ تک چار شبانہ روز مکہ میں قیام فرمایا۔ اس تفصیل سے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا قول باطل ہو گیا (کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے چار شبانہ روز مکہ میں قیام رکھنے کے باوجود اور کل دس روز کی مجموعی مدت گزارنے کے باوجود قصر کیا۔ لیکن امام احمدؒ کا قول اس سے باطل نہیں ہوتا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں کل ۲۰ نمازیں ادا کیں اس سے زیادہ نہیں پڑھیں۔
امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے آثار کو بھی دلیل میں پیش کیا ہے طحاویؒ نے حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول لکھا ہے کہ جب تم حالت سفر میں کسی شہر میں جاؤ اور وہاں پندرہ روز ٹھہرنے کا ارادہ ہو تو نماز پوری پڑھو اور اگر تم کو علم نہ ہو کہ وہاں سے کب کوچ کر جانا پڑے گا تو (پھر کتنی ہی مدت گزر جائے) قصر کرو۔
ابن ابی شیبہ نے مجاہد کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ اگر پندرہ روز کے قیام کا پختہ ارادہ کر لیتے تھے تو پوری نماز پڑھتے تھے۔ امام محمدؒ نے کتاب الآثار میں لکھا ہے کہ ابو حنیفہؒ نے کہا۔ ہم سے موسیٰ بن مسلم نے مجاہد کی روایت بیان کی کہ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا اگر تم مسافر ہو اور (کہیں) پندرہ روز قیام کرنے پر تمہارا دل جم جائے تو نماز پوری پڑھو اور اگر تم کو معلوم نہ ہو کہ کب کوچ کرنا پڑے گا تو قصر کرو۔
مسئلہ :- اگر کسی شہر میں داخل ہوا اور اقامت کی نیت نہیں کی اور آج کل پرسوں وہاں سے جانے کا ارادہ کرتا رہا یا یہ ارادہ کیا کہ جب کام پورا ہو جائے گا تو چلا جاؤں گا اس طرح برسوں تک وہاں رہتا رہا تو جمہور کے نزدیک ہمیشہ قصر کرے گا۔ ایک قول امام شافعیؒ کا بھی یہی ہے دوسرا قول امام شافعیؒ کا یہ ہے کہ ۱۴ روز قصر کرے اور پندرہویں روز پوری نماز پڑھے) امام شافعی کا قوی قول یہ ہے کہ ۱۷ روز قصر کرے اور اٹھارویں روز پوری نماز پڑھے کیونکہ حضرت ابن عباسؓ کے بیان میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک سفر میں تشریف لے گئے اور آپ نے سترہ روز دو دو رکعتیں پڑھیں اس لئے ہم بھی سترہ روز تک دو دو رکعت پڑھتے

ہیں اور اس سے زیادہ قیام کرتے ہیں تو پوری نماز پڑھتے ہیں۔ رواہ الترمذی ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے لیکن اس حدیث میں سترہ روز قصر کرنے اور اٹھارہویں روز پوری نماز پڑھنے کا کوئی ثبوت نہیں۔ اتفاق سے سترہ روز قیام فرمایا تھا بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر زیادہ قیام فرماتے تب بھی قصر کرتے۔

امام احمدؒ اور ابوداؤد نے حضرت جابر کی روایت سے لکھا ہے کہ تبوک میں رسول اللہ ﷺ نے بیس روز قیام فرمایا اور قصر کرتے رہے۔ عبدالرزاق نے اپنی سند سے لکھا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے آذربائیجان میں چھ ماہ قیام کیا اور نماز میں قصر کرتے رہے۔ یہ واقعہ بیہقی نے بھی صحیح سند سے بیان کیا ہے۔

بیہقی نے اپنی سند سے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا ہم آذربائیجان میں مجاہدین کے ساتھ چھ مہینے رہے، برف نے ہمارا راستہ بند کر رکھا تھا (اس مدت میں) ہم دو رکعتیں پڑھتے رہے۔ اسی روایت میں اتنا اور بھی آیا ہے کہ اس زمانہ میں آپ کے ساتھ دوسرے صحابی بھی تھے اور سب یہی کرتے تھے۔

عبدالرزاق نے حسن کا قول بیان کیا ہے کہ ہم حضرت عبدالرحمٰنؓ بن سمرہ کے ساتھ چند سال ملک فارس میں رہے آپ دو نمازوں کو جمع نہیں کرتے تھے اور نہ دو رکعت سے زائد پڑھتے تھے۔ عبدالرزاق نے حضرت انسؓ بن مالک کا بیان نقل کیا ہے کہ ہم عبدالملک بن مروان کے ساتھ شام میں دو ماہ رہے اور دو دو رکعت پڑھتے رہے۔

مسئلہ :- جو ملاح بیوی بچوں اور مال و متاع کے ساتھ جہاز میں سفر کرتا رہتا ہو یا جو مزدور ہمیشہ سفر میں رہتا ہو وہ تین اماموں کے نزدیک قصر کرتا رہے گا کیونکہ نص مطلق ہے صرف امام احمدؒ کے نزدیک قصر نہیں کرے گا۔

مسئلہ :- خانہ بدوش صحرائیوں کی نیت اقامت بعض کے نزدیک صحیح نہیں لیکن صحیح قول یہ ہے کہ ان کو مقیم کہا جائے گا کیونکہ اقامت اصل ہے ایک چراگاہ سے دوسری چراگاہ کی طرف منتقل ہونے سے باطل نہیں ہو سکتی۔

مسئلہ :- اگر مسافر کسی مقیم امام کی نماز کے کسی حصہ میں اقتدا کرے تو جمہور کے نزدیک اس کو چار رکعتیں پوری کرنی چاہئے۔ امام مالکؒ نے فرمایا اگر اس کو ایک رکعت مل گئی ہو تو چار پوری کرے گا ورنہ نہیں۔ اسحاق بن راہویہ نے کہا مقیم کے پیچھے مسافر قصر کرے گا۔ امام احمد نے موسیٰ بن سلمہ کا بیان نقل کیا ہے کہ ہم حضرت ابن عباسؓ کے ساتھ مکہ میں تھے۔ میں نے کہا جب ہم آپ لوگوں کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں تو چار پڑھتے ہیں اور جب لوٹ کر جاتے ہیں تو دو رکعت پڑھتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کا یہی طریقہ ہے۔

مسئلہ :- اقامت کی حالت میں جو نماز فوت ہو جائے اور سفر میں اس کو ادا کرے تو پوری ادا کرے گا۔ ابن المنذر نے کہا ہم نہیں جانتے کہ کسی نے اس میں اختلاف کیا ہو ہاں حسن اور مزنی کا قول ایک روایت میں ہے کہ (صلوٰۃ حضر کی نماز) سفر میں قصر کے ساتھ ادا کرے گا اور اگر سفر میں کوئی نماز قضا ہو گئی ہو تو امام ابو حنیفہؒ اور امام مالک کے نزدیک حضر میں قصر کے ساتھ ادا کرے گا۔ امام شافعی کا بھی ایک قول یہی ہے امام احمد کے نزدیک پوری ادا کرے گا امام شافعیؒ کا بھی صحیح قول یہی ہے۔

مسئلہ :- اگر مسافر امام ہو اور مقیم مقتدی تو امام دو رکعتیں پڑھے گا اور مقیم اپنی نماز پوری کریں گے اجماعی فیصلہ یہی ہے۔ حضرت عمران بن حصین کی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب جہاد کیا اور فتح مکہ کے وقت بھی آپ کے ساتھ موجود تھا۔ آپؐ نے مکہ میں آٹھ رات قیام کیا (اس مدت میں) ہم بس دو رکعتیں پڑھتے رہے حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے اے اہل مکہ تم چار رکعت پڑھو ہم تو مسافر لوگ ہیں۔ رواہ الترمذی وصححہ۔

اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ اگر تم کو اندیشہ ہو کہ کافر تم کو دکھ پہنچائیں گے یعنی قتل کرنے یا زخمی کرنے یا قید کرنے یا مال لوٹنے کا۔ اس شرط کو جزاء کی ضرورت نہیں کیونکہ سابق کلام اس پر دلالت کر رہا ہے یعنی اگر دشمن کی ایذا رسانی کا تم کو اندیشہ ہو تو نماز میں قصر کر لیا کرو۔ بظاہر آیت میں خوف عدو کو قصر کی شرط قرار دیا ہے۔ خارجی اسی کے قائل ہیں لیکن اجماع علماء ہے کہ خوف شرط نہیں، بلکہ عادۃً چونکہ ایسا ہوتا تھا رسول اللہ ﷺ کے اکثر سفروں میں دشمن کا

خوف لگا رہتا تھا اس لئے ایک واقعہ کا اظہار کر دیا ورنہ اس شرط پر کوئی حکم متفرع نہیں ہے (کہ اگر شرط نہ ہو تو وہ حکم بھی نہ ہو) جیسے دوسری آیت ہے وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا۔ تم اپنی باندیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو اگر وہ پاکدامنی کی خواہاں ہوں (ظاہر ہے کہ پاک دامنی کی خواہش کا ذکر اکثریت کے لحاظ سے ہے، باندیاں اور وہ بھی مسلمان باندیاں زنا کی خواہش مند نہیں تھیں پاک دامنی کی خواہش کی شرط ایسی نہیں کہ اس پر حکم موقوف ہو اور اگر باندیاں پاک دامنی کی خواہش مند نہ ہوں تو ان کو زنا پر مجبور کرنا جائز ہو)۔

امن کی حالت میں قصر صلوٰۃ کے متعلق بکثرت احادیث باہم موید ہیں جیسے یعلی بن امیہ نے حضرت عمرؓ کی حدیث بیان کی تھی (جس کا ذکر ادھر آچکا ہے) امام شافعیؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ و مدینہ کے درمیان امن کی حالت میں سفر کیا کہ آپ کو سوائے خدا کے کسی کا خوف نہ تھا اور آپ دو رکعت پڑھتے رہے۔

حضرت حارثہؓ بن وہب خزاعی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے منیٰ میں ہم کو دو رکعتیں پڑھائیں اس وقت کثرت اور امن کے لحاظ سے ہم ہر گزشتہ زمانہ سے بڑھ چڑھ کر تھے۔ متفق علیہ۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ ان خفتم کا تعلق سابق کلام سے نہیں ہے بلکہ آگے جو صلوٰۃ خوف کا بیان ہے اس سے اس کا تعلق ہے یہ تعلق اگرچہ الفاظ کے لحاظ سے بعید ہے مگر معنوی ربط کے لحاظ سے قریب ہے کیونکہ صلوٰۃ خوف میں دشمن کا خوف ہونا بالاجماع شرط ہے اور اس کے آگے کہیں اس شرط کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی تائید بغوی کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت ابو ایوبؓ انصاری نے فرمایا آیت فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ فقط یہیں تک نازل ہوئی تھی پھر ایک سال کے بعد لوگوں نے صلوٰۃ خوف کے متعلق دریافت کیا تو نازل ہوا إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ الْكَافِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُبِينًا وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ بغوی نے کہا ایسی عبارتیں قرآن میں بکثرت آئی ہیں پہلے پوری خبر ذکر کر دی جاتی ہے پھر ترتیب کلام میں ایک اور خبر لائی جاتی ہے جو بظاہر ماقبل سے مربوط ہوتی ہے مگر حقیقت میں جدا ہوتی ہے جیسے (سورۂ یوسف میں آیا ہے) الْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ أَنَا رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ۔ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ الصّٰدِقِيْنَ تک عزیز کی بیوی کے قول کی نقل ہے اور ذلک سے حضرت یوسفؑ کے قول کی حکایت ہے۔

ابن جریر نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا بنی نجار کے کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ہم ملک میں سفر کرتے رہتے ہیں۔ نماز کس طرح پڑھیں اس پر اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ۔

پھر وحی بند رہی ایک سال کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ایک جہاد کیا اور وہاں ظہر کی نماز پڑھی مشرکوں نے کہا محمدؐ اور اس کے ساتھیوں نے اپنی پشت کی جانب سے (حملہ کرنے کا) موقع تو دے دیا تھا تم نے حملہ کیوں نہیں کیا ایک آدمی بولا ان کی ایک نماز اور بھی ایسی ہی اس کے پیچھے آئے گی (اس وقت حملہ کر دینا) اس پر اللہ نے دونوں نمازوں (یعنی ظہر و عصر) کے درمیان نازل فرمایا إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا...... عَذَابًا مُهِينًا۔ تک

میں کہتا ہوں اس شان نزول پر ان خفتم کی جزا محذوف ہو گی جس پر بعد والا کلام دلالت کر رہا ہے یعنی کافروں کی ایذا رسانی کا اگر تم کو اندیشہ ہو تو نماز کی حالت میں بھی احتیاط اور جہاد کو نہ چھوڑو۔

إِنَّ الْكَافِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُبِينًا ﴿۱۰۱﴾ یقیناً کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں۔ امام احمد نے اور دلائل میں بیہقی نے اور حاکم نے (مستدرک میں) حضرت ابو عیاش زرقی کا بیان نقل کیا ہے کہ ہم عسفان میں رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب تھے سامنے سے مشرک آگئے جن کے سردار خالد بن ولید تھے یہ لوگ ہمارے اور قبلہ کے درمیان حائل تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو ظہر کی نماز پڑھائی تو مشرک کہنے لگے، تھے تو یہ بڑے موقع پر اگر ہم غفلت میں ان پر حملہ کر دیتے پھر خود ہی

بولے (اب تو موقع نکل گیا خیر) ابھی ان کی ایک اور نماز آ رہی ہے جو ان کو اپنی جان اور اولاد سے بھی زیادہ پیاری ہے (اس وقت حملہ کریں گے) اس پر جبرئیلؑ ظہر و عصر کے درمیان یہ آیت لے کر آئے وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ غرض نماز کا وقت آیا تو رسول اللہؐ نے حکم دیا (اپنے ہتھیار ساتھ رکھو) حسب الحکم لوگوں نے اسلحہ لے لئے ہم نے آپ کے پیچھے دو صفیں بنائیں آپؐ نے رکوع کیا تو ہم سب نے رکوع کیا، پھر آپ نے سر اٹھایا تو ہم سب نے سر اٹھائے پھر آپؐ نے اس صف کے ساتھ سجدہ کیا جو آپ سے متصل تھی (یعنی پہلی صف) اور دوسرے لوگ کھڑے حفاظت کرتے رہے جب پہلی صف والے سجدہ کر چکے اور کھڑے ہو گئے تو پچھلی صف والے بیٹھ گئے اور انہوں نے اول صف والوں کی جگہ سجدہ کیا۔ پھر ایک جماعت دوسری جماعت کی جگہ اور دوسری جماعت اول جماعت کی جگہ آ گئی اور (قرآت کے بعد) سب نے ساتھ مل کر رکوع کیا پھر سب نے رکوع سے سر اٹھایا پھر رسول اللہ صلعم نے سجدہ کیا اور سلام پھیر دیا۔

صلوٰۃ خوف رسول اللہ ﷺ نے دو بار پڑھی تھی ایک بار عسفان میں اور ایک بار قبیلہ بنی سلیم کی سرزمین میں مسلم نے حضرت جابرؓ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کا صلوٰۃ خوف پڑھنا اسی طرح نقل کیا ہے۔

وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ اور جب آپ ان میں موجود ہوں۔ اور دشمن کا خوف ہو دشمن کا خوف ہونے کی قید باجماع علماء اس جگہ ضروری ہے۔ اور ان خفتم کو اگر مابعد کلام سے مربوط مانا جائے تب تو قرینہ بھی موجود ہو گا۔ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ اِنْ خِفْتُمْ پر اس کا عطف ہو اور دونوں شرطوں کا مجموعہ صلوٰۃ خوف کے لئے ضروری ہو یعنی اگر دشمن کا خوف ہو اور مجاہدین کے ساتھ رسول اللہ ﷺ بھی موجود ہوں تو صلوٰۃ خوف پڑھی جائے (اگر دشمن کا خوف نہ ہو یا رسول اللہ ﷺ وہاں موجود نہ ہوں تو صلوٰۃ خوف کا جواز نہیں) اسی ظاہر کلام کے پیش نظر امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ صلوٰۃ خوف رسول اللہ صلعم کے لئے خاص تھی (دوسروں کے لئے جائز نہیں) مگر جمہور علماء کا قول ہے کہ رسول اللہ صلعم کے بعد بھی صلوٰۃ خوف کا ضابطہ جاری ہے۔ تمام خلفاء اسلام رسول اللہ صلعم کے نائب ہیں، ہر زمانہ میں کسی خلیفہ کی موجودگی رسول اللہؐ کی موجودگی کی قائم مقام ہے۔ قرآن کا طرز خطاب عموماً یہی ہے کہ، مراد تمام امت کو خطاب کرنا ہوتا ہے مگر روئے خطاب رسول اللہ ﷺ کی طرف کیا جاتا ہے جیسے لَاَنْتُمْ فِیْ مِرْیَۃٍ مِّنْہُ (ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ کو تو کوئی شک ہو نہیں سکتا تھا لامحالہ مراد امت کو ہی خطاب کرنا ہے)۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد تمام صحابہؓ نے صلوٰۃ خوف پڑھی اور کسی نے کسی کے خلاف اعتراض نہیں کیا لہٰذا نماز خوف کے جواز پر اجماع ہو گیا۔ ابو داؤد کی روایت ہے کہ مجاہدین نے حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ کی ہمراہی میں کابل کا جہاد کیا آپ نے سب کو صلوٰۃ خوف پڑھائی۔ ابو داؤد کی روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ صفین کی جنگ کے دن حضرت علیؓ نے صلوٰۃ خوف پڑھی۔ رافعی نے ذکر کیا ہے کہ لیلۃ الہریر (جنگ جمل کی رات کو) مغرب کی نماز حضرت علیؓ نے صلوٰۃ خوف پڑھائی پہلے گروہ کے ساتھ ایک رکعت اور دوسرے گروہ کے ساتھ دو رکعتیں پڑھیں۔ بیہقی نے امام جعفرؒ کی روایت سے بحوالہ امام زین العابدینؒ بوساطت امام حسینؓ بیان کیا۔

کہ حضرت علیؓ نے لیلۃ الہریر میں مغرب کی صلوٰۃ خوف پڑھی۔ امام شافعیؒ کی روایت میں بھی آیا ہے کہ حضرت علیؓ نے لیلۃ الہریر میں مغرب کی صلوٰۃ خوف پڑھی، اسی طرح جس طرح رسول اللہ صلعم نے (بروایت صالح بن خوات) پڑھی تھی بیہقی نے ابو العالیہ سے روایت کی ہے کہ حضرت ابو موسیٰؓ اشعری نے اصفہان میں صلوٰۃ خوف پڑھی۔

بیہقی نے یہ بھی بیان کیا کہ مجوسیوں کی جنگ کے وقت طبرستان میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے صلوٰۃ خوف پڑھی اس وقت آپ کے ساتھ حضرت حسنؓ بن علیؓ و حضرت حذیفہؓ بن یمان اور عبداللہ بن عمرو بن العاص بھی تھے۔ ابو داؤد اور نسائی نے ثعلبہ بن زہرم کے طریق سے بیان کیا کہ ہم حضرت سعید بن العاص کے ساتھ تھے آپ نے پوچھا تم میں سے کس نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صلوٰۃ خوف پڑھی ہے۔ حضرت حذیفہؓ نے فرمایا میں نے چنانچہ آپ نے ایک گروہ کے ساتھ ایک رکعت اور دوسرے گروہ کے ساتھ دوسری رکعت پڑھی۔

فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ اور ان کو آپ نماز پڑھائیں۔

فَلْتَقُمْ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ تو ان میں کا ایک گروہ آپ کے ساتھ (نماز میں) کھڑا ہو یعنی کل نمازیوں کے دو گروہ بنالیں ایک گروہ آپ کے ساتھ کھڑا ہو جائے اس کو آپ نماز پڑھانا شروع کر دیں۔

وَلْيَاْخُذُوْۤا اَسْلِحَتَهُمْ اور یہ گروہ اپنے اسلحہ (اپنے ساتھ) لئے رہے امام مالک نے کہا صلوٰۃ خوف میں اسلحہ (نماز کے اندر) اپنے ساتھ رکھنا واجب ہے امام شافعیؒ کا بھی ایک قول یہی ہے لیکن اکثر علماء کے نزدیک امر استحباب کے لئے ہے (نماز کے اندر اپنے اسلحہ ساتھ رکھنا مستحب ہے)۔

فَاِذَا سَجَدُوْا پھر جب یہ گروہ سجدہ کر چکے یعنی ایک رکعت امام کے ساتھ پوری کر لے سجدہ سے نماز بھی مراد ہو سکتی ہے جزبول کر کل مراد لیا جاسکتا ہے یعنی جب یہ گروہ پوری نماز پڑھ لے۔

فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآىِٕكُمْ تو تمہارے پیچھے چلا جائے یعنی تم سب کے پیچھے دشمن کے سامنے چلا جائے۔

وَلْتَاْتِ طَآىِٕفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا اور (ان کی جگہ) دوسرا گروہ آجائے جس نے نماز نہیں پڑھی ہو۔

فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ اور آپ کے ساتھ نماز پڑھے یعنی پوری نماز یا دوسری رکعت۔

وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ اور یہ بھی اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے اسلحہ لئے رہے۔ بچاؤ کے سامان سے مراد ہے دشمن کے حملہ سے بچنے کا سامان جیسے زرہ ڈھال اور اسلحہ سے مراد ہیں لڑائی کے ہتھیار جن سے لڑا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی صلوٰۃ خوف کا طریقہ چند طور پر روایات میں آیا ہے۔

(۱) ابو عیاشؓ زرقی اور جابرؓ بن عبداللہ کی روایت سے پہلے گزر چکا ہے۔ یہ صورت عسفان میں ہوئی تھی اور دشمن مسلمانوں کے اور قبلہ کے درمیان حائل تھا۔

(۲) شیخین نے صحیحین میں حضرت جابرؓ کی روایت سے لکھا ہے حضرت جابرؓ نے فرمایا ہم رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب چلے جب ذات الرقاع میں پہنچے۔ اس روایت میں آیا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ایک گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں پھر یہ گروہ پیچھے ہٹ آیا اور حضور صلعم نے دوسرے گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں اس طرح رسول اللہ ﷺ کی چار اور دوسرے لوگوں کی دو دو رکعتیں ہوئیں۔ اس حدیث کا مطلب دو طرح ہو سکتا ہے ایک یہ کہ حضورؐ نے چار رکعتیں ایک ہی سلام سے ادا کیں اور دونوں گروہوں میں سے ہر گروہ نے دو دو رکعتیں پڑھیں۔ دوسرا مطلب یہ کہ حضورؐ نے دو رکعت پڑھ کر ایک گروہ کے ساتھ سلام پھیر دیا۔ پھر دوسرے گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں اور ان کے ساتھ سلام پھیرا یہ آخری صورت حضرت جابرؓ کی روایت میں صراحت کے ساتھ بھی آئی ہے کہ بطن نخل میں رسول اللہ ﷺ لوگوں کو ظہر کی صلوٰۃ خوف پڑھا رہے تھے پہلے گروہ کو دو رکعت پڑھا کر سلام پھیر دیا۔ پھر دوسرا گروہ آیا اور آپؐ نے اس کو دو رکعتیں پڑھائیں یہ روایت بغوی نے بطریق شافعی بیان کی ہے۔ اس روایت میں شافعی کے راوی کا نام معلوم نہیں لیکن شافعی نے ان کو معتمد کہا تھا۔ چنانچہ فرمایا تھا مجھے ایک ثقہ نے ابو علیہ تھے یا کوئی اور بتایا۔

ابن جوزی نے دار قطنی کے طریق سے بوساطت عنبسہ بحوالہ حسن حضرت جابرؓ کی یہ روایت بیان کی ہے اور اس کو غیر صحیح کہا ہے یحییٰ بن معین نے عنبسہ کے متعلق فرمایا یہ کچھ نہیں ہے۔ نسائی نے اس کو متروک اور ابو حاتم نے حدیثیں بنانے والا کہا ہے۔

یہ حدیث ابو داؤد ابن حبان حاکم اور دار قطنی نے ابو بکرہ کی روایت سے بیان کی ہے ابو داؤد اور ابن حبان کی روایت میں اس کو ظہر کی نماز کہا گیا ہے اور دار قطنی کی روایت میں مغرب کی۔ ابن قطان نے کہا یہ روایت معلل ہے کیونکہ حضرت ابو بکرؓ صلوٰۃ خوف کے وقوع کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔ حافظ نے کہا اس سے روایت معلل نہیں ہوتی۔ مرسل صحابی ہو جائے گی (جو مقبول ہے)۔

(۳) شیخین نے صالح بن خوات کی روایت سے ایسے شخص کا بیان نقل کیا ہے جس نے ذات الرقاع کے دن رسول اللہؐ کے ساتھ نماز پڑھی تھی۔ بخاری نے دوسری سند سے صالح بن خوات کے راوی کا نام سہیل بن ابی حثمہ لکھا ہے۔ سہیل کا بیان ہے کہ ایک گروہ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صف باندھی اور دوسرا گروہ دشمن کے سامنے رہا۔ حضورؐ نے اس گروہ کے ساتھ ایک رکعت پڑھی پھر جمے کھڑے رہے اور ان لوگوں نے اپنی نماز (یعنی باقی رکعت) پوری کی پھر فارغ ہو کر دشمن کے سامنے پہنچ کر صف بستہ ہو گئے اور دوسرا گروہ آگیا اس کو حضورؐ نے اپنی نماز کی باقی رکعت پڑھائی پھر (بغیر سلام پھیرے) اپنی جگہ جمے بیٹھے رہے اور ان لوگوں نے اپنی باقی نماز پوری کی پھر حضور ﷺ کے ساتھ سب نے سلام پھیرا۔

(۴) ترمذی اور نسائی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ضجنان اور عسفان کے درمیان پڑاؤ کیا۔ مشرکوں نے کہا ان (مسلمانوں) کی ایک نماز ہے جو ان کو ماں باپ اور اولاد سے بھی زیادہ پیاری ہے۔ یہ عصر کی نماز ہے اس لئے اپنی پوری قوت جمع کر کے (نماز کے اندر) ان پر یکدم حملہ کر دینا ادھر حضرت جبرئیل رسول اللہ ﷺ کے پاس (مشرکوں کے ارادہ کی اطلاع لے کر) آگئے اور حضورؐ کو مشورہ دیا کہ ساتھیوں کے دو حصے کر کے ایک حصہ کو نماز پڑھائیں اور دوسرا حصہ نماز پڑھنے والوں کے پیچھے کھڑا رہے اور بچاؤ کا سامان اور اسلحہ لئے رہے اس طرح ہر گروہ کی (رسول اللہ ﷺ کے ساتھ) ایک رکعت ہو گی اور آپ کی دو رکعتیں ہو جائیں گی۔ اسی طرح بغوی نے بھی لکھا ہے کہ حضرت حذیفہؓ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کی صلوٰۃ خوف کی یہی صورت منقول ہے کہ حضور صلعم نے ایک گروہ کو ایک رکعت پڑھائی اور دوسرے گروہ کو دوسری اور انہوں نے بقیہ نماز نہیں پڑھی۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت میں آیا ہے کہ قوم کی ایک ایک رکعت ہوئی اور رسول اللہ کی دو۔ علماء نے اس کو شدت خوف کے وقت کی نماز کہا ہے اور صراحت کی ہے کہ ایسی حالت میں ایک ہی رکعت فرض ہے۔

(۵) بخاری نے صحیح میں سالم بن عمرؓ کی وساطت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان نقل کیا ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نجد کی جانب جہاد کو گیا اور دشمن کے مقابلہ پر ہم نے صف بندی کی (نماز کا وقت آگیا تو) رسول اللہ ﷺ ہم کو نماز پڑھانے کھڑے ہو گئے۔ چنانچہ ایک گروہ آپ کے ساتھ نماز کو کھڑا ہو گیا اور دوسرا گروہ دشمن کے سامنے رہا رسول اللہ ﷺ نے اس گروہ کے ساتھ رکوع اور دو سجدے کئے پھر یہ گروہ لوٹ کر اس گروہ کی جگہ پہنچ گیا جس نے نماز نہیں پڑھی تھی اور وہ گروہ آگیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو بھی لے کر ایک رکعت پڑھی اور دو سجدے کئے پھر سلام پھیر دیا اور مقتدیوں میں سے ہر شخص کھڑا ہو گیا اور ایک رکعت پڑھی اور دو سجدے کئے۔ نافع کی روایت بھی اسی طرح آئی ہے۔ اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ اگر اس سے زیادہ خوف ہو تو نماز ادا کرو پیدل ہو سوار ہو قبلہ رخ ہو یا قبلہ رخ نہ ہو۔ نافع نے کہا میرے خیال میں حضرت ابن عمرؓ نے (از خود) بغیر رسول اللہ کے فرمائے ہوئے ایسا نہیں کہا۔

امام ابو حنیفہؒ نے صلوٰۃ خوف کی صورتوں میں سے اسی آخری صورت کو اختیار کیا ہے باقی صورتوں کو جائز نہیں قرار دیا اور فرمایا دوسرا گروہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد دشمن کے سامنے چلا جائے اور پہلا گروہ آکر اول اپنی نماز پوری کر لے پھر دوسرا گروہ آکر اپنی نماز پوری کرے اور سلام پھیر دے کیونکہ امام محمدؒ نے کتاب الآثار میں امام ابو حنیفہؒ کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول نقل کیا ہے اور ایسے معاملہ میں حدیث موقوف مرفوع کی طرح ہوتی ہے اس لئے امام صاحبؒ نے اس کے سوا کسی صورت کو جائز نہیں قرار دیا۔

دوسری صورت میں تو فرض پڑھنے والے کی اقتداء نفل پڑھنے والے کے پیچھے لازم آئے گی (جو درست نہیں کیونکہ قوی کی بناء ضعیف پر ناجائز ہے) اور تیسری صورت میں امام سے پہلے مقتدی کا رکوع اور سجدہ کرنا لازم آتا ہے جس کی کوئی نظیر شریعت میں نہیں، اس کے علاوہ مقتدی کا انتظار امام کو کرنا تقاضائے امامت کے خلاف ہے۔

چوتھی صورت اجماعاً متروک العمل ہے علاوہ امام کے اور لوگ صرف ایک رکعت پڑھیں ایسا کسی کے نزدیک درست

نہیں خوف سے رکعتوں کی تعداد کم نہیں ہو سکتی۔ رہی پہلی صورت جہاں دشمن قبلہ کے اور نمازیوں کے درمیان حائل تھا تو یہ ارشاد قرآنی کے خلاف ہے اللہ نے فرمایا ہے فَلْتَقُمْ طَائِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ اور اس صورت میں دونوں گروہ نماز میں کھڑے ہوں گے اور آگے ارشاد ہے وَلْتَأْتِ طَائِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا اور اس صورت میں کوئی گروہ ایسا رہے گا نہیں جس نے نماز نہ پڑھی ہو۔ امام شافعیؒ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک صلوٰۃ خوف کی جتنی صورتیں روایات میں آئی ہیں سب صحیح ہیں۔ اختلاف صرف ترجیح میں ہے کہ راجح کون سی صورت ہے امام احمدؒ نے فرمایا سوائے ایک حدیث کے اس باب میں میرے علم میں اور کوئی صحیح حدیث نہیں آئی۔ وجوہ مذکورہ میں سے امام شافعیؒ کے نزدیک راجح چار صورتیں ہیں اور امام احمدؒ کے نزدیک تین اگر نمازیوں کے اور قبلہ کے درمیان دشمن حائل ہو تو امام شافعیؒ اور امام احمدؒ دونوں کے نزدیک راجح وہی صورت ہے جو وجہ اول میں بیان کردی گئی۔ اگر جہت قبلہ کے علاوہ کسی دوسرے رخ پر نماز ہو تو امام شافعیؒ کے نزدیک راجح یا دوسری صورت ہے جیسے حضور ﷺ نے بطن نخلہ میں نماز پڑھی تھی یا تیسری صورت ہے جیسے ذات الرقاع میں رسول اللہ ﷺ نے پڑھی دوسری صورت میں فرض پڑھنے والے کی اقتداء نفل پڑھنے والے کے پیچھے ضرور ہو جائے گی۔ مگر امام شافعی کے نزدیک یہ جائز ہے۔

امام احمدؒ کے نزدیک شق مذکور میں تیسری صورت ہی متعین ہے۔ علماء نے کہا ہے کہ ظاہر قرآن کے یہی صورت زیادہ موافق ہے اور احتیاط صلوٰۃ بھی اس میں زیادہ ہے اور دشمن سے حفاظت بھی اس میں کامل ہے۔ کیونکہ قرآن میں آیا ہے فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِن وَرَائِكُمْ یعنی جب نماز پڑھ چکیں تو پیچھے چلے جائیں پھر فرمایا وَلْتَأْتِ طَائِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا اور دوسرا گروہ آجائے جس نے نماز نہ پڑھی ہو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا گروہ نماز پڑھ چکا پھر فرمایا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ پھر وہ نماز پڑھیں یعنی پوری نماز پڑھیں۔ ظاہر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام کو چھوڑنے والا گروہ اس وقت جگہ سے ہٹے جب نماز پوری کرلے۔ نماز کے مناسب بھی یہی ہے کیونکہ نماز کا اقتضاء ہے کہ اس میں عمل کثیر اور چلنا نہ ہو۔ احتیاط کا تقاضا بھی یہی ہے کیونکہ مجاہدین جب نماز میں نہ ہوں گے تو جنگ اور فرار پر پورے طور پر قادر ہوں گے بشرطیکہ اس کی ضرورت پڑے اور اگر گھمسان کا رن پڑے اور خوف زیادہ ہو تو پیدل سوار کسی حال میں ہی جدھر کو منہ اٹھے نماز پڑھے قبلہ رخ نہ ہونا اور نماز کے اندر حرکت کثیرہ کرنا اس حالت میں معاف ہے اگر رکوع اور سجدہ بھی نہ کر سکے تو اشارہ ہی سے کام لے رکوع کیلئے معمولی اشارہ اور سجدہ کے لئے گردن کا ذرا زیادہ جھکاؤ کافی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک شدت خوف کے وقت نماز کے جواز کی دو ہی صورتیں ہیں یا قدموں پر کھڑا ہو کر یا سواری کی حالت میں موخر الذکر صورت میں اشارہ کرے گا۔ پیدل قتال کی حالت میں نماز نہیں ہوگی۔ عمل کثیر سے نماز فاسد ہو جائے گی۔ اس مسئلہ کی تحقیق سورۂ بقرہ کی آیت فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا کی تفسیر کے ذیل میں ہو چکی ہے۔

فائدہ :- حافظ نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی صلوٰۃ خوف کی ۱۴ صورتیں روایات میں آئی ہیں جن کو ابن حزم نے جزء مفرد میں بیان کیا ہے ان میں سے صحیح مسلم میں بعض کا تذکرہ آیا ہے اور بیشتر کا ذکر سنن ابو داؤد میں کیا گیا ہے حاکم نے آٹھ اور ابن حبان نے نو صورتیں لکھی ہیں۔

مسئلہ :- امام مالک کے علاوہ جمہور کے نزدیک حضر میں بھی صلوٰۃ خوف جائز ہے۔ ہر گروہ کو دو رکعت پڑھائے البتہ مغرب میں پہلی جماعت کو دو اور دوسری جماعت کو ایک رکعت پڑھائے۔

وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَاحِدَةً

کافر تمنا کرتے ہیں کہ کاش تم اپنے اسلحہ اور سامان کی طرف سے غافل ہو تو وہ سب تم پر یکدم ٹوٹ پڑیں۔ یہ ترجمہ لو تمنائی کا ہے لیکن لو مصدری بھی ہو سکتا ہے یعنی اگر تم غافل ہو تو وہ یکدم حملہ کردیں۔ نماز میں مسلح رہنے کے حکم کی یہ وجہ بیان کی گئی ہے۔ کلبی نے ابو صالح کے توسط سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلعم بنی محارب اور بنی انمار سے جہاد کرنے تشریف لے گئے۔ ایک جگہ پڑاؤ کیا وہاں دشمن کا کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ لوگوں نے ہتھیار کھول دیئے اور رسول اللہ صلعم بھی ہتھیار کھول کر قضائے حاجت کے لئے وادی کو قطع کر کے (پار) چلے گئے۔ بارش ہو رہی تھی۔ رسول اللہ ﷺ اور

صحابہؓ کے درمیان وادی حائل ہو گئی تھی۔ ایک درخت کے نیچے قضائے حاجت کے لئے بیٹھ گئے۔ غویرث بن حارث محاربی نے دور سے آپ کو دیکھ لیا کہنے لگا اللہ مجھے قتل کر دے اگر میں اس کو قتل نہ کر دوں پھر تلوار سونت کر پہاڑ سے نیچے آیا اور بولا محمد ﷺ اب تم کو میرے ہاتھ سے کون بچائے گا۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا اللہ پھر دعا کی اَللّٰھُمَّ! تو جس طرح چاہے مجھے غویرث بن حارث سے بچا۔ غویرث نے مارنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی طرف تلوار بڑھائی تھی کہ یکدم اس کے دونوں شانوں کے درمیان درد اٹھا اور درد کی وجہ سے منہ کے بل گر پڑا اور تلوار ہاتھ سے چھوٹ کر الگ جا پڑی۔ حضور نے فوراً اٹھ کر تلوار لے لی اور فرمایا غویرث اب تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا بولا کوئی نہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کیا تو شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کا بندہ اور رسول ہے میں تیری تلوار تجھے دیدوں گا۔ بولا نہیں ہاں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ تم سے کبھی جنگ نہیں کروں گا اور تمہارے خلاف کسی دشمن کی مدد نہیں کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے تلوار دیدی۔ غویرث بولا خدا کی قسم تم مجھ سے بہتر ہو۔

حضور ﷺ نے فرمایا بے شک میں اس کا مستحق بھی تجھ سے زیادہ ہوں۔ غویرث چلا گیا۔ ساتھیوں کے پاس پہنچا تو انہوں نے پوچھا ارے تجھے کیا ہو گیا، کس چیز نے تجھے روک دیا بولا میں نے مارنے کے لئے اس کی طرف تلوار بڑھائی ہی تھی کہ میں نہیں جان سکا۔ کس نے میرے دونوں شانوں کے درمیان درد پیدا کر دیا اور میں منہ کے بل گر پڑا۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ كَانَ بِكُمْ أَذًى مِنْ مَطَرٍ أَوْ كُنْتُمْ مَرْضَى أَنْ تَضَعُوا أَسْلِحَتَكُمْ اور بارش کی وجہ سے اگر تم کو تکلیف ہو (مثلاً چمڑے کی زرہ بھیگ کر بوجھل ہو جائے) یا تم بیمار ہو (کہ ہتھیاروں کا بوجھ نہ اٹھا سکتے ہو) تو کوئی گناہ نہیں کہ اپنے ہتھیار اتار دو، بارش یا بیماری کے عذر کی وجہ سے اللہ نے اس آیت میں ہتھیار کھول دینے کی اجازت دیدی، اس سے معلوم ہوا کہ ہتھیار بند رہنے کا حکم سابق وجوبی تھا استحبابی نہ تھا لہٰذا امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے مسلک کی اس سے تائید ہوتی ہے۔

وَخُذُوا حِذْرَكُمْ اور اپنا بچاؤ لے لیا کرو۔ یعنی کیمپ کے اندر یا کسی اور محفوظ مقام پر پناہ گیر رہا کرو تاکہ دشمنؓ ناگہاں تم پر حملہ نہ کر دے جان کی حفاظت واجب ہے بے فائدہ جان کا نقصان جائز نہیں حفاظت نفس مال کار اعلاء کلمۃ اللہ کا موجب ہو گی۔ ایسی حالت میں اپنا بچاؤ ملحوظ رکھنے کا کام گزشتہ شان نزول سے مناسبت رکھتا ہے گویا اللہ نے اپنے پیغمبرؐ کو نصیحت فرمادی کہ اگر دشمن کی طرف سے اندیشہ ہو تو قضاء حاجت کے لئے بھی لشکر گاہ سے دور نہ جائیں۔

إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا ﴿۱۰۲﴾ بے شک اللہ نے کافروں کے لئے اہانت آمیز سزا تیار کر رکھی ہے۔ دنیا میں قتل، قید (وغیرہ) اور آخرت میں دوزخ، پہلے احتیاط اور بچاؤ رکھنے کا حکم دیا تھا اس آیت میں کافروں پر غلبہ پانے اور فتح یاب ہونے کا وعدہ فرمایا تاکہ مسلمانوں کے قلوب میں قوت پیدا ہو اور وہ سمجھ جائیں کہ احتیاط رکھنے کا حکم ہماری کمزوری یا دشمن کے غلبہ کی وجہ سے نہیں دیا گیا ہے بلکہ ضابطہ الٰہی ہی یوں جاری ہے کہ اسباب کو اختیار کیا جائے بیداری اور تدبیر سے کام لیا جائے پھر اللہ پر بھروسہ کیا جائے۔

کلبی نے مذکورہ روایت میں آگے بیان کیا کہ پھر نالہ ٹھیر گیا اور رسول اللہ ﷺ نے واپس آکر صحابہؓ کو اس واقعہ کی اطلاع دی اور یہ آیت پڑھ کر سنائی۔

بخاریؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ آیت اِنْ كَانَ بِكُمْ أَذًى مِنْ مَطَرٍ أَوْ كُنْتُمْ مَرْضَى حضرت عبدالرحمن بن عوف کے حق میں نازل ہوئی آپ زخمی تھے یعنی زخموں کی وجہ سے آپ کو ہتھیار اتارنے کی اجازت دی گئی تھی۔

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلَاةَ فَاذْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَى جُنُوبِكُمْ پھر جب تم اس نماز کو ادا کر چکو تو اللہ کی یاد میں لگ جاؤ کھڑے بھی اور پہلو کے بل لیٹے بھی، یعنی ہر وقت تسبیح، تہلیل اور تکبیر میں مشغول رہ کر اللہ کی یاد کرو۔

حضرت عائشہؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ تمام اوقات میں اللہ کی یاد کرتے تھے۔ رواہ ابوداؤد۔ ظاہر یہ ہے کہ آیت اور حدیث میں دوام ذکر سے ذکر قلبی مراد ہے زبان سے ہر وقت ذکر تو ممکن ہی نہیں ہے۔

بعض علماء نے آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جب تم صلوٰۃ خوف سے فارغ ہو جاؤ تو پھر اللہ کا ذکر کو یعنی نماز پڑھو صحت کی حالت میں کھڑے ہو کر اور بیماری کی حالت میں یا اپاہج ہونے کی وجہ سے یا زخمی ہونے کے سبب یا کمزوری کے باعث حسب تفاوت عذر بیٹھ کر یا لیٹ کر۔ یا یہ مراد ہے کہ جب حالت خوف میں تم نماز کا ارادہ کرو تو اگر قدرت ہو تو کھڑے ہو کر نماز پڑھو نہ ہو سکے تو بیٹھ کر پڑھو۔ یہ بھی ممکن نہ ہو تو لیٹ کر پڑھو۔

فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ ۚ پھر جب تم مطمئن ہو جاؤ تو نماز کو قاعدہ کے مطابق پڑھنے لگو۔ یعنی جب خوف دور ہو جائے اور تمہارے دلوں کو سکون ہو جائے تو ٹھیک ٹھیک تمام ارکان اور شرائط کی پابندی کے ساتھ نماز پڑھو امن کی حالت میں وہ بات جائز نہیں جو خوف کی حالت میں جائز ہے۔

إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتٰبًا مَّوْقُوتًا ﴿۱۰۳﴾ بے شک نماز مسلمانوں پر وقتی تعین کے ساتھ فرض ہے۔ یعنی جہاں تک ممکن ہو نماز کو اس کے وقت سے نہ ٹالا جائے یہ آیت گویا گزشتہ بیان کی علت ہے کہ خوف کی نماز اور کھڑے بیٹھے عذر کے وقت نماز اس لئے ضرورت ہے کہ نماز مسلمانوں پر فرض لازم ہے اور اس کا وقت معین ہے۔

امام شافعی عین جنگ کی حالت میں اور مسابقت کی صورت میں نماز کو جائز قرار دیتے ہیں اور بیضاوی نے اس قول پر اسی آیت سے استدلال کیا ہے لیکن یہ استدلال غلط ہے کیونکہ اگر حالت مسابقت میں نماز کا جواز ہوتا تو جس طرح لیٹنے اور بیٹھنے کی حالت میں نماز کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے اسی طرح حالت مسابقت میں نماز کا ذکر بھی ہوتا اور اصل عدم جواز ہے۔ آیت میں اوقات صلوٰۃ کی تفصیل نہیں کی گئی ہے احادیث میں اس کا بیان آیا ہے۔

مسئلہ :- بالاتفاق ظہر کا وقت زوال کے بعد سے شروع ہو کر عصر تک رہتا ہے اور عصر کا وقت غروب آفتاب تک ہے مگر سورج میں زردی آنے پر بالاجماع مکروہ تحریمی ہے امام شافعیؒ کے نزدیک جب ہر شے کا سایہ (اصلی سایہ کو چھوڑ کر) دوچند ہو جائے تو عصر کے لئے یہ وقت سب سے اعلیٰ ہے مغرب کا وقت غروب آفتاب کے بعد اور عشاء کا وقت غروب شفق کے بعد سے شروع ہو کر فجر چمکنے تک رہتا ہے لیکن بالاجماع آدھی رات سے زیادہ تاخیر نہ کرنا مستحب ہے فجر کا وقت صبح کی پو پھٹنے سے طلوع آفتاب تک ہے۔ ظہر اور مغرب کا آخر وقت کہاں تک ہے اس میں آئمہ کا اختلاف ہے جمہور کے نزدیک ظہر کا وقت اس وقت تک رہتا ہے جب ہر چیز کا سایہ سایہ زوال کو چھوڑ کر ایک مثل ہو جائے اور مغرب کا وقت غروب شفق تک رہتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ہر چیز کا سایہ دو مثل ہونے تک ظہر کا وقت رہتا ہے۔ امام مالکؒ اور شافعیؒ کے ایک قول میں مغرب کی نماز غروب آفتاب کے بعد فوراً پڑھ لی جائے تاخیر نہ کی جائے۔ اوقات کی تعین میں اصل ضابطہ وہ ہے جو حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کعبہ کے پاس دو بار جبرئیلؑ نے میری امامت کی۔ پہلی بار ظہر کی نماز اس وقت پڑھائی جب سایہ تسمیہ کی طرح تھا پھر عصر کی نماز اس وقت پڑھائی جب ہر چیز اپنے سایہ کی مثل ہو گئی تھی (یعنی سایہ اصلی کو چھوڑ کر ہر چیز کا سایہ ایک مثل ہو چکا تھا) پھر مغرب کی نماز اس وقت پڑھائی جب سورج ڈوب چکتا ہے اور روزہ دار روزہ کھولتا ہے پھر عشاء کی نماز اس وقت پڑھائی جب شفق غائب ہو چکی تھی۔ پھر فجر کی نماز اس وقت پڑھائی جب روشنی کی پو پھٹتی ہے۔ اور روزہ رکھنے والے کے لئے کھانا ممنوع ہو جاتا ہے۔

پھر دوبارہ ظہر کی نماز اس وقت پڑھائی جس وقت گزشتہ دن کے عصر کے وقت کی طرح ہر چیز کا سایہ ایک مثل ہو گیا تھا اور عصر کی نماز اس وقت پڑھائی جب ہر چیز کا سایہ دو مثل ہو گیا تھا پھر مغرب اول وقت کی طرح پڑھائی اور عشا ایک تہائی رات گئے پڑھائی پھر فجر کی نماز اس وقت پڑھائی جب زمین زرد ہو گئی تھی پھر میری طرف رخ کر کے جبرئیلؑ نے کہا محمدؐ آپ سے پہلے انبیاء کا یہی وقت ہے اور ان دونوں (وقتوں) کے درمیان نماز کا وقت ہے۔ رواہ داؤد وابن حبان فی صحیحہ ترمذی نے اس کو حسن صحیح اور حاکم نے صحیح الاسناد کہا ہے لیکن اس کی سند میں ایک راوی عبدالرحمن بن حارث ہے جس کو امام احمد اور نسائی اور ابن معین اور ابو حاتم نے ضعیف کہا ہے مگر ابن سعد اور ابن حبان نے اس کو ثقہ کہا ہے۔ اسی روایت کا متابع (مؤید) عبدالرزاق نے حضرت

ابن عباسؓ کا بیان بھی نقل کیا ہے ابن دقیق العید نے اس کو اچھی متابعت قرار دیا ہے اور ابو بکر ابن العربی اور ابن عبد البر نے اس کو صحیح کہا ہے۔

حضرت جبرئیلؑ کی امامت والی حدیث چند صحابہؓ کی روایت سے آئی ہے حضرت جابرؓ کی روایت میں حدیث کے یہ الفاظ ہیں۔ پھر دوسرے دن عشاء کی نماز اس وقت پڑھی جب آدھی رات یا (فرمایا) ایک تہائی رات جا چکی تھی۔ بخاری نے لکھا ہے کہ اوقات (نماز) کے متعلق سب سے زیادہ صحیح حدیث وہ ہے جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے آئی ہے۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے نماز کا وقت دریافت کیا۔ فرمایا ان دونوں یعنی دو دنوں میں ہمارے ساتھ نماز پڑھنا۔ چنانچہ زوال آفتاب کے بعد حضور ﷺ نے بلال کو حکم دیا۔ بلال نے اذان دی پھر ان کو اقامت کہنے کا حکم دیا۔ حسب الحکم انہوں نے ظہر کی اقامت کہی پھر جس وقت سورج اونچا سفید اور صاف تھا اس وقت آپ نے بلالؓ کو حکم دیا اور بلالؓ نے عصر کی اقامت کہی پھر حسب الحکم مغرب کی اقامت اس وقت کہی جب سورج چھپ گیا تھا پھر حکم کے مطابق عشاء کے اقامت شفق چھپنے کی بعد کہی پھر تعمیل حکم فجر کی اقامت پو چمکنے پر کہی پھر دوسرا دن ہوا تو حضورؐ کے حکم کے موافق ٹھنڈک پڑے ظہر کی تکبیر کہی اور حضور نے خوب ٹھنڈک پڑے ظہر کی نماز پڑھی اور عصر اس وقت پڑھی جب سورج اونچا تھا مگر پہلے دن سے تاخیر کی تھی اور مغرب کی نماز شفق چھپنے سے (کچھ) پہلے پڑھی اور عشاء کی نماز ایک تہائی رات گئے پڑھی اور فجر کی نماز اجالا کر کے پڑھی پھر فرمایا وہ سائل کہاں گیا اس شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں حاضر ہوں فرمایا جو (میری نمازیں) تم نے دیکھیں ان کے درمیان تمہاری نماز کے اوقات ہیں۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت بھی حضرت بریدہؓ کی روایت کی طرح ہے اس روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ حضور ﷺ نے مغرب کو اس وقت تک موخر کیا کہ شفق غائب ہونے کے قریب ہو گئی یعنی دوسرے روز۔ رواہ مسلم حضرت عبد اللہ بن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ظہر کا وقت (شروع ہوتا ہے) زوال آفتاب سے (اور) اس وقت تک رہتا ہے کہ ہر چیز کا سایہ اس کی لمبائی تک ہو جائے جب تک عصر نہ آ جائے اور عصر کا وقت اس وقت تک ہے کہ دھوپ زرد نہ ہو جائے اور مغرب کا وقت اس وقت تک ہے کہ شفق نہ چھپ جائے اور عشاء کا وقت آدھی رات یعنی وسط رات تک ہے اور فجر کا وقت پو چمکنے سے اس وقت تک ہے کہ سورج برآمد نہ ہو جائے۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مغرب کا شروع وقت سورج غروب ہونے پر ہے اور آخری وقت شفق چھپنے پر اور عشاء کا شروع وقت شفق چھپنے پر ہے اور آخری وقت آدھی رات ہو جانے پر اور فجر کا شروع وقت طلوع فجر سے ہے اور آخری وقت سورج نکلنے تک ہے۔ ترمذی نے یہ حدیث محمد بن فضیل کی روایت سے بوساطت اعمش از ابو صالح حضرت ابوہریرہؓ کی طرف منسوب کی ہے بخاری نے اس کو غلطی سے مرفوعاً بیان کیا ہے۔ ان تمام احادیث سے جمہور کے قول کی تائید امام مالک و امام شافعیؒ کے قول کے خلاف ہو رہی ہے کہ مغرب کا آخری وقت شفق چھپنے تک ہے۔

سورج ڈوبنے تک عصر کا آخری وقت رہنا آیت اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ فَقَالَ اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ سے مستفاد ہے اس کے علاوہ رسول اللہ صلعم کا بھی ارشاد ہے کہ جس نے طلوع آفتاب سے پہلے صبح کی (نماز کی) ایک رکعت پالی اس نے فجر (کی نماز) پالی اور جس نے غروب آفتاب سے پہلے عصر کی (نماز کی) ایک رکعت پالی اس نے عصر (کی نماز) پالی۔ بخاری و مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے۔

عشاء کا آخری وقت طلوع فجر تک رہنا کسی حدیث میں نہیں آیا۔ نہ صحیح میں نہ ضعیف میں۔

عشاء کے آخری وقت کی تعین کے متعلق احادیث میں (لفظی) اختلاف ہے حضرت ابن عباسؓ حضرت ابو موسیٰؓ اشعری اور حضرت ابو سعید خدری کی روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک تہائی رات تک عشاء کو موخر کیا اور حضرت ابوہریرہؓ و حضرت انسؓ کی روایت میں آیا ہے کہ آدھی رات ہونے تک عشاء میں تاخیر کی حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ عشاء میں

اتنی تاخیر کی کہ دو تہائی رات چلی گئی۔ حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ عشاء کی نماز حضورؐ نے اس وقت پڑھی کہ بیشتر رات گزر چکی تھی۔ یہ تمام احادیث صحاح میں موجود ہیں۔

طحاوی نے لکھا ہے ان احادیث کے مجموعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پوری رات عشاء کی نماز کا وقت ہے لیکن مراتب کا فرق ہے۔ ایک تہائی رات تک افضل ہے اس کے بعد نصف رات تک فضیلت کم ہے اور نصف کے بعد سب سے کم درجہ ہے۔ طحاوی نے اپنی سند سے نافع بن جبیر کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰؓ اشعری کو لکھا تھا عشاء کی نماز رات کے جس حصہ میں چاہو پڑھو مگر اس سے غفلت نہ کرنا۔

مسلم نے لیلۃ التعریس کے قصہ میں حضرت ابو قتادہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نیند میں کوئی قصور نہیں (یعنی نیند کی وجہ سے اگر نماز قضاء ہو جائے تو یہ قصور نہیں) بلکہ قصور اس میں ہے کہ کسی (وقت کی) نماز میں اتنی تاخیر کی جائے کہ دوسری نماز کا وقت آجائے۔ اس حدیث کے آخری جملہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ عشاء کا وقت طلوع فجر تک ہے۔ اس کے علاوہ علماء کا اجماع ہے کہ اگر رات کا کچھ حصہ باقی ہو اور اس وقت کوئی کافر مسلمان ہو جائے یا حیض والی عورت پاک ہو جائے یا لڑکا بالغ ہو جائے تو عشاء کی نماز اس پر واجب ہے۔

رہی یہ بات کہ حضرت جبرئیلؑ کی امامت والی حدیث اور رسول اللہ ﷺ کی مذکورہ بالا سائل کو اوقات کی تعلیم میں جو عشاء کا وقت ثلث شب یا نصف شب تک بیان کیا گیا ہے تو اس سے مراد غیر مکروہ مستحب وقت ہے۔ اسی لئے امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا۔ اول وقت سے مغرب کی نماز میں تاخیر مکروہ ہے۔ مگر تنزیہی مکروہ تحریمی نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے سقوط شفق تک مغرب میں تاخیر کی تھی۔ مگر عشاء کی نماز میں اس وقت سے تاخیر کرنا جس وقت حضور صلعم نے (دوسرے دن) نماز پڑھی تھی اور آفتاب میں زردی آنے تک عصر کی نماز میں تاخیر کرنا مکروہ تحریمی ہے (رسول اللہ صلعم سے اس کا ثبوت نہیں ہے) اور آفتاب کے زرد ہونے تک عصر میں تاخیر کرنی تو سخت ترین مکروہ ہے کیونکہ اس وقت نماز پڑھنے کی ممانعت آئی ہے اور اس کو شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

رہی امامت جبرئیل (علیہ السلام) کی وہ حدیث جس میں عصر کا وقت (صرف) اس وقت تک بیان کیا گیا ہے کہ ہر شی کا سایہ دو مثل ہو جائے تو یہ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان سے منسوخ ہے کہ وقت عصر اس وقت تک ہے جبکہ سورج زرد نہ ہو جائے۔

ظہر کا آخری وقت دو مثل سایہ تک رہنا کسی حدیث میں نہیں آیا نہ صحیح میں نہ ضعیف میں اسی لئے اس مسئلہ میں امام صاحب کے دونوں شاگردوں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا قول بھی امام کے خلاف اور جمہور کے موافق ہے لیکن امام اعظمؒ نے اپنے مسلک کی تائید میں حضرت بریدہ والی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ دوسرے روز رسول اللہ ﷺ کے حکم کے موافق حضرت بلالؓ نے ظہر کی اقامت ٹھنڈک پڑنے پر کہی اور حضور صلعم نے ظہر کی نماز خوب ٹھنڈک ہوئے پڑھی۔ نیز رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جب سخت گرمی ہو تو نماز کو ٹھنڈا کرو کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی لپیٹ سے ہوتی ہے۔ رواہ الستہ۔

امام اعظمؒ نے فرمایا ان کے ملک (یعنی مدینہ) میں ایسے وقت جب کہ ہر چیز کا سایہ (صرف) ایک مثل ہوتا تھا سخت گرمی ہوتی تھی اس لئے ظہر کو ٹھنڈے وقت پڑھنے والی حدیث۔ امامت جبرئیلؑ والی حدیث کی ناسخ ہے کیونکہ امامت جبرئیلؑ والی حدیث تو اوقات صلوٰۃ کی تعین میں سب سے پہلی حدیث ہے لہٰذا ابراد ظہر والی حدیث سے حدیث امامت جبرئیل منسوخ ہے اور جب حدیث امامت جبرئیلؑ کا منسوخ ہونا ثابت ہو گیا تو اول وقت عصر جس میں جبرئیل نے امامت کی تھی وہ بھی منسوخ ہو گیا کیونکہ آیت اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا کا تقاضا ہے کہ ہر نماز کا جدا وقت ہو اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ نماز کو اتنا موخر کرنا کہ دوسری نماز کا وقت آجائے تفریط ہے لیکن دوسرے دن جو دو مثل سایہ ہونے پر حضرت جبرئیلؑ نے عصر کی امامت کی تھی تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عصر کا وقت تھا اور یہ منسوخ نہیں ہوا لہٰذا یہ حکم باقی

رہے گا اور عصر کے اس مقررہ وقت کے شروع ہونے تک ظہر کا وقت ہو گا۔
امام صاحبؒ کا یہ استدلال ضعیف ہے۔ حدیث ابراد اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ ایک مثل سایہ ہونے کے بعد بھی ظہر کا وقت باقی رہتا ہے بلکہ وقت کی خنکی ایک اضافی امر ہے اصل شدت حرارت تو زوال کے وقت ہوتی ہے وقت زوال کی گرمی کے مقابلہ میں ایک مثل سایہ ہونے سے کچھ پہلے قدرے خنکی تو ہو ہی جاتی ہے اور اگر یہ مان لیا جائے کہ ان کے ملک میں ایک مثل سایہ ہونے کے وقت گزشتہ وقت سے زیادہ گرمی ہوتی تھی تو پھر جراد کے امر کا تقاضا ہے کہ شروع وقت میں نماز پڑھ لی جائے (تاکہ ایک مثل سایہ ہونے کے وقت جو گرمی کی تیزی ہوتی ہے اس سے پہلے ہی نماز ہو جائے)، واللہ اعلم۔
مسئلہ :- جمہور کے نزدیک شفق (سے مراد) افق کی سرخی ہے امام ابو حنیفہ کا قول بھی (ایک ضعیف) روایت میں یہ ہی آیا ہے لیکن آپ کا مشہور مسلک یہ ہے کہ شفق وہ سفیدی ہے جو سرخی کے بعد آتی ہے۔ لفظ شفق دونوں معنی میں مشترک ہے اور (شفق سے کونسا معنی مراد ہے بہر حال یہ امر غیر یقینی ہے اور) شک کی صورت میں نہ مغرب کا وقت ختم ہو گا نہ عشاء کا وقت شروع ہو گا پھر احتیاط کا تقاضا بھی یہی ہے (کہ شفق سے سفیدی مراد لی جائے) کیونکہ وقت کے بعد نماز جائز ہے (زیادہ سے زیادہ یہ کہ قضا ہو گی) اور وقت سے پہلے جائز ہی نہیں ہے۔
جمہور کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا شفق سرخی ہے جب شفق چھپ گئی۔ (عشاء کی) نماز واجب ہو گئی۔ ابن عساکر نے یہ حدیث غرائب مالک میں دو طرح سے روایت کی ہے۔
(۱) عتیق بن یعقوب از مالک از نافع از ابن عمرؓ مرفوعاً (۲) ابو حذافہ از مالک، اول روایت کو مسنداً ابن عساکر نے ترجیح دی ہے۔ بیہقی نے اس حدیث کے موقوف ہونے کو صحیح کہا ہے۔ حاکم نے المدخل میں ابو حذافہؓ کی روایت نقل کی ہے اور ان موقوف احادیث کی مثال میں پیش کیا جن کو اصحاب تخریج نے مرفوع کہا ہے۔ ابن خزیمہ نے بروایت محمد بن یزید واسطی از شعبہ از قتادہ از ابو ایوب از ابن عمرؓ۔ ان الفاظ کے ساتھ اس حدیث کو مرفوعاً بیان کیا ہے کہ مغرب کا وقت شفق کی سرخی جانے تک ہے۔ ابن خزیمہ نے لکھا ہے اگر ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث پایہ صحت کو پہنچ جائے تو پھر باقی روایات کی ضرورت نہیں رہتی مگر یہ الفاظ صرف محمد بن یزید نے بیان کئے ہیں اور اصحاب شعبہ نے حمرۃ الشفق کی جگہ ثور الشفق کا لفظ نقل کیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ محمد بن یزید صدوق (بہت ہی سچا) ہے بیہقی نے یہ حدیث حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عبادہؓ بن صامت حضرت شداد بن اوس اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایات سے نقل کی ہے مگر ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔
بغوی نے لکھا ہے کہ ابو سفیان اور اس کے ساتھی جب احد کے دن واپس لوٹ گئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے پیچھے ایک جماعت کو بھیجا مگر انہوں نے اپنے زخموں کی شکایت کی اس پر اللہ نے آیات مندرجہ ذیل نازل فرمائیں۔
وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ اور (اے مسلمانو) اس قوم یعنی کافروں سے لڑنے کی طلب میں کمزوری نہ دکھاؤ۔ (ہمت نہ ہارو)۔
إِنْ تَكُونُوا تَأْلَمُونَ اگر تم (زخموں کا) دکھ محسوس کرتے ہو۔
فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ تو وہ بھی تمہاری طرح زخموں کا دکھ محسوس کرتے ہیں یعنی لڑائی کا ضرر دونوں کو برابر پہنچتا ہے، دکھ تمہارے لئے ہی مخصوص نہیں ہے۔
وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ اور تم کو اللہ سے جس اجر و ثواب کی امید ہے وہ کافروں کو نہیں ہے۔ لہٰذا تم کو جہاد کی رغبت اور تکالیف پر صبر کافروں سے زیادہ ہونا چاہئے۔
وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا اور اللہ (تمہارے اعمال اور نیتوں کو) خوب جانتا ہے۔
حَكِيمًا ﴿۱۰۴﴾ اور (جو کچھ حکم دیتا یا ممانعت کرتا ہے اس کی) مصلحت سے واقف ہے بغوی کے اس بیان سے معلوم ہوتا

ہے کہ مذکورہ آیات کا نزول۔ غزوہ حمراء الاسد میں ہوا آیت اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ بھی اس پر دلالت کر رہی ہے لیکن بیضاویؒ نے بدر صغریٰ کے متعلق اس کا نزول لکھا ہے۔ اہل سیر نے دونوں غزوات میں سے کسی ایک کے متعلق اس آیت کا نزول نہیں لکھا نہ کلام کی رفتار اس پر دلالت کر رہی ہے بلکہ سورۂ آل عمران کی آیت اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ کا نزول اس کے متعلق قرار دیا جائے۔ واللہ اعلم۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ بے شک ہم نے تمہارے پاس یہ کتاب بھیجی ہے واقع کے مطابق تاکہ لوگوں کا فیصلہ تم اس کے موافق کرو جو اللہ نے تم کو بتادیا ہے۔

ترمذی اور حاکم وغیرہ نے حضرت قتادہ بن نعمان کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک کنبہ والے تھے جن کو بنوابیرق کہا جاتا تھا (یہ تین بھائی تھے) بشر، بشیر، مبشر، بشیر منافق شخص تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ کی ہجاء میں شعر خود کہتا تھا اور شعروں کی نسبت کسی عرب کی طرف کر دیتا تھا اور کہتا تھا یہ قول فلاں شخص کا ہے۔ یہ لوگ جاہلیت اور اسلام دونوں زمانوں میں محتاج فاقہ زدہ تھے۔ (اس زمانہ میں) اہل مدینہ کی (عمومی) غذا چھوارے اور جو تھی میرے چچا رفاعہؓ بن زید نے بھی ایک بوری آٹا خرید کر ایک کٹیا میں رکھ دیا۔ کٹیا میں ان کے ہتھیار تلوار اور زرہ بھی رکھی تھی۔ کٹیا میں نیچے سے نقب لگا کر کسی نے آٹا اور ہتھیار چرا لئے۔ صبح کو چچا رفاعہ میرے پاس آئے اور کہا بھتیجے آج رات ہم پر بڑی زیادتی ہوئی کٹیا میں نقب لگ گیا اور آٹا اور ہتھیار چوری ہو گئے جب ہم نے احاطہ کے اندر تلاش اور پوچھ تاچھ کی تو ہم کو اطلاع ملی کہ آج رات بنی ابیرق کے ہاں چولھا جلا تھا۔ خیال یہ ہے کہ تمہارا آٹا ہی پکایا گیا ہے۔ ہم احاطہ کے اندر پوچھتاچھ کر ہی رہے تھے کہ بنی ابیرق نے کہا خدا کی قسم ہمارے خیال میں تو یہ حرکت لبیدؓ بن سہیل کی ہے اور لبیدؓ بن سہیل بڑا نیک مسلمان ہے۔ جب لبیدؓ کو انہوں نے متہم کیا تو اس نے تلوار سونت لی اور کہا میں چوری کروں گا خدا کی قسم یا تو چوری کا مال سامنے لے آؤ، ورنہ یہ تلوار تمہارے اندر داخل کر دوں گا بنی ابیرق نے کہا، ارے تو چوری کرنے والا نہیں ہے ہم سے الگ رہ (یعنی ہم نے تجھے چور نہیں کہا، پھر ہم سے کیوں الجھتا ہے)۔

غرض ہم نے احاطہ میں تفتیش کی تو ہم کو یقین ہو گیا کہ بنی ابیرق ہی چور ہیں بھتیجے تم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کا ذکر کر دو۔ چچا کے کہنے کے موافق میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا (یا رسول اللہ ﷺ) ہمارے احاطہ والوں میں سے کچھ لوگوں نے میرے چچا پر ظلم کیا ہے اس کی کٹیا میں نقب لگا کر ہتھیار اور آٹا لے لیا۔ ہمارے ہتھیار تو واپس ملنے چاہئیں آٹے کی ضرورت نہیں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں دیکھوں گا ادھر بنی ابیرق نے جب یہ بات سنی تو اپنے ایک آدمی کے پاس جس کا نام اسیر بن عروہ تھا گئے اور اس سے اس سلسلہ میں بات کی اور (وہاں) بہت سے احاطہ والے جمع ہو گئے اور انہوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ قتادہؓ بن نعمان اور اس کے چچا نے ہمارے کنبہ کے کچھ نیک مسلمانوں پر بغیر گواہ اور ثبوت کے چوری کی تہمت لگائی ہے۔ حضرت قتادہؓ کا بیان ہے جب میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضور صلعم نے فرمایا تم ایسے لوگوں پر چوری کی تہمت لگا رہے ہو جن کی نیکی اور اسلام کا ذکر میرے سامنے کیا گیا ہے اس پر زیادہ وقفہ نہیں گزرا تھا کہ آیت اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ ...... عَظِیْمًا تک نازل ہوئی۔ ان آیات کے نزول کے بعد اسلحہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر کر دیئے گئے اور حضورؐ نے رفاعہ کو واپس دیدیئے اور بشیر بھاگ کر مشرکوں سے جا ملا اور سلافہ بنت سعد کے پاس جا کر فروکش ہوا۔ اس پر اللہ نے آیت وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰى ...... ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا تک نازل فرمائی حاکم نے کہا یہ راویت بر شرط مسلم صحیح ہے۔

ابن سعدؒ نے طبقات میں اپنی سند سے محمودؒ بن لبید کی روایت سے لکھا ہے کہ بشیر بن حارث نے قتادہؓ بن نعمان کے چچا رفاعہ بن زید کی کٹیا میں پیچھے کی طرف سے سینڈھ لگا کر کچھ آٹا اور دو زرہیں مع ان کے ساز و سامان کے لے لیں۔ قتادہ نے جا کر رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع دیدی۔ حضور صلعم نے بشیر کو طلب کر کے سوال کیا بشیر نے انکار کر دیا اور ایک شخص لبید بن

سہیل کو جو احاطہ میں بڑا شریف اور اصیل آدمی تھا متہم کیا اس پر بشیر کی تکذیب اور لبیدؓ کی براءت کے سلسلے میں آیات اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ نازل ہوئیں بشیر کو جب نزول آیات کی اطلاع ملی تو وہ مرتد ہو کر بھاگ کر مکہ کو چلا گیا اور سلافہ بنت سعد کے پاس جا کر ٹھہرا اور رسول اللہ ﷺ اور دوسرے مسلمانوں کی ہجاء کرنے لگا۔ اس کے بارہ میں آیات کا نزول ہوا اور حضرت حسانؓ بن ثابت نے اس کی ہجاء کی آخر وہ لوٹ آیا۔ یہ واقعہ ماہ ربیع الثانی ۴ ہجری کا ہے۔

بغویؒ نے لکھا ہے کہ کلبیؒ نے ابو صالح کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا اور ابن جریرؒ نے یہ روایت لکھی ہے کہ اس آیت کا نزول ایک انصاری کے متعلق ہوا اس کا نام طعمہ بن ابیرق تھا اور خاندان بنی ظفر بن حارث میں سے تھا۔ اس نے اپنے ہمسائے قتادہؓ بن نعمان کی زرہ چرائی تھی زرہ ایک تھیلے میں تھی جس کے اندر آٹا بھرا ہوا تھا۔ تھیلے میں شگاف تھا شگاف سے آٹا بکھرتا ہو چلا گیا اور چور کے مکان تک یونہی چلا گیا طعمہ نے زرہ لیجا کر ایک یہودی کے پاس جس کا نام زید السمین تھا چھپادی۔ زرہ کی تلاش طعمہ کے پاس ہوئی۔ طعمہ نے قسم کھائی کہ میں نے نہ زرہ لی ہے نہ مجھے اس کا علم ہے۔ زرہ والوں نے کہا ہم نے آٹے کا نشان اس کے گھر تک دیکھا ہے لیکن طعمہ نے قسم کھالی تو زرہ والوں نے اس کو چھوڑ دیا اور یہودی کے گھر تک آٹے کے نشان کا پیچھا کیا اور یہودی کو جا پکڑا یہودی نے کہا مجھے طعمہ بن ابیرق نے یہ زرہ دی تھی۔ طعمہ کی قوم والے یعنی بنی ظفر رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضورؐ سے درخواست کی کہ آپ ہمارے آدمی کی وکالت کریں اگر آپؐ ایسا نہ کریں گے تو ہمارا آدمی رسوا ہو جائے گا، اس پر رسول اللہ صلعم نے یہودی کو سزا دینے کا ارادہ کیا۔

حضرت ابن عباسؓ کا ایک اور بیان بھی دوسری روایت میں آیا ہے، وہ یہ کہ طعمہ نے زرہ اس تھیلے سمیت چرائی جس کے اندر بھوسی رکھی ہوئی تھی اور سارے راستے بھوسی بکھرتی چلی گئی۔ طعمہ نے زید السمین کے گھر تک لے جا کر اس کے دروازہ پر تھیلا رکھ دیا اور زرہ اپنے گھر لے گیا۔ زرہ کا ملک بھوسی کے نشان پر زید السمین کے گھر پر پہنچا اور اس کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہودی کا ہاتھ کاٹنے کا ارادہ کیا۔ بغویؒ نے مقاتل کا قول نقل کیا ہے کہ زید السمین نے طعمہ کے پاس زرہ بطور امانت رکھی تھی جس کا طعمہ نے انکار کر دیا تھا، اس پر آیت اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ نازل ہوئی۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ حکم۔ ممانعت اور دوسرے سچے علوم کی حامل کتاب ہم نے تم پر اتاری، تاکہ تم اللہ کے بتائے ہوئے حکم کے مطابق لوگوں کے باہمی فیصلے کرو۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ آیت میں رویت کا معنی علم نہیں ہے کیونکہ (رویت بمعنی علم کے لئے دو مفعول ضروری ہیں اور اس جگہ باب افعال کے ارات مصدر سے اراکَ استعمال کیا گیا ہے اس لئے) اس وقت تین مفعولوں کی ضرورت ہو گی (جن میں سے صرف ایک مذکور ہے دو موجود نہیں ہیں) اور رویت کا معنی آنکھوں سے دیکھنا تو بہر حال اس جگہ مراد نہیں ہے۔ لا محالہ رویت سے مراد معرفت ہے یعنی اللہ نے جو تم کو بتایا اور وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اس کے مطابق فیصلہ کرو۔ بعض علماء کا قول ہے کہ آیت میں رویت بمعنی علم ہی مراد ہو سکتی ہے (پہلا مفعول موجود ہے اور) دوسرا تیسرا مفعول محذوف ہے یعنی جو چیز اللہ نے تم کو حق سکھائی ہے اس کے مطابق فیصلہ کرو اس صورت میں اگرچہ حذف کی زیادتی ضرور ہو گی مگر مجازی معنی (یعنی رویت بمعنی معرفت) مراد لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

میں کہتا ہوں ظاہر یہی ہے کہ رویت سے مراد علم ہو اور ما موصولہ سے مراد ہو وہ پورا مضمون جس سے علم کا تعلق ہو رہا ہے اور موصول کی طرف لوٹنے والی ضمیر محذوف ہو لیکن محذوف مذکور کے حکم میں ہو اس وقت چونکہ جملہ کا مضمون (جس پر موصول کے ذکر کی ضرورت نہیں، حاصل مطلب یوں ہو گا کہ طعمہ کے چور ہونے یا لبید یا زید کے بری ہونے کا تم فیصلہ کرو، اس غرض سے ہم نے کتاب (کی یہ آیت) نازل کی۔

آیت سے یہ امر تو ثابت ہو رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ محض ظن پر عمل نہیں کرتے تھے لیکن یہ بات ثابت ہوتی کہ آپ اجتہاد نہیں کرتے تھے کیونکہ جب اجتہاد کے ذریعہ سے حضور (صلعم) کو کسی امر کا ظن پیدا ہو گیا اور اللہ نے اس کی تائید کر دی

اور ظن رسول کے غلط ہونے کی اطلاع نہیں دی تو اسوقت آپ کو یقین ہو گیا کہ میرا ظن اجتہادی حق ہے البتہ دوسرے مجتہدوں کی حالت اس سے الگ ہے (ان کے اجتہاد کی تائید قرآن سے نہیں ہوتی اس لئے ان کا اجتہاد مفید ظن ہی رہتا ہے کبھی یقین تک نہیں پہنچ سکتا)۔

اس کی تائید عمرو بن دینار (رضی اللہ عنہ) کی روایت سے ہوتی ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا، آپ اسی کے مطابق فیصلہ کیجئے جو اللہ نے آپ کو سکھادیا ہو حضرت عمرؓ نے فرمایا چپ، یہ شان تو صرف رسول ﷺ کی تھی۔

یہ بھی درست ہے کہ آیت کا حکم عام ہو (رسول اللہ صلعم) کی تخصیص نہ ہو اور یوں کہا جائے کہ جب خبر آحاد یا قیاس غرض کس ظنی دلیل سے مجتہد کو کوئی حکم معلوم ہو گیا تو پھر از روئے قرآن و حدیث و اجماع سے حکم پر عمل واجب ہے (واقع میں وہ ظنی حکم صحیح ہو یا غلط مگر اجتہاد پر عمل کرنا بہر حال قرآن اور حدیث اور اجماع کی رو سے واجب ہے) پس اگر اجتہادی ظن کے خلاف کوئی راجح دلیل مجتہد کے سامنے نہ آئے اور انتہائی کوشش اور فکری کاوش کرنے کے بعد ایک حکم معلوم ہو جائے تو اگرچہ مجتہد کو یہ یقین نہیں ہوتا کہ واقع میں بھی اللہ کے نزدیک حکم میرے ظن کے مطابق ہے مگر اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس اجتہاد پر عمل کرنا میرے لئے واجب ہے۔[1]

شیخ ابو منصورؒ نے فرمایا، آیت کا معنی یہ ہے کہ نازل شدہ اصول کے زیر نظر جو حکم اللہ تمہارے دل میں ڈال دے اس کے مطابق فیصلہ کرو، اس صورت میں بقول شیخ رسول اللہ ﷺ کے لئے اجتہاد کرنے کے جواز کی دلیل اس آیت میں موجود ہے۔

وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ﴿١٠٥﴾ اور نہ ہو خیانت کرنے والوں کے طرف دار (اور حمایتی) لاتکن کا عطف انزلنا پر اگر مانا جائے تو لفظ قلنا محذوف قرار دیا جائے گا (تاکہ خبر پر انشاء کا عطف ہونا لازم نہ آئے) یعنی ہم نے کہہ دیا کہ خیانت کرنے والوں کے حمایتی نہ بنو اور اگر الکتب پر معطوف قرار دیا جائے تو انزلنا محذوف ہو گا یعنی ہم نے کتاب نازل کی اور یہ بھی نازل کیا کہ خائنوں کے حمایتی نہ بنو۔

الخائنین سے مراد ہیں بنی ابیرق اور خصیم سے مراد ہے بے گناہوں کے حریف یعنی لبید بن سہیل یا زید السمین یہودی کے مخالف۔

وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اور (جو کچھ تم نے قتادہ بن نعمان سے کہا اس کی) اللہ سے معافی طلب کرو، ترمذی اور حاکم نے قتادہ کا یہی تفسیری قول نقل کیا ہے، بغوی نے یہ مطلب لکھا ہے کہ یہودی کو سزا دینے کا جو تم نے ارادہ کیا تھا، اس کی معافی اللہ سے مانگو، مقاتل نے کہا کہ طعمہ کی طرف داری میں جو کچھ تم نے کہا اس کی معافی اللہ سے مانگو۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١٠٦﴾ بلا شبہ (جو اللہ سے استغفار کرتا ہے اس کو) اللہ بڑا معاف کرنے والا اور مہربان ہے۔

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اور تم کوئی جواب دہی نہ کرو، ان لوگوں کی طرف سے جو کہ اپنا خود ہی نقصان کر رہے ہیں، چونکہ ان کی اپنی خیانت کاری کا نتیجہ، بد خود ان ہی کی طرف لوٹتا تھا اس لئے دوسروں کے ساتھ خیانت کرنے کو خود اپنے ساتھ خیانت کرنا قرار دیا۔ یختانون کی ضمیر ابن ابیرق اور اس جیسے لوگوں کی طرف راجع ہے یا یوں کہا جائے کہ ابن ابیرق اور اس کی قوم والے مراد ہیں کیونکہ ابن ابیرق کی قوم والے بھی مددگار جرم تھے انہوں نے ہی رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی تھی کہ حضورؐ ابن ابیرق کی طرف سے وکالت کریں۔

---

[1] ابن وہب کا بیان ہے مجھ سے مالک نے فرمایا کہ لوگوں کے درمیان جس فیصلہ کا حکم دیا گیا ہے وہ دو طرح کا ہوتا ہے ایک تو وہ جو قرآن اور حدیث میں موجود ہو یہ حکم تو یقیناً واجب اور صحیح ہوتا ہے دوسرا وہ جس کا کوئی ذکر قرآن و حدیث میں نہیں آیا (نہ مثبت نہ منفی) اور عالم اپنے اجتہاد سے اس کو معلوم کرتا ہے اس حکم کے صحیح اور واقع کے مطابق ہونے کی امید کی جاسکتی ہے لیکن ایک تیسرا حکم اور ہے (جس کے مطابق فیصلہ نہیں کیا جاسکتا) وہ یہ ہے کہ نامعلوم حکم میں بناوٹ اور تکلف سے کام لے ایسے حکم کو غیر صحیح کہنا زیادہ مناسب ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ بے شک اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا یعنی مبغوض جانتا ہے۔
مَنْ كَانَ خَوَّانًا اس کو جو بڑا خائن ہو یعنی خیانت پر جم جانے والا ہو۔
أَثِيمًا گناہ گار ہو یعنی جھوٹ بول کر حق کا انکار کر کے اور بے قصور پر تہمت لگا کر جو گناہ گار ہوتا ہے اللہ اس سے نفرت کرتا ہے۔

بعض علماء کا بیان ہے کہ آیت میں خطاب اگرچہ رسول اللہ ﷺ کو ہے مگر مراد خطاب دوسرے لوگ ہیں (کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی شان میں تو یہ گمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ آپ خیانت کاروں کے طرف دار ہوں گے) جیسے آیت فَإِنْ كُنْتَ فِي شَكٍّ مِمَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ (میں اگرچہ مخاطب رسول اللہ ﷺ ہیں مگر مراد دوسرے لوگ ہیں کیونکہ رسول اللہ صلعم کو تو قرآن کی صداقت میں شک ہونا ممکن ہی نہ تھا) استغفار سے مراد ہے حکم شرع کو ماننا اور اطاعت کرنا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ انبیاء کی استغفار کی تین صورتیں ہیں (۱) نبوت سے پہلے کے گناہ کے لئے استغفار (۲) اپنی امت اور اہل قرابت کے گناہوں کے لئے استغفار (۳) اس مباح فعل کے لئے استغفار جس کی شرعی ممانعت آنے پر اس کو چھوڑ دیا۔

يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ (یعنی ابن ابیرق کی قوم والے لوگوں کی شرم اور رسوائی کے خوف کی وجہ سے) لوگوں سے تو چھپاتے ہیں۔
وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ اور اللہ سے نہیں چھپا سکتے یا یہ مطلب کہ اللہ سے نہیں شرماتے سب سے زیادہ مستحق تو اللہ ہی ہے کہ اس سے شرم کی جائے اور اس کے سامنے رسوا ہونے کا خوف کیا جائے۔[ا]
وَهُوَ مَعَهُمْ حالانکہ وہ اس وقت ان کے پاس ہوتا ہے یعنی اللہ سے ان کا کوئی راز پوشیدہ نہیں اور سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں کہ جو فعل اللہ کو ناپسند اور قابل مواخذہ ہے اس کو ترک کر دیا جائے۔
إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ جب کہ وہ اللہ کی مرضی کے خلاف گفتگو کے متعلق تدبیریں کرتے ہیں۔ یعنی رات کو آپس میں ملاقاتیں کرتے ہیں اور جو باتیں اللہ کو ناپسند ہیں ان کو بناتے گھڑتے اور مشورہ میں طے کرتے ہیں۔ تبیت کے معنی کی تشریح آیت بیّت طائفتہ میں گزر چکی ہے۔ بغوی نے لکھا ہے صورت یہ ہوئی تھی کہ طعمہ کی قوم والوں نے آپس میں یہ طے کیا تھا کہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے چونکہ طعمہ مسلمان ہے اس لئے حضور ﷺ اس کے قول قسم کا اعتبار کر لیں گے اور یہودی چونکہ کافر ہے اس لئے اس کی بات نہیں سنی جائے گی۔ اللہ نے قوم طعمہ کے اس مشورہ کو پسند نہیں فرمایا۔
وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا اور اللہ ان کے سب اعمال کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے یعنی اللہ (کے علم و قدرت) سے کوئی چیز چھوٹ نہیں سکتی۔
هَا أَنْتُمْ هَٰؤُلَاءِ جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ہاں تم ایسے ہو کہ تم نے دنیوی زندگی میں تو ان کی طرف سے جواب دہی کی باتیں کر لیں۔ ھم کو ضمیر ابن ابیرق اور اس جیسے دوسرے لوگوں کی طرف راجع ہے اور ابن ابیرق کی قوم والے بھی اس میں داخل ہیں۔

جدال کا معنی ہے شدت مخاصمت یہ لفظ جَدْلٌ سے بنا ہے جدل کا معنی ہے سختی کے ساتھ بٹنا صاحب جدال بھی اپنے دلائل کی قوت سے مقابل کو اس کے مسلک سے موڑ دینا چاہتا ہے۔ یا لفظ جدال جدال سے بنا ہے۔ جدالۃ زمین کو کہتے ہیں پس جدال کا معنی ہوا ہر حریف کا دوسرے حریف کو کشتی لڑ کر زمین پر گرا دینے کی کوشش کرنا۔
فَمَنْ يُجَادِلُ اللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لیکن قیامت کے دن ابن ابیرق اور اس جیسے لوگوں کی

[ا] ابن حمید اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول موقوفاً نقل کیا ہے کہ جو شخص لوگوں کے سامنے تو نماز پڑھتا ہے اور خلوت میں وہ نماز نہیں پڑھتا تو یہ استہانت ہے وہ اس فعل سے اللہ کی توہین کرتا ہے، یہ فرمانے کے بعد حضرت ابن (باقی اگلے صفحہ پر)

طرف سے اللہ سے کون جھگڑے گا جب کہ اللہ ان کو عذاب دینا چاہے گا۔

اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۱۰۹﴾ یا وہ کون شخص ہوگا جو ان کا کام بنانے والا ہوگا وکیل وہ شخص جس کے سپرد کوئی کام کر دیا جائے مراد بچانے والا حمایت کرنے والا امر ناگوار کو اپنے موکل کی طرف سے دفع کرنے والا۔ وکیل کا کام بھی یہی ہوتا ہے اس لئے محافظ اور حامی کو وکیل کہا جاتا ہے۔

ام اس جگہ نہ متصلہ ہے نہ منقطعہ بلکہ بل (اضرابیہ) کے معنی میں ہے، ام کے بعد اگر حرف استفہام آجائے جیسے ام ماذا یا ام کیف تو بل کا معنی ہی ہوتا ہے۔ تاویل کرنے کے بعد ام کا اصلی معنی بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا جو شخص کوئی بدی کرے یعنی ایسا برا کام کرے جس سے دوسرے کو تکلیف ہو۔ [۱]

اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ یا اپنے اوپر ظلم کرے یعنی ایسی برائی کرے جس سے دوسرے کو ضرر نہ پہنچتا ہو صرف اپنے کو نقصان پہنچتا ہو۔ بعض علماء نے کہا سوء سے مراد ہے وہ گناہ جو شرک سے کم درجہ کا ہو اور ظلم سے مراد ہے شرک یا اول سے مراد ہے صغیرہ گناہ اور ظلم سے مراد ہے کبیرہ۔

ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ پھر اللہ سے معافی کا طلب گار ہو یعنی اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے اور لوگوں کے حقوق لوٹا دے۔

يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا وہ اللہ کو گناہ بخشنے والا۔

رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾ اور مہربان پائے گا۔ اس آیت میں ابن ابیرق اور اس کی قوم والوں کو توبہ واستغفار کی ترغیب ہے۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا اور جو شخص کچھ گناہ کا کام کرتا ہے۔

فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ تو وہ فقط اپنی ذات پر اس کا اثر پہنچاتا ہے کیونکہ خود اسکی بداعمالی کا ضرر اسی کو پہنچے گا دوسرے پر اسکا وبال نہیں پڑیگا

وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾ اور بندہ جو عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ (اس سے) بخوبی واقف ہے۔ اور (بدلہ دینے میں) حکمت سے کام لیتا ہے۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اور جو شخص کوئی چھوٹا گناہ کرے یعنی صغیرہ گناہ یا بلا ارادہ گناہ

اَوْ اِثْمًا یا بڑا گناہ یعنی کبیرہ گناہ یا وہ گناہ جو عمداً کیا ہو۔

ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا پھر کسی بے قصور پر اس کو ڈال دے جیسے ابن ابیرق نے لبیدؓ یا زید السمین پر اپنا جرم ڈالا تھا۔

فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا سو اس نے بڑا بھاری بہتان اپنے اوپر لادا یعنی ایسا جھوٹ اٹھایا جس سے عقل حیران رہ جائے۔

وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾ اور کھلا ہوا گناہ کو بے قصور پر تو جرم ڈال دیا اور مجرم کو جرم سے بری قرار دیا۔ [۲] ※

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ اور اگر آپ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی یہ رسول اللہ ﷺ کو خطاب ہے۔ فضل سے مراد ہے اللہ کی طرف سے حفاظت اور رحمت سے مراد مہربانی حفاظت و مہربانی کی صورت یہ ہوئی کہ ابن ابیرق کی قوم کے اندرونی رازوں سے رسول اللہ ﷺ کو واقف بنا دیا۔

لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ تو ان میں کا ایک گروہ (یعنی بنی ظفر) تو آپ کو بھٹکا دینے کا قصد کر ہی چکا تھا (یقیناً آپ بھٹک جاتے) یعنی دروغ بافی کر کے انہوں نے غلط فیصلہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اور معاملہ میں اشتباہ پیدا کر دیا

(بقیہ پچھلے صفحہ پر) مسعودؓ نے آیت يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ تلاوت فرمائی۔

[۱] ابن راہویہ نے مسند میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، جب آیت مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا نازل ہوئی تو (غم کے مارے) ہمارے لئے کھانے پینے کا فائدہ جاتا رہا، آخر آیت وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا نازل ہوئی، متعدد طریقوں سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا بیان آیا ہے کہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرما رہے تھے جس شخص نے کوئی گناہ کر لیا ہو پھر اٹھ کر اچھی طرح وضو کر کے نماز پڑھنے کھڑا ہو جائے اور گناہ کی بخشش کا خواستگار ہو تو اللہ ضرور ہی معاف فرما دیا ہے کیونکہ اس نے خود فرمایا ہے وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا، رواہ ابن ابی حاتم وابن السنی وابن مردویہ۔

※ نوٹ: حاشیہ نمبر ۲ اگلے صفحہ (نمبر ۱۷۵) پر ملاحظہ فرمائیے۔

تھا یہاں تک کہ آپ ابن ابیرق کی پیروکاری کرنے لگے تھے۔

جملہ لَهَمَّتْ، لَوْلَا کا جواب ہے۔ اس سے مقصود یہ نہیں کہ چونکہ اللہ نے مہربانی کی اس لئے وہ بہکانے کا ارادہ نہ کر سکے بلکہ ارادۂ اغواء کی تاثیر کی نفی مراد ہے یعنی اللہ کی مہربانی سے ان کا اغوا کا ارادہ بیکار ہو گیا گویا ارادہ ہی نہیں کیا گیا۔

وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ اور انہوں نے غلطی میں نہیں ڈالا مگر اپنے کو کیونکہ بہکانے کا وبال آخر کار انہیں پر پڑے گا۔

وَمَا يَضُرُّونَكَ مِنْ شَيْءٍ اور (چونکہ اللہ آپ کا حامی ہے اس لئے) وہ آپ کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔

من شیٔ مفعول مطلق کے قائم مقام ہے یعنی کچھ ضرر (نہیں پہنچا سکتے)۔

کلام کا تقاضا تو یہ تھا کہ بجائے مضارع کے ماضی کے صیغے یعنی اَضَلُّوا اور اَضَرُّوا ذکر کئے جاتے (کیونکہ اس سے پہلے ہمت ماضی کا صیغہ ہے) لیکن حال ماضی کی حکایت کرنے کے لئے مضارع کے صیغے ذکر کئے۔

وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ اور اللہ نے آپ پر قرآن اتارا ہے۔

وَالْحِكْمَةَ اور حکمت یعنی وحی غیر متلو کے ذریعہ سچے علوم (مراد احادیث صحیحہ)

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ اور وہ علوم آپ کو سکھائے جن سے آپ (پہلے) واقف نہ تھے یعنی اسرار اور غیب کا علم۔ قتادہ نے کہا دنیا اور آخرت کے متعلق حلال و حرام احکام کی تعلیم دی۔

وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا ﴿۱۱۳﴾ اور اللہ کی مہربانی آپ پر بڑی ہے کیونکہ نبوت سے بڑھ کر اور کوئی فضل نہیں ہو سکتا۔

لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِنْ نَجْوَاهُمْ اور ان کی اکثر سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں ہوتی۔ نجوی سر (راز) کذا فی القاموس ناجیتہ میں نے اس سے پوشیدہ بات کی۔ صاحب صحاح نے لکھا ہے نجوۃ الارض ٹیلہ تجری اصلاً اسی سے بنا ہے یعنی کسی ٹیلہ پر سب سے الگ تھلگ ہو کر بات کرنا۔ بعض علماء نے کہا یہ لفظ نجات سے بنا ہے اس وقت نجوٰی کا معنی ہوگا۔ ایسی بات کہنا جس میں اس شخص کی خلاصی اور بچاؤ ہو۔ بغوی نے لکھا ہے نجوٰی کا معنی ہے پوشیدہ تدبیر کرنا۔ بعض علماء نے کہا نجوٰی اس تدبیر کو کہتے ہیں جو تنہا کوئی قوم کرتی ہے خواہ علی الاعلان کرے یا چھپ کر۔ آیت وَأَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِينَ ظَلَمُوا سے اسی توضیح کی تائید ہو رہی ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو خود ساختہ تدبیریں کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر میں کوئی خیر نہیں ہوتی (بلکہ اکثر شرانگیز ہوتی ہیں) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصدر (النجوٰی) بمعنی فاعل ہو یعنی نجوی سے مراد ہوں خفیہ مشورہ کرنے والے جیسے آیت وَإِذْ هُمْ نَجْوَى میں ہے۔ اور فاعلی ضمیر ابن ابیرق کی قوم کی طرف راجع ہے جو لوگوں سے چھپ کر راتوں کو ایسے مشورے کرتے تھے جو اللہ کی نظر میں ناپسندیدہ ہوتے تھے۔

مجاہد نے کہا آیت کا عموم سب لوگوں کے لئے ہے (یعنی عام لوگوں کے اکثر مشوروں میں کوئی خیر نہیں ہوتی)۔

إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ سوائے ان کے جو خیرات کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اگر نجواھم کی ضمیر ابن ابیرق کی قوم والوں کی طرف راجع ہو تو الا سے استثناء منقطع ہوگا کیونکہ صدقہ کا حکم دینے والے ابن ابیرق کی قوم والوں میں داخل ہی نہ تھے (لہٰذا مستثنیٰ منہ ابن ابیرق کی قوم کو نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ہاں مجاہد کے قول پر استثنا متصل ہوگا (سب لوگوں میں چونکہ صدقہ کا حکم دینے والے بھی داخل تھے اس لئے ان کا استثنا کر لیا گیا)۔

۱؎ زید بن اسلم کی روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جھانک کر دیکھا حضرت ابوبکرؓ اپنی زبان کھینچ رہے تھے حضرت عمرؓ نے کہا اے رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں، حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا، اسی نے مجھے ہلاکت گاہوں میں ڈالا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ جسم کا ہر حصہ زبان کی تیزی کا شکوہ کرتا ہے (یعنی زبان کی تیزی کا دکھ ہر عضو کو پہنچتا ہے)

بعض علماء کا قول ہے کہ یہ استثناء کثیرٍ مِّنْ نَّجْوَاهُمْ سے ہے۔ اس قول پر اگر نجویٰ کو فاعلی معنی میں لیا جائے (یعنی مشورہ کرنے والے) تو معنی میں کوئی دشواری نہیں اور اگر مصدری معنی مراد ہوں تو مضاف محذوف ماننا پڑے گا یعنی ان کی اکثر سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں۔ ہاں صدقہ کا مشورہ دینے والوں کی سرگوشیاں اس سے مستثنیٰ ہیں (ان میں خیر ہوتی ہے)۔

...... ایک اعتراض ......

اس صورت میں تو استثناء ہی نہ ہوگا نہ متصل نہ منقطع کیونکہ جَاءَ نِیْ کَثِیْرٌ مِّنَ الرِّجَالِ اِلَّا زَیْد (میرے پاس بہت لوگ آئے مگر زید نہیں آیا) صحیح نہیں کیونکہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ کثیر لوگوں میں زید داخل تھا۔ استثناء کو متصل کہہ دیا جائے) نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کثیر لوگوں میں زید داخل نہ تھا (کہ استثناء کو منقطع قرار دیدیا جائے)۔

جواب :- آیت کا مطلب اس طرح ہے کہ ان میں سے کسی کے بھی کثیر مشوروں میں کوئی خیر نہیں ہاں صدقہ کا حکم دینے والوں کا مشورہ اس سے مستثنیٰ ہے (لفظ کسی میں چونکہ سب لوگ داخل ہیں اس لئے استثناء متصل ہو جائے گا) لیکن یہ جواب اسی وقت صحیح ہوگا جب نجویٰ کو فاعلی معنی میں نہ لیا جائے ورنہ کلام اس طرح ہوگا لَا خَیْرَ فِیْ کَثِیْرٍ مِّنْ مُّتَنَاجِیْ کُلِّ وَاحِدٍ مِّنْھُمْ اِلَّا مِنْ اَمَرَ۔ اور یہ کلام لغو ہے۔

ظاہر یہ ہے کہ اس جگہ الا استثنائی نہیں وصفی ہے یعنی غیر کا مرادف ہے۔ جیسے آیت لَوْ کَانَ فِیْھِمَا اٰلِھَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا میں اِلَّا غیر کے معنی میں ہے۔

اَوْ مَعْرُوْفٍ یا کسی نیک کام کا۔ معروف وہ اچھا کام جس کی اچھائی شریعت کی رو سے معلوم ہوگئی ہو بعض علماء کا قول ہے کہ صدقہ سے مراد ہے فرض زکوٰۃ اور معروف سے مراد ہے قرض۔ صدقہ نفل اور امداد مصیبت زدگان۔

اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَیْنَ النَّاسِ یا لوگوں میں صلح کرانے کا۔ اصلاح کا عطف معروف پر ہے۔ معروف (عام نیکی) کے اندر اصلاح (لوگوں میں صلاح کرا دینا) بھی داخل ہے مگر اس کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر الگ کر دیا گیا۔ یا یوں کہا جائے کہ اصلاح بین الناس کی بعض صورتیں معروف نہیں ہوتیں مگر شرعاً جائز ہوتی ہیں جیسے جھوٹ بولنا (مسلمانوں میں صلح کرانے کے لئے جائز ہے اگرچہ اس کو معروف نہیں کہا جاسکتا)

حضرت ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط (جو مہاجرین سابقین میں سے تھیں) کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو لوگوں میں صلح کرائے اور کوئی اچھی بات (اپنی طرف سے) کہہ دے یا کوئی اچھی بات (اپنی طرف سے بنا کر دوسرے کو) پہنچا دے۔ متفق علیہ۔ حضرت ابو درداء کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تم کو ایسی بات بتاؤں جس کا مرتبہ روزے خیرات اور نماز سے بھی بڑھ کر ہے۔ ہم نے عرض کیا ضرور فرمائیے۔ فرمایا لوگوں کے باہمی تعلقات کو درست کر دینا۔ اور تعلقات باہمی کو خراب کرنا (نیکیوں کو) مونڈنے والا (ملیامیٹ کر دینے والا) ہے۔ رواہ ابو داؤد والترمذی، ترمذی نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

حضرت اسماءؓ بنت یزید راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جھوٹ بولنا ناجائز ہے سوائے تین مواقع کے۔ بیوی کو راضی کرنے کے (یا خوش رکھنے کے) لئے مرد کا جھوٹ بولنا۔ لڑائی میں جھوٹ بولنا اور لوگوں میں صلح کرانے کے لئے جھوٹ بولنا۔ رواہ احمد والترمذی۔

وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ اور جو شخص یہ بات کرے گا۔ یعنی مذکورہ امور میں سے کسی ایک امر کے کرنے کا مشورہ دے گا یا مذکورہ امور میں سے کوئی ایک کام کرے گا۔ یعنی صدقہ دے گا یا کوئی بھلائی کرے گا یا لوگوں میں صلح کرائے گا۔ اول مطلب زیادہ واضح ہے۔ مگر بیضاوی نے دوسرے مطلب کو ترجیح دی ہے اور صراحت کی ہے کہ کلام کا آغاز تو (تینوں امور کے متعلق) مشورہ دینے سے کیا گیا اور آخر میں انہی تینوں امور کے کرنے کی جزاء پر کلام کو ختم کر دیا گیا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ

جب مذکورہ امور کا مشورہ دینے والا نیکوکاروں میں داخل ہے تو ان امور کو کرنے والا بدرجہ اولیٰ داخل ہوگا۔ اصل غرض تو عمل سے ہے۔ مشورہ تو عمل کا ذریعہ ہے (اور اچھے کام کا ذریعہ بھی اچھا ہی ہوتا ہے اس لئے مشورہ کا ذکر ذیلی طور پر آگیا ہے)۔

اِبْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ اللہ کی رضامندی کی طلب میں نیکی کرنے کے لئے طلب رضا کی شرط اس لئے لگائی کہ دکھاوٹ اور شہرت کے لئے بھلائی کرنے والا ثواب کا مستحق نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث انما الاعمال بالنیات متفق علیہ ہے۔

فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾ تو ہم اس کو ضرور بڑا ثواب عطا کریں گے جس کے مقابلہ میں دنیا کا سارا مال و متاع حقیر ہے۔ شیخین نے صحیحین میں نیز امام احمد نے حضرت ابو شریح خزاعی کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اللہ اور روز آخرت کو مانتا ہو اس کو چاہئے کہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے۔ بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ رحمت کرے اس شخص پر جو (اگر) کچھ بات کرے تو فائدہ کی کرے یا خاموش رہے تو (مضرت سے) بچا رہے۔

نیک لوگوں کی جزاء کے ذکر کے بعد آئندہ آیت میں بدوں کی سزا کا ذکر فرماتا ہے۔ اور ارشاد فرماتا ہے۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ اس کو امر حق ظاہر ہو چکا تھا۔

یعنی دلیل یقینی سے ثابت ہونے اور قطعی طور پر معلوم ہونے کے بعد کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا حکم ہے جو شخص فرمان رسول کی مخالفت کرے گا۔ یہ شرط لگانے کی وجہ یہ ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ کے فرمان کی کسی کو اطلاع نہ پہنچے یا اطلاع پہنچ جائے مگر ذریعہ اطلاع اور سلسلہ روایت یقینی نہ ہو اور اس صورت میں یہ شخص رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے خلاف کرے یا انتہائی ذہنی کوشش کے بعد بھی مراد حدیث سمجھنے میں مجتہد سے غلطی ہو جائے تو ایسا شخص آیت کے حکم میں داخل نہیں ہے۔ بعض علماء نے مخالفت رسول سے مراد لیا ہے مرتد ہو جانا یعنی جو شخص ظہور توحید و رسالت کے بعد دین سے لوٹ جائے گا جیسا طعمہ کے متعلق روایت میں آیا ہے۔

وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ اور مومنوں کے رستہ کے علاوہ دوسرے راستہ پر چلے گا۔ یعنی اس اعتقاد اور عمل کے خلاف چلے گا۔ جس پر تمام اہل ایمان کا اجماع ہے اگر بعض مسلمانوں کے عقیدہ و عمل کے خلاف ہو جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ بشرطیکہ کسی دوسرے مومن کے طریقہ کی موافقت ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے میرے صحابہؓ ستارو کی طرح ہیں جس کی پیروی کرو گے منزل مقصود پر پہنچ جاؤ گے۔

نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى تو ہم اس کو جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے۔ یعنی جس گمراہی کو اس نے اختیار کر رکھا ہے ہم وہی اس کو دیدیں گے اور اس کی پسندیدہ غرض میں رکاوٹ نہیں ڈالیں گے بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ وہ دنیا میں جس چیز پر اعتماد رکھتا ہے آخرت میں ہم اس کو اسی کے سپرد کر دیں گے۔ صحیحین میں حضرت ابو سعیدؓ خدری اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو ایک اعلانچی اعلان کرے گا۔ جو لوگ جس کی پوجا کرتے تھے اس کے پیچھے چلے جائیں۔ اس نداء کے بعد جو کوئی بھی اللہ کے سوا کسی بت یا استھان کی پوجا کرتا تھا بغیر آگ میں گرے نہیں رہے گا۔

وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ اور ہم اس کو جہنم میں داخل کریں گے وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾ اور جہنم (حق سے روگردانی کا) برا انجام ہے۔ ۱؎ *

بغوی نے لکھا ہے اس آیت کا نزول طعمہ بن ابیرق کے متعلق ہوا تھا۔ صورت یہ ہوئی کہ طعمہ کی چوری جب کھل گئی تو اس کو اپنی رسوائی اور ہاتھ کاٹے جانے کا اندیشہ ہوا اس لئے بھاگ کر مکہ چلا گیا اور دین سے لوٹ گیا۔ اس پر آیت وَمَنْ يُّشَاقِقِ

ع ۱۷ / ۱۴

* نوٹ حاشیہ نمبر ۱ اگلے صفحہ (نمبر ۱۷۸) پر ملاحظہ فرمائیے۔

الرَّسُوْلَ نازل ہوئی اس آیت میں وعید عذاب کو دو شرطوں کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ مخالفت رسول اور اتباع غیر سبیل المومنین۔ مخالفت رسول تو تنہا بھی حسب نصوص قطعیہ موجب عذاب ہے۔ دوسری شرط موجود ہو یا نہ ہو لہٰذا رسولوں کے اجماعی راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستہ پر چلنا بھی بجائے خود موجب وعید ہوگا گویا دونوں شرطوں کا مجموعہ اگر موجود نہ بھی ہو صرف ایک شرط موجود ہو تب بھی وعید عذاب اس پر مرتب ہوگی اس سے معلوم ہوا کہ (جس طرح مخالفت رسولؐ حرام ہے اسی طرح) اجماع کی مخالفت بھی حرام ہے لہٰذا اتباع اجماع واجب ہے۔

بیہقی اور ترمذی نے حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ اس امت کو کبھی گمراہی پر مجتمع نہیں کرے گا۔ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے جو جماعت سے بچھڑا وہ بچھڑ کر دوزخ میں گیا۔ واللہ اعلم۔

بغوی نے لکھا ہے کہ طعمہ بن ابیرق (مدینہ سے بھاگ کر) مکہ میں قبیلہ بنی سلیم کے ایک شخص کے پاس جس کا نام حجاج بن علاط تھا جا کر ٹھیرا اور اسی کے گھر میں نقب لگایا نقب لگانے میں ایک پتھر اس کے اوپر گر پڑا جس کی وجہ سے ایسا پھنس کر رہ گیا کہ نہ اندر گھس سکتا تھا نہ باہر نکل سکتا تھا۔ صبح کو پکڑا گیا۔ لوگوں نے قتل کر دینا چاہا لیکن بعض لوگوں نے کہا یہ تمہارے پاس پناہ گزین ہو کر آیا ہے اس کو چھوڑ دو لوگوں نے چھوڑ دیا اور مکہ سے نکال دیا مکہ سے نکل کر وہ قبیلہ بنی قضاعہ کے تاجروں کے ساتھ شام کو چلا گیا۔ جب ایک جگہ پڑاؤ ہوا تو اس نے قافلہ والوں کا ہی کچھ سامان چرا لیا اور بھاگ گیا۔ لوگوں نے تلاش کی اور پکڑ کر سنگسار کر دیا اور اتنے پتھر مارے کہ وہ پتھر ہی اس کی قبر بن گئے۔ یہ بھی ایک روایت میں آیا ہے کہ جدہ کو جانے کے لئے وہ ایک کشتی میں سوار ہوا اور کشتی کے اندر اشرفیوں کی تھیلی چرالی اور پکڑا گیا۔ آخر سمندر میں پھینک دیا گیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حرہ بنی سلیم میں جا کر ٹھیرا اور بنی سلیم کے بت کی پوجا کرنے لگا اور اسی حالت میں مر گیا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۭ اللہ اپنے ساتھ شرک کئے جانے کو معاف نہیں کرے گا اور شرک کے علاوہ (ہر گناہ صغیرہ ہو یا کبیرہ) جس کو معاف کرنا چاہے گا معاف کر دے گا۔ خواہ توبہ کے بعد ہو یا توبہ کے بغیر ہو۔

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ اور (واجب الوجود قرار دینے میں یا معبود ماننے میں) جو کوئی کسی کو اللہ کا ساجھی قرار دیتا ہے

فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾ وہ (راہ حق سے) دور بھٹک جاتا ہے۔ نجات اور مغفرت تک اس کی رسائی ممکن نہیں۔

بغوی نے بروایت ضحاک حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول ایک بوڑھے اعرابی کے حق میں ہوا تھا جس نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا تھا یا رسول اللہ میں گناہوں میں غرق ہوں اتنی بات ضرور ہے کہ جب سے میں نے خدا کو پہچانا اور مانا ہے اس وقت سے کسی چیز کو اس کا شریک نہیں قرار دیا اور نہ اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو کارساز مانا اور نہ اللہ کے خلاف جری ہو کر گناہوں کا ارتکاب کیا نہ میرے دماغ میں کبھی یہ بات آئی کہ میں اللہ سے بھاگ کر بے بس کر دوں گا۔ اب میں (گناہوں پر) پشیمان ہوں توبہ کرتا ہوں معافی چاہتا ہوں میرا کیا حال ہوگا۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی ثعلبی نے ضحاک کی یہ روایت بیان کی ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ اہل مکہ کے متعلق آیت ذیل نازل ہوئی۔

اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ وہ نہیں عبادت کرتے ہیں اللہ کو چھوڑ کر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا دعا

---

[1] مالک کی روایت ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا، یا رسول اللہ ﷺ نے اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء نے کچھ طریقے مقرر کر دیئے ہیں جن پر عمل کرنے سے اللہ کی کتاب کی تصدیق اللہ کی طاعت کی تکمیل اور اللہ کے دین کی قوت ہوتی ہے کسی کو ان کے بگاڑنے اور بدلنے کی اجازت نہیں اور نہ ان چیزوں پر غور کرنے کی اجازت ہے جو آپ کے طریقوں کے مخالف ہیں جو ان راستوں پر چلے گا ہدایت یاب ہوگا اور جو ان پر چل کر طلب گار نصرت ہوگا اس کو نصرت عطا کی جائے گی اور جو ان کے خلاف کرے گا وہ مومنوں کے راستہ کے علاوہ دوسرے راستہ پر چلے گا اور جس چیز کو وہ اختیار کرے گا اللہ وہی اس کو دے گا اور جہنم میں داخل کرے گا اور جہنم برا ٹھکانا ہے۔

عبادت ہے پھر حضور صلعم نے آیت وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ تلاوت فرمائی۔ رواہ احمد واصحاب السنن الاربعہ۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ جو کسی کی پوجا کرتا ہے وہ اسی کو اپنی حاجات کے لئے پکارتا ہے۔

اِلَّآ اِنٰثًا مگر چند زنانی چیزوں کی۔ اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ اناث سے مراد بت ہیں۔ بتوں کو اناث کہنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ عرب اپنے بتوں کو مونث (مادہ) ہی جانتے تھے اور ان کے ناموں کے لئے مونث کے صیغے ہی استعمال کرتے تھے مثلاً مناۃ، عُزّٰی، اللّات (شاید حضرت مفسرؒ کا اس تمثیل سے اشارہ اس طرف ہے کہ مناۃ منان کا اور اللات اللہ کا مونث ہے جیسے عزی بروزن فُعلٰی اعزّ کا مونث ہے) اور کسی قبیلہ کے بت کو کہتے تھے فلاں قبیلہ کی دیوی فلاں قبیلہ کی مونث حضرت ابی بن کعبؓ نے اِلَّآ اِنٰثًا کی تشریح میں فرمایا صنمًا جنیۃً (دیوی پری) رواہ ابن ابی حاتم وابن المنذر و عبداللہ بن احمد فی زوائد المسند۔

یا یہ وجہ ہے کہ ان کے معبودوں کی کوئی حقیقت تو تھی نہیں صرف نام ہی نام تھے جن کی وہ پوجا کرتے تھے اللہ نے فرمایا ہے مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْھَا اور نام مونث تھے اس لئے اناث فرمایا۔ یا یہ وجہ کہ معبود جمادات تھے (پتھروں کے پیتل کے یا اور کسی دھات کے) اور اناث کا اطلاق جمادات پر ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے۔ اناث انثی کی جمع ہے انثی کی جمع اناثی بھی ہے اور اناث بیجان چیزوں کو بھی کہتے ہیں جیسے درخت پتھر اور چھوٹی بیلیں۔ اس وقت اناث کا بتوں پر اطلاق لغت کے اعتبار سے حقیقی ہوگا مجاز کی ضرورت نہ ہوگی۔ علم نحو کی کتابوں میں صراحت ہے کہ الف تاء کے ساتھ کسی واحد کی جمع اور جمع مونث کا نون بے عقل چیزوں کے لئے اصلی (حقیقی لغوی) ہے جیسے کہا جاتا ہے سُفُنٌ جَارِیَاتٌ اور نَخْلٌ بَاسِقَاتٌ اور صِرْنَ الْاَیَّامُ لَیَالِیَ۔ عورتوں کی جمع میں الف تاء کا آنا صرف اس وجہ سے ہے کہ کم عقل ہونے کی وجہ سے گویا ان کو بے عقل چیزوں کی فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔

حسن اور قتادہ نے اِلَّآ اِنٰثًا کی تشریح میں کہا بیجان جن میں روح نہیں جس طرح مونث مذکر کے مقابلہ میں حقیر ہے اسی طرح بے جان جاندار کے مقابلہ میں حقیر ہے اس لئے بیجان کو اناث کے لفظ سے تعبیر کیا۔ اس قول پر بیجان پر اناث کا اطلاق مجازی ہوگا۔ حضرت ابن عباسؓ کی قرآت میں اناثا کی جگہ اثنا آیا ہے۔ اثن اوثان کی جمع ہے اور اوثان وثن کی (وثن کا معنی ہے بت۔ استھان) ضحاک کے نزدیک اناث سے مراد ملائکہ ہیں کیوں کہ مشرک ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ اللہ نے فرمایا ہے وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِکَۃَ الَّذِیْنَ ھُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا۔

وَاِنْ یَّدْعُوْنَ اِلَّا شَیْطٰنًا اور وہ نہیں پوجا کرتے مگر شیطان کی۔ ہر بت میں ایک شیطان ہوتا تھا اور پجاریوں اور کاہنوں کو دکھائی دیتا تھا اور ان سے کلام بھی کرتا تھا۔ ہم اس کا ذکر پہلے کر چکے ہیں۔ بعض کے نزدیک شیطان سے ابلیس مراد ہے ابلیس نے ہی مشرکوں کو بت پرستی کا حکم دیا تھا بت پرستی میں در حقیقت ابلیس ہی کی عبادت اور طاعت تھی۔

مَّرِیْدًا ﴿۱۱۷﴾ جو سرکش ہے۔ مارد اور مرید وہ (شریر) جس کا تعلق خیر سے نہ ہو۔ مرد (میم راء دال کا مجموعہ) کا لغوی معنی ہے چکناپن (یعنی کھردرا نہ ہونا) صرح ممرد صاف چکنا محل۔ امرد بے ڈاڑھی مونچھ کا لڑکا۔ اس جگہ مرید سے مراد ہے سرکش۔ اللہ کی اطاعت سے خارج ہونے والا۔

لَّعَنَہُ اللّٰہُ ۘ جس کو اللہ نے اپنی رحمت سے دور کر دیا تھا۔ شیطانًا کی پہلی صفت مریدًا ہے اور دوسری صفت یہ جملہ۔

وَقَالَ اور شیطان نے کہا تھا اس کا عطف لعن پر ہے گویا شیطان ایک تو ملعون ہے دوسرے ایسے قول کا قائل بھی ہے جو انتہائی انسان دشمنی پر دلالت کر رہا ہے۔ شیطان کا یہ قول دلالت کر رہا ہے کہ آیت میں لفظ شیطانًا سے مراد ابلیس ہے کیونکہ ابلیس ہی نے جب حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور اللہ نے اس پر لعنت کی تو اس نے کہا قسم ہے تیری عزت وجلال کی جب تک بنی آدم میں جان رہے گی اس وقت تک برابر میں ان کو بہکاتا رہوں گا۔ صحیح حدیث میں یہی مضمون آیا ہے اور آئندہ آیت کا بھی یہی معنی ہے۔

وقف لازم

لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۱۱۸﴾ کہ میں تیرے بندوں میں سے اپنا مقرر حصہ (گمراہ کرنے کے لئے) ضرور لوں گا۔

حسن نے کہا ہر ہزار میں سے ۹۹۹ دوزخ کو اور ایک جنت کو جائے گا۔ میں کہتا ہوں حدیث بعث النار میں ایسا ہی آیا ہے۔ یا مفروضا کا معنی ہے جدا۔ الگ یعنی خوش نصیبوں سے الگ بد بختوں کی جماعت۔

وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ اور ضرور (راہ حق سے) ان کو بھٹکاؤں گا یعنی ان کے دلوں میں وسوسے ڈالوں گا اور خواہشات نفس کو آراستہ پیراستہ شکل میں ان کے سامنے لاؤں گا۔ گمراہ کرنے کی نسبت شیطان کی طرف مجازی ہے (حقیقت میں گمراہ کرنے والا اور ہدایت یاب بنانے والا اللہ ہی ہے شیطان تو گمراہی کا ایک ذریعہ ہے)۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے بعض لوگوں کے پاس شیطان آکر کہتا ہے اس کو کس نے پیدا کیا (پھر) اس کو کس نے پیدا کیا (بندہ کہتا چلا جاتا ہے کہ سب کو رب نے پیدا کیا) آخر شیطان کہتا ہے تیرے رب کو کس نے پیدا کیا لہٰذا اگر کوئی اس درجہ تک پہنچ جائے تو اس کو اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے (کیونکہ یہ توہم شیطانی توہم ہے) اور اپنے توہم سے) باز آجانا چاہئے۔ رواہ البخاری و مسلم فی صحیحہما۔

وَّلَاُمَنِّيَنَّهُمْ اور میں یقیناً ان کو (باطل) ہوسیں دلاؤں گا کہ نہ قیامت ہوگی نہ عذاب ہوگا اور زندگی ابھی بہت لمبی ہے اور باوجود عصیاں کوشی کے سعادت آخرت تم کو ملے گی۔

حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انسان کے اندر جہاں خون دوڑتا ہے شیطان بھی وہاں دوڑتا ہے رواہ البخاری و مسلم۔ حضرت ابن مسعود راوی ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا آدمی کو ایک کچو کا شیطان کا اور ایک کچو کا فرشتہ کا ہوتا ہے۔ شیطان کا کچوکا تو شر کا آرزومند کرنا اور حق کو جھٹلاتا ہے اور فرشتہ کا کچوکا خیر کا وعدہ دلانا اور حق کی تصدیق کرنا ہے۔ اگر کسی کو یہ چیز مل جائے تو یقین کرلے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور اللہ کا شکر کرے اور اگر دوسری چیز محسوس کرے تو شیطان سے اللہ کی پناہ مانگے اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ رواہ الترمذی و قال حدیث غریب۔

وَّلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ اور میں ان کو تعلیم دوں گا جس سے وہ چارپایوں کے کانوں کو کاٹا کریں گے۔ بتک (مصدر ثلاثی مجرد) کا ٹنا چیرنا پھاڑنا۔ تبتیک (باب تفعیل۔ مصدر ثلاثی مزید) بکثرت چیرنا، بار بار چیرنا، جانوروں کے کان چیرنے سے مراد ہے۔ بحیرہ کے کان کاٹنا چیرنا (جس طرح اہل جاہلیت کیا کرتے تھے قتادہ اور سدی نے کہا اہل جاہلیت بحیرہ جانوروں کے کان اپنے بتوں (کی نذر) کے لئے چیر دیا کرتے (اور بتوں کے نام پر چھوڑ دیا کرتے تھے) قاموس میں ہے۔ بحر کا معنی ہے پھاڑنا اور کان چیرنا بحیرہ لفظ بحر سے ہی مشتق ہے۔ اگر کوئی اونٹنی دس جھول بیاہ جاتی تو وہ لوگ اس کا کان چیر کر آزاد چھوڑ دیتے کہ جہاں چاہے چرتی پھرے (کہیں اس کی پکڑ نہ تھی) اگر وہ مر جاتی تو اس کا گوشت عورتوں کے لئے ممنوع اور مردوں کے لئے جائز ہوتا تھا (اس اونٹنی کو بحیرہ کہا جاتا تھا) گویا شیطان نے اپنے اس قول میں اس طرف اشارہ کیا کہ میرے حکم کے مطابق وہ اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام بنالیں گے اور جو جانور بالفعل یا بالقوۃ کامل پیدا کیا گیا ہے اس کو ناقص بنادیں گے۔

وَّلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۚ اور یقیناً میں ان کو حکم دوں گا تو وہ اللہ کی بناوٹ کو بدل ڈالیں گے۔ خواہ یہ تغیر صورت کے اعتبار سے ہو یا حالت کے لحاظ سے۔ ؎

تغیر خلق اللہ میں مندرجہ ذیل امور داخل ہیں حامی (نرسانڈ) کی ایک آنکھ پھوڑ دینا (جیسا کہ مشرک کرتے تھے)

؎ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ کی لعنت گودنے والیوں اور گدھوانے والیوں اور موچنے سے سفید بال نوچنے والیوں اور دانتوں کی جھریاں بنانے والیوں پر جو اللہ کی بناوٹ میں تبدیلی کرتی ہیں، رواہ احمد والشیخان عن ابن مسعودؓ شیخین نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا اللہ کی لعنت بال جوڑنے والیوں اور جڑوانے والیوں پر اور گودنے والی اور گدوانے والیوں پر امام احمد نے حضرت عائشہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ لعنت کرتے تھے گودنے والی گدوانے والی، بال جوڑنیوالی اور جڑوانے والی پر۔ (باقی آئندہ صفحہ)

غلاموں کو خصی بنانا۔ گودنا (یعنی سوئی سے گود کر اس میں کاجل بھرنا تاکہ کھال پر بیل بوٹے یا کسی مندر وغیرہ کی تصویر کھد جائے) دانتوں کو ریت کر تیز کرنا (لاش کو) مثلہ کرنا (یعنی ناک کان یا ہاتھ پاؤں کاٹ دینا) لواطت یا عورتوں کا آپس میں سحق کرنا، چاند سورج اور پتھروں درختوں دریاؤں وغیرہ) کی پوجا کرنا، ہاتھ پاؤں اور بدنی طاقتوں کو ان کاموں میں صرف کرنا جو نفس میں کسی طرح کا کمال پیدا کرنے والے نہ ہوں۔ فطرت خداوندی یعنی اسلام کو بگاڑ دینا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنادیتے ہیں جس طرح چوپایوں کا بچہ پورے اعضا کا پیدا ہوتا ہے (نہ دم کٹا ہوتا ہے نہ کان چرا نہ خصی) کیا تم (پیدائشی طور پر کسی جانور کے بچہ کے) ناک، کان، لب، ہاتھ، پاؤں کٹے ہوئے پاتے ہو۔ اس بیان کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا تھا فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ۔ رواہ البخاری و مسلم فی صحیحھما

یہ بھی جائز ہے کہ مذکورہ بالا پانچوں جملوں میں خود شیطان کے اپنے افعال کا بیان ہو اس صورت میں یہ قول ابلیس لعین کے ساتھ مخصوص نہ ہوگا۔

شرک پرلے درجہ کی گمراہی ہے اس کی دلیل اللہ نے یہ بیان فرمائی کہ جن چیزوں کو تم اللہ کا شریک قرار دیتے ہو وہ خود بیجان ہیں نہ کسی کو نفع پہنچا سکتی ہیں نہ نقصان بلکہ ان کے نام بھی تم نے زنانے رکھ چھوڑے ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں۔ پھر شرک کرنے میں شیطان مردود کی اطاعت بھی ہے جو خود شر و گمراہی میں غرق ہے خیر و ہدایت کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور ملعون بھی ہے۔ اس کی اطاعت سے سوائے لعنت اور گمراہی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ وہ انسان کا بدترین دشمن اور تباہ کن بھی ہے ایسے کی دوستی ہی عقل سے بعید اور سراسر گمراہی ہے عبادت تو بجائے خود ہی۔

وَمَنْ یَّتَّخِذِ الشَّیْطٰنَ وَلِیًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اور جو شخص خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا رفیق بنائے گا یعنی جو شیطان کو اپنا رب بنائے گا کہ اللہ کے حکم کے خلاف شیطان کے حکم کو مانے گا۔ آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ شرک کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنا مقبول نہیں۔ اللہ کی شرک آمیز عبادت در حقیقت اللہ کی عبادت نہیں غیر کی عبادت ہے۔ اللہ کی عبادت غیر کی عبادت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے ارشاد فرمایا ہے میں تمام شریکوں سے زیادہ شرک سے غنی ہوں جو شخص اپنے عمل میں میرے ساتھ دوسروں کو شریک کرتا ہے میں اس کو اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں۔ دوسری روایت میں آیا ہے میں اس سے بری ہوں۔ اس کا عمل اسی (شریک) کے لئے ہے جس کے لئے اس نے کیا ہے۔ رواہ مسلم۔

فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِیْنًا ﴿۱۱۹﴾ تو وہ کھلا ہوا گھاٹا اٹھائے گا کیونکہ وہ اپنی اصل پونجی بھی کھودے گا اور جنت کے عوض دوزخ مول لے گا۔

یَعِدُھُمْ شیطان ان کو وعدے دیتا ہے یعنی دماغوں میں فاسد خیالات پیدا کرتا ہے یا اپنے دوستوں کی زبانی ایسے وعدے کراتا ہے جن کو وہ کبھی پورا نہیں کرتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شیطان خود آدمی کی شکل میں آکر کامیابی کے لالچ دیتا ہو جیسا

حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ جانوروں کو خصی کرنے سے منع کرتے تھے اور فرماتے تھے نماء (بڑھوتری) تو نروں میں ہی ہے (ان کی تنقیص درست نہیں) امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جانوروں کو خصی کرنے میں کوئی گناہ نہیں (ہدایہ) کذا روی عبد الرزاق و عبد بن حمید عن الحسن و کذا روی ابن ابی شیبۃ و ابن المنذر عن محمد بن سیرین و الحسن، لیکن ابن ابی شیبہ اور بیہقی اور ابن المنذر کی روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت عمرؓ جانوروں کو خصی کرنے سے منع فرماتے تھے، ابن المنذر اور بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جانوروں کو خصی کرنے سے منع فرمایا ہے، ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول (اتنا زائد) نقل کیا ہے کہ اسی کے متعلق آیت وَلَاٰمُرَنَّھُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰہِ نازل ہوئی لیکن ابن جریر اور ابن المنذر اور ابن ابی حاتم کی روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے وَلَاٰمُرَنَّھُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰہِ کی تشریح میں فرمایا کہ خلق اللہ سے مراد دین اللہ ہے۔

جنگ بدر میں کیا تھا اور کہا تھا لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ آج تم پر کوئی غلبہ پانے والا نہیں میں ضامن ہوں لیکن فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتَانِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ جب دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا تو ایڑیاں موڑ کر بھاگ گیا اور کہنے لگا آج تمہاری کوئی حمایت نہیں کر سکتا مجھے اللہ کی طرف سے وہ چیزیں نظر آرہی ہیں جو تم کو نظر نہیں آتیں۔

وَيُمَنِّيهِمْ ۖ اور ان کو امیدیں دلاتا ہے، باطل امیدیں جن کو وہ کبھی نہیں پاتے مثلاً طول عمر اور کثرت مال کی امیدیں۔

وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝۱۲۰ اور شیطان کا وعدہ محض فریب ہی ہوتا ہے۔

نقصان رساں فعل کو نفع بخش اور سود مند کام کو ضرر آفریں بناتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ یعنی شیطان تم کو افلاس سے ڈراتا ہے کہتا ہے اگر اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے یا رشتہ داروں کو دو گے تو محتاج ہو جاؤ گے۔

اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۡ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ۝۱۲۱ یہی ہیں وہ جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور یہ اس سے چھٹکارا یا مفر نہیں پائیں گے۔ مَحِيص (مصدر) بھاگنا (ظرف مکان) بھاگنے کی جگہ قاموس میں ہے۔ حَاصَ عَنْهُ يَحِيْصُ حَيْصًا وَحَيْصَةً وَ مَحِيْصًا (یعنی حاص باب ضرب سے آتا ہے اور اس کا مصدر حَيْصٌ حَيْصَةٌ اور مَحِيْصٌ ہے اور اگر اس کے بعد عن آئے تو اعراض کرنے اور مڑ جانے کے معنی ہوتے ہیں لیکن اگر عن نہ آئے اور بغیر کسی صلہ کے استعمال کیا جائے تو اس کا معنی ہوتا ہے سینا جیسے حَاصَ عَيْنَيْهِ اس کی دونوں آنکھوں کو سی دیا یعنی نیند نے اس کی آنکھیں بند کر دیں۔ مترجم عنھا کا تعلق مَحِيْصًا سے نہیں ہے کیونکہ مَحِيْص مصدر ہو یا ظرف دونوں صورتوں میں اس کا معمول مقدم نہیں ہو سکتا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے ہم ان کو ضرور جنتوں میں داخل کریں گے جن کے محلات اور بالا خانوں کے نیچے سے نہریں بہتی جاری ہوں گی ان جنتوں میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ اللہ نے (اس کا) سچا وعدہ کیا۔ وَعْدَ اور حَقًّا مفعول مطلق ہیں تاکید کے لئے۔

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ۝۱۲۲ اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ بات کا سچا کون ہے یعنی کوئی بھی اللہ سے زیادہ سچی بات والا نہیں ہے (استفہام انکاری ہے) استفہام کے پیرایہ میں نفی کرنے سے نفی میں کامل قوت پیدا ہو گئی۔ آیت کا مقصد ہے شیطان کے جھوٹے وعدوں اور اللہ کے سچے وعدہ میں تقابلی موازنہ کو ظاہر کرنا۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے کہا تھا کہ ہمارے سوا کوئی جنت میں نہیں جائے گا اور قریش نے حشر و نشر کا ہی انکار کر دیا تھا اس پر اللہ نے آیات ذیل نازل فرمائیں۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ حقیقت امر تمہاری آرزوؤں سے وابستہ نہیں ہے۔ یعنی اے اہل مکہ تم میں سے جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ حشر و نشر کچھ نہ ہوگا اور بعض کہتے ہیں کہ اللہ کے پاس یہ بت ہمارے سفارشی ہوں گے اور بعض کہتے ہیں کہ تمہارے خیال کے مطابق اگر دوبارہ زندگی ہوئی تب بھی ہم تم سے اچھے حال میں ہوں گے۔ حقیقت امر تمہارے ان اندازوں سے وابستہ نہیں ہے۔ سیاق آیت دلالت کر رہا ہے کہ خطاب اہل مکہ کو ہے۔ مجاہد کا یہی قول ہے۔

وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ اور نہ حقیقت امر اہل کتاب کے مفروضات سے وابستہ ہے۔

اہل کتاب سے مراد ہیں یہودی اور عیسائی جو کہتے تھے کہ ہم اللہ کے چہیتے اور بیٹے ہیں اور جنت میں یہودیوں اور عیسائیوں کے علاوہ کوئی نہیں جائے گا۔ اور آگ صرف چند روز ہم کو چھوئے گی۔ بلکہ نجات اور ثواب کا مدار ایمان اور نیک اعمال پر ہے اور گرفتاری و عذاب کفر و بد اعمالی سے وابستہ ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ۔

مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ جو برے کام یعنی کفر و گناہ کرے گا اس کی سزا اس کو دی جائے گی۔

وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ اور اللہ کو چھوڑ کر وہ اپنے لئے نہ یار پائے گا۔ جو اس کو کسی طرح کی خیر پہنچا سکے۔ نہ مددگار جو اس کی طرف سے شر کو دفع کر دے۔ آیت کا سبب نزول خواہ خاص ہو مگر حکم عام ہے مومن ہو یا کافر سب کو شامل ہے کیونکہ الفاظ کے عموم کا اعتبار ہے (واقعہ کا خصوص معتبر نہیں) خیالات مذکورہ بے شک اہل مکہ اور اہل کتاب کے تھے (مسلمانوں کے نہ تھے) مگر ضابطہ عمومی ہے بغوی نے حضرت ابن عباسؓ اور سعید بن جبیرؒ کا قول یہی نقل کیا ہے۔

کئے کی سزا پانے کی صراحت عدم مغفرت کے ساتھ مشروط ہے وعید عذاب کی تمام آیات کی یہ شرط ہے کہ اگر اللہ معاف نہیں کر دے گا تو عذاب ہوگا۔ پھر سزا عام ہے آخرت میں ملے یا دنیا میں۔ حضرت عبادہؓ بن صامت کی روایت میں آیا ہے کہ صحابہؓ کی جماعت رسول اللہ ﷺ کے آس پاس بیٹھی ہوئی تھی کہ آپ نے فرمایا میری بیعت کرو کہ کسی چیز کو اللہ کا شریک نہ کرو گے چوری نہیں کرو گے زنا نہیں کرو گے اپنی اولاد کو قتل نہیں کرو گے کسی پر تہمت تراشی دیدہ ودانستہ نہیں کرو گے اور کسی اچھے کام (کے معاملہ) میں نافرمانی نہیں کرو گے پس تم میں سے جو شخص اس عہد کو پورا کرے گا تو اس کے اجر کا اللہ ذمہ دار ہے اور اگر کچھ (گناہ) کرے گا اور دنیا میں اس کو سزا مل جائے گی تو اس کے گناہ کی معافی ہو جائے گی لیکن اگر کسی نے کوئی نافرمانی کی پھر اللہ نے اس کا پردہ ڈھانکے رکھا تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے چاہے معاف کر دے چاہے سزا دے ہم نے ان شرائط پر حضور ﷺ کی بیعت کی صحیحین۔

بعض لوگ کہہ سکتے ہیں کہ آیت وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا کا حکم صرف کافروں کے ساتھ مخصوص ہے اہل ایمان سے اس کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ مسلمانوں کا کارساز اور مددگار خود ان کا مولیٰ ہے وہ چاہے گا تو بخش دے گا پھر اللہ کی اجازت سے فرشتے انبیاء اور اولیاء ان کی شفاعت بھی کریں گے مگر وہ کارساز اور دافع عذاب نہ ہوں گے نہ اہل ایمان ان کو کارساز اور حامی بنائیں گے البتہ کفار اپنے اپنے معبودوں سے کارسازی اور حمایت کے خواستگار ہوں گے مگر کوئی کارساز نہیں ملے گا۔

یہ قول غلط ہے آیت کے عموم کو مندرجہ ذیل روایت ثابت کر رہی ہے حضرت ابوبکرؓ صدیق کا بیان ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا کہ آیت فَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ نازل ہوئی اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابوبکرؓ میں تم کو ایک آیت سناؤں جو مجھ پر نازل ہوئی ہے میں نے عرض کیا فرمائیے حضور ﷺ نے مجھے یہ آیت پڑھائی (فوراً سنتے ہی) میری کمر درد سے ٹوٹنے لگی اور میں نے کمر کو سیدھا کیا (ایسا واقعہ اس سے پہلے مجھے کبھی پیش نہیں آیا) حضور ﷺ نے فرمایا ابوبکرؓ کیا ہو گیا کیا ہو گیا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ حضور ﷺ پر قربان ہم میں سے کس نے کوئی برا عمل نہیں کیا اور ہم کو ہر کئے ہوئے گناہ کی سزا ضرور دی جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اور تمہارے ساتھی مومن دنیا ہی میں برائی کی سزا پالیں گے۔ اللہ کے سامنے جائیں گے تو گناہ سے پاک ہو کر باقی دوسرے لوگوں کی بدیاں جمع رکھی جائیں گی یہاں تک کہ قیامت کے دن (سب گناہوں کی) ان کو سزا دی جائے گی۔ رواہ البغوی والترمذی و عبد بن حمید وابن المنذر۔

احمد اور ابن حبان اور حاکم کی روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا اس (آیت) کی موجودگی میں کون نجات پا سکتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم پر غم نہیں آتا کیا تم بیمار نہیں ہوتے کیا تم پر مصیبت نہیں آتی، میں نے عرض، ایسا تو ضرور ہوتا ہے فرمایا تو بس وہ (سزا) یہی ہوتی ہے۔ امام احمد، ابویعلیٰ، بیہقی اور تاریخ میں بخاری نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ کلبی نے بروایت ابوصالح حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں کو بڑا شاق ہوا انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ کے علاوہ ہم میں سے کون ہے جس نے کوئی بدی نہیں کی پھر سزا کس

طرح ہو گی۔[1] حضور ﷺ نے فرمایا دنیا میں جو کچھ (دکھ) آتا ہے وہ اسی سزا کی ایک قسم ہے پس جو شخص کوئی ایک نیکی کرے گا اس کی دس نیکیاں (ثواب کے لحاظ سے) ہو جائیں گی۔ اب اگر کسی بدی کی سزا دی گئی تو دس نیکیوں (کے ثواب) میں سے ایک نیکی کا ثواب گھٹ جائے گا اور نو نیکیاں رہ جائیں گی۔ افسوس ہے اس شخص پر جس کی اکائیاں دہائیوں سے بڑھ جائیں گی (اور گناہوں کی تعداد نیکیوں سے بڑھ جائے یعنی ہر نیکی کی دس نیکیاں اس کے لئے لکھی جاتی ہیں اور ہر گناہ ایک ہی لکھا جاتا ہے اور ایک گناہ کی سزا میں ایک نیکی کم ہو جاتی ہے اس طرح دس گناہوں کی پاداش میں دس نیکیاں ساقط ہوتی ہیں جو حقیقت میں دس نہیں بلکہ ایک نیکی ہوتی ہے تو گویا دس گناہوں کا مقابلہ ایک نیکی سے ہوتا ہے اب اگر گیارہ بارہ تیرہ گناہ ہو گئے تو بقدر ایک دو تین کے بیشی ہو جائے گی ایسے شخص کی حالت قابل افسوس ہے یہ تو دنیوی سزا کی حالت ہے)۔

رہا آخرت کا بدلہ تو وہاں نیکیوں اور بدیوں کا توازن کیا جائے گا ہر گناہ کے مقابل ایک نیکی ساقط کر دی جائے گی اس کے بعد اگر نیکی باقی رہی تو جنت میں اس کا ثواب ملے گا اور ہر بیشی والے کو اس کی بیشی ملے گی۔[2]

میں کہتا ہوں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے آیت لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ کا سبب نزول جو ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے وہی روایت اور درایت (عقل) کے لحاظ سے ظاہر ہے لیکن ایک اور سبب نزول بھی روایت میں آیا ہے جس کو ابن جریر نے مسروق قتادہ ضحاک اور سدی کی روایت سے مرسل اور عوفی کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا ہے کہ آیت لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَھْلِ الْکِتٰبِ کا نزول مسلمانوں اور عیسائیوں کے ایک مباحثہ کے متعلق ہوا دوسری روایت میں آیا ہے کہ اہل مذاہب کے مباحثہ کے متعلق ہوا کچھ یہودی اور عیسائی اور مسلمان (ایک جگہ) بیٹھے بحث کر رہے تھے ایک گروہ نے کہا ہم افضل ہیں۔ دوسرے نے کہا ہم افضل ہیں بغوی کے بیان میں آیا ہے کہ اہل کتاب نے کہا ہمارا نبی تمہارے نبی سے پہلے ہے اور ہماری کتاب تمہاری کتاب سے مقدم ہے لہٰذا ہم بنسبت تمہارے خدا سے زیادہ تقرب رکھتے ہیں مسلمانوں نے کہا ہمارے نبی خاتم الانبیاء ہیں اور ہماری کتاب کا فیصلہ سب کتابوں پر لاگو ہے اور ہمارا ایمان تمہاری کتاب پر بھی ہے مگر تمہارا ایمان ہماری کتاب پر نہیں ہے اس لئے ہم افضل ہیں۔ اس شان نزول پر بامانیکم کا خطاب مومنوں کو ہو گا اور مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ کے حکم کا عام ہونا بالکل ظاہر ہو گا۔

ابن جریر نے مسروق کی روایت سے اور بغوی نے اعمش کی روایت سے ابن الضحیٰ کا قول نقل کیا ہے کہ جب آیت لَیْسَ

---

[1] محمد بن منتشرؒ کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جب آیت مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ وَلَا یَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا نازل ہوئی تو ہم مدت تک ایسی حالت میں رہے کہ ہم کو کھانا پینا اچھا نہیں معلوم دیتا تھا بالآخر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی اور اس میں پہلی آیت کے حکم سے محفوظ رہنے کا) ایک پہلو نکال دیا اور فرمایا وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ یَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ یَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا۔

[2] ابن ابی شیبہ اور احمد اور بخاری اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے لکھا ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ مومن پر جو بیماری دکھ خرابی اور غم و فکر آتا ہے اللہ اس کو اس کے گناہوں کا کفارہ کر دیتا ہے، صحیحین وغیرہ میں حضرت عائشہ وغیرہ کی روایت سے بھی ایسا ہی آیا ہے ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے حضرت بریدہؓ اسلمی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے جس کسی مسلمان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے یہاں تک کہ کوئی کانٹا بھی لگتا ہے تو اس کا نتیجہ دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہوتی ہے یا تو اس مصیبت کے عوض اللہ اس کا کوئی گناہ معاف کر دیتا ہے جو بغیر اس کے معاف ہونے والا نہیں ہوتا یا اس کو کسی عزت پر پہنچا دیتا ہے کہ اس جیسی مصیبت کے بغیر اس عزت پر پہنچ نہیں سکتا تھا۔

ابن سعد اور بیہقی نے حضرت ابو فاطمہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ اللہ بندہ کو دکھ میں مبتلا کر دیتا ہے اور یہ صرف اللہ کی طرف سے بندہ پر مہربانی ہوتی ہے جنت کے اندر اس بندہ کو ایسا درجہ عنایت ہو گا جس پر بغیر اس دکھ میں مبتلا ہونے کے اور کسی عمل سے وہ پہنچ نہیں سکتا، بیہقی نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔

بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَا اَمَانِیِّ اَھْلِ الْکِتٰبِ نازل ہوئی تو اہل کتاب نے کہا ہم تم برابر ہیں اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ اور جو شخص بھی کوئی نیک عمل کرے گا مِنَ الصّٰلِحٰتِ میں مِن تبعیضیہ ہے یعنی کچھ بھی نیکی کرے گا کیونکہ دوسری آیت آئی ہے مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ۔

مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی یعنی کرنے والا مرد ہو یا عورت یا وہ نیکی مرد سے صادر ہو یا عورت سے۔ اول صورت میں یہ ٹکڑا یَعْمَلْ کی ضمیر سے حال ہوگا اور مِنْ کا استعمال مَنْ یَّعْمَلْ کے ابہام کو واضح کرنے کے لئے ہوگا (یعنی من تبیینیہ ہوگا) اور دوسری صورت میں الصّٰلِحٰت سے حال ہوگا اور مِنْ ابتدائیہ ہوگا۔ بہر حال دونوں صورتوں میں لفظ اَوْ سے مَنْ یَّعْمَلْ کے حکم کے عموم کی تاکید ہوگی۔ بعض علماء نے بیان کیا کہ مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی میں جو نیک عمل کرنے کی تعمیم ہے اس سے ان مشرکوں کو تنبیہ کرنی مقصود ہے جو اپنی لڑکیوں کو ہلاک کر دیا کرتے تھے (اور یہ سمجھتے تھے کہ عورت بھی ایک جانور ہے اس کا کوئی عمل خیر اور قابل ثواب ہو نہیں سکتا)۔

وَھُوَ مُؤْمِنٌ ایمان دار ہونے کی حالت میں۔ یعنی نیک اعمال کی جزا ایمان پر موقوف ہے۔ برے اعمال کی سزا کے لئے کافر ہونے کی شرط نہیں لگائی کیونکہ گناہ چھوٹا ہو یا بڑا اللہ کو پسند نہیں (کرنے والا کافر ہو یا مومن) گناہ کا تقاضا ہے کہ اللہ معاف نہ فرمادے تو اس کی سزا اسی لئے برے اعمال پر سزا پانے کی وعید عام ہے مومن اور کافر دونوں اس کے ذیل میں آتے ہیں۔ البتہ نیکیاں قابل اعتبار اس وقت ہوں گی جب ایمان کی حالت میں کی جائیں۔ کافروں کا تو کوئی عمل اللہ کے لئے خالص نہیں ہوتا (بلکہ شرک آمیز ہوتا ہے) اور جو عمل خالص اللہ کے لئے نہ ہو وہ شرک اور گناہ ہے نیکی نہیں ہے۔

...... ایک شبہ ......

اگر کافر کا کوئی عمل نیک ہی نہیں ہے تو ایسی حالت میں عمل صالحات کے لئے ایمان کی شرط لگانا ہی بے کار ہے۔ کافر کا تو نیک کام بھی صالحات میں داخل نہیں ہے۔

ازالہ :۔ بے شک بات تو یہی ہے مگر ہو مومن کہنے میں صرف صراحت اور وضاحت کرنی مقصود ہے کہ عمل صالح وہی مقبول ہوگا جو ایمان کی حالت میں ہو۔ اس سے کافروں کے اس خیال کی بھی تردید ہو جائے گی کہ صلہ رحم، کنبہ پروری خیرات اور دوسرے اچھے اعمال کافروں کے لئے بھی مفید ہوں گے اور یہ اعمال خود نیکیاں ہیں (ان کا کرنے والا کوئی ہو اجر کا مستحق ہے)۔

فَاُولٰٓئِکَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ پس یہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ خواہ صالح ہوں یا فاسق یا توبہ کر کے مرے ہوں یا بغیر توبہ کئے۔ جنت میں ابتدائی داخلہ خواہ اس طرح ہو کہ ان کے گناہ معاف کر دیئے جائیں اور دوزخ میں بھیجا ہی نہ جائے یا گناہوں کی سزا پانے کے بعد ہو۔

وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا ﴿۱۲۴﴾ اور ذرہ بھر بھی ان کی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔ نَقِیْر وہ (لمبوترا) گڑھا جو کھجور کی گٹھلی پر ہوتا ہے (مراد حقیر ترین مقدار) آیت کی عبارت بتارہی ہے کہ فرماں بردار کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور بطور دلالۃ النص یہ بات بطریق اولیٰ معلوم ہو رہی ہے کہ گناہ گار کے عذاب میں (مقدار گناہ سے) بیشی نہیں ہوگی کیونکہ ثواب کم دینے میں اتنی اذیت نہیں جتنی جرم سے زائد سزا دینے میں ہے پس جب ارحم الراحمین ثواب میں کمی نہیں کرے گا تو سزا میں بیشی بدرجہ اولیٰ نہیں کرے گا۔

بعض علماء نے بیان کیا کہ کفار کی تہدید عذاب کے لئے آیت مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِہٖ کے بعد وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا کی قید ذکر نہیں کی کیونکہ شرک سے نفرت دلانے کے لئے اس قید کو ترک کرنا ہی مناسب تھا اور مومن کو عمل صالح اور اطاعات کی ترغیب دینے کا تقاضا تھا کہ اس قید کو ذکر کر دیا جائے اس لئے اس کو ذکر کر دیا۔

میں کہتا ہوں کہ آیت وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا کا مطلب یہ ہے کہ کسی طاعت گزار کی طاعت کے ثواب میں کمی نہیں کی جائے گی اور نہ کسی کی بداعمالی کی سزا میں بیشی کی جائے گی اور آیت مَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَھُوَ مُؤْمِنٌ میں تمام مومن داخل ہیں خواہ صالح ہوں یا فاسق کیونکہ فاسق مومن بھی کوئی نہ کوئی عمل صالح کرتا ہی ہے کم سے کم توحید کی شہادت دیتا ہے اور ایمان کی سب سے اعلیٰ شاخ یہی ہے اس لئے اس آیت میں دونوں طرح کے مسلمانوں کو بشارت دیدی خواہ نیک ہوں یا بد کہ کسی مسلمان کے ثواب میں کمی نہیں کی جائے گی اور نہ عذاب میں بیشی ہو گی رہی آیت وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا تو اس کے اندر مؤمن بھی داخل ہیں اور کافر بھی گویا فاسق مومن کا اندراج دونوں جگہ ہے آیت مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا میں بھی اور آیت مَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ میں بھی لیکن کافروں کے گناہوں کی سزا کی کوئی حد اور انتہا ہی نہیں ہے کیونکہ کفر کی برائی اتھاہ ہے اس لئے اس کی سزا بھی لاانتہا ہے پس کفار کے گناہوں کی سزا خواہ کتنی ہی زائد ہو مگر اس کو گناہ سے زائد (اور ظلم) نہیں قرار دیا جاسکتا۔

یا یوں کہا جائے کہ کافروں کی سزا گناہوں سے بڑھ کر ہو گی اللہ نے فرمایا ہے زِدْنٰھُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ اس لئے کافروں کی تہدید عذاب کے ساتھ وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا نہیں فرمایا ورنہ کافروں کے لئے ایک طرح کی بشارت ہو جاتی۔

ایک شبہ

ظلم بہر حال برا ہے خواہ کافروں پر ہی ہو اور اللہ ہر برائی سے پاک ہے پھر گناہ سے زائد کافر کو عذاب دینے کا امکان ہی کیا ہے۔

ازالہ:۔ ظلم نام ہے دوسرے کی ملک میں تصرف کرنے کا اور اللہ مالک الملک ہے وہ جس طرح چاہے اپنی ملک میں تصرف کر سکتا ہے اگر سارے عالم کو بغیر جرم کے بھی عذاب دے تو ظلم نہ ہو گا (اپنی ملک میں تصرف ہو گا)

مزید شبہ:۔ جب اللہ کے لئے کوئی فعل ظلم نہیں اور اس کی شان میں ظلم ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا (خواہ وہ کچھ بھی کرے) تو پھر آیت لَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا اور آیت اِنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ میں نفی ظلم کا معنی ہی کیا ہے۔

جواب:۔ اس قسم کے کلام کی بناء مجازی معنی پر ہے مراد یہ ہے کہ مومنوں سے اللہ کوئی ایسا سلوک نہیں کرے گا کہ اگر ویسا سلوک کوئی دوسرا ان سے کرے تو اس کو ظلم کہا جاتا ہے (یعنی جو عمل کسی انسان یا فرشتے سے اگر صادر ہو اور اس کو ظلم کہا جائے تو اللہ مومنوں کے ساتھ ایسا برائے نام بھی ظلم نہیں کرے گا)۔

بغوی نے مسروق کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جب آیت لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ نازل ہوئی تو اہل کتاب نے کہا ہم اور تم برابر ہیں اس پر آیت وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ نازل ہوئی اور مندرجہ ذیل آیت کا بھی نزول ہوا۔

وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْھَہٗ لِلّٰہِ اور ایسے شخص سے اچھا دین کس کا ہو گا جو اپنا رخ اللہ کی طرف جھکا دے یعنی جس نے اپنی ذات کو اللہ کے لئے خاص کر دیا کہ اس کے قلب کی کوئی علمی یا میلانی وابستگی اور آویختگی غیر خدا سے نہیں رہی دل اور سارا بدن اللہ کے اوامر و نواہی کا پابند ہو گیا یہاں تک کہ عالم امکان میں اپنا یا کسی اور کا کوئی وجود اصلی حقیقی اس کو نظر ہی نہیں آتا کسی کے مستقل وجود یا کسی کو معبود و محبوب ماننے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ انکار کو بصورت استفہام ذکر کرنے سے کمال انکار کی طرف اشارہ ہے۔

وَھُوَ مُحْسِنٌ ایسی حالت میں کہ وہ اچھے کام کرنے والا بھی ہے یعنی نیک اعمال کرتا اور برے کام چھوڑ دیتا اور ہمیشہ حضور قلبی اور اخلاص رکھتا ہے۔ حضرت جبرئیلؑ نے جب رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ احسان (اعمال کی خوبی) کیا ہے تو آپ نے فرمایا (عبادت کی خوبی یہ ہے کہ) تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے اللہ کو (اس وقت اپنی نظر سے) دیکھ رہے ہو پس اگر تم اس کو نہیں دیکھ پاتے تو وہ تو یقیناً تم کو دیکھتا ہے اس حدیث کے راوی حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ متفق علیہ۔

وَّ اتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ اور چلا ابراہیمؑ کے دین پر۔ یوں تو تمام انبیاء کا دین ایک ہی ہے۔ اپنی ذات اور اعضاء بدن اور اندرونی بیرونی قوتوں کو اللہ کی رضامندی میں لگا دینا ہی دین انبیاء ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ حضرت ابراہیم کے دین کا تذکرہ صرف اس وجہ سے کیا کہ آپ کی نبوت پر تمام اقوام کا اتفاق ہے اور ہر دین میں آپ کی حقانیت مسلم ہے پھر دین اسلام بکثرت فروعی مسائل میں شریعت ابراہیم کے موافق ہے۔ مثلاً کعبہ کی طرف نماز، کعبہ کا طواف، مناسک حج، ختنہ، مہمان نوازی اور وہ محاسن فطریہ جن کی تکمیل کا حکم حضرت ابراہیمؑ کو دیا گیا تھا اور وہ اس امتحان میں پورے اترے اور یہ تمام احکام شریعت اسلامیہ میں باقی رکھے گئے۔

حَنِيْفًا ۭ یعنی ابراہیم یا ان کی ملت ابراہیم پر حنیف ہو کر چلنے والا مراد ہے۔ حنیف سے مراد ہے تمام باطل راستوں سے منہ موڑ کر راہ حق پر چلنے والا۔ حضرت ابراہیم نے بت پرستی سے منہ موڑ لیا تھا باوجودیکہ آپ کے باپ کے خاندان اور قوم والے سب کے سب بت پرست تھے مگر آپ نے سب کو چھوڑ کر راہ مستقیم اختیار کی۔

وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾ اور اللہ نے ابراہیمؑ کو اپنا خالص دوست بنایا تھا۔ خلیل سچا دوست خالص محبت والا۔ لفظ خُلّة کا اشتقاق یا خلال سے ہے (خلال کا معنی ہے گھس جانا مخلوط ہو جانا) خُلّت (اور باطنی محبت) بھی دل کے اندر گھس جاتی اور نفس میں مخلوط ہو جاتی ہے۔ یا خلل سے مشتق ہے (خلل کا معنی ہے رخنہ شگاف) دو گہرے دوستوں میں سے ہر ایک دوسرے کی حاجت روائی کرتا اور اس کی حالت کے بگاڑ کو درست کرتا ہے اس لئے دونوں کو خلیل کہا جاتا ہے۔

زجاج نے کہا خلیل وہ ہے جس کی محبت میں کوئی رخنہ نہ ہو یا خل سے مشتق ہے۔ خل اس راستہ کو کہتے ہیں جو ریت کے اندر ہو۔ دو خلیل بھی دوستی کے راستہ پر برابر گامزن اور ہم طریق ہوتے ہیں یا خَلت سے ماخوذ ہے خلت کا معنی ہے خصلت دونوں دوستوں کی خصلت ایک ہی ہوتی ہے اس لئے ان کو خلیل کہا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کو خلیل کہنے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ آپ صرف اللہ کے محتاج تھے مخلوق کے سامنے اپنی حاجت نہیں پیش کرتے تھے۔[1] روایت میں آیا ہے کہ جب آپ کو آگ میں ڈالا گیا اس وقت آپ کے پاس جبرئیلؑ آئے اور پوچھا کیا آپ کو مدد کی ضرورت ہے فرمایا آپ کی مدد کی ضرورت نہیں حضرت جبرئیل نے کہا تو اپنے رب سے ہی دعا کیجئے فرمایا وہ میرے حال کو جانتا ہے اس کو میرے سوال کی ضرورت نہیں۔

...... ایک سوال ......

اگر خلیل کو خلت بمعنی حاجت سے مشتق مانا جائے تو آیت کا معنی درست نہ ہوگا کیونکہ اس وقت احتیاج دونوں طرف سے ہونی چاہئے حالانکہ اللہ کا محتاج ہونا قابل تصور بھی نہیں ہے۔

جواب:۔ ہم شروع کتاب میں بیان کر چکے ہیں کہ اللہ پر اسماء وصفی کا اطلاق حقیقی نہیں مجازی ہے اور نتائج کے لحاظ

---

[1] آپ دیتے تھے لیتے نہ تھے اور اللہ کے سوا کسی کی طرف اپنا رخ نہیں کرتے تھے، بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبرئیل سے دریافت کیا، جبرئیل اللہ نے ابراہیمؑ کو خلیل کس وجہ سے بنایا حضرت جبرئیل نے کہا (مخلوق کو) کھانا کھلانے کی وجہ سے، ابن المنذر نے ابن ابزی کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے ملک الموت سے پوچھا میرے رب نے مجھے خلیل کس وجہ سے بنایا ملک الموت نے جواب دیا اس لئے کہ آپ (مخلوق کو) دینا پسند کرتے ہیں لینا پسند نہیں کرتے، دیلمی نے حضرت ابوہریرہؓ وغیرہ کی روایت سے اس قول کو رسول اللہ ﷺ کا بیان قرار دیا ہے مگر اس کی سند انتہائی ضعیف ہے، زبیر بن بکار کا قول ہے کہ اللہ نے ابراہیمؑ کے پاس وحی بھیجی کیا تم واقف ہو کہ میں نے تم کو خلیل کیوں بنایا ابراہیمؑ نے عرض کیا اے میرے رب مجھے نہیں معلوم اللہ نے فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے تیرے دل کو دیکھا تو میں نے پایا کہ تو دینا پسند کرتا ہے اور یہ پسند نہیں کرتا کہ تجھے دیا جائے، ۱۲۔

سے ہوتا ہے (جو افعال ہیں) مبادی کے اعتبار سے نہیں ہوتا (جو تاثرات وانفعالات ہیں) مثلاً رحمٰن ورحیم اللہ کے دو وصفی نام ہیں دونوں کا اشتقاق رحمت سے ہے اور رحمت کا معنی ہے رقت قلب جو حسن سلوک اور مہربانی کی مقتضی ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ کا قلب نہیں نہ اس کے اندر رقت قلب پیدا ہوتی ہے (رقت قلب تو ایک قسم کا تاثر ہوتا ہے جو کسی وجہ سے دل میں پیدا ہوتا ہے اور خدا ہر اثر پذیری سے پاک ہے اثر پذیری عجز کی علامت ہے) بلکہ رقت قلب کا جو لازمی تقاضا ہے یعنی دوسرے پر مہربانی کرنا اور حسن سلوک کرنا اس کے اعتبار سے اللہ پر رحمٰن ورحیم کا اطلاق ہوتا ہے (پس رحمٰن ورحیم کا ترجمہ ہوا مہربان۔ رقیق القلب ترجمہ درست نہیں) اسی طرح اللہ پر خلت کا اطلاق مجازی ہے یعنی خالص محبت۔ حاجت کا مفہوم مراد نہیں ہے۔ (اگرچہ محبت نتیجہ ہوتا ہے حاجت کا پس نتیجہ حاجت یعنی خالص محبت مراد ہے مبداء محبت یعنی حاجت مراد نہیں ہے)۔

جملہ معترضہ ہے وسط کلام میں اس کا ذکر اتباع ملت ابراہیمی کے وجوب کو موکد طور پر ظاہر کرنے کے لئے کیا گیا ہے کیونکہ جو شخص اتنے اونچے مرتبہ پر فائز ہو جائے کہ اللہ اس کو اپنا خلیل بنا لے یقیناً اس کا اتباع لازم ہے۔ مجدد الف ثانی نے فرمایا خلیل وہ ندیم اور ہم نشین ہوتا ہے جس کے سامنے آدمی اپنے محبّ اور حبیب کے راز ظاہر کرتا ہے۔ عبدالرزاق اور ابن جریر اور ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیروں میں زید بن اسلم کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ زمین پر سب سے اول جبار نمرود تھا لوگ اس سے آکر کھانے کے لئے اناج مانگتے تھے اور وہ دیتا تھا دوسرے لوگوں کے ساتھ ایک بار حضرت ابراہیمؑ بھی اس سے غلہ لینے گئے جب لوگ اس کے پاس پہنچے تو اس نے پوچھا تمہارا پالنہار کون ہے لوگوں نے کہا آپ (اس نے غلہ دیدیا) جب حضرت ابراہیمؑ کی باری آئی اور آپ پہنچے تو نمرود نے پوچھا تیرا رب کون ہے حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا میرا مالک وہ ہے جس کے قبضہ میں موت وزندگی ہے نمرود نے کہا میں بھی موت وزندگی دیتا ہوں حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا اللہ سورج کو مشرق سے لاتا ہے (اگر تجھے رب ہونے کا دعویٰ ہے تو) تو اس کو مغرب کی طرف سے لے آ۔ یہ بات سن کر وہ منکر خدا لاجواب ہو گیا اور حضرت ابراہیمؑ کو بغیر اناج دیئے واپس کر دیا۔ واپسی میں آپ کا گزر خاکستری رنگ کے ایک ریت کے ٹیلے کی طرف سے ہوا آپ نے سوچا کہ گھر والوں کو بہلانے کے لئے مجھے یہی ریت کچھ لے لینا چاہئے تاکہ میرے پہنچتے ہی ان کو مایوسی نہ ہو (رات گزرنے کے بعد صبح ہو گی تو دیکھا جائے گا) یہ سوچ کر آپ نے کچھ ریت لے لی اور گھر پہنچ کر سامان اتار کر رکھ دیا اور سو گئے (رات میں) بیوی نے اٹھ کر سامان کھولا تو اندر سے اعلیٰ قسم کا غلہ نکلا، اس نے فوراً اس میں سے کچھ لے کر کھانا تیار کیا اور ابراہیمؑ کے سامنے لے آئی۔ حضرت ابراہیمؑ جس وقت گئے تو گھر میں کچھ کھانا نہیں تھا اب کھانا سامنے آیا تو پوچھا یہ کہاں سے تیار کیا گیا بیوی نے کہا اسی غلہ سے تیار کیا گیا ہے جو آپ لے کر آئے تھے اس وقت آپ سمجھ گئے کہ یہ اللہ نے عطا فرمایا ہے اس پر اللہ کا شکر کیا۔

ابن ابی شیبہ نے مصنف میں ابو صالح کی روایت سے لکھا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ غلہ لینے گئے اور کچھ ہاتھ نہ آیا اور واپسی میں ایک سرخ ٹیلہ کی طرف سے گزرے تو اس سے کچھ (مٹی ریت) لے لیا اور گھر لوٹ آئے۔ گھر والوں نے پوچھا یہ کیا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ سرخ گیہوں گھر والوں نے کھول کر دیکھا تو سرخ گیہوں برآمد ہوئے (یہ عجیب گیہوں تھے) جب ان میں سے کچھ بیج لے کر بویا گیا تو جڑ سے پھنگی تک تہ بر تہ گیہوں کی بالیاں برآمد ہوئیں۔

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ بڑے مہمان نواز تھے آپ کا مکان سر راہ تھا جو ادھر سے گزرتا آپ اس کی میزبانی کرتے تھے۔ ایک بار کال پڑا لوگ کھانا طلب کرنے حضرت کے دروازے پر جمع ہو گئے آپ کے لئے غلہ کی رسد ہر سال مصر سے ایک دوست کے پاس سے آیا کرتی تھی اس سال بھی آپ نے اپنے غلاموں کو اونٹ دے کر مصری دوست کے پاس بھیجا تاکہ غلہ کی رسد لے آئیں اور دوست نے غلاموں سے کہا اگر ابراہیم اپنے لئے طلب کرتے تو ہم ان کی خاطر اس بار کو اٹھا بھی لیتے کیونکہ جو مصیبت لوگوں پر آئی ہے ہم پر بھی آئی ہے قاصد (ناکام) لوٹ پڑے اثناء راہ میں ایک وادی کی طرف سے گزر ہوا آپس میں کہنے لگے اونٹ خالی لے جاتے ہوئے تو ہم کو شرم آتی ہے مناسب یہ ہے کہ اس وادی کی

کچھ مٹی لے کر ہم بوریوں میں بھر لیں تاکہ لوگ دیکھ کر خیال کریں کہ ہم غلہ لے کر آئے ہیں یہ کہہ کر بوریاں بآسانی بھر لیں اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ کی اطلاع دے دی۔ اس وقت حضرت سارہؓ سو رہی تھیں لوگ دروازہ پر تھے حضرت کو یہ بات سن کر بڑا رنج ہوا اسی دوران میں نیند سے مغلوب ہو کر سو گئے سارہؓ بیدار ہوئیں تو دن چڑھ گیا تھا کہنے لگیں تعجب ہے غلام نہیں آئے۔ غلاموں نے آواز دی کیوں نہیں (آ تو گئے حضرت سارہؓ نے کہا تو پھر کچھ لائے نہیں۔ غلاموں نے کہا لائے کیوں نہیں۔ سارہؓ اٹھ کر بوروں کے پاس گئیں اور ان کو کھولا تو بڑا کھرا آٹا نکلا۔ آپ نے روٹی پکانے والوں کو حکم دیا۔ حسب الحکم انہوں نے روٹیاں پکائیں اور لوگوں کو کھانا کھلایا اتنے میں حضرت ابراہیمؑ بیدار ہو گئے اور آپ کو کھانے کی خوشبو آئی فرمایا سارہ یہ کہاں سے آیا سارہ نے کہا آپ کے مصری دوست کے پاس سے فرمایا (نہیں) یہ میرے خلیل کے پاس سے آیا جو اللہ ہے۔ اسی روز اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو خلیل بنایا۔

فائدہ:۔ حضور سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کا درجہ خلت کے درجہ سے بہت اونچا تھا آپ کا مقام خالص محبوبیت کا مقام تھا۔ مقام خلت کو تو آپ راستہ میں چھوڑ گئے تھے اسی عبور اور تقدم کی وجہ سے آپؐ نے اپنے کو خلیل فرمایا تھا اور ارشاد فرمایا تھا کہ اگر (اپنے رب کے علاوہ) میں کسی کو خلیل بناتا تو ابو بکر رضی اللہ عنہ) بناتا لیکن ابو بکرؓ میرے بھائی اور رفیق ہیں اور اللہ نے تمہارے ساتھی کو خلیل بنالیا ہے۔ رواہ مسلم من حدیث ابن مسعودؓ حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا، اگر اپنے رب کے علاوہ میں کسی کو خلیل بناتا تو ابو بکرؓ کو بناتا۔ رواہ البخاری و مسلم من حدیث ابی سعید الخدری۔ یہ بھی فرمایا سن لو تمہارا ساتھی اللہ کا خلیل ہے۔ رواہ الترمذی عن ابی ہریرۃ۔

حضرت جندبؓ کا بیان ہے میں نے خود سنا حضور ﷺ وفات سے پہلے فرما رہے تھے اللہ نے مجھے خلیل بنالیا ہے جس طرح ابراہیمؑ کو خلیل بنایا تھا اخرجہ الحاکم وصححہ۔ طبرانی نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے ابراہیمؑ کو خلیل بنالیا تھا اور تمہارا ساتھی بھی اللہ کا خلیل ہے اور قیامت کے دن محمد بنی آدم کا سردار ہوگا پھر آپ نے آیت عَسٰۤی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا تلاوت فرمائی۔[1]

حضور ﷺ کا استقرار مقام خلت میں نہ تھا۔ آپ کا مقام اس سے اونچا تھا۔ مقام محبوبیت کا یہی اقتضا تھا مگر امت کے بعض افراد کے لئے آپ مقام خلت کے خواستگار تھے تاکہ ان افراد کے تفصیلی کمال کا شمار آپ کے کمال میں ہو جائے کیونکہ متبعین کے کمالات مقتدا کے کمال کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ علماء اہل سنت کا اجماعی فیصلہ اصول دین کی کتابوں میں موجود ہے کہ اولیاء کی کرامتیں پیغمبر کے معجزات ہوتی ہیں۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص کوئی اچھا طریقہ جاری کرے گا اس کو اس طریقہ پر چلنے کا ثواب بھی ہوگا اور ان لوگوں کے عمل کا بھی ثواب ہوگا جو اس طریقہ پر چلیں گے مگر ان چلنے والوں کے ثواب میں اس سے کوئی کمی نہیں آئے گی۔ حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ نیکی کا راستہ بتانے والا بھی نیکی کرنے والے کی طرح ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امت کے اعمال اور کمالات کا شمار رسول اللہ ﷺ کے اعمال اور کمالات میں ہے۔ حضور ﷺ نے اپنے لئے اور اپنی امت کے لئے ان تفصیلی کمالات کو طلب کرنے کے لئے ہی دعا کی تھی اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰۤی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی

---

[1] ترمذی اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابراہیم خلیل اللہ تھے اور واقع میں وہ ایسے ہی تھے (لیکن) سن لو کہ میں اللہ کا حبیب ہوں اور (یہ) فخر نہیں ہے (اظہار واقعہ ہے) سب سے پہلے میں ہی شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول ہوگی اور (یہ) فخر نہیں ہے اور سب سے پہلے میں ہی جنت کی زنجیر ہلاؤں گا اور اللہ اس کو کھول کر مجسم کو اندر داخل فرمائے گا اس وقت میرے ساتھ فقراء مومنین بھی ہوں گے اور (یہ) فخر نہیں ہے اور میں قیامت کے دن تمام اگلوں پچھلوں سے زیادہ معزز ہوں گا اور (یہ) فخر نہیں ہے، ابن جریر اور طبرانی نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ نے ابراہیم کو خلت کے لئے اور موسیٰ کو کلام کے لئے اور محمد کو دیدار کے لئے چن لیا، از مولف رحمتہ اللہ

اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اللہ نے آپ کی یہ دعا قبول فرمائی اور ہزار برس کے بعد یہ مقام حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو عنایت فرمایا حضرت والا کا مقام مقام خلت قرار پایا اور تفصیلی خلت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کسی کو میسر نہ ہوئی اس کی وجہ خواہ یہ ہو کہ رسول اللہ ﷺ کے اتباع خصوصی کی وجہ سے بعض جلیل القدر صحابہؓ اور آئمہ اہل بیت مقام خلت سے اونچے ہو کر درجہ محبوبیت پر پہنچ گئے تھے (کیونکہ اللہ نے اپنے رسول کی زبان سے کہلوا دیا تھا کہ (اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ) یا یوں کہا جائے کہ (بعض لوگوں کو خصوصی عنایت سے سرفراز کرنا) اللہ کا سراسر فضل ہے اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے فضل سے سرفراز فرماتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا میری امت کی حالت بارش کی طرح ہے کہ معلوم نہیں اس کا اول حصہ بہتر ہے یا آخر حصہ یا باغ کی طرح ہے جس سے ایک سال ایک جماعت کو اور دوسرے سال دوسری جماعت کو کھانے کو ملتا ہے ہو سکتا ہے کہ دوسرے سال والی جماعت پہلی جماعت سے زیادہ فراخ اور وسیع رزق والی اور اس سے زیادہ خوش حال ہو۔ رواہ رزین من حدیث جعفر بن محمدؒ۔

یہ مسئلہ صحیح کشف سے ثابت ہے اگر کوئی اس کو نہیں مانتا تو نہ مانے، ہماری گفتگو ان لوگوں سے ہے جو بات سنتے اور اچھی بات پر چلتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت فرمادی ہے اور یہی گروہ اہل دانش کا ہے۔ میں نے یہ بات اس لئے کہی کہ بعض کوتاہ فہم لوگ حضرت مجدد رحمۃ اللہ کے کلام پر طعن کرتے بلکہ اس مقام پر جو کچھ آپ نے فرمایا ہے اس کو کفر قرار دیتے ہیں۔ مجدد صاحبؒ نے اس جگہ جو کچھ فرمایا وہ کسی ناممکن امر کا دعویٰ نہیں ہے بزرگوں سے حسن ظن رکھنے کا تقاضا ہے کہ اس کو تسلیم کر لیا جائے یا کم از کم سکوت ہی اختیار کیا جائے۔

(رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں) بعض لوگ کہتے تھے کہ یہ قرآن ان دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اتارا گیا؟ اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا کیا یہ لوگ اللہ کی رحمت خود تقسیم کر رہے ہیں (کہ جس کو چاہا پیغمبر بنا دیا) کچھ لوگ کہتے تھے کیا ہم میں سے اس شخص پر قرآن اتارا گیا (ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا) یہ بڑا جھوٹا ہے اللہ نے جواب میں فرمایا کل کو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ بڑا جھوٹا اترانے والا کون ہے اگر بعض جلیل القدر صحابہؓ اور آئمہ اہل بیت مقام محبوبیت پر فائز تھے تو اس سے حضرت ابراہیمؑ پر ان بزرگوں کی برتری لازم نہیں آتی کیونکہ ان کو جو کچھ ملا وہ دوسروں کا اتباع کرنے سے اور وراثت کے طور پر ملا اور حضرت ابراہیمؑ کو جو کچھ ملا وہ بالذات اور بلاوسیلہ تھا اور دونوں میں بڑا فرق ہے۔

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ مقام خلت پر فائز تھے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کی ترقی ختم ہو گئی یہ تو وقفۂ راہ ہے منزل نہیں ہے مقام خلت سے آگے بڑھ کر آپ کی رفتار مقام محبوبیت کی جانب تھی اگرچہ بالتبع اور بالواسطہ تھی۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ اور جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے یعنی اللہ ہی کی مخلوق اور اللہ ہی کی ملک ہے سوائے اللہ کے کسی دوسرے کو کسی چیز کی تخلیق میں دخل ہے نہ ملکیت میں (یوں تو سارا جہان اور جہان کی چیزیں اللہ ہی کی مخلوق و مملوک ہیں لیکن چونکہ موجودات سماوی اور کائنات ارضی نظر کے سامنے ہیں اس لئے خصوصیت کے ساتھ انہی کا تذکرہ کیا)۔

اس جملہ کا معنوی تعلق یا تو آیت وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ سے ہے گویا یہ اس کلام کی علت ہے کہ جب سب کچھ اللہ ہی کا پیدا کیا ہوا اور اسی کی ملکیت ہے لہٰذا ہر شخص پر واجب ہے کہ اپنا رخ اسی کی طرف پھیر لے۔ یا آیت وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا سے اس کا ربط ہے یعنی سب کچھ اللہ ہی کا ہے اس کو اختیار ہے کہ اپنی مشیت کے موافق جس چیز اور جس شخص کو چاہے چن لے۔ یا اس کلام کا اتصال ذکر اعمال سے ہے یعنی اللہ کی فرماں برداری ساری کائنات پر فرض ہے اور وہی سب کے اعمال کا بدلہ دینے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾ اور اللہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے مگر اس کا احاطہ ہر کیفیت سے پاک ہے

مطلب یہ کہ کوئی چیز اپنی ہستی مستقل اور خود بخود نہیں رکھتی بلکہ باری تعالیٰ کی ہستی سے وابستہ ہے اسی کی محتاج ہے کسی کا وجود ذاتی نہیں، ہر چیز کے تمام صفات وافعال اور خود اس کی ذات اللہ کی مہربانی اور فضل کی ممنون ہے لہٰذا کسی کے لئے جائز نہیں کہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف اپنا رخ کرے، اللہ کے محیط ہونے کا معنی اس کے علم وقدرت کا محیط ہونا بھی بعض علماء نے بیان کیا ہے یعنی اللہ کا علم ہمہ گیر اور قدرت محیط کل ہے لہٰذا وہ لوگوں کو اعمال کے موافق بدلہ دیگا نیکی کا بدلہ اچھا اور برائی کا بدلہ برا، واللہ اعلم۔

حاکم نے مستدرک میں حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ اہل جاہلیت بچوں کو بالغ ہونے سے پہلے میراث نہیں دیتے تھے اور نہ عورت کو وارث قرار دیتے تھے جب اسلام آیا (اور لوگوں نے عورتوں کی میراث کا حکم دریافت کیا تو) اللہ نے فرمایا۔

وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ لوگ آپ ﷺ سے عورتوں (کی میراث) کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔

استفتاء کا معنی ہے خبر طلب کرنا صحاح میں ہے فتویٰ کا معنی ہے مشکل مسائل کا جواب۔

ابن المنذر نے سعید بن جبیرؒ کا بیان نقل کیا ہے کہ بالغ مرد بچوں کو وراثت کا مال نہیں دیتا تھا نہ عورت کو کچھ دیتا تھا جب سورہ نساء میں میراث کے تفصیلی احکام نازل ہوئے تو لوگوں پر یہ بات سخت شاق گذری اور کہنے لگے کیا بالغ مرد کی طرح بچہ اور عورت بھی وارث ہوگی اور حضور ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا اس پر آیت نازل ہوئی۔ ابن جریر اور عبد بن حمید نے مجاہد کی روایت سے بھی ایسا ہی بیان کیا ہے۔ کلبی نے بروایت ابو صالح حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول ام کحہ کی لڑکیوں کی اس میراث کے متعلق ہوا تھا جو ان کو باپ کی طرف سے پہنچتی تھی۔ اس کا قصہ شروع سورۃ میں گذر چکا ہے۔

بخاریؒ نے حضرت عائشہؓ کا قول اس آیت کے متعلق نقل کیا ہے حضرت عائشہؓ نے فرمایا (آیت میں) وہ شخص مراد ہے جو کسی یتیم لڑکی کا ولی اور وارث ہو مگر لڑکی اس کے مال میں (بطور وراثت) شریک ہو گئی ہو اس لئے مرد اس یتیمہ کو (کہیں نکاح کرنے سے) روک دے۔ بغوی نے اس سے زیادہ اتنا اور لکھا ہے کہ یتیمہ کی بدصورتی کی وجہ سے خود بھی یہ شخص اس سے نکاح نہ کرے اور کسی دوسرے سے بھی نہ کرنے دے کہ کہیں غیر آدمی (اپنی بیوی کی طرف سے) میراث کے مال میں اس کا شریک ہو جائے اس لئے لڑکی کو روکے رکھے یہاں تک کہ اس لڑکی کو موت آجائے اور یہ شخص اس لڑکی کے مال کا بھی وارث ہو جائے۔ اللہ نے اس آیت میں اس کی ممانعت فرمادی ہے۔

دوسری روایت میں حضرت عائشہؓ کا قول اس طرح آیا ہے کہ آیت میں وہ یتیمہ مراد ہے جو کسی شخص کی زیر تربیت ہو اور وہ شخص اس یتیمہ کا ولی ہو اب اگر لڑکی مالدار اور خوبصورت ہو تو اس سے نکاح کا طلب گار ہو جائے مگر اس کو مہر اس کے مہر مثل سے کم دے اور بدصورت یا نادار ہو تو اس سے نکاح نہ کرے۔ [1]

قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ (اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے کہ اللہ عورتوں کے متعلق تم کو اپنا حکم کھول کر بتاتا ہے۔

وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اس کا عطف لفظ اللہ پر یا یُفْتِيكُمْ کی ضمیر واحد مذکر پر ہے اور فصل کی وجہ ضمیر مستتر پر عطف جائز ہے یعنی اللہ اپنا حکم بیان کر رہا ہے اور عورتوں کے متعلق اللہ کی کتاب یعنی آیت میراث یا آیت وَاٰتُوا النِّسَاءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً بھی حکم بیان کر رہی ہے۔

---

[1] قاضی اسماعیل نے احکام القرآن میں عبد الملک بن محمد بن حزم کی روایت سے لکھا ہے کہ عمرہ بنت حزم حضرت سعد بن ربیع کی بیوی تھیں، سعد جنگ احد میں شہید ہوگئے عمرہ کو اور اپنی ایک لڑکی کو جو عمرہ کے بطن سے تھی چھوڑ گئے لڑکی اپنے باپ کی میراث طلب کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اس پر آیت وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ نازل ہوئی۔

بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ آیت مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ میں جس کا ذکر ہے وہ وہی ہے جس کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ۔ ۱۲

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جملہ معترضہ ہو مایتلٰی مبتدا اور فی الکتٰب خبر ہو یعنی جو حکم تم کو سنایا جا رہا ہے وہ کتاب میں یعنی لوح محفوظ میں موجود ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فعل محذوف ہو اور مایتلٰی اس کا مفعول ہو یعنی جو حکم سنایا جا رہا ہے اس کو اللہ بیان کر رہا ہے۔

فِی یَتٰمَی النِّسَآءِ یتیم عورتوں کے متعلق اس فقرہ کا تعلق یُتْلٰی سے ہو گا بشرطیکہ مایُتْلٰی کا عطف لفظ اللہ پر مانا جائے یا اس کو فعل محذوف کا مفعول قرار دیا جائے وغیرہ۔

الّٰتِیْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا کُتِبَ لَهُنَّ جن کو تم ان کا واجب کردہ حق نہیں دیتے واجب کردہ حق سے مراد ہے میراث اور مہر وغیرہ۔

وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اور ان سے نکاح کرنے کی رغبت رکھتے ہو یا ان سے نکاح کرنے سے اعراض کرتے ہو اول ترجمہ پر لفظ فی اور دوسرے ترجمہ پر لفظ عن محذوف ہو گا۔ ابن المنذر نے پہلا قول حسن کا اور دوسرا قول ابن سیرین کا بیان کیا ہے، لیکن ابن ابی شیبہ نے دوسرا قول حسن کا بیان کیا ہے۔

وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ اور کمزور بچوں کے بارے اس کا عطف یتامی النساء پر ہے اہل جاہلیت بچوں کو بھی میراث نہیں دیتے تھے اور ان کا مال خود کھا لیتے تھے یعنی وہ آیت جو یتیم بچوں کے بارے میں تم کو سنائی جا رہی ہے وہ بھی کھول کر حکم بیان کر رہی ہے یتیموں کے متعلق آیت یہ ہے۔ وَاٰتُوا الْیَتٰمٰی اَمْوَالَهُمْ

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْیَتٰمٰی بِالْقِسْطِ اور اس بارہ میں کہ یتیموں کے متعلق انصاف قائم کرو۔ اس کا عطف بھی یتمی پر ہے یعنی یتیموں کے ساتھ عدل کرنے کا حکم بھی تم کو سنایا جا رہا ہے قسط سے مراد ہے میراث اور مال میں انصاف۔

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ اور (عورتوں یا یتیم بچوں کے سلسلہ میں) تم جو بھلائی کرو گے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِیْمًا ﴿۱۲۷﴾ تو اللہ اس سے بخوبی واقف ہے وہ اس کا ثواب دے گا۔

بخاری ابو داؤد اور حاکم نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے اور ترمذی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ جب حضرت سودہؓ زیادہ سن رسیدہ ہو گئیں اور ان کو اندیشہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ ان کو چھوڑ دیں گے تو انہوں نے حضور ﷺ سے درخواست کی اور عرض کیا کہ میں اپنی باری کا دن عائشہ کو دیتی ہوں اس پر مندرجہ ذیل آیات کا نزول ہوا۔

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے بددماغی کا غالب احتمال ہو یعنی علامات و قرائن سے معلوم ہو کہ شوہر اس کو طلاق دے دے گا۔

اَوْ اِعْرَاضًا یا رخ پھیر لینے کا اندیشہ ہو کہ شوہر اس کے ساتھ نشست و برخاست اور گفتگو میں کمی کر دے اور اس کے حقوق ادا نہ کرے اور عورت طلاق نہ چاہتی ہو۔

فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَاۤ اَنْ یُّصْلِحَا بَیْنَهُمَا تو کوئی جرم نہیں کہ وہ آپس میں (کسی جائز شرط پر) صلح کر لیں۔ مثلاً عورت اپنے کل مہر یا جزء مہر یا لازمی نفقہ یا مقررہ باری سے دست بردار ہو جائے یا شوہر کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے کچھ ہبہ کر دے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ اگر شوہر اپنی بی بی سے کہے تیری عمر زیادہ ہو گئی، میں کسی جوان خوبصورت عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہوں اور باری کی تقسیم میں میں اس کو تجھ پر ترجیح دوں گا اگر تو اس پر رضامند ہے تو میرے پاس رہتی رہ، اگر تجھے ناگوار ہو تو میں تجھے طلاق دے دوں گا ایسی حالت میں اگر عورت (اپنی باری کا حق سوخت ہو جانے پر) رضامند ہو جائے تو یہ اس کا احسان ہو گا اس معاملہ میں اس پر جبر نہیں کیا جا سکتا اور رضامند نہ ہو تو مرد پر لازم ہے کہ یا تو اس کے مصارف اور باری کا حق پورا ادا کرے ورنہ حسن سلوک کے ساتھ آزاد کر دے اگر اس کو نکاح میں رہنے دے گا اور اس کا حق ادا کرتا رہے گا (خواہ بکراہت خاطر ہی ہو) تو اس کو محسن (حسن سلوک کرنے والا) کہا جائے گا (گویا اول صورت میں عورت اپنے حق سے دست بردار ہونے کی وجہ سے محسن قرار پائی اور دوسری صورت میں مرد نے اپنے حق طلاق کا استعمال نہیں کیا تو محسن قرار پایا)۔

مقاتل بن حبان نے کہا کہ اگر کوئی بوڑھی عورت کسی مرد کے نکاح میں ہو پھر کسی جوان عورت سے مرد نکاح کر لے اور

بوڑھی عورت سے کہے میں تجھے اتنا مال دوں گا بشرطیکہ تو اپنے حق کی باری میں کمی کر دے اور دوسری عورت کو اپنی باری دے دے اور بوڑھی عورت اس پر رضامند ہو جائے تو بہتر، اور اگر راضی نہ ہو تو مرد پر دونوں میں مساوات رکھنی لازم ہے۔ حضرت علیؓ نے اسی آیت کے ذیل میں فرمایا اگر کوئی عورت کسی کے نکاح میں ہو لیکن بدصورتی یا زیادتی عمر کے سبب مرد کی نظر میں نہ جچے اور عورت اس مرد سے جدا ہونا بھی پسند نہ کرے اور (نکاح میں قائم رہنے کے لئے) مرد کو کچھ مال دے دے تو یہ مال اس شخص کے لئے حلال ہے اور اگر اپنی باریوں میں سے کوئی باری دے دے تب بھی درست ہے۔

آیت میں لفظ بَیْنَہُمَا سے اس طرف اشارہ ہے کہ بغیر کسی تیسرے کے دخل دیئے میاں بی بی کو خود ہی باہم صلح کر لینی مناسب ہے تاکہ ان کے آپس کی کوئی بری بات تیسرے آدمی کو معلوم نہ ہو۔

صُلْحًا یہ مفعول مطلق ہے اور بَیْنَہُمَا مفعول بہ ہے یا مفعول بہ محذوف ہے۔

ایک شبہ :- صلحاً کو اگر اصلاحاً یا مصالحۃ کے معنی میں لیا جائے تو مفعول مطلق ہو سکے گا ورنہ نہیں ہوگا (اور یہاں ثلاثی مجرد، ثلاثی مزید کے معنی میں نہیں ہے)۔

ازالہ :- صلح بھی ایک طرح کی اصلاح ہے اس لئے اس کا مفعول مطلق ہونا صحیح ہے اس کے علاوہ یہ کہ مفعول مطلق ہونے کیلئے مادہ کا اتحاد کافی ہے۔ مصدر میں اختلاف ہو تو کوئی ہرج نہیں جیسے انبتہ اللہ بناتا (فعل باب افعال سے ہے اور نباتاً ثلاثی مجرد ہے)۔

آیت سے بطور دلالت النص یہ مسئلہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر مرد کو عورت کی سرکشی کا اندیشہ ہو پھر دونوں مل کر صلح کر لیں تو کوئی ہرج نہیں (صلح ہی بہتر ہے) یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مسئلہ آئندہ کے تحت سمجھ لیا جائے۔

وَالصُّلْحُ خَيْرٌ اور صلح بہتر ہے جدا ہو جانے سے یا جھگڑا کرنے سے یا سوء معاشرت سے یا (خیر کا صلہ محذوف نہیں ہے اور) یہ معنی ہے کہ صلح ایک طرح کی بھلائی ہے جیسے باہم جھگڑا ایک طرح کی برائی ہے چونکہ لاجناح کا معنی ہے گناہ نہ ہونا اور اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ مکروہ ہے اس خیال کو دور کرنے کے لئے وَالصُّلْحُ خَيْرٌ جملہ معترضہ کے طور پر فرمایا اس کے علاوہ عورت کا اپنے حق میں کچھ دینا رشوت کی مشابہت رکھتا ہے اس وہم کو دفع کرنے کے لئے بھی والصلح خیر فرمایا۔

یہ آیت اگرچہ میاں بیوی کے درمیان مصالحت کرنے کے سلسلہ میں خصوصیت سے نازل ہوئی تھی لیکن چونکہ الفاظ عام ہیں لہٰذا صحیح دعوے کے بعد بھی مصالحت ہو اس کو حکم آیت شامل ہے۔

اقسام صلح

صلح تین قسم کی ہوتی ہے (۱) اقرار کے ساتھ صلح (۲) سکوت کے ساتھ صلح (۳) انکار حق کے ساتھ صلح چونکہ آیت مطلق ہے اس لئے امام شافعیؒ کے علاوہ باقی اماموں کے نزدیک ہر طرح کی صلح جائز ہے امام شافعیؒ موخر الذکر دونوں صورتوں کو ناجائز کہتے ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے مسلمانوں کے درمیان ہر طرح کی صلح جائز ہے مگر وہ صلح ناجائز ہے جو حرام کو حلال یا حلال کو حرام کر دے اور مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہیں مگر اس شرط کے پابند نہیں جو حلال کو حرام کر دے۔ رواہ الحاکم۔ توضیح دلیل یہ ہے کہ بدل کی رقم دینے والے (یعنی مدعی علیہ) کے لئے حلال تھی (کیونکہ دعویٰ جھوٹا تھا) لینے والے کیلئے حرام تھی (کیونکہ اس کا حق نہ تھا) لیکن صلح کے بعد معاملہ الٹ گیا (مدعی کے لئے حلال ہو گئی اور مدعی علیہ کو دینا پڑ گئی) دوسری وجہ یہ ہے کہ مدعی علیہ جھگڑا کاٹنے کے لئے (دعوے کی) رقم دیتا ہے تو یہ دینا رشوت کے مشابہ ہوتا ہے اور رشوت ناجائز ہے لہٰذا وہ صلح بھی جس سے رشوت کی مشابہت پیدا ہو جائے ناجائز ہے)۔

تینوں اماموں نے فرمایا یہ حدیث تو ہمارے خلاف نہیں جاتی بلکہ ہمارے مسلک کو ثابت کر رہی ہے کیونکہ حضور ﷺ

نے بغیر کسی شرط کے فرمایا کہ ہر صلح جائز ہے رہا استثناء تو اس کا معنی یہ ہے کہ جو صلح کسی قطعی حرام (مثلاً شراب وغیرہ) کو حلال یا کسی قطعی حلال کو حرام بنادے وہ جائز نہیں ہے مثلاً کوئی شخص اپنی بیوی سے اس شرط پر صلح کرلے کہ اس کی سوکن سے صحبت نہیں کرے گا (سوکن سے صحبت قطعی طور پر حلال ہے اگر بیوی سے صلح اس کی سوکن سے ترک صحبت کی شرط پر کرے گا تو یہ صلح باطل ہوگی) دیکھو اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے اور بیوی شوہر سے اس شرط پر صلح کرلے کہ میں اپنی باری سوکن کو دیتی ہوں مجھے طلاق نہ دو تو یہ مصالحت باجماع علماء صحیح ہے باوجودیکہ مصالحت سے پہلے بعض عورتوں کو باری کی تقسیم میں ترجیح دینا حرام تھا مگر مصالحت کی وجہ سے حلال ہو گیا۔

سکوت اور انکار کے بعد (کچھ لینے دینے پر) صلح کرنا جائز ہے کیونکہ مدعی تو اپنے گمان کے مطابق اپنا حق وصول کرے گا اور مدعی علیہ اپنی طرف سے جھگڑا کاٹنے کے لئے دینے پر رضامند ہو جائے گا اور یہ جائز ہے۔ جان بچانے کے لئے مال دینا درست ظلم کو دور کرنے کے لئے رشوت دینا مباح ہے ہاں اگر مدعی اپنا حق ثابت کرنے سے عاجز ہو اور مدعی علیہ واقف ہو کہ مدعی کا دعویٰ صحیح ہے اور اس کے باوجود وہ اقرار نہ کرے بلکہ دعوے کا کچھ حصہ لینے دینے پر مصالحت ہو جائے تو دعوے کا بقیہ حصہ عند اللہ مدعی علیہ کے لئے حلال نہ ہوگا کیونکہ کسی کے حق کو دانستہ ہضم کر جانا جائز نہیں۔ ہاں اگر دعوے کی صحت سے واقف نہ ہو اور (کچھ دینے لینے پر) مصالحت کرلے تو تینوں اماموں کے نزدیک جائز اور امام شافعیؒ کے نزدیک ناجائز ہے۔

مسئلہ :- اقرار دعویٰ کے بعد اگر مصالحت ہو جائے تو اگر مالی دعویٰ ہو اور اس کے عوض کچھ مال دینے کی شرط پر مصالحت ہو جائے تو اس کو بیع سمجھا جائے گا (جس مال کا دعویٰ ہے اور مدعی علیہ اس کا مقر ہے وہ ثمن اور جو مال دعویٰ والے مال کے عوض دینا قرار پایا ہو وہ مبیع قرار پائے گا) لہٰذا اس میں شفعہ کا قانون جاری ہوگا۔ خیار عیب، خیار شرط اور خیار رویت بھی ہوگا۔ مال بدل اگر مجہول ہو تو عقد صلح فاسد ہو جائے گا لیکن اگر وہ مال مجہول ہو جس کا دعویٰ تھا تو عقد صلح فاسد نہ ہوگا کیونکہ اس کو تو ساقط ہونا ہی ہے وصول ہونا نہیں ہے (اور ساقط ہونے والے حق کی جہالت مضر نہیں نہ باعث نزاع بن سکتی ہے) یہ ضروری ہے کہ مدعیٰ علیہ کو مال بدل ادا کرنے پر قدرت ہو۔

اگر مال کا دعویٰ ہو اور اس کے عوض مدعی کا) کچھ کام کرنا طے ہو جائے تو اس کا قیاس عقد اجارہ پر ہوگا (یعنی اس کو اجارہ مانا جائے اور جس طرح اجارہ میں کام کے وقت کی تعین ضروری ہے اسی طرح اس میں وقت کی تعین ضروری ہے اور اگر مدت مصالحت کے اندر مدعی مدعی علیہ میں سے کوئی مر جائے تو عقد مصالحت باطل ہو جائے گا۔

مسئلہ :- سکوت و انکار کی صورت میں مصالحت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مدعی علیہ قسم کھانے سے بچ جائے گا۔ (مصالحت نہ ہوتی تو مدعا علیہ پر قسم عائد ہوتی کیونکہ منکر پر قسم عائد ہوتی ہے) اور مدعی کو اپنے حق کا معاوضہ مل جائے گا لہٰذا مدعی نے اگر کسی گھر کے متعلق دعویٰ کیا اور کچھ دیکر مدعی علیہ نے مصالحت کرلی تو اس مکان میں شفعہ واجب نہیں لیکن اگر دعوے کے عوض مدعی علیہ نے مکان دیدیا تو اس مکان میں شفعہ واجب ہے۔

مسئلہ :- اگر کسی نے مکان کا دعویٰ کیا اور مکان کا ایک ٹکڑا مدعی علیہ نے دے کر صلح کرلی تو یہ صلح صحیح نہ ہوگی کیونکہ جتنا حصہ مدعی نے حاصل کر لیا وہ اس کے دعوے کا ایک جز ہے اس لئے باقی حصہ میں اس کا دعویٰ قائم رہے گا ہاں اگر مدعی علیہ نے بدل صلح میں ایک درہم بڑھا دیا یا یہ صراحت ہو گئی کہ مدعی باقی دعوے سے دست بردار ہو جائے گا تو صلح صحیح ہے اور باقی حصہ میں مدعی کا دعویٰ قائم نہیں رہے گا۔

مسئلہ :- قتل عمد و خطاء میں (مالی) مصالحت جائز ہے کیونکہ یہ بھی انسانی حقوق میں سے ایک حق ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ۔

مرد اگر کسی عورت پر نکاح کا دعویٰ کرے اور کچھ مال لے کر دست بردار ہو جائے تو جائز ہے گویا یہ خلع ہو جائے گا۔ اگر کسی پر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ تو میرا غلام ہے اور وہ کچھ مال دے کر مصالحت کرلے تو جائز ہے گویا یہ مال کے عوض آزادی

ہو جائے گی۔

مسئلہ :- اگر کسی پر قرض کا دعویٰ ہو اور مدعی علیہ کچھ دے کر مصالحت کر لے تو صحیح ہے گویا یہ صورت اس طرح ہو جائے گی کہ مدعی نے اپنا کچھ قرض وصول کر لیا اور باقی معاف کر دیا پس اگر کھرے ہزار روپیہ کا دعویٰ ہو اور کھوٹے پانچ سو روپے پر صلح درست ہو گی اور یوں سمجھا جائے گا کہ مدعی نے اپنے کھرے روپیہ کے حق کو معاف کر دیا اور تعداد میں بھی کمی کر دی اور نقد کی جگہ ادائیگی کے لئے مہلت دیدی۔

لیکن اگر کھوٹے ہزار روپیہ کا دعویٰ ہو تو پانچ سو کھرے روپیہ کی ادائیگی پر صلح کرنا جائز نہیں (خواہ ادائیگی نقد ہو یا تاخیر کے ساتھ) کیونکہ حق تو کھوٹے روپے کا تھا اور مصالحت کھرے روپیہ کی شرط پر ہوئی تو کھوٹے ہزار روپے کا معاوضہ کھرے پانچ سو سے ہو گیا یہ سود ہے۔

لیکن اگر دراہم (نقرئی) کا دعویٰ ہو اور (سونے کے) کچھ دینار پر مصالحت ہو جائے تو چونکہ یہ بیع صرف ہو گئی اس لئے اشرفیوں پر فوراً مجلس مصالحت کو چھوڑنے سے پہلے مدعی کا قبضہ ضروری ہے۔

سعید بن منصور نے سعید بن میسب کا بیان نقل کیا ہے کہ محمد بن مسلمہ کی بیٹی رافع بن خدیج کے عقد میں تھی۔ رافع کو بیوی کی کوئی بات پسند نہ آئی معلوم نہیں وجہ ناپسندیدگی بیوی کی پیرانہ سالی تھی یا کچھ اور۔ بہر حال رافع نے بیوی کو طلاق دینی چاہی، بیوی نے کہا مجھے طلاق نہ دو اور میری باری کا تم کو اختیار ہے جو اور جتنی چاہو میرے لئے مقرر کر دو اس پر اللہ نے آیت وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ الخ نازل فرمائی۔ حاکم نے سعید بن میسب کی ہی روایت سے حسب بیان حضرت رافع بن خدیج مذکورہ بیان کے کچھ تائیدی شواہد بھی نقل کئے ہیں جو متصل ہیں (موقوف نہیں ہیں)۔

بغوی نے لکھا ہے کہ عمرہ کے متعلق اس آیت کا نزول ہوا یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ خویلہ بنت محمد بن مسلمہ اور ان کے شوہر اسعدؓ بن ربیع کے حق میں اس کا نزول ہوا۔ یا حضرت رافع بن خدیج کے حق میں ہوا۔ جنہوں نے بنت محمدؓ سے نکاح کیا تھا اس وقت خویلہ جوان تھیں لیکن جب پیری آگئی تو رافع نے کسی دوسری بیوی کو ان پر ترجیح دی اور ان سے الگ ہو گئے بنت محمد بن مسلمہ نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر اس بات کی شکایت کی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

حاکم نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ آیت وَالصُّلْحُ خَیْرٌ اس شخص کے متعلق نازل ہوئی جس کے نکاح میں ایک عورت تھی اور اس سے اس کے بچے بھی تھے لیکن اس شخص نے اس کو طلاق دے کر دوسری عورت سے نکاح کرنا چاہا عورت نے اس کی رضامندی کے لئے کہا تم مجھے اپنے پاس رہنے دو اور مجھے اپنی باری کی ضرورت نہیں۔ بغوی نے سعید بن جبیرؒ کا قول نقل کیا ہے کہ ایک شخص تھا جس کی بیوی بوڑھی ہو گئی تھی۔ اس شخص کی اس بیوی سے بچے بھی تھے۔ مرد نے اس کو طلاق دے کر کسی دوسری عورت سے نکاح کرنا چاہا عورت نے کہا مجھے طلاق نہ دو۔ اپنے بچوں پر مجھے رہنے دو اور اگر چاہو تو دو ماہ میں میرے لئے ایک باری مقرر کر دو نہ چاہو تو یہ بھی نہ کرو۔ مرد نے جواب دیا اگر تو اس پر رضامند ہے تو مجھے بھی یہ صورت پسند ہے۔ پھر وہ شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور واقعہ عرض کیا اس پر آیت وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ نازل ہوئی۔

وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ اور انسانی طبائع سے حرص غائب نہیں ہوتی۔

یعنی کنجوسی نفس انسانی کے سامنے ہر وقت رہتی ہے کبھی غائب نہیں ہوتی آدمی کی طبیعت کے خمیر میں ہی کنجوسی داخل ہے۔ شُحّ کا معنی ہے حرص آمیز کنجوسی۔ صحاح و قاموس۔ یعنی اکثر حالات میں کسی سے کنجوسی دور نہیں ہوتی۔ نہ عورت کو گوارا ہوتا ہے کہ مرد اس کی طرف سے منہ پھیر لے اور اس کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کرے نہ مرد کو گوارا ہوتا ہے کہ عورت کو (ہر حالت میں) اپنے پاس رکھے اور اس کے حقوق ادا کرتا رہے۔ یہ جملہ بھی معترضہ ہے پہلا جملہ صلح کی ترغیب کے لئے تھا اور یہ جملہ اپنے اپنے حق پر اڑے رہنے کی توجیہ کی تمہید کو ظاہر کر رہا ہے۔

وَاِنْ تُحْسِنُوْا اور اگر تم آپس کی معاشرت اچھی رکھو گے یعنی مرد عورت کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے گا اور خواہ

دل نہ چاہے مگر بیوی کے ساتھ انصاف قائم رکھے گا اور بیوی شوہر کے حقوق ادا کرتی رہے گی خواہ اس کو خود نا گوار ہو۔

وَتَتَّقُوْا اور بچتے رہو گے یعنی نشوز اور اعراض اور حق تلفی سے بچتے رہو گے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾ تو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بخوبی باخبر ہے خواہ دوسرے کے ساتھ بھلائی کرو یا برائی وہ اس کا بدلہ تم کو دے گا۔ اللہ کا علم جزاء اعمال کا سبب ہے بجائے جزو سزا کے علم کا ذکر کر دیا جیسے سبب کو مسبب کے قائم مقام ذکر کر دیا جاتا ہے۔

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ اور (لوگو) تم عورتوں میں (ہر طرح کی) برابری نہیں کر سکتے یعنی جس بیوی سے قلبی محبت ہے اس کی طرف دل کا جھکاؤ نہ ہونا ناممکن ہے۔ کامل برابری تو یہ ہے کہ مصارف ذمہ داری، التفات نظر، معاملات، گفتگو، دل لگی، طبیعت کے جھکاؤ (اور صنفی قربت) وغیرہ میں برابری ہو (اور یہ ناممکن ہے اسی لئے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقسیم میں تو سب عورتوں کے ساتھ برابری کرتے تھے اور پھر دعا فرماتے تھے۔ اے اللہ! میرے بس میں جو کچھ ہے اس میں میری طرف سے یہ برابری کی تقسیم ہے۔ لیکن جو بات میرے قبضے میں نہیں صرف تیرے اختیار میں ہے۔ اس میں (برابری نہ ہونے پر) تو میری پکڑ نہ کرنا۔ یعنی محبت میں (برابری نہ ہونے پر مواخذہ نہ کرنا کیونکہ دل کا جھکاؤ تیرے اختیار میں ہے میرے قبضہ میں نہیں ہے) امام احمد اور چاروں اصحاب صحاح اور ابن حبان اور حاکم نے یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے بیان کیا ہے اور اصحاب سنن اربعہ اور دارمی نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے۔

وَلَوْ حَرَصْتُمْ اگرچہ تم کتنی ہی اس کی خواہش کرو۔

فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ پھر بھی (اپنے عمل کو دلی رغبت کے تابع نہ بنا دینا اور) کامل طور پر جھک نہ جانا۔ جس کی طرف رغبت نہ ہو اس پر مصارف اور باری کی تقسیم میں ظلم کرو۔

فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ اور اس کو ادھر میں لٹکی ہوئی کی طرح چھوڑ دو کہ وہ نہ رانڈ رہے نہ سہاگن، حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کی دو عورتیں ہوں اور وہ ایک کی طرف مڑ جائے (اور دوسری سے منہ پھیر لے) قیامت کے دن وہ ایسی حالت میں آئے گا کہ اس کا ایک پہلو ٹیڑھا ہو گا۔ رواہ اصحاب السنن الار بعۃ والدارمی۔

وَاِنْ تُصْلِحُوْا اور اگر تم (آپس کے بگڑے ہوئے امور کی) اصلاح کر لو گے۔

وَتَتَّقُوْا اور (آئندہ بگاڑ سے) بچتے رہو گے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۲۹﴾ تو اللہ معاف کرنے والا اور مہربان ہے (پچھلے قصور کو معاف کر دے گا)۔

وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا اور اگر دونوں (میاں بی بی طلاق کی وجہ سے) الگ الگ ہو جائیں گے۔

يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ تو اللہ اپنی قدرت سے، دونوں میں سے کسی کو دوسرے کا محتاج نہ رکھے گا۔ عورت کو دوسرا شوہر دے دے گا اور مرد کو دوسری بیوی۔ سعۃ کا معنی ہے وسعت اور قدرت۔

وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا اور اللہ وسعت والا ہے یعنی اس کی رحمت میں بڑی سمائی ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے یا وسعت والا ہے مگر اس کی وسعت بے کیف ہے۔ ہر خیر اور ہر وجود اس کی خیر اور اس کے وجود کا پرتو ہے۔

حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾ حکمت والا ہے یعنی اس کے افعال و احکام پُر حکمت ہیں۔

مسئلہ :- سنت رسول اللہ اور اس آیت کا اقتضاء ہے کہ تمام بیویوں کی باری (اور مصارف) کی تقسیم میں برابری رکھنا شوہر پر واجب ہے برابری نہ رکھنے میں اللہ کی نافرمانی ہے قاضی پر بھی واجب ہے کہ جس عورت کی حق تلفی ہو رہی ہو اس کو ڈگری دے لیکن تسویہ اور برابری جماع میں ضروری نہیں کیونکہ جماع بغیر طبعی نشاط کے نہیں ہوتا۔ اور طبعی جوش انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ ہاں شب باشی میں برابری واجب ہے۔

اگر کسی کے نکاح میں ایک آزاد عورت اور ایک باندی ہو تو آزاد عورت کی باریاں دو اور باندی کی باری ایک ہو گی۔ آثار صحابہ میں یہی آیا ہے ابن ہمام (شارح ہدایہ) نے لکھا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ و حضرت علیؓ نے یہی حکم دیا تھا۔ امام احمد نے حضرت

علیؓ کے فیصلہ سے استدلال کیا ہے۔ ابن حزم نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے کیونکہ اس کے راویوں میں ایک شخص منہال بن عمر اور دوسرا ابن ابی لیلی ہے اور یہ دونوں ضعیف ہیں لیکن ابن حزم کی یہ جرح نا قابل اعتبار ہے یہ دونوں راوی ثقہ اور حافظ تھے۔

نئی بیوی بھی پرانی بیویوں کی طرح باری کی تقسیم میں امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک برابر ہے کیونکہ حدیث مذکور مطلق ہے باقی تین اماموں کے نزدیک نئی بیوی اگر ناکت خدا ہو تو اس کے پاس پیہم ایک ہفتہ تک رہے اور دوشیزہ نہ ہو تو تین رات مسلسل رہے اس مدت کے بعد سب کی باری برابر کر دے نئی بیوی کے پاس ابتداء جو راتیں گزاری ہوں پرانی بیویوں کے لئے ان کی تلافی واجب نہیں۔

ابو قلابہؒ کی روایت ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا سنت ہے کہ اگر پہلی بیوی پر کسی کنواری سے نکاح کرلے تو اس کے پاس سات رات رہے اور اگر غیر دوشیزہ سے نکاح کیا ہو تو اس کے پاس تین رات رہے پھر سات اور تین راتوں کے بعد باری کی (برابر) تقسیم کرے ابو قلابہ نے یہ روایت بیان کرنے کے بعد کہا اگر میں چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ حضرت انسؓ نے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بیان کیا تھا۔ متفق علیہ۔

اگر کوئی شخص سفر کو جائے تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک حالت سفر میں کسی بیوی کو باری کا حق نہیں ہے اس لئے جس کو چاہے ساتھ لے جائے لیکن مستحب یہ ہے کہ قرعہ اندازی کر دے اور جس کا نام نکل آئے اس کو ساتھ لے جائے۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک بغیر دوسری کی رضامندی یا قرعہ اندازی کے کسی ایک کو ساتھ لے جانا جائز نہیں۔ امام مالکؒ کے دونوں قول مروی ہیں۔ اب اگر دوسری کی رضامندی یا قرعہ اندازی کے بغیر کسی ایک کو ساتھ لے گیا تو امام شافعیؒ و امام احمد کے نزدیک دوسری کے لئے تلافی کرنی واجب ہے لیکن امام ابو حنیفہؒ اور امام مالک تلافی کو واجب نہیں کہتے۔ امام شافعی نے اپنے مسلک کے ثبوت میں حضرت عائشہؓ کی روایت کردہ حدیث پیش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر کا ارادہ کرتے تو بیویوں میں قرعہ ڈالتے جس کا نام نکل آتا اسی کو ساتھ لے جاتے۔ متفق علیہ۔

امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کا یہ عمل بیویوں کا دل رکھنے کے لئے تھا۔ بطور وجوب نہ تھا صرف استحبابی تھا ورنہ حالت سفر میں کسی عورت کا کوئی حق نہیں۔ دیکھو اگر مرد کسی کو بھی ساتھ نہ لے جائے تو باجماع علماء مرد کو اس کا حق ہے لہذا کسی ایک کو ساتھ لے جانے کا بھی حق ہے لیکن شافعی کی طرف سے اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ دونوں باتوں میں فرق ہے اگر کسی کو ساتھ نہیں لے جائے گا تو (مرگ انبوہ جشنے دارد) کسی کے دل میں جذبۂ غیرت وحسد کا ابھار نہ ہوگا اور کسی ایک کو لے جائے گا اور دوسری کو چھوڑ جائے گا تو اس کو دکھ ہوگا۔

اگر کسی بی بی نے اپنی باری سوکن کو دے دی ہو تو اس کی باری ساقط ہو جائے گی۔ حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے کہ حضرت سودہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے اپنی باری عائشہؓ کو دے دی چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کے دو دن کر دیئے تھے ایک دن خود ان کا اور ایک دن حضرت سودہ والا۔ متفق علیہ۔

جس عورت نے اپنی باری سوکن کو دے دی ہو اس کو اپنی باری لوٹا لینے کا حق ہے کیونکہ جب تک باری کا دن آنہ جائے اس کا وجوبی حق نہیں پیدا ہوتا اور جب تک وجوب نہ ہو اسقاط کا کوئی معنی نہیں (گویا رجوع کا معنی ہوا عدم سقوط اور عدم سقوط کی بناء عدم وجوب پر ہے اور وجوب وقت سے پہلے نہیں ہوتا لہذا رجوع صحیح ہے) بغوی نے سلیمانؒ بن یسار کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے آیت لَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا کے ذیل میں فرمایا اگر عورت اپنے بعض مصارف یا باری کو معاف کر دینے پر رضامند ہو گئی ہو تو جب تک رضامند رہے جائز ہے اور اگر رضامندی کے بعد پھر انکار کر دے تو اس کا حق اس کو واپس مل جائے گا۔

مسئلہ :- مرض کی وجہ سے عورت کی رضامندی کے بغیر اس کی باری ترک کر دینا جائز نہیں رضامند ہو تو جائز ہے۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مرض وفات کی حالت میں (روزانہ فرماتے تھے میں کل کہاں ہوں گا اس سے آپ

کی مراد حضرت عائشہؓ کی باری معلوم کرنا ہوتی تھی (یہ دیکھ کر) بیویوں نے اجازت دیدی کہ آپ جہاں چاہیں رہیں چنانچہ آپ حضرت عائشہؓ کے گھر رہنے لگے اور وہیں وفات پائی۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اور جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے یعنی سب اسی کی مخلوق ہے اور وہی سب کا مالک ہے۔ اس جملہ میں اللہ کی وسعت وقدرت پر تنبیہ ہے۔

وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ تم سے پہلے جن کو کتاب دی گئی ان کو اور تم کو ہم نے ہدایت کردی ہے۔ الکتٰب سے جنس کتاب مراد ہے (کوئی آسمانی کتاب ہو یا صحیفہ ہو) اور اہل کتاب سے مراد ہیں یہودی اور عیسائی اور ان سے پہلے انبیاء کی امتیں۔

اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ کہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ تقویٰ سے مراد ہے شرک سے پرہیز رکھنا۔ کیونکہ آگے آیا ہے۔

وَاِنْ تَكْفُرُوْا اور اگر تم کفر کرو گے (اللہ کی توحید کا انکار کرو گے)۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تقویٰ سے مراد ہو گناہوں سے بچنا اور کفر سے مراد ہو ناشکری یعنی اللہ کی طاعت نہ کرنا اور اس کے اوامر ونواہی کا پابند نہ ہو۔ یا تقویٰ سے مراد غیر اللہ کے ساتھ وابستگی سے دل کو محفوظ رکھنا اور کفر سے مراد ہے اللہ کے سوا کسی اور سے دل لگانا۔

فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ تو (سمجھ لو کہ) اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے (تمہارے کفر سے اس کا کوئی نقصان نہ ہوگا) وہ جس طرح چاہے تم کو عذاب دے سکتا ہے اس کے عذاب سے کوئی بچا نہیں سکتا یا یہ مطلب کہ اگر تم کفر کرو گے تو اس کو کیا پرواہ آسمانوں اور زمینوں کے فرشتے اس کے ہیں جو تم سے زیادہ اس کے اطاعت گزار ہیں یا یہ مطلب ہے کہ وہ تم سے بے نیاز ہے نہ اس کو تمہاری عبادت سے فائدہ نہ تمہارے کفر سے نقصان نفع نقصان تمہارا ہی ہے اس نے اپنی مہربانی سے تم کو بعض اعمال کرنے کا حکم دیا اور بعض کی ممانعت کی ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ اور اللہ بے نیاز اور محمود ہے یعنی ساری مخلوق اور اس کی طاعت کی اس کو ضرورت نہیں اور مخلوق اس کی حمد کرے یا نہ کرے وہ بہرحال محمود ہے آیت فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ کے آخری مطلب کی توضیح اور تاکید اس آیت سے ہو رہی ہے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ یہ جملہ آئندہ جملہ کے مضمون کی تمہید ہے تیسری مرتبہ ذکر کرنے سے ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ اس امر کے قابل اور مستحق ہے کہ اس پر بھروسہ کیا جائے۔

وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾ ممکن ہے کہ اس جملہ کا تعلق آیت يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ سے ہو کیونکہ یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ مرد اور عورت دونوں کی کارسازی کا اللہ ذمہ دار ہے اور اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی ذمہ داری کافی ہے۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اگر وہ (تم کو فنا کرنا) چاہے تو تم کو فنا کردے۔

اَيُّهَا النَّاسُ اے لوگو! کیونکہ اس کی مشیت تم کو فنا کرنے کے لئے کافی ہے۔

وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ اور دوسری قوم کو (تمہاری جگہ) لے آئے جو تم سے زیادہ اللہ کی اطاعت گزار ہو یا یہ مراد ہے کہ اگر اللہ چاہے تو اے بنی آدم تم کو فنا کردے اور تمہاری جگہ دوسری مخلوق کو لے آئے۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾ اور اللہ اس (فنا کرنے اور پیدا کرنے) پر پوری قدرت رکھتا ہے اس کو کوئی چیز عاجز نہیں کرسکتی۔ اس آیت میں اللہ کے غنی اور قادر ہونے کی تاکید ہے اور جو لوگ کفر اور نافرمانی کرتے ہیں ان کے لئے دھمکی ہے۔

سعید بن منصور اور ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی

تو رسول اللہ ﷺ نے دست مبارک حضرت سلمانؓ کی پشت پر مار کر فرمایا یقیناً وہ لوگ اس کی قوم والے ہوں گے۔ اس حدیث کی روشنی میں اس آیت کا مفہوم ویسا ہی ہوگا جیسے آیت اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ کا الخ

صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کا بیان منقول ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ سورۂ جمعہ نازل ہوئی جب آیت وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ اتری تو عرض کیا گیا یا رسول اللہ یہ کون لوگ ہیں حضورؐ نے دست مبارک حضرت سلمانؓ پر رکھ کر فرمایا اگر ایمان ثریا پر بھی ہوگا (یعنی زمین پر ایمان کا کہیں وجود نہیں رہے گا) تب بھی کچھ لوگ ان (کی قوم) میں کے ایمان کو حاصل کرلیں گے ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ اگر تم منہ پھیر لو گے تو اللہ تمہارے علاوہ کچھ اور لوگوں کو لے آئے گا پھر وہ لوگ تم جیسے (کافر بد اعمال) نہ ہوں گے تلاوت فرمائی صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ کون لوگ ہوں گے حضورؐ نے دست مبارک سلمانؓ کی ران پر مار کر فرمایا اور اس کی قوم والے اگر دین ثریا پر بھی ہوگا تو فارس کے کچھ لوگ اس کو پالیں گے[1] ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ ہی کی روایت سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے عجمیوں کا تذکرہ آیا تو آپؐ نے فرمایا میں ان پر یا (فرمایا) ان میں سے بعض پر تم سے یا (فرمایا) تمہارے بعض لوگوں سے زیادہ اعتماد رکھتا ہوں۔

میں کہتا ہوں شاید ان احادیث میں حضرت شیخ بہاؤالدین نقشبندی اور آپ جیسے دوسرے مشائخ ماوراء النہر کی طرف اشارہ ہے یہ بزرگ اگرچہ عجمی النسل نہ تھے مگر وطنیت کے اعتبار سے عجمی تھے اکثر حضرات رسول اللہ ﷺ کی آل اور صحابہؓ کرام کی نسل سے تھے انہوں نے ہی رسول اللہ ﷺ کی مردہ سنت کو زندہ کیا اور کبھی بدعت کو سیئہ ہو یا حسنہ پسند نہیں کیا، مولانا جامی نے کیا خوب کہا ہے۔

سکہ کی در یثرب و بطحا زدند نوبت آخر بنجارا زدند!

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ماوراء النہر کے محدثین کرام اور فقہاء عظام کی طرف اشارہ ہو جیسے امام ابو عبداللہ بخاری رحمۃ اللہ وغیرہ۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا جو دنیوی ثواب کا خواستگار ہے (یعنی صرف دنیوی ترقی چاہتا ہے) جیسے دکھاوٹ کے لئے اچھے اعمال کرنے والے اور اقتدار حکومت یا مال کے لئے جہاد کرنے والے۔

فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ تو (وہ سخت نقصان میں ہے اور طلب میں کوتاہی کر رہا ہے کیونکہ) اللہ ہی کے پاس دنیا اور آخرت کا ثواب ہے۔ لہٰذا دونوں کے لئے دعا کرنی چاہئے اور یوں کہنا چاہئے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً یا اعلیٰ ثواب کی طلب کرنا چاہئے (اور اعلیٰ ثواب آخرت کا ثواب ہے) کیونکہ جو شخص محض اللہ کے لئے خلوص نیت کے ساتھ جہاد کرتا ہے اس کو دنیا میں مال غنیمت ملتا ہے اور آخرت میں تو ایسی جزا ملے گی کہ دنیوی مال غنیمت اس کے مقابلہ میں نفی سے زائد نہیں ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾ اور اللہ بڑا سننے والا اور دیکھنے والا ہے یعنی اللہ لوگوں کی اغراض کو جانتا ہے ہر شخص کے مطابق بدلہ دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص کی ہجرت مال حاصل کرنے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہوگی اس کی ہجرت (اللہ کے لئے نہ ہوگی بلکہ) اسی مقصد کے لئے ہوگی جس کے لئے اس نے وطن کی سکونت چھوڑی ہوگی متفق علیہ من حدیث عمرؓ بن الخطاب۔ ابن ابی حاتم نے سدی کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں دو شخص باہمی نزاع لے کر حاضر ہوئے ایک مالدار تھا دوسرا نادار حضور کا جھکاؤ نادار کی طرف تھا کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ یہ نادار

۱۹ ع ۸ ۱۲

[1] شیخ محمد بن یوسف صالحی نے کہا کہ شیخ نے یعنی شیخ جلال الدین سیوطی'' نے فرمایا اس حدیث میں امام ابو حنیفہ'' اور آپ کے ساتھی مراد ہیں، شیخ محمد بن یوسف صالحی نے کہا سیوطی کے اس قول میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ اہل فارس میں سے کوئی بھی امام ابو حنیفہ'' اور آپ کے ساتھیوں کے علمی درجہ کو نہیں پہنچا اور سلمان فارسی امام ابو حنیفہ'' کے جد اعلیٰ تھے۔ ''از مفسر قدس سرہٗ''

تو مالدار پر ظلم کر ہی نہیں سکتا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ اے ایمان والو انصاف پر خوب قائم رہنے والے ہو جاؤ یعنی انصاف قائم کرنے میں انتہائی کوشش کرو اور ہمیشہ انصاف کرنے پر پابند رہو لہٰذا قاضی پر واجب ہے کہ مدعی اور مدعی علیہ دونوں سے مساویانہ سلوک کرے بیٹھنے اور کسی کی طرف متوجہ ہونے میں امتیاز سے کام نہ لے حضرت ام سلمہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص قاضی ہونے کی مصیبت میں مبتلا کر دیا جائے تو فریقین کی نشست اشارہ اور نظر میں مساوات رکھے کسی ایک پر دوسرے سے زیادہ نہ چیخے (یعنی لب و لہجہ اور آواز میں بھی دونوں کے ساتھ مساوی سلوک کرے) رواہ اسحاق بن راہویہ فی المسند والدار قطنی۔

شُھَدَآءَ لِلّٰہِ اللہ کیلئے گواہی دینے والے یعنی تم خالص توجہ اللہ ادائے شہادت کرو (کوئی نفسانی غرض شامل نہ ہو)

وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ج خواہ تمہاری گواہی خود تمہارے خلاف پڑے یا تمہارے ماں باپ اور اقرباء کے خلاف پڑے یا تمہارے ماں باپ اور اقربا کے خلاف تم شہادت نہ چھپاؤ۔ حق کہو نہ کسی دولت مند کی دولت اداء شہادت سے مانع ہو نہ کسی محتاج کا افلاس موجب رحم۔ کذا اخرج البیہقی وغیرہ عن ابن عباسؓ۔

اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا اگر وہ شخص (جس پر شہادت دی جا رہی ہے) غنی ہو یا محتاج تم شہادت سے نہ رکو۔ کسی مالدار کی دولت یا غریب پر رحم کرنے کی وجہ سے گواہی میں کجی نہ اختیار کرو۔

فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا قف (تمہاری بہ نسبت) اللہ کا ان دونوں سے تعلق زیادہ ہے (غنی اور فقیر دونوں کو اللہ نے پیدا کیا اور امیر یا غریب بنایا ہے) اگر ان کے فائدے یا نقصان کی شہادت مصلحت کے خلاف ہوتی تو اللہ شہادت کا قانون جاری ہی نہ کرتا۔ فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا۔ شہادت کو ترک نہ کرنے کے حکم کی علت ہے (چونکہ اللہ کا تعلق غریب اور امیر دونوں سے زیادہ ہے وہ ہی دونوں کا خالق، رازق، ربّ اور کرتا دھرتا ذمہ دار ہے اور اس نے واقعی شہادت کا حکم دیا ہے اس لئے کسی کو فائدہ پہنچے یا ضرر تم سچی شہادت دو)۔

ایک شبہ

بِھِمَا (تثنیہ) کی ضمیر غنی اور فقیر دونوں کی طرف راجع ہے حالانکہ ان دونوں لفظوں کے درمیان (واو عاطفہ نہیں بلکہ اَوْ (تردیدیہ) ہے دونوں کا مجموعہ مراد نہیں ہو سکتا۔ (اور تثنیہ کی ضمیر واحد کی طرف راجع نہیں ہو سکتی اس لئے واحد کی ضمیر ہونی چاہئے تھی۔

جواب :- ضمیر (صرف غنی یا فقیر کی طرف راجع نہیں کہ ضمیر واحد کا ذکر ضروری ہو بلکہ) مذکورہ بالا یعنی جنس غنی و فقیر کی طرف راجع ہے۔ تفتازانی نے لکھا ہے کہ ظاہر کلام یعنی واحد کی ضمیر کو چھوڑ کر تثنیہ کی ضمیر ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کی اولویت کی تعمیم مقصود ہے اگر واحد کی ضمیر ذکر کی جاتی تو واحد کی طرف راجع ہوتی اور یہ خیال پیدا ہوتا کہ اللہ کی اولویت اسی ایک کے ساتھ مخصوص ہے۔

تفتازانی کے اس قول پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ واحد کی تعین نہیں ہے کہ اسی واحد کی طرف راجع ہو اور خصوصیت کا خیال پیدا ہو (واحد غیر معین کی طرف ضمیر کو راجع کرنے سے اختصاص کا وہم بھی پیدا نہیں ہو سکتا رضی نے لکھا ہے اگر دو چیزیں مذکور ہوں اور ایک کا عطف دوسرے پر ہو رہا ہو تو ضمیر کو واحد اور تثنیہ لانا جائز ہے جو مراد ہو (ایک یا دو) ویسی ہی ضمیر لائی جائے گی۔

میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے ضمیر تثنیہ کا مرجع (غنی اور فقیر نہ ہو بلکہ) جس کی طرف سے یا جس کے خلاف شاہد شہادت دی جا رہی ہو وہی دونوں ضمیر کا مرجع ہوں ان دونوں کا ذکر (اگرچہ لفظاً نہیں ہے مگر کلام کا سیاق ان پر دلالت کر رہا ہے مطلب یہ

ہے کہ ضابطہ شہادت کے اجراء میں دونوں کی مصلحت ہے مدعی کی بھی اور منکر کی بھی جس کی طرف سے شہادت دی جائے اس کا مفاد فوری ہو جاتا ہے (اس کو ڈگری مل جاتی ہے) اور مدعی علیہ جس کے خلاف شہادت دی جا رہی ہو آئندہ فائدہ کا مستحق قرار پاتا ہے حقوق العباد سے اس کو سبکدوشی حاصل ہوتی ہے پس اللہ دونوں سے قریبی تعلق رکھنے والا ہے۔

شُهَدَآءَ لِلّٰهِ کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ کی وحدانیت ذات، کمال صفات اس کی کتابوں اور پیغمبروں کی صداقت اور احکام کی حقانیت کے گواہ بن جاؤ خواہ اس شہادت سے تمہاری اپنی ذات والدین اور اقارب کو دکھ پہنچ جائے قتل کر دیئے جاؤ یا مال تباہ ہو جائے اور مفلس ہو جاؤ کیونکہ کوئی مالدار ہو یا نادار دونوں کے لئے ان کی جان و مال سے زیادہ اللہ اولیٰ (اور اعلیٰ) ہے اس لئے جان سے زیادہ اللہ کے احکام قابل لحاظ ہونے چاہئیں۔

فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ سو تم خواہش نفس کا اتباع نہ کرنا کہیں حق سے ہٹ جاؤ، یا یہ مطلب ہے کہ عدل سے مڑ جانا برا ہے اس برائی کو ترک کرنے کے لئے تم خواہشات پر نہ چلو یا یہ مراد ہے کہ تم اپنی خواہش پر نہ چلو تاکہ تم عادل رہو۔

وَاِنْ تَلْوٗٓا اور اگر تم کج بیانی کرو گے یعنی شہادت میں کجی اختیار کرو گے اور سچی شہادت سے زبان پھیر لو گے۔ بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اگر تم اپنی شہادت دوسروں کے سپرد کر دو گے (یعنی ادائے شہادت کو دوسروں کا تابع بنا دو گے)۔

بعض اہل تفسیر نے کہا ہے کہ اس آیت میں حکام کو خطاب ہے یعنی اے حاکمو اگر تم اپنا رخ کسی ایک فریق کی طرف جھکا دو گے (اور صرف مدعی یا مدعی علیہ کی طرف مائل ہو جائے گے)۔

اَوْ تُعْرِضُوْا یا پہلو تہی کرو گے یعنی شہادت حق یا حکومت منصفانہ سے روگردانی کرو گے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝۱۳۵ اللہ تمہارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے یعنی تم کو سزا دے گا۔

—يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اے ایمان والو تم اعتقاد رکھو اللہ اور اس کے رسول پر، ایمان کی حقیقت اور تکمیل یہ ہے کہ مومن اپنی بصیرت فکر سے پہچان لے کہ اللہ ہی کا وجود اصلی اور حقیقی ہے وہی ہر چیز کا خالق اور نقصان یا نفع پہنچانے والا ہے اس کے علاوہ کسی میں حقیقی اور اصلی کمال و حسن نہیں جو کچھ ہے اسی کا دیا ہوا ہے اس عارفانہ ایمان کے بعد مومن کا علمی فکری اور جذباتی تعلق سوائے اللہ کے کسی سے نہیں رہے گا اور اس علاقہ محبت کی وجہ سے اللہ کے اوامر و نواہی کی پابندی اس کی فطرت میں داخل ہو جائے گی آخری نتیجہ یہ ہو گا کہ آگ میں جھونکے جانے سے بھی زیادہ اس کو ارتکاب گناہ سے نفرت ہو جائے گی۔

بغوی نے ابو العالیہ اور ایک جماعت علماء کا قول نقل کیا ہے کہ آیت مذکورہ میں اہل ایمان کو خطاب ہے اور مطلب یہ ہے کہ اے اہل ایمان تم ایمان پر جم جاؤ اور مضبوطی کے ساتھ قائم رہو۔ اس تفسیر کا مغز بھی وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا (یعنی اے اہل ایمان، کمال ایمان کا درجہ حاصل کرو اور حقیقی مومن بن جاؤ)۔

ضحاک کے نزدیک یہود و نصاریٰ کو خطاب ہے۔ اور اٰمنوا سے مراد ہیں وہ لوگ جو حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ پر ایمان لا چکے ہیں یعنی اے وہ لوگو جو موسیٰ اور عیسیٰ کو مانتے ہو محمد اور قرآن پر بھی ایمان لاؤ بعض کے نزدیک مشرکوں کو خطاب ہے یعنی اے لوگو جو لات و عزیٰ کو مانتے ہو اللہ اور محمد اور قرآن پر ایمان لاؤ

بعض کے نزدیک منافقوں کو خطاب ہے یعنی اے وہ لوگو جو صرف زبانوں سے ایمان لائے ہو دلوں سے اللہ اور اس کے رسول اور قرآن کو مانو۔ یہ تمام اقوال کمزور ہیں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر نہ یہودیوں کو خطاب کیا جاتا ہے نہ عیسائیوں کو نہ مشرکوں کو نہ منافقوں کو کیونکہ زبانی ایمان تو مجازی ایمان ہے حقیقت میں ایمان وہی ہے جو دل سے ہو اور مجازی معنی کے مقابلہ میں حقیقی معنی (اگر متعذر نہ ہوں تو) اولیٰ ہوتے ہیں۔

(بغوی نے کلبی کا بیان بروایت ابو صالح لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔ حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول ثعلبی نے

بھی نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول عبداللہؓ بن سلام، اسدؓ بن کعب، اسیدؓ بن کعب، ثعلبہؓ بن قیس، عبداللہؓ بن سلام کے بھانجے سلامؓ اور بھتیجے سلمہؓ اور یامین بن یامین کے متعلق ہوا تھا۔ ان لوگوں نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا تھا کہ ہمارا ایمان آپ پر اور آپ کی کتاب پر بھی ہے اور موسیٰؑ اور توراۃ اور عزیر پر بھی ان کے علاوہ ہم کسی کتاب اور پیغمبر کو نہیں مانتے اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور یہ تمام حضرات مسلمان ہو گئے۔

وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ اور اس کتاب (یعنی قرآن) پر جو اللہ نے تھوڑی تھوڑی اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی ہے

وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ اور ان کتابوں پر جو اللہ نے قرآن سے پہلے (بشکل مجموعہ) نازل کی تھیں یعنی توراۃ، انجیل، زبور اور تمام کتابیں صحیفے۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اور جو شخص نہ مانے اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس کے پیغمبروں کو اور روز قیامت کو۔ یعنی کسی ایک پیغمبر یا کتاب یا فرشتے کا انکار کر دے۔

فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۱۳۶ تو بس وہ گمراہی میں بہت دور جا پڑا۔
یعنی مقصد (راہ راست) سے اتنی دور جا پڑا کہ اب صحیح راستہ کی طرف اس کے لوٹنے کی امید نہیں رہی۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک پر ایمان دوسرے پر ایمان لانے سے وابستہ ہے کسی ایک کا انکار گمراہی اور اللہ سے دوری کا موجب ہے اور اگر سب کا انکار ہو تو بدرجہ اولیٰ کامل گمراہی ہے۔

میں کہتا ہوں بلکہ اللہ کی کسی نعمت کا انکار بھی بڑی گمراہی ہے جیسے فرقہ معتزلہ اللہ کے متکلم ہونے کا انکار کرتا ہے اور بندوں کے افعال کا خالق اللہ کو نہیں مانتا اور یہ بھی اس کا قول ہے کہ اللہ بعض چیزوں کا ارادہ کرتا ہے مگر اس کی مراد پوری نہیں ہوتی۔ اس سے اللہ کی صفات واقعیہ کا انکار لازم آتا ہے۔

بعض اکابر کا قول ہے کہ معتزلہ بندوں کو اپنے افعال کا خالق قرار دیتے ہیں اور بندوں کا خالق اللہ کو مانتے ہیں تو گویا بندوں کے افعال کا خالق اللہ کو مانتے ہیں مگر براہ راست نہیں بلکہ بندوں کے ذریعہ سے اس زمانہ کے عوام کا حال تو معتزلہ سے بھی بدتر ہے وہ افعال کی نسبت اللہ کی طرف کرنے سے سراسر غافل ہیں ان کو تو بادشاہوں یا چوروں کی ذات سے یا زہر و تریاق سے نفع اور ضرر کی وابستگی رہتی ہے اور اسی کے وہ قائل ہیں اس غفلت کو دور کرنے کے لئے صوفیہ کا دامن پکڑنا (اس زمانہ میں) لازم ہے تاکہ بصیرت سے غفلت کا پردہ اٹھ جائے اور اللہ کے سوا تمام مخلوق کا حجاب نظر سے ہٹ جائے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے پھر مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے۔

قتادہ نے کہا آیت میں یہودی مراد ہیں جو موسیٰؑ پر ایمان لائے پھر گوسالہ پرستی کی وجہ سے کافر ہو گئے پھر (توبہ کر کے) توراۃ پر ایمان لائے، پھر عیسیٰؑ کا انکار کیا پھر محمدؐ اور تمام انبیاء کی نبوت کا انکار کر کے کفر میں بڑھتے چلے گئے۔ بعض اہل تفسیر کے نزدیک تمام اہل کتاب مراد ہیں جو اپنے پیغمبر پر ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے اور جو کتاب اس پیغمبر پر نازل ہوئی اس کو سچا ماننے کے بعد پھر کفر کرنے لگے یعنی اس کتاب پر عمل چھوڑ دیا پھر محمد ﷺ کا انکار کر کے کفر میں مزید ترقی کی۔

بعض لوگوں نے کہا کہ آیت میں وہ مرتد مراد ہیں جو ایمان لا کر پھر گئے، پھر مسلمان ہو گئے، پھر مرتد ہو گئے، پھر مسلمان ہو گئے پھر اسلام سے لوٹ گئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ایسی توبہ قابل قبول نہیں کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے۔

لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ۝۱۳۷ۭ اللہ ان کو ہرگز نہیں بخشے گا نہ ان کو راستہ دکھائے گا۔ لیکن اجماع علماء ہے کہ مرتد کی (خواہ کتنی ہی مرتبہ مرتد ہوا ہو) توبہ قبول ہے مجاہد نے کہا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا سے

مراد ہے مرتے دم تک کافر رہنا۔ بعض علماء نے آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ایسے لوگوں سے کفر چھوڑنا بعید ہے اور کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ چڑھ جاتا ہے اس لئے ایمان پر ثابت قدم رہنا ناممکن ہے۔ ان کی بصیرت نابینا ہو جاتی ہے اس لئے حق ان کو سجھائی ہی نہیں دیتا۔

مرتدوں کے متعلق اس آیت کا نازل ہونا اس بات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ آئندہ آیت میں منافقوں کے عذاب کا بیان ہے۔

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۝ منافقوں کو خوش خبری سنا دو اس امر کی کہ ان کے لئے ہی بڑی دردناک سزا ہے۔ منافقوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ ﷺ یا خالص ایمان والوں کے سامنے آکر تو ایمان کا اظہار کرتے تھے اور تنہائی میں جب اپنے سرداروں سے ملتے تھے تو کفر ظاہر کرتے تھے پھر اس منافقت پر جم جاتے اور ملک میں بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش پر اصرار کرنے کی وجہ سے کفر میں بڑھتے چلے جاتے تھے۔

عذاب کی وعید (اور تکلیف رساں خبر) کو بطور استہزاء خوشخبری سے تعبیر فرمایا ہے کذا قال الزجاج بعض علماء نے لکھا ہے کہ جس خبر کو سننے سے چہرہ پر تغیر آجائے اس کو بشارت کہتے ہیں خواہ خوشی کی خبر ہو یا نہ ہو۔

الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ جن کی حالت یہ ہے کہ کافروں کو دوست بناتے ہیں مومنوں کو چھوڑ کر یعنی یہودیوں کو اپنا مددگار اور یار غار بناتے ہیں کیونکہ یہودیوں کے طاقتور ہونے کا ان کو خیال ہوتا ہے۔

اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ کیا وہ کافروں کے پاس معزز ہونا (اور معزز رہنا) چاہتے ہیں یعنی کافروں کی مدد اور دوستی سے وہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف عزت اور قوت کے طلب گار ہیں۔ جملہ سوالیہ انکاریہ ہے (یعنی ان کو ایسا نہ کرنا چاہئے) یا استہزائیہ یا اظہار تعجب کے لئے ہے۔

فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝ سو اعزاز تو سارا خدا کے قبضہ میں ہے جسکو اللہ عزت نہ دے وہ عزت نہیں پاسکتا اور عزت اس نے اپنے دوستوں کے لئے لکھ دی ہے۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ۔

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اور اللہ قرآن میں یہ فرمان تمہارے پاس بھیج چکا ہے۔

اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ جب اللہ کے احکام کے ساتھ استہزاء اور کفر ہوتا ہوا سنو تو ان کے ساتھ نہ بیٹھو یعنی استہزاء اور کفر آیات کرنے والوں کے ساتھ نہ بیٹھو یُكْفَرُ اور يُسْتَهْزَاُ دونوں آیات لفظ اللہ سے حال ہیں اور ساتھ بیٹھنے کی ممانعت انہی دونوں حالتوں سے وابستہ ہے مطلقاً بیٹھنے کی ممانعت نہیں ہے۔

حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ جب تک کہ (استہزاء کے علاوہ) وہ کوئی اور بات شروع نہ کریں تو اس وقت کسی ضرورت سے ان کے پاس بیٹھنا جائز ہے اور بلاضرورت مکروہ ہے۔ حسن کا قول ہے کہ خواہ وہ استہزاء کو چھوڑ کر کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں تب بھی ان کے ساتھ بیٹھنا ناجائز ہے۔ اس آیت میں سورۂ انعام والی آیت کی طرف اشارہ ہے جو پہلے مکہ میں نازل ہوئی تھی اور فرمادیا تھا وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ۔ ضحاک نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن تک جتنے بدعتی ہوں گے سب اسی آیت کے حکم میں داخل ہیں۔

اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ کہ اس حالت میں تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے یعنی اے مسلمانو! جب تم کافروں اور آیات خداوندی کا مذاق اڑانے والوں کے ساتھ ان کے کفر و استہزاء کی حالت میں بیٹھو گے اور اس پر راضی ہو گے تو انہی جیسے کافر ہو جاؤ گے۔ ہاں اگر زبان سے کلمہ کفر نہ کہا جائے اور دل سے کفر پر راضی ہو تو منافق ہو جائے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْكٰفِرِیْنَ فِیْ جَهَنَّمَ جَمِیْعًا ﴿۱۴۰﴾ یقیناً اللہ منافقوں کو اور کافروں کو سب کو جہنم میں جمع کردے گا۔ یعنی جو لوگ کافروں کے پاس بیٹھ کر ان کے کفر و استہزاء پر راضی ہوتے ہیں اور جو لوگ قرآن کا مذاق اڑاتے ہیں ان سب کو اللہ جہنم کے اندر جمع کردے گا جس طرح وہ دنیا میں کفر و ہم نشینی پر جمع تھے۔

الَّذِیْنَ یَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ وہ ایسے ہیں کہ تم پر افتاد اور مصیبت پڑنے کے منتظر رہتے ہیں۔

فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ پھر اگر من جانب اللہ تمہاری فتح ہوگئی۔ یعنی لڑائی میں جیت ہوگئی اور مال غنیمت حاصل ہوگیا۔

قَالُوْۤا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ تو باتیں بناتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے یعنی کیا دین اور جہاد میں تمہارے ساتھی نہ تھے لہٰذا ہم کو بھی مال غنیمت کا حصہ دو۔

وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِیْنَ نَصِیْبٌ ۙ اور اگر کافروں کو کچھ نصیب ہوگیا یعنی مسلمانوں پر کچھ غلبہ مل گیا۔

قَالُوْۤا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَیْكُمْ تو کہتے ہیں کیا ہم مسلمانوں کے ساتھ مل کر تم پر غالب نہیں آنے لگے تھے مگر ہم نے تم کو چھوڑ دیا۔ استحواذ کا معنی ہے غلبہ پانا۔

وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ اور کیا ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچا نہیں لیا۔ یعنی کیا ہم نے مسلمانوں کو بے مدد نہیں چھوڑ دیا اور کیا تم کو ان کی خبریں نہیں بتائیں اور ان کے واقعات کی اطلاع نہیں دی (جس سے تم ہوشیار ہوگئے اور تم نے تیاری کرلی) مبرد نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کیا ہم نے تم کو تمہاری رائے سے نہیں روک دیا اور مسلمانوں میں شامل ہوجانے سے باز نہیں رکھا تھا۔

فَاللّٰهُ یَحْكُمُ بَیْنَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ پس (اے مسلمانو) تمہارے (اور منافقوں کے) درمیان قیامت کے دن اللہ ہی فیصلہ کرے گا۔ مومنوں کو جنت میں داخل کرے گا اور منافقوں کو دوزخ میں۔

شیخین نے صحیحین میں اور حاکم نے ایک طویل حدیث کے ذیل میں حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے لکھا ہے جب قیامت کا دن ہوگا تو ایک منادی ندا دے گا جو لوگ جس معبود کی پوجا کرتے رہے ہوں اسی کے پیچھے چلے جائیں ...... پھر اللہ فرمائے گا لوگو! ہر قوم اپنے معبود سے جا لگی اور تم ابھی یہیں ہو (تم کو کس کا انتظار ہے) وہ جواب دیں گے ہم اپنے رب کے انتظار میں ہیں۔ اللہ فوراً کسی قدر اپنی پنڈلی کھول دے گا دیکھتے ہی ہر (خالص) مومن سجدہ میں گر پڑے گا صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جو دکھاوٹ اور شہرت کے لئے سجدے کرتے تھے وہ سجدہ کریں گے تو ان کی پشت یک دم سپاٹ (تختہ) ہوجائے گی (جس کی وجہ سے سجدہ نہ کرسکیں گے) حاکم کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ جب وہ سجدہ کرنا چاہے گا تو پشت کے بل گر پڑے گا۔ (الحدیث)۔

وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِیْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا ﴿۱۴۱﴾ اور اللہ (اس فیصلہ میں) ہرگز مومنوں کے مقابلہ میں کافروں کو غالب نہیں کرے گا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا یعنی آخرت میں (غالب نہیں کرے گا) رواہ ابن جریر۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول بھی ایک روایت میں یہی ہے اور یہی ظاہر بھی ہے۔ لیکن عکرمہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا ہے کہ دلیل میں (کافروں کو مسلمانوں پر غلبہ نہیں عطا کرے گا) ابن جریر اور عبد بن حمید نے سدی کا بھی یہی قول نقل کیا ہے۔

بعض علماء نے کہا کافروں کے غالب نہ کرنے سے مراد ہے صحابہؓ پر غالب نہ کرنا۔ رہا اس زمانہ میں مومنوں پر کافروں کا غلبہ تو یہ مسلمانوں کے عقیدہ کی کمزوری اور اللہ کی نافرمانی کی وجہ سے ہے (یعنی اللہ نے کافروں کو غالب نہ کرنے کی جو صراحت کی ہے اس سے مراد ہے پکے صالح الاعمال فرمانبردار مسلمانوں پر غلبہ نہ عطا کرنا کمزور ایمان والے نافرمان مسلمانوں پر غلبہ عطا نہ کرنے کا وعدہ نہیں ہے) بعض نے کہا سبیلاً سے مراد ہے بیخ کنی کی راہ یعنی اللہ کافروں کو ایسی راہ نہ دے گا جو مسلمانوں کی بیخ کنی کرسکیں۔

امام شافعیؒ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی کافر مسلمان غلام خریدے تو بیع فاسد ہے امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا

بیع صحیح ہے کیونکہ کافر اہل عقد ہے اور مسلمان غلام محل بیع ہے البتہ اس آیت کے زیر اثر (کافر اپنی ملک میں مسلمان غلام کو نہ رکھ سکے گا بلکہ) کافر کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ مسلمان غلام کا مالک ہونے کے بعد فروخت کر دے، امام ابوحنیفہؒ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ اگر شوہر مرتد ہو جائے اور بیوی مسلمان رہے تو مرتد ہوتے ہی بیوی کی تفریق ہو جاتی ہے (یعنی نکاح سے خارج ہو جاتی ہے)۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ بلاشبہ منافق اللہ سے چال بازی کرتے ہیں اور اللہ چال بازی کی سزا ان کو دینے والا ہے۔ اللہ کو دھوکہ دینا اور اللہ کا منافقوں کو دھوکہ دینا۔ اس کی تحقیق سورۂ بقر کی ابتدائی آیات میں کر دی گئی ہے۔

وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ اور جب نماز کو کھڑے ہوتے ہیں یعنی مسلمانوں کے ساتھ تو سستی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں جیسے کوئی جبریہ کھڑا ہو اس طرح یہ ناگواری کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں نہ ثواب کی امید رکھتے ہیں نہ نماز کو ترک کرنے پر عذاب سے ڈرتے ہیں۔

يُرَآءُوْنَ النَّاسَ لوگوں کو (اپنی نماز) دکھاتے ہیں تاکہ لوگ ان کو مومن خیال کریں۔

وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ اور اللہ کا ذکر نہیں کرتے مگر بہت مختصر یا بہت تھوڑے وقت۔ ذکر سے مراد نماز ہے۔ اس تقلیل کی علت یہ ہے کہ دکھاوٹ کرنے والا دکھاوٹ کے لئے جو کام کرتا ہے وہ دیکھنے والوں کے سامنے کرتا ہے اور ایسا وقت بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ [1]

يُرَآءُوْنَ اور كُسَالٰى دونوں قَامُوْا کی ضمیر سے حال ہیں اور لَا يَذْكُرُوْنَ کا عطف يُرَآءُوْنَ پر ہے یا يُرَآءُوْنَ کے فاعل سے لَا يَذْكُرُوْنَ حال ہے۔

مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ یعنی ایمان و کفر دونوں میں متردد ہیں ذبذبة کسی چیز کو مضطرب بنا دینا۔ اصل مادہ مجرد ذب ہے جس کا معنی ہے نکال دینا دھکے دینا۔ مذبذب وہ شخص جس کو دونوں جانب سے دھکے دیئے جائیں کسی ایک طرف وہ ٹھہر نہ سکے۔

لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ نہ ان کو قرار و اطمینان ہے ان کی طرف یعنی مومنوں کی طرف کہ ظاہر باطن میں انہی کی طرف ہو جائیں اور مومنوں کے ساتھ آخرت میں پورا اجر پانے کے مستحق بن جائیں۔

وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ اور نہ کافروں کی طرف ان کو پورا قرار ہے کہ دوسرے کافروں کی طرح ان سے بھی دنیا میں سلوک کیا جائے۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝ اور جس کو (راہ حق سے) اللہ بھٹکا دے۔ (اے مخاطب) تجھے اس کے لئے (حق و صواب کی) راہ ہرگز نہیں ملے گی۔ ایسی ہی اسی مفہوم کی ایک اور آیت آئی ہے وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا منافق کی حالت ایسی ہے جیسے ریوڑ سے بچھڑی ہوئی بکری جو دو گلوں کے درمیان کبھی ایک کی طرف اور کبھی دوسرے کی طرف گھومتی ہے۔ رواہ مسلم۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اے ایمان والو مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو ولی اور دوست نہ بناؤ، کافروں کی دوستی نے منافقوں کو تباہ کر دیا اور ان کو نفاق تک پہنچا دیا اس لئے تم ان سے احتیاط رکھو۔

---

[1] ابویعلی نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص لوگوں کے سامنے تو نماز اچھی طرح پڑھے اور جب لوگ نہ دیکھتے ہوں تو نماز کو خراب پڑھے تو یہ نماز کو حقیر سمجھتا ہے ایسی نماز سے یہ شخص اپنے رب کی استہانت کرتا ہے۔

اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارے عذاب کی اللہ کے پاس واضح وجہ پیدا ہو جائے۔ [1]

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ بلاشبہ منافق دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے۔ سیوطی نے لکھا ہے کہ درکات (رکتہ کی جمع) کا معنی ہے طبقات اور منزلیں۔ اس لفظ کا استعمال نچلی منزلوں کے لئے مخصوص ہے بالائی منزلوں کو درجات کہتے ہیں۔ ابن مبارک نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں فرمایا، دوزخ کے نچلے حصہ میں لوہے کے صندوق ہوں گے جن کے اندر منافق بند ہوں گے۔ بغوی کی روایت میں ایک لفظ کا تغیر ہے۔ معنی ایک ہی ہے۔ بغوی نے حضرت ابو ہریرہؓ کا قول لکھا ہے صندوقوں کے اندر منافق بند ہوں گے جن کے اندر منافقوں کے اوپر نیچے انگارے دہک رہے ہوں گے۔

ابن وہبؒ نے کعب احبار کا قول نقل کیا ہے کہ دوزخ میں ایک بند کنواں ہے بند کرنے کے بعد اس کو کھولا ہی نہیں گیا ہے آغاز آفرینش سے روزانہ دوزخ اس کی گرمی سے اللہ کی پناہ مانگتی ہے دوزخ کا درک اسفل یہی ہے۔ منافق دوزخ کے نچلے طبقہ کے مستحق اس لئے قرار پائے کہ یہ تمام کافروں سے زیادہ خبیث ہیں، ان کے اندر کفر کے ساتھ اللہ رسول اور اسلام سے استہزاء کرنے اور مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی بھی خباثت ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ (باوجود کافر ہونے کے) یہ قتل اور جزیہ سے بچ گئے اس کے عوض درک اسفل کے مستحق قرار پائے۔

وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۝ اور (اے مخاطب) تجھے ان کا کوئی مددگار نہیں ملے گا۔ جو ان کو دوزخ سے نکال دے اور اللہ کے عذاب سے بچائے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ لیکن جو لوگ (نفاق سے) توبہ کرلیں (اور ایمان لے آئیں) اور (اپنے اعمال کی) اصلاح کرلیں اور اللہ پر وثوق رکھیں اور اپنے دین کو خالص اللہ ہی کے لئے کیا کریں۔ یعنی دکھاوٹ اور ریاکاری سے دین کو الگ رکھیں ایمان اور اعمال محض اللہ کے لئے کریں۔ ابن عساکر نے ابو ادریس کا قول نقل کیا ہے کہ حقیقت اخلاص تک رسائی صرف اس وقت ہو گی جب اللہ کے واسطے کئے ہوئے عمل پر لوگوں کی تعریف کو پسند نہ کرے۔

امام احمدؒ اور ابن ابی شیبہؒ نے ابو ثمامہؒ کا قول نقل کیا ہے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰؑ سے دریافت کیا یا روح اللہ۔ اللہ کا مخلص کون ہے فرمایا وہ شخص مخلص ہے جو اللہ کے لئے عمل کرے اور اس عمل پر لوگوں کی تعریف کو پسند نہ کرے۔ حکیم ترمذیؒ نے نوادر الاصول میں حضرت زید بن ارقم کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اخلاص کیساتھ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا جنت میں داخل ہو گیا۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ کلمہ پڑھنے میں اخلاص کیا ہے فرمایا پڑھنے والے کو یہ کلمہ ممنوعات سے باز رکھے (یہ اخلاص کلمہ ہے)۔

بیہقی نے شعب الایمان میں اور حاکم نے حضرت معاذؓ بن جبل کی روایت سے لکھا ہے کہ جب حضور ﷺ نے مجھے (حاکم بنا کر) یمن کو بھیجا تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے کچھ ہدایت فرمائیے۔ فرمایا اپنے دین کو خالص رکھنا تیرے لئے تھوڑا عمل بھی کافی ہو گا۔

ابن ابی الدنیا نے الاخلاص میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ثوبانؓ کی روایت سے لکھا ہے حضرت ثوبانؓ نے کہا میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا آپ فرما رہے تھے خوشی ہو مخلصوں کے لئے یہی لوگ ہدایت کے چراغ ہیں ہر تاریک فتنہ کی ظلمت ان سے چھٹ جاتی ہے۔

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ تو یہ لوگ مومنوں کے ساتھ ہوں گے یعنی جنت کے اندر ان مخلص مومنوں کے

---

[1] ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قرآن کی ہر دلیل (اللہ کی) محکم حجت ہے۔

ساتھ ہوں گے جو ایمان واخلاص کی وجہ سے ان سے پہلے جنت میں داخل ہو چکے ہوں گے۔

فراء نے مع المومنین کی تفسیر کی ہے من المومنین (یعنی مع کا ترجمہ من کیا ہے)۔

وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾ اور مومنوں کو اللہ اجر عظیم عطا فرمائے گا، یعنی آخرت میں مخلص مومنوں کو اجر عظیم عنایت کریگا، اجر عظیم سے مراد ہے جنت اور اللہ کی خوشنودی اور مراتب قرب خداوندی۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ اور اللہ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر گزاری کرو اور ایمان لے آؤ۔

استفہام انکاری اور تقریری ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ شکر گزار مومن کو عذاب نہیں دے گا کیونکہ بندوں کو عذاب دینے سے نہ اس کے اقتدار میں اضافہ ہو جاتا ہے نہ عذاب نہ دینے سے حکومت میں کوئی کمی آجاتی ہے کسی فائدہ کو حاصل کرنا یا ضرر کو دفع کرنا تو عذاب دینے کا مقصد ہی نہیں ہے اللہ ہر نفع و نقصان سے پاک ہے البتہ اس کا دستور ہے کہ اس نے نتیجہ کو سبب سے وابستہ کر دیا ہے بندوں کو عذاب دینے کے معاملہ میں بھی اس کا یہی دستور کار فرما ہے جیسے مزاج کے بگڑنے سے مرض پیدا ہوتا ہے اگر ایمان اور شکر کی وجہ سے آدمی کی قلبی بیماری یعنی نفاق و کفر کا ازالہ ہو جائے اور دل کو پاک کر لیا جائے تو آدمی برے نتیجہ سے بھی محفوظ ہو جاتا ہے۔

بغویؒ نے لکھا ہے آیت میں کچھ لفظی تقدیم و تاخیر ہے۔ اصل میں اِنْ اٰمَنْتُمْ وَ شَكَرْتُمْ تھا میں کہتا ہوں اس قول کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ واؤ مطلق عطف کے لئے آتا ہے عطف ترتیبی کے لئے نہیں آتا۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ شکر کو ایمان سے پہلے اس لئے ذکر کیا کہ شروع میں آدمی نعمت کو دیکھ کر مبہم طور پر شکر گزار ہوتا ہے پھر گہری نظر کرتا ہے تو منعم کو پہچانتا اور اس پر ایمان لاتا ہے۔

میں کہتا ہوں شاید شکر سے مراد ہے ایمان مجازی عامی جو کفر کی ضد ہے اور ایمان سے مراد ہے ایمان حقیقی (اور ایمان مجازی ایمان حقیقی کا زینہ ہے ظاہری مجازی ایمان سے ہی ترقی کر کے آدمی ایمان حقیقی تک پہنچتا ہے اسی لئے شکر کو ایمان سے پہلے ذکر کیا)۔

وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾ اور اللہ بڑی قدر کرنے والا اور خوب جاننے والا ہے یعنی شکر کا ثواب عطا کرتا ہے۔ تھوڑا قبول فرماتا ہے اور زیادہ عطا کرتا ہے اور تمہارے ایمان کی حقیقت کو خوب جانتا ہے۔

﴿پارہ والمحصنٰت ختم ہوا﴾

الجزء السادس

پارہ ششم

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ اللہ تعالیٰ بری بات زبان پر لانے کو پسند نہیں کرتا بجز مظلوم کے۔ جَهْرَ بِالسُّوْٓءِ (چلا کر بری بات زبان سے کہنا) سے اس جگہ مراد عام ہے۔ چلا کر ہو یا نہ ہو اللہ کو دونوں ناپسند ہیں مگر چلا کر بری بات کہنی زیادہ بری ہے۔ چونکہ واقعہ سے تعلق چلا کر بری بات زبان پر لانے کا تھا اس لئے جَهْر بِالسُّوْٓء کا لفظ اختیار کیا۔ مظلوم کے لئے جَهْر بِالسُّوْٓءِ کی اجازت کا یہ معنی ہے کہ مظلوم ظالم کے ظلم کی فریاد اور اس کے لئے بد دعاء کر سکتا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک بدزبانی کرنے سے مراد ہے گالی دینا اگر کوئی گالی دے (تو نا جائز ہے لیکن) ویسی ہی گالی مظلوم دے سکتا ہے کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ۔ الآیہ۔

حضرت انس و حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو گالیاں دینے والوں میں سے جو پہل کرے الزام اس پر ہے جب تک کہ مظلوم حد مساوات سے آگے نہ بڑھ جائے۔ رواہ مسلم۔

بغوی نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول مہمان کے حق میں ہوا تھا۔ اگر کوئی شخص کسی قوم کے پاس جا کر اترے اور وہ میزبانی نہ کریں اور ان کی طرف سے اچھی طرح مہمانی نہ ہو تو مہمان کے لئے شکوہ کرنا اور جیسا اس کے ساتھ سلوک کیا گیا ہے ویسا بیان کرنا جائز ہے۔

ہناد نے کتاب الزہد میں مجاہد کا بیان نقل کیا ہے کہ مدینہ میں کسی شخص کے پاس کوئی مہمان آیا میزبان نے اس کی مہمانی اچھی طرح نہ کی مہمان اس کے پاس سے چلا گیا اور میزبان نے جیسا سلوک کیا تھا ویسا ہی اس نے (لوگوں سے) بیان کیا اس کی اجازت میں یہ آیت نازل ہوئی۔

عبدالرزاق عبد بن حمید اور ابن جریر نے مجاہد کا بیان اس طرح نقل کیا کہ ایک شخص ایک قوم کے پاس بطور مہمان آیا۔ میزبانوں نے اس کو کھانا، نہیں دیا۔ مہمان نے اس کا شکوہ کیا۔ میزبانوں نے اس شکایت پر اس کی گرفت کی تو یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت عقبہ بن عامرؓ کا بیان ہے کہ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ ہم کو (تبلیغ یا جہاد وغیرہ کے لئے) بھیجتے ہیں اور ہم جا کر (کبھی) ایسے لوگوں کے پاس اترتے ہیں جو ہماری مہمانی نہیں کرتے۔ ہم کو کیا کرنا چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اگر تم لوگوں کے پاس جا کر اترو اور وہ تمہاری مناسب مہمانی کریں تو قبول کر لو اور اگر مناسب مہمانی کا اہتمام نہ دیں تو ان کے مناسب حال مہمانی کا حق ان سے (زبردستی) وصول کر لو۔ رواہ البخاری و مسلم فی صحیحہما۔

وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾ اور اللہ ہے سننے والا جاننے والا یعنی مظلوم کے شکوے اور بد دعا کو سنتا اور ظالم کے فعل

کو جانتا ہے کو جانتا ہے۔

اِنۡ تُبۡدُوۡا خَيۡرًا اگر تم کوئی نیک کلام علانیہ کرو۔ خیر سے مراد ہے طاعت اور فرماں برداری۔ بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ بجائے بری بات کہنے کے اگر تم ظالم کے ساتھ بھلائی کرنے کا اظہار کرو اور برائی کو بھلائی سے مٹا دو۔

اَوۡ تُخۡفُوۡهُ یا پوشیدہ طور پر کرو۔ بعض علماء کے نزدیک خیر سے مراد ہے مال یعنی ظاہر خیرات کر دیا چھپا کر۔

اَوۡ تَعۡفُوۡا عَنۡ سُوۡٓءٍ یا برائی سے درگزر کرو یعنی ظالم کے ساتھ بھلائی اگرچہ نہ کرو مگر اس کے ظلم کو اپنے دلوں سے مٹا دو۔ بیضاوی وغیرہ نے لکھا ہے کہ مظلوم کی طرف سے درگزر کرنا مقصود ہے اور بیان کی اصل غرض یہی ہے بھلائی کرنے کا ذکر تو بطور تمہید کے کیا گیا ہے کیونکہ آگے فرمایا ہے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيۡرًا ﴿۱۴۹﴾ تو بلاشبہ اللہ بڑا معاف کرنے والا کامل قدرت والا ہے یعنی باوجود انتقام کی طاقت رکھنے کے گناہ گاروں کو بہت زیادہ معاف کر دیتا ہے اس لئے تم کو بدرجہ اولیٰ معاف کرنا چاہئے کیونکہ تمہارے حق میں تو یہ تجارت ہے (اللہ کے ہاں اس کا بڑا ثواب ملے گا) مظلوم کو پہلے انتقام لینے کی اجازت دی اس آیت میں مکارم اخلاق پر آمادہ کرنے کے لئے معاف کرنے کی ترغیب دی۔ حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا خادم کو کتنی مرتبہ معاف کیا جائے فرمایا ہر روز ستر مرتبہ (یعنی بہت مرتبہ) رواہ ابوداؤد والترمذی وابو یعلی۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ يَكۡفُرُوۡنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ جو لوگ اللہ اور اس کے پیغمبروں کا انکار کرتے ہیں۔ بغوی نے لکھا ہے یہ آیت یہودیوں کے حق میں نازل ہوئی کیونکہ یہودیوں نے جب محمد ﷺ کا اور قرآن کا اور عیسیٰ علیہ السلام کا اور انجیل کا انکار کیا تو گویا سب پیغمبروں کا انکار کیا کیونکہ ہر پیغمبر دوسرے کی تصدیق کرتا ہے اور چونکہ اللہ کے احکام کا انہوں نے انکار کیا تھا تو گویا اللہ کا انکار کر دیا۔

وَيُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يُّفَرِّقُوۡا بَيۡنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ اور چاہتے ہیں اللہ کے اور اس کے پیغمبروں کے درمیان فرق رکھنا۔ کہ اللہ کو تو مانتے ہیں اور پیغمبروں کا انکار کرتے ہیں جیسے مشرک (کہ صرف خدا کو مانتے ہیں) اور یہودی کہ اللہ اور موسیٰؑ کو تو اپنے خیال کے مطابق مانتے ہیں اور عیسیٰ اور محمد ﷺ اور دوسرے پیغمبروں کا انکار کرتے ہیں اور قرآن و انجیل کو بھی نہیں مانتے۔

وَيَقُوۡلُوۡنَ نُؤۡمِنُ بِبَعۡضٍ وَّنَكۡفُرُ بِبَعۡضٍ ۙ اور کہتے ہیں ہم بعض (پیغمبروں) کو مانتے ہیں اور بعض کو (سچا) نہیں جانتے۔

وَّيُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يَّتَّخِذُوۡا بَيۡنَ ذٰلِكَ سَبِيۡلًا ﴿۱۵۰﴾ اور چاہتے ہیں اس کفر و اسلام کے درمیان راہ اختیار کرنا۔

اُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ حَقًّا ۚ ایسے لوگ یقیناً کافر ہیں۔ یعنی پورے کافر ہیں کیونکہ ایمان و کفر کے درمیان کوئی وسطی چیز نہیں اور اللہ پر ایمان کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک سب پیغمبروں کو نہ مانا جائے اور جو کچھ انہوں نے (اللہ کی طرف سے) مجمل و مفصل پہنچایا ہے اس کی تصدیق نہ کی جائے۔ تمام انبیاء کے دین میں حقانیت مشترک ہے سب حق ہیں اور حق کے علاوہ سوائے گمراہی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابًا مُّهِيۡنًا ﴿۱۵۱﴾ اور کافروں کے لئے ہم نے ذلیل کن سزا تیار کر رکھی ہے۔ انہی کافروں میں سے یہودی بھی ہیں۔

وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ اور جو لوگ اللہ اور اس کے (تمام) پیغمبروں پر ایمان لائے۔

وَلَمۡ يُفَرِّقُوۡا بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ اور ان میں سے کسی ایک میں بھی فرق نہیں کیا۔

ایک شبہ :- لفظ بین کی اضافت متعدد کی جانب ہوتی ہے اور آیت میں لفظ احد کی طرف اضافت ہے جو ضابطہ کے خلاف ہے۔

ازالہ :- لفظ احد میں اس جگہ عموم ہے کیونکہ احد اس جگہ نکرہ ہے اور نفی کے بعد آیا ہے (لفظ احد کی وحدت مراد نہیں ہے عمومی تنکیر مراد ہے) اس لئے اس جگہ اضافت صحیح ہے۔

اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ان لوگوں کو ضرور اللہ ان کا ثواب عطا فرمائے گا یعنی جس ثواب کا اللہ نے وعدہ کیا ہے وہ ضرور عنایت کرے گا۔ لفظ سَوْفَ وعدہ کو پختہ کرنے اور اس امر کو ظاہر کرنے کے لئے ہے کہ ثواب لامحالہ ملے گا خواہ ملنے میں تاخیر ہو۔

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا (اور جو کچھ ان سے قصور ہو گیا ہو) اللہ بخشنے والا ہے۔

رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾ ان پر مہربانی کرنے والا ہے یعنی ان کی نیکیوں کے ثواب کو چند گنا کر دے گا۔

ع ۲۱ / ۱

ابن جریر نے محمد بن کعب قرظی کی روایت سے لکھا ہے کہ کچھ یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا حضرت موسیٰؑ اللہ کی طرف سے (تورات کی لکھی ہوئی) تختیاں لائے تھے آپ بھی (اللہ کی کتاب کی لکھی ہوئی) تختیاں اللہ کی طرف سے لا کر ہم کو دیجئے کہ ہم آپ کو سچا جانیں۔ بغوی نے تعین کے ساتھ ان یہودیوں کے نام کعب بن اشرف اور فنحاص بن عازورا بتائے ہیں اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ آپ ﷺ سے اہل کتاب درخواست کرتے ہیں کہ آپ ان کے لئے کوئی خاص نوشتہ آسمان سے منگوا دیں یہ سوال اکڑ پن اور حاکمانہ شان کے ساتھ تھا اطاعت آمیز نہ تھا اور اللہ حاکمانہ شان کے سوال پر آیات نازل نہیں فرمایا کرتا۔

ابن جریر نے محمد بن کعب قرظی کی روایت سے لکھا ہے کہ جب آیت يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ ...... بُهْتَانًا عَظِيْمًا تک نازل ہوئی تو ایک یہودی نے دو زانو بیٹھ کر کہا اللہ نے نہ آپ پر کچھ اتارا نہ موسیٰؑ پر نہ عیسیٰؑ پر نہ اور کسی پر۔ اس پر آیت وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ نازل ہوئی۔

فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ (آپ ان کے اس سوال کو بڑا نہ سمجھیں اس لئے کہ) یہ موسیٰؑ سے اس سے بھی بڑا سوال کر چکے ہیں۔ سَاَلُوْا کی ضمیر اہل کتاب کی طرف راجع ہے کیونکہ اہل کتاب میں سے ہی ان ستر آدمیوں نے جن کو حضرت موسیٰؑ پہاڑ پر لے کر آئے تھے یہ درخواست کی تھی۔

فقد میں فاء سببیت کیلئے ہے (ہم نے ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے مترجم) بعض علماء کے نزدیک یہ فاء جزائیہ ہے اور شرط محذوف ہے یعنی اگر آپ ان کے اس سوال کو بڑا سمجھتے ہیں تو (تعجب نہیں) ان کے اسلاف موسیٰؑ سے اس سے بھی بڑھ کر سوال کر چکے ہیں۔ مطلب یہ کہ ایسی درخواست ان کی پہلی جہالت نہیں ہے (اس سے بڑی جہالت ان کے اسلاف کر چکے ہیں)

فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً اور انہوں نے کہا تھا کہ ہم کو اللہ کا دیدار کھلم کھلا کرا دو۔ ابو عبیدہؒ نے اس جملہ کا مطلب اس طرح بیان کیا کہ بنی اسرائیل نے علانیہ کہا ہم کو خدا دکھادو۔

فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ لہٰذا کڑک نے ان کو پکڑ لیا یعنی آسمان سے ایک آگ آئی اور ان کو ہلاک کر گئی۔

بِظُلْمِهِمْ ان کے ظلم کی وجہ سے یعنی چونکہ انہوں نے اپنے اوپر خود ظلم کیا تھا اس لئے آگ نے ان کو جلا ڈالا۔ ظلم کرنے سے مراد ہے ہٹ کرنا اور ایسی چیز کی درخواست کرنا جس کا ہونا اللہ کے دستور اور حکمت کے خلاف تھا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دیدار الٰہی محال ہے (جیسا کہ معتزلہ کا خیال ہے کہ دنیا اور آخرت میں اللہ کا دیدار نا ممکن ہے) اور یہودیوں نے ایک محال بات کی درخواست کی تھی اس لئے مستحق عذاب قرار پائے۔

ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ پھر کھلے کھلے معجزات آنے کے بعد بھی

انہوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا۔

فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ پھر (اللہ کی ہدایت کے مطابق انہوں نے توبہ کی اور باہم لڑ کر ایک نے دوسرے کو قتل کردیا تو) ہم نے اس (گناہ) سے درگزر کی۔ یعنی ان کی قوم کی مکمل بیخ کنی نہیں کی۔ (قتل موقوف کردینے کا حکم نازل کردیا) اس جملہ میں درپردہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کے یہودیوں کو توبہ کرنے کی ترغیب ہے مراد یہ ہے کہ تمہارے اسلاف نے جب توبہ کرلی تو ہم نے ان کو معاف کردیا تم بھی توبہ کرو تاکہ ہم تم کو بھی معاف کردیں۔

وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾ اور ہم نے موسیٰ کو کھلا ہوا تسلط عطا کیا تھا کہ انہوں نے بنی اسرائیل کو آپس میں قتل کرنے کا حکم دیا (اور انہوں نے حکم کی تعمیل کی) یا سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا سے مراد ہے واضح دلیل یعنی مخالفوں کے خلاف نو معجزات۔

وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ یعنی چونکہ انہوں نے قبول کرنے کا پختہ وعدہ کیا تھا اس لئے طور کو ہم نے ان کے اوپر اٹھالیا۔

وَقُلْنَا لَهُمُ اور ہم نے ان سے کہا یعنی جب طور ان کے سروں پر سایہ فگن تھا اس وقت موسیٰؑ کی زبان سے ہم نے کہلوایا۔

ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا کہ (ایلیا کے) دروازہ میں سر جھکائے داخل ہو۔

وَّقُلْنَا لَهُمْ اور ہم نے ان سے کہا یعنی حضرت داؤد کی زبانی کہلوایا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ آئندہ کلام بھی حضرت موسیٰؑ کی زبانی اس وقت کہلوایا ہے جب پہاڑ بنی اسرائیل کے سروں پر جھکا ہوا تھا کیونکہ سنیچر (کے روز کی عبادت) کی مشروعیت اسی دور میں ہو چکی تھی البتہ اس حکم کی خلاف ورزی اور عذاب مسخ حضرت داؤد کے زمانہ میں ہوا۔

لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ سنیچر کے معاملہ میں زیادتی نہ کرو یعنی سنیچر کے دن مچھلیاں پکڑ کر اپنے نفوس پر ظلم نہ کرو۔

وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۱۵۴﴾ اور ہم نے ان سے پکا وعدہ لے لیا کہ وہ تورات کے حکم کو قبول کریں گے اور سنیچر کے معاملہ میں زیادتی نہیں کریں گے یہاں تک کہ انہوں نے بسر و چشم اس حکم کی تعمیل کا وعدہ کیا۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ (یعنی انہوں نے توریت کے حکم کے خلاف کیا اور اپنے وعدہ کو توڑ دیا اس کی سزا میں ہم نے بھی ان سے جو سلوک کرنا تھا کیا اور ان پر لعنت کی) ان کی عہد شکنی اور آیات خدا کے انکار کرنے کی وجہ سے۔ اس صورت میں لفظ ما زائد ہوگا جو مضمون کلام کو پختہ کرنے کے لئے لایا گیا ہے اور بما کا تعلق فعل محذوف سے ہوگا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا تعلق حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ سے ہو۔ اٰيٰتِ اللّٰهِ سے مراد ہیں توریت کی وہ آیات جن میں رسول اللہ ﷺ کے اوصاف کا بیان ہے اور قرآن و انجیل بھی مراد ہیں۔ (یہ بھی آیات اللہ ہیں)

وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ اور انبیاء کو ناحق قتل کرنے کی وجہ سے۔

وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ اور (رسول اللہ ﷺ سے) ان کے اس کہنے کی وجہ سے کہ ہمارے دل غلاف ہیں یعنی علوم کے ظرف ہیں (ہمارے دل علوم سے بھرے ہوئے ہیں مزید علم کی ضرورت نہیں۔

یا یہ مطلب کہ تمہاری دعوت اور ہمارے دلوں کے درمیان پردے حائل ہیں (تمہاری دعوت ہمارے دلوں تک نہیں پہنچ سکتی) حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے یعنی دلوں کو علم سے محجوب کردیا ہے یا ان کو بے مدد چھوڑ دیا ہے اور آیات خداوندی میں غور کرنے کی توفیق عطا نہیں فرمائی۔

فَلَا يُؤْمِنُونَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۱۵۵ پس وہ ایمان نہیں لاتے مگر تھوڑا سا یعنی ایسا ناقص ایمان جو قابل اعتبار نہیں۔ مراد یہ کہ بعض کتابوں اور بعض پیغمبروں پر تو ان کا ایمان ہے اور بعض کتب وانبیاء پر ایمان نہیں رکھتے یا یہ مطلب ہے کہ ان میں سے تھوڑے آدمی ایماندار ہیں جیسے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے دوسرے ساتھی بعض علماء نے کہا آیت میں مطلق نفی ایمان مقصود ہے یعنی ان کا ایمان نہ ناقص ہے نہ کامل (کیونکہ عربی میں قلت بمعنی عدم مستعمل ہے)۔

وَّبِكُفْرِهِمْ اور (عیسیٰ کا) انکار کرنے کی وجہ سے۔ اس فقرہ کا عطف سابق کُفْرِهِمْ پر ہے سابق کفر عام تھا اور یہ کفر خاص ہے خاص کا عطف عام پر ہو جاتا ہے دونوں کفر متحد نہیں ہیں کہ ایک کا عطف دوسرے پر نا جائز ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ وُكُفْرِهِمْ پر تنہا بِكُفْرِهِمْ کا عطف نہیں ہے بلکہ بِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا کے مجموعہ کا ہے (تو گویا معطوف علیہ معطوف کا جز ہو گا اور یہ درست ہے جیسے کہتے ہیں امام نے اور سب لوگوں نے یہ بات کہی (امام بھی لوگوں کے لفظ میں داخل ہے وہ بھی ایک آدمی ہے) یا یوں کہا جائے کہ بِكُفْرِهِمْ کا عطف فَبِمَا نَقْضِهِمْ پر ہے بار بار کفر کے صادر ہونے پر تنبیہ کرنے کے لئے كُفْرِهِمْ دوبارہ فرمایا کیونکہ پہلے انہوں نے موسیٰؑ کی تکذیب کی پھر عیسیٰؑ اور داؤدؑ و سلیمانؑ کی پھر محمد ﷺ کی۔ یا یہ کہا جائے کہ مجموعہ کلام کا مجموعہ کلام سابق پر عطف ہے لہٰذا تکرار موجود ہی نہیں ہے۔

وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝۱۵۶ مریمؑ پر بڑا بہتان باندھنے کی وجہ سے یعنی مریمؑ کو زانیہ قرار دینے کی وجہ سے

وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ اور ان کے اس کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریمؑ کو (جو بزعم خود) رسول اللہ تھا قتل کر دیا یا یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو رسول اللہ بطور استہزاء کہا ہو (کیونکہ حضرت عیسیٰؑ کی رسالت کا اعتقاد ان کا نہ تھا) یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی جگہ بُرا لفظ کہا ہو لیکن اللہ نے ان کے لفظ کی جگہ اپنی طرف سے لفظ رسول اللہ بطور مدح فرما دیا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ رسول اللہ ﷺ کو برے الفاظ سے ذکر کرنے والے مستحق ملامت ہیں۔

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ اور انہوں نے عیسیٰؑ کو نہ قتل کیا نہ صلیب دی بلکہ ان کو اشتباہ ہو گیا۔

روایت میں آیا ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت نے حضرت عیسیٰؑ اور آپ کی والدہ کو گالیاں دیں آپ نے ان کیلئے بددعا کی حضرت کی بددعا سے اللہ نے ان کی صورتیں بندروں اور سوروں کی طرح کر دیں اس پر سب یہودی آپکے قتل پر متفق الرائے ہو گئے مگر اللہ نے آپ کو اطلاع دیدی کہ تم کو آسمان کی طرف اٹھا لیا جائے گا۔ یہ قصہ سورۃ آل عمران میں گزر چکا ہے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا تم میں سے کون اس بات پر راضی ہے کہ اس کو میری شکل دیدی جائے اور اسکو قتل کر کے صلیب پر لٹکا دیا جائے اور جنت میں داخل ہو جائے ایک شخص نے اٹھ کر اظہار رضامندی کیا اللہ نے اس کی شکل حضرت عیسیٰؑ جیسی کر دی اس کو قتل کر کے صلیب دیدی گئی۔ کذا اخرج النسائی عن ابن عباسؓ۔

بغوی نے ذکر کیا ہے کہ اللہ نے اس شخص کی شکل عیسیٰؑ جیسی بنا دی تھی جس نے یہودیوں کو حضرت عیسیٰؑ کی نشان دہی کی تھی۔

ہم نے سورۃ آل عمران میں کلبی کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہودیوں کے سردار یہودا نے ایک شخص کو جس کا نام طیطانوس تھا مقرر کیا تھا کہ گھر میں گھس کر حضرت عیسیٰؑ کو قتل کر دے مگر اللہ نے عیسیٰؑ کو اٹھا لیا اور طیطانوس کی صورت عیسیٰؑ جیسی بنا دی جب وہ باہر نکل کر آیا تو لوگوں نے اسی کو عیسیٰؑ سمجھ کر پکڑ کر مار ڈالا اور صلیب دیدی۔ بعض کا قول ہے کہ لوگوں نے حضرت عیسیٰ کو ایک مکان میں بند کر دیا تھا اور ایک چوکیدار نگرانی کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ اللہ نے اس چوکیدار کی صورت عیسیٰ جیسی کر دی اور لوگوں نے اسی کو قتل کر دیا۔ واللہ اعلم۔

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ کوئی شبہ نہیں کہ جن لوگوں نے عیسیٰؑ کے قتل کے معاملہ میں اختلاف کیا وہ اس کے قتل کے متعلق تردد میں ہیں۔ کلبی نے کہا ان کا اختلاف یہ تھا کہ یہودی مدعی تھے ہم نے عیسیٰؑ

کو قتل کیا۔ اور نصاریٰ کا ایک گروہ قائل تھا کہ ہم نے قتل کیا اور نصاریٰ ہی کا ایک گروہ کہتا تھا نہ یہودیوں نے قتل کیا نہ عیسائیوں نے بلکہ اللہ نے ان کو آسمان کی طرف اٹھالیا ہماری نظروں کے سامنے ایسا ہوا تھا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ نے طیطا نوس کی صرف شکل عیسیٰؑ کی صورت کی طرح کردی تھی باقی جسمانی حالت اس کی اصلی تھی اس لئے کچھ لوگ کہنے لگے ہم نے عیسیٰؑ کو قتل کردیا صورت اسی کی تھی دوسرے لوگوں نے کہا نہیں قتل نہیں کیا جسم عیسیٰؑ کا نہ تھا۔ سدی کا قول ہے اختلاف کی صورت یہ تھی کہ ان لوگوں نے کہا اگر یہ عیسیٰؑ ہے تو ہمارا آدمی کہاں گیا اور یہ ہمارا آدمی ہے تو عیسیٰ کہاں گیا۔

بعض علماء کا قول ہے کہ فیہ کی ضمیر عیسیٰ کی طرف راجع ہے مطلب یہ ہے کہ عیسیٰؑ کے معاملہ میں لوگوں نے اختلاف کیا کسی نے کہا عیسیٰ جھوٹا تھا ہم نے اس کو قتل کردیا اور ٹھیک کیا کچھ لوگوں کو تردد ہوا (کہ معلوم نہیں عیسیٰ جھوٹا تھا یا سچا اور ہم نے قتل صحیح کیا یا غلط) بعض لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ سے سن لیا تھا کہ اللہ مجھے آسمان پر اٹھالے گا انہوں نے کہا کہ عیسیٰ کو آسمان کی طرف اٹھالیا گیا۔

مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ سوائے تخمین پر چلنے کے ان کے پاس (عیسیٰ کے قتل و عدم قتل کا) کوئی یقینی علم نہیں (یا یوں ترجمہ کیا جائے کہ عیسیٰؑ کے قتل کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔

وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ﴿۱۵۷﴾ اور یقینی امر ہے کہ عیسیٰؑ کو انہوں نے قتل نہیں کیا۔ یا یہ مطلب ہے کہ ان کا خود بھی خیال ہے کہ عیسیٰؑ کو قتل کردینا یقینی امر نہیں۔ فراء نے یہ مطلب بیان کیا کہ جس کو انہوں نے قتل کیا اس کے عیسیٰؑ ہونے کا ان کو یقین نہیں۔

بَل رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ ۚ بلکہ اللہ نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا اس جملہ میں عیسیٰؑ کے قتل کی تردید اور آپ کے اٹھائے جانے کا اثبات ہے۔

وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا اور اللہ ہے زبردست۔ یہودیوں کو سزا دینے پر قادر۔ اسکو اس ارادہ سے کوئی نہیں روک سکتا۔

حَكِيمًا ﴿۱۵۸﴾ حکمت والا۔ کہ یہودیوں پر لعنت و غضب نازل فرمایا اور صطیونس بن استیانوس کو ان پر مسلط کیا جس نے ان کی قوم کا عظیم الشان قتل کیا یا حکیم ہونے سے یہ مراد ہے کہ اللہ نے حضرت عیسیٰؑ کے معاملہ میں جو تدبیر کی وہ پر حکمت تھی۔

وَإِن مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ ۖ اور کوئی بھی اہل کتاب میں سے ایسا شخص نہیں کہ اپنے مرنے سے پہلے (عذاب کے فرشتوں کو دیکھ کر) عیسیٰ پر ایمان نہ لے آئے یا محمد ﷺ پر ایمان نہ لے آئے یا اللہ کو نہ مان لے نتیجہ مطلب ایک ہی ہے کیونکہ تمام پیغمبروں پر ایمان لائے بغیر اللہ کو ماننا قابل اعتبار نہیں اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کے لئے عیسیٰؑ کو ماننا اور عیسیٰؑ پر ایمان رکھنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کو ماننا لازم ہے۔ اول تفسیری قول اکثر اہل تفسیر اور جمہور علماء کا ہے دوسرا قول عکرمہ کا مروی ہے۔

قَبْلَ مَوْتِهِ کی ضمیر اہل کتاب کی طرف راجع ہے۔ علیؓ بن ابی طلحہؓ کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول آیا ہے یعنی ہر کتابی اپنے مرنے سے پہلے ایمان لے آتا ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ حضرت ابن عباس سے دریافت کیا گیا۔ بتائیے اگر کوئی کتابی چھت کے اوپر سے گر جائے (تو کیا اس وقت بھی رسالت عیسیٰؑ کا اقرار کرے گا) فرمایا ہاں ہوا میں (یعنی زمین پر گرنے سے پہلے) عیسیٰؑ کا کلمہ پڑھ لے گا۔ دریافت کیا گیا اگر اس کی گردن ماری جارہی ہو تو کیا کرے گا فرمایا لڑکھڑاتی زبان سے بولے گا، خلاصہ یہ کہ ہر کتابی مرتے وقت اللہ کی توحید اور محمد ﷺ اور عیسیٰؑ کی عبدیت ورسالت پر ایمان ضرور لائے گا۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ ہر کتابی کسی نہ کسی وقت ضرور ایمان لاتا ہے اور زندگی میں نہ لائے تو مرتے وقت عذاب کو

دیکھ کر اقرار ایمان کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں شاید اس کلام کا یہ مطلب ہے کہ ہر کتابی (یہودی) حضرت موسیٰؑ اور توراۃ کو تو مانتا ہی ہے اور یہ دونوں حضرت عیسیٰؑ اور انجیل اور داؤدؑ و زبور اور محمد ﷺ اور قرآن کی صداقت کے شاہد ہیں کفر کا مظاہرہ محض عناد اور تعصب سے کرتا ہے ورنہ دل میں تو انصاف کرتا اور اعتقاد رکھتا ہی ہے کہ محمد ﷺ برحق ہیں آپ کی صداقت کی شہادت حضرت موسیٰؑ اور توراۃ نے پہلے ہی دے دی ہے اگر زندگی میں اس کو اس بات کا تصور نہیں ہوتا تو آخر کار مرنے کے وقت عذاب کے فرشتوں کو دیکھ کر تو اس کو یقین ہو ہی جاتا ہے کہ محمد ﷺ جو کچھ فرماتے تھے وہ سچ تھا بہر حال آیت میں گویا وعید عذاب اور جلد از جلد ایمان لانے کی ترغیب ہے تاکہ مرنے کے وقت غیر اختیاری ایمان نہ لانا پڑے کیونکہ اس وقت اضطراری ایمان قبول نہ ہوگا۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ بہٖ اور موتہٖ دونوں ضمیریں عیسیٰؑ کی طرف راجع ہیں (یعنی ہر کتابی حضرت عیسیٰؑ کی موت سے پہلے ان پر ایمان لے آئے گا) مطلب یہ کہ جب حضرت عیسیٰؑ آسمان سے اتریں گے تو تمام اہل مذاہب آپ پر ایمان لے آئیں گے کسی مذہب والا بغیر ایمان لائے نہیں رہے گا۔ سب کی ملت ایک ہی ہو جائے گی یعنی سب ملت اسلامیہ پر ہو جائیں گے آیت کی یہ تفسیر حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آئی ہے صحیحین میں بخاری و مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے عنقریب ابن مریمؑ حاکم منصف ہو کر تم میں اتریں گے صلیب کو توڑیں گے خنزیر کو قتل کریں گے جزیہ ساقط کر دیں گے مال بہائیں گے کہ مال کو قبول کرنے والا کوئی نہ ہوگا یہاں تک کہ اس وقت ایک سجدہ دنیا اور دنیا کی ہر چیز سے بہتر ہوگا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے یہ حدیث بیان کرنے کے بعد فرمایا اگر تم (اس کا ثبوت) چاہتے ہو تو پڑھو وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ یعنی عیسیٰ بن مریم کے مرنے سے پہلے (ہر کتابی ایمان لے آئے گا) ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی ایک مرفوع روایت میں آیا ہے کہ عیسیٰؑ کے زمانہ میں سوائے اسلام کے تمام مذاہب ہلاک ہو جائیں گے (نابود ہو جائیں گے) ابن جریر اور حاکم نے حضرت ابن عباسؓ کا قول موقوفاً نقل کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ اہل کتاب میں سے کوئی بھی بغیر ایمان لائے نہیں رہے گا۔

میں کہتا ہوں کہ قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰؑ کا اترنا اور آپ کے زمانہ میں سوائے اسلام کے ہر مذہب کا نابود ہو جانا بالکل صحیح اور حق ہے اور صحیح مرفوع احادیث سے ثابت ہے لیکن کیا اس آیت سے بھی اس مضمون کا استنباط ہو رہا ہے اور دوسری ضمیر کو حضرت عیسیٰؑ کی طرف راجع کر کے آیت کی وہ تفسیر کی جا سکتی ہے جس سے مضمون مذکورہ کا استفادہ ہو سکے یہ بات قابل تسلیم نہیں، صرف حضرت ابوہریرہؓ کا خیال اور رائے ہے کسی صحیح مرفوع حدیث میں مذکور نہیں اور نہ یہ تشریح درست ہے کیونکہ اس تفسیر پر تو صرف ان اہل کتاب کے مومن ہو جانے کی پیشن گوئی ہوگی جو نزول کے بعد حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں ہوں گے حالانکہ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ کا لفظ عام ہے ہر زمانہ کے اہل کتاب کو شامل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جو اہل کتاب تھے اگر خصوصی طور پر ان کو مراد نہ بھی مانا جائے تب بھی عموم کے تحت تو وہ بھی آئیں گے کلام کا حقیقی اطلاق انہی لوگوں پر ہوتا ہے جو وقت کلام میں موجود ہوں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ صرف وہی کتابی گروہ مراد ہو جو حضرت عیسیٰؑ کے نزول کے بعد ان کے زمانہ میں موجود ہو

اس سے معلوم ہوا کہ موتہٖ کی ضمیر حضرت عیسیٰؑ کی طرف راجع کرنا غلط ہے ہمارے اس قول کی تائید حضرت ابی بن کعب کی قرأت سے بھی ہوتی ہے جس میں قَبْلَ مَوْتِهٖ کی جگہ قَبْلَ مَوْتِهِمْ آیا ہے (اس وقت تو ہم کی ضمیر کا مرجع اہل کتاب ہی ہوگا۔ عیسیٰؑ کی طرف ضمیر راجع نہیں ہو سکے گی)۔

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿۱۵۹﴾ اور قیامت کے دن وہ (یعنی عیسیٰؑ یا محمد ﷺ) ان (مومنوں) کے گواہ ہوں گے کیونکہ اللہ اپنے بندوں کا شاہد ہے وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا اور انبیاء اپنی اپنی امتوں کے متعلق شہادت دیں گے اور رسول اللہ ﷺ ان سب کے گواہ ہوں گے۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا پھر یہودیوں کی بیجا حرکتوں کی وجہ سے ہی۔ ظلم سے مراد وہی بیجا حرکات ہیں جن کا ذکر اوپر کر دیا گیا یعنی وعدہ شکنی، آیات خداوندی کا انکار، قتل انبیاء، مریمؑ پر تہمت تراشی اور فخر کے ساتھ قتل مسیح کا دعویٰ کرنا۔

حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وہ پاکیزہ چیزیں ہم نے ان کے لئے حرام کر دیں جو پہلے حلال کر دیں گئی تھیں۔ ان طَيِّبٰتِ محرمہ کا ذکر سورۃ الانعام کی ان آیات میں کیا گیا ہے وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ سے وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ تک۔

یہ بھی احتمال ہے کہ طیبات سے مراد جنت کی پاکیزہ نعمتیں ہوں یہ مطلب آیت وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ کے مناسب ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ طیبات سے مراد ہو دنیوی حلال رزق اور حرام کر دینے سے مراد ہو ان کو بامر تقدیری ان حلال چیزوں سے محروم و بے بہرہ رکھنا یعنی باوجود یہ کہ دنیا میں حلال پاکیزہ رزق بہت ہے مگر اللہ نے یہودیوں کو حلال پاکیزہ رزق سے محروم کر دیا ہے پس سوائے حرام ناپاک روزی کے وہ اور کچھ نہیں کھاتے۔ اور حرام روزی دوزخ کا مستحق بنا دیتی ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے جو گوشت حرام سے پیدا ہو دوزخ اس کے لئے زیادہ موزوں ہے۔

وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾ اور بہتوں کو راہ خدا یعنی ایمان اور رسول اللہ ﷺ کے اتباع سے روکنے کی وجہ سے۔

وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا اور سود لینے کی وجہ سے۔

وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ حالانکہ (توریت میں) ان کو سود سے منع کر دیا گیا تھا (نہی سے مراد ہے حرام کر دینا) اس آیت میں دلیل ہے کہ نہی (ممانعت) موجب تحریم ہے (خواہ لفظ حرام نہ استعمال کیا گیا ہو)۔

وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ اور لوگوں کا مال ناجائز طریقوں سے کھانے کی وجہ سے۔ ہم نے پاکیزہ حلال چیزیں ان کے لئے حرام کر دیں۔ ناجائز طریقوں سے مراد ہے رشوت، دھوکہ دہی، چوری ڈاکہ وغیرہ۔

بِصَدِّهِمْ اور اَخْذِهِمْ اور اَكْلِهِمْ سب کا عطف بِظُلْمٍ پر ہی یعنی تحریم طیبات کے یہ سب اسباب ہیں۔

وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶۱﴾ اور ہم نے ان میں سے کافروں کے لئے (دوزخ کے اندر) دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ چونکہ کلام سابق سے یہ توہم پیدا ہو سکتا تھا کہ حکم مذکور تمام اہل کتاب کو شامل ہے (حالانکہ بعض نیک ایماندار اہل کتاب اس سے مستثنیٰ تھے) اس وہم کو دور کرنے کے لئے آئندہ فرمایا۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ لیکن ان میں سے جو لوگ علم (دین) میں پختہ ہیں جیسے عبد اللہ بن سلام اور ان کے وہ کتابی ساتھی جو ایمان لے آئے تھے اور تقاضائے علم دین پر ثابت قدم تھے۔[1]

وَالْمُؤْمِنُوْنَ اور ایمان رکھنے والے یعنی رسول اللہ ﷺ کے صحابی مہاجر اور انصار یا اَلْمُؤْمِنُوْنَ سے مراد بھی اَلرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ ہی ہیں۔

يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ جو اس (کتاب) پر ایمان لاتے ہیں جو آپ پر اتاری گئی۔

وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ اور ان (کتابوں) پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ سے پہلے (پیغمبروں پر) اتاری گئیں

وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ اور (خصوصیت کے ساتھ) نماز قائم کرنے والے۔

بغوی نے لکھا ہے حضرت عائشہؓ اور ابان بن عثمانؒ کا قول منقول ہے کہ اس جگہ اَلْمُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ لکھنا چاہئے تھا۔ اسی طرح سورۂ مائدہ میں اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصَّابِئُوْنَ میں الصَّابِئُوْنَ اور آیت اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ میں هٰذٰنِ کاتب کی غلطی ہے (الصائبین اور ھذین ہونا چاہئے) حضرت عثمانؓ نے بھی فرمایا تھا کہ مصحف میں کچھ (کتابت کی)

---

[1] بیہقی نے دلائل میں اور ابن اسحاق نے نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس آیت کا نزول حضرت عبد اللہ بن سلام اور اسیدؓ بن شعبہ اور ثعلبہ بن شعبہ کے بارہ میں ہوا تھا یہ لوگ یہودیت کو چھوڑ کر مسلمان ہو گئے تھے۔

غلطی ہے عرب پڑھتے وقت اپنی زبانوں پر خود اس کو ٹھیک کرلیں گے عرض کیا گیا آپ اس کو بدلوا کیوں نہیں دیتے فرمایا یونہی رہنے دو اس سے کسی حلال کی حرمت اور حرام کی حلت نہیں ہو جاتی۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ ان قائلوں کا سہو ہے اجماعاً یہی صحیح ہے جو مصحف میں ہے البتہ اس کی تاویل مختلف طور پر کی گئی ہے۔ کسی نے کہا کہ المقیمین کا نصب مدح کی بناء پر ہے یعنی اَمْدَحُ فعل محذوف ہے بعض نے کہا اَعْنِیْ محذوف ہے۔ بعض نے کہا المقیمین کا عطف مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ پر ہے یعنی وہ اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو آپ پر اتاری گئی ہے اور نماز قائم کرنے والوں پر بھی یعنی انبیاء پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔

وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ اور جو زکوٰۃ دینے والے ہیں۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اور جو اللہ اور آخرت پر (صحیح) ایمان رکھنے والے ہیں۔ اور روز آخرت پر ایمان سے پہلے انبیاء وکتب پر ایمان لانے والے اور ایمان کی تصدیق والے اعمال یعنی اقامت الصلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ کا ذکر کیا کیونکہ آیت کی رفتار بتارہی ہے کہ انبیاء وکتب پر ایمان اور اقامت صلوٰۃ ہے اللہ اور روز آخرت پر تو اہل کتاب بھی اپنے دعوے کے مطابق ایمان رکھتے ہی تھے یہاں اس ایمان پر آمادہ کرنا مقصود ہے جو ان کو حاصل نہ تھا یعنی تمام انبیاء وکتب پر ایمان یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اول ایمان سے مراد ایمان مجازی ہو اور دوسرے ایمان سے مراد ایمان حقیقی اور ایمان حقیقی ایمان مجازی (عرفی) اور پابندی شرائع پر مبنی ہوتا ہے (اس لئے ایمان مجازی کا پہلے ذکر کر دیا)۔

اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾ یہ ہی لوگ ہیں جن کو ہم ضرور اجر عظیم عطا کریں گے۔

ابن اسحاق نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ عدی بن زید (یہودی) نے کہا تھا ہم نہیں جانتے کہ موسیٰؑ کے بعد اللہ نے کسی شخص پر کوئی کتاب نازل کی ہو اس پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ ہم نے آپ کے پاس اسی طرح وحی بھیجی جیسی نوحؑ کے پاس بھیجی تھی پیغمبروں میں سب سے پہلے حضرت نوحؑ کا ذکر اس لئے کیا کہ حضرت آدمؑ کی طرح آپ بھی آئندہ تمام انسانوں کے باپ تھے (کیونکہ طوفان کی وجہ سے سب لوگ ہلاک ہو گئے تھے اور جو کشتی میں بچ رہے تھے ان میں حضرت نوحؑ کی نسل کے علاوہ کسی شخص کی نسل باقی نہیں رہی) اللہ نے فرمایا ہے۔ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ۔ انہی کی نسل ہم نے باقی رکھی۔ اس کے علاوہ حضرت نوح کی یہ خصوصیات بھی تھیں کہ سب سے پہلے آپ نبی شریعت تھے۔ سب سے اول آپ ہی نے شرک پر عذاب آنے سے ڈرایا سب سے پہلے دعوت کو رد کر دینے کی وجہ سے آپ ہی کی امت پر عذاب آیا۔ آپ ہی کی بددعا سے روئے زمین کے تمام باشندے ہلاک کر دیئے گئے۔ تمام پیغمبروں سے آپ کی عمر زیادہ تھی اور اس کو بجائے خود آپ کا معجزہ قرار دیا گیا فرمایا فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا۔ آپ کا کوئی دانت نہیں گرا۔ کوئی بال سفید نہیں ہوا جسمانی طاقت میں کمی نہیں آئی۔ اتنی لمبی عمر تک آپ نے قوم کی ایذا رسانی پر صبر کیا۔

وَالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ اور جیسے نوحؑ کے بعد پیغمبروں کے پاس وحی بھیجی مثلاً ادریسؑ، ہودؑ، صالحؑ، شعیبؑ وغیرہ۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اور جیسے ہم نے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحاق اور یعقوبؑ کے پاس وحی بھیجی۔

وَالْاَسْبَاطِ اور اسباط یعقوبؑ یعنی اولاد یعقوبؑ کے پاس۔ اَلْاَسْبَاطِ سے مراد یا تو حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹے ہیں (اگر سب کو پیغمبر قرار دیا جائے) یا ان کی نسل سے ہونے والے پیغمبر۔

وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ اور عیسیٰؑ اور ایوبؑ اور یونسؑ اور ہارون اور سلیمان کے پاس۔ اَلْاَسْبَاطِ میں سے ان پیغمبروں کے ناموں کا خصوصی ذکر اس لئے کیا کہ یہ بڑے صاحب فضیلت تھے۔

وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۱۶۳﴾ اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔ زبور اس کتاب کا نام ہے جو حضرت داؤد پر اتاری گئی تھی۔ بغوی نے لکھا ہے کہ زبور میں اللہ کی حمد وثناء اور مجد کا بیان تھا۔ حضرت داؤد شہر سے باہر جنگل میں جا کر کھڑے ہو کر زبور کی

تلاوت کرتے تھے اس وقت علماء بنی اسرائیل آپ کے پیچھے صف بستہ ہوتے تھے اور علماء کے پیچھے دوسرے لوگ اور سب آدمیوں کے پیچھے جنات حسب تفاوت درجہ کھڑے ہوتے تھے۔ پہاڑی چوپائے بھی آپ کے سامنے آکر سن کھڑے ہوجاتے اور تعجب سے تلاوت کو سنتے تھے اور پرندے بازو پھیلائے لوگوں کے سروں پر منڈلاتے تھے۔ حضرت ابو موسیٰؓ اشعری کا بیان ہے کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رات تم مجھے دیکھتے میں تمہاری قرات سن رہا تھا تم کو داؤد کے سروں میں سے ایک سر دیا گیا ہے۔ ابو موسیٰؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ سن رہے ہیں تو خدا کی قسم میں خوب خوش ادائیگی سے کام لیتا۔

حضرت عمرؓ کی جب حضرت ابو موسیٰؓ سے ملاقات ہوتی تو آپ فرماتے ابو موسیٰؓ ہم کو کچھ نصیحت کرو (یعنی قرآن پڑھ کر سناؤ تاکہ ہم کچھ نصیحت حاصل کریں) حضرت ابو موسیٰؓ کچھ پڑھ کر سناتے۔

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ اور ہم نے کچھ پیغمبر بھیجے جن کا ذکر ہم نے پہلے تم سے کر دیا جیسے آدمؑ، شیثؑ، زکریاؑ، یحییٰؑ، ذوالکفلؑ وغیرہ۔

وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ؕ اور کچھ پیغمبر اور بھی بھیجے جن کا ذکر تم سے ہم نے نہیں کیا۔

حضرت ابوذرؓ نے فرمایا ہے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ سب سے پہلے کون پیغمبر تھا، فرمایا آدمؑ، میں نے عرض کیا وہ نبی تھے، فرمایا ہاں نبی تھے، جن سے کلام کیا گیا تھا۔

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ رسول کتنے ہوئے، فرمایا تین سو اور کچھ اوپر دس ایک بڑی جماعت۔

حضرت ابوامامہؓ کی روایت ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ انبیاء کی پوری گنتی کتنی تھی فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار، جن میں تین سو پندرہ کی ایک بڑی جماعت رسولوں کی ہوئی۔ رواہ احمد وابن ابی حاتم، حاکم نے ضعیف سند سے اور ابو یعلی نے اور حلیہ میں ابو نعیم نے بیان کیا کہ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے آٹھ ہزار انبیاء مبعوث فرمائے، چار ہزار بنی اسرائیل میں سے، اور چار ہزار باقی لوگوں میں سے۔ [1]

یہ آیت بتا رہی ہے کہ ایمان کے لئے تمام انبیاء کی الگ الگ (ناموں کے ساتھ) شناخت ضروری نہیں اگر ہر ایک پر تفصیلی ایمان ضروری ہوتا تو اللہ سب کا تفصیلی ذکر فرماتا بلکہ سب پر اجمالاً ایمان لازم ہے۔

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿۱۶۴﴾ اور اللہ نے موسیٰ سے یقیناً کلام کیا۔

اللہ کا کلام کرنا وحی کا انتہائی درجہ ہے یہ فضیلت اللہ نے تمام پیغمبروں میں سے حضرت موسیٰؑ کو عطا فرمائی تھی مگر محمد رسول اللہ ﷺ کو اس سے بھی بڑھ کر فضیلت عطا کی اور آپ کے درجات اونچے کئے فرمایا ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى وَ لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى اور جو کچھ کسی دوسرے نبی کو عنایت کیا تھا اس سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کو عطا کیا۔

فراء نے بیان کیا ہے کہ عرب بعض افعال انسانی کی نسبت بعض ایسے فاعلوں کی طرف بھی کر دیتے ہیں جو حقیقی فاعل نہیں ہو سکتے لیکن اس فعل کی تاکید مصدر کے ساتھ نہیں کرتے ہاں اگر مصدر کا تاکیداً ذکر کرتے ہیں تو اس وقت حقیقی فعل مقصود ہوتا ہے مجازی معنی مراد نہیں ہوتے مثلاً کہتے ہیں اَرَادَ الْجِدَارُ اَنْ يَّنْقَضَّ دیوار نے ٹوٹنے کا ارادہ کیا (ارادہ انسانی فعل

---

[1] ابن حبان نے صحیح میں اور حاکم اور ابن عساکر نے اور حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں اور عبد بن حمید نے حضرت ابوذر کا بیان نقل کیا ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! انبیاء کتنے ہوئے فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ان میں رسول کتنے ہوئے فرمایا تین سو تیرہ کی ایک بڑی جماعت، پھر فرمایا ابوذرؓ چار سریانی ہیں آدمؑ، شیثؑ، نوحؑ، خنوخؑ، خنوخ ہی ادریسؑ تھے انہوں نے سب سے پہلے قلم سے لکھا، چار عرب میں سے ہیں، ہودؑ، صالحؑ، شعیبؑ اور تمہارا نبی ﷺ، بنی اسرائیل میں سب سے پہلے نبی موسیٰؑ اور آخری نبی عیسیٰؑ ہوئے، سب سے اول نبی آدم تھے اور آخری نبی تمہارا پیغمبر ﷺ۔

ہے لیکن اس مثال میں اس کی نسبت دیوار کی طرف کر دی گئی ہے اس لئے حقیقی ارادہ مراد نہیں ہے) اس مثال میں اَرَادَ الْجِدَارُ اِرَادَةً کہنا درست نہیں کیونکہ دیوار حقیقی ارادہ کی اہل نہیں ہے (اور آیت میں کلم کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے اور اس کی تاکید کے لئے تکلیما مصدر بھی ذکر کیا ہے معلوم ہوا کہ حقیقی کلام مراد ہے)۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ اللہ نے بھیجے پیغمبر خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے۔

لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ تاکہ پیغمبروں کے بھیجنے کے بعد اللہ کے خلاف لوگوں کو کوئی عذر باقی نہ رہے یعنی قیامت کے دن لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ اے ہمارے رب تو نے ہمارے پاس کوئی پیغمبر کیوں نہیں بھیجا کہ ہم اس کے کہنے پر چلتے۔ حضرت مغیرہؓ کی روایت ہے کہ سعد بن عبادہؓ نے کہا اگر میں کسی کو اپنی بیوی کے پاس دیکھ لوں تو تلوار کی دھار سے اس کو ضرور قتل کر دوں۔ اس قول کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو فرمایا کیا تم کو سعد کی غیرت سے تعجب ہوتا ہے خدا کی قسم میں اس سے زیادہ غیرت مند ہوں اور اللہ مجھ سے زیادہ غیرت والا ہے اللہ کی اسی غیرت کا تقاضا ہے کہ اس نے کھلی چھپی فحش کاریاں حرام کر دی ہیں اور اللہ سے زیادہ کسی کو (گناہ گار کی) عذر خواہی پسند نہیں اسی لئے اس نے ڈرانے والے اور بشارت دینے والے پیغمبر بھیجے اور اللہ سے زیادہ کسی کو اپنی تعریف پسند نہیں اسی لئے اللہ نے جنت کا وعدہ کیا ہے۔ رواہ البخاری وغیرہ۔

بغوی نے لکھا ہے اس آیت میں ثبوت ہے اس امر کا کہ پیغمبروں کو بھیجے بغیر کسی کو عذاب نہیں دے گا جیسا کہ دوسری آیت میں اس نے خود فرمایا ہے وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا حنفیہ کہتے ہیں کہ (آیت وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ الخ سے مراد عذاب دنیوی کی نفی ہے یعنی جب تک اللہ کسی پیغمبر کو ہدایت کے لئے نہیں بھیج دیتا اور پھر لوگ اس سے سرکشی نہیں کرتے اللہ دنیوی عذاب نہیں بھیجتا) [1] احکام امر و نہی پر عذاب اللہ کی طرف سے اسی وقت ہوگا جب پیغمبر آکر امر و نہی بیان کر دیں (کیونکہ پیغمبر کے بغیر کسی کو معلوم نہیں کہ اللہ کا کیا حکم ہے اور کس چیز کی ممانعت ہے) البتہ نفس توحید کا اقرار و اعتراف پیغمبروں کے آنے پر موقوف نہیں، اندرونی اور بیرونی تمام آیات الوہیت توحید پر دلالت کر رہی ہیں اور ان کو سمجھنے کے لئے عقل کافی ہے، واللہ اعلم۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا اور اللہ غالب ہے یعنی اس کے ارادہ پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔

حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾ حکمت والا ہے۔ تدبیر نبوت۔ ہر نبی کو خاص قسم کی وحی اور مخصوص معجزات و فضیلت عطا کرنا اور خاتم المرسلین کو قیامت تک آنے والی تمام قوموں کی ہدایت کے لئے بھیجنا اور ہر نبی کو جو کچھ عطا فرمایا وہ سب ان کو عطا فرمانا اسی کی حکمت کے زیر اثر ہے۔

ابن اسحاقؒ اور ابن جریرؒ نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی حضور ﷺ نے ان سے فرمایا تم بلاشبہ جانتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں یہودیوں نے جواب دیا ہم کو تو اس کا علم نہیں۔

بغوی نے لکھا ہے کہ مکہ کے کچھ سردار رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا محمد ﷺ ہم نے یہودیوں سے تمہارے اور تمہارے اوصاف کے متعلق دریافت کیا کہ ان کی کتاب میں اس کا ذکر ہے یا نہیں یہودیوں نے جواب دیا کہ ہم (اپنی کتاب میں) اس امر سے واقف نہیں اس پر مندرجہ ذیل آیات کا نزول ہوا۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ لیکن اللہ تو اس کتاب کے ذریعہ سے جو آپ پر نازل کی ہے (آپ کی نبوت کی) شہادت دے رہا ہے۔ یعنی قرآن جو اپنی عبارت اور معنی کے لحاظ سے مکمل معجزہ ہے وہ آپ ﷺ کی نبوت کو ثابت کر

---

[1] یا اس آیت میں نفی عذاب سے مراد ہے بداعمالی اور بداطواری پر عذاب دینے کی نفی، یعنی آخرت میں کسی کی بداعمالی موجب عذاب اس وقت تک نہ ہوگی جب تک اللہ نے اسکے پاس پیغمبر کو نہ بھیج دیا ہو، رہا عدم توحید اور شرک کا مواخذہ اس کی نفی اس جگہ نہیں ہے۔

رہا ہے۔

أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ اللہ نے یہ کتاب اپنے خاص علم کے ساتھ اتاری ہے (یعنی یہ کتاب اللہ کے علم خاص کی حامل ہے) علم خاص سے مراد ہے گزشتہ اور آئندہ کے غائب امور کا علم۔ قرآن کی عبارت کا علم جس کی مختصر ترین سورت کی طرح بھی کوئی عبارت نہیں پیش کی جاسکتی۔ اس امر کو جاننا کہ نبوت کا اہل کون ہے اور کس پر کتاب نازل کی جائے۔ اور اس بات کو جاننا کہ لوگوں کو اپنی معاش و معاد کی درستگی کے لئے کس چیز کی ضرورت ہے۔ بِعِلْمِهٖ ترکیب کے اعتبار سے یا حالت فاعل کو بیان کر رہا ہے یا حالت مفعول کو یا مفعول مطلق ہے۔ اور پورا جملہ أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ سابق جملہ کی گویا تفسیر ہے۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ اور ملائکہ (بھی) شہادت دیتے ہیں کہ آپ کی مدد کے لئے جہاد کے موقع پر علی الاعلان آتے ہیں جیسے بدر کی لڑائی میں ہوا۔

وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾ اور اللہ کی شہادت کافی ہے یعنی آپ کی نبوت کے جو دلائل اللہ نے قائم کر دیئے ہیں ان کی موجودگی میں کسی دوسرے شہادت طلب کرنے کی ضرورت نہیں، یا یہ مراد ہے کہ مومنوں اور کافروں کو بدلہ دینا قیامت کے دن اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوگا لہٰذا اسی کی شہادت کافی ہے منصف حاکم کو اگر واقعہ کا علم ہو اور وہ خود شاہد ہو تو پھر کسی دوسرے کی شہادت کی ضرورت نہیں رہتی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بلاشبہ جن لوگوں نے خود کفر کیا اور دوسروں کو اللہ کی راہ سے روکا یعنی جن یہودیوں نے خود کافر رہنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کے ان اوصاف کو چھپایا جن کا ذکر توریت میں آیا ہے اور دوسروں کو رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے اور آپ ﷺ کا اتباع کرنے سے روکا۔

قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴿۱۶۷﴾ وہ (حق کے راستہ سے) دور بھٹک گئے کیونکہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا بلاشبہ جن لوگوں نے کفر کیا اور (محمد ﷺ پر) ظلم کیا کہ جان لینے کے بعد آپ کی نبوت کا انکار کیا یا لوگوں پر ظلم کیا کہ ان کو ان کی بھلائی کے راستہ سے روکا۔ اس سے مراد یہودی ہیں۔

لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ﴿۱۶۸﴾ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ اللہ نہ تو ان کی مغفرت کرے گا اور نہ سوائے راہ جہنم کے ان کو کوئی راستہ دکھائے گا یعنی صرف وہی راستہ بتائے گا جو جہنم تک پہنچانے والا ہوگا۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا وہ جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یعنی جہنم میں داخلہ کے وقت وہاں ہمیشہ رہنا ان کے لئے مقدر کر دیا جائے گا۔[1]

وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۶۹﴾ اور ان کو دوزخ میں داخل کرنا اللہ کے لئے آسان ہے۔ اس کے لئے کوئی چیز دشوار نہیں۔ اس آیت کا حکم ان لوگوں کے حق میں ہے جن کا مرتے وقت تک کفر پر قائم رہنا اللہ کے علم میں ہے کیونکہ ایسے ہی لوگ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے)۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے رسول، حق یعنی قرآن اور سچا دین لے کر آگیا۔ پہلے نبوت کا اثبات کیا۔ پھر نبوت پر یقین حاصل کرنے کا طریقہ بتایا اور نبوت کا انکار کرنے والوں کو عذاب کی وعید ذکر کی اب عام انسانوں کو دعوت حق دی جا رہی ہے۔

---

[1] خٰلِدِيْنَ حال ہے اور حال و ذوالحال کا زمانہ ایک ہوتا ہے اور داخلہ کے وقت خلود کا امکان نہیں کیونکہ داخلہ ایک آنی چیز ہے، تھوڑے وقت میں ہو جائے گا اور خلود کا معنی ہے غیر منقطع لاانتہا زمانہ پھر خٰلِدِيْنَ کا حال واقع ہونا کس طرح ممکن ہے، اس شبہ کا جواب حضرت مؤلف نے ایک جملہ میں دے دیا کہ داخلہ کے وقت ان کے لئے خلود مقدر کیا جائے گا حکم خلود اور داخلہ کا وقت ایک ہوگا گویا خلود سے مراد ہے حکم خلود۔

فَاٰمِنُوْا خَیْرًا لَّکُمْ ط لہٰذا اس پر ایسا ایمان لاؤ جو تمہارے لئے بہتر ہو یا اس طرح ترجمہ کیا جائے کہ ان پر ایمان لاؤ اور ایسا کام کرو جو تمہارے موجودہ مسلک سے بہتر ہو بغوی نے یَکُنْ کا لفظ محذوف قرار دیتے ہوئے اس طرح ترجمہ کیا ہے اس پر ایمان لاؤ، وہ ایمان تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ بصرہ کے علماء نحو نے بغوی کے قول کی مخالفت کی ہے کیونکہ اس صورت میں کان (فعل) کو مع اسم کے محذوف ماننا پڑے گا جو بغیر کسی خاص مجبوری کے جائز نہیں۔ اس کے علاوہ ایک خرابی یہ ہوگی کہ شرط و جزا دونوں کو محذوف قرار دیا جائے گا (صرف جزاء کا ایک جز مذکور ہوگا کیونکہ پورا کلام اس طرح ہوگا لوگو! ایمان لاؤ اگر ایمان لے آؤ گے تو ایمان لانا تمہارے لئے بہتر ہوگا) اہل بصرہ کے قول کی تردید اس قول الناس یجزون مجزون باعمالہم ان خیراً فخیرا۔ سے ہوتی ہے (کیونکہ اس میں کان کہ مع اسم کے دو جگہ حذف کر دیا ہے پورا کلام اس طرح تھا اگر عمل اچھے ہوں گے تو جزا اچھی ہوگی اِنْ کَانَ الْعَمَلُ خَیْرًا فَیَکُنْ جَزَاءُہٗ خَیْرًا۔

وَاِنْ تَکْفُرُوْا اور اگر کفر کروگے تو اللہ بے نیاز ہے نہ تمہارے کفر سے اس کا ضرر ہوگا نہ ایمان سے نفع، نقصان فائدہ تمہارا ہی ہوگا۔ (شرط کی جزا محذوف ہے اور آئندہ آیت علت حکم ہے)۔

فَاِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط پس جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے سب اللہ ہی کی مخلوق اور ملک ہے۔

وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا اور اللہ (مؤمن وغیر مؤمن کو) خوب جانتا ہے۔

حَکِیْمًا ﴿۱۷۰﴾ حکمت والا ہے، مومن اور غیر مؤمن کو ایک جیسا بدلہ نہیں دے گا۔

یٰۤاَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ اے اہل کتاب اپنے دین (کی عصبیت) میں (حق وصداقت کی) حد سے تجاوز نہ کرو۔ بعض علماء کا قول ہے کہ آیت میں یہود و نصاریٰ دونوں گروہوں کو خطاب ہے یہود حضرت عیسیٰ کی تنقیص کرتے تھے آپ کی والدہ کو زانیہ قرار دیتے اور آپ کی رسالت کی تکذیب کرتے تھے اس طرح حد صداقت سے ہٹ گئے تھے اور عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعظیم میں آگے بڑھ گئے تھے کہ آپ کو معبود بنا رکھا تھا۔ غلو کا اصل لغوی معنی ہے حد سے ہٹ جانا۔

بغویؒ نے لکھا ہے اس آیت کا نزول صرف نصاریٰ کے متعلق ہوا تھا۔ نصاریٰ کے چار فرقے ہیں یعقوبیہ، ملکائیہ، نطوریہ، مرقوسیہ، یعقوبیہ اور ملکائیہ کا تو قول یہ تھا کہ عیسیٰ ہی اللہ ہے۔ نسطوریہ کہتے تھے عیسیٰ اللہ کا بیٹا ہے مرقوسیہ قائل تھے کہ عیسیٰؑ تین میں کا تیسرا ہے یہ تعلیم ان کو ایک یہودی نے دی تھی جس کا نام بولس تھا سورۂ توبہ میں انشاء اللہ اس کی تفصیل آئے گی۔

وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الْحَقَّ ط اور اللہ کے متعلق حق بات کے علاوہ اور کچھ نہ کہو یعنی اس کو شریک، بیوی اور اولاد سے پاک سمجھو اور اس کو جسم قرار نہ دو جو کھانے کا محتاج ہو۔

اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ مسیح عیسیٰؑ بن مریمؑ تو بس اللہ کا رسول تھا۔ نہ نصاریٰ کا قول صحیح ہے کہ مسیح اللہ کا بیٹا تھا نہ یہود کا قول درست ہے کہ عیسیٰؑ جھوٹا ہے وہ تو اللہ کا رسول تھا۔

وَکَلِمَتُہٗ ج اور اللہ کا کلمہ تھا۔ یعنی اللہ کے کلمہ کن کا نتیجہ تھا۔ اللہ نے فرمایا ہو جا فوراً وہ بغیر باپ کے آدمی ہو گیا۔

اَلْقٰھَاۤ اِلٰی مَرْیَمَ اللہ نے اپنا کلمہ مریمؑ تک پہنچا دیا۔

وَرُوْحٌ مِّنْہُ ز اور اس کی طرف سے روح تھا یعنی دوسرے جانداروں کی طرح اللہ کی تخلیق کے زیر اثر وہ حامل روح تھا اور اس روح کا صدور اللہ کی طرف سے تھا اس لئے اِلٰہ نہیں ہو سکتا۔ اس فقرہ میں اللہ نے روح کی نسبت اپنی ذات کی طرف عیسیٰ کے شرف کو ظاہر کرنے کے لئے کی ہے۔ (ورنہ حقیقت میں تمام ارواح کا صدور اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ حضرت مفسر قدس سرہ عقیدۂ جزئیت کو باطل کرنا چاہتے ہیں کہ رُوْحٌ مِّنْہُ سے یہ سمجھنا کہ عیسیٰؑ اللہ کی روح تھے یا اللہ کی روح کا جز تھے بلکہ ایک مخلوق تھے جس کی روح کا صدور اللہ کی طرف سے ہوا تھا گویا اس وقت مِنْہُ میں مِنْ تبعیضیہ نہیں ہے بلکہ ابتدائیہ ہے)۔

بعض اہل تفسیر نے روح کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ آپ مردہ انسانوں کو یا مردہ دلوں کو زندہ کر دیتے تھے بعض نے کہا روح سے وہ پھونک مراد ہے جو جبرئیل علیہ السلام نے حضرت مریمؑ کے گریبان میں پھونکی تھی اور بحکم خدا اس پھونک سے حضرت مریم حاملہ ہو گئی تھیں۔ پھونکنے کو روح کہنے کی وجہ یہ ہے کہ پھونک بھی ہوا ہوتی ہے جو روح سے خارج ہوتی ہے اور چونکہ یہ نفخ بامر خدا بغیر مادی سبب کے ہوا تھا اس لئے اللہ کی طرف (براہ راست) اس کی نسبت کر دی۔

بعض نے کہا روح سے مراد ہے رحمت خدا اور رحمت اسی پر ہوتی ہے جو اس پر ایمان رکھتا اور حکم پر چلتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ روح سے مراد وحی ہے مریمؑ کو وحی بصورت بشارت ہوئی اور جبرئیلؑ کو وحی نفخ کی ہوئی اور عیسیٰ کو وحی کی گئی کہ ہو جا وہ ہو گئے بعض کے نزدیک روح سے مراد جبرئیلؑ ہیں اور اس کا عطف القا کی مستتر فاعلی ضمیر پر ہے اور فصل ہونے کی وجہ سے یہ جائز ہے یعنی اللہ نے اپنا کلمہ مریمؑ کو پہنچایا اور جبرئیلؑ نے بحکم خدا وہ کلمہ پہنچا دیا۔ اللہ آمر یا خالق تھا اس لئے اس کی طرف کلمہ پہنچانے کی نسبت کی اور جبرئیل فاعل یا کاسب تھا اس لئے اس کی طرف نسبت کر دی۔

حضرت عبادہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اللہ کے وحدہ لاشریک ہونے کی اور محمد ﷺ کی عبدیت و رسالت کی شہادت دی اور یہ بھی اعتراف کیا کہ عیسیٰؑ اللہ کا بندہ اور اس کا رسول اور اس کا کلمہ تھا جو اللہ نے مریمؑ کو پہنچایا تھا اور اللہ کی طرف سے صادر شدہ روح بھی تھا اور (یہ بھی یقین رکھا کہ) جنت حق ہے اور دوزخ حق ہے تو اس کو (آخر کار) اللہ جنت میں لے جائے گا عمل اس کے کچھ بھی ہوں۔ رواہ البخاری و مسلم فی صحیحہما۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ پس مانو اللہ تعالیٰ کو جیسا کہ اس کی شان تنزیہ کے مناسب ہے۔

وَرُسُلِهٖ اور اس کے پیغمبروں کو جن میں عیسیٰ بھی داخل ہیں۔

وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اور نہ کہو کہ الٰہ تین ہیں اللہ اور مسیحؑ اور مریمؑ (یعنی مسیحؑ اور مریمؑ کو معبود نہ قرار دو) اسی مفہوم پر دلالت کر رہی ہے آیت اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ نصاریٰ اقانیم ثلثہ (الوہیت کے تین عناصر) کے قائل تھے۔ اللہ عیسیٰؑ .... اور جبرئیل اللہ کو باپ عیسیٰؑ کو بیٹا اور جبرئیلؑ کو روح القدس کہتے تھے۔ عیسائی کہتے تھے کہ ایک ذات کی دو صفات تھیں علم اور حیوۃ۔ صفت علم ذات سے منتقل ہو کر مستقل بن کر مجسم بن گئی جس کا نام عیسیٰؑ ہو گیا اور صفت حیوۃ کا نام جبرئیل قرار پایا۔

اِنْتَهُوْا (تثلیث سے) باز ہو۔

خَيْرًا لَّكُمْ تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ یا ایسا کام کرو جو تمہارے موجودہ مسلک سے بہتر ہے۔

اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ بس اللہ ہی تنہا معبود ہے۔ اسکے اندر کسی طرح کا تعدد (اور کثرت) نہیں ہے۔

سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ وہ اس امر سے پاک ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو۔ اولاد ہونے کا تصور تو وہاں ہو سکتا ہے جہاں اصل کی مثل ہو سکتی ہو اور فناء کا تصور کیا جا سکتا ہو (اللہ کا تو نہ مثل ہے نہ وہ فانی ہے) اسی لئے اللہ نے اپنے لئے صاحب اولاد ہونے کے قول کو گالی قرار دیا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ نے فرمایا۔ ابن آدمؑ نے میری تکذیب کی اور اس کے لئے یہ جائز نہ تھا، اس نے مجھے گالی دی اور اس کو یہ بھی درست نہ تھا میری تکذیب تو اس قول سے کی کہ اول تخلیق کی طرح دوبارہ اللہ تخلیق نہیں کرے گا حالانکہ اول تخلیق سے دوبارہ تخلیق میرے لئے دشوار نہیں اور گالی اس قول سے دی کہ اللہ نے اپنا بیٹا بنا لیا حالانکہ میں اکیلا ہوں بے احتیاج ہوں نہ میری اولاد نہ میں کسی کی اولاد، نہ میرا کوئی مثل۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں میں بیوی اور اولاد اختیار کرنے سے پاک ہوں۔ رواہ البخاری۔

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ اسی کی مخلوق اور ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اس کی مثل کون ہو سکتا ہے کہ اس کے بیٹے ہونے کا تصور کیا جا سکے۔ یہ جملہ گویا نفی ولدیت کی علت ہے۔

وقف لازم

وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾ اور اللہ کافی کارساز ہے یعنی سارے عالم کی نگہداشت اور انتظام کے لئے اللہ ہی کافی ہے اس لئے اولاد کی اس کو کوئی ضرورت نہیں۔ اولاد کی ضرورت تو اس لئے ہوتی ہے کہ باپ کا ہاتھ بٹائے اور اس کا قائم مقام بن جائے۔ واللہ اعلم

بغوی نے لکھا ہے اور واحدی نے اسباب النزول میں اس قول کی نسبت کلبی کی طرف کی ہے کہ نجران کے نمائندوں نے کہا محمد ﷺ آپ ہمارے آقا پر عیب لگاتے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا میں کیا کہتا ہوں وفد والوں نے کہا آپ ان کو اللہ کا بندہ اور رسول کہتے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا اللہ کا بندہ ہونا تو عیسیٰ کے لئے باعث عار نہیں اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ مسیح تو اللہ کا بندہ ہونے سے ہرگز عار نہ کریں گے کیونکہ اللہ کی بندگی تو ان کے لئے باعث شرف و کمال ہے جس پر ان کو فخر ہے کیونکہ ممکنات کے اندر کوئی کمال وصفی اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ان کا انتساب اللہ کی طرف نہ ہو اور سوائے عبدیت کے مسیح کی کوئی اور نسبت اللہ سے نہیں ہے پس عبدیت ہی ان کیلئے کمال ہے ذلت و نفرت تو اللہ کے سوا دوسروں کی بندگی سے ہوتی ہے کیونکہ وہ بھی اسی جیسا ہوتا ہے۔

اِسْتِنْكَاف کا معنی ہے کسی چیز کو حقیر سمجھ کر اس سے ناک چڑھانا۔ محاورہ ہے نَكَفْتُ الدَّمْعَ میں نے انگلی یا ہاتھ سے آنسو پونچھ لئے تا کہ کا نشان باقی نہ رہے۔

وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ اور نہ مقرب فرشتے (اللہ کی بندگی سے عار کرتے ہیں) اس کا عطف اَلْمَسِيْحُ پر ہے۔

جو لوگ انسان پر فرشتوں کی برتری کے قائل ہیں وہ اپنے دعوے پر اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کیونکہ اس آیت میں مسیح کے بعد ملائکہ کا ذکر کیا گیا ہے اور ترقی ادنیٰ سے اعلیٰ کی جانب ہوتی ہے محاورہ میں بولا جاتا ہے زید اس سے عار نہیں کرتا اور نہ وہ شخص عار کرتا ہے جو زید سے برتر ہے یوں نہیں کہا جاتا کہ فلاں بات سے زید عار نہیں کرتا اور نہ اس کا غلام عار کرتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ ملائکہ کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی جانب حکم کی ترقی مقصود ہو بلکہ آیت میں دونوں فرقوں کی تردید مقصود ہے۔ پرستاران مسیح کی بھی اور پرستاران ملائکہ کی بھی۔ (کیونکہ جس طرح نصاریٰ کا ایک فرقہ مسیح کو خدا کا بیٹا کہتا تھا اسی طرح بعض اہل شرک ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے)۔

یا یوں کہا جائے کہ آیت میں ادنیٰ مرتبہ والوں سے اعلیٰ مرتبہ والوں کی طرف ترقی مراد نہیں ہے بلکہ قلت سے کثرت کی طرف ترقی کا حکم مقصود ہے (یعنی مسیح کو بھی عبدیت سے عار نہیں اور نہ ملائکہ مقربین کو عار ہے جن کی تعداد بے شمار ہے) جیسے کہا جاتا ہے حاکم سے نہ کوئی بڑا سردار ڈرتا ہے نہ رعایا اور نہ خدام۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ اگر ادنیٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ تک ترقی کا حکم آیت میں مان بھی لیا جائے تو زائد سے زائد یہ لازم آتا ہے کہ مقرب فرشتے مسیحؑ سے افضل ہو جائیں گے یعنی وہ کروبی جو حاملین عرش ہیں مسیحؑ سے برتر قرار پائیں گے لیکن اس سے مطلق جنس ملائکہ کی فضیلت نوع بشر پر لازم نہیں آتی اور اختلاف اسی مسئلہ میں ہے۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ آیت میں نفی استنکاف کی مسیح سے ملائکہ کی جانب ترقی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ملائکہ افضل ہیں اور ان کو ثواب کا استحقاق زیادہ ہے بلکہ اس ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ بنی آدم میں تو باہمی بندگی اور غلامی کی کثرت ہے اگر انسان کے کسی ایک فرد یعنی مسیحؑ کو عبدیت سے عار نہ ہو تو تعجب نہیں ان میں غلامی اور عبدیت عام چیز ہے تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ مقرب فرشتے جو باہم بندگی کا تصور بھی نہیں کرتے ان کو بھی اللہ کی عبدیت سے عار نہیں۔

میرے نزدیک اعلیٰ تحقیق یہ ہے کہ آیت سے ملائکہ کی کلی فضیلت انسانوں پر لازم نہیں آتی جزئی فضیلت ثابت ہوتی ہے یعنی بعض وجوہ سے ملائکہ کو انسان پر فضیلت اور برتری حاصل ہے اور اس میں کوئی نزاع بھی نہیں ہے حاصل مطلب یہ ہے کہ انسان جو اپنی شخصی اور نوعی بقا کے لئے کھانے پینے اور جماع کرنے کا محتاج ہے اس کا زمانہ حدوث بھی قریب ہے مدت عمر بھی کوتاہ ہے موت آنے میں بھی زیادہ مدت نہیں وہ اللہ کی عبدیت اور مخلوقیت سے کیسے انکار کر سکتا ہے اور کس طرح اپنی الوہیت کا

دعویٰ کر سکتا ہے جب کہ وہ ملائکہ جو ہر مادی کثافت سے پاک ہیں ان کو کوئی حاجت نہیں۔ قوت بھی ان کی زائد ہے عمریں بھی کم نہیں ہیں امراض و مصائب میں مبتلا بھی نہیں ہوتے اللہ کی عبدیت سے انکار نہیں کرتے اور نہ اپنی الوہیت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ پھر نصاریٰ نے حضرت عیسیٰؑ کے معاملہ میں حد سے زیادہ مبالغہ کیا اور عبدیت سے بالاتر قرار دیا تھا اور اس غلط افراط کی وجہ صرف یہ تھی کہ عیسیٰؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے مادر زاد اندھوں کو بینا اور برص زدہ لوگوں کو صحت مند اور مردوں کو زندہ کر دیتے تھے اور لوگوں کی رات کی کھائی ہوئی چیزیں بتادیتے تھے اور جو چیزیں لوگ گھروں میں اندوختہ کرتے تھے ان کی بھی اطلاع دیدیتے تھے ان کے رد میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ اوصاف تو ملائکہ میں بہ نسبت عیسیٰؑ کے زیادہ ہیں اور اس کے باوجود ملائکہ کو اللہ کی عبدیت سے عار نہیں پھر عیسیٰؑ کو عبدیت سے کس طرح انکار ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ جب نصاریٰ نے حضرت عیسیٰؑ کے معاملہ میں حد سے زیادہ افراط سے کام لیا اور اتنی اونچی بلندی پر جا بٹھایا جو کسی طرح ان کے لئے سزاوار نہ تھی تو آیت میں عیسیٰؑ پر ملائکہ کی فضیلت کی طرف اشارہ کر دیا گیا خواہ بعض اعتبارات سے ہی ہو مگر ملائکہ کی فضیلت کی طرف اشارہ ہو گیا اور نصاریٰ کے زعم باطل کا جواب ہو گیا۔ جس طرح حضرت موسیٰ سے جب دریافت کیا کہ کیا تم کو اپنے سے بڑا عالم کوئی معلوم ہے اور موسیٰ نے نفی میں جواب دیا تو فرمایا ضرور ہے۔ ہمارا بندہ خضر تم سے (بعض چیزوں کو) زیادہ جانتا ہے۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ نے اپنے ساتھی سے کہا لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا۔ اور حضرت خضرؑ سے کہا هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا۔

وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾ اور جو شخص اللہ کی بندگی سے عار اور تکبر کرے گا تو اللہ سب کو اپنے پاس جمع کرے گا۔ اور سزا دے گا۔

استنکاف (غرور کیساتھ انکار آمیز ناک چڑھانا) سے استکبار (اپنے کو غلط طور پر بڑا سمجھنا) کا درجہ کم ہے۔ استکبار کا استعمال اس جگہ ہوتا ہے جہاں بڑائی کا استحقاق مطلق نہ ہو اور تکبر میں یہ شرط نہیں ہے تکبر کبھی استحقاق کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ پس جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے۔

جیسے مسیح اور ملائکہ اور دوسرے مومن (معلوم نہیں آیت کے عموم میں حضرت مفسر علیہ الرحمۃ نے ملائکہ کو کیوں داخل کیا، باوجودیکہ کلام کا سیاق بتا رہا ہے کہ صرف نیک مومن انسانوں کا حکم بیان کرنا مقصود ہے پھر آئندہ جزاء کا تعلق بھی صرف انسانوں سے ہے ثواب پورا پورا دینا اور اپنے فضل سے ثواب مزید عطا کرنا اس کا وعدہ صرف انسانوں سے ہے۔ انسان ہی قوانین کتاب کا مکلف ہے فرشتے تو مکلف ہی نہیں ہیں نہ ان سے حساب کتاب کی کہیں صراحت ہے نہ ثواب عذاب پانے کی نص (واللہ اعلم۔ مترجم)

فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ تو ان کا ثواب پورا پورا دے گا جیسا کہ اس نے وعدہ کیا ہے۔

وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اور اپنی مہربانی سے (جتنا اور جو چاہے گا) زیادہ عطا کرے گا۔

چند در چند جزا اور مقام قرب و دیدار کے وہ معاملات جو نہ کسی آنکھ نے دیکھے نہ کسی کان نے سنے نہ کسی کے دل میں ان کا تصور آیا (جو کچھ چاہے گا عطا فرمائے گا)۔

طبرانی وغیرہ نے ضعیف سند سے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جن لوگوں کے لئے دوزخ لازم ہو چکی ہو گی تو اللہ اپنی مہربانی سے نیک لوگوں کو ان کی شفاعت کرنے کا حق دے گا (گویا نیکیوں کے لئے حق شفاعت کی عطا اللہ کی مزید مہربانی ہو گی)۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ اور جن لوگوں نے (اللہ کی بندگی سے) عار کی اور بڑے بنے تو اللہ ان کو دکھ کا عذاب دے گا۔

وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾ اور اللہ کو چھوڑ کر ان کو اپنے لئے نہ کوئی

کارساز ملے گا نہ مددگار۔

ایک شبہ

تفصیل اجمال کے مطابق نہیں ہے کیونکہ سیحشر ھم کی ضمیر مَنْ یَسْتَنْکِفْ کی طرف راجع ہے تو اجمال کی حالت میں صرف اَلْمُسْتَنْکِفِیْنَ کا ذکر ہوا مگر تفصیل کے موقع پر دونوں فریقوں کا ذکر ہے۔

ازالہ :۔ یہ صریحی عبارتی اجمال کی تفصیل نہیں ہے بلکہ مضمون کلام جو قرینہ سے سمجھا جارہا ہے اس کی تفصیل ہے گویا کلام یوں تھا اللہ اپنے پاس سب استنکاف کرنے والوں کو جمع کرے گا اور جس روز سب بندوں کو جمع کرے گا اس روز ان کو بدلہ دے گا پس بندوں میں سے جو ایمان لائے ہوں گے اور نیک کام کئے ہوں گے ان کو......... اور جن لوگوں نے استنکاف اور تکبر کیا ہوگا ان کو......... یا یوں کہا جائے کہ اہل استنکاف کے مخالفوں کو اچھی جزاء دینا در حقیقت اہل استنکاف کے لئے عذاب اور حسرت والم کا سبب ہوگا تو گویا اہل استنکاف کے ہی دوگنا عذاب کو بیان کیا گیا ہے (اہل ایمان کے ثواب کا بیان سابق اجمال کی تفصیل نہیں بلکہ کافروں کے عذاب کا دوسرے طریقہ سے بیان ہے)

علامہ تفتازانیؒ نے اس توجیہ کو غلط قرار دیا ہے کیونکہ اہل استنکاف کی سزا پر اَمَّا کا لفظ نہیں آیا ہے بلکہ دونوں فریقوں کے بیان کے شروع میں آیا ہے۔

صاحب کشاف نے فَسَیَحْشُرُھُمْ کے بعد وَالْمُؤْمِنِیْن کا لفظ مقدر قرار دیا ہے (تاکہ اجمال کے موقع پر دونوں فریق کا ذکر ہو جائے) کیونکہ تفصیل کا تقاضا یہی ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ دو مقابل چیزوں میں سے اگر ایک کا ذکر صراحت کے ساتھ کر دیا جائے تو دوسری کا ذکر ضمناً آہی جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں تفصیل سے پہلے دونوں فریقوں کا ذکر (صراحت کے ساتھ) ہو چکا ہے غیر مُسْتَنْکِفِیْن کا ذکر تو لَنْ یَّسْتَنْکِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّکُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِکَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ کے ذیل میں آگیا اور اہل استنکاف کا ذکر آیت ومن یستنکف عن عبادتہ کے ضمن میں ہو گیا اس کے بعد تفصیل کے موقع پر اللہ نے دونوں فریقوں کے اچھے برے بدلہ کا ذکر کر دیا۔

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَکُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کے پاس سے واضح دلیل آگئی یعنی ایسے معجزات آگئے جو محمد ﷺ کی نبوت کو ثابت کر رہے ہیں یا برہان سے مراد ہے حجت الٰہیہ یعنی رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا ﴿۱۷۴﴾ اور ہم نے تمہارے پاس روشنی پیدا کرنے والا یعنی قرآن بھیج دیا جس طرح اشیاء کا انکشاف روشنی سے ہوتا ہے اسی طرح حق کا انکشاف قرآن سے ہوتا ہے۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اس کو (یعنی اس کے دین کو) مضبوطی سے پکڑ لیا۔

فَسَیُدْخِلُهُمْ فِیْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ تو اللہ ان کو اپنی رحمت و فضل میں ضرور داخل کرے گا۔ رحمت سے مراد ہے جنت اور اتنا ثواب جو ایمان و عمل کے مقابلہ میں اللہ نے اپنی رحمت سے مقرر کر دیا ہے اگرچہ کسی کا حق اللہ پر واجب نہیں۔ معتزلہ ہر نیکی کے ثواب کو اللہ پر واجب قرار دیتے ہیں۔ فضل سے مراد ہے اللہ کا وہ احسان جو مقررہ ثواب سے زائد ہوگا، جیسے دیدار الٰہی اور درجات قرب۔

وَّیَهْدِیْهِمْ اِلَیْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ﴿۱۷۵﴾ اور اپنے پاس تک پہنچنے کا ان کو سیدھا رستہ بتادے گا۔ اِلَیْه

سے مراد ہے اللہ کا وہ راستہ جو اللہ کی ذات بے کیف و بے مثال تک پہنچانے والا ہے اور صراط مستقیم سے مراد ہے اسلام، طاعت، صوفیہ کے راستہ پر چلنا اور آخرت میں جنت کا راستہ اور مقام دیدار و قرب۔ ابن مردویہ نے بیان کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے کلالہ (کی میراث کا حکم دریافت کیا تو آیت ذیل نازل ہوئی۔

یَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِ ؕ لوگ آپ سے حکم دریافت کرتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تم کو کلالہ کے بارے میں حکم دیتا ہے۔ کلالہ کے معنی کی تحقیق شروع سورت میں ہو چکی ہے۔ نسائی نے ابوالزبیر کے طریق سے حضرت جابرؓ کا بیان نقل کیا ہے۔ جابرؓ نے فرمایا میں بیمار ہو گیا رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا میں اپنی بہنوں کے لئے ایک تہائی مال کی وصیت کر دوں فرمایا (ان کے ساتھ) بھلائی کرو میں نے عرض کیا آدھے مال کی وصیت کر دوں فرمایا (ان کے ساتھ) بھلائی کرو، یہ فرمانے کے بعد تشریف لے گئے پھر (کچھ دیر کے بعد) تشریف لائے اور فرمایا میرے خیال میں تم اس بیماری سے نہیں مرو گے۔ اللہ نے تمہارے اور تمہاری بہنوں کے معاملہ میں حکم نازل فرما دیا اور وہ دو تہائی مال (کا) ہے حضرت جابرؓ فرمایا کرتے تھے کہ اس آیت کا نزول میرے ہی حق میں ہوا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ شروع سورت میں جو قصہ گزر گیا حضرت جابرؓ کا یہ قصہ اس سے الگ ہے۔

فائدہ :- علماء کا اجماع ہے کہ حقیقی بھائی بہنوں کی میراث کے متعلق یہ آیت اتری ہے جیسا کہ شروع سورت میں حضرت ابو بکرؓ کی روایت سے ہم نے بیان کر دیا ہے۔

اگر حقیقی بھائی بہن نہ ہوں تو علاتی بھائی بہن (باپ ایک ماں جدا جدا) کا حکم حقیقی کی طرح بالاجماع ہے۔

اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَیْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ اگر کوئی آدمی مر جائے اور اس کی کوئی اولاد نہ ہو (نہ نر نہ مادہ) اور ایک حقیقی بہن ہو تو بہن کو بھائی کے ترکہ میں سے آدھا مال ملے گا۔

وَهُوَ یَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ یَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ لیکن اگر بہن مر جائے اور اس کی کوئی اولاد نہ ہو تو بھائی حقیقی بہن کے کل مال کا وارث ہوگا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ میت کے باپ دادا بھی موجود نہ ہوں یہ شرط لفظ کلالہ سے سمجھی جاتی ہے (اگرچہ اس جگہ یہ شرط عبارت میں مذکور نہیں ہے)۔

فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَیْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ اور اگر دو (یا زیادہ) بہنیں ہوں (اور بھائی کوئی نہ ہو) تو بھائی کے کل ترکہ کا دو تہائی ان کا ہوگا۔ دو سے زائد کا حصہ بھی دو ہی کے برابر بالاجماع ہے۔

وَ اِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّ نِسَآءً اور اگر بھائی بہنوں کی ایک جماعت ہو کچھ مرد اور کچھ عورتیں۔ اگر دو بھائی بہن ہوں یعنی ایک بھائی اور ایک بہن ہو تو دونوں کا حصہ بھی جماعت کی برابر بالاجماع ہے۔

فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ ؕ تو (ایک) مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر واجب ہے یعنی اگر دونوں کے ساتھ ایک بھائی یا زیادہ بھائی ہوں تو ہر بھائی کو دو بہنوں کے برابر حصہ دینا واجب ہے۔ دلالت نص سے یہ مسئلہ معلوم ہو رہا ہے کہ اگر ایک یا زیادہ بھائی ہوں اور بہن ایک ہو تو ایک بہن کو ایک بھائی کے حصہ سے آدھا دیا جائے گا۔ حاصل یہ کہ مرد کے دو حصے اور عورت کا ایک حصہ ہے۔

مسئلہ :- ایک بہن کے لئے کل ترکہ کا آدھا اور ایک بہن سے زیادہ کے لئے کل ترکہ کا دو تہائی اس وقت ہوگا جب میت کی نر مادہ اولاد نہ ہو یہ مسئلہ تو صراحتاً مذکور ہے۔ اسی کے ساتھ باجماع علماء یہ بھی ضروری ہے کہ میت کی نسل در نسل کی کوئی نرینہ اولاد بھی نہ ہو یعنی پوتا پوتے کا بیٹا پوتے کے بیٹے کا بیٹا وغیرہ بھی نہ ہو اس وقت بہن یا بہنوں کا مذکورہ حصہ ہوگا اور اگر ایک نرینہ نسل یا چند ہوں۔ مثلاً ایک یا چند پوتے یا ایک پروتا یا چند پروتے ہوں خواہ پوتی یا پروتی یا سکروتی کوئی ہو یا نہ ہو بہر حال اس وقت بھائیوں اور بہنوں کو کچھ نہیں ملے گا اور اگر ایک یا چند لڑکیاں ہوں پوتیاں ہوں پروتیاں ہوں تو اس وقت بھائی بہن عصبہ ہوں گے بیٹی پوتی پروتی بہر حال نرینہ اولاد کی نسلی عورتوں کے مقررہ حصہ دینے کے بعد جو کچھ بچے گا وہ بھائیوں اور بہنوں کا

ہو گا۔ بھائیوں کے عصبہ ہونے کے متعلق حدیث آئی ہے حضور ﷺ نے فرمایا ہے مقررہ حصے حصوں والوں کو پہنچادو پھر جو کچھ بچے وہ قریب ترین مرد کا ہے (یعنی بھائی کا ہے) اسی طرح ایک یا چند بہنیں ایک بیٹی یا چند بیٹیوں کی موجودگی میں صاحب فرض نہیں بلکہ عصبہ ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہے۔ بہنوں کو بیٹیوں کی موجودگی میں عصبہ قرار دو۔

شرحبیل کا بیان ہے کہ ایک شخص حضرت ابو موسیٰؓ اور حضرت سلیمانؒ بن ربیعہ کے پاس آیا اور مسئلہ پوچھا کہ ایک آدمی مر گیا اور وارثوں میں ایک بیٹی ایک پوتی اور ایک حقیقی بہن موجود ہے تقسیم ترکہ کس طرح کی جائے۔ دونوں بزرگوں نے جواب دیا بیٹی کو نصف اور بہن کو نصف دیا جائے (یعنی پوتی محروم ہے) جاؤ ابن مسعودؓ سے جا کر پوچھ لو وہ بھی اس کی تائید کریں گے۔ سائل حضرت ابن مسعودؓ کے پاس گیا حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا اگر میں اس کی تائید کروں گا تو گمراہ ہوں گا۔ میں وہی حکم دوں گا جو رسول اللہ ﷺ نے دیا تھا۔ بیٹی کا نصف ترکہ۔ پوتی کا کل ترکہ کا چھٹا حصہ۔ اس طرح دو تہائی ترکہ دونوں کا ہو جائے گا۔ اور جو باقی رہے گا (یعنی ایک تہائی) وہ بہن کا ہو گا۔ [1] رواہ البخاری۔

مسئلہ :- ایک حقیقی بھائی اگر موجود ہو تو علاتی بھائی بہن وارث نہیں ہوتے کیونکہ حضرت علیؓ کی روایت ہے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا حقیقی بھائی آپس میں وارث ہوتے ہیں۔ علاتی بھائی وارث نہیں ہوتے ایک شخص اپنے حقیقی بھائی کا وارث ہوتا ہے علاتی بھائی وارث نہیں ہوتا۔ رواہ الترمذی وابن ماجہ والحاکم من حدیث الحارث عن علیؓ۔ یہ حدیث بقول ترمذی صرف حارث کی روایت سے آئی ہے اور حارث ضعیف ہے مگر ترمذی نے کہا ہے کہ حارث فرائض کے عالم تھے ان کی اس روایت پر عمل کیا جاتا ہے یعنی ان کی اس روایت پر عمل کرنے پر اجماع ہے۔

مسئلہ :- اگر ایک حقیقی بہن ہو تو علاتی بہن کو خواہ ایک ہو یا چند کل ترکہ کا چھٹا حصہ ملے گا تاکہ دو تہائی کی تکمیل ہو جائے جس طرح اگر ایک بیٹی ہو اور اس کے ساتھ ایک پوتی یا متعدد پوتیاں ہوں تو بیٹی کو نصف اور پوتی کو چھٹا حصہ ملتا ہے لیکن اگر دو حقیقی بہنیں ہوں تو علاتی بہنوں کو کچھ نہیں ملتا۔ کیونکہ حقیقی بہنوں کو اس وقت دو تہائی مل جاتا ہے ہاں اگر علاتی بہنوں کے ساتھ ان کا کوئی بھائی بھی موجود ہو تو بھائی کی وجہ سے وہ بھی عصبہ ہو جاتی ہیں اور بقیہ ایک تہائی بھائی بہنوں میں دوہرے اور اکہرے کے حساب سے تقسیم کر دیا جائے گا یعنی مرد کا دوہرا حصہ اور عورت کا اکہرا۔

مسئلہ :- اجماع علماء ہے کہ اگر حقیقی بھائی موجود نہ ہوں اور علاتی ہوں تو علاتی کا اس وقت حکم حقیقی کی طرح ہو جاتا ہے یا تو اسی آیت کی وجہ سے کیونکہ اس میں لفظ اخوۃ آیا ہے جو بہنوں کو بھی شامل ہے (اور حقیقی وعلاتی دونوں اس میں داخل ہیں) مگر عینی کو علاتی پر ترجیح سنت سے ثابت ہے (گویا سنت سے آیت کی تشریح ہو گئی) مگر اس صورت میں مشترک کے دونوں معنی ایک ہی وقت میں مراد لینے پڑیں گے یا یوں کہا جائے کہ نقل مستفیض (خبر مشہور) کی وجہ سے ہم مذکورۂ بالا حکم دیتے ہیں (اگرچہ آیت میں مذکور نہیں ہے)۔

بہر حال ایک بہن کو نصف اور دو یا دو سے زیادہ ہوں تو ان کو دو تہائی دیا جائے گا۔ اور تنہا ایک بھائی ہو تو سب ترکہ کا مالک ہو جائے گا اور اگر بھائی بہن مخلوط ہوں تو مرد کا دوہرا اور عورت کا اکہرا حصہ ہو گا لیکن اگر میت کا بیٹا یا پوتا یا پروتا یا باپ یا دادا موجود ہو تو علاتی بھائی بہن محروم ہو جائیں گے اور اگر میت کی ایک یا متعدد بیٹیاں موجود ہوں تو علاتی کا وہی حکم ہو گا جو بیٹیوں کی موجودگی میں حقیقی بھائی کا ہوتا ہے۔

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ اللہ تمہارے سامنے تمہارے بہک جانے کو کھول کر بیان کرتا ہے یعنی اگر تم کو تمہاری خواہش پر آزاد چھوڑ دیا جائے تو گمراہ ہو جاؤ گے اُس بات کو اللہ کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنی مرضی پر چلنے کو چھوڑ

---

[1] حضرت ابن عباسؓ فرماتے تھے کہ اگر بیٹی موجود ہو تو بہن کا کوئی مقررہ حصہ نہیں بلکہ وہ عصبہ ہو جائے گی آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ یہ حکم نہ قرآن میں ہے نہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ میں اللہ نے تو فقط اِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ فرمایا ہے مگر یہ حکم سنت (صحابہ) سے ثابت ہے اور اس پر اجماع ہو چکا ہے۔

دو۔
یا یہ ترجمہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے حق اور سچی بات کھول کر بیان کر رہا ہے کیونکہ تمہارا بھٹک جانا اس کو ناپسند ہے۔ علماء کوفہ کے نزدیک اس جگہ لا محذوف ہے یعنی اللہ اپنا حکم کھول کر بیان کر رہا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ۔

وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ اور اللہ ہر چیز سے بخوبی واقف ہے۔ موت و زندگی میں بندوں کے لئے جو مصالح ہیں ان کو بھی خوب جانتا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت براء بن عازبؓ کا قول منقول ہے کہ سب سے آخر میں نازل ہونے والی سورت سورۂ برأت ہے اور سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت سورۂ نساء کی آخری آیت یَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ہے۔ متفق علیہ۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت آیت ربوا ہے اور سب سے آخر میں نازل ہونے والی سورت اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ہے۔ ایک اور روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول بھی آیا ہے کہ آخری آیت وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللّٰهِ ہے۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ سورۃ النصر کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ سال بھر زندہ رہے اور سورۃ النصر کے چھ ماہ بعد سورت برات نازل ہوئی اور یہی سورت تھی جو سب سے آخر میں پوری نازل ہوئی اس کے بعد حضور ﷺ چھ ماہ زندہ رہے پھر حجۃ الوداع کے راستہ میں آیت یَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ نازل ہوئی۔ اور اس کا نام آیت الصیف لیا گیا (گرمی والی آیت) پھر اس کے بعد وقوف عرفہ کے وقت آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ نازل ہوئی اس آیت کے نزول کے بعد حضور ﷺ ۸۱ دن زندہ رہے پھر آیت ربوا نازل ہوئی، اور اس کے بعد حضور ﷺ اکیس روز زندہ رہے۔

جس روایت میں سورت برات کے بعد حضور ﷺ کا چھ ماہ زندہ رہنا آیا ہے وہ محل تامل ہے کیونکہ سورت برات کا نزول اس وقت ہوا جب ۹ھ میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو امیر حج بنا کر بھیجا تھا جب حضرت ابوبکرؓ چلے گئے تو ان کے پیچھے حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو سورت برات کے شروع کی چالیس آیات تعلیم دے کر بھیجا تھا کہ حج میں لوگوں کے سامنے پڑھ دی جائیں۔ اس حساب سے سورت برات کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ ۱۵ مہینے زندہ رہے یا ۱۶ مہینے۔

اسی طرح یہ بات بھی قابل تسلیم نہیں کہ سورت نصر کے بعد رسول اللہ ﷺ سال بھر زندہ رہے کیونکہ فتح مکہ کے بعد جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو سورت نصر تلاوت فرماتے داخل ہوئے۔ سورت نصر کی تفسیر میں اس کی تفصیل کر دی گئی ہے اور فتح مکہ حضور ﷺ کی وفات سے ۳۰ ماہ پہلے ہوئی تھی۔

...... سورت نساء کی تفسیر ۱۱ ررجب ۱۹۸ اھ کو بحمد اللہ پوری ہوئی ......

۱؎ حضرت عمر بن الخطابؓ نے فرمایا جو سورۃ بقرہ اور سورۃ النساء اور سورۃ آل عمران پڑھتا ہے اللہ کے ہاں اس کو اہل دانش میں سے لکھا جاتا ہے۔ (مفسر رحمۃ اللہ)

سورۃ المائدۃ

سُوْرَةُ الْمَائِدَةِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ وَعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَسِتَّةَ عَشَرَ رُكُوْعًا

یہ سورت مدینہ میں نازل ہوئی اس میں ۱۶ رکوع اور ۱۲۰ آیات ہیں[۱]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ اے ایمان والو وعدوں کو پورا کرو۔ عقد۔ مضبوط عہد۔ اصل میں دو چیزوں کا اتنا مضبوط اتصال کہ دونوں کا الگ الگ ہونا دشوار ہو عقد کہلاتا ہے۔

زجاج نے کہا کہ عقد مضبوط ترین عہد کو کہتے ہیں۔ "وفاء اور ایفا" وعدہ کے تقاضے کو ادا کرنا۔ وفا سے زیادہ لفظ ایفاء میں قوت ہے کذا قال التفتازانی۔ اللہ نے روز میثاق سے اب تک جن عہود کا پابند بندوں کو بتایا ہے وہ سب العقود میں داخل ہیں خواہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام اور حلال کی ہوئی چیزوں کو حلال قرار دینے کی صورت میں ہوں یا وہ وعدے ہوں جو محمد ﷺ پر ایمان لاتے اور اوصاف محمدی کو ظاہر کرنے سے متعلق اہل کتاب سے لئے گئے ہیں۔ یا انسانوں کے باہم وہ معاہدات ہوں جن کا تعلق آپس کے معاملات اور امانتوں وغیرہ سے ہو جس کو پورا کرنا شرعاً واجب ہو۔

[۱] حضرت عائشہؓ نے فرمایا (سورت) مائدہ کا نزول قرآن میں سب سے آخر میں ہوا اس لئے جو چیز تم اس میں حلال پاؤ اس کو حلال سمجھو اور جس کو حرام پاؤ اس کو حرام قرار دو (یعنی اس کا کوئی حکم منسوخ نہیں) رواہ احمد والنسائی وغیرہما۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا سورۃ المائدہ اور الفتح آخر قرآن ہے (یعنی سب سے آخر میں نازل ہوئی رواہ احمد والترمذی والحاکم، ترمذی نے اس روایت کو حسن اور حاکم نے صحیح کہا ہے، ابو عبیدہ نے محمد بن کعب قرظی کا قول نقل کیا ہے مکہ مدینہ کے درمیان سورۂ مائدہ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی اس وقت آپ اونٹنی پر سوار تھے اونٹنی کا شانہ (نزول وحی کے بار سے) دکھنے لگا تو آپ اتر پڑے۔

ابن جریر نے ربیع بن انسؓ اور عطیہ بن قیس کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، مائدہ نزول کے اعتبار سے آخر قرآن سے ہے پس تم اس کے حلال کو حلال قرار دو اور حرام کو حرام، ابو داؤد نے ناسخ میں اور ابن المنذر نے حسن کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ مائدہ کا کوئی حصہ منسوخ نہیں ہوا، عبد بن حمید نے اور ناسخ میں ابو داؤد نے شعبی کا قول نقل کیا ہے کہ مائدہ کی آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ کے علاوہ اور کوئی حصہ منسوخ نہیں ہوا، ابو داؤد نے ناسخ میں اور حاکم نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ اس سورۃ کی دو آیتیں منسوخ کر دی گئی ہیں ایک آیت القلائد اور دوسری آیت فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ۔

بیہقی نے شعب الایمان میں مقاتل بن حیان کا قول نقل کیا ہے کہ آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ میں عقود سے مراد ہیں وہ وعدے جو قرآنی اوامر و نواہی کی پابندی سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ وعدے جو مومنوں اور مشرکوں کے درمیان ہوں اور (باقی اگلے صفحہ پر)

رسول اللہ ﷺ نے منافق کی نشانیوں میں سے ایک نشانی معاہدہ شکنی کو بھی قرار دیا تھا۔ رواہ الشیخان من حدیث عبداللہ بن عمرؓ۔ تحلیل حلال اور تحریم حرام بھی چونکہ ان عقود میں داخل ہے جن کا مکلف اللہ نے بندوں کو کیا ہے اس لئے ایفاء عقود کا حکم دینے کے بعد آگے فرمایا۔

اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْاَنْعَامِ حلال کر دیئے گئے ہیں تمہارے لئے چوپائے۔

بہیمہ وہ جاندار جس میں قوت تمیز نہ ہو۔ انعام چوپائے۔ یا بہیمہ چوپائے اور انعام اونٹ گائے، بکریاں بہر حال دونوں صورتوں میں بہیمۃ الانعام میں عام کی اضافت خاص کی جانب ہے اور اہل نحو کے نزدیک ایسی اضافت میں لام مقدر ہوتا ہے۔ بیضاوی اور صاحب کشاف کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اضافت بتقدیر من ہے حالانکہ اضافت بتقدیر من اس جگہ ہوتی ہے جہاں مضاف مضاف الیہ کی جنس سے ہو جیسے خاتمٌ فضۃٍ چاندی کی انگوٹھی اور دونوں کے ہم جنس ہونے کا یہ معنی ہے کہ مضاف اور مضاف الیہ میں سے ہر ایک دوسرے سے بعض اعتبار سے عام ہو (دیکھو خاتم، فضہ سے عام ہے لوہے اور پیتل کی بھی انگوٹھی ہوتی ہے اور فضہ خاتم سے عام ہے چاندی کا دوسرا زیور بھی ہوتا ہے لیکن بہیمۃ الانعام میں بہیمہ اگرچہ الانعام سے عام ہے مگر الانعام بہیمہ سے عام نہیں ہے تمام انعام بہیمہ ہی ہوتے ہیں۔) بہر حال دونوں تاویلوں کی صورت میں آیت کا مقصد ان چوپایوں کو حلال بنا دینا ہے جو اہل جاہلیت نے اپنے لئے حرام قرار دے لئے تھے جیسے بحیرہ اور سائبہ کلبی نے کہا بہیمۃ الانعام سے وہ جنگلی چوپائے مراد ہیں جو شہری چوپایوں کی طرح جگالی کرتے ہیں اور ان کے منہ میں نوکیلے کیلے نہیں ہوتے جیسے ہرن، نیل گائے وغیرہ۔ اس وقت بہیمہ کی الانعام کی طرف اضافت علاقہ مشابہت کی وجہ سے ہوگی جیسے لُجَيْنُ الْمَاءِ (یعنی پگھلی ہوئی چاندی جو پانی کی طرح ہو پس بہیمۃ الانعام کا معنی ہو وہ بہائم جو انعام کی طرح ہوتے ہیں)۔

بغوی نے لکھا ہے کہ ابوظبیان نے حضرت ابن عباس کا قول بیان کیا ہے کہ بہیمۃ الانعام سے مراد ہیں۔ حلوان یعنی جانوروں کے پیٹ سے بر آمد ہونے والے بچے۔ شعبی کا قول بھی اسی طرح آیا ہے۔ اس تفسیر پر آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ اگر کسی مادہ کو ذبح کرنے کے بعد اس کے پیٹ سے مردہ بچہ بر آمد ہو اور جسم کی بناوٹ پوری ہو گئی ہو تو بغیر ذبح کے اس کو کھانا حلال ہے۔ امام شافعیؒ امام احمدؒ اور ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا یہی قول ہے۔ امام مالکؒ نے یہ شرط مزید لگائی ہے کہ بچہ کے بال نکل آئے ہوں۔ بغوی نے حضرت ابن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ماں کو ذبح کرنا ہی پیٹ کے بچہ کا ذبح کرنا ہے بشرطیکہ اس کی جسمانی بناوٹ پوری ہو گئی ہو اور بال نکل آئے ہوں۔ سعید بن مسیب کا قول بھی اسی طرح مروی ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا پیٹ کے بچہ کو بغیر مستقل ذبح کرنے کے کھانا درست نہیں۔ اس کے بال نکل آئے ہوں یا نہ نکلے ہوں۔ امام شافعیؒ اور ان کے ساتھیوں نے حضرت ابو سعیدؓ خدری کی روایت سے استدلال کیا ہے۔ ابو سعیدؓ کا بیان ہے کہ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم اونٹنی کو گائے کو اور بکری کو ذبح کرتے ہیں اور اس کے پیٹ کے اندر سے بچہ نکلتا ہے کیا ہم بچہ کو پھینک دیں یا کھالیں؟ فرمایا دل چاہے تو کھالو۔ اس کی ماں کو ذبح کرنا اس کو ذبح کرنا ہے (جدید ذبح کی ضرورت نہیں) رواہ ابو

(بقیہ پچھلے صفحے کا) وہ معاہدات جو لوگوں کے درمیان آپس میں ہوں، اس آیت سے حنفیہ نے استدلال کیا ہے کہ بیع میں جب طرفین سے ایجاب قبول کی تکمیل میں ہو جئے تو بائع اور مشتری میں سے کسی کو بغیر خیار شرط اور خیار رویت اور خیار عیب کے بیع کو فسخ کرنے کا حق نہیں (کیونکہ یہ نقض عقد ہوگا اور آیت ایفاء عقد کا حکم دے رہی ہے)۔

امام مالک کا بھی یہی قول ہے امام شافعی کہتے ہیں کہ دونوں کو صورتوں میں خیار فسخ رہتا ہے ایک خیار کی صورت میں اور دوسری اس صورت میں کہ ایجاب و قبول کی تکمیل کے بعد دونوں میں سے کوئی مقام عقد سے چلا نہ جائے، کیونکہ حضرت ابن عمرؓ اور حضرت حکیم بن حزام کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَلْمُتَبَايِعَانِ بِالْخِيَارِ مَالَمْ يَتَفَرَّقَا، رواہ البخاری اور جب خیار مجلس صحیح حدیث سے ثابت ہو تو جب تک مجلس عقد سے دونوں جدا جدا نہ ہو جائیں خیار باطل نہیں ہوتا اور تکمیل عقد نہیں ہوتی جس طرح خیار شرط کی صورت میں جب تک مدت خیار گذر نہ جائے عقد تمام نہیں ہوتا، ۱۲۔

داؤد واحمد۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پیٹ کے بچہ کی ماں کو ذبح کرنا اس بچہ کا ذبح کرنا ہے۔ رواہ ابوداؤد والدارمی۔

دار قطنی نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے پیٹ کے بچہ کے متعلق فرمایا اس کی ماں کو ذبح کرنا ہی اس کو ذبح کرنا ہے اس کے بال نکل آئے ہوں یا نہ نکلے ہوں دار قطنی نے کہا صحیح یہ ہے کہ یہ (آخری فقرہ) حضرت ابن عمرؓ کا قول ہے۔

امام شافعیؒ نے (عقلی استدلال کے طور پر) فرمایا کہ پیٹ کا بچہ حقیقت میں ماں کا جز ہے ماں سے جڑا ہوا ہوتا ہے یہاں تک کہ بغیر قینچی سے کاٹنے کے ماں سے جدا نہیں ہوتا۔ ماں کی ہی غذا سے اس کو غذا پہنچتی ہے اور ماں کے ہی تنفس سے وہ سانس لیتا ہے اور جب بہمہ حیثیات جزہے تو ماں کا زخم ہی اس کو ذبح کرتا ہے اگر اس کو بحالت زندگی ذبح کرنا ممکن ہو جیسے شکار اور امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا پیٹ کا بچہ مستقل زندگی رکھتا ہے۔ ماں کے مرنے کے بعد بچہ کی زندگی کا امکان ہے۔ اور بچہ خون رکھنے والا جاندار بھی ہے اور ذبح کرنے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ گوشت کو خون سے علیحدہ کر دیا جائے اور یہ بات تنہا ماں کو ذبح کرنے سے حاصل نہیں ہوتی۔ ماں کو ذبح کرنے سے بچہ کے بدن سے خون نہیں نکل جاتا۔ شکار کو زخمی کرنے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا وہاں زخمی ہو جانے سے کچھ خون نکل ہی جاتا ہے اور ناقص خروج کو پورے خروج کے قائم مقام مان لیا جاتا ہے (بچہ کے بدن سے تو ماں کو ذبح کرنے سے بالکل خون نہیں نکلتا) اور بچہ کا گوشت خون سے جدا نہ ہوا تو وہ مردار ہوا اور مردار کی حرمت قرآن میں موجود ہے جو قطعی ہے اور احادیث آحاد مفید ظن ہیں لہٰذا (حکم کتاب کے خلاف) جنین کی حلت احادیث آحاد سے ثابت نہیں کی جا سکتی۔ اور اس آیت میں بہیمۃ الانعام کی تفسیر جنین سے کرنا تقاضائے مقام کے خلاف ہے کیونکہ آگے بطور استثناء آیا ہے۔

اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ سوائے ان کے جن کی تمہارے سامنے (آگے) تلاوت کی جا رہی ہے۔ جن چیزوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے اور ان کا حکم سنایا گیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔ مردار۔ جن کو ذبح کرنے کے وقت اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔ جن جانوروں کو بتوں کی بھینٹ کے طور پر ذبح کیا گیا ہو گلا گھونٹ کر مارے ہوئے جانور چوٹ کے صدمہ سے مرے ہوئے جانور، کسی اونچی جگہ سے لڑھک کر گر کر مرے ہوئے جانور اور وہ چوپائے جن کا کچھ حصہ درندوں نے کھا لیا ہو۔ یہ تمام جانور بہیمۃ الانعام میں داخل تھے اسی لئے استثناء کیا گیا (بہیمہ الانعام سے مراد جنین ہو تو ان جانوروں کے استثناء سے پہلے مستثنیٰ یا مستثنیٰ منہ میں داخل ہونا ضروری ہے اور ان جانوروں کی حرمت کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ جانور خود اپنی موت سے یا دوسرے عوارض سے مرتے ہیں بعض علماء کے نزدیک استثناء منقطع ہے تلاوت کی نسبت المیتہ وغیرہ کی طرف مجازی ہے حقیقت میں میتہ اور اس کے بعد ذکر کی جانے والی چیزیں بذات خود نا قابل تلاوت ہیں تو حقیقت میں الفاظ کی ہوتی ہے یا یوں کہا جائے کہ مضاف محذوف ہے یعنی سوائے ان جانوروں کے جن کی حرمت کی آیت تلاوت کی جا رہی ہے اس صورت میں (مجازی الاسناد نہ ہوگا۔ مجاز بالحذف ہو گا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ما یتلی میں ما سے مراد آیت ہو اور اس سے پہلے مضاف محذوف ہو یعنی الا محرم ما یتلی علیکم —

منہ نبی الا محرم ما یتلی علیکم ×

غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ (لیکن) شکار کو حلال مت سمجھنا۔ صید مصدر بھی ہو سکتا ہے (شکار کرنا) اور اسم مفعول بھی (شکار کیا ہوا) لفظ غیر حال ہے یعنی انعام جیسے چوپائے تمہارے لئے حلال کر دیئے گئے ہیں لیکن تمہارے لئے یہ حلت ایسی حالت میں ہے کہ بحالت احرام تم شکار کو حلال نہ سمجھو چونکہ حلت انعام کو اس شرط سے مشروط کرنا کہ حالت احرام میں شکار کو حلال نہ سمجھا جائے ایک بے ربط سی بات تھی اس لئے صاحب کشاف نے لکھا ہے کہ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ سے مراد ہے شکار سے باز رہنا گویا یوں فرمایا کہ جب شکار کی ممانعت کی حالت ہو تو اس وقت (بھی) تمہارے لئے بعض چوپائے حلال کر دیئے گئے ہیں تاکہ تمہارے لئے کچھ دشوار نہ ہو۔

یہ تفسیر قابل اعتراض ہے کیونکہ چوپایوں کی حلت حالت احرام کے ساتھ مقید نہیں جبکہ شکار کرنا حرام ہوتا ہے بلکہ چوپایوں کی حلت ہر حال میں ہے۔ احرامی حالت ہو یا نہ ہو اس لئے یہ تقیید اس وقت درست ہو گی جب بہیمۃ سے مراد عام بہائم

ہوں جنگلی ہوں یا شہری۔ یہ مراد اول تفسیر کی ہوگی اور تیسری صورت پر بہیمہ سے مراد خصوصیت کے ساتھ جنگلی چوپائے ہوں گے اس وقت شکار کی حلت، عدم احرام کے ساتھ مشروط ہوگی۔ مطلب اس طرح ہوگا کہ بہیمۃ الانعام جنگلی ہوں یا شہری سوائے میتہ اور دوسرے ممنوعات کے تمہارے لئے حلال کر دیئے گئے ہیں مگر تم احرام کی حالت میں شکار کی حلت کا اعتقاد نہ رکھو۔ یہ بھی جائز ہے کہ محلی سے مراد حق تعالیٰ کی ذات ہو اور جمع کا صیغہ تعظیماً استعمال کیا گیا ہو یعنی ہم نے تمہارے لئے بہیمۃ الانعام کو حلال کیا۔ مگر احرام کی حالت میں ہم نے شکار حلال نہیں کیا۔

وَاَنْتُمْ حُرُمٌ اس حال میں کہ تم احرام باندھے ہو۔

اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ① کوئی شک نہیں کہ اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے چاہے وہ کسی چیز کو حلال بنا دے چاہے حرام اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ابن جریر نے عکرمہ اور سدی وغیرہ کی روایت سے لکھا ہے کہ حکم بن ہند بکری کچھ اونٹ غلہ سے لدے ہوئے لے کر مدینہ میں آیا اور غلہ فروخت کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی اور مسلمان ہو گیا جب واپسی میں پشت پھیر کر باہر جانے لگا تو حضور اقدس ﷺ نے اس کی طرف دیکھا اور ان لوگوں سے جو حضور ﷺ کے پاس موجود تھے فرمایا یہ شخص میرے سامنے کافر چہرہ لے کر آیا اور دغا باز پشت پھیر کر واپس چل دیا۔ چنانچہ حکم یمامہ پہنچ کر مرتد ہو گیا اور حضور کی پیشین گوئی پوری ہوئی) پھر اونٹوں پر کچھ لاد کر ماہ ذی قعدہ میں مکہ کو جانے کے ارادہ سے نکلا صحابہؓ نے جب یہ خبر سنی تو مہاجرین و انصار کے کچھ آدمیوں نے اس کے قافلہ کو لوٹنے کے ارادہ سے جانے کا ارادہ کر لیا اس پر آئندہ آیت نازل ہوئی۔

بغوی نے لکھا کہ آئندہ آیت کا نزول حطم کے متعلق ہوا تھا جس کا نام شریح بن ضبیعہ بکری تھا یہ مدینہ میں آیا اور اپنے سواروں کو پیچھے چھوڑ کر تنہا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا آپ لوگوں کو کس بات کی طرف بلاتے ہیں۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا میں دعوت دیتا ہوں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ و مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کے اقرار کی۔ نماز پابندی کے ساتھ ادا کرنے اور زکوٰۃ دینے کی، کہنے لگا بہتر ہے مگر میرے ساتھ کچھ سردار اور بھی ہیں جن (کی رائے) کے بغیر میں کسی کام کو طے نہیں کر سکتا۔ امید ہے کہ میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ اور ان کو ساتھ لے کر آؤں گا۔ شریح کے آنے سے پہلے ہی رسول اللہ ﷺ صحابہؓ سے فرما چکے تھے کہ تمہارے پاس قبیلہ ربیعہ کا ایک شخص آئے گا جو شیطان کی زبان سے کلام کرے گا۔ غرض شریح حضور کے پاس سے نکل کر چلا گیا۔ آپ نے فرمایا کافر منہ لے کر آیا تھا اور عہد شکن پشت کے ساتھ چلا گیا۔ شریح مدینہ سے نکل کر (جنگل میں) مدینہ والوں کے اونٹوں کی طرف سے گزرا اور گلہ کو ہنکا کر لے گیا لوگوں نے اس کا پیچھا کیا مگر گرفتار نہ کر سکے پھر جب دوسرا سال ہوا تو یہ بنی بکر کے حاجیوں کے ساتھ حج کرنے کے لئے یمامہ سے روانہ ہوا، اس وقت اس کے ساتھ بڑا تجارتی مال بھی تھا اور اونٹوں کی گردنوں میں اس نے قلادہ بھی ڈال رکھا تھا۔ مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا حضور ﷺ یہ حطم حج کے لئے نکلا ہے آپ ہم کو اجازت دیدیجئے ہم اس سے نمٹ لیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا اس نے تو قربانی کے جانوروں کے گلے میں قلادے ڈال رکھے ہیں مسلمانوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ حرکت تو ہم جاہلیت کے زمانہ میں کیا کرتے تھے مگر رسول اللہ ﷺ نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

واحدی نے بیان کیا ہے کہ حطم یمامہ سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مدینہ میں آیا حضور ﷺ نے اس کو اسلام کی دعوت دی لیکن اس نے قبول نہیں کی جب حطم مدینہ سے نکلا تو راہ میں مدینہ والوں کے اونٹوں کو ہنکا تا لے گیا۔ پھر جب حضور ﷺ قضاء عمرہ کے لئے مدینہ سے نکلے تو آپ نے یمامہ کے حاجیوں کے لبیک پڑھنے کی آواز سنی صحابہؓ سے فرمایا یہ حطم اور اس کے ساتھی ہیں حطم نے جو اونٹ لوٹے تھے ان کی گردنوں میں قلادے پہنائے تھے اور کعبہ کو قربانی کے لئے بھیجے تھے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ اے ایمان والو بے حرمتی نہ کرو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کی۔

حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد نے فرمایا شعائر سے مراد ہیں حج کے مناسک اور مواقف یعنی کعبہ کا طواف صفا اور مروہ کے درمیان سعی۔ عرفہ اور مزدلفہ میں قیام، کنکریاں مارنا اور وہ تمام امور جو حاجی کرتا ہے جیسے احرام طواف، سر منڈوانا، قربانی کرنا وغیرہ۔ شعائر کو حلال قرار دینے سے مراد ہے ان کی پرواہ نہ کرنا ان کی توہین کرنا حاجیوں کے ان اعمال میں رکاوٹ پیدا کرنا۔ مشرکین حج کرتے اور قربانی کے جانور کعبہ کو بھیجا کرتے تھے مسلمانوں نے ان کو لوٹنا چاہا تو ممانعت میں یہ آیت نازل ہوئی۔

شعائر جمع ہے شعیرۃ واحد، کسی چیز کی خصوصی علامت کو شعیرہ کہتے ہیں حج کے مناسک اور مواقف حج کی علامات اور نشانیاں ہیں اسی لئے ان کو شعائر حج کہا جاتا ہے، ابو عبیدہ نے کہا شعائر اللہ سے مراد ہیں قربانی کے وہ جانور جو حاجی کعبہ کو بھیجتا ہے۔

اشعار علامت بنادینا (یہ لغوی معنی ہے) اونٹ کے کوہان کے ایک پہلو کو کسی قدر چیر دیا جاتا تھا کہ اس سے خون بہنے لگتا تھا یہ خصوصی علامت تھی اس امر کی کہ یہ اونٹ قربانی کے لئے بھیجا ہوا ہے اس زخم کر دینے کو اشعار اسی مناسبت سے کہا جاتا تھا

مسئلہ :۔ قربانی کا جانور اگر اونٹ ہو تو اس کو اشعار کرنا امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مکروہ ہے باقی اماموں کے نزدیک سنت ہے اور صاحبینؒ کا بھی یہی قول ہے۔ جمہور کے قول کا ثبوت حضرت عائشہؓ کی اس روایت سے ہوتا ہے حضرت عائشہؓ کا بیان ہے میں نے اپنے ہاتھ سے رسول اللہ ﷺ کی قربانی کے اونٹوں کے قلادے بٹے پھر آپؐ نے وہ قلادے اونٹوں کی گردنوں میں ڈال دیئے اور ان کو اشعار کیا اور کعبہ کو بھیج دیا لیکن قربانیوں کے اونٹوں کی روانگی سے قبل جو چیز حلال تھیں وہ اس روانگی سے ممنوع نہیں ہو گئیں (یعنی حلت بدستور قائم رہی اور قربانی کے جانوروں کی روانگی کو احرام نہیں قرار دیا گیا)۔

عطیہ کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا جو قول آیت لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ کی تفسیر کے سلسلہ میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ حالت احرام میں شکار نہ کرو (آیت کا یہی مطلب ہے) کیونکہ دوسری آیت میں ہے وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا جب احرام کھول دو تو پھر شکار کر سکتے ہو۔ میرے نزدیک حضرت ابن عباسؓ کے دونوں قولوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ حالت احرام میں شکار سے اجتناب بھی مناسک حج کی خلاف ورزی سے اجتناب کی ایک شاخ ہے بعض علماء نے آیت کا مرادی مطلب یہ بیان کیا کہ حرم کے اندر قتل نہ کرو۔

وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ اور نہ ماہ حرام کی یعنی ماہ حرام میں مقاتلہ (جنگ کو حلال نہ قرار دو۔ ابن زید نے کہا ماہ حرام کی خلاف ورزی نہ کرنے سے مراد نسی کی ممانعت ہے۔ عرب جاہلیت کے زمانہ میں ایک ماہ حرام کو ماہ حلال اور دوسرے ماہ حلال کو ماہ حرام بنا دیتے تھے (رجب، ذیقعدہ، ذی الحجہ اور محرم چار ماہ اسلام سے پہلے ماہ حرام کہلاتے تھے ان میں امن عام ہو جاتا اور لڑائیاں بند ہو جاتیں مگر لوگ پیہم تین ماہ ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم کے امن سے تنگ آجاتے اور شیخ مجاز سے درخواست کرتے کہ ماہ محرم کو اس سال حلال کر دیا جائے اور بجائے محرم کے صفر کو حرام بنا دیا جائے۔ سردار قبائل عکاظ کے میلہ میں اس تبدیل حرمت حلت کا اعلان کر دیتا اسی کو نسی کہتے تھے۔ اللہ نے اس تبدیلی کی ممانعت فرمادی اور اس کو زیادت کفر فرمایا کہ ایک مہینہ جو ایک سال حلال ہے وہی دوسرے سال حرام بنا دیا جائے نسئی کا ترجمہ بعض اہل علم نے جو لوندھ کیا ہے وہ غلط ہے۔ لوندھ میں تو ایک ماہ کا اضافہ ہو جاتا ہے اور نسئی میں مہینہ کی بیشی نہیں ہوتی تھی بلکہ ایک مہینہ کی خصوصیت منتقل کر کے دوسرے مہینہ پر ڈال دی جاتی تھی)۔

وَلَا الْهَدْيَ اور نہ قربانی کے اس جانور کی جو کعبہ کو قربانی کے لئے بھیجا گیا ہو قربانی کے جانور اونٹ گائے اور بکری تھے انہی کو قربانی کے لئے کعبہ کو بھیجا جاتا تھا۔

بخاری نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ھدی میں اونٹ یا گائے یا بکری ہوتی ہے۔ اگرچہ قربانی کا جانور بھی شعائر میں داخل ہے جن کی ممانعت شروع جملہ میں کر دی گئی ہے مگر اس کی اہمیت زیادہ تھی اس لئے خصوصیت کے ساتھ اس کا نام لے کر ذکر کیا اگر اس کو لوٹ لیا جائے تو غریبوں کی حق تلفی ہو گی اور اس کا احتمال بھی قوی تھا کہ بنسبت دوسرے شعائر کے

ہدی کو لوگ لوٹ لیں گے کیونکہ اس میں ان کا مالی نفع تھا اور طمع مالی انسان کی سرشت میں داخل ہے۔

وَلَا الْقَلَآئِدَ اور نہ پٹہ والے قربانی کے جانوروں کی قلائد قلادۃ کی جمع ہے (ہار یا وہ چیز جو ہار کی طرح استعمال کی جائے) ہدی کے گلے میں جوتی یا کسی درخت کی چھال لٹکادی جاتی تھی تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ جانور کعبہ کو جارہا ہے اور کوئی اس سے تعرض نہ کرے۔

القلائد سے مراد قلادہ والے جانور ہیں۔ الہدی کے اندر اگرچہ ان کا اندراج تھا مگر خصوصی شرف کی وجہ سے ان کا ذکر علیحدہ کیا گیا۔ عطاء نے کہا القلائد سے مراد قلادہ والے انسان ہیں کیونکہ جاہلیت کے زمانہ میں جب لوگ حرم سے نکلتے تھے تو اونٹوں کی طرح خود اپنی گردنوں میں بھی حرم کے درختوں کی چھال لٹکالیا کرتے تھے تاکہ کوئی ان سے تعرض نہ کرے۔ مطرف بن الشخیر کے نزدیک قلائد سے یہی مراد ہیں۔ مشرکوں کا دستور تھا کہ مکہ کے درختوں کی چھال اپنی گردنوں میں لٹکالیا کرتے تھے (اس رسم کی ممانعت کے لئے) درختوں سے کھال اکھاڑنے کی ممانعت فرمادی۔

بعض علماء نے کہا اصل میں قربانی کے جانوروں سے تعرض کرنے کی ممانعت مقصود ہے لیکن کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے قلادوں سے بھی تعرض کرنے کی ممانعت کردی جیسے آیت وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ میں (عورتوں کو اظہار زینت کی ممانعت کی گئی ہے اور مقصد ہے عورتوں کو خود پردہ میں رہنے کا حکم دینا اور اس حکم میں قوت پیدا کرنے کے لئے اظہار زینت کی بھی ممانعت فرمادی گئی ہے۔ ھدی و قلائد سے تعرض کرنے سے مراد ہے ان کو پکڑ لینا یا حرم تک پہنچنے سے روک دینا۔

وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ اور نہ (زیارت کیلئے) کعبہ کا قصد کرنے والوں کی یعنی ان کو قتل کرو نہ لوٹو۔

يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ؕ جو اپنے رب کے فضل اور اس کی رضامندی کے طالب ہوں۔

رب کا فضل دنیوی تو تجارتی رزق ہے اور اخروی فضل ثواب ہے جو لوگ بیت حرام کو تجارت کرنے اور حج کرنے کے لئے جارہے ہوں ان سے تعرض کرنے کی ممانعت اس آیت میں کردی گئی۔

کعبہ کا قصد کرنے والوں میں مشرک اور مومن دونوں فرقے داخل ہیں۔ اٰمِّيْنَ کا لفظ بھی دونوں کو شامل ہے اس کے علاوہ قضاء عمرہ کے سال یہ آیت نازل ہوئی جس میں حطم بکری اور اس کے اونٹوں سے تعرض کرنے کی ممانعت کردی گئی۔ لیکن واقع میں یہ حکم مومنوں کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ دوسری آیت میں آیا ہے اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو۔ اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا۔ مشرک (عقائد میں) گندے ہیں اس لئے اس سال کے بعد کعبہ کے قریب بھی نہ آئیں۔ لہٰذا آیت وَلَا اٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ منسوخ ہے ہدی اور قلائد کو لے کر کوئی مشرک وکافر حج نہیں کر سکتا۔

رہا اللہ کے فضل و رضامندی کی طلب تو ظاہر ہے کہ مشرک واقع میں اس کے طلب گار نہیں ہو سکتے اس لئے بعض لوگوں نے اس طرح تاویل کی ہے کہ کفار اپنے خیال میں تو اللہ کے فضل و رضوان کے طالب ہیں۔ انہی کے خیال کے مطابق اللہ نے ان کو بھی فضل و رضامندی کا طلب گار قرار دیدیا قتادہ نے کافروں پر اللہ کے فضل اور ان سے اللہ کی خوشنودی کا مطلب یہ لیا ہے کہ اللہ دنیا میں ان کی معاش کے اسباب کا انتظام کرتا اور کفر کی دنیا میں سزا نہیں دیتا ہے۔ بعض لوگوں نے کہا تجارت کے ذریعہ سے رزق کی طلب تو اہل ایمان اور اہل شرک دونوں فرقوں میں پائی جاتی ہے۔ رہا اللہ کی خوشنودی کی جستجو وہ صرف مومنوں کے ساتھ مخصوص ہے۔

وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ اور جب تم احرام کھول دو تو شکار کر سکتے ہو۔

آیت لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ میں بحالت احرام شکار کرنے کی ممانعت کردی گئی تھی۔ اس آیت میں احرام کھولنے کے بعد شکار کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ بعض لوگوں نے کہا کہ غَيْرَ مُحِلِّى الصَّيْدِ کے فقرہ میں شکار کی ممانعت کی گئی تھی اور فَاصْطَادُوْا سے اجازت دے دی گئی یہ قول ضعیف ہے۔

فَاصْطَادُوْا امر کا صیغہ ہے اور باجماع علماء اس جگہ امر اباحت (اجازت) کے لئے ہے جیسے آیت فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا میں بالاجماع امر اباحت کے لئے ہے۔ اباحت حکم کی اس جگہ یہ علت نہیں ہے کہ یہ امر ممانعت کے بعد آیا ہے اور جو امر ممانعت کے بعد آئے وہ اباحت کے لئے ہوتا ہے۔ بلکہ وجہ یہ ہے کہ جو امر بیرونی قرائن سے خالی ہو ضابطہ اصلیہ یہ ہے کہ وہ وجوب کے لئے ہوتا ہے دیکھو اسی ضابطہ کی وجہ سے آیت فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ میں لفظ امر سے اور آیت مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ میں لفظ اَمَرْتُكَ سے اہل اصول کے نزدیک ایجاب مراد ہے۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ اور کسی قوم (یعنی مکہ کے باشندوں) سے دشمنی اس سبب سے کہ انہوں نے تم کو کعبہ سے روک دیا تھا تم کو (انصاف کی) حد سے نکل جانے پر آمادہ نہ کردے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اور قتادہؒ نے لَا يَجْرِمَنَّكُمْ کا ترجمہ کیا ہے تم کو آمادہ نہ کردے اور فراءؒ نے ترجمہ کیا۔

قوم سے مراد ہیں مکہ والے۔ شَنَاٰنُ (مصدر) سخت بغض۔ اکثر مصادر فَعَلَانٌ کے وزن پر آتے ہیں جیسے ضَرَبَان، سَیَلان، کَسَلان اور اگر نون کے سکون کے ساتھ پڑھا جائے تو صفت کا صیغہ ہوگا۔ اَنْ صَدُّوْكُمْ سے پہلے لام محذوف ہے یہ بغض کی علت ہے یعنی حدیبیہ کے سال کعبہ تک پہنچنے سے چونکہ انہوں نے تم کو روک دیا تھا اور اس وجہ سے تم کو ان سے بغض ہو گیا تھا یہ بات تم کو زیادتی کرنے پر آمادہ نہ کردے۔ ابن جریر نے لکھا ہے کہ واقعہ حدیبیہ کے بعد اس آیت کا نزول ہوا تھا اس کے نزول سے پہلے کافروں کی طرف سے بازداشت اور ممانعت کا وقوع ہو چکا تھا۔

زیادتی کرنے اور حد سے تجاوز کرنے سے مراد ہے قتال اور مال لوٹنا۔ ابن ابی حاتم نے زید بن اسلم کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ جب مشرکوں نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو کعبہ تک پہنچنے سے روک دیا تو آپ ﷺ نے حدیبیہ میں قیام کیا اور مشرکوں کی یہ حرکت مسلمانوں کو بڑی شاق گزری۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں مشرق کی طرف سے کچھ مشرک عمرہ کرنے کے ارادہ سے آئے اور ان کا گزر مسلمانوں کی طرف سے ہوا اس پر صحابہؓ نے کہا مکہ والوں نے جس طرح ہم کو روک دیا، اس طرح ہم ان لوگوں کو روک دیں کہ یہ بھی عمرہ نہ کرسکیں۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى اور نیکی و پرہیزگاری پر باہم تعاون کرو۔ اَلْبِرّ سے مراد ہے اللہ کے احکام کی تعمیل اور تقویٰ سے مراد ہے ممنوعات سے اجتناب تاکہ اللہ کے عذاب سے بچاؤ ہو جائے۔

وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠ اور گناہ و ظلم پر تعاون نہ کرو۔ گناہ سے مراد ہے ممنوعات کا ارتکاب اور عدوان سے مراد ہے ظلم یعنی ممنوعات الٰہیہ کا ارتکاب نہ کرو اور انتقام لے کر تسکین قلب حاصل کرنے کے لئے ظلم بھی نہ کرو۔

حضرت نواسؓ بن سمعان انصاری راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے بِرّ اور اِثم کی تشریح دریافت کی گئی۔ فرمایا بِرّ حسن خلق ہے اور اِثم وہ کھٹک ہے جو تمہارے دل میں پیدا ہو اور لوگوں کا اس سے واقف ہونا تم کو پسند نہ ہو۔ رواہ مسلم فی الصحیح و البخاری فی الادب والترمذی، حضرت ابو ثعلبہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بِرّ وہ بات ہے جس پر تمہارے دل کو سکون واطمینان ہو جائے خواہ مفتی تم کو اس کے خلاف جواز کا فتویٰ دے دیں۔ رواہ احمد۔ میں کہتا ہوں یہ پاک باطن نفوس مطمئنہ والوں کو خطاب ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ اور اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ بڑا سخت عذاب دینے والا ہے اس کا عذاب بڑا سخت اور خوفناک ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ حرام کر دیا گیا ہے تم پر مردار، یہاں سے مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ کی تفصیل شروع کی گئی

ہے مَیۡتَۃ وہ مردار جس کی روح خود (بغیر کسی بیرونی سبب کے) بدن کے نکلی ہو۔ ابن مندہ نے کتاب الصحابہ میں کہاہے کہ حضرت حیان بن الجبر نے فرمایا ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے ایک ہانڈی میں مردار کا گوشت تھا، میں اس کے نیچے آگے جلا رہا تھا کہ تحریم مَیۡتَۃ کی آیت نازل ہوئی میں نے فوراً ہانڈی الٹ دی، میں نے اس جگہ یہ حدیث "لباب النقول فی اسباب النزول" کے اتباع میں نقل کی ہے۔ ورنہ صحیح بات یہ ہے کہ سورت مائدہ کی اس آیت کے نزول کے وقت حضرت حیان کے اس واقعہ کا ہونا ناممکن ہے کیونکہ آیات احکام کی سب سے آخری آیت یہی ہے اور سورت انعام میں حرمت میتہ والی آیت ہجرت سے پہلے نازل ہو چکی تھی اور یہ ممکن نہیں کہ حرمت میتہ کے حکم کے بعد (یعنی سورت انعام کی آیت کے نزول کے بعد) صحابی مردار کا گوشت پکاتے ہوں اس لئے صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حیانؓ والا قصہ سورت انعام کی آیت تحریمہ کے نزول کے وقت کا ہے، اس آیت سے اس قصہ کا کوئی تعلق نہیں۔

وَالدَّمُ اور خون۔ باجماع علماء اس سے مراد سیال خون ہے اہل جاہلیت سیال خون پیا کرتے تھے۔ (اس کی حرمت کا حکم اس آیت میں دیدیا گیا)۔

وَلَحۡمُ الۡخِنۡزِيۡرِ اور خنزیر کا گوشت۔ یوں تو پورا خنزیر اس کا ہر حصہ نص اور اجماع کی رو سے نجس ہے مگر عموماً کھانے میں گوشت ہی آتا ہے اس لئے صرف گوشت کا تذکرہ کیا۔

وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيۡرِ اللّٰهِ اور وہ جانور جس پر (یعنی جس کو ذبح کرنے کے وقت) اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو، اہلال آواز بلند کرنا اس سے مراد وہ آواز ہے جو کسی جانور کو ذبح کرنے کے وقت مشرکین چیخ کر باسم اللات والعزیٰ کہا کرتے تھے۔

ابوالطفیل کی روایت ہے کہ حضرت علیؓ سے دریافت کیا گیا کیا رسول اللہ ﷺ نے خصوصیت کے ساتھ کوئی چیز (بطور وصیت یا اندرونی حکم) دی تھی فرمایا عام لوگوں کو جو چیز نہ دی ہو اور ہم کو خصوصیت کے ساتھ دی ہو ایسی کوئی چیز نہیں ہاں جو میری تلوار کے پرتلہ میں ہے بس یہی چیز تھی پھر آپ نے (تلوار کے پرتلہ سے) ایک تحریر نکالی جس میں یہ عبارت لکھی ہوئی تھی اللہ کی لعنت اس پر جو اللہ کے سوا کسی دوسرے کے لئے ذبح کرے (یعنی ذبح کے وقت دوسرے کے نام کو شریک بنالے یا تنہا دوسرے کا نام لے) اور اللہ کی لعنت اس پر جو زمین کے نشانات میں چوری کرے۔ دوسری روایت میں چوری کے لفظ کی جگہ بگاڑنے کا لفظ آیا ہے یعنی جو زمین کے نشانات کو بگاڑے اور اللہ کی لعنت اس پر جو اپنے باپ پر لعنت کرے اور اللہ کی لعنت اس پر جو (دین میں اپنی طرف سے) نئی بات نکالنے والے کو ٹھکانا دے۔ رواہ مسلم۔

مسئلہ :- ذبح کے وقت اللہ کے نام کے ساتھ ملا کر بغیر عطف کے کسی دوسری چیز کا ذکر کرنا مکروہ ہے مگر حرام نہیں ہے جیسے ذبح کے وقت بسم اللہ کے بعد فوراً ساتھ ساتھ اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلۡ مِنۡ فُلَان کہنا یا بسم اللہ کے بعد متصلاً بغیر فصل کے محمد رسول اللہ کہنا مکروہ ہے لیکن اگر بالکل ملا کر عطف کے ساتھ کسی اور کا ذکر کیا مثلاً بسم اللہ واسم فلاں یا بسم اللہ و محمد رسول اللہ کہہ دیا تو ذبیحہ حرام ہو جائے گا ذبح کے وقت غیر اللہ کی شرکت ہو جائے گی۔ ہاں اگر جانور کو لٹانے اور بسم اللہ پڑھنے سے پہلے غیر اللہ کا ذکر کر دیا تو کوئی ہرج نہیں ہے اسی طرح ذبح کے بعد بھی کچھ (دعائیہ یا دوسرے طرح کے) الفاظ کہنا مکروہ نہیں ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ ذبح کے بعد رسول اللہ ﷺ نے دعا کی تھی اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلۡ ھذا عَنۡ اُمَّۃِ مُحَمَّدٍ مِمَّنۡ شَھِدَ لَکَ بِالۡوَحۡدَانِیَّۃِ وَلِیۡ بِالۡبَلَاغِ۔ سورۂ بقرہ میں مسئلہ کی یہ چاروں صورتیں اور ان سے متعلق مباحث کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔

وَالۡمُنۡخَنِقَةُ اور گلا گھٹ کر مرا ہوا جانور یعنی وہ جانور جو گلا گھونٹنے سے مرا ہو۔

وَالۡمَوۡقُوۡذَةُ اور چوٹ کھا کر مرا ہوا جانور۔ وقذ سخت چوٹ۔ اہل جاہلیت جانور کو لاٹھی اور پتھر کی ضرب سے بھی قتل کرتے (اور پھر کھالیتے) تھے۔

وَالۡمُتَرَدِّيَةُ اور اوپر سے نیچے گر کر مرنے والا جانور، اوپر سے لڑھک کر نیچے گر کر مرا ہو یا کنویں میں گر کر، ذبح

کرنے سے پہلے مر گیا ہو۔

وَالنَّطِيْحَةُ اور ٹکر سے مرا ہوا جانور جیسے جانور باہم ٹکراتے اور ایک دوسرے کو سینگوں سے مار ڈالتے ہیں۔

وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اور وہ جانور جس کو درندہ نے کچھ کھا کر باقی حصہ چھوڑ دیا ہو (اور جانور کے پھاڑنے سے ذبح کرنے سے پہلے وہ مر چکا ہو) اس فقرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر شکاری جانوروں نے شکار کا کچھ حصہ کھا لیا ہو (اور ذبح کرنے سے پہلے وہ شکار مر گیا) تو وہ حرام ہے اس کو کھانا جائز نہیں۔

اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ مگر وہ جانور (حلال ہے جس کو مرنے سے پہلے) تم ذبح کر پاؤ۔ تَذْكِيَة کا لغوی معنی ہے تمام کرنا ذَكَتِ النَّارُ آگ پوری روشن ہو گئی یہاں ذبح مراد ہے ذبح سے زندگی پوری ہو جاتی ہے۔ صحاح میں ہے ذَكَّيْتُ الشَّاةَ میں نے بکری کو ذبح کر دیا۔

تذکیہ کی حقیقت صرف یہ ہے کہ جانور کی طبعی حرارت کو بدن سے نکال دیا جائے لیکن شریعت میں (ہر طریقہ سے ازالۂ حرارت کو تذکیہ نہیں کہا جاتا بلکہ ایک خالص طریقہ سے ابطال حیات کا نام تذکیہ ہے)۔

یعنی بالارادہ اللہ کا نام لے کر حلق ولبہ کو کاٹ کر یا چھید کر ابطال حیات کرنے کا نام شرعاً تذکیہ ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نوفل بن ورقاء خزاعی کو اونٹ پر سوار کر کے منیٰ کی گھاٹیوں میں (تمام حاجیوں کی تعلیم کے لئے) یہ ندا کرنے کے لئے بھیجا کہ ذکات (ذبح اور نحر) حلق اور لبہ میں ہونا چاہئے۔ رواہ ابن الجوزی من طریق الدار قطنی۔

مسئلہ :- درندہ کا زخمی کیا ہوا یا کچھ کھایا ہوا جانور اس وقت حلال ہے جب مرنے سے پہلے اس کو ذبح کر لیا جائے۔ آیت میں یہی مفہوم مراد ہے اگر درندہ کے زخمی کرنے سے شکار کی حالت ذبیحہ جیسی ہو گئی (خواہ مرا نہ ہو) اور اس کو ذبح کر لیا جائے تب بھی وہ مردار کے حکم میں ہے اس کو کھانا حلال نہیں۔ متردیہ، نطیحہ اور موقوذہ کا بھی یہی حکم ہے اگر ان کی حالت چوٹ سے ذبیحہ جیسی ہو گئی ہو تو ان کو کھانا حرام ہے خواہ مرنے سے پہلے اس کو ذبح کر لیا گیا ہو۔

امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ میں استثناء صرف درندہ کے کھائے ہوئے جانور سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ چند معطوفات کے بعد اگر استثناء آئے تو اس کا تعلق آخری معطوف سے ہوتا ہے باقی چاروں یعنی مُنْخَنِقَةُ، موقوذہ، نطیحہ اور متردیہ کا استثنائی حکم قیاسی ہے (منصوص نہیں ہے) مَا اَكَلَ السَّبُعُ کے استثناء پر قیاس کرنے سے معلوم ہوا ہے سب کے ساتھ استثناء کا تعلق یوں بھی ممکن نہیں کیونکہ مُنْخَنِقَةُ تو کہتے ہی اس کو ہیں جو گلا گھوٹنے سے مر گیا ہو اسی طرح متردیہ، موقوذہ اور نطیحہ بھی انہی جانوروں کو کہا جاتا ہے جو گرنے چوٹ کھانے اور ٹکرانے سے مر گئے ہوں اس لئے ان قریب الموت جانوروں کو جو ذبح سے پہلے زندہ تھے یہ الفاظ شامل ہی نہیں ہیں اور شمول نہیں تو استثناء کا بھی ان سے تعلق نہیں ہو سکتا۔

مسئلہ :- ذبح کی رگیں چار ہیں۔ حلقوم یعنی سانس کی نالی۔ مری یعنی غذا کی نالی اور دوداوج یعنی خون کی نالیاں۔ امام مالکؒ کے نزدیک چاروں کا کٹنا ضروری ہے ایک قول امام احمد کا بھی اسی طرح آیا ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک صرف حلقوم اور مری کا کٹنا کافی ہے امام احمد کا بھی دوسرا قول یہی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا تین رگیں کٹنی ضروری ہیں کوئی تین ہوں۔ تعین نہیں۔ امام ابو یوسفؒ کا بھی اول قول یہی تھا۔ پھر آپ نے اس قول سے رجوع کر لیا اور حلقوم مری اور ایک ودج کٹنے کو ضروری قرار دیا۔ ایک روایت میں امام محمدؒ کا بھی یہی قول منقول ہے۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ امام محمدؒ نے فرمایا چاروں میں سے ہر ایک کا زیادہ حصہ کٹنا لازم ہے ایک روایت میں امام ابو حنیفہؒ کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی گئی ہے۔ بہر حال امام محمدؒ کے قول کا حاصل یہ ہے کہ چاروں کا کٹنا ضروری ہے مگر اکثر کو کل کا قائم مقام قرار دیا جاتا ہے لہٰذا تین کافی ہیں۔ اصل مقصد یعنی سیال خون کا بہا دینا اس سے حاصل ہو جاتا ہے۔

مسئلہ :- جس آلہ سے سیال خون کا بہاؤ اور رگوں کا کٹنا ممکن ہو ذبح کے لئے وہ کافی ہے شیشہ ہو یا دھار دار پتھر ہو یا کھپاچ ہو مگر دھار دار ہو۔ دانت ناخن اور سینگ بھی آلہ ذبح ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ جسم سے الگ کر لیا گیا ہو (جب تک دانت اور

ناخن ذبح کرنے والے کے جسم کا جز ہیں ان سے ذبح کرنا ناجائز ہے جب اکھڑ کر الگ ہو جائیں تو ان کو آلہ ذبح قرار دیا جا سکتا
ہے) مگر دھار ہونا ضروری ہے اور یہ مکروہ ہے امام اعظم کا یہی قول ہے۔ باقی تینوں اماموں کے نزدیک دانت ناخن اور سینگ سے
ذبح ناجائز ہے ایسا ذبیحہ مردار ہوگا۔ کذا فی الہدایہ۔ حضرت رافع بن خدیج کا بیان ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کل کو ہمارا
مقابلہ دشمن سے ہوگا اور جانور کو ذبح کرنے کے لئے ہمارے پاس چھریاں نہیں ہیں کیا ہم کھپاچ سے ذبح کر سکتے ہیں فرمایا جو آلہ
(اپنی دھار سے کاٹ کر) خون بہادے اور (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لے لیا گیا ہو۔ تم ایسا ذبیحہ کھا سکتے ہو مگر آلہ ذبح دانت اور
ناخن نہ ہونا چاہئے میں تم سے اس کی وجہ بیان کرتا ہوں دانت تو ہڈی ہے اور ناخن حبشیوں کی چھریاں ہیں (بخاری و مسلم)
حضرت کعب بن مالکؓ کا بیان ہے ہماری بکریاں سلع میں چرتی تھیں ایک روز ہماری باندی نے ایک بکری کو مرتے دیکھ کو فوراً ایک
پتھر توڑ کر اس کی دھار سے بکری کو ذبح کر دیا میں نے رسول اللہ ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا فرمایا کھالو۔ رواہ البخاری۔

حضرت عدی بن حاتم کا بیان ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر کسی کو شکار مل جائے اور چھری موجود نہ ہو تو
کیا دھار دار پتھر یا لاٹھی کی شگافتہ کھپاچ سے ذبح کر سکتا ہے فرمایا خون بہادو جس آلہ سے ہو سکے اور ذبح کے وقت اللہ کا نام لے
لو، رواہ ابو داؤد و النسائی۔

عطاء بن یساء نے قبیلہ بنی حارثہ کے ایک شخص کا بیان نقل کیا جو کوہ احد کی کسی گھاٹی میں اپنی اونٹیاں چرا رہا تھا۔ اتفاق
سے ایک اونٹنی مرنے لگی اور (چھری وغیرہ) کوئی چیز تھی نہیں کہ اونٹنی کو نحر کر سکے مجبوراً اس نے ایک میخ لے کر اس کی نوک
سے اونٹنی کے لبہ میں شگاف کر دیا اس طرح اونٹنی کا خون بہ گیا پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ عرض کر دیا
حضور ﷺ نے اس کو اس ذبیحہ کے کھانے کی اجازت دیدی۔ رواہ ابو داؤد و مالک دوسری روایت میں میخ کی جگہ شظاظ کا لفظ آیا ہے
(شظاظ اس دھار دار لکڑی کو کہتے ہیں جو اونٹ پر لدی ہوئی دو خورجینوں کے درمیان باندھ دی جاتی ہے تاکہ دونوں طرف
خورجین ایک ہی لکڑی سے بندھ کر آویزاں ہو جائیں)۔

امام ابو حنیفہؒ نے اپنے قول کے ثبوت میں رسول اللہ ﷺ کے فرمان مَا أَنْهَرَ فَكُلْ کے عموم کو پیش کیا ہے لفظ ما عام
ہے ناخن اور دانت کو بھی شامل ہے دوسرے فقرہ میں حضور ﷺ نے فرمایا أَهْرِقِ الدَّمَ بِمَا شِئْتَ اس میں بھی ما کا لفظ عام
ہے۔

تینوں آئمہ نے حضور ﷺ کے فرمان لَيْسَ السِّنُّ وَالظُّفُرُ سے دانت اور ناخن سے ذبح جائز نہ ہونے پر استدلال کیا
ہے مگر امام ابو حنیفہ نے فرمایا اس سے مراد وہ دانت اور ناخن ہیں جو جسم سے اکھڑے ہوئے نہ ہوں کیونکہ حبشی اپنے پنجوں سے
ذبح کرتے تھے (اور ممانعت کی علت میں حضور (ﷺ) نے یہی فرمایا تھا کہ یہ حبشیوں کی چھریاں ہیں) استثناء میں بظاہر دانت سے
مراد وہی دانت ہے جس میں تیزی اور دھار نہ ہو، دیکھو حضور (ﷺ) نے (اسی لئے) دانت کو ہڈی فرمایا۔

بہر حال اگر دانت اور ناخن جسم سے اکھڑا ہوا نہ ہو تو بالاجماع اس سے ذبح کرنا ناجائز ہے کیونکہ اس وقت ذبیحہ کا قتل آلہ
کے بوجھ کے سبب سے ہوگا اور ایسا ذبیحہ مُنْخَنِقَة کے حکم میں ہو جائے گا۔

مسئلہ :- ذبح سے پہلے چھری کو تیز کر لینا مستحب ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ نے ہر چیز میں حسن کار کو
لازم کر دیا ہے اس لئے اگر قتل کرو تو برے طریقہ سے قتل نہ کرو اور ذبح کرو تو ذبح کرنے میں بھی خوبی کو اختیار کرو، چھری کو تیز
کر لیا جائے اور ذبیحہ کو دکھ کم پہنچایا جائے، رواہ مسلم عن شداد بن اوس۔

مسئلہ :- اگر اڑتے پرندے کے تیر مارا اور تیر لگ گیا اور پرندہ زمین پر گر کر مر گیا تو حلال ہے کیونکہ زمین پر تو اس کو
گرنا ہی تھا لیکن اگر پانی میں گر لیا پہاڑ یا درخت پر گر کر وہاں سے لڑھک کر مر گیا تو اس کو کھانا ناجائز ہے، وہ متردیہ کے حکم میں
آ گیا، ہاں اگر تیر پرندہ کے اسی مقام پر لگا جس جگہ ذبح کیا جاتا ہے تو جہاں بھی گرے حلال ہے کیونکہ تیر سے اس کا ذبح ہو چکا۔

وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ اور جس جانور کو تھانوں پر ذبح کیا گیا ہو۔ نصب جمع، نصاب واحد، جیسے کتب اور کتاب،

بعض کے نزدیک نصب مفرد ہے اس کی جمع انصاب آتی ہے جیسے عنق کی جمع اعناق ہے، مجاہد و قتادہ نے کہا کہ کعبہ کے آس پاس ۳۶۰ پتھر نصب تھے جن کی پوجا ہوتی تھی، اہل جاہلیت ان کی تعظیم کرتے اور وہاں جانوروں کی بھینٹ کرتے تھے یہ بت نہ تھے بتوں کی تو مورتیاں صورتیں ہوتی ہیں، دوسرے لوگوں نے کہا یہ مورتیاں ہی تھیں۔

قطرب نے کہا علی النصب میں علی بمعنی لام ہے یعنی جو جانور استھانوں کے لئے ذبح کئے گئے ہوں وہ حرام کر دیئے گئے ہیں، ابن زید نے کہا مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ اور مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ سے مراد ایک ہی ہے، میں کہتا ہوں عطف تغایر کو چاہتا ہے صحیح مجاہد و قتادہ کا قول ہی ہے کہ کعبہ کے اردگرد کچھ پتھر نصب تھے اہل جاہلیت ان پر ذبح کرتے اور اس کو عبادت سمجھتے تھے۔

وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ اور جوئے کے تیروں سے تمہارا فال نکالنا بھی حرام کر دیا گیا ہے، استقسام اپنا نصیب پہچاننے کی طلب، اِزْلَام جمع زَلَمٌ اور زُلَمٌ واحد جوئے کے چھوٹے تیر جن میں نہ پر ہوتے تھے نہ پھل، اِزْلَام سات تھے جو کعبہ کے مجاور کے پاس رہتے تھے یہ شوحط لکڑی کے بنے ہوئے تھے ایک پر لکھا ہوتا تھا ہاں "ٹھیک ہے"۔ دوسرے پر لکھا ہوتا "نہیں"۔ ایک پر لکھا ہوتا تم سے۔ دوسرے پر ہوتا تمہارے علاوہ دوسروں سے۔ ایک پر ہوتا چسپاں۔ دوسرے پر عقل اور ایک خالی ہوتا اس پر کچھ لکھا نہیں ہوتا۔ جب لوگ کسی کام کا ارادہ کرتے مثلاً سفر کا یا نکاح کا یا دامادی کا یا نسب یا دیت میں اختلاف ہوتا تو ہبل کے پاس جاتے ہبل قریش کا سب سے بڑا بت تھا۔ ہبل کے پاس پہنچ کر مجاور کو سو درہم دیتے اور وہ ترکش کو گھما کر تیر نکالتا اگر ہاں نکل آتا تو اس کام کو کرتے اگر نہیں نکلتا تو سال بھر تک وہ کام نہیں کرتے اور اگر تحقیق نسب کے لئے فال نکالتے اور تم میں سے، نکل آتا تو اس کو اپنے قبیلہ کا ایک شریف النسب فرد قرار دیتے اور اگر تمہارے غیر میں سے۔ لکھا ہوتا تو اس کو اپنا معاہد دوست قرار دیتے۔ اور اگر چسپاں کا لفظ نکلتا، تو ایسے آدمی کو نہ نسبی شریک مانا جاتا نہ معاہد دوست۔ اور اگر دیت کے متعلق اختلاف ہوتا اور فال نکالتے اور العقل نکل آتا تو دیت کا بار برداشت کر لیتے اور اگر بے نشان تیر نکلتا تو دوبارہ فال نکالتے یہاں تک کہ کچھ نہ کچھ لکھا ہوا تیر نکل آتا اور اس کے موافق عمل کرتے اللہ نے اس کی ممانعت فرما دی۔

ذٰلِكُمْ فِسْقٌ یہ سب گناہ ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا ازلام کچھ سفید سنگریزے ہوتے تھے جو مارا کرتے تھے۔ مجاہد نے کہا اہل فارس اور روم کی جوئے کی گوٹیں ہوتی ہیں جن سے جوا کھیلتے تھے سفیان بن وکیع نے شطرنج کے لفظ سے تشریح کی ہے شعبی وغیرہ نے کہا عرب کے لئے اِزْلَام اور عجم کے لئے گوٹیں (دونوں کا ایک حکم ہے) میں کہتا ہوں اس طریقہ سے علم غیب حاصل کرنے کی جو چیزیں ہوں سب ازلام میں داخل ہیں جیسے اہل علم کے پانسے۔ فالنامے اور وہ تمام بازیاں جن میں جوا کھیلا جاتا ہے۔ سب کا اندراج استقسام کے ذیل میں ہے۔

حضرت ابو درداءؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے کاہن سے خبر طلب کی یا نصیب معلوم کرنا چاہا یا سفر سے رک جانے کا شگون لیا وہ قیامت کے دن جنت کے اونچے درجات کی طرف بھی نہیں دیکھے گا۔ رواہ البغوی عن قبیصۃ۔

یہ بھی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پرندوں کے ناموں سے آوازوں سے اور گزرنے سے فال حاصل کرنا اور شگون لینا اور کنکریاں مارنا (یعنی ہار جیت یا کرنے نہ کرنے کا حکم معلوم کرنا) کفر سے ہے۔ رواہ ابوداؤد بسند صحیح۔

اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ اب کافر تمہارے دین (پر غالب آنے) سے ناامید ہو گئے

الیوم سے مراد آج کا دن نہیں بلکہ وقت حاضر اور اس کے بعد آنے والے متصل زمانے سب اس میں شامل ہیں۔ بعض نے کہا نزول آیت کا دن مراد ہے۔ دین کی طرف سے کافروں کی ناامیدی کا یہ معنی ہے کہ دین اور اہل دین کے مغلوب ہونے اور دین کو چھوڑ کر مسلمانوں کے مرتد ہونے سے کافر مایوس ہو گئے۔

فَلَا تَخْشَوْهُمْ پس تم کافروں سے نہ ڈرو۔ یعنی یہ اندیشہ نہ کرو کہ کافر تم پر غالب آجائیں گے یا تمہارے دین کو برباد کر سکیں گے۔

وَاخْشَوْنِ اور مجھ سے ڈرو یعنی صرف مجھ ہی سے ڈرو۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ اب میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کردیا۔

یعنی اصول عقائد کی صراحت کردی فرائض واجبات، سنن، مستحبات، حلال، حرام، مکروہات، مفسدات مشروعات جیسے مفسد صوم وصلوٰۃ وبیع وغیرہ اور غیر منصوص میں اجتہاد کے قوانین ہر چیز سے واقف کردیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تکمیل دین سے مراد ہو رسول اللہ ﷺ کو قرب کے اس مرتبہ پر پہنچادینا جو تمام اگلے پچھلے باکمال انسانوں کے لئے قابل رشک ہے یہاں تک کہ آپ کے مرتبہ محبوبیت پر فائز ہونے کی وجہ سے ہی اللہ نے آپ کی امت کے تمام گناہ معاف فرمادیئے خواہ اللہ کے حقوق سے تعلق رکھتے یا بندوں کے حقوق سے حد یہ کہ آپس کی خوں ریزیاں اور مظالم بھی معاف کردیئے گئے۔

حضرت عباسؓ بن مرداس کی روایت ہے کہ عرفہ کی شام کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے گناہ بخشنے کے لئے دعا کی جو قبول کرلی گئی اور فرمایا گیا کہ میں نے سوائے باہمی مظالم کے ان کے گناہ معاف کردیئے مظلوم کا بدلہ ظالم سے ضرور لوں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے عرض کیا میرے رب اگر تو چاہے تو مظلوم کی مظلومیت کے بدلہ میں جنت کا کوئی حصہ اس کو دیدے اور ظالم کو معاف کردے۔ شام کو یہ التجا قبول نہیں ہوئی۔ صبح کو مزدلفہ میں رسول اللہ ﷺ نے پھر گزشتہ دعا کا اعادہ کیا اس وقت درخواست قبول کرلی گئی اور حضور ہنس دیئے یا مسکرادیئے حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے عرض کیا۔ اللہ آپ کو ہنستا رکھے۔ آپ ایسے وقت تو ہنستے نہ تھے۔ آج ہنسنے کا کیا باعث ہے، فرمایا اللہ کے دشمن ابلیس کو جب معلوم ہوا کہ اللہ نے میری دعا قبول فرمالی اور میری امت کو بخش دیا تو سر پر خاک ڈالنے اور واویلا مچانے لگا مجھے اس کا یہ اضطراب دیکھ کر ہنسی آگئی۔ رواہ ابن ماجۃ والبیہقی فی کتاب البعث۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس آیت کے بعد حلال، حرام، فرائض، سنن، حدود اور احکام میں سے کوئی حکم نازل نہیں ہوا۔

اگر شبہ کیا جائے کہ حضرت ابن عباسؓ ہی کی روایت میں آیا ہے کہ اس کے بعد آیت ربوا کا نزول ہوا۔ ہم جواب میں کہیں گے کہ اگر اس روایت کی صحت ثابت ہوجائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حرمت سود کا حکم اگرچہ اس آیت کے نزول سے پہلے آچکا تھا مگر سورۂ بقرہ کی آخری آیات اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ ...... اِلٰى قَوْلِهٖ ...... يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اس آیت کے نزول کے بعد نازل ہوئیں حضرت جابرؓ کی روایت سے حجۃ الوداع کے قصہ میں رسول ﷺ کا یہ فرمان آیا ہے کہ جاہلیت کا سود ساقط کیا جاتا ہے اور اپنے سودوں میں سے سب سے پہلے میں عباس بن عبد المطلب کا سود ساقط کرتا ہوں وہ سارا سود چھوڑ دیا گیا۔

سعید بن جبیرؒ نے آیت مذکورہ کی تشریح اس طرح کی کہ میں نے اب تمہارا دین کامل کردیا اب کسی مشرک نے تمہارے ساتھ حج نہیں کیا۔ یہ مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ تمام مذاہب پر تمہارے دین کو میں نے غالب کردیا اور دشمنوں سے تم کو بے خوف کردیا۔

فائدہ:- حجۃ الوداع میں بمقام عرفہ جمعہ کے دن عصر کے بعد یہ آیت نازل ہوئی رسول اللہ ﷺ اس وقت عرفہ میں اپنی اونٹنی عضباء پر کھڑے تھے کہ وحی کے بار سے اونٹنی کے بازو ٹوٹنے لگے اور یہ آیت نازل ہوئی۔ شیخین نے صحیحین میں بیان کیا ہے کہ ایک یہودی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا۔ امیر المومنین! ایک آیت آپ لوگوں کی کتاب میں ہے جو آپ پڑھتے ہیں اگر ہم یہودیوں پر وہ اترتی تو ہم اس کے یوم نزول کو روز عید بنالیتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا وہ کون سی آیت ہے یہودی نے کہا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ حضرت عمرؓ نے فرمایا ہم کو وہ دن اور وہ مقام معلوم ہے جس میں یہ آیت رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی تھی۔ عرفہ میں جمعہ کے دن رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے تھے کہ یہ آیت اتری۔ حضرت عمرؓ نے اپنے اس کلام سے اس طرف اشارہ کیا کہ آیت کے نزول کے دن ہماری دوہری عید ہوگئی جمعہ کا دن، اور قیام عرفہ کا دن۔

بغوی نے بیان کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمرؓ اس کو سن کر رو دیئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عمرؓ تم

کیوں روتے ہو حضرت عمرؓ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ مجھے یہ بات رلا رہی ہے کہ اب تک تو ہمارا دین ترقی پذیر تھا اور اب کامل ہو گیا تو کمال کے بعد آئندہ نقصان (کے احتمال) کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا۔ حضور ﷺ نے فرمایا تم نے سچ کہا یہ آیت رسول اللہ ﷺ کی وفات کی اطلاع تھی چنانچہ اس کے نزول کے بعد حضور ﷺ صرف ۸۱ روز زندہ رہے اور ۳ ربیع الاول ۱۱ھ کو پیر کے دن روز اول کے بعد آپ کی وفات ہو گئی اور ہجرت کی تاریخ ۱۲ ربیع الاول تھی۔

وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ اور میں نے اپنا انعام تم پر پورا کر دیا۔ یعنی تم سے جو بطور وعدہ کے کہا تھا وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ اس وعدہ کو پورا کر دیا۔ تکمیل انعام کی صورتیں یہ ہوئیں کہ پوری ہدایت کر دی دین کو کامل کر دیا توفیق بھی عطا کر دی فتح مکہ بھی عنایت کر دی۔ جاہلیت کے نشان گرا دیئے یہاں تک کہ تنہا مسلمانوں نے اطمینان کے ساتھ حج بھی کر لیا، اور اس حج میں کوئی شرک نہ ہو سکا۔

وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۚ اور (تمام مذاہب میں) اسلام کو تمہارا دین ہونے کے لئے انتخاب کر لیا، اللہ کے نزدیک صرف یہی دین صحیح ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ نے بیان کیا میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے کہ جبرئیلؑ نے (مجھ سے) اللہ کا قول نقل کیا یہ دین ہے جس کو میں نے اپنے لئے (یعنی اپنی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے) انتخاب کیا ہے اس دین کی درستی صرف سخاوت اور حسن اخلاق سے ہو گی لہٰذا جب تک تم اس دین کے رفیق ہو سخاوت اور حسن اخلاق سے اس کو عزت دو۔ واللہ اعلم۔

فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ پس جو شخص شدت کی بھوک میں بے تاب ہو جائے بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو۔ اس آیت کا تعلق مذکورہ ممنوعات سے ہے بیچ میں ایسے امور کا تذکرہ آ گیا تھا جو ممنوعات سے اجتناب کے مقتضی ہیں یعنی دین کی تعظیم۔ اور دین کی تکمیل کا مسلمانوں پر احسان اور امور ممنوعہ کے ارتکاب کا فسق ہونا۔

مَخْمَصَةٍ غذا سے پیٹ کا خالی ہونا۔ رَجُلٌ خَمِيْصُ الْبَطْنِ بھوکے کو کہتے ہیں۔ متجانف بمعنی مائل۔ لِاِثْمٍ میں لام بمعنی الی ہے یعنی جو شخص انتہائی بھوک کی حالت میں مذکورہ ممنوعات میں سے کسی کو کھانے کے لئے بیتاب ہو جائے بشرطیکہ لذت اندوزی کے لئے نہ کھائے اور نہ حد جواز سے آگے بڑھے۔ اگر وہ ایسی حالت میں کھا لے گا۔

فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ③ تو اللہ غفور رحیم ہے اپنی رحمت سے معاف کر دے گا۔ سورۂ بقرہ میں یہ مسئلہ اور اس کے متعلقات کا بیان کیا جا چکا ہے۔

بغوی نے ابو واقد لیثی کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ ہم (کبھی) ایسی سرزمین میں ہوتے ہیں جہاں ہم کو بھوک لگتی ہے اور کھانے کو کچھ ملتا نہیں) ہمارے لئے مردار کب حلال ہو جائے گا فرمایا جب صبح کو تم کچھ نہ پی سکو نہ پچھلے دن میں کچھ پی سکو نہ زمین سے کچھ سبزی اکھاڑ کر کھا سکو اس وقت تم جانور اور مردار کو کھا سکتے ہو۔ واللہ اعلم۔

طبرانی حاکم اور بیہقی وغیرہ نے حضرت ابو رافع کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک بار حضرت جبرئیلؑ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور داخل ہونے کی اجازت طلب کی آپ نے اجازت دیدی لیکن جبرئیلؑ نے داخل ہونے میں تاخیر کی تو حضور خود اپنی چادر لے کر (یعنی اوڑھ کر) باہر تشریف لے آئے دیکھا دروازہ پر حضرت جبرئیل موجود ہیں فرمایا ہم نے تو آپ کو داخل ہونے کی اجازت دیدی تھی۔ حضرت جبرئیلؑ نے کہا بے شک لیکن ہم اس گھر میں نہیں جاتے جہاں کوئی تصویر یا کتا ہو لوگوں نے دیکھا تو ایک کوٹھری میں کتے کا بچہ موجود تھا۔ اس کے بعد حضورؐ نے ابو رافع کو حکم دے دیا کہ مدینہ میں کسی کتے کو زندہ نہ چھوڑیں سب کو قتل کر دیں اس پر کچھ لوگ حاضر ہوئے اور عرض کیا یارسول اللہ اس امت (نوع حیوانی) میں سے ہمارے لئے کیا حلال ہے۔ جس کے قتل کا آپ نے حکم دیا ہے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَاۤ اُحِلَّ لَهُمْ لوگ آپ ﷺ سے دریافت کرتے ہیں کہ ہمارے لئے کیا حلال کیا گیا ہے۔ ابن جریر نے عکرمہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب ابورافعؓ کو کتوں کو قتل کر دینے کا حکم دے کر بھیجا اور وہ (قتل کرتے کرتے) بالائی مدینہ تک پہنچ گئے تو عاصمؓ بن عدی اور سعدؓ بن حثمہ اور عویمر بنؓ ساعدہ خدمت گرامی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہمارے لئے کیا حلال کیا گیا ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

محمد بن کعب قرظی کی روایت سے ابن جریر نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کتوں کو قتل کر دینے کا جب حکم دیا تو لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ اس گروہ (یعنی کتوں) میں کیسے (کتے پالنے) ہمارے لئے حلال کئے گئے ہیں۔ ابن جریر نے بحوالہ شعبی حضرتؓ عدی بن حاتم کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک شخص خدمت گرامی میں حاضر ہو کر کتوں سے شکار کرنے کا مسئلہ دریافت کرنے لگا۔ حضور ﷺ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دیں اس پر آیت مندرجہ نازل ہوئی۔

ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت عدی بن حاتم طائی اور حضرت زید بن مہلیل طائی نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ہم لوگ کتوں اور بازوں سے شکار کرتے ہیں اور خاندان ذریح کے کتے تو نیل گائے گورخر اور ہرنوں کا شکار کر لیتے ہیں اور اللہ نے مردار کو حرام کر دیا ہے اب ہمارے لئے کس قسم کا شکار حلال ہے اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ کتوں سے ہم کیا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں اور ان کا کیا ہوا شکار کون سا کھا سکتے ہیں۔

قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّیِّبٰتُ ۙ آپ کہہ دیجئے کہ تمہارے لئے تمام پاکیزہ (حلال) چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ یہ جملہ جواب سے زائد ہے ایک خاص مصلحت کے تحت جس کا ذکر ہم عنقریب کریں گے اس کا اضافہ کیا گیا ہے اصل جواب آئندہ آیت ہے۔

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ اور ان شکاری جانوروں کا کیا ہوا شکار حلال کر دیا گیا ہے جن کو تم نے (شکار کرنا) سکھا دیا ہو۔ اَلْجَوَارِح سے مراد ہیں شکاری جانور خواہ چوپائے ہوں یا پرندے جیسے کتا، چیتا، باز، شکرہ، شاہین وغیرہ۔

جرح کا معنی ہے کمانا فلانٌ جَارِحَۃُ أھلہ فلاں شخص اپنے گھر والوں کے لئے کمائی کرنے والا ہے۔ ہاتھ پاؤں چونکہ کمائی کرتے ہیں اسی لئے ان کو جوارح کہا جاتا ہے شکاری جانور بھی اپنے مالکوں کے لئے شکار کرتے ہیں اور ان کے لئے ان کی غذا کماتے ہیں اس لئے ان کو جوارح کہتے ہیں۔

یا جرح کا معنی ہے زخمی کرنا شکاری جانور شکار کو زخمی کرتے ہیں اس لئے ان کو جوارح کہا جاتا ہے۔ اسی موخر الذکر توجیہ کی بنا پر امام ابوحنیفہ اور امام احمد اور اکثر علماء کا قول ہے کہ شکار کا زخمی ہونا ضروری ہے اگر کتے نے شکار کو بغیر زخمی کئے قتل کر دیا مثلاً ٹکر مار کر یا گلا گھونٹ کر مار ڈالا تو اس کو کھانا درست نہیں۔ امام شافعیؒ کے ایک قول میں شکار کا زخمی ہونا ضروری نہیں ہے اس لئے وہ شکار جو بغیر زخمی ہوئے مر گیا ہو حلال ہے صاحب ہدایہ نے لکھا ہے دونوں توجیہوں میں کوئی منافات نہیں خواہ جرح کا معنی کسب لیا جائے یا زخمی کرنا بہر حال زخمی کرنا بنظر احتیاط ضروری ہے۔ کفایہ میں ہے کہ فخر الاسلام بزدوی نے بیان کیا اگر نہی کے اندر معانی کا اختلاف ہو اور اجتماعی صورت مراد لینی ممکن نہ ہو تو کسی ایک معنی کو مراد لینے کے لئے ترجیح دینے والی علت کی ضرورت ہے اور اگر معانی میں تضاد نہ ہو تو سب مراد لئے جائیں گے۔

اگر شبہ کیا جائے

کہ یہ تو عموم مشترک کی صورت ہو گئی (کہ بغیر تعین کے سب معنی مراد ہو سکتے ہیں) حالانکہ امام اعظم عموم مشترک کے قائل نہیں۔

جواب میں کہا جائے گا

کہ عموم مشترک کا معنی تو یہ ہے کہ لفظ مشترک سے متکلم کی مراد دونوں معنی ہوں اور سننے والا بھی یہی سمجھے کہ دونوں معنی کو یہ حکم شامل ہے۔ عموم کا مفہوم یہی ہوتا ہے لیکن یہاں ایسا نہیں ہے کیونکہ ہمارا مطلب اس جگہ یہ ہے کہ جوارح سے اللہ کی مراد تو یقیناً تعین کے ساتھ ایک ہی ہے مگر ہمارے پاس کوئی یقینی دلیل نہیں کہ ہم اللہ کی مراد کی تعیین کر سکیں اور دونوں معنی میں منافات ہے نہیں اس لئے ہم بنظر احتیاط کہتے ہیں کہ نہی کا ورود دونوں معنی پر ہے، اور دونوں ہی مراد ہیں۔ حنفیہ کے مسلک (یعنی شکار کا زخمی ہونا ضروری ہے اس قول) کی دلیل یہ ہے۔ کہ شکار کے حلال ہونے کے لئے (اصل میں) ذبح یا نحر کرنا ضروری ہے لیکن جہاں اضطرار اور مجبوری ہو (کہ ذبح یا نحر نہ کر سکے) وہاں ذبح کا قائم مقام کسی جارحہ سے جرح کرنے (زخم پہنچانے) کو قرار دے دیا جائے گا خواہ بدن کے کسی حصہ میں ہو۔

اگر شکاری جانور نے شکار کے کسی عضو کو توڑ دیا جس سے وہ مر گیا تو امام اعظم کا قول ایک روایت میں آیا ہے کہ اس کو کھانا حلال ہے کیونکہ اندرونی جراحت بیرونی زخم کی طرح ہے لیکن صحیح روایت میں یہ قول آیا ہے اور یہی صحیح بھی ہے کہ شکار مردار ہو جائے گا کیونکہ شکار کا اس طرح زخمی ہونا ضروری ہے جس سے خون بہہ جائے اور چونکہ اندرونی طور پر کسی عضو کا شکستہ ہونا خون کے بہنے کا سبب نہیں اس لئے شکست عضو سے مار ڈالنا ایسا ہوا جیسے گلا گھونٹ کر مار ڈالنا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے جو چیز خون بہادے اور اللہ کا نام اس پر لے لیا گیا ہو تو کھالے۔

اس طرح بالاجماع تیر سے شکار کرنے میں بھی زخمی کرنا شرط ہے حضرت عدی بن حاتم کا قول ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم چپٹے تیر سے شکار کرتے ہیں فرمایا تیر گھس جائے اور کاٹ پیدا کر دے تو کھالو اور تیر کا چپٹا حصہ اگر شکار (کے لگے اور اس سے شکار مر جائے تو مت کھاؤ یہ کوٹے ہوئے کی طرح ہوگا)۔ رواہ البخاری و مسلم

مسئلہ:- ہر شکاری جانور سے شکار کرنا جائز ہے امام ابو یوسفؒ نے شیر اور بھیڑیئے کو اسے مستثنیٰ کیا ہے کیونکہ یہ دونوں شکاری کیلئے شکار نہیں کرتے ہیں بعض نے ان دونوں کے ساتھ چیل کو ملا دیا ہے، خنزیر بالاجماع مستثنیٰ ہے کیونکہ یہ نجس العین ہے کسی طور پر اس سے انتفاع درست نہیں۔ میں کہتا ہوں کوئی وجہ نہیں کہ شیر اور بھیڑیئے اور چیل کو جوارح سے مستثنیٰ قرار دیا جائے) شکاری کے لئے شکار نہ کرنے کو استثناء کی علت نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ اگر ایسا ہے تو یہ دونوں درندے مَا عَلَّمْتُمْ کے لفظ سے خارج ہو جائیں گے (جوارح میں داخل رہیں گے) امام احمد نے فرمایا خالص سیاہ کتے کا شکار حلال نہیں، حضرت عبداللہ بن مغفل کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کتے بھی من جملہ دیگر (حیوانی) امتوں کے ایک امت نہ ہوتے تو میں ان کو (عام طور پر) قتل کر دینے کا حکم دے دیتا۔ اب تم خالص سیاہ کتے کو قتل کر دیا کرو۔ رواہ ابوداؤد والترمذی والدارمی۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کتوں کو مار ڈالنے کا ہم کو حکم دیا پھر کچھ مدت کے بعد ممانعت فرما دی اور فرمایا دو نقطوں والے خالص سیاہ کتے کو قتل کر دیا کرو وہ یقیناً شیطان ہے۔ جمہور کے نزدیک عموم آیت کی وجہ سے ہر کتے کا شکار حلال ہے۔

مُكَلِّبِيْنَ ٹریننگ دیئے ہوئے تعلیم کے اندر ٹریننگ داخل ہے مکرر ذکر تعلیم میں قوت پیدا کرنے اور ترغیب دینے کے لئے کیا گیا۔ مُکَلِّب کتوں کو ٹریننگ دینے والا یہ لفظ کلب سے بنا ہے چونکہ کتوں کو ادب آموزی کثیر الوقوع بھی ہے اور زیادہ اثر انگیز بھی اس لئے کلب سے تکلیب بنا کر عام شکار کی ٹریننگ کے لئے استعمال کر لیا گیا۔ یا یوں کہا جائے کہ کلب ہر درندہ کو کہتے ہیں (لہٰذا ہر درندہ کو شکار آموزی کے لئے اس لفظ کا استعمال کیا گیا) قاموس میں ہے کلب ہر کٹکھنا درندہ۔ عتبہ بن ابی لہب رسول اللہ ﷺ کو گالیاں دیتا تھا حضور ﷺ نے اس کے لئے بددعا کی اور فرمایا اے اللہ اپنے کتوں میں سے کسی کتے کو (یعنی کسی درندہ کو) اس پر مسلط کر دے چنانچہ شام کو جانے کے ارادہ سے جب وہ قافلہ کے ساتھ مکہ سے نکلا اور قافلہ کسی منزل پر اترا تو

عتبہ نے کہا مجھے محمد (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) کی بددعا سے ڈر لگا ہوا ہے لوگوں نے اپنا سارا سامان اس کے گرد اگرد جمع کر دیا اور (سامان پر بیٹھ کر ہر طرف سے) عتبہ کی نگرانی کرنے لگے لیکن ایک شیر آیا اور عتبہ کو اچک کر نکال لے گیا۔ حاکم نے یہ روایت مستدرک میں ابوعقرب کے حوالے سے نقل کی ہے اور اس کو صحیح الاسناد کہا ہے۔

تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ز اس طریقہ سے ان کو تعلیم دے کر جو اللہ نے تم کو سکھایا ہے یعنی ٹریننگ کا جو طریقہ تم کو اللہ نے سکھادیا ہے تم اس طریقہ سے شکاری جانوروں کو تعلیم دو، یا مالک کے چھوڑنے سے شکار کے پیچھے جانا مالک کے روکنے سے رک جانا، بلانے سے واپس آجانا، شکار کو پکڑ کر روکے رکھنا، خود اس میں سے کچھ نہ کھانا یہ تمام امور تم ان کو سکھادو۔ شکاری جانور کے ٹرینڈ ہو جانے کا علم تین مرتبہ حکم کی تعمیل سے ہو جاتا ہے اگر مالک کی تعلیم کے مطابق شکاری جانور تین بار ایسا کرلے تو ایسے جانور کو ٹرینڈ سمجھا جائے گا۔

تمام علوم عطا کرنے والا اللہ ہی ہے علوم تصوری و تصدیقی، بدیہی و نظری سب وہی القاء کرتا ہے۔ غور و فکر علم کا حقیقی سبب نہیں عادی سبب ہے غور و فکر اور مقدمات صغریٰ و کبریٰ کے بعد بھی نتیجہ بغیر القاء خداوندی کے نہیں نکلتا، بلکہ ترتیب مقدمات کے بعد نتیجہ کا فیضان اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس لئے تعلیم کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے۔

(یعنی کتوں کو تعلیم دینے کا طریقہ اللہ نے قرآن میں یا رسول اللہ ﷺ نے حدیث میں نہیں سکھایا علوم شرعیہ میں اس کا شمار نہیں مگر کوئی علم ہو بغیر عطاء الٰہی کے حاصل نہیں ہو سکتا، بدیہی علم ہو یا نظری، تجربہ و مشاہدہ سے حاصل ہو یا حدس و تمثیل سے یا استقراء اور برہان سے کوئی علم کسی طریقہ سے حاصل ہو اس کا حصول بغیر الہام و القاء و فیضان کے ناممکن ہے ذرائع علم تو تمام اسباب عادیہ ہیں حقیقی موجب علم عطائے خداوندی ہے)۔

فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ پس جس شکار کو وہ پکڑ کر تمہارے لئے روک لیں اس میں سے تم کھا سکتے ہو یعنی اس شکار میں سے تم کھا سکتے ہو جس میں شکاری جانور نے نہ کھایا ہو آیت کی یہ تفسیر حضرت عدی بن حاتم کی روایت کردہ حدیث سے ماخوذ ہے حضرت عدی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا اگر بسم اللہ کر کے تم کتے کو چھوڑو اور کتا جا کر شکار کو پکڑ لے اور تم شکار کو زندہ پالو تو ذبح کرلو اور اگر کتا اس کو قتل کر چکا ہو مگر خود اس میں سے کچھ نہ کھایا ہو تو تم اس کو کھا سکتے ہو، اور اگر کتے نے کچھ کھالیا ہو تو تم اس کو نہ کھاؤ وہ کتے نے اپنے لئے پکڑا ہے۔ الحدیث، متفق علیہ۔

دوسری روایت اس طرح ہے جس کتے اور باز کو ٹرینڈ کر کے اللہ کا نام لے کر تم نے (شکار پر) چھوڑا ہو تو جو شکار وہ تمہارے لئے پکڑ لے اس کو تم کھا سکتے ہو (عدی نے کہا) میں نے عرض کیا خواہ وہ قتل کر چکا ہو فرمایا خواہ اس نے قتل کر دیا ہو بشرطیکہ اس نے کھایا نہ ہو اگر اس میں سے کچھ کھالیا ہو تو مت کھاؤ وہ شکار اس نے اپنے لئے پکڑا ہے۔ یہ حدیث ابوداؤد اور بیہقی نے مجالد کی روایت سے بیان کی ہے اور مجالد نے شعبی کی روایت نقل کی ہے بیہقی نے لکھا ہے کہ صرف مجالد کے بیان میں باز کا ذکر ہے دوسرے حفاظ حدیث کی روایت اس کے خلاف ہے (یعنی باقی روایات میں صرف کتے کا ذکر ہے باز کا ذکر نہیں) یہی تفسیر جو حضرت عدی کی حدیث سے ماخوذ ہے۔ امام اعظمؒ کے قول کی دلیل ہے کہ اگر شکاری جانور نے شکار میں سے کچھ کھالیا ہو تو اس شکار کو کھانا حلال نہیں۔ امام احمدؒ کا قول بھی یہی ہے اور امام شافعیؒ کے دو قولوں میں سے صحیح ترین قول یہی ہے۔ بغویؒ نے لکھا ہے کہ عطاء، طاؤس، شعبی، ثوری اور ابن مبارک کا مختار بھی یہی ہے اور حضرت ابن عباس سے بھی یہی منقول ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ کتے کے ٹرینڈ ہو جانے کی علامت یہ ہے کہ اس کو تین شکار پر چھوڑا جائے جب تین بار شکار کرنے کے بعد وہ خود نہ کھائے تو اس کو ٹرینڈ کتا کہا جائے گا اس کتے سے چوتھی مرتبہ شکار کر کے کھانا جائز ہے بعض روایات میں امام صاحبؒ کا قول آیا ہے کہ تیسری مرتبہ کا شکار کیا ہوا بھی حلال ہے۔ امام مالکؒ کا قول ہے کہ اگر کتا شکار کا گوشت کھا بھی لے تب بھی وہ شکار حلال ہے ایک روایت میں امام شافعیؒ کی طرف اس قول کی نسبت کی گئی ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ، حضرت سلمانؓ فارسی اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے اقوال بھی یہی روایات

میں آئے ہیں کیونکہ حضرت عمرو بن شعیب کے دادا کی روایت ہے کہ ایک شخص جس کا نام ابو ثعلبہؓ تھا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے پاس ٹرینڈ کتے ہیں، میں ان سے شکار کرتا ہوں فرمایا اگر تیرے کتے ٹرینڈ ہیں تو جو شکار وہ تیرے لئے پکڑ رکھیں اس کو تو کھا سکتا ہے، ابو ثعلبہؓ نے عرض کیا شکار ذبح کیا گیا ہو یا نہ ذبح کیا گیا ہو، فرمایا ذبح ہو یا نہ ہو۔ ابو ثعلبہؓ نے عرض کیا خواہ کتے نے اس میں سے کچھ کھا لیا ہو، فرمایا خواہ اس نے اس میں سے کچھ کھا لیا ہو۔ رواہ ابو داؤد۔

میں کہتا ہوں بیہقی نے اس حدیث کو معطل قرار دیا ہے اور حضرت عدیؓ بن حاتم والی حدیث کی صحت پر اتفاق ہے۔

حضرت عدیؓ کی حدیث اور مجالد کی روایت کے بموجب اگر آیت کی تفسیر کی جائے تو خود نہ کھانے کی جو شرط درندہ شکاری جانوروں کے متعلق ہے وہی شکاری پرندوں کے سلسلہ میں ہوگی، اور بعض فقہاء کا یہی مسلک ہے، لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک شکاری پرندوں کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ انہوں نے شکار میں سے کچھ نہ کھایا ہو وجہ ظاہر ہے کہ شکاری پرندے ضرب برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے (کہ ان کو مار کر شکار ان کے پنجوں سے چھڑا لیا جائے) اور درندے چوپائے ضرب کی برداشت رکھتے ہیں۔ عبد بن حمید نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ جب کتا کھا لے تو تم نہ کھاؤ اور شکرا کھا لے تو تم (بقیہ) کھا سکتے ہو کیونکہ کتا ضرب کو برداشت کر سکتا ہے اور شکرا برداشت نہیں کر سکتا۔

اس تنقیح سے یہ شبہ نہ کرنا چاہئے کہ یہ تو قرآن اور حدیث کے مقابلہ میں قیاسی استدلال ہے جو ناقابل قبول ہے کیونکہ قرآن میں تو کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے شکاری جانور کے کچھ نہ کھانے کی شرط پر واضح دلالت ہو رہی ہو، لفظ امساک (جو اَمۡسَکۡنَ عَلَیۡکُمۡ میں موجود ہے) ارسال کی ضد ہے (یعنی پکڑ لینا نہ چھوڑنا) اَکَلَ کی ضد نہیں ہے (یعنی امساک کا معنی نہ کھانا نہیں ہے) اور کتے کے شکار میں نہ کھانے کی شرط (ظاہر نص قرآنی کی وجہ سے نہیں بلکہ) صحیحین کی حدیث کی وجہ سے لگائی گئی ہے۔ رہا مجالد کی انفرادی روایت (جس میں باز کا لفظ بھی آیا ہے) وہ ناقابل قبول ہے حفاظ حدیث کی روایت کے بھی خلاف ہے اور قیاس کی بھی مخالف ہے۔

وَاذۡکُرُوا اسۡمَ اللّٰہِ عَلَیۡہِ ۪ اور اس شکاری جانور پر اللہ کا نام لے لیا کرو یعنی شکاری جانور کو چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھ لیا کرو۔ لہٰذا کتے اور باز وغیرہ کو شکار پر چھوڑنے کے وقت بسم اللہ پڑھنی ضروری ہے اسی طرح تیر چھوڑنے کے وقت بسم اللہ پڑھنی لازم ہے ویسے ہی جیسے ذبح کے وقت پڑھنی ضروری ہے فرق یہ ہے کہ ذبح میں جانور کو ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھی جاتی ہے اور تیر یا شکاری جانور کو چھوڑتے وقت کیونکہ شکار پر گرفت تیر پھینکنے یا شکاری جانور کو چھوڑنے کے وقت نہیں ہوتی لہٰذا ایسے فعل کے وقت اللہ کا نام لینا چاہئے جس پر قدرت ہو یہی وجہ ہے کہ اگر کسی بکری کو پچھاڑا اور بسم اللہ پڑھی اور اس بسم اللہ سے ذبح دوسری کر دی تو ناجائز ہے اور اگر کسی شکار پر تیر پھینکتے وقت بسم اللہ پڑھی اور تیر دوسرے پرندہ کے لگ گیا جس سے وہ مر گیا تو حلال ہے اور اگر ایک بکری کو پچھاڑا اور بسم اللہ پڑھی پھر وہ چھری پھینک دی اور دوسری سے ذبح کر دیا تو حلال ہے اور اگر تیر پھینکتے وقت بسم اللہ پڑھی مگر وہ تیر نہ چھوڑا بلکہ دوسرا چھوڑا تو شکار حلال نہیں۔ مذبوح کو ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھنی اصل ہے لیکن اگر مجبوراً ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو پھر آلہ (شکاری جانور یا تیر) کو چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھنی کافی ہے اسی لئے اگر شکار پر شکاری جانور کو یا تیر کو چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھ لی ہو مگر شکار زندہ ہاتھ لگ جائے تو دوبارہ ذبح کے وقت بسم اللہ پڑھنی اور بسم اللہ پڑھ کر ذبح کرنا واجب ہے ایسا نہ کیا تو وہ شکار حلال نہ ہوگا۔ یہ حکم اس وقت ہوگا جب زندہ کو ذبح کرنے کا امکان ہو اور ذبح نہ کرے لیکن زندہ جانور ہاتھ میں ایسی حالت میں آ جائے کہ ذبح کئے ہوئے جانور سے کچھ زائد اس کے اندر جان ہو مگر ذبح نہ کر سکے اور وہ مر جائے تو ایک روایت میں امام اعظمؒ کے نزدیک وہ حلال نہیں دوسری روایت میں حلت کا قول آیا ہے امام ابو یوسفؒ اور امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے بعض لوگوں نے لکھا کہ اگر ذبح پر قدرت آلہ ذبح نہ ہونے کی وجہ سے نہ ہو سکے تو حلال نہیں اور ذبح کرنے کا وقت نہ ملے اور اس وجہ سے ذبح نہ کر سکے تو حلال ہے۔ یہ قول امام اعظمؒ کا ہے امام شافعیؒ اس کے خلاف ہیں۔

مسئلہ :- جانور یا تیر چھوڑنے کے وقت قصداً بسم اللہ ترک کر دی یا ذبح کرنے کے وقت قصداً بسم اللہ نہ کہی یا ٹرینڈ کتے

کے ساتھ کوئی ان ٹرینڈ کتایا مجوسی کا کتایا کوئی ایسا کتا جس کو چھوڑنے کے وقت قصداً بسم اللہ ترک کردی گئی ہو شریک ہو گیا تو اس شکار کو کھانا حلال نہیں کیونکہ اس آیت میں شکار کے حلال ہونے کی جو شرط لگائی گئی ہے وہ فوت ہو گئی اس کے علاوہ دوسری آیت میں آیا ہے وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ جس پر اللہ کا نام نہ ذکر کیا گیا ہو اس کو نہ کھاؤ۔ حضرت عدیؓ کی روایت ہے میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میں اپنے کتے کو چھوڑتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ایک اور کتا بھی شریک ہو جاتا ہے فرمایا اس کو مت کھاؤ، کیونکہ بسم اللہ تو تم نے اپنے کتے کو چھوڑتے وقت پڑھی ہے دوسرے کتے پر نہیں پڑھی۔ متفق علیہ۔

حضرت عدیؓ ہی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا اپنا کتا چھوڑتے وقت تم اللہ کا نام لے لیا کرو اب اگر وہ کتا تمہارے لئے پکڑ کر روک رکھے اور تم شکار کو زندہ پالو تو اس کو ذبح کرلو اور اگر مقتول پاؤ مگر کتے نے اس میں سے نہ کھایا ہو تو تم کھا سکتے ہو۔[۱] اور اگر اس کو پانی میں ڈوبا ہوا پاؤ تو نہ کھاؤ۔ متفق علیہ حضرت ابو ثعلبہ خشنی کا بیان ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا تم نے بسم اللہ کر کے اپنی کمان سے جو شکار کیا ہو اس کو کھاؤ اور جو بسم اللہ کر کے اپنے ٹرینڈ کتے کے ذریعہ سے شکار کیا ہو اس کو کھاؤ اور جو بن سدھائے کتے کے ذریعے سے شکار کیا ہو اور ذبح کو پہنچ گئے ہو (یعنی ذبح کرلیا ہو) تو اس کو بھی کھاؤ۔ متفق علیہ۔[۱]

مسئلہ :- اگر بسم اللہ کہنا بھول گیا تو امام احمد کے نزدیک حلال نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک حلال ہے امام مالکؒ کا بھی یہی قول ہے کتب مالکیہ میں یہی مذکور ہے۔ امام احمدؒ کا ایک قول بھی اسی طرح آیا ہے امام احمدؒ کا دوسرا قول یہ ہے کہ اگر ذبیحہ پر بسم اللہ کہنا بھول گیا تو ذبیحہ حلال ہے اور شکار پر شکاری جانور اور تیر چھوڑتے وقت بسم اللہ کہنا بھول گیا تو شکار حرام ہے امام احمدؒ کا تیسرا قول یہ ہے کہ تیر پھینکتے وقت اگر بسم اللہ کہنا بھول گیا تو شکار حلال ہے اور کتے یا چیتے کو چھوڑتے وقت بسم اللہ کہنا بھول گیا تو شکار حرام ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک بہر صورت حلال ہے (امام مالکؒ کا قول بھی ایک روایت میں یہی آیا ہے۔ ابو القاسم مالکی کا بھی یہی مختار ہے) خواہ بسم اللہ قصداً ترک کی ہو یا بھول گیا ہو ذبیحہ پر ترک ہو یا کتے اور تیر سے شکار کرنے پر مگر کتا ٹرینڈ ہونا چاہئے اور ٹریننگ دینے والا مسلمان ہو یا کتابی، لیکن اگر ان ٹرینڈ کتایا مجوسی کا کتا شریک ہو گیا تو شکار حرام ہے۔ مطلقاً متروک التسمیہ کے حلال ہونے پر دلیل حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث ہے کہ کچھ لوگوں نے خدمت گرامی میں عرض کیا یارسول اللہ ﷺ بعض لوگ ہمارے پاس گوشت لاتے ہیں اور معلوم نہیں ہوتا کہ (ذبح کے وقت) اس پر بسم اللہ کہی گئی ہے یا نہیں فرمایا تم بسم اللہ پڑھ لیا کرو اور کھالیا کرو۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا لوگوں کے کفر کا زمانہ گذرے اس وقت تک زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی۔ رواہ البخاری۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ ہم میں سے بعض آدمی ذبح کرتے ہیں اور بسم اللہ کہنی بھول جاتے ہیں۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کا نام ہر مسلمان کے منہ میں ہے۔ رواہ الدار قطنی، حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان اگر ذبح کے وقت بسم اللہ کہنا بھول جائے تو پھر بسم اللہ کہے اور اللہ کا نام لے کر کھالے، رواہ الدار قطنی، صلت کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان کا ذبیحہ حلال ہے بسم اللہ کہی ہو یا نہ کہی ہو، رواہ ابو داؤد فی المراسیل بیہقی نے اس حدیث کو موصولاً حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے مگر اس کی اسناد میں ضعف ہے بیہقی نے لکھا ہے صحیح یہ ہے کہ حدیث ابن عباسؓ پر موقوف ہے۔

ان روایات کا جواب یہ ہے کہ پہلی حدیث تو ترک بسم اللہ پر دلالت ہی نہیں کرتی اور ظاہر یہ ہے کہ وہ بسم اللہ پڑھتے ہی ہوں گے۔ دوسری حدیث کی سند میں مروان بن سالم ہے جس کے متعلق امام احمدؒ نے کہا کہ وہ ثقہ نہیں ہے اور نسائی و دار قطنی نے اس کو متروک کہا ہے۔ تیسری حدیث کی روایت میں ایک شخص معقل مجہول ہے چوتھی روایت مرسل ہے۔ پھر دوسری

---

[۱] اور اگر کھالیا ہو تو نہ کھاؤ کیونکہ اس نے شکار اپنے لئے پکڑا ہے اور اگر تم اپنے کتے کے ساتھ کسی دوسرے کے کتے (یعنی غیر کتے کو) شریک پاؤ اور شکار قتل ہو چکا ہو تو اس کو نہ کھاؤ کیونکہ تم کو معلوم نہیں کہ کس کتے نے شکار کو قتل کیا ہے اور اگر بسم اللہ پڑھ کر تم تیر چھوڑو اور شکار ایک دن تک تمہاری نظر سے غائب ہو جائے پھر (مقتول) ملے مگر اس میں تمہارے تیر کے نشان کے علاوہ کوئی دوسرا نشان نہ ہو (تو اس کو کھالو)۔

اور تیسری حدیث اس ذبیحہ کے متعلق ہے جس پر بسم اللہ کہنی بھول کر رہ گئی ہے اس سے شافعیؒ کے مسلک کی تائید نہیں ہو سکتی اور چوتھی حدیث کو ہم حالت نسیان پر محمول کرتے ہیں۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ قصداً متروک التسمیہ کو حلال قرار دینا خلاف اجماع ہے، امام شافعیؒ سے پہلے کوئی بھی اس کی حلت کا قائل نہ تھا البتہ بھول کر بسم اللہ پڑھنی رہ گئی ہو تو اس کے متعلق سلف میں اختلاف تھا حضرت ابن عمرؓ اس کو حرام کہتے تھے اور حضرت ابن عباس و حضرت علیؓ حلال۔ اسی لئے امام ابو یوسف نے کہا کہ قصداً اگر بسم اللہ نہ پڑھی ہو تو اس میں اجتہاد کی گنجائش ہی نہیں ہے (یہ تو اجماعاً حرام ہے) اور اگر قاضی ایسے ذبیحہ کی بیع کے جواز کا حکم دے دے تو اس کا حکم نافذ نہیں ہوگا کیونکہ اجماع کے خلاف ہے۔

مسئلہ :- جو شکار پالتو ہو گیا ہو تو اس کو ذبح کرنا ضروری ہے اور جو اونٹ گائے جنگلی ہو گیا ہو تو صرف زخمی کر دینا ہی اس کا تذکیہ ہے اور اگر بکری آوارہ ہو کر جنگل کو چلی گئی ہو تو اس کا تذکیہ بھی فقط زخمی کر دینا ہے لیکن اگر آوارہ ہو کر شہر ہی کے اندر ہو تو چونکہ اس کو پکڑنا ممکن ہے اس لئے اس کو ذبح کرنا لازم ہے اصل ضابطہ یہ ہے کہ جب ذبح کرنا قابو سے باہر ہو تو اس شے کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جس کو ذبح کے قائم مقام مانا گیا ہے اور جب پالتو جانور صحرائی بن جائیں تو اختیاری تذکیہ ممکن نہیں رہتا اس کے برخلاف جو صحرائی جانور پالتو بنا لیا جائے وہاں اختیاری تذکیہ پر قابو ہو جاتا ہے۔

یہی حالت جمہور کے نزدیک اس وقت ہوگی جب کوئی چوپایہ کنویں میں گر پڑے اور اس کو ذبح کرنا ناممکن ہو جائے تو تذکیہ غیر اختیاری یعنی صرف زخمی کرنے پر اکتفا کیا جائے گا۔ امام مالکؒ کے نزدیک پالتو جانوروں کا باقاعدہ ذبح کرنا یعنی حلق اور لبہ کا کاٹنا ضروری ہے کیونکہ بھاگ کر ان کا صحرائی بن جانا بہت نادر ہے جو نا قابل اعتبار ہے۔

ہماری دلیل حضرت رافعؓ بن خدیج کی روایت کردہ حدیث ہے۔ حضرت رافعؓ کا بیان ہے کہ مال غنیمت کے کچھ اونٹ ہم کو ملے ان میں سے ایک اونٹ بھاگ نکلا لیکن ایک آدمی نے اس کے تیر مارا جس کی وجہ سے اللہ نے اس کو روک دیا اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان اونٹوں میں کچھ وحشی جنگلی بھی ہوتے ہیں جیسے دوسرے وحشی جانور لہٰذا اگر ان میں سے کوئی بے قابو ہو جائے تو اس کے ساتھ ایسا ہی کیا کرو۔ متفق علیہ۔

ابو العشراء کی روایت ہے کہ میرے باپ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا حلق اور لبہ کے سوا ذبح کرنے کی اور کوئی صورت نہیں فرمایا۔ اگر اس کی ران میں تم نیزہ مار دو تب بھی کافی ہے۔ رواہ احمد واصحاب السنن الار بعۃ والدارامی۔

ابو داؤد نے بیان کیا ہے کہ اوپر سے نیچے گرنے والے جانور کا تذکیہ بھی اسی طرح ہے ترمذی نے لکھا ہے ایسا ضرورت کے وقت ہوگا۔ حافظ ابو موسیٰؒ نے مسند ابو العشراء میں یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے اگر تم اس کی ران یا پہلو میں نیزہ مار دو اور اللہ کا نام لے لو تو تمہارے لئے کافی ہے۔ امام شافعیؒ نے بیان کیا ہے ایک اونٹ کنویں میں گر گیا تو اس کے پہلو کو نیزہ سے زخمی کر دیا گیا اور حضرت ابن عمرؓ سے مسئلہ دریافت کیا گیا آپ نے کھانے کا حکم دے دیا۔

مسئلہ :- شکار کے تیر مارنے سے اگر اس کا کوئی عضو کٹ کر جدا ہو جائے تو شکار حلال ہے اور وہ کٹا ہوا عضو نہیں کھایا جائے گا۔ امام شافعیؒ کے نزدیک دونوں کو کھانا حلال ہے خواہ شکار تیر مارنے سے مر گیا ہو کیونکہ غیر اختیاری تذکیہ سے عضو جدا ہوا ہے لہٰذا جس بدن سے جدا ہوا اور جو عضو جدا ہوا دونوں کا کھانا حلال ہے۔ ہمارے مسلک کا ثبوت حدیث سے ملتا ہے حضورؐ کا فرمان عام ہے کہ زندہ سے جو حصہ جدا کر لیا گیا ہو وہ حصہ مردار ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اور (ممنوعات کا ارتکاب کرنے میں) اللہ سے ڈرو۔

اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ④ یقیناً اللہ جلد حساب لینے والا ہے، تمہارے ہر چھوٹے بڑے گناہ کی پکڑ کرے گا

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۭ اب (تکمیل دین کے بعد) تمہارے لئے تمام پاکیزہ (حلال) چیزیں (قیامت تک کے لئے) جائز کر دی گئیں۔ تکمیل دین کے بعد چونکہ کوئی حکم منسوخ نہیں کیا گیا اس لئے قیامت تک یہ حلت باقی رہے گی، اس فقرہ کی تکرار تاکید کے لئے ہے۔

طَيِّبٰت (پاکیزہ) خَبَائِث (ناپاک گندہ) کی ضد ہے، اس جگہ طیبات کا لفظ مجمل ہے جن احادیث مبارکہ میں طیبات و خبائث کی تفصیل آئی ہے وہ اس مجمل کا بیان ہو جائیں گی، اس کے بعد اس واقعہ پر جس کے متعلق نص کا ورود ہوا ہے دوسری مشابہ چیز کو قیاس کر لیا جائے گا۔ طیب اور خبیث کو پہچاننے کا ضابطہ یہ ہے کہ نص (یعنی قرآن وحدیث) نے جس حکم کو حلال کہا ہے اس کو طیب کہا جائے گا اور جس کو حرام قرار دیا ہے اس کو خبیث کہا جائے گا اور جس کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے اور خبیث و فاسق کہا ہے وہ خبیث و حرام ہو گا مثلاً حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچ (جانور) ہیں جن کو حرم کے اندر احرام کی حالت میں قتل کر دینے میں کوئی گناہ نہیں چوہا، کوا، چیل، بچھو، کاٹنے والا کتا، متفق علیہ، حضرت عائشہؓ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچ (جانور) فاسق (یعنی ایذا رساں) ہیں حل و حرم میں ان کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ سانپ، کوا، چوہا، کاٹنے والا کتا اور چیل، متفق علیہ۔ [1]

سانپ کے متعلق حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے جب سے ان سے ہماری جنگ ہوئی ہم نے ان سے صلح نہیں کی جو شخص ڈر کے مارے ان کو (قتل کرنے سے) چھوڑ دے گا وہ ہم میں سے نہیں۔ رواہ ابو داؤد، حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام سانپوں کو قتل کر دو جو ان کے انتقام سے ڈرے گا، مجھ سے نہ ہو گا (یعنی اسکا تعلق مجھ سے نہ ہو گا، میری جماعت میں سے نہ ہو گا) رواہ ابو داؤد والنسائی۔

اور جس کے متعلق نص نہیں آئی (قرآن وحدیث میں اس کو نہ طیب کہا گیا نہ خبیث) تو وہاں قیاس سے کام لیا جائے گا۔ عرب کی نفیس سلیم طبیعت جس کو پاکیزہ مانے گی اس کو طیب اور جس کو ان کی طبیعت ناپاک اور گندہ سمجھے گی اس کو خبیث قرار دیا جائے گا۔ تمام صحابہؓ مردار کھانے والے جانور سے نفرت کرتے تھے۔ ابن ابی شیبہ نے نخعی کے طریق سے یہی نقل کیا ہے اسی لئے جمہور علماء کا فیصلہ ہے کہ جو چوپایہ یا پرندہ مردار خوار ہے وہ حرام ہے۔

اگر کسی جانور کو قتل کرنے کی ممانعت آگئی ہو تو جب تک کوئی دوسری دلیل موجود نہ ہو صرف ممانعت قتل سے ہم اس کو حرام یا مکروہ نہیں قرار دے سکتے تینوں اماموں کا یہی قول ہے لیکن امام شافعیؒ اس کو حرام کہتے ہیں ہدہد اور مور کی حلت (بر قول جمہور) اور حرمت (بر قول شافعیؒ) اسی وجہ سے ہے بنائے اختلاف یہی ہے۔

مسئلہ:- جو جانور کیلوں والا ہو (یعنی اس کے دانت پھاڑنے والے ہوں) جیسے شیر، چیتا، بھیڑیا، کتا، بلی (گیدڑ، لومڑی وغیرہ) وہ تینوں اماموں کے نزدیک حرام ہے اور امام مالک کے نزدیک مکروہ۔

ہر وہ پرندہ جس کے ناخن والے پنجے ہوں جیسے باز، شکرا، چیل وغیرہ وہ تینوں اماموں کے نزدیک حرام اور امام مالک کے نزدیک مکروہ ہے۔ امام مالکؒ نے فرمایا آیت میں آیا ہے قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْمَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗ لہٰذا جس کی حرمت کا ذکر آیات میں نہیں وہ حرام نہیں، امام مالکؒ کی یہی دلیل ہے۔

ہم کہتے ہیں اس آیت سے تو اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نزول کے وقت سوائے ان چیزوں کے جن کا ذکر اس میں آیا ہے اور کوئی جانور حرام نہیں کیا گیا تھا لیکن اس کے نزول کے بعد بھی ان مذکورات کے علاوہ کسی اور کو حرام نہیں کیا گیا اس کا ثبوت اس آیت سے نہیں ہوتا اس آیت کی تشریح اس کی تفسیر کے وقت انشاء اللہ آئے گی، اور مذکورات آیت کے علاوہ بعض دوسری چیزوں کی حرمت، نزول آیت کے بعد صحیح احادیث میں آچکی ہے جن کو امت اسلامیہ نے قبول کیا ہے مثلاً حضرت ابن

---

[1] اصل بات یہ ہے کہ قرآن مجید شارع ہے اور حدیث شارح یعنی قرآن دستور ہے اور حدیث نے اس کی شرح کی ہے اور آئین کا اظہار کیا ہے، مجمل کی وضاحت حدیث سے ہوتی ہے پھر اہل اجتہاد غور کرتے ہیں اور حکم کی علت کو سمجھتے ہیں اگر قرآن یا حدیث میں علت اور سبب بیان کر دیا گیا ہے تو جہاں وہ سبب پایا جاتا ہے وہاں وہی حکم نافذ کرتے ہیں جو اصل نص میں موجود ہے اور گر علت منصوص نہیں ہوتی تو مجتہد خود غور کر کے علت کا استنباط کرتا ہے اور اسی علت قیاسیہ کی روشنی میں تمام جزئیات کے احکام کا استنباط و استخراج کرتا ہے اس کی مزید تشریح اصول فقہ کی کتابوں میں بیان کر دی گئی ہے، ۱۲۔

عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر کیلوں والے درندہ اور ہر ناخن دار پنجوں والے پرندہ (کے کھانے) کی ممانعت فرمائی ہے۔ رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر کیلوں والے درندے کو کھانا حرام ہے، رواہ مسلم۔ ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کی صحت پر اجماع ہے، عبداللہ بن احمدؒ نے زیادات مسند میں حضرت علیؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے، مگر یہ روایت معطل ہے۔ امام احمدؒ نے بھی ایسی ہی حدیث حضرت جابرؓ کی روایت سے نقل کی ہے، یہ بھی حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بلی اور اس کی قیمت کو کھانے کی ممانعت فرمادی ہے۔ رواہ ابوداؤد والترمذی۔

مسئلہ :۔ امام اعظم کے نزدیک بجو اور لومڑی حرام ہے اور امام مالک کے نزدیک مکروہ امام شافعیؒ اور امام احمد ان کو حلال کہتے ہیں ایک روایت میں آیا ہے کہ امام احمد کے نزدیک لومڑی حلال نہیں۔

صاحب ہدایہ نے لکھا ہے یہ دونوں درندوں میں داخل ہیں، کفایہ میں ہے ان کے کیلے ہوتے ہیں اور کیلوں سے ہی یہ لڑتے ہیں اس لئے ان کو بھیڑیے کی طرح کھانا جائز نہیں۔

امام شافعیؒ نے حضرت جابرؓ کے قول سے استدلال کیا ہے کہ جب حضرت جابرؓ سے دریافت کیا گیا کہ کیا بجو شکار ہے، فرمایا ہاں دریافت کیا گیا کیا اس کو کھایا جاسکتا ہے فرمایا ہاں، پوچھا گیا کیا یہ رسول اللہ ﷺ سے آپ نے سنا ہے ؟ فرمایا ہاں، یہ روایت امام شافعیؒ اور اصحاب سنن نے بیان کی البتہ ابوداؤد اور بیہقی نے نہیں بیان کی، بخاری اور ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے۔ ابن عبدالبر نے عبدالرحمن بن ابی عمار راوی کی وجہ سے اس کو معطل قرار دیا ہے مگر ابوزرعہ اور نسائی نے اس کو ثقہ کہا ہے، امام شافعیؒ نے یہ بھی کہا ہے کہ صرف صفا اور مروہ کے درمیان بجو کا گوشت فروخت کیا جاتا ہے اور کہیں نہیں بیچا جاتا۔ ابوداؤد کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے بجو کے متعلق دریافت کیا فرمایا شکار ہے اور اگر محرم بحالت احرام اس کا شکار کرلے تو مینڈھے کی قربانی دی جائے۔

میں کہتا ہوں بجو کا شکار قرار دینا اور اس کو شکار کرنے کی صورت میں مینڈھے کی قربانی کا حکم اس کی حلت کو نہیں چاہتا محرم اگر کسی ایسے جانور کا شکار کرلے جس کا گوشت حرام ہے تب بھی (بصورت قربانی) بدلہ دینا واجب ہوتا ہے شکار تو ہر اس جانور کو کہتے ہیں جو جنگلی ہو اور بالطبع محفوظ ہو (خواہ حلال ہو یا حرام) رہی بجو کے حلال ہونے والی حدیث تو اس میں اتنی قوت نہیں جتنی حرمت سباع والی حدیث میں ہے اور اگر حلت و حرمت میں کہیں تعارض ہو رہا ہو تو احتیاطاً حرمت کو ترجیح دی جاتی ہے حرمت کو ترجیح دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس صورت میں نسخ کی تکرار لازم نہیں آتی۔

ترمذی نے خزیمہؓ بن جریر کی روایت سے لکھا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کیا بجو کو کوئی کھاتا ہے۔ یہ روایت ضعیف ہے کیونکہ اس روایت میں ایک راوی عبدالکریم بن امیہ ہے جو بالاتفاق ضعیف ہے۔

مسئلہ :۔ زمین کے کیڑے مکوڑے جیسے چوہا، گرگٹ وغیرہ تینوں اماموں کے نزدیک حرام اور امام مالک کے نزدیک مکروہ ہیں، ائمہ ثلثہ کی دلیل حضرت ام شریک والی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گرگٹ کو قتل کردینے کا حکم دیا اور فرمایا یہ ابراہیم کی آگ میں (بھڑکانے کے لئے) پھونکیں مارتا تھا، متفق علیہ۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گرگٹ کو قتل کردینے کا حکم دیا اور اس کو فویسق فرمایا۔ رواہ مسلم، حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے پہلی ضرب میں گرگٹ کو مار ڈالا اس کے لئے سو نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور دوسری ضرب سے (قتل کرنے میں) اس سے کم اور تیسری ضرب سے (قتل کرنے میں) اس سے کم (نیکیاں لکھی جاتی ہیں)، رواہ مسلم۔

حل و حرم کے اندر چوہے کو قتل کرنے کا حکم اور اس کو فاسق فرمانے کا بیان گزشتہ حدیثوں میں آچکا ہے لہٰذا گرگٹ اور

چوہے پر قیاس کرتے ہوئے تمام حشرات الارض کو حرام قرار دیا جائے گا۔
سیہی، امام مالکؒ و امام شافعیؒ کے نزدیک حلال اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک حرام ہے کیونکہ یہ بھی حشرات الارض میں سے ہے۔ ابو داؤد نے عیسیٰ بن نمیلہ کے باپ کی روایت سے بیان کیا ہے، عیسیٰ کے باپ کا بیان ہے میں حضرت ابن عمرؓ کے پاس موجود تھا کہ آپ سے سیہی کا مسئلہ پوچھا گیا آپ نے فوراً آیت قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْمَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ پڑھ دی وہاں ایک بوڑھا آدمی موجود تھا اس نے کہا میں نے حضرت ابو ہریرہؓ کو یہ کہتے سنا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے سیہی کا ذکر آیا تو حضور ﷺ نے فرمایا وہ خبائث میں سے ایک خبیثہ ہے حضرت ابن عمرؓ نے شیخ کا بیان سن کر فرمایا اگر یہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے تو بے شک ویسا ہی ہوگا جیسا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیہقی نے لکھا ہے اس کی سند میں ضعف ہے اور اس حدیث کی روایت میں صرف یہی سند آئی ہے۔

مسئلہ :- گوہ اور گھونس امام اعظمؒ کے نزدیک حرام اور امام مالکؒ و شافعیؒ کے نزدیک حلال ہے امام احمدؒ کے نزدیک گوہ حلال ہے اور گھونس کے متعلق آپ ﷺ کے دو قول (منفی و مثبت) مروی ہیں۔ گوہ کو حلال قرار دینے والوں نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا گوہ کو نہ میں کھاتا ہوں نہ اس کو حرام کہتا ہوں۔ رواہ البخاری و مسلم

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ خالد بن ولید نے بیان کیا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ام المومنین حضرت میمونہؓ کے گھر گیا۔ حضرت میمونہؓ حضرت ابن عباسؓ کی بھی خالہ تھیں اور حضرت خالد بن ولید کی بھی۔ ام المومنین کے پاس گوہ کا بھنا ہوا گوشت رکھا تھا آپؓ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا حضور ﷺ نے اس سے ہاتھ کھینچ لیا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا گوہ حرام ہے، فرمایا نہیں مگر میری سرزمین میں پائی نہیں جاتی، مجھے اس سے گھن آتی ہے، حضرت خالدؓ کا بیان ہے یہ سن کر میں نے اس کو اپنی طرف کھینچ لیا اور کھانے لگا اور رسول اللہ ﷺ مجھے کھاتا دیکھتے رہے۔ متفق علیہ

امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا گوہ حشرات میں سے ہے (اور حشرات کی حرمت منصوص قطعی ہے) اور نص صریح سے ایسی روایات کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، ہدایہ میں ہے کہ جب حضرت عائشہؓ نے گوہ کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تو حضور ﷺ نے ممانعت فرما دی، مجھے یہ حدیث معلوم نہیں۔[1]

مسئلہ :- مردہ ٹڈی کھانا حلال ہے جس طرح بھی مری ہو، امام مالک کے نزدیک صرف وہ ٹڈی نہ کھائی جائے جو اپنی موت سے بغیر خارجی سبب کے مری ہو یعنی مکروہ ہے جمہور نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہمارے لئے دو مردار اور دو خون حلال کر دیئے گئے ہیں دو مردار تو ٹڈی اور مچھلی ہیں اور دو خون کلیجی اور تلی ہیں، رواہ الشافعی واحمد وابن ماجہ والدار قطنی والبیہقی من روایۃ عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم، عبد الرحمٰن بن زید راوی ضعیف متروک ہے۔ دار قطنی نے اس حدیث کو زید بن اسلم کی روایت سے حضرت ابن عمرؓ پر موقوفاً نقل کیا ہے یعنی ابن عمر کا قول قرار دیا ہے یہی زیادہ صحیح ہے، ابو زرعہ اور ابو حاتم نے بھی اس کے موقوف ہونے کو ہی صحیح کہا ہے۔

خطیب نے اس کی تخریج اس طرح کی ہے مسور بن الصلت از زید بن اسلم از عطا بن یسار از حضرت ابو سعید خدری، اس سلسلہ میں امام احمدؒ نے مسور کی تکذیب کی ہے اور ابن حبان نے کہا کہ یہ ثقات کی طرف موضوعات کی نسبت کرتا ہے۔

مسئلہ :- گدھے اور خچر کا گوشت تینوں اماموں کے نزدیک حرام ہے اور امام مالکؒ کے نزدیک مکروہ ہے۔ حضرت ابو ثعلبہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گھریلو گدھوں کے گوشت کو حرام کر دیا ہے، متفق علیہ۔ امام احمد کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبد الرحمٰن بن عوف سے یہ منادی کرائی کہ جو شخص میرے رسول ﷺ ہونے کی شہادت دیتا ہے

---

[1] یہ حدیث صاحب مشکوٰۃ نے باب مَا یَحِلُّ اَکْلُہٗ وَمَا لَا یَحِلُّ اَکْلُہٗ کے اندر عبد الرحمٰن بن شبل کی روایت سے بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گوہ کا گوشت کھانے کی ممانعت فرمادی تھی، رواہ ابو داؤد، تفسیر مظہری کے اصل نسخہ میں یہی عبارت ہے، لہٰذا یہ الفاظ کہ "مجھے یہ حدیث معلوم نہیں، غلط معلوم ہوتے ہیں"۔ ۱۲

اس کو (معلوم ہونا چاہئے کہ) پالتو گدھوں کا گوشت حلال نہیں۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گھریلو گدھوں کے گوشت کی ممانعت فرمادی اور گھوڑوں کے گوشت کی اجازت دے دی تھی۔ متفق علیہ۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے دن پالتو گدھوں اور خچروں اور کیلے والے درندوں اور ناخن دار پنجوں والے پرندوں کے گوشت کو حرام کر دیا تھا۔ رواہ الترمذی۔ ترمذی نے اس حدیث کو غریب کہا ہے۔

امام احمدؒ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں رسول اللہ ﷺ نے پالتو گدھوں، لومڑیوں، کیلوں والے درندوں اور ناخن دار پنجوں والے پرندوں کے گوشت کو حرام کر دیا۔ حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو گھوڑے کا گوشت کھانے کی اجازت دیدی اور گدھے کے گوشت کی ممانعت کر دی۔ ترمذی نے اس روایت کو صحیح کہا ہے اور نسائی نے بھی اس کو بیان کیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ خیبر کے دن رسول اللہ ﷺ نے ہر کیلے والے درندوں اور پالتو گدھوں (کے گوشت) کو حرام کر دیا۔ رواہ احمد۔ حضرت براء بن عازبؓ کا بیان ہے کہ خیبر کے دن کچھ گدھے ہمارے ہاتھ لگ گئے کچھ دیر میں اچانک رسول اللہ ﷺ کے منادی نے آواز لگائی ہانڈیاں الٹ دو۔ متفق علیہ۔

حضرت علی کرم اللہ وجہ کی روایت ہے کہ خیبر کے سال رسول اللہ ﷺ نے نکاح متعہ کی اور پالتو گدھوں کے گوشت کی ممانعت فرمادی۔ متفق علیہ۔ اس موضوع کی احادیث حضرت ابوسلیطؓ، انسؓ، ابن عباسؓ، سلمہ بن اکوع، عبداللہ بن ابی اوفی، خالد بن ولیدؓ، عمرو بنؓ شعیب کے دادا، مقدام بن معدیکرب اور عمرو بنؓ دینار کی روایات سے آئی ہیں۔

مسئلہ :- گھوڑے کا گوشت کھانا جمہور کے نزدیک حلال ہے صاحبین کا بھی یہی قول ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام ابومالکؒ کے نزدیک مکروہ ہے تحریمی ہے یا تنزیہی۔ دونوں روایات آئی ہیں۔ صاحب ہدایہ نے کراہت تحریم کو زیادہ صحیح قرار دیا ہے۔

جمہور کی دلیل حضرت جابرؓ کی وہی حدیث ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے گھوڑوں (کے گوشت) کی اجازت دیدی۔ دوسری حدیث حضرت اسماءؓ کی ہے اسماء نے فرمایا۔ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جبکہ ہم مدینہ میں تھے ایک گھوڑے کو ذبح کر کے کھایا متفق علیہ۔ امام احمد کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے گھر والوں نے۔

امام ابوحنیفہؒ نے آیت وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً سے استدلال کیا ہے اس آیت میں اللہ نے بطور احسان گھوڑوں خچروں اور گدھوں کے دو فوائد بیان کئے ہیں سواری اور زینت، کھانا تو سب سے بڑا فائدہ تھا۔ اگر اس کی اجازت ہوتی تو بدرجہ اولیٰ اس کا بھی اظہار کیا جاتا اعلیٰ احسان کا ذکر ترک نہ کیا جاتا۔ دوسری حدیث حضرت خالدؓ بن ولید کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حرام ہے گوشت پالتو گدھوں اور پالتو گھوڑوں کا۔ دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے گھوڑوں خچروں اور گدھوں کا گوشت کھانے کی ممانعت فرمادی۔ امام احمد نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد اس کو منکر قرار دیا ہے۔ موسیٰ بن ہارون نے کہا اس حدیث کے راوی صالح بن یحییٰ اور یحییٰ بن مقدام غیر معروف ہیں صرف مقدام کے ذیل میں ان کی معرفت ہوتی ہے ورنہ خود مجہول ہیں۔ دار قطنی نے بھی اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔

ابن جوزی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے کہ خیبر کے دن رسول اللہ ﷺ نے گدھوں خچروں اور گھوڑوں کا گوشت حرام کر دیا۔ واقدی نے کہا کہ حضرت خالدؓ تو خیبر کے بعد مسلمان ہوئے تھے (خیبر میں موجود ہی نہ تھے)۔

مسئلہ :- امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک نیولا مکروہ ہے کیونکہ یہ بھی حشراتی درندوں میں سے ہے۔

مسئلہ :- تینوں اماموں کے نزدیک رخم، بغاث، ابقع (چت کبرا کوا) اور گدھ مکروہ ہے یہ سب مردار خوار ہیں۔ کھیتی والے کوے میں کوئی ہرج نہیں، یہ دار خور ہے۔ شکاری پرندہ نہیں ہے نہ عقعق (ایک قسم کا کوا) میں کوئی ہرج ہے کیونکہ اس کی خوراک مخلوط ہوتی ہے (دانہ بھی اور مردار کا گوشت بھی) یہ مرغی کے مشابہ ہے امام ابویوسفؒ اس کو مکروہ کہتے ہیں کیونکہ اس کی بیشتر خوراک مردار کا گوشت ہے۔

مسئلہ :- گندگی خور چوپایہ ہو یا پرندہ اس کا گوشت انڈے اور دودھ امام احمد کے نزدیک حرام ہے جب تک اس کو بند

کر کے ایک مدت تک نہ رکھا جائے۔ پرندے کو تین دن اونٹ کو چالیس دن گائے کو تیس دن۔ بکری کو سات دن اور مرغی کو تین دن بند رکھا جائے ایک روایت میں سب کے لئے تین دن کی مدت بیان کی گئی ہے۔ باقی تینوں اماموں کے نزدیک اگر گندگی خور جانور کے گوشت اور دودھ میں بدبو پیدا ہو جائے تو اس کو کھانا مکروہ تحریمی ہے اس کو اتنی مدت تک بند رکھا جائے کہ نجاست کی بدبو جاتی رہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گندگی خور جانور کو کھانے اور اس کا دودھ پینے کی ممانعت فرمادی رواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجۃ ۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گندگی خور بکری کے دودھ کی ممانعت فرمادی۔ رواہ احمد

حضرت عبداللہ بنؓ عمرو بن عاصؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گندگی خور اونٹوں کا گوشت کھانے ان کا دودھ پینے اور ان پر سوار ہونے کی ممانعت فرمادی۔ تاوقتیکہ چالیس روز تک (بند رکھ کر) ان کو چارہ نہ کھلایا جائے۔ رواہ البیہقی والدار قطنی۔ اس کی سند میں ایک راوی اسماعیل بن ابراہیم بن مہاجر ہے ابن جوزی نے اسماعیل اور ابراہیم دونوں کو ضعیف کہا ہے۔ امام احمد، ابوداؤد نسائی اور الحکم نے عمرو بن شعیب کے دادا کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پالتو گدھوں اور گندگی خور جانوروں کا گوشت کھانے اور ان پر سوار ہونے کی ممانعت فرمائی ہے۔

مسئلہ :- دریائی جانوروں میں سے سوائے مچھلی کے امام ابو حنیفہ کے نزدیک اور کوئی جانور حلال نہیں۔ امام مالکؒ کے نزدیک سب دریائی جانور کھائے جاسکتے ہیں یہاں تک کہ کیکڑا، مینڈک دریائی کتا اور دریائی سور بھی، مگر دریائی سور امام مالکؒ کے نزدیک مکروہ ہے بعض روایات میں آیا ہے کہ آپ نے اس کے حلال حرام ہونے میں توقف اختیار کیا۔ امام احمدؒ نے کہا مینڈک، مگر مچھ اور کوسج کے علاوہ دریا میں جو جانور پیدا ہوتا اور رہتا ہے اس کو کھانا حلال ہے مگر مچھلی کے علاوہ دوسرے دریائی جانوروں کو ذبح کرنا ضروری ہے جیسے دریائی سور (دریائی خنزیر) دریائی انسان۔ امام شافعیؒ کے ساتھیوں میں اختلاف ہے بعض کا قول امام مالکؒ (رحمہم اللہ) کے قول کی طرح ہے بعض کا قول امام ابو حنیفہ (رحمہم اللہ) کے قول کی طرح بعض نے کہا جن دریائی جانوروں کے ہم شکل خشکی میں جانور پائے جاتے ہیں ان کو نہ کھایا جائے جیسے دریائی کتا، سور، انسان، سانپ بچھو، چوہا اور جن کے ہم شکل خشکی میں نہ ہوں ان کو کھایا جاسکتا ہے بعض نے کہا مینڈک، مگر مچھ، دریائی سانپ بچھو، کیکڑا، کچھوا حرام ہیں باقی سب حلال، امام مالکؒ کی دلیل یہ آیت ہے اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ یہ آیت عام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے وہ یعنی سمندر کا پانی پاک ہے اور اس کا مرا ہوا (بغیر ذبح کے) حلال ہے۔

اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ آیت میں صید (کا معنی مصدری ہے یعنی اس) کا معنی ہے شکار کرنا کیونکہ دوسری آیت میں آیا ہے وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا جب تک احرام کی حالت میں ہو، تمہارے لئے خشکی کے جانوروں کو شکار کرنا حرام کر دیا گیا ہے ظاہر ہے کہ اس جگہ صید کا معنی ہے شکار کرنا (شکار کا جانور مراد نہیں ہے) کیونکہ غیر محرم اگر احرام والے کی مدد کے بغیر خشکی کے حلال جانور کا شکار کرلے تو محرم کے لئے اس کو کھانا جائز ہے (اس لئے آیت کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ خشکی کا جانور محرم کے لئے بحالت احرام مطلقاً نا جائز ہے) رہی حدیث تو اس میں میتہ سے مراد صرف مچھلی ہے۔

حضرت جابرؓ کی ایک روایت میں آیا ہے جس کو دار قطنی نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سمندر کا کوئی جانور ایسا نہیں کہ اللہ نے بنی آدم کے لئے اس کا تذکیہ نہ کر دیا ہو (یعنی بغیر ذبح کئے اس کو کھانا حلال نہ کر دیا ہو اور ظاہر ہے کہ اس حدیث میں جانور سے مراد صرف مچھلی ہے ہر جانور مراد نہیں ہے کیونکہ) دوسری حدیث میں آیا ہے ہر نون کو بنی آدم کے لئے ذبیحہ (یعنی ذبیحہ کے حکم میں) کر دیا گیا ہے اور نون کا معنی ہے مچھلی اور حدیث کی رفتار بتا رہی ہے کہ ہر سمندری جانور کو ذبح کرنے سے مستغنی بنا دینا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ مچھلی کو ذبح کرنے کی ضرورت نہیں۔

مچھلی کے علاوہ بعض دوسرے سمندری جانوروں کی حلت حضرت جابرؓ کی روایت سے معلوم ہوتی ہے حضرت جابرؓ کا بیان ہے میں جیش خبط کے ساتھ جہاد میں شریک تھا ابو عبیدہ کمانڈر تھے ہم سخت بھوک زدہ ہو گئے (کھانے کو کچھ موجود نہ تھا)

سمندر نے ایک اتنی بڑی مچھلی مردہ باہر نکال پھینکی تھی کہ ہم نے اتنی بڑی مچھلی نہیں دیکھی اس کو عنبر کہا جاتا تھا ہم نے نصف ماہ تک اسی کو کھایا ابو عبیدہ نے اس کی ایک ہڈی لے کر کھڑی کی تو اس کے (کمانچے کے) نیچے سے اونٹ سوار نکل گیا جب ہم خدمت گرامی میں پہنچے تو ہم نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا حضور ﷺ نے فرمایا خدا دادرزق کھاؤ اور اگر تمہارے پاس ہو تو ہم کو بھی کھلاؤ چنانچہ ہم نے اس میں سے کچھ حضور ﷺ کے لئے بھیج دیا اور آپ نے اس کو کھایا۔ متفق علیہ۔ حنفیہ اس کے جواب میں کہتے ہیں عنبر ایک قسم کی مچھلی ہی تھی دیکھو حضرت جابرؓ نے اس کو حوت کے لفظ سے تعبیر کیا تھا۔

مینڈک اور وہ تمام دریائی جانور جن سے انسانی ذوق نفرت کرتا اور لطیف طبیعت گھن کھاتی ہے اس کی حرمت پر آیت وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ دلالت کرتی ہے اور ایک حدیث بھی آئی ہے جو عبدالرحمٰن بن عثمان نے بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک طبیب نے کچھ دوایاں کی اور مینڈک کو اس میں شامل کرنے کا بھی ذکر کیا لیکن حضور ﷺ نے مینڈک کو قتل کرنے سے منع فرمادیا۔ رواہ احمد وابوداؤد والنسائی والبیہقی بیہقی نے لکھا ہے کہ مینڈک کی ممانعت کی روایات میں سب سے زیادہ قوی یہی روایت ہے۔

مسئلہ :- پانی کے اوپر مردہ مچھلی تیرنے والی امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مکروہ ہے جمہور کے نزدیک مکروہ نہیں۔ جمہور کے قول کی تائید ایک تو حضرت جابر والی روایت سے ہوتی ہے جس میں عنبر کا کنارہ پر پڑا ہوا مذکور ہے۔ دوسری حدیث یہ ہے کہ حضورؐ نے فرمایا هُوَ الْحِلُّ میتۃ۔

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ حضرت جابرؓ کی روایت میں ہے سمندر نے ایک مردہ مچھلی پھینک دی تھی اس کا مطلب یہ ہے کہ سمندر کے پھینکنے سے (باہر آکر) جو مچھلی مرگئی تھی۔ یہ تو بالاتفاق حلال ہے میتۃ البحر وہی مچھلی ہو سکتی ہے جس کی موت کا فاعل سمندر ہو یعنی سمندر کے کسی عمل سے وہ مری ہو وہ مچھلی میتۃ البحر نہیں ہو سکتی جو (کنارہ پر آنے سے پہلے) کسی بیماری کی وجہ سے سمندر ہی میں مرگئی ہو۔

حنفیہ نے حضرت جابرؓ کی روایت سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو مردہ ہونے کی حالت میں پانی کے اوپر تیر رہی ہو اس کو نہ کھاؤ اور سمندر جس کو چھوڑ کر سمٹ گیا ہو (یعنی بھاٹا کی حالت میں جو مچھلی بھاٹا کے ساتھ نہ جاسکے اور رہ جائے) اور جو کنارہ پر رہ گئی ہو اس کو کھاسکتے ہو۔ یہ حدیث دار قطنی نے ابو احمد زبیری کے طریق سے مرفوعاً بیان کی ہے اور صراحت کی ہے کہ ابو احمد کے علاوہ اور کسی طریق سے اس کو مرفوعاً نہیں ذکر کیا گیا۔ وکیع عبدالرزاق اور مومل وغیرہ نے اس کو موقوفاً نقل کیا ہے ابو ایوب سجستانی، عبداللہ بن عمرو بن جریج حماد بن سلمہ اور زہیر وغیرہ نے بھی بروایت ابوالزبیر اس کو موقوفاً نقل کیا ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔

دار قطنی نے ایک اور طریق سے حدیث کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں سمندر جس (مچھلی) کو کھول کر چلا جائے اور جس کو ڈال جائے اس کو کھاؤ اور جس کو مردہ پاؤ پانی پر (مردہ ہونے کی حالت میں) تیرتا پاؤ اس کو نہ کھاؤ۔ دار قطنی نے لکھا یہ حدیث صرف عبدالعزیز نے بروایت وہب بیان کی ہے اور عبدالعزیز ضعیف ناقابل احتجاج ہے امام احمد نے اس کو ضعیف کہا ہے اور حدیث کو غیر صحیح قرار دیا ہے نسائی نے اس کو متروک کہا ہے۔

ابوداؤد نے ایک دوسرے سلسلہ سے بالفاظ ذیل روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو (مچھلی) سمندر (کنارہ پر) پھینک دے یا اسکو چھوڑ کر سمٹ جائے تو اس کو کھاؤ اور جو سمندر میں مرجائے اور اوپر تیرنے لگے اس کو مت کھاؤ۔ اس سند میں ایک راوی اسماعیل بن امیہ متروک ہے ابوداؤد نے لکھا ہے اس حدیث کو سفیان ایوب اور حماد نے ابوالزبیر کی روایت سے نقل کیا ہے مگر سب نے حضرت جابرؓ پر اس کو موقوف کردیا (مرفوعاً نہیں بیان کیا)

مسئلہ :- باجماع علماء خرگوش حلال ہے حضرت انسؓ کا بیان ہے مرالظہران میں میں نے ایک خرگوش پکڑ لیا اور لے کر ابو طلحہ کے پاس آیا، ابو طلحہ نے اس کو ذبح کر کے ایک سرین وران رسول اللہ کی خدمت میں بھیج دیا اور حضور ﷺ نے اس کو قبول

کرلیا۔ متفق علیہ۔
فائدہ :- حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مرغی کا گوشت کھایا۔ متفق علیہ۔
فائدہ :- حضرت سفینہ کا بیان ہے میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سرخاب کا گوشت کھایا۔ رواہ ابوداؤد۔
وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ اور اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے طعام سے مراد ہے ذبیحہ کیونکہ دوسرے کھانوں کی حلت اہل کتاب کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔
اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ میں یہود و نصاریٰ داخل ہیں اور صابئین بھی داخل ہیں بشرطیکہ کسی نبی کے دین پر ان کا ایمان اور کسی آسمانی کتاب کا ان کو اقرار ہو ستارہ پرست صابی اس میں داخل نہیں ہیں۔
اہل کتاب سے مراد بھی ہر کتابی ہے حربی ہو یا ذمی عجمی ہو یا عربی تغلبی ہو (یا بکری) امام اعظم کا یہی قول ہے لیکن باقی تینوں اماموں کے نزدیک قبیلہ تغلب کے عیسائیوں کا ذبیحہ حلال نہیں (وہ مشرک تھے) ابن جوزی نے لکھا ہے ہمارے سلسلہ کے اصحابؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عرب کے عیسائیوں کے ذبیحوں کی ممانعت فرما دی۔ ابن جوزی نے حضرت علی کا قول نقل کیا ہے کہ بنی تغلب کے عیسائیوں کا ذبیحہ نہ کھاؤ انہوں نے سوائے شراب پینے کے نصرانیت سے اور کوئی چیز نہیں لی۔ امام شافعیؒ نے بھی صحیح سند سے حضرت علیؓ کا یہ قول نقل کیا ہے عبدالرزاق نے ابراہیم نخعی کے سلسلہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ بنی تغلب کے نصاریٰ کے ذبیحہ کو (کھانے) اور ان کی عورتوں (سے نکاح کرنے) کو مکروہ قرار دیتے تھے۔
میں کہتا ہوں کہ اس بحث کی کوئی مرفوع صحیح حدیث مجھے معلوم نہیں ہوئی اور اگر کوئی صحیح مرفوع حدیث مل بھی جائے تو وہ حدیث آحاد ہوگی جو قرآن کو نسخ نہیں کر سکتی۔
بغوی نے لکھا ہے اللہ کی مراد تمام یہودیوں، عیسائیوں اور ان لوگوں کے ذبیحے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے اہل کتاب کے مذہب میں داخل ہو چکے تھے لیکن حضور ﷺ کی بعثت کے بعد جن غیر لوگوں نے عیسائیت یا یہودیت اختیار کی ان کے ذبیحے حلال نہیں کئے۔
میں کہتا ہوں کہ یہ شرط لغو ہے صاحب ہدایہ نے لکھا ہے مرتد کا ذبیحہ حلال نہیں یعنی جس مسلمان نے اسلام کو چھوڑ کر یہودیت یا عیسائیت یا مجوسیت یا بت پرستی اختیار کر لی ہو۔ اس کے ساتھ کا ذبیحہ نہ کھایا جائے اس کا کوئی دین نہیں وہ اختیار کردہ مذہب پر بھی قائم نہیں رہے گا ہاں کوئی کتابی اگر اپنے مذہب کو چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کر لے تو ذبح کے وقت جو اس کا مذہب ہوگا وہی قابل اعتبار ہوگا۔ گزشتہ مذہب کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ صاحب کفایہ نے لکھا ہے کہ اگر کوئی یہودی یا عیسائی مجوسی ہو جائے تو اس کا ذبیحہ حلال نہ ہوگا وہ اصلی مجوسی مانا جائے گا لیکن اگر کوئی مجوسی یہودی یا عیسائی بن جائے تو اس کا ذبیحہ اور شکار حلال ہو جائے گا۔
مسئلہ :- اگر کوئی یہودی حضرت عزیر کے نام پر یا عیسائی حضرت عیسیٰؑ کے نام پر ذبح کرے تو ذبیحہ حلال نہیں۔ کفایہ میں ہے کتابی کا ذبیحہ اس وقت حلال ہے جب عزیر مسیح (وغیرہ) کے نام پر اس نے ذبح نہ کیا ہو ورنہ حلال نہیں جیسے مسلمان کا وہ ذبیحہ حلال نہیں جو اللہ کے سوا کسی دوسرے کے نام پر ذبح کیا گیا ہو اللہ نے فرمایا وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ۔
بغوی نے لکھا ہے اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا حلال نہیں۔ اکثر اہل علم حلت کے قائل ہیں شعبی، عطاء خراسانی اور مکحول کا یہی قول ہے شعبی سے پوچھا گیا اگر کوئی عیسائی مسیح کے نام پر ذبح کرے تو کیا حکم ہے شعبی نے جواب دیا حلال ہے کیونکہ اللہ نے عیسائیوں کے ذبیحوں کو حلال قرار دیا ہے اور وہ خوب واقف ہے کہ عیسائی (ذبح کے وقت) کیا کہتے ہیں۔
حسن نے فرمایا اگر کوئی یہودی یا عیسائی ذبح کے وقت اللہ کے سوا کسی اور کا نام لے اور تم سن رہے ہو تو اس کو نہ کھاؤ اور اگر

تم وہاں موجود نہ ہو (اور خود نہیں سن رہے ہو) تو کھالو اللہ نے وہ تمہارے لئے حلال کر دیا ہے۔

میں کہتا ہوں ہمارے نزدیک صحیح پہلا قول ہے کہ اگر کوئی کتابی قصداً اللہ کا نام ترک کر دے اور کسی اور کے نام پر ذبح کرے اور یہ بات یقینی معلوم ہو جائے یا ان کی عمومی حالت، یہی ہو (یعنی مسیح وغیرہ کے نام پر ذبح کرنے کا ان کا دستور ہو، خواہ ہم کو یقینی معلوم نہ ہو کہ غیر اللہ کے نام پر انہوں نے ذبح کیا ہے) تو نہ کھاؤ۔ عرب کے عیسائیوں کے ذبیح کھانے کی ممانعت کی بنا یہی ہے اور حضرت علیؓ کے قول مذکور کی بھی یہی علت ہے کیونکہ حضرت علیؓ کو بنی تغلب کے عیسائیوں کی اس حرکت کا شاید علم ہو کہ وہ ذبح کے وقت اللہ کا نام نہیں لیتے یا غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے ہیں عجمی عیسائیوں کے ذبیحہ کا بھی یہی حکم ہے کہ اگر غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنے کا ان کا دستور ہی ہو تو اس ذبیحہ کو نہ کھایا جائے اور یہ حقیقت ہے کہ اس زمانہ کے عیسائی ذبح نہیں کرتے بلکہ چوٹ مار کر قتل کرتے ہیں اس لئے ان کا ذبیحہ حلال نہیں۔

وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ اور تمہارا کھانا ان کے لئے حلال ہے۔

ایک سوال: جب رسول اللہ ﷺ کی بعثت تمام لوگوں کے لئے ہے اور آپ کی شریعت ایک ہی ہے تو پھر بعض کے لئے بعض چیزوں کی حلت اور بعض کے لئے انہی چیزوں کی حرمت کا کیا معنی اور اس اختلاف احکام کی کیا علت ہے۔

جواب: مطلب یہ ہے کہ کچھ چیزیں سب کے لئے حلال ہیں جیسے سمندر کا پانی، اور بعض چیزوں کی حلت کچھ شرطوں کے ساتھ مشروط ہے جیسے نماز کے جواز کے لئے وضو کی شرط ہے یا تمام عبادات کے لئے اللہ رسول پر ایمان رکھنے اور اخلاص نیت کی شرط ہے اور مال کی حلت کے لئے خود اس کا مالک ہونا یا مالک کی اجازت سے کھانا شرط ہے پس مسلمانوں کا ذبیحہ کافروں کے لئے حلال ہے آخرت میں اس ذبیحہ کو کھانے کی وجہ سے ان کو عذاب نہ ہوگا جس طرح ان کاموں کو کرنے کی وجہ سے عذاب نہ ہوگا جو سب لوگوں کے لئے جائز ہیں اور ان کے لئے ایمان کی شرط نہیں ہے مجوسیوں کی ذبیحہ کی حالت اس سے الگ ہے اس کو کھانا مردار کی طرح سب کے لئے ناجائز ہے اس کو کھانے پر کافروں کو عذاب ہوگا۔ جس طرح ایمان لانا فرض ہے اور ترک ایمان پر عذاب ہوگا اور وہ فرائض جن کا وجوب ایمان پر موقوف ہے ادا نہ کرنے پر بھی عذاب ہوگا اور ممنوعات کے ارتکاب پر بھی عذاب ہوگا۔ اللہ نے فرمایا مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ الخ آیت میں جو اہل کتاب کے لئے مسلمانوں کے ذبیحہ کی حلت کی صراحت کی گئی ہے اس کی غرض اس فرق کو ظاہر کرنا ہے جو مسلمانوں کے ذبیحہ اور مسلمانوں کی عورتوں کے درمیان ہے کہ ان کا ذبیحہ تو سب کے لئے حلال ہے مگر مسلم عورتوں سے نکاح کی حلت کے لئے ایماندار ہونے کی شرط ہے۔

زجاج کے نزدیک آیت میں حلت کا خطاب مومنوں سے ہے مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب کو کھانا کھلانا تمہارے لئے حلال ہے بیضاوی نے زجاج کے مطلب کو زیادہ صحیح الفاظ میں واضح کیا ہے کہ اہل کتاب کو کھانا کھلانے اور ان کے ہاتھ فروخت کرنے میں مسلمانوں پر کوئی گناہ نہیں اگر اہل کتاب کے لئے مسلمانوں کا کھانا حلال نہ ہوتا تو پھر مسلمانوں کے لئے اہل کتاب کو کھلانا بھی ناجائز ہوتا۔ حقیقت میں اس کا راز وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کر دیا کہ مسلمانوں کا ذبیحہ کھانے کے لئے ایمان کی شرط نہیں ہے ہاں مسلم عورتوں سے نکاح کے لئے ایماندار ہونے کی شرط ہے۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اور پارسا عورتیں ایمان والیوں میں سے اور پارسا عورتیں ان لوگوں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی۔

اس کا عطف الطَّيِّبٰتُ پر ہے۔ بغوی نے کہا الْمُحْصَنٰت سے کیا مراد ہے۔ علماء کا اس کے متعلق اختلاف ہے اکثر علماء کے نزدیک اس لفظ سے مراد ہیں آزاد عورتیں جو باندیاں نہ ہوں مومن ہوں یا کتابی نیک چلن ہوں یا بدرفتار، مجاہد کا بھی یہی قول ہے۔ مجاہد نے صراحت کی ہے کہ کتابی عورت سے جو باندی ہو نکاح ناجائز ہے کیونکہ اللہ نے آیت بِمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ میں باندیوں سے نکاح کی شرط کے طور پر الْمُؤْمِنٰت کی قید لگائی ہے۔

بعض علماء کے نزدیک الْمُحْصَنٰت سے پاک دامن عورتیں مراد ہیں خواہ مسلمان آزاد ہوں یا باندیاں یا کتابی باندیاں۔

بد چلن عورتیں خواہ مسلمان ہوں یا کتابی بہر حال ان سے نکاح حرام ہے حسن کا یہی قول ہے شعبی نے کہا کہ کتابیہ عورت کے محصن ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ زنا سے پاک دامن ہو اور غسل جنابت کرتی ہو۔

میں کہتا ہوں بغوی کے اس قول کا مدار اس امر پر ہے کہ مفہوم مخالف کا اعتبار کیا جائے (پس آزاد عورتوں سے جواز نکاح کی آیت میں صراحت ہے اور آزاد نہ ہوں باندیاں ہوں تو ان سے نکاح کا عدم جواز بطور مفہوم معلوم ہو جائے گا) مگر امام ابو حنیفہؒ تو مفہوم مخالف کا اعتبار نہیں کرتے اور بد چلن کتابیہ باندی کے ساتھ نکاح کو جائز قرار دیتے ہیں کیونکہ آیت وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ عام ہے (بد چلن کتابیہ باندی بھی اس کے ذیل میں آتی ہے) البتہ امام شافعی کے نزدیک مفہوم مخالف معتبر ہے مگر وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ میں وہ بھی مفہوم مخالف کا اعتبار نہیں کرتے اور مسلم بد چلن عورت سے (خواہ وہ آزاد ہو یا باندی ہو) نکاح کو جائز قرار دیتے ہیں اسی لئے بیضاوی نے لکھا ہے کہ مُؤْمِنٰتِ میں سے مُحْصَنٰتِ کی تخصیص صرف ترغیب اولیٰ کیلئے ہے (یعنی نکاح اگرچہ غیر محصنات مومنات سے بھی جائز ہے مگر محصنات سے نکاح کرنا افضل اور اولیٰ ہے بس محصنات سے نکاح کرنے کی ترغیب کے لئے مومنات کے ساتھ المحصنات کی قید لگائی) لیکن جب وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ میں محصنات کا مفہوم مخالف معتبر نہیں تو وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ میں مفہوم مخالف کا اعتبار کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ واللہ اعلم۔

اس آیت کے عموم کا تقاضا ہے کہ حربی کتابیہ کے ساتھ بھی نکاح جائز ہو اجماع علماء بھی اسی پر ہے۔ [1] حضرت ابن عباسؓ فرماتے تھے کہ حربی کتابیہ کے ساتھ نکاح ناجائز ہے۔ حضرت ابن عمرؓ ہر کتابی عورت سے نکاح کو ناجائز قرار دیتے تھے خواہ آزاد ہو یا باندی، ذمی ہو یا حربی، کیونکہ ہر کتابی عورت مشرکات کے ذیل میں آتی ہے اللہ نے فرمایا ہے قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ (یہودی عزیرؑ کو اللہ کا بیٹا اور نصاریٰ مسیح کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں) اور مشرک عورتوں سے نکاح حرام ہے اللہ نے فرمایا ہے وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ جب تک مشرک عورتیں ایمان نہ لائیں۔ ان سے نکاح نہ کرو۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا آیت مندرجہ میں المحصنت سے مسلمان عورتیں مراد ہیں مگر یہ تفسیر غلط ہے کیونکہ اس کی شہادت لغت سے نہیں ملتی پھر یہ قول اجماع کے بھی خلاف ہے۔ حرہ کتابی عورت سے جواز نکاح پر اجماع ہو چکا ہے اختلاف صرف کتابیہ باندی سے نکاح کرنے میں ہے اس کی تفصیل ہم نے سورۃ النساء میں کی ہے۔ ہاں کتابی عورت سے نکاح باتفاق علماء مکروہ ضرور ہے۔ اس میں ایک کافرہ کے ساتھ ہر وقت کار ہن سہن اور محبت و دوستی کرنی لازم ہے پھر اولاد ہو گی تو وہ اخلاق کفر اختیار کرے گی ہر بچہ اپنی ماں سے مانوس ہوتا اور اس کا طور طریقہ سیکھتا ہے۔ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ حضرت حذیفہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت کعبؓ بن مالک نے کتابی عورتوں سے نکاح کیا تھا حضرت عمرؓ ان پر غصے ہوئے تو ان حضرات نے کہا امیر المومنین ہم طلاق دیئے دیتے ہیں۔ یہ قصہ بتا رہا ہے کہ کتابی عورت سے نکاح درست ہے نکاح درست نہ ہوتا تو طلاق دینے کا کیا معنی۔ ہاں جواز کے ساتھ کراہت بھی معلوم ہوتی ہے (ورنہ حضرت عمرؓ غصے کیوں ہوتے)۔

فائدہ:- صابی عورتوں سے نکاح کے متعلق امام ابو حنیفہؒ اور صاحبین میں اختلاف ہے امام صاحبؒ کا خیال ہے کہ صابی فرقہ زبور کو مانتا ہے اس کا شمار اہل کتاب میں ہے اس لئے نکاح جائز ہے۔ صاحبینؒ ناجائز ہونے کے قائل ہیں کیونکہ ان کے خیال میں صابی ستارہ پرست ہوتے ہیں ان کا شمار مشرکوں میں ہے صاحب ہدایہ نے لکھا ہے اس اختلاف کی بناء صرف اختلاف خیال ہے صابی مذہب کیا ہے اس کی حقیقت کو سمجھنے میں امام اعظمؒ اور ان کے شاگردوں میں اختلاف ہے واقع میں کوئی اختلاف نہیں۔ حضرت ابراہیمؑ و حضرت شیثؑ کے صحیفوں پر ایمان رکھنے والی عورتوں کے ساتھ بھی امام اعظمؒ کے نزدیک نکاح درست ہے۔

مسئلہ:- مستصفی میں ہے کہ عیسائی عورت سے نکاح کا جواز اس وقت ہے جب وہ مسیح کو الٰہ نہ کہتی ہو اگر الوہیت مسیح کا اس کا عقیدہ ہو تو اس سے نکاح ناجائز ہے۔ مبسوط شیخ الاسلام میں ہے اگر اہل کتاب مسیح یا عزیر کو الٰہ کہتے ہوں تو ان کا ذبیحہ نہ کھایا

[1] حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا مسلمان نصرانی عورت سے نکاح کر سکتا ہے مگر عیسائی مرد مسلمان عورت سے نکاح نہیں کر سکتا۔ ۱۲

جائے نہ ان کی عورتوں سے نکاح کیا جائے۔ (وہ مشرک ہیں) بعض علماء نے اسی فیصلہ پر فتویٰ ہونا بیان کیا ہے مگر دلائل (آیات و احادیث) پر اگر نظر کی جائے تو ہر کتابی کا ذبیحہ کھانا اور ہر کتابی عورت سے نکاح کرنا جائز قرار پائے گا۔ (انتہی کلام شیخ الاسلام)۔

ابن ہمام نے شیخ الاسلام کی موافقت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہر نصرانی کا ذبیحہ حلال ہے خواہ وہ تثلیث کا قائل ہو یا نہ ہو۔ آیت میں جو ہر کتابی کے ذبیحہ کو بے قید حلال قرار دیا ہے ابن ہمام کا قول اس کے موافق ہے۔

میں کہتا ہوں یہ بات کھلی ہوئی ہے کہ آیت میں اہل کتاب سے مراد وہ کتابی ہیں جو مشرک نہ ہوں موحد ہوں کیونکہ مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت تو اللہ نے خود کردی ہے فرمایا وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ۔ اور یہ بات کہنا کہ صرف مشرک کتابیہ سے نکاح کی حرمت (وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ سے) منسوخ کردی گئی بعید از دانش ہے بت پرست کے شرک اور کتابی کے شرک میں کوئی فرق نہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ یہودیوں کے متعلق جو اللہ نے قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ اور عیسائیوں کے متعلق قَالَتِ النَّصَارٰى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ فرمایا ہے وہ صرف اہل کتاب کے دو فرقے تھے (یعنی یہودیوں کا ایک مختصر فرقہ عزیر کو ابن اللہ اور عیسائیوں کا ایک قلیل گروہ مسیح کو ابن اللہ کہتا تھا) جن کا اب کہیں وجود نہیں ابن ہمام نے لکھا ہے ہمارے ملک کے یہودی توحید کے قائل ہیں اور اللہ کو عزیر کا باپ ہونے سے پاک کہتے ہیں۔ ہاں نصاریٰ میں سے ہم نے کوئی شخص ایسا نہیں پایا جو مسیح کے ابن اللہ ہونے کا قائل نہ ہو۔ حضرت علیؓ نے جو بنی تغلب کے عیسائیوں کا ذبیحہ کھانے اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنے کی ممانعت فرمائی تھی اس سے ہمارے مذکورہ بالا قول کی تائید ہوتی ہے (کہ عیسائی مسیح کی ابنیت کے قائل ہیں)۔

اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ جبکہ تم ان کے مہر ادا کر دو۔

حلت نکاح کو ادائے مہر سے مشروط کرنے سے غرض دو باتوں کا اظہار ہے مہر کے وجوب کی تاکید اور ادائے مہر کے افضل و اولیٰ قرار دینے کے بعد ادائیگی کی ترغیب۔ بعض علماء نے کہا ادائے مہر سے مراد ہے مہر کا اقرار اور التزام کر لینا اور اقرار مہر نکاح سے ہوتا ہے گویا یوں فرمایا کہ جب تم تحلیل فروج کے ارادہ سے نکاح کرو۔

مُحْصِنِيْنَ اس طرح سے کہ تم بیوی بناؤ۔

غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ نہ تو علانیہ بدکاری کرو یعنی زناء کے ذریعہ سے پانی کو بہاتے اور ضائع کرتے نہ پھرو کہ کوئی مزنیہ ہو تم اس سے زنا کرو۔

وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ نہ خفیہ آشنائی یعنی مقررہ داشتہ عورتوں سے زنا کرنے والے نہ ہوں۔

خدن کا اطلاق مرد و عورت دونوں پر ہوتا ہے۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ اور جو ایمان یعنی قوانین اسلام کا انکار کرے گا۔

فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ اسکے اعمال (یعنی نیک اعمال) اکارت جائیں گے کیونکہ قبول اعمال کیلئے ایمان کی شرط ہے۔

وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۵ اور وہ آخرت میں گھاٹا پانے والوں میں سے ہوگا حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس کے ثواب میں گھاٹا ہوگا۔

ع ۵

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اے ایمان والو! جب تم نماز کو اٹھنے لگو۔ بخاری نے قاسم کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا ہم مدینہ کو آرہے تھے کہ میرا ہار کہیں صحرا میں گر پڑا اس لئے رسول اللہ ﷺ کو پڑاؤ کرنا پڑا اور آپ فروکش ہوگئے (لوگ ہار کی تلاش کرنے لگے) حضور فروکش ہونے کے بعد میری گود میں سر رکھ کر سو گئے۔ اتنے میں ابوبکرؓ آئے اور میرے مکے مارنے لگے اور فرمانے لگے تو نے ایک ہار کے لئے لوگوں کو روک رکھا ہے کچھ دیر کے بعد رسول اللہ ﷺ بیدار ہوگئے اور صبح کی نماز کا وقت آگیا۔ وضو کے لئے پانی تلاش کیا گیا مگر پانی نہیں ملا اس پر آیت مذکورہ

نازل ہوئی اسید بن حضیرؓ نے کہا اے ابو بکرؓ کے گھرانے والو! تمہاری وجہ سے اللہ نے لوگوں کو برکت عطا فرمائی۔ اس بیان میں صراحت ہے کہ سورۂ مائدہ کی اس آیت کا نزول حضرت عائشہؓ کے ہار کے سلسلہ میں ہوا سورۂ نساء کی آیت کا نزول ہار کے سلسلہ میں نہیں ہوا۔ اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ نساء والی آیت سے پہلے اس آیت کا نزول ہوا اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت ابو بکرؓ حضرت عائشہؓ پر ان الفاظ سے عتاب نہ کرتے کہ تو نے لوگوں کو روک دیا ہے پانی پر پڑاؤ بھی نہیں اور پانی ساتھ بھی نہیں ہے نہ حضرت اسید حضرت عائشہؓ کے شکر گزار ہوتے۔

طبرانی نے بھی حضرت عائشہؓ کی روایت سے ایسی حدیث نقل کی ہے اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ اللہ نے آیت تیمم نازل فرمائی اور حضرت ابو بکرؓ نے (حضرت عائشہ سے) فرمایا بلا شبہ تو برکت والی ہے۔

آیت میں نماز کے لئے کھڑے ہونے سے مراد ہے کھڑے ہونے کا ارادہ کرنا جیسے آیت وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ میں قرآن پڑھنے سے مراد ہے پڑھنے کا ارادہ کرنا۔ ایجاز کے پیش نظر ارادہ کی تعبیر فعل سے کی (ارادہ سبب فعل ہے اور فعل اس کا نتیجہ، نتیجہ بول کر سبب مراد لینا ضابطہ مجاز مرسل ہے) اس تعبیر سے اس بات پر بھی تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ جو شخص عبادت کا ارادہ کرے اس کو فوراً عبادت کر ہی لینا چاہئے ارادہ اور عبادت میں فصل نہ ہونا چاہئے۔

ظاہر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص بھی نماز پڑھنے کا ارادہ کرے اس پر وضو کرنا واجب ہے خواہ طاہر باوضو ہو یا غیر طاہر بے وضو۔ حالانکہ اجماع علماء اس کے خلاف ہے (بے وضو پر وضو واجب ہے اور باوضو کے لئے تجدید وضو مستحب) صحیح روایت سے ثابت ہے کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ نے چند نمازیں ایک وضو سے پڑھیں اور چمڑے کے موزوں پر مسح کیا اس سے پہلے آپ ہر نماز کے لئے (تازہ) وضو کیا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا۔ آج حضور ﷺ نے ایسا عمل کیا جو پہلے نہیں کرتے تھے فرمایا عمرؓ میں نے ایسا قصداً کیا ہے (رواہ مسلم واصحاب السنن الار . بعۃ من حدیث بریدۃؓ)

اس ظاہری تضاد کو دور کرنے کے لئے علماء نے آیت کی تفسیر مختلف طور پر کی ہے۔ بعض نے کہا امر وجوب کے لئے ہے مگر یہ وجوب شروع میں تھا پھر منسوخ ہو گیا (اور باوضو کے لئے تجدید وضو مستحب ہو گئی) اس پر حضرت غسیل الملائکہ عبداللہ بن حنظلہ کی حدیث دلالت کر رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ہر نماز کے لئے تازہ وضو کرنے کا حکم دیا گیا تھا باوضو ہوں یا بے وضو جب اس سے حضور کو دشواری ہوئی تو ہر نماز کے لئے (صرف) مسواک کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ رواہ احمد وابوداؤد وابن خزیمہؒ وابن حبان فی صحیحہما والحاکم فی المستدرک۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ امر استحباب کے لئے ہے (باوضو آدمی کے لئے ہر نماز کے واسطے تازہ وضو کرنا مستحب ہے) اور نمازی اگر باوضو بھی ہو تب بھی باجماع علماء وضو کرنا مسنون یا (کم سے کم) مستحب ہے۔ مسنون ہونے پر حضرت انسؓ کی حدیث دلالت کر رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز کے لئے (تازہ) وضو کرتے تھے۔ رواہ النسائی وصححہ۔

مستحب ہونے پر حضرت ابن عمرؓ کی روایت دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص پاک ہونے کے باوجود وضو کرتا ہے اللہ اس کے لئے دس نیکیاں لکھ دیتا ہے۔ رواہ النسائی باسناد ضعیف بعض علماء نے لکھا ہے کہ وضو کا حکم اس جگہ اگرچہ بے قید ہے لیکن معنوی حیثیت سے تقید مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بے وضو ہونے کی حالت میں اگر نماز کو اٹھنے لگو تو وضو کر لو۔ اس مطلب پر رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے کہ جب کوئی بے وضو ہو تو اللہ اس کی نماز قبول نہیں کرتا تاوقتیکہ وہ وضو نہ کر لے۔ رواہ الشیخان فی صحیحہما وابوداؤد والترمذی عن ابی ہریرۃؓ۔

زید بن اسلمؒ کے نزدیک آیت کا معنی اس طرح ہے جب تم سو کر اٹھو نماز کیلئے تو...... بعض علماء نے کہا حقیقت میں یہ اللہ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ہے کہ تم پر وضو اسی وقت واجب ہے جب نماز کا ارادہ ہو اور کسی عمل کیلئے وضو واجب نہیں گویا یہ اللہ کی طرف سے اجازت ہے کہ نماز کے علاوہ جو عمل کرنا چاہو بے وضو ہونے کی حالت میں کر سکتے ہو (یعنی ممنوعات کے علاوہ) حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے۔ ہم حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے آپ قضائے حاجت سے واپس آئے تھے کھانا

خدمت میں پیش کیا گیا اور عرض کیا گیا کیا حضورؐ وضو کریں گے فرمایا میں نماز پڑھنی چاہتا ہوں تو وضو کرتا ہوں۔ رواہ البغوی۔

فائدہ :- اس آیت کے نزول سے پہلے ہی وضو واجب تھا جیسا بخاری کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے جو آیت کی شان نزول میں حضرت عائشہؓ کے متعلق انہوں نے نقل کی ہے اسی وجہ سے کسی پانی پر فروکش نہ ہونے سے صحابہؓ کو تکلیف ہوئی تھی (کہ وضو کیسے کریں) ابن عبدالبر نے بیان کیا ہے تمام اہل مغازی کے علم میں ہے کہ جب سے نماز فرض ہوئی حضورؐ نے بے وضو کے کوئی نماز نہیں پڑھی وضو کی فرضیت نماز کی فرضیت کے ساتھ ہی ہوئی تھی۔ اس صورت میں وضو کا اس جگہ حکم باوجودیکہ اس سے پہلے بھی کوئی نماز بغیر وضو کے نہ تھی۔ محض اس لئے ہے کہ وضو کی فرضیت عبارت سے ثابت ہو جائے اگرچہ عمل سے پہلے بھی ثابت تھی) میں کہتا ہوں وضو کا ذکر تیمم کی تمہید کے لئے بھی کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ تو اپنے چہروں کو دھوؤ۔ دھونے کا مفہوم ہے پانی گزار دینا۔ تینوں اماموں کے نزدیک ملنا شرط ہے۔ امام مالک (رحمہ اللہ) کے نزدیک ملنا ضروری ہے چونکہ قرآن میں ملنے کا ذکر نہیں اس لئے امام مالکؒ کا قول بے دلیل ہے۔ وجہ مواجہت سے مشتق ہے وجہ کی حد پیشانی کے بالوں کی جڑوں سے ٹھوڑی کے نیچے تک اور ایک کان سے دوسرے کان تک ہے۔ اگر کان اور ڈاڑھی کا درمیانی حصہ دھونے سے رہ جائے گا تو علاوہ امام مالک کے تینوں اماموں کے نزدیک وضو نہ ہوگا۔ امام مالک کا قول اس کے خلاف ہے۔ ابرو کے نیچے پلکوں کے اندر اور مونچھوں میں پانی پہنچانا لازم ہے۔ اگر ڈاڑھی چھدری ہو کہ اندر کی کھال نظر آتی ہو تو کھال تک پانی پہنچانا ضروری ہے اور اگر گھنی ہو کہ کھال نظر نہ آتی ہو تو جلد تک پانی پہنچانا ضروری نہیں جیسے سر کے بالوں پر مسح کرنا سر کے مسح کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ اس کی دلیل ایک تو اجماع علماء ہے دوسرا عمل رسول کہ رسول اللہ ایک لپ سے منہ دھو لیا کرتے تھے۔ رواہ البخاری من حدیث ابن عباسؓ۔ حالانکہ ریش مبارک بہت گھنی تھی۔ ذکرہ القاضی عیاض۔ قاضی عیاض کے قول کی تائید بکثرت صحابہؓ کے اقوال سے ہوتی ہے جو صحیح سندوں کے ساتھ آئے ہیں۔

مسلم نے حضرت جابرؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ڈاڑھی کے بال بہت تھے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ڈاڑھی گھنی ہو تو یک لپ پانی ہر بال کی جڑ تک پہنچانا تو ممکن ہی نہیں۔ کھال کے عوض ڈاڑھی کے اوپری سطح کو دھو لینا جمہور کے نزدیک واجب ہے جس طرح سر کے بال کا مسح بجائے سر کی کھال کے واجب ہے۔ ایک روایت میں امام اعظمؒ کا بھی یہی قول ہے۔ صاحب ظہیریہ نے اسی پر فتویٰ ہونا نقل کیا ہے صاحب بدائع نے لکھا ہے کہ اس قول کے علاوہ دوسرے اقوال سے امام صاحب کا رجوع کر لینا ثابت ہے۔ ایک روایت میں امام صاحبؒ کا قول اس طرح آیا ہے کہ چوتھائی ڈاڑھی کا مسح کرنا واجب ہے۔ دوسری روایت میں تہائی ڈاڑھی کے مسح کا وجوب آیا ہے۔ تیسری روایت میں آیا ہے کہ ڈاڑھی کو نہ دھونا واجب ہے نہ مسح کرنا ڈاڑھی کے اوپری حصہ کو دھونے کے وجوب کی دلیل یہ ہے کہ ڈاڑھی کے اندر کی کھال کو دھونا بالاجماع ساقط ہے اور اجماع کی تائید عمل رسول اللہ ﷺ سے بھی ہوتی ہے کہ آپ ایک لپ سے چہرہ دھو لیا کرتے تھے اور سر کے بالوں کے مسح پر قیاس کرنے سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ بالوں کے اندر کھال کو دھونا واجب نہیں۔ کیونکہ سر کی کھال پر مسح کرنے کی جگہ جب بالوں پر مسح کرنے کو دے دی گئی اور سر کا مسح ساقط کر دیا گیا تو کوئی وجہ نہیں کہ چہرہ کی کھال کو دھونے کی جگہ ڈاڑھی کے بیرونی حصہ کو دھونا ضروری نہ قرار دیا جائے ورنہ فرع کی ترجیح اصل پر لازم آئے گی۔ حدیث بھی بتا رہی ہے کہ ایک لپ پانی سے رسول اللہ ﷺ چہرہ مبارک دھو لیا کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ ڈاڑھی تو ضرور دھوتے ہی تھے اس سے ثابت ہو گیا کہ بجائے اندرونی جلد کے صرف ڈاڑھی (کے بیرونی حصہ) کو دھو لینے پر اجماع بلاسند نہیں قیاس کا بھی یہ تقاضا ہے اور حدیث کا بھی۔

وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک۔

پوروں کے سروں سے بغل تک۔ پورے عضو کا نام ہاتھ ہے اور مرافق کو حد قرار دینے سے ہاتھ کا باقی حصہ یعنی بازو ساقط ہو گیا اور چاروں اماموں کے نزدیک کہنیوں کا دھونا واجب رہا۔ جمہور علماء کا یہی قول ہے۔ ہاں شعبی اور محمد بن جریر کا قول ایک روایت میں آیا ہے کہ ان دونوں حضرات کے نزدیک کہنیاں دھونا واجب نہیں۔ امام زفر بھی اسی کے قائل تھے کیونکہ الیٰ کا

لفظ غایت (آخری حد) پر دلالت کرتا ہے اور آخری حد اول حصہ سے (جس کی وہ حد ہوتی ہے) خارج ہوتی ہے جیسے اَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ میں (رات کا کوئی حصہ صوم کے حکم میں داخل نہیں، رات کا آغاز حکم صوم کی آخری حد ہے) اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ محقق علماء عربیت کہتے ہیں کہ لفظ الیٰ کی وضع صرف آخری حد کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ آخری حد حکم میں داخل ہے یا خارج اس پر لفظ الیٰ دلالت نہیں کرتا۔ یہ بات خارجی قرینہ سے معلوم ہوتی ہے اور آیت میں حد کو داخل کرنے والا کوئی قرینہ نہیں۔ اس لئے حد کے داخل اور خارج ہونے کا برابر احتمال ہے اور احتمال سے حکم ثابت نہیں ہوتا۔

ہم کہتے ہیں اجماع بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ الیٰ کا مابعد ماقبل کے حکم میں داخل ہے امام شافعیؒ نے اپنی کتاب الاُمّ میں لکھا ہے کہ وضو میں کہنیوں کو دھونے سے اختلاف کرنے والا کوئی شخص مجھے معلوم نہیں (یعنی ہر عالم کے نزدیک کہنیاں دھونی واجب ہیں)۔

شعبی اور محمد بن جریر اور امام زفر کا اختلاف اگر صحیح روایت سے ثابت بھی ہو جائے تب بھی سلف و خلف کے اجماع کے مقابلہ میں یہ اختلاف ہیچ ہے۔ امام مالکؒ سے کوئی ایسا قول منقول نہیں جس سے صراحتاً کہنیوں کا خارج ہونا ثابت ہوتا ہو صرف اشہب نے ایسے الفاظ نقل کئے ہیں جو (دونوں معنی کے) محتمل ہیں پھر اجماع بلاسند نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا عمل اس کی سند موجود ہے اور فعل رسول سے کتاب کے مجمل حکم کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ دار قطنی نے حسن سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے وضو میں دونوں ہاتھ کہنیوں تک اس طرح دھوئے کہ بازو کے سروں سے مس ہو گیا (بازو کے سر چھو گئے) اور فرمایا رسول اللہ ﷺ کا وضو اسی طرح تھا۔ دار قطنی نے حضرت جابرؓ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ وضو کرتے وقت کہنیوں پر پانی گزار دیتے تھے اس روایت کی سند میں ضعف ہے۔

بزار اور طبرانی نے حضرت وائل بن حجر کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دونوں باہیں کہنیوں سے آگے تک دھوئیں طحاوی اور طبرانی نے ثعلبہ بن عباد کے باپ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے۔ پھر آپ دونوں باہیں اس حد تک دھوتے کہ پانی کہنیوں پر بہا لیتے تھے رسول اللہ ﷺ یا کسی صحابی کا کوئی عمل ایسا منقول نہیں کہ کسی نے وضو میں کہنیاں یا ٹخنے نہ دھوئے ہوں اس عمل سے کتاب کے مجمل حکم کی وضاحت کامل طور پر ہوتی ہے اسی لئے بعض مفسرین نے صراحت کی ہے کہ اس آیت میں دونوں جگہ (إِلَى الْمَرَافِقِ اور إِلَى الْكَعْبَيْنِ) الیٰ کا معنی ہے مع جیسے دوسری آیت وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ میں یا آیت وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ میں اور آیت مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ میں الیٰ کا معنی ہے مع۔

وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ اور اپنے سروں پر مسح کرو۔ اس آیت سے سر کا مسح واجب ہوتا ہے کتنے سر کا مسح واجب ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک اور امام احمدؒ کے نزدیک پورے سر کا مسح واجب ہے کیونکہ سر کا مفہوم متعین ہے اور بِرُءُوسِكُمْ میں باء زائد ہے لہٰذا پورے سر کا مسح کرنا واجب ہے جیسے چہرہ دھونے کے حکم میں پورے چہرہ کو دھونا واجب ہے اور تیمم میں پورے چہرے کا مسح واجب ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا پورے سر پر مسح کرنا اس قول کی تائیدی دلیل ہے۔ حضرت عبداللہ بن زید راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دونوں ہاتھوں سے سر کا مسح کیا سر کے اگلے حصہ پر دونوں ہاتھ آگے سے پیچھے کو لے گئے اور پیچھے سے آگے کو لائے پھر دونوں ہاتھ گدی تک لے گئے اور گدی سے اس مقام تک واپس لائے جہاں سے شروع کیا تھا۔ متفق علیہ۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ نے فرمایا کہ بِرُءُوسِكُمْ میں باء الصاق کی ہے اور باجماع علماء عربی باء کا حقیقی معنی الصاق ہی ہے حقیقی معنی کو چھوڑ کر مجازی معنی کی طرف رجوع بے وجہ نہیں کیا جا سکتا اور باء الصاق اکثر وسائط (اور آلات و ذرائع) پر داخل ہوتی ہے (مفعول پر داخل نہیں ہوتی) اور وسائط کا استیعاب (احاطہ اور ہر طرف سے تکمیل) مقصود نہیں ہوتی اسی لئے اگر باء الصاق محل (مکان) پر داخل ہو (جیسے مَرَرْتُ بِالسُّوقِ) تو پورا محل مقصود نہیں ہوتا لہٰذا پورے سر کا مسح کرنا آیت میں مراد نہیں ہو سکتا) اس قول کی تائید رسول اللہ ﷺ کے عمل سے ہوتی ہے حضرت مغیرہ بن شعبہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے

وضو کیا تو اپنی پیشانی (یعنی سر کے اگلے حصہ) پر اور چمڑے کے دونوں موزوں پر اور عمامہ پر مسح کیا (رواہ مسلم)۔
امام شافعیؒ نے عطاء کی مرسل روایت نقل کی ہے مگر اس کی تائید ایک اور متصل روایت سے ہوتی ہے جو ابوداؤد نے حضرت انسؓ کے حوالہ سے لکھی ہے مگر اس سند میں ایک راوی ابو معقل مجہول ہے۔
سعید بن منصور کا بیان ہے کہ حضرت عثمانؓ سے وضوء کی کیفیت دریافت کی گئی تو آپ نے وضو کیا اور سر کے اگلے حصہ پر مسح کیا۔ اس حدیث کی سند میں خالد بن یزید بن ابی مالک ہے جو مختلف فیہ شخصیت ہے۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ابن منذر وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے سر کے کچھ حصہ پر مسح کو کافی سمجھا یعنی صرف کچھ حصہ پر مسح کیا۔ اور یہ روایت صحیح بھی ہے۔ کسی صحابی کی طرف سے اس کا انکار کسی صحیح روایت میں نہیں آیا ابن حزم نے اس کی صراحت کی ہے۔
باقی وہ احادیث جن میں پورے سر پر مسح کو مستحب کہا جائے گا۔ پورے سر پر مسح کرنے کا وجوب ان سے ثابت نہیں ہوتا۔
مذکورہ بالا توضیح سے ثابت ہو گیا کہ آیت میں پورے سر کا مسح مراد نہیں۔ سر کے کچھ حصہ کا مسح کافی ہے لیکن آیت میں کچھ کی تعیین نہیں ہے، اسی لئے امام شافعیؒ نے فرمایا کہ اگر ایک بال یا تین بالوں پر مسح کر لیا تو کافی ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک آیت مجمل ہے (تفصیل طلب) حضرت مغیرہ والی حدیث اور اس کی ہم معنی دوسری روایات اجمال آیت کو دور کر رہی ہیں اسی لئے ہم چوتھائی سر پر مسح کرنے کو واجب کہتے ہیں (سر کا اگلا حصہ سر کا ایک چوتھائی ہوتا ہے) اگر آیت کو مطلق قرار دیا جائے گا تو دو ایک بالوں کا مسح بھی کافی ہو گا حالانکہ یہ امر بدیہی ہے کہ پورے چہرے کو دھونے سے سر کے اگلے حصہ کے چند بال خود دھل جاتے ہیں (پھر مسح راس کا مستقل ذکر کرنے کی کوئی وجہ نہیں)۔
وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ط اور دونوں ٹخنوں تک اپنے پاؤں دھوؤ۔
اَرْجُلَكُمْ لام کے زبر کے ساتھ، نافع، ابن عامر، کسائی، یعقوب اور حفص کی قرات ہے۔ اَيْدِيَكُمْ پر اس کا عطف ہے۔ اس لئے کہ پاؤں کی حد کعبین کو اسی طرح قائم کیا ہے جس طرح اَيْدِيَكُمْ کی حد اِلَى الْمَرَافِقِ کو قائم کیا ہے لہٰذا دونوں جگہ دھونا ہی مراد ہے اگر رُءُوْسِكُمْ پر عطف اور اَرْجُلِكُمْ لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا جائے تو پھر پاؤں کے مسح کی حد نہ ہونی چاہئے جیسے سر کے مسح کی حد نہیں بیان کی گئی۔
باقی قاریوں نے لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے مگر عطف اَيْدِيَكُمْ پر ہی قرار دیا ہے جیسے اِنِّيْ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ میں اليم کو زیر کے ساتھ قرب یوم کی وجہ سے پڑھا ہے اگرچہ یہ صفت عذاب کی ہے پس اَرْجُلِكُمْ میں لام کا زیر بھی رُءُوْسِكُمْ کے قرب کی وجہ سے ہے اگرچہ اس کا عطف اَيْدِيَكُمْ پر ہے۔

ایک شبہ......

اکثر اہل نحو نے جوار اور قرب کی وجہ سے مکسور پڑھنے کو ناجائز قرار دیا ہے اور جس نے جائز بھی کہا ہے تو دو شرطوں کے ساتھ (۱) حرف عطف درمیان میں نہ ہو (اور یہاں حرف عطف موجود ہے) (۲) اشتباہ نہ پیدا ہوتا ہو (اور یہاں لام کے کسرہ پڑھنے سے اشتباہ ہوتا ہے کہ معلوم نہیں اس کا عطف رُءُوْسِكُمْ پر ہے یا اَيْدِيَكُمْ پر)۔
جواب :- یہ دعویٰ کرنا کہ اکثر اہل نحو نے کسرہ جوار کا انکار کیا ہے، ناقابل تسلیم ہے، اور جب حد (الی الکعبین) کو ذکر کر دیا تو اشتباہ باقی نہیں رہا۔ پھر جب جوار کی وجہ سے کسرہ کا استعمال قرآن کی بکثرت آیات اور بڑے بڑے اہل بلاغت کے کلام میں موجود ہے تو اس کا انکار محض مکابرہ اور عناد ہے جس کی تفصیل امثلہ موجب طوالت ہے۔ ہاں حرف عطف درمیان میں نہ آیا ہو، یہ شرط ضرور اختلافی ہے بعض اہل علم اس کے قائل ہیں۔ کیونکہ حرف عطف کی موجودگی میں بھی حق جوار قائم رہتا ہے۔ حرف عطف سے تو اتصال پختہ ہوتا ہے۔ قطع اتصال نہیں ہوتا۔ ابن مالک اور خالد ازہری نے کہا کہ من جملہ دیگر حروف کے واؤ کے خصوصیات گیارہ ہیں جن میں سے ایک حق جوار ہے جو معطوف بالواؤ میں قائم رہتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ واؤ کے درمیان میں آنے کے بعد حق جوار کے باقی رہنے کی اگر کوئی مزید دلیل نہ بھی ہو تب بھی پاؤں دھونے کا وجوب اس آیت سے ثابت ہو ہی جاتا ہے اور وجوہ ثبوت وہ ہیں جو ہم نے اوپر درج کر دیں کہ اَرْجُلَكُمْ کا عطف اَيْدِيَكُمْ پر ہے رُءُوْسِكُمْ پر نا جائز ہے اور احادیث میں اس کا بیان آ چکا ہے اور اجماع بھی منعقد ہو چکا ہے لہٰذا حرف عاطف کے درمیان میں آنے کے بعد بھی حق جوار کا بقاء انہی وجوہ سے ثابت شدہ حقیقت ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ کعبین سے مراد وہ دو ہڈیاں ہیں جو پنڈلی اور قدم کے ملنے کی جگہ (دونوں طرف) ابھری ہوئی ہیں، ان دونوں ہڈیوں تک مسح کرنے کا کوئی قائل نہیں۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ (اگر اَرْجُلَكُمْ کا عطف اَيْدِيَكُمْ پر کیا جائے گا تو) اس وقت کلام کی ترکیب اسی قسم کی ہو گی جیسی ضَرَبْتُ زَيْدًا وَّ عَمْرًا وَ اَكْرَمْتُ بَكْرًا وَّ خَالِدًا کی ہے جبکہ خالدًا کا عطف زیدًا پر قرار دیا جائے۔ یہ قول غلط ہے کیونکہ کوئی قرینہ نہیں کہ خالدًا کا عطف زیدًا پر ہی قرار دیا جائے اگر بکرًا پر عطف مانا جائے تو کوئی مانع نہیں۔

بعض علماء کا قول ہے کہ اَرْجُلَكُمْ کو اگر منصوب پڑھا جائے تب بھی اس کا عطف رُءُوْسِكُمْ کے محل پر ہو گا (اور رُءُوْسِكُمْ محلاً منصوب ہے) یا یوں کہا جائے گا کہ اس جگہ سے حرف جر کو نکال کر منصوب کر دیا گیا ہے، یہ توجیہ بھی غلط ہے کیونکہ اصل یہ ہے کہ لفظ پر عطف ہو، بلا قرینہ اور بے وجہ محل پر عطف صحیح نہیں اور بے وجہ حرف جر کو حذف کرنا درست ہے اور یہاں کوئی وجہ اور قرینہ موجود نہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اَرْجُلَكُمْ سے پہلے امسحوا محذوف ہے مگر یہ بھی غلط ہے۔ بغیر قرینہ کے فعل خاص کو محذوف ماننا درست نہیں۔ پھر ان تمام توجیہات میں شرط یہ ہے کہ خلاف مقصود کا اشتباہ نہ پیدا ہو اور اَرْجُلَكُمْ کو کسی تاویل کے ساتھ بھی اگر مسح کے تحت داخل کیا جائے تو مقصود سے التباس باقی رہتا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک وَاَرْجُلَكُمْ میں واؤ بمعنی مع ہے (یعنی واؤ مصاحبت کا ہے) مگر یہ بھی غلط ہے کیونکہ مفعول معہ کے لئے صرف فعل کا اشتراک کافی نہیں ہے بلکہ زمانہ یا مکان بھی ایک ہونا ضروری ہے۔ زمانہ کے اتحاد کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ (عطف بالواؤ میں) با ترتیب واجب ہو گی اس صورت میں مراد پاؤں کے زمانے میں تقدیم تاخیر ضروری ہو گیا اتحاد زمانہ نہ ہو گا یا مطلق فعل مراد ہو گا اس وقت زمانے کا مفہوم ہی نہ ہو گا نہ ترتیب کے ساتھ نہ بلا ترتیب یا اتحاد مکان تو دونوں مسحوں کا ایک مکان ہونا کسی کا بھی قول نہیں

اگر مذکورہ بالا ضعیف توجیہات کو مان کر رُءُوْسِكُمْ پر عطف تسلیم بھی کر لیا جائے تب وہ باء جو بِرُءُوْسِكُمْ میں ہے (الصاق کیلئے ہو گی اور الصاق کی باء) اکثر آلات پر داخل ہوتی ہے (اور روس کو آلہ سے تشبیہ دے کر اس کے قائم مقام مانا جائے گا) لہٰذا کل سر مراد نہیں ہو سکتا بلکہ باء تبعیض کے لئے ہو گی (اور سر کا بعض غیر معین حصہ مراد ہو گا) اسی لئے اکثر فقہاء کے نزدیک سر کے کچھ حصہ کا مسح فرض ہے لیکن اَرْجُلَكُمْ میں پہنچ کر اسلوب کلام بدل جائے گا اور پورا قدم مراد ہو گا۔ معطوف میں اسلوب کلام کا تغیر اسی کا مقتضی ہے اور دونوں پورے قدموں پر کسی کے نزدیک مسح واجب نہیں۔ فرقہ امامیہ کے نزدیک اَرْجُلَكُمْ (لام کے زبر کے ساتھ) کا عطف رُءُوْسِكُمْ پر ہے اور لام کے زبر کی ان لوگوں نے ضعیف توجیہات بیان کی ہیں۔

ہمارے مسلک کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرو بن عنبہؓ نے فضیلت وضو کے سلسلہ میں ایک طویل حدیث نقل کی ہے جس کے آخر میں حضور ﷺ نے فرمایا پھر دونوں قدم دھولے جیسا کہ اللہ نے حکم دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے پاؤں دھونے کی حدیث بطور تواتر منقول ہے اور اتنے راویوں نے پاؤں دھونے کی احادیث نقل کی ہیں جن کا کذب پر اتفاق بعید ہے اور قدمین پر مسح کرنے کی ایک حدیث بھی منقول نہیں۔ صحابہؓ کا بھی (عملاً) پاؤں دھونے پر اجماع ہے۔ ایک کا خلاف بھی کہیں روایت میں نہیں آیا۔ صرف حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، اور حضرت انسؓ کے اقوال ضرور مسح قدمین کے آئے ہیں، مگر ان بزرگوں کا اپنے قول سے رجوع کر لینا بھی ثابت ہو چکا ہے۔ سعید بن منصور، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے بیان کیا کہ حضرت علیؓ نے وَاَرْجُلَكُمْ پڑھا حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے (اس قرات کی وجہ سے مسح سے) قدم دھونے کی طرف رجوع کر لیا۔

ابو عبد الرحمٰن سلمی کی روایت ہے کہ حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسین نے وَاَرْجُلَكُمْ پڑھا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے سن کر فرمایا اَرْجُلَكُمْ اس کلام میں (بعض حصوں کی) تقدیم تاخیر ہے (یعنی اَرْجُلَكُمْ رُءُوْسِكُمْ سے حکماً پہلے ہے

اگرچہ ذکر میں مؤخر ہے) اس وقت حضرت علیؓ لوگوں کے کسی مقدمہ کا فیصلہ کر رہے تھے۔ رواہ ابن جریر۔ عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ کا بیان کہ قدموں کے دھونے پر تمام صحابہؓ کا اجماع ہے۔ رواہ سعید بن منصور، ابن ابی شیبہ نے حکم کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کا طریقہ گذشتہ زمانہ سے پاؤں دھونے کا چلا آرہا ہے۔

ابن جریر کی روایت ہے کہ عطاء نے کہا میں نے کسی کو قدموں پر مسح کرنے کی اجازت نہیں دی۔ طحاوی اور ابن حزم نے دعویٰ کیا ہے کہ مسح (پہلے تھا پھر) منسوخ کر دیا گیا۔ ابن جریر نے حضرت انسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قرآن (بظاہر) مسح (کا حکم) لے کر نازل ہوا اور سنت قدم دھونے کا (حکم لے کر آئی) حضرت انسؓ کا یہ قول بتا رہا ہے کہ (بظاہر) قرآن کی آیت مسح قدمین پر دلالت کر رہی ہے اور رسول اللہ ﷺ قدم دھویا کرتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کا ایسا عمل اسی وقت ممکن ہے کہ آیت میں پاؤں دھونا مراد ہو یا مسح کا حکم منسوخ ہو گیا ہو۔

ہمارے قول کا ثبوت حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث سے بھی ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ پیچھے رہ گئے اور اس وقت پہنچے جب نماز بالکل قریب تھی اور ہم وضو کر رہے تھے اس لئے ہم پاؤں پر مسح کرنے لگے حضور ﷺ نے انتہائی اونچی آواز سے فرمایا (خشک) ایڑیوں کے لئے دوزخ کا (طبقہ) ویل ہے (یا عذاب دوزخ ہے) متفق علیہ۔

روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کچھ لوگوں کی طرف سے گذرے جو وضو کر رہے تھے آپ نے فرمایا وضو پورا پورا کرو۔ میں نے حضور ابوالقاسم ﷺ سے سنا ہے آپ فرما رہے تھے (خشک) ایڑیوں کے لئے عذاب دوزخ ہے۔ متفق علیہ۔ حضرت جابرؓ و حضرت عائشہؓ کی روایت میں بھی یہ حدیث انہی الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔

قدموں پر مسح کے قائل اپنے قول کے ثبوت میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ حضرت اوسؓ بن ابی اوسؓ نے بیان کیا، میں نے خود دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے وضو کیا اور نعلین مبارک پر مسح کیا، پھر نماز کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، ابوداؤد کی روایت میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے نعلین اور پاؤں پر مسح کیا۔

ہم کہتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ نعلین مبارک پورے قدموں پر حاوی تھیں اور چمڑے کے موزوں کی طرح ہو گئی تھیں اس لئے آپ نے ان پر مسح کیا۔ جس طرح موزوں پر مسح کیا جاتا ہے۔

اگر شبہ کیا جائے کہ یعلی کی روایت میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے وضو کیا اور دونوں پاؤں پر مسح کیا یہ حدیث ہیثم نے بحوالہ یعلی بیان کی ہے، ہم کہیں گے کہ امام احمد نے کہا ہیثم تدلیس کرتا ہے، شاید کسی بے وقوف سے ہیثم نے یہ حدیث سنی ہو پھر اس کا نام ساقط کر دیا (اور خود دعویٰ کیا کہ میں نے یعلی سے سنا ہے) یا حدیث کا مطلب اس طرح بیان کیا جائے کہ حضور ﷺ نے پاؤں پر مسح کیا اور اس وقت پاؤں موزوں کے اندر تھے گویا موزوں پر مسح کو پاؤں پر مسح قرار دیا۔ [1]

اِلَى الْكَعْبَيْنِ میں الیٰ کی تفصیل وہی ہے جو اِلَى الْمَرَافِقِ میں کر دی گئی۔ کعب وہ ہڈی ہے جو پنڈلی اور قدم کے جوڑ کے دونوں طرف ابھری ہوئی ہے۔ جوتہ کا تسمہ باندھنے کی (بالائی وسطی) جگہ کا نام کعب نہیں ہے دیکھو اَلْكَعْبَيْنِ تثنیہ کا

---

[1] محاورہ میں بولا جاتا ہے میں جب بھی امیر کے پاس گیا میں نے اس کے پاؤں چومے یعنی اگر اس کے پاؤں بغیر موزوں کے ننگے تھے تو پاؤں کو چوما اور موزوں کے اندر تھے تو موزوں کو چوما، اگر شبہ کیا جائے کہ اس وقت موزوں کا ذکر کرنا جائز ہے اور ذکر نہ کیا جائے تو کوئی قرینہ ایسا نہیں جو خفین پر دلالت کر رہا ہو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر دو آیتوں یا دو قراتوں میں تعارض ہو تو دونوں پر عمل کرنے کی صورت نکالنا واجب ہے اور دونوں پر عمل کرنے کی صورتوں میں سے ایک صورت یہ بھی ہے کہ دونوں کا وقت اور حالت جدا جدا قرار دی جائے اس وقت نہ تو دونوں حالتوں کا ذکر ضروری ہے اور نہ کسی قرینہ کی ضرورت ہے دیکھو آیت وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ میں دو قراتیں آئی ہیں اول يَطْهُرْنَ دوسری يَطَّهَّرْنَ پہلی قرات کے وقت قربت کا جواز اس وقت ہو گا جب حیض پورے دس دن آیا ہو اور دس دن کے بعد طہارت ہوئی ہو اور دوسری قرات اس وقت ہو گی جب حیض دس دن سے کم میں ختم ہو گیا ہو اگر شبہ کیا جائے تو چمڑے کے موزے پہننے کا رواج رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بہت ہی کم تھا تو ہمارے لئے یہ قول ناقابل تسلیم ہے۔

صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ الکعاب (جمع کا صیغہ) نہیں فرمایا حالانکہ جمع کا جمع سے مقابلہ ہو تو اکائی کی تقسیم میں اکائی آتی ہے تثنیہ کے مقابل اگر جمع کا صیغہ ہو تو اس وقت آحاد کی تقسیم آحاد پر نہیں ہوتی اور جب تقسیم آحاد ممکن نہیں تو پھر ہر پاؤں میں دو کعب ہونے چاہئیں اور تسمہ باندھنے کی جگہ ہر پاؤں میں ایک ہوتی ہے۔

مسئلہ :- سفر ہو یا اقامت کی حالت اگر چمڑے کے موزے پاؤں دھونے کے بعد طہارت کی حالت میں پہنے ہوں تو (وضو ٹوٹ جانے کے بعد) بجائے پاؤں دھونے کے موزوں پر مسح جمہور کے نزدیک کافی ہے۔ امام مالکؒ اقامت کی حالت میں موزوں پر مسح کرنے کی اجازت نہیں دیتے سفر کی حالت میں صحیح روایات سے امام مالکؒ کا قول جواز کا منقول ہے۔ ابو بکر بن داوٗد اور فرقہ امامیہ کے نزدیک موزوں پر مسح ہر حالت میں ناجائز ہے۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ اَرْجُلَکُمْ لام کے زبر کے ساتھ پڑھا جائے ایدیکم پر عطف ہوگا اور پاؤں دھونا واجب ہوں گے اور زیر کے ساتھ پڑھا جائے تو رؤسکم پر عطف ہوگا اور پاؤں کا مسح کرنا واجب ہوگا لیکن یہ اسی صورت میں ہوگا کہ پاؤں موزوں کے اندر ہوں۔ گویا دونوں قرآتیں دو آیتوں کی طرح ہیں۔ ایک قرأت کا حمل حقیقی معنی پر اور دوسری قرأت کا حمل مجازی معنی پر ہوگا۔ ہر قرأت کی ترکیب اور تقدیر الفاظ دوسری قرأت کی ترکیب اور تقدیر الفاظ سے جدا ہے (گویا اول صورت میں حقیقتاً پاؤں کا دھونا اور دوسری صورت میں مجازاً پاؤں پر مسح کرنا مراد ہوگا۔ حقیقی مسح تو موزوں پر ہوگا)۔

اگر آیت کی یہ تفسیر نہ بھی کی جائے تب بھی موزوں پر مسح کو جائز کرنے والی حدیث معنیً متواتر ہے جس سے قرآنی آیت کے حکم کا منسوخ ہونا جائز ہے۔ حفاظ حدیث کی ایک جماعت نے صراحت کی ہے کہ موزوں پر مسح کا حکم متواتر ہے بعض لوگوں نے مسح علی الخُفَّین کے راویوں کو (جو طبقہ اول کے تھے) جمع کیا ہے جن کی مجموعی تعداد اسّی سے بھی بڑھ جاتی ہے اس تعداد میں عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں۔ ابن ابی شیبہ وغیرہ نے لکھا ہے کہ حسن بصری نے فرمایا مجھ سے ستر صحابیوں نے موزوں پر مسح کرنے کی حدیث بیان کی۔

امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا میں موزوں پر مسح کرنے کا قائل اس وقت تک نہ ہوا جب تک دن کی روشنی کی طرح مجھ پر اس کی وضاحت نہیں ہوگئی یہ بھی امام اعظم ہی کا قول ہے کہ جو شخص موزوں پر مسح کو جائز نہیں کہتا مجھے اس کے کفر کا اندیشہ ہے۔

امام احمدؒ نے فرمایا میرے دل میں موزوں پر مسح کے جواز کے متعلق کوئی کھٹک باقی نہیں اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کے صحابیوں کی چالیس حدیثیں آئی ہیں جن میں سے کچھ مرفوع ہیں کچھ موقوف۔ امام احمد نے ان احادیث میں سے دو حدیثیں بیان کیں، ایک حضرت مغیرہ بن شعبہ والی، حضرت مغیرہؓ نے بیان کیا میں ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا مغیرہ لوٹا لے لے میں نے لوٹا لے لیا آپ تشریف لے چلے اور اتنی دور چلے گئے کہ میری آنکھوں سے چھپ گئے اور رفع حاجت کر کے واپس تشریف لے آئے میں نے پانی ڈالا آپ نے وضو کیا جیسا نماز کا وضو کرتے تھے اور دونوں موزوں پر مسح کیا۔ متفق علیہ۔

حضرت مغیرہؓ کی یہ حدیث تقریباً ساٹھ سندوں سے نقل کی گئی ہے جن میں سے ۴۵ سلسلوں سے ابن مندہ نے بھی اس کو بیان کیا ہے۔ دوسری حضرت جریرؓ والی حدیث ہے۔ حضرت جریرؓ کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا رسول اللہ ﷺ نے پیشاب کرنے کے بعد وضو کیا اور موزوں پر مسح کیا۔ ابراہیم نے کہا لوگوں کو یہ حدیث بہت پسند تھی کیونکہ حضرت جریرؓ سورۂ مائدہ کے نزول کے بعد مسلمان ہوئے تھے (اگر پاؤں دھونا ضروری ہوتا جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیت وضو سے بظاہر معلوم ہوتا ہے تو حضور موزوں پر مسح نہ کرتے۔ یہ حدیث بھی بخاری و مسلم دونوں صحیحین میں بیان کی ہے)۔

ابن عبدالبر مالکی کا بیان ہے کہ کسی فقیہ نے موزوں پر مسح کے جواز کا انکار نہیں کیا۔ صرف امام مالک (رحمۃ اللہ) کا انکار روایت میں آیا ہے۔ مگر صحیح روایات سے ثابت ہے کہ امام مالکؒ نے بھی آخر میں اقرار کر لیا تھا۔

صحابہؓ میں سے کوئی بھی موزوں پر مسح کا منکر نہ تھا۔ صرف حضرت ابو ہریرہؓ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ کا انکار بعض روایات میں آتا ہے حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کے انکاری قول کے خلاف صحیح سندوں کے ساتھ خود انہی

حضرات کا اقرار منقول ہے اور ثابت ہو گیا ہے کہ یہ دونوں بزرگ بھی باقی صحابہؓ کے موافق ہو گئے تھے۔ رہا حضرت عائشہؓ کا قول تو صحیح مسلم میں شریح بن ہانی کی روایت سے اس کی تفصیل اس طرح آئی ہے شریح نے کہا میں نے ام المومنینؓ سے موزوں پر مسح کے متعلق دریافت کیا فرمایا تم ابن ابی طالب سے جا کر پوچھو وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر کرتے تھے ہم نے حضرت علیؓ سے جا کر پوچھا حضرت علیؓ نے فرمایا رسول اللہؐ نے مسافر کے لئے تین دن تین راتیں اور مقیم کے لئے ایک شبانہ روز کی میعاد مقرر فرمائی ہے۔ رواہ ابوداؤد والترمذی وابن حبان، دارقطنی نے بھی مسح خفین کے جواز کے متعلق حضرت عائشہؓ کا قول نقل کیا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے فرمایا مجھے پرواہ نہیں کہ موزوں پر مسح کروں یا اپنے گدھے کی پشت پر۔ یہ قول سراسر غلط ہے اس کی کوئی اصل نہیں بعض لوگ راوی ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا اگر پاؤں کو میں استرے سے کاٹ ڈالوں تو موزوں پر مسح کرنے سے میرے نزدیک بہتر ہے۔ یہ روایت بھی بالکل غلط ہے حفاظ حدیث نے اس کی صراحت کر دی ہے۔

مسئلہ :- موزوں پر مسح کرنے کی میعاد مسافر کے لئے تین شبانہ روز اور مقیم کے لئے ایک رات دن ہے۔ حضرت ابو بکرؓ کی حدیث ہے کہ مسافر کو تین روز (تک مسح کرنے) کی اور مقیم کو ایک روز کی اجازت دی گئی ہے بشرطیکہ طہارت کے بعد موزے پہنے ہوں۔ رواہ الترمذی وصححہ۔ ورواہ ابن خزیمۃ وابن حبان وابن الجارود والشافعی وابن ابی شیبۃ والبیہقی والدار قطنی۔ بیہقی نے یہ بھی لکھا ہے کہ امام شافعی کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے۔

حضرت مغیرہؓ کی حدیث جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اس میں یہ بھی ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا میں حضورؐ کے موزے اتار نہ دوں فرمایا رہنے دو طہارت کی حالت میں میں نے ان کے اندر پاؤں ڈالے ہیں۔ ابن جوزی نے حضرت علیؓ، حضرت صفوانؓ بن عسال، حضرت عمر بن خطابؓ، حضرت عمرو بن ابی امیہ ضمری، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت خزیمہؓ بن ثابت کی احادیث التحقیق میں نقل کی ہیں اور ہم نے منار الاحکام میں ترتیب وار ان کو بیان کیا ہے ان احادیث میں مدت مسح کا ذکر ہے۔ امام مالکؒ مقیم کو تو مسح خفین کی اجازت ہی نہیں دیتے اور مسافر کو اجازت دیتے ہیں تو اس کے لئے کسی مدت کی تعین نہیں کرتے امام مالک کے مسلک کے خلاف احادیث مذکورہ حجت ہیں۔

مسئلہ :- امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وضو میں ترتیب اور توالی شرط نہیں۔ امام شافعیؒ، امام احمد اور امام مالکؒ کے نزدیک ترتیب شرط ہے اور توالی (پیہم بغیر وقفہ کے دھونا) بھی امام مالک کے نزدیک ضروری ہے۔ امام شافعیؒ کا قدیم قول بھی یہی ہے۔ ہم اپنے مسلک کے ثبوت میں کہتے ہیں کہ آیت کے اندر واؤ کے ساتھ عطف کیا گیا اور واؤ ترتیب پر دلالت نہیں کرتا نہ توالی کا مفہوم اس کے اندر آتا ہے۔ صرف جمعیت کے لئے واؤ کی وضع ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا میں کس عضو سے وضو کا آغاز کروں یہ امر میرے لئے ناقابل التفات ہے۔

تینوں اماموں نے حضرت ابی بن کعب اور حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وضو کا پانی منگوا کر ایک ایک بار وضو کیا اور فرمایا یہ وضو ہے۔ جو (اتنا) وضو نہ کرے اللہ اس کی نماز نہیں قبول فرماتا پھر (ہر عضو کا) دو دو بار وضو کیا اور فرمایا یہ (بھی) وضو ہے جو ایسا وضو کرے گا اللہ اس کو دوہرا اجر دے گا۔ پھر آپ نے تین تین بار وضو کیا اور فرمایا یہ میرا اور مجھ سے پہلے پیغمبروں کا وضو ہے رواہ الدار قطنی۔

صورت استدلال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ترتیب اور توالی کے ساتھ وضو کیا ہو گا۔ ورنہ یہ کہنا پڑے گا کہ وضو میں عدم ترتیب اور عدم توالی فرض ہے اور جب حضور ﷺ نے ترتیب و توالی کے ساتھ وضو کرنے کے بعد فرمایا کہ اس وضو کے بغیر اللہ نماز نہیں قبول فرماتا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ دونوں امور فرض ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ بوجوہ ذیل استدلال غلط ہے (۱) حضرت ابی بن کعب والی حدیث کی سند میں ایک راوی زید بن ابی الجواری ہے جس کو یحییٰ نے ہیچ اور ابو ذرعہ نے ضعیف الحدیث قرار دیا ہے اور اسی حدیث کی سند میں ایک راوی عبد اللہ بن عرادہ ہے جو یحییٰ کے نزدیک ہیچ اور بخاری کے نزدیک منکر الحدیث ہے۔

دوسری حدیث حضرت ابن عمرؓ کی ہے جس کی سند میں مسیب بن واضح ضعیف راوی ہے۔ (۲) اگر ترتیب و توالی کے وجوب پر استدلال بصورت مذکورہ قائم کیا جاتا ہے تو ہم بھی اس کے توڑ کے لئے اسی طرح کا استدلال قائم کر کے کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے وضو دائیں طرف سے کیا ہوگا یا بائیں طرف سے مسواک کی ہوگی یا نہ کی ہوگی۔ ناک جھاڑی ہوگی یا نہ جھاڑی ہوگی۔ بہر حال رسول اللہ ﷺ کا فعل یوں ہوگا یا یوں اور دونوں صورتیں وجوب کی ہیں تیامن یا عدم تیامن مسواک یا عدم مسواک ناک کی صفائی یا عدم صفائی دونوں میں سے کوئی امر واجب ہو جائے گا (۳) حدیث کی اصل مراد یہ ہے کہ ایک ایک مرتبہ وضو کرنا کافی ہے اس سے کم کا کوئی درجہ نہیں اگر ایسا بھی نہیں کیا جائے گا تو اللہ نماز قبول نہیں کرے گا۔

وجوب ترتیب پر حضرت عمرو بن عنبسہؓ کی روایت سے بھی استدلال کیا جاتا ہے۔ حضرت عمرو بن عنبسہ (رضی اللہ عنہ) کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے جو شخص برتن میں وضو کا پانی لے پھر کلی کرے اور ناک میں پانی ڈال کر ناک جھاڑے اس کے منہ اور ناک کے بانسہ کے گناہ پانی کے ساتھ جھڑ جائیں گے پھر وہ منہ دھوئے گا تو چہرہ کے گناہ پانی کے ساتھ ڈاڑھی کے بالوں کی نوکوں کے ساتھ جھڑ جائیں گے، پھر دونوں ہاتھ کہنیوں تک دھوئے گا تو دونوں ہاتھوں کے گناہ پوروں سے بہ کر پانی کے ساتھ جھڑ جائیں گے، پھر اللہ کے حکم کے موافق سر پر مسح کرے گا تو سر کے گناہ بالوں کی نوکوں سے پانی کے ساتھ بہہ جائیں گے۔ پھر حکم خدا کے مطابق دونوں ٹخنوں تک پاؤں دھوئے گا تو دونوں قدموں کے گناہ انگلیوں کی نوکوں سے پانی کے ساتھ بہہ کر نکل جائیں گے۔ رواہ مسلم حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث لفظ، پھر کے ساتھ آئی ہے اور پھر کا لفظ ترتیب کے لئے ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اس حدیث میں تو اس طریقہ کو بیان کرنا مقصود ہے جو وضو کرنے والا عام طور پر اختیار کرتا ہے اور مغفرت گناہ کی بشارت دینی مقصود ہے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ اگر ترتیب وضو فوت ہو جائے تو ایسے وضو سے نماز ہی نہیں ہوتی بلکہ اس سے تو یہ بھی نہیں ثابت ہوتا کہ ترتیب فوت ہو جائے تو مغفرت بھی نہ ہوگی۔

توالی کو ضروری قرار دینے والوں نے ایک حدیث سے استدلال کیا ہے ایک شخص نے نماز کے لئے وضو کیا اور قدم کی پشت پر ناخن برابر جگہ دھونے سے رہ گئی رسول اللہ ﷺ نے دیکھ کر فرمایا دوبارہ جا کر اچھی طرح وضو کر وہ شخص واپس گیا اور وضو کیا پھر نماز پڑھی۔ یہ حدیث امام احمد اور ابوداؤد نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے اور مسلم نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے بیان کی ہے لیکن اس حدیث میں بھی کوئی ایسی چیز نہیں جس سے توالی کا واجب ہونا معلوم ہوتا ہو، کیونکہ اچھی طرح وضو کرنے سے مراد یہ ہے کہ جو جگہ دھونے سے رہ گئی ہے اس کو دھو کر وضو کی تکمیل کر لو دوبارہ وضو کرنے کا حکم اس سے مستفاد نہیں ہوتا۔ باقی امام احمد کی روایت کے یہ الفاظ کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا رسول اللہ نے اس کو دوبارہ وضو کرنے کا حکم دیا۔ اس روایت کی سند میں ابن لہیعہ ضعیف راوی ہے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ حضور کی بیبیوں میں سے کسی بی بی کا بیان ہے کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا لیکن اس کے قدم کی پشت پر درہم برابر خشک نشان تھا جس پر پانی نہیں پہنچا تھا رسول اللہ ﷺ نے ملاحظہ فرما کر اس کو دوبارہ وضو کرنے کا حکم دیا۔ اس حدیث کی سند میں بھی ضعف ہے اس میں ایک راوی بقیہ ہے جو مدلّس ہے جب تک کسی دوسرے کی تائید حاصل نہ ہو اس کی حدیث صحیح نہیں۔ توالی ضروری نہ ہونے پر حضرت ام میمونہ کا وہ بیان دلالت کرتا ہے جس میں ام المومنینؓ نے رسول اللہ ﷺ کے غسل کی حالت بیان کرنے کے ذیل میں فرمایا پھر آپ اپنی جگہ سے ہٹ گئے اور دونوں قدم دھوئے۔ رواہ البخاری۔

امام مالکؒ نے نافعؒ کی روایت سے بیان کیا اور امام شافعیؒ نے الام میں امام مالکؒ کے حوالہ سے اس کو نقل کیا ہے کہ مدینہ کے بازار میں حضرت ابن عمرؓ نے وضو کیا اتنے میں ایک جنازہ کی نماز کیلئے آپ کو بلایا گیا اس وقت آپکے وضو (کی تکمیل) میں صرف دونوں قدموں کا فرض (مسح کرنا) باقی رہ گیا تھا آپ فوراً لوگوں کے ساتھ نماز کی جگہ پر چلے گئے پھر (وہاں پہنچ کر) دونوں موزوں پر مسح کیا یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ (باقی اعضاء سے) وضو کا پانی خشک ہونے کے بعد حضرت ابن عمرؓ نے پاؤں دھوئے تھے۔

مسئلہ :- امام اعظمؒ کے نزدیک وضو میں نیت ضروری نہیں۔ باقی تینوں اماموں کے نزدیک ضروری ہے کیونکہ باجماع علماء وضو عبادت ہے اور ہر عبادت کے لئے نیت شرط ہے اس پر اجماع بھی ہے اور آیات واحادیث بھی اس پر دلالت کر رہی ہیں۔ اللہ نے فرمایا ہے وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ حدیث میں آیا ہے۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ۔

ہم کہتے ہیں وضو کی دو حیثیتیں ہیں ایک اعتبار سے وضو خود عبادت ہے اس سے گناہ معاف ہوتے ہیں اس وقت اس کے لئے نیت ضروری ہے کیونکہ ہر عبادت کے لئے نیت شرط ہے دوسرے اعتبار سے وضو نماز کی کنجی اور من جملہ دیگر شرائط کے نماز کی ایک شرط ہے اس لحاظ سے اس کے لئے نیت ضروری نہیں۔ ستر عورت طہارت لباس وبدن اور دوسری شرائط کے لئے جس طرح نیت شرط نہیں اسی طرح وضو کے لئے بھی نیت شرط نہیں۔

مسئلہ :- جمہور کے نزدیک وضو کے لئے نہ بسم اللہ پڑھنی شرط ہے نہ کلی کرنی نہ ناک میں پانی ڈالنا۔ امام احمدؒ کے نزدیک تینوں ضروری اور وضو کے رکن ہیں۔ بسم اللہ اس لئے واجب ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے بسم اللہ نہیں کہی اس کا وضو نہیں (ہوا) یہ حدیث امام احمدؒ اور آئمہ حدیث کی ایک جماعت نے کثیر بن زید کی روایت سے بیان کی ہے اس کا سلسلہ اس طرح ہے کثیر بن زید از ربیح بن عبدالرحمٰن بن ابی سعید الخدری از عبدالرحمٰن پدر ربیح از حضرت ابوسعید خدری جد ربیح۔ ترمذی اور بعض دوسرے اماموں نے یہ حدیث سعید بن زید کی روایت سے بیان کی ہے۔ اس کا سلسلہ اس طرح ہے سعید بن زید از عبدالرحمٰن بن حرملہ از ابی ثقال از رباح از جدۂ رباح از پدر جدۂ رباح۔ امام احمد اور اصحاب سنن نے یہ حدیث حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کی ہے اس کے سلسلے میں یعقوب بن سلمہ از سلمہ آیا ہے۔

دار قطنی نے حدیث کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں جس نے وضو کیا اور بسم اللہ پڑھ لی اس نے اپنے پورے جسم کو پاک کر لیا اور جس نے بغیر بسم اللہ پڑھے وضو کیا اس نے صرف وضو کی جگہ (یعنی وضو کے اعضاء کو حد خاص تک) پاک کیا۔

حضرت ابن مسعودؓ حضرت ابن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ وضو کے لئے اٹھتے تھے تو (وضو سے پہلے) بسم اللہ پڑھتے تھے۔ رواہ الترمذی وابن ابی شیبۃ وابن عدی، حضرت خصیفؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے بغیر بسم اللہ پڑھے وضو کر لیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا دوبارہ وضو کرو۔ اس نے پھر وضو کیا مگر بسم اللہ نہیں پڑھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا لوٹ کر پھر وضو کرو۔ ایسا تین مرتبہ ہوا آخر اس نے وضو کیا اور بسم اللہ بھی پڑھی۔ حضور نے فرمایا اب تم نے ٹھیک وضو کیا اور خیر کو پالیا۔

...... جواب ......

مذکورۂ بالا تمام احادیث ضعیف ہیں۔ خصیف والی حدیث تو بالکل موضوع اور بے اصل ہے۔ ابوبکر اثرم کا بیان ہے میں نے امام احمد سے سنا فرما رہے تھے کہ اس کے سلسلہ میں (یعنی بسم اللہ کے وجوب کے متعلق) کچھ ثبوت نہیں سب سے بڑھیا حدیث کثیر بن زید والی ہے مگر کثیر بھی ضعیف ہے۔ یہی حالت عبدالرحمٰن بن حرملہ کی ہے ابو حاتم کے نزدیک یہ شخص نا قابل حجت ہے اور بخاری کے نزدیک اس میں لِین (نرمی یعنی ثقاہت کی نرمی) ہے۔ باقی ابو ثقال اور رباح سو یہ دونوں غیر معروف ہیں اور رباح کی دادی کا تو نہ نام معلوم نہ حال۔ ابو حاتم اور ابوزرعہ نے بھی یہی کہا ہے۔ یعقوب بن سلمہ لیثی کے متعلق بخاری نے لکھا ہے کہ یعقوب کا سماع سلمہ سے اور سلمہ کا اسماع ابوہریرہؓ سے معروف نہیں۔

حضرت عائشہؓ والی حدیث کی سند میں ایک راوی حارثہ ہے جو ضعیف ہے۔ حافظ ابن حجر نے لکھا اس مبحث کی ایک حدیث حضرت علیؓ کی روایت سے آئی ہے جو ابن عدی نے نقل کی ہے لیکن اس حدیث کی سند بھی درست نہیں۔ حضرت انسؓ والی حدیث عبدالملک نے نقل کی ہے جو بہت ہی ضعیف ہے اور حضرت ابن عمر کی حدیث کے سلسلہ میں ایک راوی ابوبکر داہر ہے جو متروک الحدیث ہے۔ اور حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث کا ایک راوی یحییٰ بن ہاشم الشمشاد ہے جو متروک ہے۔ یہ حدیث مرسلا

ابان کی روایت سے آئی ہے مگر یہ بھی کمزور ہے خلاصہ یہ کہ بسم اللہ کے وجوب کے سلسلہ میں کوئی صحیح حدیث نہیں آئی اسی لئے امام احمد نے فرمایا کہ جس نے بغیر بسم اللہ پڑھے وضو کیا ہو میں اس کو دوبارہ وضو کرنے کا حکم نہیں دیتا مجھے امید ہے کہ اس کا وضو کافی ہو گا لیکن امام احمد کے نزدیک تو قیاس پر ضعیف حدیث کو ترجیح حاصل ہے خصوصاً مذکورۂ بالا ضعیف احادیث جن کو باہمی تائید و تقویت حاصل ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرور ان کی کچھ اصلیت ہے۔

وجوب بسم اللہ کے ثبوت میں حضرت ابوہریرہؓ کی ایک مرفوع حدیث بھی پیش کی گئی ہے۔ حدیث ان الفاظ کے ساتھ کل امر ذی بال لم یبدء بسم اللہ فھو اجذم ہم کہتے ہیں یہ حدیث بسم اللہ کے وجوب پر دلالت نہیں کرتی ورنہ حمد پڑھنی بھی ہر کام کے آغاز میں (خصوصاً وضو کے آغاز میں) واجب قرار پائی جائے گی کیونکہ حمد کے بارے میں بھی اسی کی ہم معنی حدیث آئی ہے۔

پھر یہ تمام احادیث ابوجہیم کی صحیح حدیث سے ٹکراتی ہیں۔ ابوجہیم کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ چاہ جمل کی طرف سے سامنے سے تشریف لائے۔ راستہ میں ایک آدمی سے ملاقات ہوئی اس نے سلام کیا حضورؐ نے جواب نہیں دیا۔ یہاں تک کہ ایک دیوار کی طرف جا کر اس سے تیمّم کیا پھر اس کو جواب دیا۔ متفق علیہ۔ یہ حدیث بتا رہی ہے کہ سلام چونکہ اللہ کا نام ہے اس لئے بغیر طہارت کے اس کو زبان پر لانا مناسب نہ سمجھا پھر بسم اللہ وضو سے پہلے کس طرح زبان سے پڑھی جا سکتی ہے۔ بالفرض اگر مان لیا جائے کہ احادیث میں وضو کے وقت بسم اللہ پڑھنے کا حکم آیا ہے تو (وجوب کہاں سے معلوم ہوا زیادہ سے زیادہ) امر کو استحباب کے لئے کہہ دیا جائے گا رہا نفی وضو کا قول تو اس سے کمال وضو کی نفی مراد ہے (یعنی جس نے بسم اللہ نہیں پڑھی اس کو وضو کا کمال حاصل نہیں ہوا)۔

کلی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے کے وجوب کے لئے حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کلی کرنا اور ناک میں پانی سڑکنا وضو میں سے ہے جس کے بغیر چارہ نہیں یا فرمایا وضو ان کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔ ایک روایت حضرت ابوہریرہؓ کی بھی آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کلی کرنے اور ناک میں پانی سڑکنے کا حکم دیا یہ تینوں روایات دار قطنی نے لکھی ہیں ان روایات کا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ والی حدیث کے سلسلہ میں تو ایک شخص سلیمان بن موسیٰ راوی ہے جسکو بخاری نے منکر کہا ہے اور نسائی نے کہا ہے کہ یہ قوی نہیں ہے (یعنی ضعیف ہے)۔

اور حضرت ابن عباس والی روایت کا ایک راوی جابر جعفی ہے ایوب سجستانی اور زائدہ نے اس کو جھوٹا کہا ہے اور نسائی نے متروک الحدیث قرار دیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث کو مسنداً صرف ہدبہ اور داؤد بن محبر نے ذکر کیا اور حماد کی وساطت سے عمار کی روایت کہا ہے دوسرے لوگوں نے مرسلاً بیان کیا ہے ابن جوزی نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ ہدبہ ثقہ ہے صحیحین میں اس کی روایت آئی ہے اگر یہ مرسل کو مرفوعاً بیان کرتا ہے تو ثقہ کی یہ زیادتی قابل قبول ہے اس کے علاوہ (مرسل ہی قرار دیا جائے تب بھی کوئی خرابی نہیں کیونکہ) مرسل حجت ہے۔

ایک روایت حضرت ابوہریرہؓ کی اور ہے جس سے ناک میں پانی ڈالنے کا وجوب ثابت کیا جاتا ہے حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب کوئی وضو کرے تو نتھنے سے پانی سڑک لے پھر ناک جھاڑ دے۔ رواہ مسلم۔ بعض روایات کے الفاظ اس طرح ہیں کہ ناک میں پانی ڈال لے پھر ناک جھاڑ دے، متفق علیہ۔ ابن جوزی نے لکھا ہے ایسی ہی احادیث حضرت عثمان بن عفان حضرت سلمان بن قیس اور حضرت مقدام بن معدی کرب کی روایات سے بھی آئی ہیں۔ امام احمد اور ابوداؤد وطیالسی اور حاکم نے حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ ناک کو دو یا تین بار خوب جھاڑو۔ ابوداؤد کی روایت اس طرح بھی آئی ہے کہ جب تم میں سے کوئی وضو کرے تو ناک کو جھاڑے اور ایسا دو یا تین بار کرے۔ اس حدیث کی سند حسن ہے۔

ہم کہتے ہیں کلی کرنے ناک میں پانی سڑکنے اور ناک جھاڑنے کے متعلق جو حکم بھی آیا ہے وہ وجوبی نہیں استحبابی ہے۔ خصوصاً اگر اول الذکر دونوں کا ذکر موخر الذکر کے ساتھ کیا گیا ہو کیونکہ ناک جھاڑنا کسی کے نزدیک واجب نہیں ہے۔ دیکھو حضرت

ابوہریرہؓ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو وضو کرے وہ ناک (بھی) جھاڑے۔ جو ایسا کرلے گا۔ بہتر ہوگا نہیں کرے گا تو کوئی ہرج نہیں۔ پھر وہ احادیث جن سے بسم اللہ پڑھنے کلی کرنے ناک میں پانی ڈالنے اور ناک جھاڑنے کا وجوب ثابت کیا جاتا ہے اگر ان کو صحیح مان بھی لیا جائے تو امام ابوحنیفہؒ کے مسلک پر ان سے وجوب ثابت نہ ہوگا کیونکہ قرآن پر حدیث سے زیادتی امام اعظمؒ کے نزدیک درست نہیں آپ کے نزدیک زیادتی نسخ کے حکم میں ہے (اور حدیث قرآن کو منسوخ نہیں کرسکتی) کیونکہ قرآن کا مقتضا تو یہ ہے کہ چاروں ارکان وضو جب پورے کرلئے (ہاتھ منہ پاؤں دھولئے اور سر کا مسح کرلیا) تو وضو ہوگیا، اس وضو سے نماز صحیح ہے (اور حدیث کا مقتضا یہ ہوگا کہ صرف ان چار کو ادا کرنے سے وضو نہیں ہوتا، ایسے وضو سے نماز صحیح نہیں گویا صرف چار کا حکم حدیث نے منسوخ کردیا) اور حدیث آحاد سے قرآن کو منسوخ قرار دینا صحیح نہیں ہے، واللہ اعلم۔

فصل

وضو میں مندرجہ ذیل امور سنت ہیں (۱) نیت (۲) پہنچوں تک تین بار شروع میں ہاتھ دھونا (۳) کلی کرنا (۴) ناک میں پانی سڑکنا (۵) ناک جھاڑنا یہ دونوں عمل تین بار کئے جائیں (۶) ہر دھوئے جانے والے عضو کو تین بار دھویا جائے (۷) سر کا مسح ایک بار کیا جائے (۸) ترتیب (۹) اور توالی کے ساتھ وضو کیا جائے۔

حضرت عبداللہ بن زیدؓ سے جب درخواست کی گئی کہ رسول اللہ ﷺ کے وضو کی طرح ہم کو وضو کرکے بتائیں تو آپ نے پانی کا برتن طلب کرکے اول دونوں ہاتھوں پر اس سے پانی الٹا پھر دونوں ہاتھ دھوئے، پھر کلی کی اور ایک ہاتھ سے ناک میں پانی ڈالا ایسا تین مرتبہ کیا، پھر تین بار چہرہ دھویا پھر کہنیوں تک دونوں ہاتھ دو دو بار دھوئے پھر سر کا مسح کیا، دونوں ہاتھ کو پیچھے لے گئے اور آگے کی طرف لائے پھر ٹخنوں تک دونوں پاؤں دھوئے پھر فرمایا رسول اللہ ﷺ کا وضو اسی طرح تھا۔ متفق علیہ۔ دوسری روایت میں اس طرح آیا ہے پھر کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا اور ناک جھاڑی۔ تین چلو پانی سے تین بار۔ حضرت علیؓ کی حدیث اس طرح ہے آپ نے تین کلیاں کیں۔ تین مرتبہ ناک میں پانی سڑکا اور تین مرتبہ چہرہ دھویا اور تین مرتبہ دونوں بانہیں دھوئیں اور ایک مرتبہ سر کا مسح کیا پھر ٹخنوں تک دونوں پاؤں دھوئے پھر کھڑے ہوگئے اور وضو سے بچا ہوا پانی کھڑے ہوکر پی لیا پھر فرمایا، میں چاہتا تھا کہ تم کو رسول اللہ کے وضو کا طریقہ دکھاوں۔ رواہ الترمذی والنسائی۔

دار قطنی نے لکھا ہے کوئی حدیث ایسی نہیں آئی جس میں یہ آیا ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے وضو کیا اور ان تینوں امور (نیت، ترتیب، توالی) میں سے کسی کو ترک کردیا (معلوم ہوا کہ تینوں امور سنت ہیں) امام شافعی کا ایک قول ہے اور امام احمدؒ کا بھی مسلک ہے کہ سر کا مسح تین بار کرنا سنت ہے۔

حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن زیدؓ، حضرت سلمہؓ بن اکوع، حضرت انسؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت براء بن عازبؓ، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت کردہ احادیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سر پر مسح ایک بار کیا (اس سے معلوم ہوا کہ تین بار مسح کرنا سنت نہیں ہے)

امام احمدؒ نے حضرت عثمانؓ کی اس روایت سے تین مرتبہ مسح کے سنت ہونے پر استدلال کیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے تین تین بار وضو کیا۔ رواہ البخاری اور وضو میں اعضاء کا دھونا بھی داخل ہے اور سر کا مسح بھی) حضرت علیؓ کی ایک روایت بھی اسی طرح آئی ہے۔ رواہ الترمذی۔

ہم کہتے ہیں تین تین بار وضو کرنے سے مراد ہے دھوئے جانے والے اعضاء کو تین تین مرتبہ دھونا ابوداؤد نے بیان کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی روایت کردہ تمام صحیح احادیث ایک مرتبہ سر کا مسح کرنے پر دلالت کرتی ہیں۔ لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت میں جو آیا ہے کہ وضو کیا اور سر کا اور دونوں کانوں کا مسح کیا تین بار تو اس سے مراد یہ ہے کہ ہاتھوں کو سر کے آگے پیچھے تین بار لے گئے ہر بار جدید پانی کے استعمال پر یہ لفظ دلالت نہیں کرتا اور صرف چند بار ہاتھ پھیرنے سے تین بار مسح کرنا

ثابت نہیں ہوتا۔ بغیر جدید پانی کے چند بار ہاتھ پھیرنے کو ایک ہی مسح کہا جائے گا یوں تو حضرت عبداللہ بن زید کی حدیث میں آیا ہے کہ آپ دونوں ہاتھ پیچھے کو لے گئے، پھر واپس سر کے اگلے حصہ کی طرف لائے پھر گدی کی طرف لے گئے پھر لوٹا کر وہیں لائے جہاں سے شروع کیا تھا (دیکھو اس عمل کو چند مرتبہ مسح کرنا نہیں کہا جاتا)۔

(۱۰) دونوں کانوں کا مسح بھی سنت ہے۔ حضرت ابوامامہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، دونوں کان سر کا حصہ ہیں حضور ﷺ سر کا مسح ایک بار کرتے تھے اور کانوں کا مسح بھی کرتے تھے۔ رواہ احمد واصحاب السنن۔ یہ حدیث دوام مسح پر دلالت کر رہی ہے۔ حضرت مقدام بن معدی کرب کی مرفوع حدیث ہے کہ حضورؐ نے وضو کیا اور دونوں انگلیاں کانوں کے سوراخوں میں داخل کیں۔ رواہ النسائی وابن ماجۃ حضرت علیؓ نے وضو کیا اور سر اور کانوں کا مسح تین بار کیا اور فرمایا رسول اللہ کا وضو اسی طرح تھا۔

ایک شبہ :۔ کثیر احادیث میں کانوں کے مسح کا ذکر نہیں آیا۔

جواب :۔ حضرت ابو امامہؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہ کی روایات میں ذکر آیا ہے۔ اور کانوں کا دوامی مسح ان دونوں حدیثوں سے ثابت ہے۔ اگر دوسری احادیث میں نہیں آیا تو اس سے نفی ثابت نہیں ہو سکتی یہ بھی ممکن ہے کہ جب حضورؐ نے کانوں کو سر کا ایک حصہ فرما دیا تو پھر سر کے مسح کے ذکر کے بعد کانوں کے مسح کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں رہی اسی لئے بکثرت احادیث میں کانوں کے مسح کا ذکر نہیں آیا۔

(۱۱) داڑھی میں انگلیوں سے خلال کرنا بھی سنت ہے۔ حضرت عثمانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ریش مبارک میں خلال کرتے تھے۔ رواہ الترمذی وابن ماجۃ وابن خزیمۃ والحاکم وابن حبان۔ داڑھی کے خلال کے سلسلہ میں حضرت ابن عمرؓ کی حدیث بھی آئی ہے جس کو ابن ماجہ دار قطنی اور بیہقی نے نقل کیا ہے اور ابن السکن نے اس کو صحیح کہا ہے۔

(۱۲) دونوں رخساروں کو کسی قدر ملنا بھی سنت ہے حضرت ابن عمر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ دونوں رخساروں کو کسی قدر گڑتے تھے۔ رواہ ابن ماجۃ والدار قطنی، یہ حدیث حسن ہے مگر ابن السکن نے اس کو صحیح کہا ہے۔

فصل

بسم اللہ کے ساتھ وضو کرنا مستحب ہے بسم اللہ کہنے کی احادیث ہم اوپر درج کر چکے ہیں اور تمام احادیث میں امر استحبابی ہے۔ دائیں طرف سے وضو کرنا بھی مستحب ہے لیکن اس کو سنت ہونا چاہئے تھا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہمیشہ کیا ہے لیکن کوئی عالم اس کے سنت ہونے کا قائل نہیں کیونکہ حضور ﷺ نے دائیں طرف سے شروع کرنے کا التزام بطور عادت کیا تھا۔ بطور عبادت نہیں کیا۔

حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے کہ جس قدر ممکن ہوتا رسول اللہؐ اپنا ہر کام وضو کرنا، جوتا پہننا، کنگھی کرنا، دائیں طرف سے شروع کرنے کو پسند فرماتے تھے۔ متفق علیہ۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ وضو کرو تو دائیں اعضاء سے شروع کرو۔ رواہ احمد وابوداؤد وغیرہما۔

وضو سے فارغ ہونے کے بعد یہ دعا پڑھنی مستحب ہے۔ اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَھِّرِیْنَ۔

مسلم نے عقبہ بن عامر کی روایت سے حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جو شخص وضو کے بعد پڑھے اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ..... (آخر تک پڑھے) اس کے لئے جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ جس دروازے سے چاہے داخل ہو۔ ترمذی کی روایت دوسری سند سے آئی ہے اس میں اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ ..... زائد ہے۔ یا یہ دعا پڑھے سُبْحَانَکَ وَبِحَمْدِکَ اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ۔ پھر دو رکعت نماز (تحیۃ الوضو) پڑھے۔ رواہ ابن ماجۃ من حدیث انسؓ، نسائی اور حاکم نے

حضرت ابو سعیدؓ خدری کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ حدیث نقل کی ہے کہ جس نے وضو کیا اور سُبحانک الخ پڑھا تو ایک جھلی پر لکھ کر اس پر مہر لگادی جاتی ہے اور روز قیامت تک اس کی مہر نہیں توڑی جائے گی۔ نسائی نے اس حدیث کو موقوفاً صحیح کہا ہے اور مرفوعاً ضعیف کہا ہے مگر موقوف بھی مرفوع کے حکم میں ہے۔

مسئلہ :- مسواک سنت مؤکدہ ہے بخاری نے حضرت انسؓ کی روایت موقوفاً نقل کی ہے۔ اَکثَرتُ عَلَیکُم فِی السِّوَاکِ۔ مسلم نے حضرت عائشہؓ کی روایت لکھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ گھر میں داخل ہو کر سب سے پہلے مسواک کرتے۔ طبرانی اور بیہقی نے حضرت ام سلمہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جبرئیلؑ پیہم مجھے مسواک کرنے کی ہدایت کرتے رہے اتنی کہ مجھے اپنے پوپلے ہونے کا اندیشہ ہو گیا۔ کتب حدیث میں اسی طرح کی احادیث حضرت سہل بن سعد حضرت ابوامامہؓ حضرت جبیر بن مطعم، حضرت ابوالطفیلؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت مطلبؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت انسؓ کی روایات سے آئی ہیں۔ یہ احادیث مسواک کی انتہائی پابندی اور دوام پر دلالت کر رہی ہیں خصوصاً سو کر اٹھنے والے کے لئے (تو بہت ہی ضروری ہے) رسول اللہ ﷺ جب سو کر اٹھتے تھے تو مسواک کرتے تھے۔ متفق علیہ۔

مسواک ہر نماز کے وقت مستحب ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا اگر مجھے امت کے دشواری میں پڑ جانے کا خیال نہ ہوتا تو میں ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دے دیتا۔ رواہ مسلم وابوداؤد۔ حضرت عائشہؓ کی مرفوع روایت ہے جس نماز سے پہلے مسواک کر لی گئی ہو اس کی برتری بغیر مسواک کی نماز سے ستر گنی ہے۔ رواہ احمد وابن خزیمہ والحاکم۔ مسواک وضو کی سنتوں میں سے نہیں ہے کیونکہ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زید وغیرہ سے کیفیت وضو کی تفصیل کے سلسلہ میں بکثرت احادیث آئی ہیں لیکن کسی روایت میں کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کی طرح مسواک کرنے کا ذکر نہیں آیا۔

وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو سارا بدن خوب پاک کرو۔

یعنی نماز کو اٹھنے کے وقت تم جنابت کی حالت میں ہو تو خوب پاکی کر لو۔ جنابت کی تشریح سورۂ نساء میں گزر چکی ہے۔ خوب پاک ہونے کے حکم سے تمام بدن کا دھونا واجب ہو گیا۔ کلی کرنا اور ناک کے اندر پانی ڈالنا بھی اسی حکم کے تحت واجب ہے کیونکہ اندرون دہن اور اندرون ناک ایک اعتبار سے بیرونی بدن میں داخل ہے اگر کھلا ہو اور ایک اعتبار سے اس کا شمار باطن بدن میں ہے۔ اگر بند ہو چونکہ جنابت میں خوب پاکی حاصل کرنے کا حکم ہے اس لئے ہم نے اندرون دہن اور اندرون ناک کو بیرونی جلد کے حکم میں داخل کر لیا۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا وضو کی طرح غسل میں بھی سنت ہے۔

حضرت ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میں سر کی پٹیاں بہت سخت گوندھتی ہوں کیا غسل جنابت کے وقت ان کو کھولا کروں فرمایا نہیں تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ تین لپ پانی اپنے سر پر ڈال لو۔ پھر اپنے اوپر پانی بہالو۔ پھر پاک ہو جاؤ ہم کہتے ہیں حضرت ام سلمہؓ نے سر دھونے کی کیفیت دریافت کی تھی کہ بال کھولنے ضروری ہیں یا نہیں۔ حضور ﷺ نے اسی سوال کا جواب دے دیا۔ کلی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے کا ذکر نہ اثبات کے ساتھ کیا نہ نفی کے ساتھ اس سے نفی کیسے معلوم ہوئی)۔ [1]

مسئلہ :- عورت ہو یا مرد غسل میں ہر ایک کیلئے سر کے بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانا واجب ہے ڈاڑھی کے اندر بھی پانی پہنچانا لازم ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک اور امام شافعیؒ کے ایک قول میں وضو پر قیاس کرتے ہوئے ڈاڑھی کے اندر پانی پہنچانا

---

[1] ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن عمرؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ ابن عمرؓ نے فرمایا ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک شخص آیا خوبصورت خوش لباس پاکیزہ خوشبو والا اور عرض کیا یارسول اللہ ﷺ اسلام کیا ہے فرمایا نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، رمضان کے روزے رکھو حج کرو اور جنابت کا غسل کرو اس شخص نے کہا آپ نے سچ فرمایا، عبد بن حمید کا بیان ہے کہ وہب زماری نے فرمایا زبور میں لکھا ہوا ہے جس نے جنابت کا غسل کیا وہ یقیناً میرا بندہ ہے اور جس نے جنابت کا غسل نہیں کیا وہ قطعاً میرا دشمن ہے۔

واجب نہیں۔ ہمارے نزدیک دونوں میں فرق یہ ہے کہ غسل میں طہارت مبالغہ کے ساتھ ہونی چاہئے۔ وضو میں اس کی ضرورت نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے جلد کو خوب صاف کرو۔ حضرت علی کا بیان ہے میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرمارہے تھے جس نے غسل جنابت میں بال برابر جگہ چھوڑ دی جس پر پانی نہ پہنچے تو اللہ اس کے ساتھ ایسا ایسا دوزخ سے کرے گا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا اسی وجہ سے میں نے اپنے بالوں سے دشمنی کرلی ہے۔ رواہ ابوداؤد وابن ماجہ واسنادہ صحیح بعض علماء نے کہا کہ اس حدیث کو موقوف قرار دینا صحیح ہے (مرفوع کہنا غلط ہے)۔

ہم کہتے ہیں ثقہ راوی نے اس کو مرفوع کیا ہے اور ثقہ کی زیادتی قابل قبول ہے۔ پھر اس جگہ تو موقوف مرفوع کے حکم میں یقینی طور پر ہے، کیونکہ عذاب آخرت کا اندازہ رائے سے نہیں کیا جاسکتا (وحی کے بغیر اس کا علم نہیں ہوسکتا اور وحی صرف پیغمبر کے پاس آتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ صحابیؓ خواہ کسی قول کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف نہ کرے لیکن اگر وہ قول عذاب آخرت سے متعلق ہے تو یقیناً وہ فرمان رسول (ﷺ) ہے)۔

حضرت ابوایوبؓ کی مرفوع روایت ہے کہ غسل جنابت ادائے امانت ہے کیونکہ ہر بال کے نیچے جنابت ہوتی ہے۔ رواہ ابن ماجۃ اس کی اسناد ضعیف ہے۔ صحیحین میں رسول اللہ ﷺ کے غسل کی کیفیت کے بیان میں حضرت عائشہؓ نے فرمایا پھر آپ انگلیاں پانی میں داخل کرکے ان سے بالوں کی جڑوں میں خلال کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ اسماء نے غسل حیض کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا اس حدیث میں ہے پھر خوب ملے یہاں تک کہ بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچائے۔ رواہ مسلم۔ اس مبحث کی ایک روایت حضرت ابوذرؓ کی بھی ہے جس میں آیا ہے جب پانی مل جائے تو کھال کو ملو۔ رواہ احمد۔

مسئلہ :- بدن ملنا جمہور کے نزدیک واجب نہیں ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک واجب ہے۔ جمہور کی دلیل یہ ہے کہ اللہ نے حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا فرمایا ہے اور اغتسال (دھونے) کا معنی ہے پانی بہانا مالش کا مفہوم اغتسال سے خارج ہے۔ حضرت جبیرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پھر میں چلو بھر پانی لے کر سر پر ڈالتا ہوں پھر اس کے بعد تمام بدن پر بہاتا ہوں۔ متفق علیہ۔ غسل کی کسی حدیث میں کوئی لفظ ایسا نہیں آیا جو مالش کے وجوب پر دلالت کرتا ہے۔

مسئلہ :- بٹے ہوئے بال (بٹیاں یا کوجیٔ) کھولنا اور بالوں کی لٹیں دھونا عورت پر واجب نہیں یہ مسئلہ اجماعی ہے۔ قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ مرد عورت ہر ایک کے لئے بٹے ہوئے بال کھولنا اور لٹیں دھونا واجب ہوتا کیونکہ غسل میں طہارت میں مبالغہ کرنا واجب ہے (اور یہ حکم مرد عورت دونوں کے لئے ہے)۔

لیکن (لٹیں نہ دھونے اور بستہ بال نہ کھولنے کے سلسلے کی حدیث) حضرت ام سلمہ والی اوپر گزر چکی ہے (اور نص کو قیاس پر ترجیح حاصل ہے) عبید بن عمیر کا بیان ہے حضرت عائشہ کو اطلاع ملی کہ حضرت عبداللہ بن عمر عورتوں کو حکم دیتے ہیں کہ جب غسل کریں تو سروں کے بال کھول لیا کریں۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا وہ عورتوں کو سر مونڈ دینے کا حکم کیوں نہیں دیتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ ایک برتن سے غسل کرتے تھے اور تین بار سر پر پانی ڈالنے سے زیادہ میں اور کچھ بھی نہیں کرتی تھی۔

مردوں کے لئے لٹیں دھونے کا حکم ساقط نہیں ہے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر بال کے نیچے جنابت ہوتی ہے۔ اس لئے تم بالوں کو دھوؤ اور جلد کو خوب صاف کرو۔ رواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجہ والبیہقی۔ مگر یہ روایت ضعیف ہے اس کا مدار حارث بن وجیہ پر ہے اور حارث بہت زیادہ ضعیف ہے دار قطنی نے کہا یہ حدیث صرف مالک بن دینار سے مرسلاً مروی ہے اسی طرح سعید بن منصور نے بروایت یونس از حسن مرسلاً بیان کیا ہے۔ ابن جوزی نے کہا یہ صرف ابوہریرہؓ کا قول ہے (یعنی موقوف حدیث ہے) بہر حال یہ حدیث یا مرسل صحیح ہے یا موقوف صحیح متصل مرفوع نہیں ہے لیکن مرسل بھی حجت ہے۔ خصوصاً اگر اس کی تائید کسی حدیث مسند یا اثر سے ہورہی ہو۔

فصل

غسل میں نیت اور توالی سنت ہے اور دونوں پاؤں کو چھوڑ کر باقی وضو کرنا پھر بدن پر پانی بہانا پھر غسل کی جگہ سے ہٹ کر پاؤں دھونا بھی سنت ہے۔ غسل کی نیت میں اختلاف وہی ہے۔ جو وضو کی نیت میں ہے۔ اور توالی رسول اللہ ﷺ کے دوامی عمل سے ثابت ہے۔ باقی امور کا مسنون ہونا حضرت میمونہؓ کی حدیث سے ثابت ہے۔ حضرت میمونہؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کے لئے غسل کا پانی رکھا آپؐ نے غسل جنابت کیا (اول) برتن کو بائیں ہاتھ سے جھکا کر دائیں ہاتھ پر پانی ڈالا پھر تین بار دونوں ہاتھ دھوئے پھر سر پر پانی تین بار ڈالا پھر باقی بدن پر پانی بہایا پھر وہاں سے ہٹ کر دونوں پاؤں دھوئے۔ متفق علیہ۔

فائدہ :۔ اگر بدن پر نجاست حقیقیہ لگی ہو تو اس کو دور کرنا واجب ہے اسی لئے غسل کی سنتوں میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جس طرح وضو کی سنتوں میں استنجا کا ذکر نہیں کیا گیا۔ تین بار باقی بدن کو دھونے کی کوئی دلیل مجھے معلوم نہیں ہوئی۔

وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ مِنْهُ ۚ

اور اگر تم بیمار ہو یا یا حالت سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی استنجے سے آیا ہو یا تم بیبیوں سے لگے ہو اور اس کے بعد تم کو پانی نہ ملے تو پاک زمین سے تیمم اس طرح کر لو کہ اس زمین سے اپنے چہروں کا اور ہاتھوں کا مسح کر لو۔ اس کی تفسیر سورت نساء میں ہو چکی ہے اس جگہ لفظ مِنۡهُ زائد ہے باقی وہی ہے جو سورۂ نساء میں ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ لفظ منہ میں اس بات کی دلیل ہے کہ چہرے اور ہاتھوں کا مسح مٹی سے ہونا چاہئے۔ میں کہتا ہوں بغوی کا یہ قول اس وقت صحیح ہو گا جب منہ میں مِن کا لفظ تبعیض کے لئے لیا جائے اور امام ابو یوسفؒ نے اسی لئے فرمایا ہے کہ زمین کی جنس سے جو چیز بھی ہو اس سے تیمم اس وقت صحیح ہو گا جب اس پر مٹی ہو (اگر اس پر مٹی نہ ہو گی تو اس سے تیمم درست نہ ہو گا)۔

اس کے متعلق امام محمدؒ کے دو قول آئے ہیں (مٹی ہونا ضروری ہے یا صرف جنس ارض سے ہونا کافی ہے خواہ اس پر خاک نہ ہو) ہم کہتے ہیں من کی اصل حقیقی وضع ابتدا کیلئے ہے۔ تبعیض یا بیان کیلئے ہونا تو (مجازی معنی ہے جو) قرینہ کا محتاج ہے۔ علامہ تفتازانی شافعی نے لکھا ہے کہ بعض فقہاء شافعیہ اس طرف گئے ہیں کہ مِنۡ کی اصل وضع تبعیض کیلئے ہے تاکہ اشتراک کے قول کی طرف رجوع نہ کرنا پڑے (یعنی تبعیض کیلئے تو اس کی اصلی وضع ہے اب اگر ابتدا کیلئے بھی اصلی وضع قرار دی جائے گی تو وضع حقیقی میں اشتراک ہو جائے گا اور یہ ضابطہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اشتراک کا قول نہ اختیار کیا جائے) لیکن اس عالم کا یہ قول درست نہیں۔ تمام ائمہ لغت کا اتفاق ہے کہ مِنۡ کی اصل وضع ابتداء غایت کیلئے ہی ہے۔ (انتہی کلامہ)۔

میں کہتا ہوں تبعیض کا معنی اس جگہ درست نہیں ہو سکتا کیونکہ تبعیض کا معنی یہ ہے کہ بجائے لفظ من کے لفظ بعض کا لانا اس جگہ صحیح ہو اور اس جگہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ چہروں پر اور ہاتھوں پر اپنے ہاتھ پھیر لو۔ مسح کا یہی مفہوم ہے بس یہ کلام پورا ہو گیا اس کو مزید مفعول بہ کی ضرورت نہیں (ہاں مِن کو ابتداء کے لئے کہا جائے تو یہ مطلب ہو گا کہ صعید طیب سے مسح شروع کرو یعنی صعید پر ہاتھ پھیر کر یا اس پر ہاتھ مار کر چہروں اور ہاتھوں پر ملو۔ یہ معنی بالکل صاف ہیں)۔

اگر شبہ کیا جائے صاحب کشاف نے صراحت کی ہے کہ لوگوں کا یہ خیال کہ مِنۡ (اصل میں) ابتداء غایت کے لئے آتا ہے۔ تعسف ہے کیونکہ مَسَحۡتُ بِرَأۡسِیۡ مِنَ الدُّهۡنِ یا مِنَ الۡمَاءِ یا مِنَ التُّرَابِ سے کوئی عرب بھی سوائے تبعیض کے اور کچھ معنی نہیں سمجھتا۔

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ مذکورہ مثالوں میں تبعیض کا مفہوم محض عقلی قرینہ سے سمجھ میں آرہا ہے لفظ مِنۡ سے یہ مفہوم نہیں ہوتا دیکھو سر پر اس طرح ہاتھ پھیرنا کہ تیل یا پانی یا مٹی سے مسح کی ابتدا کی جائے عقلاً چاہتا ہے کہ ان چیزوں سے

ہاتھ آلودہ ہو یا یہ چیزیں ہاتھ کو لگی ہوئی ہوں لفظ سے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہاں اگر مَسَحْتُ بِرَاسِیْ مِنَ الصَّخْرَۃِ کہا جائے تو اس سے تبعیض کا معنی قطعاً سمجھ میں نہیں آتا بلکہ ابتداء کا مفہوم ہی سمجھا جاتا ہے۔ اور جب تبعیض کا مفہوم نہیں سمجھا جاتا تو لا محالہ اس جگہ مِن ابتداء غایت کیلئے ہی ہوگا اور تیمم پتھر سے جائز ہوگا خواہ اس پر غبار نہ ہو۔ واللہ اعلم۔

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ (وضو اور غسل اور تیمم کا حکم دے کر) اللہ تم پر تنگی ڈالنا نہیں چاہتا۔

وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ بلکہ (نجاستوں اور گناہوں) کو پاک کرنا چاہتا ہے عمرو بن عنبسہ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد بحث وضو میں ہم نقل کر چکے ہیں کہ جب وضو کرنے والا کلی کرتا اور ناک میں پانی ڈالتا ہے تو اس کے منہ اور اندرون ناک کے گناہ پانی کے ساتھ بہہ جاتے ہیں۔ الخ

بغوی نے لکھا ہے کہ جب حضرت عثمانؓ نے تین تین بار دھونے کے بعد فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جو شخص میرے اس وضو کی طرح وضو کرے گا اس کے چہرے اور دونوں ہاتھوں اور دونوں پاؤں سے گناہ (بہہ کر) نکل جائیں گے۔

وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ اور اس لئے کہ اپنا انعام تم پر کامل کر دے یعنی ایسے طریقے تمہارے لئے مقرر کر دے جو تمہارے اجسام کو نجاستوں سے اور تمہاری ذات کو گناہوں سے پاک کرنے والے ہیں اور وہ نماز جو تمہارے لئے معراج ہے اس کے واسطے وہ کنجی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تکمیل نعمت دخول جنت اور دوزخ سے نجات ہے، رواہ احمد وابن ابی شیبۃ والترمذی من حدیث معاذ بن جبل۔

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے قیامت کے دن میری امت کو بلایا جائے گا جن کے چہرے اور ہاتھ پاؤں وضو کے اثر سے گورے ہوں گے لہٰذا تم میں سے جو شخص جس قدر اپنے گورے پن کو بڑھا سکے بڑھائے۔ رواہ البخاری۔

لِيَجْعَلَ اور لِيُطَهِّرَ اور لِيُتِمَّ میں لام زائد ہے اس کے بعد اَن محذوف ہے اور ان کی وجہ سے یہ تینوں افعال بمعنی مصدری ہو کر يُرِيْدُ کے مفعول ہیں (یعنی اللہ تم پر تنگی کرنا نہیں چاہتا بلکہ تم کو پاک کرنا اور تم پر انعام کی تکمیل کرنا چاہتا ہے)۔

چونکہ صاحب کافیہ (ابن حاجب) نے صراحت کر دی ہے کہ اَن صرف دو جگہ محذوف ہوتا ہے اس لام کے بعد جو "کَیْ" کے معنی میں ہو اور لام جحود کے بعد اس لئے بیضاوی نے لکھا ہے کہ لام، زائد کے بعد اَن کو محذوف نہیں مانا جا سکتا مگر بیضاوی کا یہ خیال غلط ہے۔ رضی اور زمخشری نے ایسی مثالوں میں اَن کو محذف مانا ہے باوجودیکہ ایسے مقامات میں لام زائد ہوتا ہے تسہیل میں ہے کہ لام جر غیر جحودی کے بعد اَن ظاہر بھی ہوتا ہے اور مضمر بھی۔

بیضاوی نے آیت میں تفسیر اس طرح کی ہے کہ دونوں جگہ يُرِيْدُ کا مفعول محذوف ہے اور لام علت کیلئے ہے مطلب اس طرح ہے اللہ نہیں چاہتا کہ طہارت کا امر تم پر تنگی ڈالنے کیلئے دے بلکہ وہ تم کو طہارت کا حکم اس لئے دینا چاہتا ہے کہ تم کو پاک کر دے اور نعمت کی تکمیل کر دے۔ اس تفسیر میں یہ خرابی ہے کہ پہلے امر دیا گیا اور امر دینے کی علت نہیں ظاہر کی گئی اور پھر ارادہ امر کی علت بیان کر دی (حالانکہ امر دینے کے بعد امر کی علت بیان کرنی چاہئے تھی ارادہ امر کی علت کا اظہار بے جوڑ ہے)۔

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ تاکہ تم شکر ادا کرو۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اور تم پر جو اللہ کا انعام ہے اس کو یاد کرو کہ اس نے اپنا پیغمبرؐ بھیجا، کتاب نازل کی تم کو اسلام کی توفیق دی اور دوسرے احسانات کئے ان سب کو یاد کرو تاکہ اس سے تم کو انعام دینے والے کی یاد اور اس کا شکر ادا کرنے کی رغبت ہو۔

وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ اور اللہ سے کئے ہوئے اس عہد کو بھی یاد کرو جو اللہ نے تم سے پختہ طور پر لے لیا تھا جبکہ تم نے کہا تھا ہم نے حکم سن لیا ہم فرماں برداری کریں گے۔ میثاق سے مراد وہ میثاق ہے

جو بیعت کے وقت رسول اللہ ﷺ نے ان سے لیا تھا کہ تنگی ہو یا فراخی دل چاہے نہ چاہے۔ بہر حال اطاعت کریں گے۔ حضرت عبادہؓ بن صامت کی روایت سے یہ حدیث بخاری اور مسلم نے نقل کی ہے۔ یا وہ میثاق مراد ہے جو لَیْلَۃُ الْعُقْبَہ (گھاٹی والی رات) میں رسول اللہ ﷺ نے انصار سے لیا تھا جس کو بخاری وغیرہ نے بیان کیا ہے یا وہ میثاق مراد ہے جو حدیبیہ کے مقام پر سب نے کیا تھا، اس میثاق کا بیان آیات قرآنی میں بھی آیا ہے۔

مجاہدؒ اور مقاتلؒ کے نزدیک وہ میثاق مراد ہے جو ذریت آدم کو آدم کی پشت سے نکالنے کے بعد سب سے اللہ نے لیا تھا۔

اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا میثاق کا بیان ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اور اللہ سے ڈرو، یعنی احسان فراموشی اور عہد شکنی سے پرہیز کرو۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۞ یہ حقیقت ہے کہ اللہ ان کے دلوں کے اسرار سے خوب واقف ہے، یعنی دلوں کے اندر جو اچھے برے خیالات پیدا ہوتے ہیں ان سے بھی اللہ واقف ہے ظاہری اعمال کا تو ذکر ہی کیا ہے، اس آیت میں (اہل ایمان و صلاح کے لئے) وعدۂ ثواب اور (اہل کفر و معصیت کے لئے) وعید عذاب ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ز اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے لئے پوری پابندی کرنے والے، انصاف کے ساتھ شہادت ادا کرنے والے رہو، یعنی خود اپنی ذات اور دوستوں کے خلاف بھی عدل اور سچائی کی شہادت دینے کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اور کسی خاص لوگوں کی عداوت تم کو اس پر باعث نہ ہو جائے کہ تم عدل نہ کرو۔

جَرْمٌ اور اِجْتِرَامٌ کمانا جَرَمَ لِاَهْلِهٖ اپنے گھر والوں کے لئے کمایا (قاموس) اس جگہ لَا يَجْرِمَنَّ اپنے اندر ابھارنے آمادہ اور برانگیختہ کرنے کا مفہوم رکھتا ہے اس لئے لفظ حَمَلَ کے بعد جو حرف جار (علیٰ) آتا ہے اسکا استعمال يَجْرِمَنَّ کے بعد کیا گیا گویا یہ مطلب ہوا کہ مشرکوں سے تمہاری سخت عداوت تم کو اس امر پر آمادہ نہ کر دے کہ ان کے سلسلہ میں تم عدل کو چھوڑ بیٹھو اور حد جواز سے آگے بڑھ کر مشرکوں کے ساتھ ایسی حرکتیں کرنے لگو جو تمہارے لئے ناجائز ہیں مثلاً مقتول مشرک کے ناک، کان کاٹنا مشرکوں کی عورتوں کو قتل کرنا (بلا ثبوت) زنا کی تہمت لگانا، کیے ہوئے معاہدہ کو توڑنا وغیرہ۔

اِعْدِلُوْا ۟ انصاف کرو، یعنی کج راہی نہ اختیار کرو جور کی ممانعت مذکورہ بالا آیت میں کر دی گئی تھی لفظ اِعْدِلُوْا سے اس کی مزید تاکید کر دی۔

هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ز یعنی عدل، ہر چیز سے زیادہ تقویٰ کے قریب ہے، لِلتَّقْوٰى میں لام بمعنی الی ہے، تقوی کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے ناپسندیدہ امور سے اپنے نفس اور ظاہری باطنی قوتوں کو بچایا جائے تاکہ آخرت میں اللہ کی ناراضگی اور عذاب سے حفاظت ہو جائے، اور عدل و جور کا تعلق انسانی حقوق سے ہے اور انسانی حقوق کی نگہداشت کو تقویٰ میں سب سے بڑا دخل ہے اس لئے عدل کو اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى فرمایا۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اور اللہ سے ڈرو یعنی ماموٗرات و منہیات کے عمل و ترک میں اللہ سے ڈرتے رہو۔

اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۞ یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے۔ یعنی اعمال کی جزا سزا دے گا، اس جملہ میں (نیکوں کے لئے) وعدۂ ثواب اور (بدوں کے لئے) وعید عذاب ہے، اس حکم کی تکرار یا تو اس وجہ سے ہے کہ پہلی آیت کے مخاطب مشرک ہیں اور اس آیت کے مخاطب یہودی یا صرف عدل پر زور دینے اور آتش انتقام کو بجھانے کے لئے حکم کی تکرار کر دی گئی۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۞ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کے گناہوں کی مغفرت ہو گی اور ان کو بڑا اجر ملے گا۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝ اور جن لوگوں نے (ماننے سے) انکار کیا اور تکذیب کی وہی دوزخی ہیں۔ یعنی کبھی دوزخ سے الگ نہ ہوں گے۔

کلام خداوندی کا اسلوب ہے کہ ایک فریق (اور اس کے عواقب) کا ذکر کرنے کے بعد دوسرے فریق (اور اس کے نتائج) کا ذکر کرتا ہے (آیات مذکورہ بالا میں بھی یہی اسلوب پیش نظر رکھا گیا ہے)۔

بغوی نے اپنے سلسلہ سند سے مجاہد، عکرمہ، کلبی اور ابن بشار کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت منذر بن عمر ساعدی کو مہاجرین و انصار کی تیس آدمیوں کی جماعت کے ساتھ بنی عامر بن صعصعہ کی طرف (تبلیغ اسلام کے لئے) بھیجا یہ منذر وہی تھے جو گھاٹی والی رات میں (انصار کے) نمائندوں میں سے ایک نمائندہ تھے حسب الحکم یہ لوگ گئے اور بنی عامر کے ایک چشمہ پر جس کا نام بیر معونہ تھا بنی عامر بن طفیل سے مقابلہ ہوا (بنی عامر نے فریب کیا اور سب کو قتل کر دینا چاہا) اور لڑائی ہو پڑی، نتیجہ میں حضرت منذرؓ اور آپ کے ساتھی شہید ہو گئے صرف تین مسلمان بچے جو گم شدہ اونٹنی ڈھونڈھنے گئے ہوئے تھے ان تین میں سے ایک عمرو بن امیہ ضمری تھے یہ بات دیکھ کر ان تینوں کو اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کچھ پرندے آسمان پر چکر کاٹ رہے ہیں اور ان کی چونچوں سے خون کے لوتھڑے زمین پر گر رہے ہیں یہ سماں دیکھ کر ایک صاحب بولے ہمارے ساتھی قتل کر دیئے گئے۔ یہ کہہ کر اپنی جماعت کی طرف رخ کر کے دوڑتے ہوئے پلٹ پڑے راستہ میں ایک آدمی سے مقابلہ ہوا دونوں میں لڑائی ہونے لگی آخر ایک ضرب مسلمان کے کاری لگی تو انہوں نے آسمان کی طرف سر اٹھایا آنکھیں کھولیں اور فرمایا اللہ اکبر، رب العلمین کی قسم میں جنت میں داخل ہو گیا دوسرے دونوں ساتھی بھی لوٹ پڑے ان کا مقابلہ بنی سلیم کے دو آدمیوں سے ہوا (بنی سلیم بنی عامر کی ایک شاخ تھی) ان دونوں آدمیوں نے اپنا نسب بنی عامر سے ملایا تو دونوں مسلمانوں نے (ان کو کافر سمجھ کر) قتل کر دیا، مگر واقع میں بنی سلیم اور رسول اللہ ﷺ کا ایک معاہدہ صلح ہو چکا تھا، جس کی وجہ سے بنی سلیم والے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں خون بہا مانگنے حاضر ہوئے (خون بہا ادا کرنے کو پیسہ نہ تھا اس لئے) رسول اللہ ﷺ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو ساتھ لے کر کعب بن اشرف (یہودی) اور بنی نضیر کے پاس تشریف لے گئے تاکہ دیت ادا کرنے میں ان سے مالی امداد لیں کیونکہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے معاہدہ کیا تھا کہ مسلمانوں اور یہودیوں میں لڑائی نہ ہوگی اور (اگر مسلمانوں کو ضرورت ہوئی تو) خون بہا ادا کرنے میں مسلمانوں کی مدد کریں گے رسول اللہ ﷺ کا مطلب سمجھ کر یہودیوں نے کہا، ہاں ابوالقاسم اب وقت آیا ہے کہ تم ہم سے آکر اپنی ضرورت مانگو، بیٹھو۔ اول ہم تم کو کھانا کھلائیں گے پھر جو کچھ مانگتے ہو وہ دیں گے۔ رسول اللہ ﷺ بیٹھ گئے۔ یہودیوں نے باہم مشورہ کیا اور کہا محمد! (ﷺ) جس قدر آج تمہارے قریب آ گئے ہیں آئندہ اتنے قریب کبھی نہیں آئیں گے، اس وقت اگر کوئی ہو تا کہ اس مکان کی چھت پر چڑھ کر اوپر سے محمد پر ایک بڑا پتھر گرا دیتا تو (ہمیشہ کے لئے ہم کو سکھ مل جاتا، عمرو بن حجاش نے کہا ایسا میں کر لوں گا چنانچہ وہ ایک بڑی چکی کے پاٹ نیچے گرا دینے کے ارادہ سے گیا، مگر اللہ نے یہودیوں کے ہاتھ باندھ دیئے اور جبرئیلؑ نے آکر رسول اللہ ﷺ کو خبر دے دی اور حضور ﷺ مدینہ کو لوٹنے کے ارادہ سے باہر آ گئے، پھر حضرت علیؓ کو بلا کر فرمایا تم اپنی جگہ سے نہ ہٹنا اگر میرے رفقاء میں سے کوئی شخص تمہارے پاس آکر مجھے دریافت کرے تو کہہ دینا کہ وہ مدینہ کو گئے ہیں حضرت علیؓ نے حکم کی تعمیل کی، یہاں تک کہ ایک ایک کر کے سب ساتھی نکل آئے اور رسول اللہ ﷺ کے پیچھے پیچھے آ گئے۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اے اہل ایمان اپنے اوپر اللہ کے کئے ہوئے احسان کو یاد کرو، یہ پورا قصہ محمد بن اسحاق اور ابن عمرؓ اور ابن سعدؓ نے ذکر کیا ہے، اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ سلام بن مشکم نے یہودیوں کو اس حرکت سے روکا تھا اور کہا تھا کہ اگر تم ایسا کرو گے تو ان کو اطلاع ضرور مل جائے گی کہ ہم نے معاہدہ کو توڑ دیا یہ معاہدہ کی خلاف ورزی ہے، ایسا نہ کرو۔

ابن جریر نے عکرمہ اور یزید بن زیاد اور عبد اللہ بن ابی بکرؓ اور عاصم بن عمر بن قتادہؒ اور مجاہد اور عبد اللہ بن کثیر اور ابو مالک کی روایات سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت ابو بکر کو ساتھ لے کر نکلے، الحدیث اس روایت میں حضرت منذرؓ اور آپ کے ساتھیوں کی شہادت کا ذکر نہیں ہے۔

ابو نعیم نے دلائل النبوۃ میں حسنؒ بصری کے طریق سے حضرت جابرؓ بن عبد اللہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ بنی محارب کے ایک آدمی نے جس کو غویرث بن حارث کہا جاتا تھا اپنی قوم والوں سے کہا میں جا کر محمد (ﷺ) کو قتل کئے دیتا ہوں یہ کہہ کر وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف آیا، آپ بیٹھے ہوئے اور تلوار گود میں رکھی تھی، غویرث نے کہا محمد (ﷺ) ذرا میں آپ کی تلوار دیکھوں، حضور ﷺ نے فرمایا اچھا (لو) غویرث نے تلوار لے کر نیام سے کھینچی اور ہلانے لگا، اس کا ارادہ مارنے کا ہو رہا تھا مگر اللہ اس کو ذلیل کر رہا تھا کہنے لگا محمد ﷺ کیا تم کو مجھ سے ڈر نہیں لگتا (میرے ہاتھ میں ننگی تلوار ہے) حضور ﷺ نے فرمایا نہیں، بولا میرے ہاتھ میں تو تلوار ہے حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تجھ سے میری حفاظت کرے گا یہ سن کر اس نے تلوار نیام میں کی اور رسول اللہ کو واپس کر دی اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اس روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس وقت بنی غطفان کا محاصرہ کئے ہوئے تھے، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے عوفی کے طریق سے حضرت ابن عباسؓ کا قول اس آیت کی تشریح میں اس طرح نقل کیا ہے کہ کچھ یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے لئے کھانا تیار کیا اور مقصد یہ تھا کہ (دھوکہ سے بلا کر) رسول اللہ ﷺ کو قتل کر دیں گے، اللہ نے وحی کے ذریعہ سے یہودیوں کی حالت کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو دے دی اور کھانے کو نہیں گئے اور حضور ﷺ کے حکم کے مطابق صحابہؓ بھی کھانے کو نہیں گئے، شیخین نے حضرت جابرؓ کی روایت سے یہ قصہ نقل کیا ہے لیکن ان کی روایت میں اس آیت کے نزول کا ذکر نہیں ہے۔

بیہقی نے دلائل میں قتادہؒ کی روایت سے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول عربوں کے ایک قبیلہ کے متعلق ہوا تھا جس نے دھوکہ سے رسول اللہ ﷺ کو قتل کر دینے کا ارادہ کیا تھا اور ایک بدو کو بھیجا تھا، وہی بدو جو حضور کے پاس اس وقت پہنچا تھا جب آپ کسی پڑاؤ پر سو رہے تھے بدو نے آپ کی تلوار پر قبضہ کر لیا اور کہا اب مجھے تم سے کون روک سکتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ، فوراً اس کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی مگر حضور ﷺ نے اس کو سزا نہیں دی۔

اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ جب کچھ لوگوں نے (قتل کرنے کے لئے) تمہاری طرف ہاتھ بڑھائے تھے بَسَطَ اِلَيْهِ يَدَهٗ اس کی طرف ہاتھ بڑھایا یعنی پکڑا بَسَطَ اِلَيْهِ لِسَانَهٗ اس پر زبان درازی کی یعنی گالی دی۔

فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ پس اللہ نے تم سے ان کے ہاتھوں کو یعنی ضرر رسانی کو روک دیا۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ⑪ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ رکھنا چاہئے۔ وہی بھلائی پہنچانے اور شر کو دفع کرنے کے لئے کافی ہے۔ وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اور (امر فرعون سے فراغت کے بعد جب اللہ نے توریت نازل فرمائی تو) اللہ نے بنی اسرائیل سے ایک پختہ وعدہ لیا تھا، میثاق لینے کا قصہ سورۂ بقرہ میں آیت وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ کے ذیل میں گذر چکا ہے۔

اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار بھیجے، نقیب سے مراد ہے ہر خاندان کا ایک سردار جو اپنی قوم کے احوال کا نگراں تھا اور سب کی طرف سے ذمہ دار تھا کہ سب لوگ حکم کی تعمیل کریں گے اور اپنے پیغمبر کے حکم کے مطابق وہ اپنی قوم کو بھلائی کا حکم دیتا تھا اور برائی سے باز داشت کرتا تھا۔

وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ ۭ اور اللہ نے فرمایا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں یعنی جب تک تم عہد کو پورا کرتے رہو گے اللہ کا ساتھ ہونا بے کیف ہے (یعنی مخلوق کی معیت کی کیفیت سے خالی ہے۔ اللہ کی معیت کی حقیقت کو نہیں بیان کیا جا سکتا) ہاں اللہ کی معیت کا نتیجہ یہ ہے کہ اوامر و نواہی کی پابندی ہو جاتی ہے سینہ کھل جاتا ہے اور دل میں اطمینان پیدا ہو جاتا ہے۔

آیت مذکورہ پوری ہو گئی کیونکہ اگلے جملہ پر لام ابتدائیہ تاکید یہ آیا ہے (جو اِسْتِیْنَافِ کَلَام کو چاہتا ہے)۔

لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَیْتُمُ الزَّکٰوۃَ وَ اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ اگر تم ٹھیک ٹھیک نماز پڑھو گے اور زکوٰۃ ادا کرو گے اور میرے پیغمبروں کو مانو گے یعنی موسیٰ کے بعد آنے والے پیغمبروں کو جنہوں نے موسیٰ کی تصدیق کی۔ پیغمبروں میں تفریق بالکل نہ کرو گے (کہ کسی کو مانو اور کسی کا انکار کر دو)۔

وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ اور انکی تائید کرو گے تعزیر سے مراد ہے تعظیم کرنا۔ تائید کرنا اور مدد کرنا قاموس میں عزرٌ (مصدر مجرد) ملامت کرنا، اور تعظیم و تکریم کرنا۔ یہ لفظ متضاد المعنی ہے۔ مدد کرنا۔ قوت پہنچانا، نصرت بہم پہنچانا صحاح میں ہے تعزیر کا معنی ہے۔ تعظیم آمیز مدد کرنا۔ اصلی لغوی معنی ہے دفع کرنا، رد کرنا، کسی کی مدد کرنے میں اس کے دشمنوں کی مدافعت ہوتی ہے۔ حد شرعی سے کم سزا کو تعزیر اسی لئے کہتے ہیں کہ اس سے برے اعمال سے باز داشت اور بدکاریوں کا دفاع ہوتا ہے۔

وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا اور اللہ کو اچھا قرض دو گے۔ یعنی راہ خیر میں خرچ کرو گے۔ بعض علماء نے اللہ کو قرض دینے کا معنی بیان کیا ہے ہر نیکی کرنا۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ کے بندوں کو قرض دو گے۔ اس وقت اللہ سے پہلے مضاف محذوف ہو گا (اور مجاز بالحذف ہو جائے گا) یا یہ مطلب کہ لوگوں کو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے دو گے (اس وقت مجاز فی الاسناد ہو گا)۔

قرض حسن وہ قرض ہے جو لینے والے پر احسان رکھنے سے خالی ہو۔ اس میں غرور اور دکھاوٹ بھی نہ ہو اور ان تمام امور سے پاک ہو جن سے عمل اکارت جاتا ہے۔

لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ تو میں ضرور تمہاری بدیوں کا کفارہ کر دوں گا۔

وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اور ضرور تم کو ان جنتوں میں داخل کر دوں گا جن کے (درختوں اور کوٹھیوں کے) نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔

فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ پھر جس نے اس کے بعد کفر کیا تم میں سے یعنی مضبوط عہد اور تعمیل احکام کے پختہ وعدے کے بعد جس نے کفر کیا۔

فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ﴿۱۲﴾ تو وہ سیدھے راستے اور حق کی راہ سے بھٹک گیا۔ سَوَآءَ السَّبِیْل میں سواء (مصدر) اسم فاعل کے معنی میں ہے اور صفت کی موصوف کی جانب اضافت کر دی گئی ہے۔ سیدھے راستہ سے بھٹک جانے سے مراد ہے ایسی واضح اور کھلی گمراہی جس میں کوئی شبہ نہ ہو اور نہ اس کا کسی طرح عذر ہو سکے، اسی لئے مستقبل کی تعبیر ماضی کے صیغہ (ضَلَّ) سے کی اور ماضی سے پہلے لفظ قد لا کر مزید پختگی ظاہر کر دی۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّیْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ پھر ان کے مضبوط عہد کو توڑ دینے کے سبب سے ہی ہم نے ان پر لعنت بھیج دی۔ ما زائد ہے جو عظمت نقض عہد کو ظاہر کر رہا ہے۔ لعنت سے عطاءؒ کے نزدیک رحمت سے خارج کر دینا مراد ہے اور حسنؒ و مقاتلؒ کے نزدیک صورتیں مسخ کر دینا۔ بعض علماء کے نزدیک جزیہ مقرر کرنا مراد ہے مطلب یہ ہے کہ چونکہ نصاریٰ نے محمد ﷺ کی تکذیب کی اور یہودیوں نے حضرت عیسیٰ اور رسول اللہ ﷺ اور بعض دوسرے انبیاء کو سچا نہ مانا اور اللہ کی کتابوں کو پس پشت پھینک دیا اور فرائض الٰہیہ سے منہ موڑا اس لئے ہم نے بھی ان پر لعنت بھیج دی۔

وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِیَةً اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا کہ نہ اللہ کے ذکر سے ان میں نرمی آتی ہے نہ اللہ کی آیات و تنبیہات کا ان پر اثر پڑتا ہے۔ قَاسِیَۃ کا لفظ قَسْوَۃٌ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے۔ دل کی سختی حَجَرٌ قَاسٍ سخت پتھر (صحاح) حضرت ابن عباسؓ نے قاسیۃ کا معنی بیان کیا ہے یابسہ (خشک) اس سے بھی سختی ہی مراد ہے۔

بعض قراتوں میں قَاسِیَۃ کی جگہ قَسِیَّۃ آیا ہے بغوی نے لکھا ہے دونوں لفظوں کا معنی ایک ہی ہے بیضاوی کے نزدیک قَسِیَّۃ یا تو قَاسِیَۃ سے مبالغہ کا صیغہ ہے یا اس کا معنی ہے خراب ناکارہ درہم قسی کھوٹے درہم کو کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اس

صورت میں بھی سختی ہی کا معنی ہو گا۔ کھوٹے روپیہ میں بھی خشکی اور سختی ہوتی ہے۔ بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ ان کے دلوں میں خالص ایمان نہیں ہے بلکہ کھوٹے درہم کی طرح کفر و نفاق سے آلودہ ہے۔

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (توریت کے خداوندی) الفاظ کو ان کی جگہ سے ہٹانے لگے۔ تحریف سے مراد بعض علماء کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے اوصاف کو بدل ڈالنا ہے۔ بعض کے نزدیک غلط توجیہ کرنا (یعنی الفاظ کے غلط معنی بیان کرنا)۔

وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ اور جو نصیحت ان کو کی گئی تھی اس کا ایک کامل حصہ بھول گئے۔ بھول جانے سے مراد ہے چھوڑ دینا یعنی توریت کے اندر اور پیغمبروں کی زبانی جو اتباع محمدی کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کو بنی اسرائیل نے ترک کر دیا۔ یا یہ مطلب ہے کہ بنی اسرائیل نے نصیحت کے اس حصہ کو ترک کر دیا جو ان کو دیا گیا۔ اسلاف کو اتباع موسیٰ کا حکم دیا گیا تھا۔ انہوں نے اس کو ترک کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اس زمانہ کے لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کے اتباع کا حکم دیا گیا تو انہوں نے اس کو ترک کر دیا۔

تحریف کو بصیغہ مضارع اور نسیان کو بصیغہ ماضی ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ تحریف نسیان پر مرتب تھی نسیان پہلے ہوا اور تحریف اس کے بعد۔

بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا کہ تحریف کرنے کی نحوست کی وجہ سے ان علوم کو بھول گئے جو ان کو یاد تھے۔ امام احمدؒ نے الزہد میں حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ آدمی گناہ کرنے کی وجہ سے اس علم کو بھول جاتا ہے جس سے اس کو واقفیت ہوتی ہے پھر آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اور آپ کو آئے دن ان کی کسی نہ کسی خیانت کی اطلاع ہوتی رہتی ہے۔ خَائِنَۃ بروزن فاعلہ بمعنی مصدر ہے جیسے کَاذِبَۃ (بمعنی کذب) اور لَاغِنَۃ بمعنی لعن) یا یہ لفظ اپنے فاعلی معنی پر قائم ہے اور اس کا موصوف محذوف ہے جیسے خیانت کار گروہ یا خیانت کرنے والی طبیعت یا خیانت والی حرکت۔ یا یوں کہا جائے کہ خائنہ میں ہا، مبالغہ کی ہے یعنی پکا خیانت کار۔

مِنْهُمْ کی ضمیر تمام بنی اسرائیل کی طرف راجع ہے خواہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں موجود ہوں یا پہلے گزر گئے ہوں اور اطلاع کا لفظ جس طرح معائنہ کو شامل ہے اسی طرح خبر کو بھی یعنی خیانت اور غداری ان کی عادت میں داخل ہے انکے بزرگ بھی اپنے زمانہ کے پیغمبروں سے غداری کرتے رہے ہیں اور یہ بھی آپ سے غداری کرتے رہتے ہیں۔ ان یہودیوں کی خیانت سے مراد ہے معاہدہ کی خلاف ورزی اور حضور ﷺ کے خلاف مشرکوں کی امداد اور رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کا ارادہ کرنا اور زہر دینا وغیرہ۔

اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ مگر ان میں سے تھوڑے آدمی مستثنیٰ ہیں۔ انہوں نے خیانت نہیں کی یہ وہی نیکو کار گروہ تھا جو حضرت موسیٰؑ کے عہد نبوت میں پیغمبر وقت پر ایمان لایا۔ پھر حضرت عیسیٰؑ کے دور میں عیسیٰؑ کی تصدیق کی اور رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی تو آپ پر ایمان لے آیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اِلَّا قَلِيْلًا کا استثناء جَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قَاسِيَةً سے ہے یعنی تھوڑے لوگوں کے دلوں کو ہم نے سخت نہیں کیا۔ مگر یہ تشریح غلط ہے کیونکہ دلوں کے سخت ہو جانے کا سبب نقض میثاق کو قرار دیا گیا ہے اور میثاق شکن لوگوں میں سے کوئی بھی قساوت قلب سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ پس آپ ان سے درگزر کیجئے اور پہلو پھیر لیجئے یعنی ان سے کچھ تعرض اور ان کی حرکت کا مواخذہ نہ کیجئے بلکہ ان سے وہی سلوک کیجئے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ یہ حکم عفو حکم قتال کے خلاف نہیں ہے کیونکہ قتال بحکم خدا واجب ہوا اور درگزر کا حکم اس جرم کی سزا سے دیا گیا جو خاص رسول اللہ ﷺ کی ذات سے تعلق رکھتا تھا۔ یعنی آپ کی ذات کو دکھ دینے اور ارادہ قتل کرنے کا جو جرم ان سے سرزد ہوا ہے اس سے درگزر کیجئے۔

بعض علماء نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ اگر یہ توبہ کر لیں اور ایمان لے آئیں یا معاہدہ کر لیں اور جزیہ

ادا کرنے کا اقرار کر لیں تو ان سے درگزر کیجئے۔ بعض علماء کے نزدیک آیت جہاد کے حکم سے اس آیت کو منسوخ کر دیا گیا۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ حقیقت یہ ہے کہ اللہ بھلائی کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ یہ حکم معافی کی علت اور عفو کی ترغیب ہے اور اس بات پر تنبیہ ہے کہ خیانت کار کافر کو معاف کر دینا بھی اچھا کام ہے دوسرے لوگوں کا توذکر ہی کیا ہے۔

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ اور بعض لوگوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں ہم نے ان سے (بھی) میثاق لیا تھا یعنی انجیل میں اور عیسیٰؑ کی زبانی ہم نے نصاریٰ کا میثاق (پختہ وعدہ) لیا تھا کہ انجیل جو توریت کی تصدیق کرتی ہے اور ایک آنے والے رسول کی بشارت دے رہی ہے جن کا نام محمد ﷺ ہوگا اور وہ عیسیٰؑ کے بعد آئیں گے تم انجیل کے اس حکم کی تعمیل کرنا۔ حسنؒ نے کہا اس آیت سے یہ بات نکل رہی ہے کہ عیسائیوں کا لقب نصاریٰ اللہ نے نہیں رکھا بلکہ خود انہوں نے اپنے کو نصاریٰ کہا۔

اولیٰ مطلب اس طرح ہے کہ انہوں نے خود اپنے کو نصاریٰ کہا۔ یعنی اللہ کی مدد کرنے کا دعویٰ کیا واقع میں ایسا نہیں در حقیقت اس کلام میں ان عیسائیوں پر طنز ہے۔ جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے کہ تمہارے اسلاف تو اللہ کے مددگار ہونے کے مدعی تھے اور واقع میں کچھ ان میں سے تھے بھی انصارِ خدا اور ان سے ہم نے عہد لیا تھا اور چونکہ تم ان کی پیروی کے مدعی ہو اس لئے وہ عہد تم پر بھی لاگو ہے گویا اللہ نے تم سے بھی میثاق لے لیا ہے۔

فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ پھر وہ (کامل) حصہ یا اپنا حصہ اس نصیحت کا بھول گئے جو (انجیل میں) ان کو کی گئی تھی۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی ان کو بشارت دے دی گئی تھی مگر آپ کی بعثت کے بعد انہوں نے تکذیب کی اور اس سے پہلے بھی اپنے اپنے میلان نفسانی کے زیر اثر ان کے فرقے بن گئے تھے۔ ملکانیہ، نسطوریہ اور یعقوبیہ جماعتیں الگ الگ ہو گئی تھیں کوئی کہتا تھا اللہ تین میں کا تیسرا ہے کوئی قائل تھا کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے اور کسی کی رائے تھی کہ اللہ تو مسیح ہی ہے۔

فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اندر قیامت کے دن تک کیلئے ہم نے دشمنی اور باہمی عداوت کو بھڑکا دیا۔ قتادہ اور مجاہد کے نزدیک بَيْنَهُمْ کی ضمیر یہود و نصاریٰ کی طرف راجع ہے یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان ہم نے ہمیشہ کیلئے دشمنی ڈالدی لیکن ربیع (بن انسؒ) کے نزدیک نصاریٰ کے مختلف فرقوں کی طرف ضمیر کا رجوع ہے یعنی نصاریٰ کے فرقوں میں باہم ہم نے عداوت بھڑکا دی (سیاق کلام سے) یہی ظاہر ہے۔

وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۴﴾ اور آئندہ (قیامت کے دن جزاء سزا دے کر) اللہ ان کو بتا دے گا جو کچھ وہ کرتے تھے یعنی دنیا میں کفر معصیت اور آسمانی کتابوں کی خلاف ورزی جو کچھ یہ کرتے تھے قیامت کے دن اس کی سزا دے کر اللہ ان کو بتا دے گا کہ تمہاری یہ حرکتیں گمراہی کی تھیں۔ واللہ اعلم۔

ابن جریر نے عکرمہ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کچھ یہودی رجم (سنگسار کر دینے) کا حکم دریافت کرنے کے لئے حاضر ہوئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تمہارا سب سے بڑا عالم کون ہے (اس کو پیش کرو) یہودیوں نے ابن صوریا کی طرف اشارہ کیا۔ حضور ﷺ نے ابن صوریا کو اس خدا کی قسم دی جس نے موسیٰ پر توریت اتاری تھی اور بنی اسرائیل کے سروں پر طور کو اٹھا کر (توریت پر عمل کرنے کا) مضبوط وعدہ لیا تھا اور دریافت فرمایا کہ کیا تمہاری کتاب میں رجم کی سزا ہے اگر ہے تو تم لوگوں نے اس کو کس طرح ترک کر دیا۔ ابن صوریا نے کہا۔ جب ہمارے اندر زنا کی کثرت ہو گئی (اور سنگسار کرنا دشوار ہو گیا) تو ہم نے خود سو تازیانے مارنے اور سر مونڈنے کی سزا جاری کر دی یہ سن کر حضور ﷺ نے رجم کا حکم دے دیا۔ اس پر اللہ نے آیت ذیل صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ تک نازل فرمائی۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ اے حاملان کتاب یہ لفظ یہودیوں اور عیسائیوں کو شامل ہے اور لفظ کتاب چونکہ جنس ہے اس لئے اس کو واحد ذکر کیا گیا (اگرچہ یہودیوں کی کتاب جدا اور عیسائیوں کی کتاب جدا تھی)۔

قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا ہمارا پیغمبر تمہارے پاس آپہنچا یعنی محمد ﷺ مبعوث ہوگئے۔
يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ جو کتاب کی بہت باتیں جن کو تم چھپایا کرتے تھے کھول کر تمہارے سامنے بیان کر رہا ہے یعنی توریت و انجیل کی صراحتیں جو تم چھپایا کرتے تھے مثلاً آیت رجم اور محمدؐ کے اوصاف کا بیان جو توریت میں مذکور تھا اور محمدؐ کے متعلق بشارت جو انجیل میں مذکور تھی، یہودی اور عیسائی پوشیدہ رکھتے تھے۔
وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ اور بہت امور (جو یہودی اور عیسائی چھپاتے تھے مگر کوئی دینی بحث ان پر موقوف نہ تھی ان کی طرف سے اعراض کرلیتا ہے ان کو نہیں بیان کرتا۔ یا یہ مطلب ہے کہ بہت سے اہل کتاب سے درگزر کرتا ہے ان کے جرم کا مواخذہ نہیں کرتا۔
قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ کوئی شبہ نہیں کہ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس نور آپہنچا نور سے مراد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے یا اسلام۔
وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ اور احکام کو واضح کرنے والی یا کھلے ہوئے معجزہ والی کتاب بھی آگئی۔[1] کتاب سے مراد قرآن ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نور سے مراد بھی قرآن ہی ہو۔ اور کتاب مبین کا عطف تفسیری ہو۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات مقدس اور قرآن مجید دونوں کفر کی تاریکیوں کو دور کرنے والے تھے، اس لئے دونوں کو نور فرمایا۔
يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ جو اللہ کی خوشنودی کے درپے ہوگا۔ اللہ اس (کتاب اور رسول اللہ ﷺ) کے ذریعہ سے اس کو بتادے گا۔ بہ کی ضمیر واحد کی ہے لیکن مراد تثنیہ ہے، کیونکہ دونوں کا اتباع ایک ہی ہے یا حکم میں ایک کی طرح ہے۔
سُبُلَ السَّلٰمِ سلامتی کے راستے۔ یعنی اللہ کے عذاب سے محفوظ رہنے کے راستے بعض علماء نے کہا اسلام اللہ کا نام ہے اور اس کے راستے اس کے احکام و ضوابط ہیں جو اللہ کے قریب تک پہنچانے والے ہیں (یعنی اللہ اپنے قرب تک پہنچانے والے ضابطے اور احکام بتادے گا)۔
وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ اور اپنے ارادہ اور توفیق سے (کفر کی) تاریکیوں سے نکال کر (ایمان کے) نور تک ان کو پہنچادے گا۔
وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾ اور ان کو سیدھا راستہ دکھادے گا۔ یعنی اللہ تک پہنچانے والا سیدھا راستہ بتادیگا، سیدھے راستے سے مراد ہے اسلام۔
لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ جن لوگوں نے کہا کہ اللہ مسیح بن مریم ہی ہے وہ قطعاً کافر ہوگئے۔ یہ قول فرقہ یعقوبیہ کا تھا، جو اللہ اور مسیح کے اتحاد کا قائل تھا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اتحاد کا صراحتہً قائل کوئی بھی نہ تھا لیکن فرقہ یعقوبیہ باوجود توحید کا قائل ہونے کے عقیدہ رکھتا تھا کہ مسیح کے اندر الوہیت تھی اس لئے ان کے عقیدہ پر اتحاد لازم آتا تھا، اس گروہ کی جہالت واضح کرنے اور عقیدہ کی خرابی ظاہر کرنے کے لئے نتیجۂ عقیدہ کو عقیدہ کی شکل میں ذکر فرمادیا (یعنی زبان سے اگرچہ وہ اللہ کو واحد کہتے تھے مگر مسیح کے اندر الوہیت ہونے کے قول پر اللہ کا مسیح ہونا ہی لازم آتا ہے اس لئے خواہ زبان سے اتحاد کا اقرار نہ کیا جائے۔ مگر اللہ اور مسیح کا ایک ہونا لازمی نتیجہ نکلے گا اس لازمی نتیجہ کو فرقہ یعقوبیہ کا عقیدہ صرف ان کی جہالت واضح کرنے کے لئے قرار دیا گیا)۔
قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ آپ کہہ دیں کہ اللہ اگر مسیح بن مریم اور اس کی ماں اور تمام اہل زمین کو ہلاک کرنا چاہے تو کون ایسا شخص ہے جو اللہ سے ان کو ذرا بھی بچا سکے۔ یعنی دوسری مخلوق کی طرح مسیح اور ان کی ماں بھی اللہ کے بندے تھے۔ دونوں

[1] اول ترجمہ کی صورت میں مبین متعدی ہوگا یعنی روشن کرنے والی اور دوسرے ترجمہ کی صورت میں لازم ہوگا، یعنی روشنی والی۔

جنس ممکنات میں سے تھے حدوث کی صفت ان میں بھی تھی ایک ماں تھی دوسرا بیٹا تھا دونوں قابل فناء تھے کوئی بھی اللہ کی قدرت سے باہر نہیں تھا اگر خدا ان کو تباہ و ہلاک کر دینا چاہے تو دوسری مخلوق کی طرح ان میں بھی دفع کرنے کی طاقت نہیں۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ اور اللہ ہی کی حکومت ہے آسمانوں کی اور زمین کی اور ان دونوں کے درمیانی کائنات کی۔

يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ جو کچھ (جس طرح) وہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے بغیر سابق مادہ کے بھی پیدا کرتا ہے جیسے آسمان و زمین کو (بغیر سابق مادہ کے محض عدم سے) وجود میں لایا اور غیر جنس کے مادہ سے بھی پیدا کر سکتا ہے جیسے آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا اور صرف نر سے بھی پیدا کر سکتا ہے جیسے حوا، کو آدم سے پیدا کیا، اور صرف مادہ سے بھی پیدا کر سکتا ہے جیسے عیسیٰؑ کو مریمؑ سے پیدا کیا اور نر و مادہ کے جوڑ سے بھی پیدا کر سکتا ہے جیسے اکثر جانوروں اور انسانوں کو پیدا کرتا ہے۔

وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ⑰ اور اللہ کے قابو میں سب کچھ ہے زندہ کرنا بھی اور مار دینا بھی، پس ظاہر الاحتیاج ممکن کا اتحاد ایسی ہستی سے کس طرح ممکن ہے جو سب پر قادر اور سب کی مالک اور سب سے اعلیٰ و بالا ہے، محمد بن اسحاق نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ نعمان بن حیی اور بحری بن عمرو اور شاس بن عدی یہودی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کچھ گفتگو کی۔ حضور ﷺ نے بھی ان کو جواب دیئے اور اسلام کی دعوت پیش کی اور اللہ کے عذاب سے ڈرایا۔ اس پر یہ یہودی بھی عیسائیوں کی طرح کہنے لگے محمد (ﷺ) تم ہم کو کس چیز سے ڈراتے ہو، بخدا ہم تو اللہ کے بیٹے اور چہیتے ہیں (وہ ہم کو عذاب کیسے دے گا) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰۗؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ ۭ اور یہود و نصاریٰ نے کہا ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں بعض علماء نے لکھا ہے ان کی اس قول سے مراد یہ تھی کہ اللہ باپ کی طرح ہم پر شفیق و مہربان ہے اور ہم اولاد کی طرح اس کے مقرب اور بلاواسطہ تعلق رکھنے والے ہیں۔

ابراہیم نخعی نے کہا یہودیوں نے توریت میں لکھا دیکھا تھا اے میرے علماء کے بیٹو! انہوں نے احبار کے لفظ کو ابکار کے لفظ سے بدل دیا (اور یوں کہنے لگے کہ اللہ نے ہم کو اپنی دوشیزاؤں کی اولاد قرار دیا ہے گویا ہمارا باپ صرف خدا ہے) اسی لئے وہ اپنے کو اللہ کی اولاد کہنے لگے۔ بعض علماء نے کہا اَبْنٰۗؤُا اللّٰهِ سے ان کی مراد یہ تھی کہ ہم اللہ کے پیغمبروں کی اولاد ہیں (ہم کو عذاب کیسے ہوگا) بعض نے کہا کہ عزیز اور مسیح کو وہ خدا کے بیٹے کہتے تھے اور خود عزیزؑ و مسیح کے گروہ میں ہونے کے مدعی تھے (اور جو گروہ میں داخل ہو اس کو اسی گروہ کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے) اسی لئے وہ اپنے کو اللہ کے بیٹے کہتے تھے جیسے ابوالجنیب عبداللہ بن زبیر کے گروہ کو جنبیوں کا گروہ کہا جاتا ہے۔

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ۭ آپ کہہ دیجئے (اگر تمہارا گمان صحیح ہے) تو پھر اللہ تم کو تمہارے گناہوں کی پاداش میں عذاب کیوں دیتا ہے۔ یعنی باپ تو اپنی اولاد کو عذاب نہیں دیتا اور اللہ تم کو عذاب دیتا ہے دنیا میں بھی اس نے قتل، قید ذلت اور مسخ کا عذاب دیا اور آخرت میں بھی تم کو اقرار ہے کہ چند روز کے لئے تم کو دوزخ کا عذاب دیا جائے گا۔

بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۭ (تم اللہ کے بیٹے ویٹے کچھ نہیں ہو) بلکہ دوسرے آدمیوں کی طرح آدمی ہو، اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہو تم کو بھی نیکی بدی کی جزا سزا دی جائے گی۔

يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ اللہ (اپنی مہربانی سے کفر سے کم درجہ کے) گناہ جس کے چاہے گا معاف کر دے گا اور جس کو چاہے گا (بتقاضائے انصاف) عذاب دے گا۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۡ اور اللہ ہی کی حکومت ہے آسمانوں کی اور زمین کی اور ان دونوں کے درمیانی کائنات کی۔ مملوک اور مخلوق ہونے میں سب برابر ہیں اور مملوک ہونا بیٹے ہونے کے منافی ہے (بیٹا مملوک نہیں ہو سکتا) اس فقرہ میں تنبیہ ہے کہ عزیرؑ اور عیسیٰؑ بھی بیٹے نہیں ہو سکتے۔

وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ﴿۱۸﴾ اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ یعنی ہر شخص کی واپسی اللہ ہی کے پاس ہو گی۔ وہی سب کو اعمال کے مطابق بدلہ دے گا۔ اس فقرہ میں (نیکو کار لوگوں کیلئے) ثواب کا وعدہ اور (بدکار منکروں کے لئے) عذاب کی وعید ہے۔

محمدؒ بن اسحاق نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کو اسلام کی دعوت اور ترغیب دی۔ حضرت معاذؓ بن جبل اور حضرت سعد بن عبادہ نے کہا اے گروہ یہود، اللہ سے ڈرو۔ بخدا تم ضرور جانتے ہو کہ حضور ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ بعثت سے پہلے تو تم حضور ﷺ کا ہم سے ذکر کیا کرتے تھے اور آپ کے اوصاف بیان کیا کرتے تھے اس کے جواب میں رافع بن حریملہ اور وہب بن یہودا بولے ہم نے تم سے یہ نہیں کہا تھا اور موسیٰ کے بعد اللہ نے کوئی کتاب نہیں اتاری اور نہ کسی شخص کو موسیٰ کے بعد پیغمبر بنا کر بھیجا۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا اے اہل کتاب ہمارا پیغمبر یقیناً تمہارے پاس آ چکا یعنی محمد ﷺ۔

يُبَيِّنُ لَكُمْ جو کھول کھول کر تم سے (ہدایت کی علامات اور دین کے احکام) بیان کر رہا ہے۔ علامات ہدایت اور شرائع دین مفعول ہے جس کو ظاہر الفہم ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے یا یوں کہا جائے کہ مفعول کی ضرورت ہی نہیں ہے اس وقت ترجمہ اس طرح ہو گا جو تمہارے سامنے اظہار کر رہا ہے۔

عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ ایسے وقت میں کہ رسولوں کا سلسلہ موقوف تھا۔ عَلَىٰ فَتْرَةٍ کا تعلق جَاءَكُمْ سے ہے، یعنی رسول مکرم ایسے وقت آئے کہ مدت سے پیغمبر نہیں آئے تھے اور وحی کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔

أَن تَقُولُوا مَا جَاءَنَا مِن بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ ۖ فَقَدْ جَاءَكُم بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ ۗ یعنی خدا کو یہ امر پسند نہ تھا کہ تم (قیامت کے دن) بطور عذر کہہ سکو کہ ہمارے پاس تو کوئی بشیر و نذیر (پیغمبر نصیحت کرنے اور اللہ کے احکام پہنچانے کے لئے) آیا ہی نہ تھا (اس لئے ہم بے قصور ہیں) یا تَقُولُوا سے پہلے لا محذوف ہے یعنی تاکہ تم (مندرجہ بالا بات قیامت کے دن) نہ کہہ سکو اب (اللہ کے ثواب کی نیکو کاروں کو) خوشخبری دینے والا اور (بدکار منکروں کو اللہ کے عذاب سے) ڈرانے والا آ گیا۔

وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۹﴾ اور اللہ ہر بات پر قابو رکھتا ہے۔ پس وہ متواتر بہم پیغمبر بھی بھیج سکتا ہے۔ جیسے موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے درمیان پندرہ سو یا سترہ سو برس کی مدت میں ایک ہزار نبی بھیجے۔ ابن سعد اور زبیر بن بکار اور ابن عساکر نے کلبی کا قول لکھا ہے کہ موسیٰ بن عمران اور عیسیٰؑ کی والدہ مریم بنت عمران کے درمیان ایک ہزار سات سو برس کا فصل تھا اور دونوں ایک سبط سے نہیں تھے لیکن حاکم نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ موسیٰ اور عیسیٰ کے درمیان پندرہ سو برس کی مدت ہوئی۔

ابن ابی حاتم نے بحوالہ اعمش لکھا ہے کہ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے درمیان ہزار پیغمبر ہوئے۔

اور سلسلہ نبوت موقوف ہونے کے زمانہ میں بھی پیغمبر کو بھیج سکتا ہے۔ جیسے عیسیٰ کے بعد (مدت تک کسی پیغمبر کو نہیں بھیجا پھر) محمد ﷺ کو بھیجا۔ ابن عساکر اور ابن ابی حاتم نے بحوالہ قتادہ لکھا ہے کہ دونوں کے درمیان سو برس کا فصل ہوا۔ لیکن عبد الرزاق اور عبد بن حمید اور ابن جریر نے بطریق معمر قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان پانچ سو ساٹھ برس کی مدت ہوئی اور عیسیٰؑ کے بعد سوائے حضور ﷺ اور کوئی پیغمبر نہیں ہوا۔

آیت میں احسان کا ذکر ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت اس وقت ہوئی جب وحی کے آثار مٹ چکے تھے اور پیغمبر کی انتہائی ضرورت تھی تو اللہ نے احسان کیا کہ اپنے پیغمبر کو مبعوث فرمایا۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں دنیا اور آخرت میں عیسیٰ کے ساتھ سب سے زیادہ قرابت رکھتا ہوں انبیاء علاتی بھائی ہیں ان کی مائیں (شریعتیں) مختلف ہیں اور دین سب کا ایک ہے اور ہم دونوں کے درمیان کوئی اور پیغمبر نہیں ہوا۔ رواہ البخاری و مسلم فی صحیحیہما۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ اور (یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم (بنی اسرائیل) سے کہا تھا۔

يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اے میری قوم والو اللہ کے احسان کو یاد کرو جو تم پر اللہ نے کیا ہے۔

اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ جب کہ تمہارے اندر اس نے انبیاء بنائے اور انبیاء کے ذریعہ سے تم کو ہدایت اور عزت عطا فرمائی۔ جتنے پیغمبر بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے اتنے کسی قوم میں نہیں ہوئے۔

وَّجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا اور تم کو یعنی تم میں سے یا تمہارے اندر بادشاہ بنائے، فرعون کے بعد بنی اسرائیل میں بکثرت بادشاہ ہوئے، آخر جب حضرت یحییٰ کو انہوں نے قتل کر دیا اور حضرت عیسیٰ کے قتل کے درپے ہو گئے تو سلسلہ ملوکیت ختم ہوا۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔ ملوک سے نوکروں چاکروں والے سردار مراد ہیں۔ قتادہ کا قول ہے کہ سب سے پہلے بنی اسرائیل نے ہی خدمت گار اور نوکر چاکر رکھنے کا دستور نکالا پہلے کسی کے خدمت گار نہیں ہوتے تھے۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابو سعیدؓ خدری کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بنی اسرائیل میں اگر کسی کے پاس خادم بیوی اور سواری ہوتی تھی تو اس کو بادشاہ کہا جاتا تھا۔ زید بن اسلم کی مرسل روایت، حضرت ابو سعیدؓ کی مرفوع روایت کی تائید میں آئی ہے۔ عبدالرحمٰن جبلی کا بیان ہے۔ میرے سامنے ایک شخص نے عبداللہ بن عمرو بن العاص سے کچھ سوال کیا تھا اور عرض کیا تھا کیا ہم فقراء و مہاجرین میں سے نہیں ہیں؟ حضرت عبداللہ نے فرمایا کیا تیری بیوی ہے جس کے پاس تو رہتا ہے، اس نے کہا جی ہاں! فرمایا کیا تیرا مکان ہے جس میں تو رہتا ہے اس نے کہا جی ہاں! حضرت عبداللہؓ نے فرمایا پھر تو تو غنی ہے۔ اس شخص نے کہا میرا تو ایک خادم بھی ہے۔ حضرت عبداللہؓ نے فرمایا پھر تو تو بادشاہ ہے۔

وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲۰ اور تم کو وہ کچھ دیا جو (تمہارے زمانہ میں) کسی کو نہیں دیا۔ انبیاء کی برکت سے اللہ کا قرب۔ دنیا میں عزت و بزرگی اور مختلف معجزات مثلاً سمندر کو پھاڑ کر راستہ بنا دیا اور دشمنوں پر طرح طرح کے عذاب کا نزول یہ سب وہ انعامات ہیں جو اللہ نے بنی اسرائیل کو عطا فرمائے اور کسی کو (اس زمانہ میں) نہیں عطا کئے۔

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ اے میری قوم والو! پاک سرزمین میں داخل ہو جاؤ۔ مجاہد کے نزدیک ارض مقدس سے مراد طور اور حوالی طور ہے۔ ضحاک کے نزدیک ایلیا اور بیت مقدس، عکرمہؒ اور سدیؒ کے نزدیک اریحا۔ کلبی کے نزدیک دمشق فلسطین اور اردن کا کچھ حصہ۔ اور قتادہؒ کے نزدیک پورا ملک شام۔ حضرت کعبؒ کا بیان ہے کہ میں نے اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب (یعنی توریت) میں پڑھا تھا کہ شام اللہ کی زمین کا خزانہ ہے، اور شام کے رہنے والے اللہ کے بندوں میں خزانہ ہیں۔ مقدسہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ارض مذکور انبیاء کی قرار گاہ اور اہل ایمان کا مسکن ہے۔

الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ یعنی جس میں داخل ہونا اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا اور فرض کر دیا ہے۔ جیسے نماز و روزہ کو فرض کیا ہے۔ کذا قال قتادۃ والسدی۔ (یعنی آیت میں قتادہ اور سدی کے نزدیک كَتَبَ کا معنی فرض ہے)۔

وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝۲۱ اور (مصر کی طرف یا اللہ کے حکم کے خلاف کسی اور طرف) پشت پھیر کر نہ لوٹو ورنہ (دونوں جہان کے ثواب کے) گھاٹے میں لوٹو گے۔

بعض علماء نے آیت بالا کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اللہ نے لوح محفوظ میں لکھ دیا کہ ارض مقدسہ تمہارا مسکن ہو گی۔ اس تفسیر پر ایک شرط کو محذوف ماننا پڑے گا یعنی اگر تم ایمان لے آؤ اور اطاعت کرو تو اس صورت میں اللہ نے لوح محفوظ میں ارض مقدس کا تمہارے لئے مسکن ہونا لکھ دیا ہے۔ شرط کو محذوف قرار دینے کی ضرورت اس لئے ہے کہ جب بنی اسرائیل نے نافرمانی کی تو اللہ نے فرمایا۔ اِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ۔ یہ زمین ان کے لئے حرام کر دی گئی (یعنی اگر معصیت نہ کرتے تو داخلہ لازم تھا اور ارض مقدسہ ان کا مسکن ضرور ہو جاتی لیکن معصیت کی وجہ سے ارض مذکورہ ان کے لئے حرام کر دی گئی)۔

یہ بھی (دونوں آیتوں میں موافقت کی شکل) ممکن ہے کہ لَكُمْ میں خطاب فرماں بردار اسرائیل کو ہو اور عَلَيْهِمْ میں ضمیر نافرمانوں کی طرف راجع ہو (یعنی فرماں برداروں کے لئے اس زمین کا مسکن ہونا مقدر ہو چکا ہے اور نافرمانوں کے لئے اس کو

حرام کر دیا گیا ہے) یا یوں کہا جائے کہ حرمت داخلہ چالیس سال تک تھی اور محرمہ سے مراد یہی چالیس سال کی مدت ہے۔ پھر مدت مذکور ختم ہونے کے بعد ان کا مسکن بنادیا گیا۔

ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ کَتَبَ سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے وہ زمین تم کو بخش دی ہے اور تمہارے لئے مقرر کر دی ہے (تم کو ضرور ملے گی) کلبی نے کہا کہ حضرت ابراہیمؑ جب کوہ لبنان پر چڑھے تو ان سے اللہ نے فرمایا ذرا نظر دوڑاؤ جہاں تک تمہاری نگاہ پہنچے وہ ارض مقدس ہے اور تمہاری اولاد کی میراث ہے (تمہاری اولاد بقدر حد نظر زمین کی وارث ہو گی)۔

بغوی نے لکھا ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰؑ سے وعدہ کر لیا تھا کہ ارض مقدسہ کا تم کو اور تمہاری قوم کو وارث بنایا جائے گا، ارض مقدسہ سے مراد سرزمین شام تھی پہلے وہاں مغرور ظالم کنعانی آباد تھے، فرعون کے کام سے فراغت کے بعد جب بنی اسرائیل مصر میں جا کر سکونت پذیر ہو گئے تو اللہ نے ان کو اریحا علاقۂ شام کو جانے کا حکم دیا، اریحا ہی ارض مقدسہ تھی اس علاقہ میں ایک ہزار آبادیاں تھیں اور ہر بستی میں ہزار باغ تھے، میں کہتا ہوں شاید ہزار سے مراد کثیر تعداد ہے کوئی معین عدد مراد نہیں ہے اور اللہ نے فرمایا موسیٰؑ میں نے اس زمین کو تمہاری مسکن اور قرار گاہ مقرر کر دیا ہے تم وہاں جاؤ اور وہاں کے باشندوں سے جہاد کرو، میں تم کو فتح عنایت کروں گا اور اپنی قوم میں سے بارہ سردار بطور نمائندہ چن لو، ہر سبط کا ایک نمائندہ ہو جو اپنی قوم کی طرف سے تعمیلِ حکیم الٰہی کا ذمہ دار ہو، چنانچہ موسیٰؑ نے (بارہ) سردار چن لئے اور بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر چل دیئے، جب اریحا کے قریب پہنچے تو سرداروں کی تلاش احوال اور فراہمی معلومات کے لئے اریحا کو روانہ کیا، راستہ میں ان کی ملاقات ایک شخص سے ہوئی جو انہی جبار قوم میں سے تھا، اس کے قد کی لمبائی ۳۳۳۳ ہاتھ تھی اور ابر میں سوراخ کر کے پانی پیا کرتا تھا اور قعر سمندر سے مچھلیاں پکڑ کر سورج کی ٹکیہ کے سامنے لے جا کر بھون کر کھایا کرتا تھا، یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ پانی جب اتنا چڑھ جاتا تھا کہ تمام پہاڑیاں اس میں ڈوب جاتی تھیں تو عوج بن عنق کے زانو سے اوپر نہیں آتا تھا یہ شخص تین ہزار برس جیا آخر حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ سے اللہ نے اس کو ہلاک کیا، جس کی صورت یہ ہوئی کہ موسیٰؑ کے لشکر کے برابر عوج پہاڑ کا ایک پتھر اٹھا کر لایا تاکہ موسیٰؑ کے کل لشکر پر ڈھانک دے (اور اس طرح سب کو پتھر کے نیچے دبا دے لیکن اللہ نے ایک ہدہد کو مسلط کر دیا، ہدہد نے پتھر کی چٹان میں اپنی چونچ سے سوراخ کر دیا اور پتھر عوج کے سر میں گھس کر گردن میں پھنس گیا جس کی وجہ سے عوج زمین پر گر گیا اتنے میں موسیٰؑ سامنے سے آگئے اور عوج کو زمین پر گرا ہوا پایا تو قتل کر دیا عنق عوج کی ماں کا نام تھا وہ حضرت آدمؑ کی بیٹی تھی اور ایک جریب زمین میں بیٹھتی تھی۔

غرض یہ کہ سرداروں کی جب عوج سے ملاقات ہوئی اس وقت اس کے سر پر لکڑیوں کا گٹھار کھا ہوا تھا۔ سرداروں کو پکڑ کر اس نے نیفہ میں اٹکا لیا اور اپنی بیوی کے پاس لے جا کر زمین پر بکھیر کر کہا دیکھ تو یہ لوگ ہم سے لڑنا چاہتے ہیں میں ان کو اپنے پاؤں سے دبا کر پیسے ڈالتا ہوں۔ بیوی نے کہا نہیں ان کو چھوڑ دو تاکہ جو کچھ انہوں نے یہاں دیکھا ہے اس کی اطلاع جا کر اپنی قوم کو دیں۔ عوج نے بیوی کا قول مان لیا۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ عوج سب کو آستین میں بھر کر بادشاہ کے پاس لے گیا اور اس کے سامنے لے جا کر بکھیر دیا۔ بادشاہ نے حکم دیا واپس لوٹ جاؤ اور جو کچھ تم نے دیکھا اپنی قوم سے جا کر کہہ دو (ان کے ملک کے پھلوں کی یہ حالت تھی کہ انگوروں کا ایک خوشہ کسی تختہ پر رکھ کر پانچ آدمی اٹھاتے تھے اور ایک انار کے دانے اگر نکال لئے جائیں تو (چھلکے میں اتنا بڑا خلا ہو جاتا تھا کہ) پانچ آدمی اس میں سما جاتے تھے۔

میں کہتا ہوں عوج بن عنق کا جو تذکرہ بغوی نے لکھا ہے اس میں بہت ہی بعید از عقل مبالغہ ہے۔ علماء حدیث نے اس خرافات کا انکار کیا ہے۔ صرف اتنی بات ضرور تسلیم کی گئی کہ اس دراز قامت قوم میں عوج سب سے بڑا اور قوی الجثہ شخص تھا ساری قوم قد آور تھی اور طاقتور تھی۔

سرداران بنی اسرائیل جب لوٹ کر حضرت موسیٰؑ کے پاس پہنچے اور واقعہ بیان کیا تو آپ نے حکم دیا اس بات کو لوگوں

کے سامنے ظاہر نہ کرنا اور کسی سپاہی کو اطلاع نہ دینا ورنہ سب پست ہمت ہو جائیں گے لیکن حضرت موسیٰؑ کے حکم کے خلاف سوائے دو شخصوں کے سب نے اپنے عزیزوں اور قرابت داروں سے بات کہہ دی۔ صرف یوشع بن نون بن افراہم بن یوسفؑ اور کلب بن یوقنا نے کسی سے کچھ نہیں کہا یوشع تو حضرت موسیٰؑ کے خادم خاص تھے اور آیت قَالَ مُوسٰی لِفَتَاہُ میں فَتًی سے مراد یوشع ہی ہیں اور کالب موسیٰؑ کے بہنوئی مریم بنت عمران (ہمشیرہ موسیٰؑ) کے شوہر تھے یہ یہودا کے سبط میں سے تھے جب بنی اسرائیل کو اس واقعہ کی اطلاع ہو گئی تو سب نے چیخیں مار مار کر رونا شروع کر دیا اور کہنے لگے کاش ہم مصر میں ہی مر جاتے، کاش ہم کو موت آجاتی اور یہاں نہ آتے کہ ہمارے بال بچے اور عورتیں اور مال متاع سب ان کے لئے مال غنیمت بنتا۔ بعض لوگ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے آؤ کسی اور کو اپنا سردار بنالیں اور (موسیٰؑ کو یہیں چھوڑ کر) ہم مصر کو لوٹ چلیں۔

قَالُوْا یٰمُوْسٰۤی اِنَّ فِیْهَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ ﳓ بنی اسرائیل نے کہا موسیٰؑ اس زمین پر تو بڑے قد آور طاقتور لوگ ہیں۔ جَبَّارٌ بروزن فَعَّالٌ جبر کا معنی ہے لوگوں سے زبردستی کام لینا جابر اور جبار زبردستی دوسروں سے اپنی منشاء کے مطابق کام لینے والا اجْبَرَهٗ عَلَى الْاَمْرِ (یعنی مجرد) اور اَجْبَرَهٗ عَلَیْهِ (یعنی ثلاثی مزید باب افعال) دونوں ہم معنی ہیں۔ بغوی نے لکھا ہے جبار اس کو کہتے ہیں جس پر کوئی زبردستی نہ کر سکے اور اس کا مقابلہ ممکن نہ ہو۔ نَخْلَةٌ جَبَّارَةٌ کھجور کا وہ طویل درخت کہ ہاتھ کی رسائی سے باہر ہو۔

میں کہتا ہوں ان کی جباریت یا تو درازی قامت کی وجہ سے تھی۔ جیسا مذکورہ بالا قصہ سے معلوم ہوتا ہے یا فوج کی کثرت، مال کی فراوانی اور جنگی اسلحہ کی بہتات کی وجہ سے۔ بغوی نے لکھا ہے یہ لوگ عمالقہ کی قوم میں سے تھے جو قوم عاد کی نسل سے تھے (عاد، ثمود، طسم، مدیس عرب عاربہ کے مختلف قبائل تھے جن کی نسل دنیا سے ختم ہو گئی انہی کو اقوام بائدہ کہا جاتا ہے بائدہ بمعنی بالکہ)۔

وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى یَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﰕ اور جب تک وہ نکل نہ جائیں گے ہم ہرگز وہاں نہیں جائیں گے۔ ہاں اگر وہ وہاں سے نکل جائیں تو ہم ضرور جانے کو تیار ہیں کیونکہ ہم میں ان سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے جب بنی اسرائیل نے یہ جواب دیدیا اور مصر کو واپس جانے کا ارادہ کر لیا تو حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارون سجدے میں گر پڑے اور یوشع و کالب نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے انہی دونوں کے متعلق آیت ذیل میں اللہ نے فرمایا۔

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ جو لوگ اللہ سے ڈرتے تھے ان میں سے دو آدمیوں نے یعنی کالب اور یوشع نے کہا ہے۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے یہ دو آدمی اور تھے (بنی اسرائیل میں سے نہیں تھے بلکہ) عمالقہ میں سے تھے جو مسلمان ہو کر حضرت موسیٰؑ کے پاس آگئے تھے اس صورت میں آیت کا ترجمہ اس طرح ہو گا کہ اس قوم کے دو آدمیوں نے کہا جن سے بنی اسرائیل ڈرتے تھے اس مطلب کی تائید سعید بن جبیر کی قرأت سے بھی ہوتی ہے جس میں یَخَافُوْنَ کی جگہ یُخَافُوْنَ (بصیغہ مجہول آیا ہے) اخرجہ ابن جریر عن سعید بن جبیر ورواہ الحاکم وصححہ عن ابن عباس۔

اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمَا جن کو اللہ نے (ایمان واطمینان دے کر) نوازا تھا۔ یہ فقرہ رَجُلَانِ کی صفت ہے یا جملہ اعتراضیہ ہے۔

ادْخُلُوْا عَلَیْهِمُ الْبَابَ ۚ ان کی بستی کے دروازہ میں تو چلو یعنی اچانک ان پر جا پڑو اور شہر کے اندر ہی ان کو بند کر لو، تاکہ بھاگ کر جنگل اور میدان میں نہ جا سکیں۔

فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ۬ اگر تم دروازہ میں گھس پڑے تو بلاشبہ تم ہی غالب آجاؤ گے ایک تو یہ کہ تنگ مقام میں وہ لڑ نہ سکیں گے اور دوسری بات یہ کہ اللہ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔ ہم نے ان کو دیکھا ہے وہ ڈیل ڈول میں تو بڑے ہیں مگر ان کے دل بودے ہیں۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۳﴾ اور اللہ ہی پر بھروسہ رکھو۔ اگر تم کو اس کے وعدہ کا یقین ہے
بغوی نے لکھا ہے بنی اسرائیل نے ان کو پتھر مار مار کر قتل کر دینے کا ارادہ کیا اور غضب ناک ہو کر بولے۔
قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا اور کہنے لگے موسیٰ جب تک وہ اس بستی میں ہیں ہم ہرگز کبھی وہاں نہیں جائیں گے۔
فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾ تم اور تمہارا خدا جا کر ان سے لڑیں ہم تو یہیں بیٹھے ہیں (یہاں سے نہیں ہلیں گے)۔
بعض علماء نے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل نے یہ بات خدا اور رسول کی اہانت کے طور پر کہی تھی ان کو اللہ اور اس کے رسول کی کوئی پرواہ نہ تھی۔
(میں کہتا ہوں) یہ بات غلط ہے ورنہ ان کا کافر ہو جانا لازم آجائے گا (اہانت خدا اور سول موجب کفر ہے) اور کافر ہونے کے بعد حضرت موسیٰؑ کے ساتھ رہنا ممکن تھا۔ وہ لوگ تو حضرت کے ساتھی تھے من وسلویٰ انہیں پر اترا تھا۔ ابر انہی پر سایہ فگن رہتا تھا۔ پتھر سے چشمے انہی کے لئے بہائے گئے تھے۔ اس لئے آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ جائیں اللہ آپ کی مدد کرے۔
حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا مقداد بن اسودؓ کو ایک مقام ایسا حاصل ہو گیا کہ کاش مجھے وہ حاصل ہو جاتا تو مجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہوتا۔ مقدادؓ کو حضور ﷺ نے مشرکوں کے مقابلہ کی دعوت دی تو مقدادؓ نے عرض کیا ہم وہ نہیں کہ موسیٰؑ کی قوم کی طرح اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ، کہہ دیں بلکہ ہم حضور کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے ہو کر (دشمن سے) لڑیں گے میں نے دیکھا کہ یہ الفاظ سن کر حضور ﷺ کا چہرہ مبارک کھل گیا اور آپ خوش ہو گئے (رواہ البخاری وغیرہ) جب بنی اسرائیل نے اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کی خلاف ورزی کی اور یوشع وکالب کو مار ڈالنے کا ارادہ کیا تو حضرت موسیٰؑ نے غضب ناک ہو کر دعا کی (اور)۔
قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ کہا میرے رب مجھے صرف اپنے اوپر اختیار ہے اور میرا بھائی بھی صرف اپنے اوپر اختیار رکھتا ہے (قوم والوں پر ہمارا بس نہیں)۔
یہ ترجمہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجھے صرف اپنے نفس پر اور اپنے بھائی پر قابو ہے۔ یہ حصر حقیقی نہیں (کہ موسیٰؑ کو کسی اور پر قابو ہی نہ ہو بلکہ) اضافی ہے یعنی نافرمانوں پر میرا قابو نہیں، اس صورت میں یوشع اور کالب کا اطاعت سے خارج ہونا لازم نہیں آتا۔ حقیقت میں یہ کلام بطور شکایت ہے (یعنی موسیٰؑ نے اللہ سے بنی اسرائیل کی شکایت کی تھی کہ یہ لوگ نافرمان ہیں ان نافرمانوں پر میرا قابو نہیں)۔
فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۵﴾ پس میرے اور ان بدکار لوگوں کے درمیان جدائی کر دے
یعنی تعریف و مذمت اور ثواب و عذاب میں سے جو فریق جس چیز کا مستحق ہے اس کے حق میں وہی فیصلہ کر دے۔ یا یہ مطلب ہے کہ ہم کو ان کی صحبت سے الگ اور ان کو ہم سے دور کر دے۔
قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اللہ نے فرمایا وہ سرزمین ان کے لئے حرام کر دی گئی یعنی ان کو وہاں داخل ہونے سے روک دیا گیا، وہاں ان کا داخلہ نہ ہوگا، یہ وہاں نہ رہ سکیں گے تحریم سے مراد تحریم تعبدی (یعنی حکم ممانعت) نہیں ہے (داخلہ کا وجوبی حکم تو دیا گیا ہی تھا، جو بدستور برقرار تھا) بلکہ تحریم سے مراد ہے محروم کر دینا۔
اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ چالیس برس تک۔ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً کا بظاہر تعلق مُحَرَّمَةٌ سے ہے اس صورت میں تحریم داخلہ محدود ہوگی۔ دوامی نہ ہوگی اور كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ کا معنی اگر لوح محفوظ میں لکھنا اور مقدر کر دینا ہی ہو تب بھی دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہ ہوگا (کیونکہ تحریم دوامی نہ تھی وقتی تھی) اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ جو اسرائیلی حضرت موسیٰؑ کے فرماں پذیر تھے ان کو ساتھ لے کر آپ اریحا گئے اور اریحا کو فتح کیا۔ یوشع ہراول دستہ میں تھے انہوں نے جا کر عمالقہ سے

جنگ کی، پھر حضرت موسیٰؑ اریحا میں قیام پذیر رہے، پھر اللہ نے آپ کو طلب فرمالیا اور آپ کی قبر مبارک کسی کو معلوم نہیں۔ یہ قصہ آگے آئے گا بغوی نے لکھا ہے کہ تمام اقوال میں یہ قول سب سے زیادہ صحیح ہے کیونکہ باتفاق علماء یہ بات ثابت ہے کہ عوج بن عنق کو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے قتل کیا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ آیات وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ...... اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ تک بتا رہی ہیں کہ جب بنی اسرائیل کو تیہ سے نجات دے کر کسی بستی میں اتار اگیا تو اس وقت تک حضرت موسیٰؑ زندہ تھے اور یہ واقعہ چالیس سال کے بعد کا ہے بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً کا تعلق یَتِیْهُوْنَ سے ہے۔

یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ ط (یعنی چالیس برس تک) اسی زمین میں حیران و سرگردان پھرتے رہیں گے۔ نکلنے کا راستہ نہیں ملے گا۔ اس صورت میں تحریم دوامی ہوگی۔ جس جس نے لَنْ نَّدْخُلَهَا کہا تھا کوئی بھی ارض مقدسہ میں داخل نہ ہو سکا۔ سب تیہ میں ہی مر کھپ کر رہ گئے۔ ان کی نسل نے حضرت یوشعؑ کے ساتھ جا کر عمالقہ سے جنگ کی۔ چالیس سال کے اندر جب تمام منکر مر گئے اور ان کی اولاد بڑھ کر جوان ہوگئی تو حضرت یوشع کے ہمرکاب یہ لوگ گئے۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کی وفات تیہ کے اندر ہی ہوئی اور آپ کی وفات کے بعد حضرت یوشعؑ ارض مقدسہ میں داخل ہوئے۔ کذا اخرج ابن جریر وابن ابی حاتم عن ابن عباسؓ۔

بغوی نے لکھا ہے اس روایت پر قصہ اس طرح ہوا کہ حضرت موسیٰؑ کی وفات ہوگئی اور چالیس سال کی مدت گزر گئی تو اللہ نے حضرت یوشع کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔ حضرت یوشع نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ اللہ نے عمالقہ سے جنگ کرنے کا حکم دیا ہے۔ سب نے آپ کی تصدیق کی اور آپ کے ہاتھ پر بیعت (جہاد) کر لی اور اریحا کی طرف روانہ ہوگئے۔ ساتھ ساتھ میثاق والا صندوق بھی تھا۔ اریحا پہنچ کر شہر کا محاصرہ کر لیا اور چھ ماہ تک محاصرہ جاری رکھا ساتواں مہینہ شروع ہوتے ہی سنکھ پھونکا گیا اور یکدم نعرہ مار افوراً شہر پناہ کی دیوار گر پڑی اور بنی اسرائیل نے شہر میں گھس کر عمالقہ سے مار دھاڑ شروع کر دی آخر ان کو شکست دیدی اور یکدم حملہ کر کے قتل کرنے لگے۔ بنی اسرائیل کا گروہ کا گروہ ایک ایک عملیقی کی گردن پر چڑھ کر کاٹنے کے لئے زور لگاتا تھا مگر کاٹ نہ پاتا تھا۔ یہ جنگ جمعہ کے دن ہوئی تھی۔ دن بھر جاری رہی پھر بھی شام تک پوری نہ ہوئی سورج غروب ہونے لگا اور سنیچر کا دن شروع ہونے والا تھا۔ حضرت یوشعؑ نے دعا کی اے اللہ! سورج کو میری طرف لوٹا دے اور سورج سے فرمایا تو اللہ کی تعمیل حکم میں لگا ہوا ہے اور میں بھی اسی کی فرماں پذیری میں مشغول ہوں تو ٹھہر جاتا کہ اللہ کے دشمنوں سے میں انتقام لے لوں سورج کو لوٹا دیا گیا اور دن ایک گھنٹہ بڑھا دیا گیا۔ آخر حضرت یوشع نے سب کو قتل کیا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت یوشع نے پھر شاہان شام کا پیچھا کیا یہاں تک کہ ۳۱ بادشاہوں کو قتل کیا اور تمام ملک شام پر تسلط حاصل کر لیا اور اپنی طرف سے حاکم ہر طرف مقرر کر دیئے اور مال غنیمت جمع کر لیا مگر (مال غنیمت کو جلانے کے لئے) آگ آسمان سے نہیں اتری (یوشعؑ پریشان ہوئے کہ خدا جانے کیا قصور ہو گیا) وحی آئی کہ کسی نے مال غنیمت میں کچھ چوری کی ہے۔ بنی اسرائیل کو حکم دو کہ وہ (از سر نو) تمہاری بیعت کریں۔ حسب الحکم سب نے بیعت کی۔ بیعت کرتے وقت ایک شخص کا ہاتھ حضرت یوشعؑ کے ہاتھ سے چمٹ گیا۔ حضرت یوشعؑ نے فرمایا تیرے پاس کیا ہے وہ شخص سونے کا بنا ہوا بیل کا ایک سر لے آیا۔ جو جواہرات سے مرصع تھا۔ اس آدمی نے مال غنیمت میں سے اس کو چرایا تھا۔ حضرت یوشعؑ نے وہ سر قربانی کے مال میں شامل کر دیا اور چور کو بھی اسی میں ڈال دیا اور (آسمان سے) ایک آگ آکر سب کو کھا گئی۔ پھر کچھ مدت کے بعد حضرت یوشع کی وفات ہوگئی اور کوہ افرائیم میں آپ کو دفن کیا گیا آپ کی عمر ۱۲۶ سال ہوئی حضرت موسیٰؑ کے بعد ۲۶ برس آپ نے بنی اسرائیل کا انتظام کیا۔

فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۶﴾ اور ان بدکار لوگوں کا رنج نہ کرو۔ یہ خطاب حضرت موسیٰؑ کو اس وقت کیا

گیا جب آپ کو بد دعا کرنے پر پشیمانی ہوئی تھی۔
اَلْفٰسِقِیْنَ کے لفظ سے اس طرف واضح اشارہ ہے کہ فاسق ہونے کی وجہ سے یہ لوگ اسی کے مستحق ہیں۔ روایت میں آیا ہے کہ بنی اسرائیل چھ فرسخ کے اندر چالیس سال تک گھومتے رہے دن بھر کوشش کرکے چلتے لیکن شام کو اسی جگہ ہوتے جہاں سے چلنا شروع کرتے۔ ابو الشیخ "العظمۃ" میں اور ابن جریر نے وہب بن منبہ کا قول اسی طرح نقل کیا ہے لیکن اس روایت میں چھ فرسخ کا ذکر نہیں ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل چھ لاکھ جنگی سپاہی تھے بعض اقوال میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارون انکے ساتھ نہیں تھے مگر صحیح یہ ہے کہ ساتھ میں موجود تھے اور تیہ میں موجودگی آپ کے لئے بطور سزا نہ تھی بلکہ ترقی درجات کا باعث اور (اخروی) راحت کا سبب تھی سزا تو صرف (نافرمان) بنی اسرائیل کے لئے تھی۔ تیہ میں ابر کا سایہ تمام لوگوں پر پانچ یا چھ فرسخ تک ہوتا تھا۔ ابن جریر نے ربیع بن انس کا یہی قول نقل کیا ہے رات میں روشنی کا ایک ستون نمودار ہو جاتا تھا جس سے اجالا ہو جاتا تھا۔ کھانے کے لئے من وسلویٰ تھا اور پینے کے لئے اس پتھر سے پانی پھوٹ نکلتا تھا جو بنی اسرائیل ساتھ لئے پھرتے تھے جب تیہ کی مدت ختم ہو گئی تو حکم ہوا بستی میں جاکر اترو۔ پھر حضرت موسیٰؑ نے عمالقہ سے جہاد کیا اور اریحا کو فتح کیا اور حکم دیا گیا کہ (شہر کے) دروازہ میں سر جھکائے استغفار کرتے داخل ہو۔

حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات کا قصہ

سدی نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے پاس وحی بھیجی کہ میں ہارون کو وفات دینے والا ہوں تم ان کو فلاں پہاڑ پر لے کر آؤ حسب الحکم موسیٰؑ اور ہارون مقررہ پہاڑ کی طرف گئے وہاں ایک عجیب درخت دیکھا کہ ایسا درخت کبھی نہیں دیکھا تھا اور ایک مکان بھی نظر آیا جس کے اندر تخت بچھا ہوا تھا اور تخت پر بستر لگا ہوا تھا جس سے خوشبو مہک رہی تھی۔ حضرت ہارون نے یہ منظر دیکھ کر پسند کیا اور بولے موسیٰ میں تو اس تخت پر سونا چاہتا ہوں۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا سو جاؤ۔ حضرت ہارونؑ نے کہا اندیشہ یہ ہے کہ کہیں گھر والا آکر ناراض نہ ہو حضرت موسیٰؑ نے فرمایا اس کا اندیشہ نہ کرو، گھر والے سے میں نمٹ لوں گا۔ حضرت ہارون نے کہا موسیٰ! میرے ساتھ آپ بھی سو جائیں۔ اب گھر والا آجائے گا تو مجھ پر اور آپ پر دونوں پر غصہ ہوگا چنانچہ دونوں سو گئے اور (سوتے میں ہی) حضرت ہارونؑ کی وفات ہو گئی۔ وفات سے پہلے موت کا احساس کرکے حضرت ہارونؑ نے کہا موسیٰؑ میری آنکھوں کو بند کر دو جب وفات ہو گئی تو وہ مکان درخت اور تخت سب آسمان کی طرف اٹھا لیے گئے اور حضرت موسیٰؑ تنہا بغیر ہارون کے لوٹ آئے۔ تنہا آتا دیکھ کر بنی اسرائیل بولے چونکہ قوم والے ہارونؑ سے محبت کرتے تھے اس لئے موسیٰؑ کو حسد ہوا اور انہوں نے ہارونؑ کو قتل کر دیا۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا ارے کم بختو! ہارونؑ تو میرا بھائی تھا۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں نے اس کو قتل کر دیا جب لوگوں نے یہ بات بہت زیادہ کہی تو حضرت موسیٰؑ نے کھڑے ہو کر دو رکعت نماز پڑھی اور اللہ سے دعا کی آپ کی دعا سے تخت اتر آیا اور لوگوں نے آسمان و زمین کے درمیان معلق تخت دیکھ لیا تو حضرت موسیٰؑ کے قول کی تصدیق کی۔

حضرت علیؓ بن ابی طالب کا قول روایت میں آیا ہے کہ موسیٰؑ اور ہارونؑ پہاڑ پر چڑھے۔ وہاں ہارونؑ کی وفات ہو گئی، تو بنی اسرائیل نے موسیٰؑ سے کہا تم نے ہارون کو قتل کیا ہے (تہمت قتل لگا کر کم بختوں نے) حضرت موسیٰؑ کو دکھ پہنچایا تو اللہ کے حکم سے فرشتے ہارونؑ کو اٹھا کر بنی اسرائیل کی طرف سے لے کر گزرے اور فرشتوں نے (باہم) ہارونؑ کی موت کا چرچا کیا اس وقت بنی اسرائیل کو ہارونؑ کی موت کا یقین ہوا اور اللہ نے ان کی تہمت تراشی سے موسیٰؑ کو نجات دی۔ پھر ملائکہ ہی ہارون کا جنازہ لے گئے اور کہیں دفن کر دیا۔ آپ کے مقام دفن کا معائنہ سوائے رخم (ایک قسم کا گدھا) کے اور کسی نے نہیں کیا۔ مگر اس رخم کو اللہ نے گونگا بہرا بنا دیا۔

عمرو بن میمون کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰؑ تیہ ہی میں تھے کہ حضرت ہارونؑ کا انتقال ہو گیا دونوں بزرگ پہاڑ کے کسی غار کی طرف گئے تھے۔ وہاں حضرت ہارونؑ کی وفات ہو گئی۔ حضرت موسیٰؑ ان کو دفن کر کے واپس آئے تو بنی اسرائیل بولے ہم کو چونکہ ہارونؑ سے محبت تھی (اس حسد کی وجہ سے) آپ نے ان کو قتل کر دیا۔ حضرت ہارونؑ سے واقع میں بھی بنی اسرائیل کو محبت تھی۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے عاجزی کے ساتھ اللہ سے دعا کی اللہ نے وحی بھیجی کہ بنی اسرائیل کو ہارون کی قبر کی طرف لے جاؤ۔ حضرت موسیٰؑ سب کو لے کر ہارونؑ کی قبر پر پہنچے اور وہاں پہنچ کر آواز دی ہارونؑ! فوراً حضرت ہارونؑ سر جھاڑتے ہوئے قبر سے نکل آئے۔ حضرت موسیٰؑ نے پوچھا کیا میں نے تم کو قتل کیا ہے۔ حضرت ہارونؑ نے کہا نہیں میں تو اپنی موت مرا ہوں۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا تو اپنی خوابگاہ کو لوٹ جاؤ (حضرت ہارونؑ واپس لوٹ گئے) اور بنی اسرائیل بھی لوٹ آئے۔

...... حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا قصہ ......

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو موت گوارا نہ تھی اور اللہ نے چاہا کہ موسیٰ کی نظر میں موت محبوب ہو جائے اس لئے یوشع بن نون کو پیغمبری سے سرفراز فرمایا۔ حضرت یوشع صبح شام حضرت موسیٰؑ کے پاس جاتے تھے اور حضرت موسیٰؑ ان سے پوچھتے تھے اے اللہ کے نبی اللہ نے آپ کے پاس کیا نیا پیام بھیجا۔ حضرت یوشعؑ کچھ نہیں بیان کرتے تھے اور جواب دیتے تھے۔ اے نبی اللہ کیا اتنے اتنے سال میں آپ کی صحبت میں نہیں رہا تو کیا اتنی طویل مدت میں جب تک آپ نے خود ہی ذکر نہیں کیا۔ میں نے کبھی آپ سے سوال کیا۔ اللہ نے کیا نیا پیام آپ کے پاس بھیجا ہے آپ نے اپنی طرف سے خود ہی بیان کر دیا تو کر دیا جب موسیٰؑ نے یہ جواب سنا تو زندگی سے نفرت اور موت سے رغبت ہو گئی۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا موت کا فرشتہ موسیٰؑ کے پاس آیا اور کہا اپنے رب کا بلاوا قبول کیجئے۔ حضرت موسیٰؑ نے ملک الموت کے طمانچہ مارا جس سے اس کی ایک آنکھ پھوٹ گئی ملک الموت نے اللہ سے جا کر عرض کیا کہ تو نے مجھے ایسے بندے کے پاس بھیجا تھا جو مرنا نہیں چاہتا اور اس نے میری آنکھ پھوڑ دی۔ اللہ نے دوبارہ ملک الموت کو آنکھ عطا کر کے حکم دیا کہ میرے بندے کے پاس واپس جا کر کہو کہ کیا تو زندہ رہنے کا خواستگار ہے اگر تیری خواہش یہی ہے تو اپنا ہاتھ کسی بیل کی پشت پر رکھ جتنے بال تیرے ہاتھ کے نیچے آئیں گے اتنے ہی سال تو زندہ رہے گا۔ (ملک الموت نے جا کر حضرت موسیٰؑ کو اللہ کا پیام پہنچا دیا) حضرت موسیٰؑ نے پوچھا پھر کیا ہوگا۔ ملک الموت نے کہا پھر آپ کو مرنا ہوگا۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا تو پھر ابھی صحیح۔ اور دعا کی پروردگار! مجھے ارض مقدس کے اتنے قریب پہنچا دے کہ ایک اینٹ پھینکنے کے بقدر فاصلہ رہ جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر میں وہاں ہوتا تو تم کو موسیٰؑ کی قبر راستہ کے کنارہ پر سرخ ٹیلہ کے قریب دکھا دیتا۔ رواہ البخاری و مسلم۔

وہب نے بیان کیا کہ ایک بار حضرت موسیٰؑ کسی کام سے باہر گئے آپ نے وہاں دیکھا کہ فرشتوں کی ایک جماعت قبر کھود رہی ہے کہ نہ ایسی قبر دیکھی تھی نہ وہ رونق، شادابی اور تروتازگی جو اس قبر میں تھی کبھی دیکھی، پوچھا اللہ کے فرشتو یہ قبر کس کے لئے کھود رہے ہو۔ فرشتوں نے کہا ایک ایسے بندہ کے لئے جو اللہ کے ہاں بڑی عزت والا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا وہ بندہ بڑے مرتبہ والا ہوگا جس کی خوابگاہ کی طرح میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ ملائکہ نے کہا اے صفی اللہ کیا آپ پسند کرتے ہیں کہ یہ خوابگاہ آپ کی ہو جائے۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا میں تو یہی چاہتا ہوں فرشتوں نے کہا تو اس میں اتر کر لیٹ جائیے اور اپنے رب کی طرف توجہ کیجئے حضرت موسیٰؑ اس قبر میں لیٹ گئے اور اللہ کی طرف توجہ کی پھر بہت ہی ہلکی سی سانس لی اور اللہ نے آپ کی روح قبض کر لی۔ حضرت موسیٰؑ کی عمر ۱۲۰ برس کی ہوئی۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اور ان کو سنائیے آدمؑ کے دونوں بیٹوں کی سچی خبر۔ یعنی ایسی خبر جو گزشتہ انبیاء کی کتابوں کی صراحت کے موافق ہے۔

اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا جب دونوں نے قربانی پیش کی۔
قربان وہ چیز جو بطور بھینٹ پیش کی جائے جس سے اللہ کا قرب حاصل کرنا مقصود ہو خواہ وہ ذبیحہ ہو یا کوئی اور چیز جیسے حلوان اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی کو دی جائے۔ اصل لغت میں قربان مصدر ہے۔ اسی لئے تثنیہ نہیں لایا گیا (باوجود یہ کہ ہر ایک کی قربانی جدا جدا تھی) بعض علماء نے لکھا ہے کہ قَرَّبَا کا مطلب ہے قَرَّبَ کُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا یعنی دونوں میں ہر ایک نے اپنی قربانی پیش کی۔ قربانی پیش کرنے کا قصہ اہل علم نے اس طرح ذکر کیا ہے کہ حضرت حواء کے بطن سے ہر مرتبہ میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوتی تھی۔ کل بیس مرتبہ میں چالیس بچے پیدا ہوئے سب سے پہلے قابیل اور اس کی ہمزاد اقلیما کی ولادت ہوئی، دوسری مرتبہ میں ہابیل اور اس کی ہمزاد لبودا ہوئے، آخر میں ابوالمغیث اور ام المغیث کی پیدائش ہوئی۔
حضرت ابن عباسؓ کا قول مروی ہے کہ حضرت آدمؑ کی زندگی میں ہی آپ کی اولاد اور اولاد کی نسل چالیس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

محمد بن اسحاق نے بعض علماء اسرائیلیات کے حوالے سے لکھا ہے کہ قابیل اور اس کی بہن کی پیدائش جنت میں ہوئی تھی ان کی پیدائش پر حضرت حواء کے نہ دکھ ہوا تھا نہ درد نہ تکان نہ خون آیا نہ اخراج مشیمہ ہوا۔ لیکن جب جنت سے زمین پر ان کو اتارا گیا اور ہابیل اور اس کی بہن کی پیدائش ہوئی تو دکھ درد بھی ہوا اور ماندگی بھی اور خون بھی نکلا اور اخراج مشیمہ بھی بعض اہل علم کا بیان ہے کہ زمین پر اترنے کے سو برس کے بعد حضرت آدمؑ نے حضرت حواء سے قربت کی اور (زمین پر) قابیل اور اس کی بہن کی پیدائش ہوئی۔ پھر دو سال کے بعد ہابیل اور اس کی بہن کی پیدائش ہوئی۔ یہ آخری فقرہ کلبی کا ہے۔
حضرت آدمؑ کی اولاد جب جوان ہو جاتی تو آپ ایک بطن کے لڑکے اور دوسرے بطن کی لڑکی کا باہم نکاح کر دیتے تھے بلکہ ہر لڑکے کو اختیار تھا کہ اپنی ہمزاد لڑکی کے علاوہ جس بطن کی لڑکی سے نکاح کرنا چاہے کرلے۔ چنانچہ قابیل وہابیلؑ جب نکاح کے قابل ہوئے تو اللہ نے حضرت آدمؑ کے پاس حکم بھیجا کہ دونوں میں سے ہر ایک کا دوسرے کی ہمزاد لڑکی سے نکاح کر دیں۔ ہابیلؑ تو اس حکم پر رضامند ہو گیا۔ مگر قابیل ناخوش ہو گیا کیونکہ اس کی ہمزاد زیادہ حسین تھی۔ کہنے لگا میں اس کا زیادہ مستحق ہوں۔ ہم دونوں کی پیدائش جنت میں ہوئی تھی اور ان دونوں کی زمین پر حضرت آدمؑ نے فرمایا تیری ہمزاد تیرے لئے حلال نہیں۔
قابیل نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا اور بولا یہ کوئی اللہ کا حکم نہیں ہے، صرف آپ کی رائے ہے۔ حضرت آدمؑ نے فرمایا تو تم دونوں قربانی پیش کرو۔ جس کی قربانی قبول ہو جائے گی وہی اس کا مستحق قرار پائے گا۔ قربانی کے عدم قبول کا معیار یہ تھا کہ آسمان سے ایک سفید آگ آکر قربانی کو کھا جاتی تھی اور قربانی قبول ہو جاتی تھی اور اگر آگ نہ آتی تھی تو غیر مقبول قرار پاتی تھی اور پھر چرندے، پرندے، درندے (جن کی خوراک ہوتی تھی وہ) کھا لیتے تھے۔ حسب مشورہ دونوں قربانی پیش کرنے کے لئے نکلے۔ قابیل کاشت کار تھا، اس نے بہت ہی ردی قسم کا ایک ڈھیر غلہ پیش کیا اور دل میں یہ خیال چھپائے رکھا کہ میری قربانی قبول ہو یا نہ ہو مجھے پرواہ نہیں ہابیل میری بہن سے نکاح نہیں کر سکتا۔ ہابیل بکریوں والا تھا اس نے نہایت عمدہ مینڈھا قربانی میں پیش کیا اور اللہ کی خوشنودی کے حصول کی نیت رکھی دونوں نے اپنی اپنی قربانی پہاڑ پر رکھ دی پھر حضرت آدمؑ نے دعا کی اور آسمان سے ایک آگ آئی۔
فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ پس ایک (یعنی ہابیل) کی قربانی قبول کرلی گئی (آگ نے اس کو کھا لیا) اور دوسرے (یعنی قابیل) کی قربانی نہیں قبول کی گئی۔ قابیل کو اس پر بڑا غصہ آیا اور دل میں جلن کو چھپائے رکھا۔ جب حضرت آدم کعبہ کی زیارت کے لئے مکہ کو تشریف لے گئے تو قابیل ہابیلؑ کے پاس پہنچا اور
قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ ہابیلؑ سے کہا، میں تجھے ضرور مار ڈالوں گا۔
قَالَ ہابیلؑ نے کہا کیوں؟ قابیل نے کہا اس لئے کہ اللہ نے تیری قربانی قبول کرلی اور میری قربانی رد کر دی (اگر)

تو میری خوبصورت بہن سے اور میں تیری بدصورت بہن سے نکاح کرلوں گا تو لوگ کہیں گے کہ تو مجھ سے بہتر ہے اور تیری اولاد میری اولاد پر فخر کرے گی۔ ہابیل نے جواب دیا میرا کیا قصور ہے۔

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾ اللہ انہی کی (قربانی) قبول فرماتا ہے جو اس سے ڈرتے ہیں۔ اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ حاسد کو چاہئے کہ اپنی ناکامی کا سبب اپنی کوتاہی کو سمجھے اور جس سبب سے محسود کامیاب ہوتا ہے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے محسود کے نصیب کے زوال کی کوشش نہ کرے اس سے حاسد کا نقصان ہی ہوگا کچھ فائدہ نہ ہوگا اور طاعت اسی مومن کی قبول کی جاتی ہے جو ممنوعات اور بری حرکتوں سے بچتا ہے بشرطیکہ اس کی نیت میں خلوص ہو۔

آیت مذکورہ کی تفسیر میں ابن ابی شیبہ نے ضحاک کا قول نقل کیا ہے کہ متقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو شرک سے بچتے ہیں۔ میں کہتا ہوں شاید اس آیت سے مراد یہ ہے کہ قربانی اسی کی قبول کی جاتی ہے جو دونوں میں حق پر ہو جو باطل پر ہو اس کی قربانی قبول نہیں کی جاتی۔

موسیٰ بن اعین سے اس آیت کا معنی پوچھا گیا تو فرمایا متقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو حلال چیزوں سے بھی حرام چیزوں (میں مبتلا ہو جانے) کے ڈر سے بچتے ہیں۔ ابن ابی الدنیا نے حضرت علیؓ کا ارشاد نقل کیا ہے آپ نے فرمایا تقویٰ کے ساتھ کوئی (چھوٹا اور تھوڑا) عمل بھی قلیل نہیں ہوتا۔ جو عمل قبول ہو جائے وہ قلیل کیسے ہو سکتا ہے۔ ابن ابی الدنیا نے بیان کیا کہ عمر بن عبدالعزیز نے ایک شخص کو لکھا میں تجھے اس تقویٰ کو اختیار کرنے کی نصیحت کرتا ہوں جس کے سوا کوئی چیز مقبول نہیں اور صرف انہی لوگوں پر رحم کیا جاتا ہے جو اہل تقویٰ ہوں اور محض تقویٰ کا ہی ثواب ملے گا (اس کے بغیر کسی عمل کا ثواب نہیں) تقویٰ کا وعظ کہنے والے بہت ہیں مگر اس پر عمل کرنے والے تھوڑے ہیں۔

ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے کہ حضرت ابو درداءؓ نے فرمایا، اگر یہ امر ثابت ہو جائے کہ اللہ نے میری ایک نماز قبول فرمالی ہے تو یہ بات ساری دنیا اور موجودات دنیا سے میری نظر میں زیادہ محبوب ہوگی کیونکہ اللہ فرماتا ہے کہ اللہ صرف تقویٰ والوں کا عمل قبول فرماتا ہے۔ ابن عساکر نے ہشام بن یحییٰ کی روایت سے یحییٰ کا بیان نقل کیا ہے کہ کوئی مانگنے والا حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے اپنے لڑکے کو حکم دیا اس کو ایک درہم دے دو لڑکے نے ایک درہم دے دیا جب سائل واپس چلا گیا تو بیٹے نے کہا ابا اس نے آپ کا دیا ہوا درہم قبول کر لیا۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ اللہ نے ایک سجدہ یا ایک درہم کا صدقہ قبول فرمالیا تو پھر موت سے زیادہ محبوب مجھے کوئی غائب چیز نہ ہوگی (ساری دنیا میرے پاس سے چلی جائے مجھے کچھ پرواہ نہ ہوگی میں موت کا مشتاق ہو جاؤں گا) تم جانتے ہو اللہ کس کا عمل قبول فرماتا ہے۔ صرف تقویٰ والوں کا عمل قبول فرماتا ہے۔

ابن عساکر نے بیان کیا کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا اگر میرے علم میں آجائے کہ اللہ میرا ایک عمل قبول فرما رہا ہے تو یہ بات زمین بھر سے میرے لئے زیادہ محبوب ہوگی۔ حضرت عامر بن عبداللہ کے مرنے کا وقت آیا تو رونے لگے لوگوں نے کہا آپ کیوں روتے ہیں آپ تو ایسے ایسے، یعنی بڑے عبادت گزار تھے فرمایا میں نے سنا ہے اللہ فرماتا ہے کہ تقویٰ والوں کا عمل ہی اللہ قبول فرماتا ہے (اور معلوم نہیں اس کی نظر میں میں تقویٰ والا ہوں یا نہیں ہو)۔

لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ (ہابیل نے جواب میں کہا) اگر تو مجھے قتل کرنے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لئے دست درازی نہیں کروں گا۔

اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ کیونکہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو سارے جہان کا مالک ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے فرمایا بخدا مقتول قاتل سے زیادہ طاقتور تھا لیکن تقویٰ نے اس کو دست درازی کرنے سے روکا یعنی اللہ کے ڈر سے اس نے خود سپردگی سے کام لیا۔ اس کی وجہ یا تو یہ تھی کہ اس وقت دفاع جائز نہ تھا۔ مجاہد کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں حکم تھا کہ اگر کوئی کسی کو قتل کرنا چاہے تو مقتول ہونے والا دفاع نہ کرے صبر سے کام لے یا ہابیل نے اس امر کو اختیار کیا جو افضل تھا (یعنی

اپنے دفاع کے لئے قتل کر دینا اگرچہ جائز تھا مگر مقتول ہو جانا قاتل ہونے سے افضل تھا اس لئے انہوں نے مقتول ہونے کو پسند کیا) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔ اللہ کا مقتول بندہ ہو جا قاتل بندہ نہ ہو۔ اخرجہ ابن سعد فی الطبقات من حدیث عبد اللہ۔

ہماری شریعت میں بھی خود سپردگی اور عدم دفاع جائز ہے جیسا حضرت عثمانؓ نے کیا ابن سعد نے لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا میں محاصرۂ خانہ کے زمانہ میں حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میں آپ کی مدد کرنے حاضر ہوا ہوں (آپ جس طرح حکم دیں مدد کر سکتا ہوں) فرمایا ابو ہریرہؓ کیا تم کو یہ بات پسند ہو گی کہ تم سب لوگوں کو جن کے اندر میں بھی شامل ہوں قتل کر ڈالو میں نے عرض کیا۔ نہیں۔ فرمایا تو بس اگر ایک آدمی کو بھی قتل کرو گے تو گویا سب کو قتل کر دیا۔ (مَنْ قَتَلَ نَفْسًا فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا)۔

عبد الرزاق اور ابن جریر نے حسن کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا آدم کے دو بیٹوں کو بطور مثل یہاں بیان کیا گیا ہے تم اسی کی پیروی کرو جو دونوں میں بہتر ہو۔ عبد بن حمید کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے تم اسی کی مشابہت حاصل کرو جو دونوں میں بہتر تھا جو برا تھا اس کے مشابہ نہ بنو۔

لَئِنْ بَسَطْتَّ کی جزاء میں ہابیل نے مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ (جملہ اسمیہ) کہا اور اس جملہ میں بھی نفی کو باء کے ساتھ پختہ کر دیا اس سے غرض یہ تھی کہ وہ اس فعل شنیع سے اپنی بیزاری کا کامل اظہار کرنا اور قاتل ہونے کی نسبت سے بھی بچنا چاہتے تھے (اسی لئے یوں نہیں کہا کہ میں تجھے قتل نہیں کروں گا بلکہ ارادہ قتل کی بھی نفی کر دی اور ارادہ قتل کا جس عمل سے ظہور ہو سکتا تھا اس کا بھی انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ میں قتل کے ارادہ سے تیری طرف ہاتھ بھی نہیں بڑھاؤں گا بلکہ ہاتھ بڑھانے والا ہی نہیں ہوں گا)۔

اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓءَاۡ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ میں چاہتا ہوں کہ تو (اللہ کی طرف) میرا گناہ اور اپنا گناہ (دونوں گناہ) لے کر لوٹے۔ یعنی جب تو مجھے قتل کر دے گا تو میرے گناہوں کا بوجھ بھی تجھ پر پڑ جائے گا اور اپنے پچھلے گناہوں کا اور اس قتل کے گناہ کا سب کا بار سمیٹ لے گا (تیرا کوئی گناہ معاف نہ ہو گا بلکہ میرے گناہ بھی تجھ پر پڑیں گے) کذا روی ابن نجیح عن مجاہد۔

فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ پھر تو دوزخیوں میں سے ہو جائے گا اور یہی ظالموں کی سزا ہے۔ قیامت کے دن مظلوم کو، ظالم کی نیکیاں ظلم کے عوض دیدی جائیں گی اور اگر اس کی نیکیاں نہ ہوں گی یا ادائے حقوق کے لئے کافی نہ ہوں گی تو ظالم پر مظلوم کے گناہ ڈال دیئے جائیں گے اور پھر اس کو دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن میری امت میں مفلس وہ آدمی ہو گا جو نماز، روزہ، زکوٰۃ (سب کچھ) لے کر آئے گا (لیکن) کسی کو گالی دی ہو گی، کسی کا مال کھایا ہو گا، کسی کا خون بہایا ہو گا، کسی کو مارا ہو گا، لہٰذا اس کی کچھ نیکیاں اس کو اور کچھ نیکیاں اس کو دے دی جائیں گی اور حقوق کی ادائیگی پوری پھر بھی نہ ہو گی اور نیکیاں باقی نہ رہیں گی تو حقداروں کے گناہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے۔ پھر اس کو دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔ مسلم۔

ایک شبہ :- مومن کے لئے جائز نہیں کہ اپنے بھائی کو بدبخت اور گناہ گار بنانے کا خواہش مند ہو۔ پھر ہابیل نے کیسے کہا کہ میں چاہتا ہوں تو میرے اور اپنے گناہ سمیٹ کر لے جائے۔

جواب :- کلام کا حقیقی معنی مراد نہیں ہے۔ ہابیل کا مقصد یہ ہرگز نہ تھا کہ قابیل اس کو قتل کر دے اور قاتل گناہ گار بن جائے بلکہ جب اس کو معلوم ہو گیا کہ اس کو قاتل بننا ہے یا مقتول ہونا تو اس نے قاتل نہ ہونے کا ارادہ کر لیا (اور مقتول ہونے کو ترجیح دی) اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا بھائی قاتل ہو جائے اور قتل کا گناہ ہابیل پر نہ ہو (بلکہ قابیل پر ہو)۔

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ پھر اس کے جی نے اس کو اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کر دیا۔ لَهٗ کا لفظ زیادتی ربط کے لئے بڑھایا گیا ہے۔ جیسے حَفِظْتُ لِزَيْدٍ مَالَهٗ میں نے زید کے لئے اس کے مال کی حفاظت کی۔ گویا قابیل نے اپنے نفس کو قتل ہابیل کی دعوت دی اور نفس مان گیا۔ صحاح میں ہے کہ طَوَّعَتْ میں اطاعت سے زیادہ زور ہے۔

قابیل نے جب ہابیل کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح قتل کرے۔ ابن جریج کا بیان ہے کہ

شیطان بھیس بدل کر اس کے سامنے آیا اور ایک پرندہ کو پکڑ کر پرندہ کا سر پتھر پر رکھ کر اوپر سے دوسرا پتھر مار دیا اور اس طرح سر کچل کر قتل کر دیا قابیل نے بھی یہ سب کچھ دیکھا اور ہابیل کا سر پتھر پر رکھ کر کچل کر قتل کیا۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ ہابیل نے خود سپردگی سے کام لیا اور بعض کا قول ہے کہ سوتے میں سر پر پتھر مار کر قابیل نے قتل کر دیا۔

فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۳۰﴾ پھر اس نے ہابیل کو قتل کر دیا، اور قتل کے بعد خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو گیا۔ دنیا میں بھی ساری عمر مارا مارا پریشان پھرتا رہا اور آخرت میں بھی جنت کی بجائے دوزخ میں گیا۔ ہابیل کی عمر بیس سال ہوئی۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، قابیل نے ہابیل کو کوہ نور (غالباً یہ لفظ ثور ہے۔ واللہ اعلم) پر قتل کیا تھا بعض کے نزدیک کوہ حراء کی گھاٹی کے پاس مارا تھا۔ قتل کرنے کے بعد لاش کو کھلے میدان میں چھوڑ دیا اور کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ نعش کا کیا کرے کیونکہ روئے زمین پر یہ پہلا انسانی مردہ تھا۔ ادھر درندوں نے کھانا چاہا مجبوراً بوری میں بھر کر پشت پر لادے چالیس روز اور بقول حضرت ابن عباس سال بھر تک پھرتا رہا جب لاش بگڑنے لگی اور پرندے و درندے گھیرے رہے کہ کب لاش کو پھینکے اور وہ کھائیں اس وقت اللہ نے دو کوے بھیجے، دونوں باہم لڑے اور ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا پھر چونچ اور پنجوں سے زمین میں گڑھا کھود کر مردہ کوے کو اس میں ڈال کر اوپر سے مٹی ڈال دی اور اس طرح مردہ کوے کو چھپا دیا۔ قابیل یہ تماشا دیکھ رہا تھا آیت ذیل میں اسی طرف ایماء ہے۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا یَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ لِیُرِیَهٗ كَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَةَ اَخِیْهِ ؕ اس کے بعد اللہ نے ایک کوا بھیجا کہ وہ زمین کھودتا تھا کہ (اللہ یا کوا) قابیل کو بتا دے کہ بھائی کی لاش کو کس طرح چھپائے۔

اس جگہ اراءت کا معنی ہے بتا دینا تعلیم دینا۔ دکھانا مراد نہیں ہے کیونکہ دیکھنے میں کوے کا دفن کرنا آیا تھا۔ ہابیل کی لاش کو دفن کرنا اور چھپانا تو نہیں دکھایا گیا۔ سَوْءَة سے مراد ہے مردہ لاش۔ مردہ لاش کو دیکھنا برا معلوم ہوتا ہے (سوراۃ کا لغوی ترجمہ برائی ہے) بعض کے نزدیک جسم کا قابل ستر حصہ مراد ہے جس کی بے پردگی جائز نہیں۔ کوے کو دفن کرنے کی تدبیر بتائی اور براہ راست قابیل کو نہیں بتائی بلکہ کوے کو رہنما بنایا یہ تنبیہ ہے اس امر پر کہ اللہ کی نظر میں قابیل کوے سے بھی زیادہ حقیر تھا اسی لئے تو کوے کو اس کا معلم اور اس کو کوے کا شاگرد بنایا۔

قَالَ یٰوَیْلَتٰۤى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوْءَةَ اَخِیْ ۚ قابیل نے کہا ہائے افسوس کیا میں اس کوے کی طرح ہونے سے بھی گیا گزرا کہ اپنے بھائی کی لاش کو چھپا دیتا وَیْلَتٰی میں آخری الف بجائے یا متکلم کے آیا ہے اصل میں وَیْلَتِیْ تھا ویلۃ (اور ویل) حسرت و افسوس کا کلمہ ہے اس کا معنی ہے ہلاکت۔ یا کلمہ ندبہ (نوحہ) ہے جیسے یاحسرتا اَعَجَزْتُ میں استفہام سے مراد ہے اظہار تعجب فَاُوَارِیَ کا عطف اَكُوْنَ پر ہے یہ استفہام کا جواب نہیں ہے ورنہ مطلب اس طرح ہو جائے گا کہ اگر میں عاجز ہوتا تو بھائی کی لاش کو چھپا دیتا (گویا اصل مطلب الٹ جائے گا)۔

فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِیْنَ ﴿۳۱﴾ پھر (سال بھر تک پشت پر لادے پھرنے پر) پشیمان ہو گیا بعض نے کہا بھائی کی جدائی پر پشیمان ہوا اور بعض نے قتل پر پشیمان ہونا مراد لیا ہے قتل پر پشیمان ہونے سے یہ مراد نہیں کہ اس کو اپنے اس جرم پر ندامت ہوئی اور یہ خیال ہوا کہ میں نے گناہ کا کام کیا بلکہ ندامت اس بات پر ہوئی کہ قتل کرنے کی وجہ سے ماں باپ کو بھی ناراض کیا اور فائدہ بھی کچھ نہ ہوا۔

مطلب بن عبداللہ بن حنطب کا بیان ہے کہ جب آدمؑ کے بیٹے نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا تو زمین میں لرزہ آ گیا پھر پانی کی طرح مقتول کا خون زمین نے پی لیا (سطح زمین پر خون کا کوئی نشان نہیں رہا) اور اللہ نے قابیل کو ندا کی تیرا بھائی کہاں ہے قابیل نے کہا مجھے نہیں معلوم میں اس کا نگراں نہیں تھا۔ اللہ نے فرمایا تیرے بھائی کا خون مجھے زمین سے پکار رہا ہے تو نے کس وجہ سے اپنے بھائی کو قتل کیا۔ قابیل نے کہا اگر میں نے اس کو قتل کیا ہے تو اس کا خون کہاں ہے (اللہ نے کوئی جواب نہیں دیا)

منزل ۲

اسی دن سے اللہ نے خون کو زمین میں جذب ہونے کی ممانعت کر دی۔
روایت میں آیا ہے کہ قتل کے بعد قابیل کا بدن کالا پڑ گیا حضرت آدمؑ نے قابیل سے بھائی کے متعلق دریافت کیا تو قابیل نے کہا میں اس کا ذمہ دار نہ تھا۔ حضرت آدمؑ نے فرمایا یہ بات نہیں بلکہ تو نے اس کو قتل کیا ہے اسی وجہ سے تیرا بدن کالا ہو گیا حضرت آدمؑ قابیل سے بیزار ہو گئے اور اس کے بعد سو برس تک کبھی نہیں ہنسے۔
مقاتل بن سلیمان نے بروایت ضحاک حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تو اس زمانہ میں حضرت آدم مکہ میں تھے قتل ہونے کے بعد درخت خار دار ہو گئے۔ کھانے سڑنے لگے پھلوں میں ترشی پیدا ہو گئی۔ پانی شور ہو گیا، اور زمین غبار آلود بن گئی (یعنی ہابیل کی شہادت سے پہلے ایسی کوئی بات نہ تھی نہ درختوں میں کانٹے ہوتے تھے نہ کھانا سڑتا تھا نہ پھلوں میں ترشی اور پانی میں نمکینی تھی نہ زمین پر غبار ہوتا تھا) حضرت آدمؑ نے فرمایا زمین پر ضرور کوئی نیا واقعہ ہوا ہے۔ چنانچہ آپ ہندوستان آ گئے یہاں آکر دیکھا کہ قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا ہے۔ آپ فوراً یہ شعر پڑھنے لگے سب سے پہلے آپ نے ہی شعر کہے ہیں (ترجمہ)۔
بستیاں اور بستیوں کے رہنے والے بدل گئے۔ روئے زمین غبار آلود اور بد نما ہو گیا۔ ہر مزہ دار چیز کا مزہ اور رنگدار چیز کا رنگ بگڑ گیا اور خوبصورت چہروں کی شگفتگی معدوم ہو گئی۔
میمون بن مہران کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا جو شخص کہتا ہے کہ حضرت آدمؑ نے شعر کہے ہیں وہ جھوٹا ہے۔ اللہ اور اللہ کے رسول پر دروغ بندی کرتا ہے محمد ﷺ اور تمام انبیاء شعر (نہ کہنے) میں برابر ہیں۔ ہاں جب قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تو حضرت آدم نے کچھ دردناک کلام کہا جو سریانی زبان میں تھا اور حضرت شیثؑ سے فرمایا بیٹے تو میرا وصی ہے اس کلام کو یاد کر لے تاکہ آئندہ لوگوں میں یہ منتقل ہوتا رہے اور لوگ اسکو سن کر ہابیل پر رقت کا اظہار کرتے رہیں چنانچہ آپ کا وہ دردناک کلام برابر منتقل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ یعرب بن قحطان کو پہنچا۔ یعرب عربی بھی بولتا تھا اور سریانی بھی اور شعر بھی کہتا تھا اسی نے سب سے پہلے تحریر عربی ایجاد کی۔ یعرب نے حضرت آدم کے کلام کو (ترجمہ میں) کچھ پیچھے آگے کر کے موزوں کر دیا۔ مذکورۂ بالا اشعار میں کچھ شعر اور بھی ہیں جن میں سے دو شعر مندرجہ ذیل ہیں۔
ترجمہ کیا وجہ کہ میں آنسو بہانے میں بخل سے کام لوں حالانکہ ہابیل کو قبر نے اپنے اندر سما لیا۔ میں پوری زندگی اپنے اوپر غم دیکھتا رہوں گا کاش میں اپنی زندگی سے راحت پا سکتا۔
ہابیل کی شہادت کے پانچ سال بعد جب حضرت آدم کی عمر ایک سو تیس برس کی ہو گئی تو حضرت حواءؑ کے بطن سے شیثؑ پیدا ہوئے آپ کا نام ہبۃ اللہ تھا یعنی آپ ہابیل کے قائم مقام ہوئے۔ اللہ نے آپ کو رات دن کی ساعتوں کا علم دیا اور ہر ساعت کی ایک عبادت کی تعلیم دے دی۔ اللہ نے آپ پر پچاس صحیفے نازل فرمائے اور آپ حضرت آدمؑ کے وصی اور جانشین قرار پائے۔ قابیل اپنی بہن اقلیما کا ہاتھ پکڑ کر عدن علاقہ یمن کو بھاگ گیا۔ وہاں اس سے ابلیس نے آکر کہا ہابیل چونکہ آگ کو پوجتا تھا اس لئے آگ نے اس کی قربانی کھالی تو بھی آگ (کیلئے آتشکدہ) قائم کر تاکہ آگ تیرے اور تیری نسل کیلئے ہو جائے قابیل نے حسب مشورہ آتش کدہ بنا دیا اور سب سے پہلے اسی نے آگ کی پوجا کی۔ قابیل کی اولاد نے آلات لہو بانسری ڈھول باجے، عود اور طنبورے بنائے اور لہو و لعب، شراب خوری، زنا، عیاشی اور آتش پرستی میں منہمک ہو گئے آخر حضرت نوح کے زمانہ میں اللہ نے سب کو طوفان بھیج کر غرق کر دیا اور حضرت شیثؑ کی نسل باقی رہ گئی۔
حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص ظلم سے قتل کیا جاتا ہے اس کے خون کا ایک حصہ آدم کے پہلے بیٹے کی گردن پر ہوتا ہے کیونکہ قتل کا دستور سب سے پہلے اسی نے ایجاد کیا ہے رواہ البخاری وغیرہ۔
بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابن عمرؓ کا قول لکھا ہے کہ آدمؑ کا قاتل بیٹا (دوسرے) دوزخیوں کے عذاب کا آدھا حصہ صحیح طور پر تقسیم کر کے اپنے لئے لے گا۔ (یعنی سارے دوزخیوں کا آدھا عذاب اس پر ہوگا) ابن عساکر نے

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنے بھائی کو سال بھر چھوڑے رکھے گا (یعنی قطع تعلق رکھے گا) وہ اللہ کے سامنے قابیل کے گناہ کا حامل ہو کر جائے گا۔ سوائے دوزخ میں داخلہ کے اس کو قابیل سے کوئی چیز جدا نہیں کرے گی (یعنی قیامت کے دن وہ قابیل کا ساتھی ہو گا مگر دوزخ میں قابیل سے الگ ہو گا کیونکہ قابیل کا عذاب سخت اور طویل ہو گا)۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ اسی وجہ سے یعنی ابن آدم سے جرم عظیم صادر ہونے اور قتل کا دروازہ بند کرنے کی وجہ سے۔ اَجَلَ شَرًّا یا جَلَ (ماضی و مضارع) شر کو کھینچ کر لایا۔ قاموس میں ہے اَجَلَ لِلشَّرِّ عَلَیْهِمْ مرتکب شر ہوا اور شر کو ان پر بھڑکایا۔ لفظ اجل کا یہ وضعی لغوی مفہوم ہے اس کے بعد کسی جرم کی علت اور سبب بیان کرنے کے لئے اس لفظ کا استعمال ہونے لگا۔ پھر استعمال میں مزید توسیع کی گئی تو ہر چیز کی علت بیان کرنے کیلئے اس کا استعمال کرنے لگے۔ (یعنی اجل کا معنی علت و سبب ہو گیا)۔

كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ ہم نے بنی اسرائیل کے لئے (یہ حکم) لکھ دیا (مقرر کر دیا) یعنی حکم ذیل کی ابتداء سبب مذکور کی وجہ سے ہوئی۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ کہ جس نے کسی کو بغیر جرم قتل کے یا بدون کسی فساد کے جو زمین پر اس سے پھیلا ہو قتل کر دیا تو گویا اس نے سب آدمیوں کو قتل کر دیا۔[1]

فساد کے تحت حربی کافروں کا فساد، رہزنوں کی رہزنی اور زنا، وغیرہ داخل ہے یعنی ان اشیاء کے بغیر اگر کسی نے قتل کیا تو گویا سب آدمیوں کو مار ڈالا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ آیت کا مطلب مختلف طور پر بیان کیا گیا ہے عکرمہ کی روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جس نے کسی نبی یا خلیفہ وقت کو قتل کیا اس نے گویا سب لوگوں کو قتل کیا اور جس نے کسی پیغمبر یا خلیفہ عادل کی مدد کی اس نے گویا سب لوگوں کو زندہ کر دیا۔ مجاہد نے کہا ناحق اگر کسی نے کسی ایک کو قتل کر دیا تو اس جرم کی وجہ سے وہ دوزخ میں اسی طرح جائے گا جس طرح تمام آدمیوں کو قتل کرنے کی وجہ سے جاتا اور جو شخص ایک آدمی کے قتل سے اپنے کو بچائے رہا تو گویا اس نے سب لوگوں کے قتل سے اپنے کو بچالیا۔ قتادہؒ نے کہا اللہ نے اس آیت میں ایک فرد کے قتل کے جرم کی عظمت اور قتل نہ کرنے کے ثواب کی بزرگی ظاہر کی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جس نے کسی ایک مسلمان کے ناحق قتل کو حلال سمجھا تو اس پر اتنا بڑا گناہ ہوا جیسے سب لوگوں کے قتل کا ہوتا۔

وَمَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ اور جس نے ایک آدمی کو بھی زندہ رکھا گویا اس نے سب کو زندہ رکھا یعنی جو شخص ایک آدمی کے قتل سے مجتنب رہا یا اسباب ہلاکت سے کسی ایک کو بچالیا مثلاً ناحق قتل سے، ڈوبنے سے، جلنے سے، دیوار کے نیچے دبنے سے بچالیا اس کا ثواب اتنا بڑا ہو گا جیسے اس نے سب آدمیوں کو بچالیا۔ حسن نے کہا ایک آدمی کو بھی ناحق قتل کرنے سے اسی طرح قصاص واجب ہو گا جس طرح سب لوگوں کو قتل کرنے سے واجب ہوتا اور جس نے ایک (واجب القصاص قاتل) کو معاف کر دیا۔ قصاص نہ لیا تو گویا اس نے سب کو زندگی عطا کی۔

تمام اقوال کا حاصل صرف یہ ہے کہ اللہ نے قتل نفس اور احیاء نفس کی عظمت کا اظہار فرمایا ہے تاکہ قتل سے لوگ بچتے رہیں اور احیاء نفس کی کوشش کریں۔

---

[1] عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن المنذر نے مجاہد کا قول اس آیت کی تشریح کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ یہ آیت اسی طرح ہے جیسے سورۃ النساء میں آیا ہے، وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِیْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِیْمًا یعنی اگر سب آدمیوں کو بھی قتل کر دے تو بس اتنا ہی عذاب ہو گا جتنا ایک آدمی کو قتل کرنے سے ہو گا اس سے زیادہ نہ ہو گا

حضرت براء بن عازبؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (کل) دنیا کی تباہی اللہ کے نزدیک ایک مومن کے ناحق خون کے مقابلہ میں حقیر ہے رواہ ابن ماجہ بسند حسنؒ بیہقی کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ اگر (تمام) آسمانوں والے اور (کل) زمین والے ایک مومن کے خون میں شریک ہو جائیں تو سب کو اللہ دوزخ میں بھیج دے گا۔ بیہقی کی دوسری روایت میں ناحق خون بہانے کا لفظ آیا ہے۔

مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے ابن ماجہ کی روایت کی طرح حدیث نقل کی ہے۔ نسائی نے حضرت بریدہؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ اللہ کے نزدیک مومن کا قتل (کل) دنیا کے زوال سے بھی بڑا ہے۔ ابن ماجہ نے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کعبہ کا طواف کر رہے تھے اور فرما رہے تھے تو کیسا پاکیزہ ہے تیری خوشبو کیسی اچھی ہے تیری عظمت کس قدر بڑی ہے۔ تیری عزت کتنی عظیم ہے لیکن قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے مومن کے مال و خون کی عزت و حرمت تیری حرمت سے بڑھ کر ہے۔

سلیمان بن علیؒ کا قول ہے میں نے حسنؒ (بصری) سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا۔ ابو سعید کیا یہ آیت ہمارے متعلق بھی ہے یا صرف بنی اسرائیل کے لئے تھی۔ فرمایا بے شک (ہمارے لئے بھی ہے) قسم ہے وحدہٗ لاشریک کی بنی اسرائیل کے خون اللہ کی نظر میں ہمارے خونوں سے زیادہ عزت والے نہیں تھے۔

وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ اور بیشک ہمارے پیغمبر بنی اسرائیل کے پاس کھلے معجزات لیکر پہنچے۔

ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ پھر اس کے بعد ان سے بہت لوگ یعنی مذکورہ بالا جرم کی وجہ سے ہمارے اس سخت حکم اور پیغمبروں کے واضح معجزات کے بعد پیغمبروں کو واضح معجزات دے کر صرف حکم کے استحکام اور عہد کی تجدید کیلئے بھیجا گیا تھا تاکہ لوگ ایسے جرائم کے ارتکاب سے اجتناب رکھیں مگر ان تمام باتوں کے بعد بھی ان میں سے بہت آدمی۔

فِى الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ﴿۳۲﴾ زمین پر حدود (الٰہیہ) سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ یعنی قتل کرتے ہیں۔ اللہ کے حکم کی پروا نہیں کرتے۔ اسراف کا معنی ہے حد اعتدال سے ہٹ جانا۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں۔

وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اور زمین پر بگاڑ پیدا کرنے کے لئے دوڑے پھرتے ہیں ان کی سزا یہی ہے اللہ سے لڑنے کا معنی ہے اللہ کے بندوں سے جنگ کرنا۔ اللہ کا رسول راہ زندگی کا محافظ ہے اور اس کے جانشین خلیفہ ہوں یا بادشاہ رسول کے نائب ہیں (ان سب سے جنگ اللہ سے جنگ ہے) یا اللہ اور اللہ کے رسول سے جنگ کرنے سے مراد ہے دونوں کے احکام کی مخالفت اور اللہ کی قائم کی ہوئی حرمت مالی و جانی میں رخنہ اندازی، بیضاوی نے لکھا ہے حرب کا اصلی معنی ہے چھیننا، قاموس میں ہے کہ حرب کا معنی معروف ہے (یعنی جنگ) اور مال چھیننے کو بھی کہتے ہیں۔ بیضاوی کے کلام سے ثابت ہو رہا ہے کہ لفظ حرب منقول ہے اور قاموس کی صراحت بتا رہی ہے کہ یہ لفظ مشترک ہے۔

فساداً حال یہ بمعنی مفسدین، یا مفعول لہ ہے یا مفعول مطلق ہے اس آیت کے نزول کا سبب[1] مختلف طور پر بیان کیا گیا ہے ابن جریر نے یزید بن ابی حبیب کی روایت سے لکھا ہے کہ عبدالملک بن مروان نے حضرت انسؓ کی خدمت میں عریضہ بھیجا اور اس آیت کے متعلق آپ سے دریافت کیا حضرت انسؓ نے جواب میں لکھا کہ اس آیت کا نزول عرینہ والوں کے متعلق ہوا تھا جنہوں نے مرتد ہو کر رسول اللہ ﷺ کے چرواہے کو قتل کر دیا تھا اور اونٹوں کو ہنکا کر لے گئے تھے الحدیث ابن جریر نے حضرت جریرؓ کی روایت سے اور عبدالرزاق وغیرہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی اسی طرح بیان کیا ہے اور بغوی نے سعید بن جبیرؒ کا قول بھی یہی نقل کیا ہے۔

---

[1] خرائطی نے مکارم الاخلاق میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔ قبیلہ عرینہ کے کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسلمان ہو گئے (لیکن مدینہ کی آب و ہوا ان کو موافق نہ آئی) ہاتھ پاؤں سوکھ گئے چہرے زرد پڑ گئے اور پیٹ بڑھے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بخاری وغیرہ نے حضرت انسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ قبیلہ عکل کے کچھ لوگ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسلمان ہو گئے لیکن مدینہ کی آب ہوا ان کو موافق نہ آئی اس لئے رسول اللہ ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ صدقہ کے اونٹوں کے (پڑاؤ کے) پاس جا کر رہیں اور اونٹوں کا دودھ اور پیشاب پئیں۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی جب تندرست ہو گئے تو مرتد ہو کر چرواہوں کو قتل کر کے اونٹوں کو ہنکا کر لے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے تعاقب میں آدمی بھیجے جب گرفتار کر کے ان کو لے آئے تو آپ ﷺ نے ان کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیئے اور آنکھوں میں سلائیں پھروا کر حرہ میں پھینکوا دیا وہ انتہائی تشنگی میں پانی مانگتے تھے مگر ان کو پانی نہیں دیا جاتا تھا آخر اسی حالت میں مر گئے ابو قلابہ نے کہا انہوں نے قتل کیا تھا مال بھی چرایا تھا اللہ اور رسول سے جنگ بھی کی تھی اور زمین پر تباہی مچانے کے لئے کوشش بھی کی تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ عرینہ والوں کو جو سزا دی اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے بعض کے نزدیک اس آیت کی وجہ سے وہ سزا منسوخ ہو گئی کیونکہ ناک، کان اور پیشاب گاہ کو کاٹنا جائز نہیں۔ بعض نے کہا آنکھوں میں سلائی پھیر کر اندھا کرنا اور ناک، کان کاٹنا تو جائز نہیں مگر باقی سزا بدستور قائم ہے۔ مگر یہ بات اسی وقت ممکن ہے جب حاکم کو چاروں مذکورہ احکام آیت میں تمیزی اختیار دے دیا جائے قتادہؒ نے ابن سیرین کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ سزا اس وقت تھی جب حدود (شرعیہ) کا نزول نہیں ہوتا ابو الزناد نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے اس عمل کے بعد اللہ نے حدود نازل فرما دیں اور مثلہ کرنے سے رسول اللہ ﷺ کو منع فرما دیا۔ پھر حضور ﷺ نے کسی کو مثلہ نہیں کیا قتادہ کا بیان ہے ہم کو اطلاع ملی ہے کہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ صدقہ کی ترغیب دیتے تھے اور مثلہ کرنے سے منع فرماتے تھے سلیمان تیمیؒ نے حضرت انس کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی آنکھوں میں اس لئے سلائی پھیروائی کہ انہوں نے بھی چرواہوں کی آنکھیں پھوڑی تھیں۔ لیث بن سعد نے کہا اس آیت کے نزول کا رخ رسول اللہ ﷺ کی طرف بطور عتاب ہے اور ان لوگوں کو سزا دینے کی تعلیم دینے کے لئے ہے اسی لئے فرمایا کہ ان کی سزا تو صرف یہ ہے مثلہ کرنا (جائز) نہیں۔

ضحاک نے کہا اس آیت کا نزول اہل کتاب میں سے ایک قوم کے متعلق ہوا جن کا رسول اللہ ﷺ سے معاہدہ تھا مگر انہوں نے معاہدہ توڑ دیا راستے لوٹے اور زمین پر فساد پھیلایا۔

کلبی نے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول ہلال بن عویمر کے قبیلہ کے حق میں ہوا رسول اللہ ﷺ نے ہلال بن عویمر یعنی ابو برزہ اسلمی سے معاہدہ کیا تھا کہ ابو برزہ کی قوم نہ رسول اللہ ﷺ کی مدد دے گی نہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف کسی دشمن کو، اور قبیلہ ہلال بن عویمر کا کوئی آدمی اگر رسول اللہ ﷺ کی طرف سے گزرے گا تو وہ مامون رہے گا (اس سے کچھ تعرض نہیں کیا جائے گا اور) اس کو چھیڑا نہ جائے گا ایک بار قبیلہ کنانہ کے کچھ لوگ اسلام لانے کے ارادہ سے چلے اور قبیلہ اسلم کے کچھ لوگوں کی طرف سے ان کا گذر ہوا قبیلہ اسلم ہلال بن عویمر کا قبیلہ تھا۔ ہلال اس وقت موجود نہ تھا بنی اسلم نے بنی کنانہ والوں پر چڑھائی کر دی اور

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) ہو گئے حضور ﷺ نے ان کو صدقہ کے اونٹوں کے ساتھ (پڑاؤ پر جنگل میں) رہنے کا حکم دیا تا کہ اونٹوں کا پیشاب اور دودھ پیا کریں (وہ چلے گئے) اور دودھ وغیرہ پی کر تندرست اور موٹے ہو گئے پھر رسول اللہ ﷺ کے چرواہے کو قتل کر کے اونٹوں کو ہنکا کر لے گئے اور مرتد ہو گئے حضرت جبرئیل نے آکر اطلاع دی اور مشورہ دیا کہ کسی کو ان کے تعاقب میں روانہ کیجئے حضور ﷺ نے ان کے پیچھے لوگوں کو روانہ کر دیا۔ جبرئیل نے یہ بھی کہا کہ آپ ان الفاظ سے دعا بھی کیجئے۔ اے اللہ بلا شبہ آسمان تیرا آسمان ہے۔ زمین تیری زمین ہے مشرق تیرا اور مغرب تیرا ہے اے اللہ ان پر زمین کو باوجود فراخ ہونے کے تنگ کر دے یہاں تک کہ تو ان کو میرے قابو میں دیدے آخر لوگ ان کو گرفتار کر کے لے آئے۔ اس پر آیت اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ الخ اللہ نے نازل فرمائی۔ جبرئیل نے حکم دیا کہ جس نے مال چھینا ہو اور قتل کیا ہو اس کو صلیب دی جائے اور جس نے صرف قتل کیا ہو اس کو صرف قتل کیا جائے اور جس نے صرف مال لیا ہو قتل نہ کیا ہو اس کا ہاتھ اور پاؤں کاٹا جائے مگر دونوں ایک طرف کے نہیں بلکہ ایک دایاں اور دوسرا بایاں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اگر کوئی غلام بھاگ جائے یا کوئی جانور یا آدمی گم ہو جائے تو یہ دعا پڑھی جائے اور کسی چیز پر لکھ کر کسی صاف پاک مقام پر دفن کی جائے اللہ ضرور فراری گم شدہ پر قابو عنایت فرما دے گا۔

مال چھین کر ان کو قتل کر دیا یہ خبر لے کر جبرئیلؑ آئے اور ان آیات کا نزول ہوا۔

فائدہ :- باتفاق علماء اس آیت میں محاربین مفسدین سے مراد راہزن ڈاکو ہیں خواہ مسلمان ہوں یا ذمی ہوں اس مسئلہ پر بھی اتفاق ہے کہ جو شخص شہر سے باہر نکل کر ڈرانے کے لئے ہتھیار نکالے اور مقام ایسا ہو کہ وہاں (حکومت یا راہ گیروں کی طرف سے) مدد نہ پہنچ سکتی ہو وہ محارب اور راہزن ہے اس پر آیت کے احکام جاری کئے جائیں گے۔

شہر کے اندر یا دو بستیوں کے درمیان مثلاً حیرہ اور کوفہ کے درمیان اگر کوئی شخص رات کو یا دن میں راستہ لوٹے تو اس کے حکم میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک وہ رہزن محارب ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا لٹیرا ہونے کا حکم اسی وقت ہو گا جب شہر کے باہر اتنی دور وہ رہزنی کرے کہ مددگار کا پہنچنا ممکن نہ ہو۔ کذا ذکر صاحب رحمۃ الامۃ۔

بغوی نے لکھا ہے شہروں کے اندر زبردستی رہزنی کرنے والے اس آیت کے حکم میں داخل ہیں یہی قول مالک اوزاعی، لیثؒ بن سعد اور شافعیؒ کا ہے۔ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ امام شافعیؒ کا یہی مذہب ہے کیونکہ ان کے وجیز (المسائل) میں صراحت ہے کہ جو شخص زبردستی شہر کے اندر مال چھینے گا وہ رہزن ہے۔ ظاہر روایت (یعنی امام محمد کی چھ کتابوں میں سے کسی ایک کتاب) میں امام اعظمؒ کے نزدیک یہ شرط ہے کہ شہر اور رہزنی کے مقام کے درمیان بقدر سفر مسافت ہو۔ امام ابو یوسفؒ کا قول ہے کہ شہر سے باہر دور جگہ پر اگر رہزنی ہو تو حد واجب ہے کیونکہ مدد پہنچ نہ سکے گی اس لئے ایسے شخص کو لٹیرا کہا جائے گا بلکہ بیابان و صحرا میں لوٹنے سے ایسے مقام میں لوٹنا زیادہ سخت ہے اور نص (قرآن و حدیث) میں رہزنی کے مقام کی تعین نہیں آئی (کہ ایک میل ہو یا ۴۸ میل پر) امام مالکؒ کے دو قول روایت میں آئے ہیں ایک میں آبادی سے تین میل دور ہونے کی صراحت ہے اور دوسرے قول میں آیا ہے کہ اگر اس طور پر مال چھینا کہ لوٹے جانے والے کے لئے مدد طلب کرنا ممکن نہ ہو تو ایسا شخص محارب ہو گا۔

امام احمدؒ نے اس مسئلہ میں توقف اختیار کیا ہے لیکن اکثر حنابلہ کی رائے ہے کہ مقام رہزنی ایسا ہونا ضروری ہے جہاں مدد نہ پہنچے۔ امام ابو یوسفؒ کا ایک قول روایت میں آیا ہے کہ شہر کے اندرون کے وقت اگر ہتھیار لے کر لوٹنے کا ارادہ کرے گا تو راہزن قرار دیا جائے گا اور اگر لکڑی (پتھر) وغیرہ سے لوٹنے کا ارادہ کرے گا تو وہ راہزن نہ ہو گا ہاں رات میں اگر پتھر لکڑی وغیرہ لے کر بھی لوٹے گا۔ تو لٹیرا ہی ہو گا۔ کیونکہ دن میں مدد پہنچنے کا امکان ہوتا ہے مگر ہتھیار میں مدد پہنچنے سے پہلے ہی اپنا کام کر چکتے ہیں لہٰذا دن میں ہتھیاروں کے ساتھ لوٹے گا تو اس کو لٹیرا کہا جائے گا ورنہ نہیں اور رات میں مدد پہنچنے میں دیر لگتی ہے یا مدد پہنچ نہیں سکتی ایسے وقت میں بغیر ہتھیاروں کے بھی رہزنی ہو سکتی ہے۔ شرح طحاوی میں ہے کہ فتوی امام ابو یوسف کے اس قول پر ہے۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ امام شافعیؒ کا مسلک تقاضائے قیاس کے موافق ہے۔ کیونکہ زبردستی کی صورت میں حقیقۃً رہزنی کا تحقیق ہو جاتا ہے (خواہ شہر کے اندر ہی ہو) مگر امام ابو حنیفہؒ کا قول استحسان پر مبنی ہے استحسان کی وجہ یہ ہے کہ رہزنی کا وجود اس وقت ہو گا جب امداد پہنچنے کی جڑ کٹ جائے اور شہر کے اندر اور شہر کے قریب امداد کی جڑ کٹنے کی صورت نہیں۔ مدد پہنچنے کا کھلا ہوا احتمال ہے۔

ابن ہمام نے لکھا ہے کہ آیت میں جو سزا بیان کی گئی ہے وہ رہزنی کے (اصطلاحی) مفہوم سے وابستہ نہیں ہے، رہزنی کا لفظ تو لوگوں کا ساختہ پرداختہ ہے بلکہ اس سزا کا تعلق اللہ کے بندوں سے جنگ کرنے کے ساتھ ہے اور ایسا شہر کے باہر ہی ہوتا ہے پھر شہر اور مقام رہزنی کے درمیان تین روز کی مسافت کا ہونا ضروری نہیں اس تعین کی کوئی وجہ نہیں، حدیث عرینہ اس تعین مسافت سے انکار کر رہی ہے (کیونکہ اونٹوں کے رہنے کا مقام جہاں عرینہ والوں نے ڈاکہ مارا تھا مدینہ سے تین دن کی مسافت پر نہیں تھا اس سے کہیں قریب تھا)۔

مسئلہ :- ڈاکو ایک شخص ہو یا گروہ بہرطور ایسا طاقتور ہونا چاہئے کہ مقابلہ کر رہا ہو اور کر سکتا ہو اس لئے وہ اچکے جو قافلہ کے پچھلے حصہ پر حملہ کر کے مال لے کر راہ فرار اختیار کر لیتے ہیں اور وہ لوگ جو چند آدمیوں پر اپنی قوت (جسمانی) کی وجہ سے غالب آجاتے ہیں قافلہ کے ڈاکو نہیں قرار پائیں گے، ہاں جن کو لوٹا ہو گا ان کے لحاظ سے ہم ان کو راہزن اور ڈاکو کہہ سکتے ہیں، ڈاکو

کے اندر مقابلہ کی طاقت ہونا ضروری ہے یہ شرط خود آیت سے مستفاد ہے کیونکہ محاربت اور ملک میں فساد بغیر مقابلہ کی طاقت ہونے کے ممکن نہیں۔

اَنۡ یُّقَتَّلُوۡۤا اَوۡ یُصَلَّبُوۡۤا اَوۡ تُقَطَّعَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَ اَرۡجُلُهُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ اَوۡ یُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ ؕ

کہ ان کو قتل کر دیا جائے یا صلیب پر لٹکا دیا جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جہتوں سے کاٹ دیئے جائیں یا ان کو اس زمین سے نکال دیا جائے، باجماع امت مخالف جہت سے مراد ہے دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹنا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ آیت میں بیان کی ہوئی چاروں سزاؤں میں سے کسی ایک سزا کا دینا امام کے تمیزی اختیار میں ہے ظاہر آیت سے یہی معلوم ہوتا ہے لفظ اَوْ کلمہ تخییر ہے (یعنی لفظ اَوْ فرما کر اللہ نے حاکم کو اختیار دیا ہے کہ چاروں سزاؤں میں سے جو سزا اس کے نزدیک مناسب ہو وہ دے) اس صورت میں کسی زائد قید کو محذوف قرار دینے کی ضرورت بھی نہ ہو گی، یہ قول سعید بن میسبؒ، عطاءؒ، داؤدؒ، حسن بصریؒ، ضحاکؒ، نخعیؒ، مجاہدؒ اور ابو ثورؒ کا ہے، امام مالکؒ نے فرمایا امام اپنی رائے اور اجتہاد سے کام لے کر سزا دے، جو محارب طاقتور اور (سیاسی) سوجھ بوجھ والا ہو اس کو قتل کر دے، اگر سیاست کا تقاضا اس سے زائد ہو تو صلیب پر چڑھا دے اور جو محارب طاقتور نہ ہو اور اس کے پاس (فتنہ انگیزی والی) عقل بھی نہ ہو اس کو اس زمین سے نکال دے اور جو طاقتور تو ہو مگر (فتنہ انگیز) فکر نہ رکھتا ہو اس کے ہاتھ پاؤں کٹوا دے، امام مالک کے نزدیک جلاوطن کرنے سے مراد یہ ہے کہ جس میں محارب رہتا ہو اس سے نکال کر دوسری جگہ بھیج دیا جائے اور وہاں قید کر دیا جائے (آزاد نہ چھوڑا جائے) محمد بن جبیر کا یہی قول ہے، امام مالک کے نزدیک یہ بھی شرط ہے کہ چھینا ہوا (کل) مال بقدر نصاب ہو تقسیم کے بعد ہر ڈاکو کے حصہ میں بقدر نصاب مال آنا ضروری نہیں، امام اعظمؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، اور امام اوزاعیؒ کے نزدیک آیت میں لفظ اَوْ ڈاکو کے مختلف احوال کو ظاہر کر رہا ہے (تقسیم حال کے مطابق تقسیم سزا کی گئی ہے) اگر ڈاکوؤں نے رہزنی کا ارادہ کیا ہو اور ڈرایا دھمکایا ہو یا مال نہ لیا ہو نہ قتل کیا ہو تو ان کو جلاوطن کیا جائے جلاوطن کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان کو قید کر دیا جائے اور اس وقت تک بند رکھا جائے جب تک توبہ نہ کریں، کیونکہ اس صورت میں ان کا شر ملک سے دفع ہو جائے گا گویا ان کو زمین سے نکال باہر کر دیا جائے گا (یعنی ان کا وجود زمین کے اوپر نہ رہے گا، زیر زمین پہنچ جائیں گے)۔

مکحول کی روایت ہے کہ قید خانہ میں سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (ڈاکوؤں کو) بند کیا اور فرمایا میں اس وقت تک ان کو بند رکھوں گا جب تک توبہ نہ کر لیں، یہاں سے نکال کر دوسرے شہر میں نہیں بھیجوں گا کہ وہاں لوگوں کو دکھ پہنچائیں، محمد بن جبیر نے کہا بستی سے نکال کر کسی دوسری بستی میں قید خانہ میں بند کر دیا جائے اس قول پر حقیقی اور مجازی معنی کا بیک وقت مراد ہونا لازم آتا ہے، اکثر علماء کا قول ہے کہ حاکم وقت اعلان کر دے کہ جس بستی میں ملے وہاں سے نکال باہر کر دیا جائے اس طرح کسی جگہ قرار نہ پکڑنے دیا جائے۔

اگر ڈرایا بھی ہو اور کسی مسلمان یا ذمی کا مال بھی چھینا ہو مگر قتل نہ کیا ہو، اور مال اتنا ہو کہ تقسیم کے بعد ہر ڈاکو کے حصہ میں چوری کے نصاب کے برابر آجائے (برائے امام اعظم دس درہم اور بر قول شافعی و احمد چہارم دینار یا تین درہم نصاب سرقہ ہے) تو اس صورت میں ڈاکوؤں کے ہاتھ پاؤں مختلف جہات سے کاٹے جائیں گے، اور اگر قتل کیا ہو، مال نہ لیا ہو تو اولیاء مقتول اگرچہ معاف کر دیں پھر بھی ڈاکو کو قتل کیا جائے گا یہ قتل بطور شرعی سزا کے ہو گا۔

اگر قتل یا مال چھیننے کا ارتکاب ایک نے کیا ہو باقی مددگار ہوں، مرتکب جرم نہ ہوں تو امام اعظمؒ کے نزدیک شرعی سزا سب کو دی جائے گی، امام مالکؒ اور امام احمد کا بھی یہی قول ہے یہ سزا محاربت (اللہ کے خلاف جنگی کوشش) کی ہو گی، کیونکہ اس کوشش میں سب باہم مددگار ہیں، ایک کا بھی پاؤں اکھڑ جائے تو سب بھاگ اٹھیں اور چونکہ سب کے قدم جمے ہوئے ہیں اس لئے سب مجرم ہیں، شرط صرف یہ ہے کہ قتل کا وقوع ہوا ہو خواہ ایک سے ہی ہوا ہو دیکھو آیت میں یُقَتَّلُوۡۤا اَوۡ یُصَلَّبُوۡۤا اور تُقَطَّعَ تشدید کے ساتھ (ثلاثی مزید کے صیغے) آئے ہیں جو تکثیر اور مبالغہ کو ظاہر کر رہے ہیں اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ

ارتکاب اگرچہ ایک نے کیا ہو مگر سزا سب کو یکے بعد دیگرے دی جائے گی، امام شافعیؒ کے نزدیک مددگار کو صرف قید اور جلاوطنی کی سزا دی جائے گی۔

اگر ڈاکوؤں نے قتل بھی کیا اور مال بھی لیا ہو تو امام اعظمؒ اور امام ابو یوسف کے نزدیک حاکم کو اختیار ہے کہ پہلے ہاتھ پاؤں کٹوائے پھر قتل کرائے پھر صلیب پر لٹکائے یا صرف قتل کرائے یا صرف صلیب دے، امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک اس صورت میں قطع اعضاء کی سزا نہیں دی جائے گی، صرف قتل کیا جائے گا اور صلیب دی جائے گی، ظاہر آیت کا یہی اقتضاء ہے، امام محمدؒ کے نزدیک قطع اعضاء نہ ہوگا صرف قتل کیا جائے گا یا صلیب دی جائے گی، کیونکہ جرم ایک ہے دو سزائیں نہیں دی جاسکتیں قتل سے کم درجہ کا جرم باب سزا میں قتل کے اندر شامل سمجھا جاتا ہے جیسے چوری کی سزا اور رجم (اگر جمع ہو جائیں تو رجم کیا جائے گا چوری کی سزا نہیں دی جائے گی، اعلیٰ سزا کے اندر ادنیٰ سزا کو داخل قرار دیا جاتا ہے)۔

امام اعظمؒ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک سزا ہے چونکہ سبب سخت ہے اس لئے سزا بھی سخت ہے قتل کرنے اور مال چھیننے کی وجہ سے ڈاکو امن عامہ کو انتہائی طور پر تباہ کرتا ہے اس لئے اس کو سخت سزا دی جانی چاہئے اسی لئے بڑی چوری میں ہاتھ اور پاؤں کو کاٹنا ایک سزا قرار دیا جاتا ہے اور چھوٹی چھوٹی چوریوں میں دو سزائیں تجویز کی جاتی ہیں (ہاتھ کاٹنا ایک سزا پاؤں کاٹنا دوسری سزا) اور جب سزا ایک ہے (خواہ کتنی ہی سخت ہو مگر ہے ایک) تو تداخل ممکن نہیں کیونکہ تداخل دو سزاؤں میں ہوتا ہے ایک میں نہیں ہوتا۔

امام ابو یوسفؒ کا قول ہے کہ قتل بھی کیا جائے گا اور صلیب بھی یقیناً دی جائے گی کیونکہ نص قرآنی میں اس کی صراحت آگئی ہے اور اس سے غرض تشہیر دینی ہو تا کہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو، امام اعظم نے فرمایا اصل تشہیر تو قتل ہے صلیب دینے میں تشہیر کی زیادتی ہے لہٰذا حاکم کو اختیار ہے (صرف قتل کرادے یا صلیب دے دے) امام شافعی کے نزدیک صلیب پر قتل کرنے کے بعد کھینچا جائے گا، امام شافعیؒ کا ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ زندہ کو صلیب پر چڑھا دیا جائے گا پھر برچھے اور تیروں سے اس کو اتنا چھیدا جائے گا کہ وہ مر جائے امام اعظمؒ کا قول بھی دونوں طرح روایت میں آیا ہے، پہلی صورت کو طحاویؒ نے پسند کیا ہے، اس صورت میں مثلہ کرنا نہیں پڑتا، دوسری صورت کو کرخی نے اختیار کیا ہے یہی زیادہ صحیح بھی ہے کیونکہ قتل یا صلیب کشی کی صراحت ہے (اور لفظ اَوْ دونوں کو جمع کرنے سے مانع ہے)۔

امام اعظمؒ کے نزدیک تین دن سے زائد صلیب پر لٹکا نہ چھوڑا جائے اس سے زیادہ چھوڑنے سے لاش بگڑ جائے گی اور لوگوں کو دکھ ہوگا، امام ابو یوسفؒ کے نزدیک تختہ پر اس وقت تک لٹکا رکھا جائے کہ خود ٹوٹ کر گر پڑے تا کہ لوگوں کو عبرت ہوتی رہے، ہم کہتے ہیں عبرت آفرینی تو صورت صلیب پر لٹکانے سے ہی ہو جاتی ہے اور انتہائی عبرت آفرینی مقصود نہیں ہے۔

جمہور نے جس تفسیر کو اختیار کیا ہے، یہ امام شافعیؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب کی ہے، حضرت ابن عباسؓ نے راہزنوں اور لٹیروں کے متعلق فرمایا اگر لٹیروں نے قتل کیا ہو اور مال لیا ہو تو ان کو قتل کیا جائے اور صلیب دی جائے اور اگر صرف قتل کیا ہو تو مال نہ لیا ہو تو ان کو قتل کیا جائے صلیب نہ دی جائے اور اگر صرف مال لیا ہو قتل نہ کیا ہو تو ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جہت کے کاٹے جائیں اور اگر راہ گیروں کو صرف خوفزدہ کیا ہو مال نہ چھینا ہو تو جلاوطن کر دیا جائے۔

بیہقی نے محمد بن سعد عوفی کے طریق سے حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا ہے کہ اس آیت کے ذیل میں آپ نے فرمایا اگر محارب نے جنگ کی اور قتل کیا اور توبہ کرنے سے پہلے گرفتار کر لیا گیا تو اس کو قتل کیا جائے گا اور اگر محاربت کے ساتھ مال بھی چھینا اور قتل بھی کیا تو اس کو صلیب بھی دی جائے گی اور اگر (صرف مال لیا) قتل نہ کیا تو ہاتھ پاؤں مخالف جہت سے کاٹے جائیں گے اور اگر جنگ کی اور راہ گیروں کو خوفزدہ کیا (مال نہیں چھینا نہ قتل کیا) تو شہر بدر کر دیا جائے گا۔

امام محمدؒ نے امام ابو یوسفؒ کی وساطت سے بحوالہ کلبی از ابو صالح بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو بردہ، ہلال بن عویمر اسلمی سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر لیا۔ پھر کچھ لوگ (حوالی مکہ سے) مسلمان ہونے کے ارادہ

سے (مدینہ کو) چلے (راستہ میں) ابو بردہ کے ساتھیوں نے ان کو لوٹ لیا (اور قتل بھی کر دیا) اس پر حضرت جبرئیلؑ یہ ضابطہ سزا لے کر نازل ہوئے کہ جس نے قتل کیا ہو اور مال بھی لیا ہو اس کو صلیب دی جائے اور جس نے قتل کیا ہو، مال نہ لیا ہو اس کو قتل کیا جائے اور جس نے مال لیا ہو قتل نہ کیا ہو اس کے ہاتھ پاؤں مخالف جہت سے کاٹے جائیں اور جو (گرفتار ہونے سے پہلے) مسلمان ہو کر آجائے تو حالت شرک میں اس سے جو گناہ ہوئے ہوں گے اسلام ان کو ساقط کر دے گا۔ عطیہ کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ جس نے راہ گیروں کو خوف زدہ کیا ہو، قتل نہ کیا ہو نہ مال لیا ہو تو اس کو شہر بدر کر دیا جائے۔ رواہ احمد بن حنبل فی تفسیرہ۔

مجرم کے احوال کے موافق تقسیم سزا قواعد شرع کے مطابق بھی ہے ایسے امور میں حاکم کو اختیار تمیزی دینا قواعد شرع کے مطابق نہیں ہے کیونکہ اس جرم میں خفت اور ثقل ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے اب اگر حاکم کو اختیار تمیزی دیا جائے گا تو شدید ترین جرم پر خفیف ترین سزا اور خفیف ترین جرم پر شدید ترین سزا کا جواز پیدا ہو جائے گا۔

قتل کے عوض قتل، مال لینے کے عوض، ہاتھ پاؤں کٹنا اور دونوں جرم ہوں تو قتل کے ساتھ صلیب بھی دینا تقاضائے عقل کے مطابق بھی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے موخر الذکر صورت میں جو صرف قتل کرنے کی سزا پر اکتفا کیا ہے اور صلیب دینے کی اجازت نہیں دی وہ صرف عرینہ والوں کے واقعہ کی وجہ سے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو صلیب نہیں دی تھی (ورنہ عقلی تقاضا تو صلیب دینے کے موافق ہے)۔

مسئلہ :- اگر ڈاکو نے قتل نہ کیا ہو اور مال بھی نہ لیا ہو، صرف زخمی کر دیا ہو تو جو قابل قصاص زخم ہو گا اس کا قصاص (بدلہ) لیا جائے گا اور جو قابل تاوان زخم ہو گا اس کا مالی معاوضہ لیا جائے گا۔ اور لینے نہ لینے کا اختیار مجروح کو ہو گا وہ چاہے تو معاف کر دے۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے اس جرم کی کوئی شرعاً مقرر سزا نہیں صرف حق عبد کا اس سے تعلق ہے۔ لہٰذا مجروح کو اختیار ہو گا لیکن صاحب ہدایہ کا یہ قول کہ اس جرم کی کوئی شرعی سزا نہیں قابل تسلیم نہیں کیونکہ ڈرانا دھمکانا تو موجود ہے اور (مال لینے اور قتل کرنے کے بغیر صرف) ڈرانے دھمکانے کی شرعی سزا شہر بدر دینا مقرر ہے۔

مسئلہ :- اور اگر ڈاکو نے مال لے کر زخمی بھی کر دیا تو مال لینے کے عوض اس کا ہاتھ پاؤں کاٹا جائے گا۔ اور زخمی کرنے کی کوئی سزا جدا نہیں دی جائے گی کیونکہ عصمت نفس بندہ کا حق ہے اور عصمت مال اللہ کا حق ہے۔ جب حد شرعی جاری ہو گئی۔ کیونکہ مجرم نے حق خداوندی میں دخل اندازی کی تھی تو اب عصمت نفس کا سقوط ہو گیا۔ امام شافعیؒ نے کہا (دونوں حق جدا جدا ہیں اللہ کا حق عصمت مال اور بندہ کا حق عصمت نفس) حد شرعی جاری ہونے کی وجہ سے حق عبد ساقط نہیں ہو گا۔ زخموں کا قصاص بھی لیا جا سکتا ہے۔

امام اعظمؒ اور امام شافعی کا یہی اختلاف اس صورت میں ہے جب ڈاکو کو جرم قتل کی وجہ سے قتل کر دیا گیا ہو یا مال چھیننے کی وجہ سے اس کو ہاتھ پاؤں کاٹنے کی سزا دے دی گئی ہو اور جو مال اس نے چھینا تھا وہ تلف ہو گیا ہو یا مجرم نے تلف کر دیا ہو تو اب چھینے ہوئے مال کا کوئی تاوان مجرم پر عائد نہ ہو گا، لیکن امام شافعیؒ اور امام احمد کے نزدیک تلف شدہ اور تلف کردہ مال کا معاوضہ دینا پڑے گا ہاں اگر مال موجود ہو (تلف نہ ہوا ہو) تو باتفاق آئمہ واپس دیا جائے گا حد سرقہ کی بحث میں اس اختلاف کی تفصیل انشاء اللہ آئے گی۔

مسئلہ :- ڈاکوؤں میں اگر کوئی عورت بھی شامل ہو جس نے قتل کیا ہو اور مال لیا ہو تو امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک اس کو بھی قتل کیا جائے گا اور یہ سزا شرعی ہو گی (یعنی اولیاءِ مقتول کو معاف کر دینے کا حق نہ ہو گا)۔

امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا عورت کو قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ اور لئے ہوئے مال کا تاوان بھی وصول کیا جائے گا (یعنی اولیاءِ مقتول معاف کر دینے کا حق ہو گا)۔

مسئلہ :- اگر ڈاکوؤں میں کوئی بچہ یا دیوانہ شامل ہو تو (ان دونوں کے علاوہ) باقی لوگوں پر حد شرعی جاری کی جائے گی یہ

تینوں اماموں کا قول ہے۔ امام اعظمؒ اور امام زفر کے نزدیک باقی لوگوں سے بھی حد شرعی ساقط ہو جائے گی (صرف قصاص کا حق باقی رہے گا) اور امام ابو یوسفؒ کا قول ہے کہ اگر صرف صحیح الدماغ لوگوں نے جرم کا ارتکاب کیا ہے (اور بچہ یا دیوانہ جرم قتل و غصب میں شریک نہیں ہوئے صرف ساتھ تھے) تو باقی ڈاکوؤں پر شرعی حد جاری کی جائے گی (اور اگر بچہ یا دیوانہ بھی شریک جرم ہو تو باقی لوگوں سے بھی حد شرعی ساقط ہو جائے گی صرف قصاص کا حکم باقی رہے گا)۔

یہی اختلاف اس صورت میں ہے جب ڈاکو قافلہ والوں کے محرم قرابت دار ہوں۔ امام صاحبؒ کی دلیل یہ ہے کہ جرم ایک ہی ہے جو سب پر عائد ہو رہا ہے (خواہ اصل مجرم کوئی ایک ہی ہو اور دوسرے مددگار ہوں) لہٰذا باقی لوگوں کے متعلق شبہ پیدا ہو جاتا ہے (اور شبہ کی صورت میں حد شرعی جاری نہیں ہو سکتی) جمہور نے کہا ایسے شبہ کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ ورنہ حد شرعی کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

مسئلہ :- اگر قافلہ والوں میں سے ایک نے دوسرے کو لوٹ لیا تو حد واجب نہ ہو گی پورا قافلہ ایک پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا ہے جیسے ایک مکان کے اندر دو آدمی رہتے ہوں اور ایک دوسرے کا سامان چرا لے تو حد جاری نہیں ہوتی۔ جب حد واجب نہیں، تو قصاص اور مالی معاوضہ واجب ہو گا۔

ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا یہ (حد شرعی جس کا ذکر کیا گیا) ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے۔ یعنی ذلت و رسوائی (کا ذریعہ) ہے۔

وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۳۳﴾ اور آخرت میں ان کے لئے بڑا عذاب ہے ان کا جرم بڑا ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ ۖ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۳۴﴾ مگر جن لوگوں نے تمہارے قابو میں آجانے سے پہلے توبہ کر لی تو اللہ غفور رحیم ہے (ان کو معاف کر دے گا)۔

بغوی نے لکھا ہے جن علماء کے نزدیک اس آیت کا نزول کافروں کے حق میں ہوا ان کے نزدیک اس کا مطلب اس طرح ہو گا کہ جن (مجرم، قاتل، رہزن) کافروں نے قابو میں آنے سے پہلے شرک سے توبہ کر لی اور مسلمان ہو گئے ان پر حد جاری نہ ہو گی اور حالت کفر میں انہوں نے جو کچھ کیا ہو گا خون کیا ہو یا مال چھینا ہو، کسی فعل کا مواخذہ نہ ہو گا۔

میں کہتا ہوں اسی طرح حربی کافر گرفت میں آنے کے بعد (بھی) اگر شرک سے توبہ کر لے گا تو گزشتہ جرائم کا کوئی مؤاخذہ مسلمان ہو جانے کے بعد نہ ہو گا۔ اس حکم کا ثبوت دوسری آیات سے بھی ہوتا ہے۔ رہے مسلمان یا ذمی ڈاکو اور راہزن سو اگر گرفتار ہونے یعنی حاکم کے پنجہ میں پہنچنے سے پہلے وہ ڈاکہ مارنے اور راستہ لوٹنے سے توبہ کر لیں تو استثناء مذکور کا تقاضا ہے کہ ان پر حد جاری نہ کی جائے اور یہی اجماعی فیصلہ ہے کیونکہ اللہ نے فرمادیا ہے اللہ غفور رحیم ہے (یعنی دنیا میں اس کی قائم کی ہوئی حد جاری نہیں کی جائے گی) باقی حقوق عباد کا سوال رہتا ہے تو بعض علماء کے نزدیک ان کا بھی سقوط ہو جاتا ہے (توبہ کے بعد گزشتہ جرائم کا بطور قصاص کوئی مؤاخذہ نہیں رہتا) ہاں اگر چھینا ہوا مال موجود ہو گا تو واپس کر دیا جائے گا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہی فیصلہ روایت میں آیا ہے حارثہ بن بدر ڈاکو بن کر نکل گیا خون بھی کئے اور مال بھی لوٹا کچھ مدت کے بعد گرفتاری کے بغیر توبہ کر کے خود آگیا حضرت علیؓ نے اس سے کوئی مواخذہ نہیں کیا رواہ ابن ابی شیبۃ و عبد بن حمید و ابن ابی الدنیا و ابن ابی حاتم عن الشعبی۔ ابن ابی شیبہ اور عبد بن حمید نے اشعث کی روایت سے حضرت ابو موسیٰ کا بیان بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ اس روایت میں اشعث اور ابو موسیٰ کے درمیان ایک گمنام آدمی کا واسطہ ہے۔

جمہور کے نزدیک حقوق عباد ساقط نہیں ہوتے اگر کسی کو قتل کیا ہو اور مال چھینا ہو پھر گرفتار سے پہلے توبہ کر لی ہو تو مقتول کے وارثوں کو قصاص لینے یا معاف کر دینے کا حق ہے اور مال موجود ہو یا تلف ہو گیا ہو یا ڈاکو نے تلف کر دیا ہو (یعنی خرچ کر لیا ہو) بہر حال ادا کرنا ہو گا (موجود ہو گا تو بالاتفاق وہی واپس کرنا ہو گا اور تلف ہونے کی صورت میں ضمان دینا پڑے گا۔

امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا قصاص نفس اور ضمان مالی کے سقوط کی وجہ یہ تھی کہ حد شرعی واجب تھی جو خالص اللہ کا حق تھی

(اللہ کا حق مقدم تھا اس کو وصول کرنے کے لئے بندوں کا حق ساقط کر دیا گیا تھا) لیکن جب آیت میں کلمہ استثناء آنے کی وجہ سے حد واجب نہ رہی تو حق عبد کو ساقط کرنے والی چیز ہی باقی نہیں رہی اور بندہ کا حق پھر برسر ظہور آ گیا اور قصاص نفس و ضمان مالی کا حکم پھر نافذ ہو گیا۔ قصاص نفس و اعضاء اور ضمان مالی کا وجوب دوسری آیات سے ثابت ہی ہے (اس حکم کو دبانے والی جب کوئی چیز باقی نہیں رہی تو اب یہ حکم جاری ہونا لازم ہے) واللہ اعلم بالصواب۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ ـــ اے اہل ایمان! اللہ سے ڈرو اور اس کے تقرب کے جویاں رہو۔ اَلْوَسِیْلَۃَ سے مراد تقرب الٰہی ہے حاکم نے حضرت حذیفہؓ کا یہی قول بیان کیا ہے۔ فریابی، عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کی بھی یہی تفسیر نقل کی ہے۔ میں کہتا ہوں تقرب سے مراد ہے تقرب ذاتی جو ہر (جسمانی مادی) کیفیت سے بالاتر ہے قاموس میں ہے، تقرب شاہی، مرتبہ، درجہ، قربت، وسیلہ کے یہ سب معانی ہیں۔ واسل کے معنی ہے راغب صحاح میں ہے وسیلہ، وصیلہ سے خاص ہے۔ وسیلہ کا معنی ہے کس چیز تک رغبت کے ساتھ پہنچنا اور وصیلہ کا معنی ہے وابستہ ہو جانا۔ اول کے اندر رغبت کا مفہوم داخل ہے۔

حدیث میں آیا ہے وسیلہ اللہ کے ہاں ایک درجہ ہے جس سے اونچا کوئی درجہ نہیں۔ تم اللہ سے دعا کرو کہ اللہ وہ درجہ مجھے عنایت فرما دے۔ یہ حدیث حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے امام احمد نے صحیح سند کے ساتھ نقل کی ہے۔

مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم مؤذن کو اذان دیتے سنو تو جو الفاظ وہ کہتا ہے ویسے ہی تم کہو پھر (اذان کے بعد) مجھ پر درود پڑھو جو شخص میرے لئے ایک بار دعاء رحمت کرے گا اللہ اس پر دس بار رحمت نازل فرمائے گا۔ پھر میرے لئے وسیلہ ملنے کی اللہ سے دعا کرو جو میرے لئے وسیلہ عطا ہونے کی دعا کرے گا اس پر میری شفاعت حلال ہو جائے گی (یعنی اس کے لئے میری شفاعت کا دروازہ کھل جائے گا)۔

ایک شبہ

احادیث سے ثابت ہے کہ وسیلہ ایک خاص درجہ ہے جس سے اونچا کوئی درجہ نہیں اور مختلف نصوص (احادیث) اور اجماع امت سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ وہ درجہ رسول اللہ ﷺ کے لئے مخصوص ہے۔ پھر ہر شخص کو طلب گار وسیلہ ہونے کا حکم کس طرح دیا گیا (ناممکن الحصول چیز کو مانگنے کا حکم لاحاصل ہے) اس حکم سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مرتبہ وسیلہ پر پہنچنا دوسروں کے لئے بھی ممکن ہے۔

جواب

میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کے لئے مرتبہ وسیلہ تو براہ راست (بغیر کسی دوسرے کے ذریعہ کے) مخصوص ہے لیکن حضور ﷺ کی وساطت سے دوسرے اولیاء امت اور کاملین کے لئے بھی وہاں تک رسائی ممکن ہے (احادیث میں حضور ﷺ کی وساطت سے مرتبہ وسیلہ تک کسی دوسرے کی رسائی کی نفی نہیں کی گئی صرف حضور ﷺ کی ذاتی خصوصیت کو ظاہر کیا گیا ہے) اس مقام کی زیادہ تفصیل توضیح کے لئے دیکھو "مکتوبات حضرت شیخ مجدد الف ثانی" یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لفظ وسیلہ کا اطلاق تمام مراتب قرب پر عموماً کیا گیا ہو (قرب الٰہی کا ہر درجہ وسیلہ ہو) اور رسول اللہ ﷺ نے جس وسیلہ کی اپنے لئے مخصوص طور پر طلب فرمائی، وہ تمام مراتب قرب میں چوٹی کا درجہ ہو۔ واللہ اعلم۔

فائدہ :- رغبت اور محبت، وسیلہ کے مفہوم میں داخل ہے جوہری نے صحاح میں یہی صراحت کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مراتب کی قرب کی ترقی بغیر محبت کے ناممکن ہے اسی کی تائید حضرت مجدد قدس سرہ کے اس قول سے ہوتی ہے کہ (نظری) بہ ہم مرتبہ لاتعین (اطلاق) میں جو قرب کا سب سے بڑا درجہ ہے اس سے اونچا کوئی درجہ نہیں۔ اور اسی مرتبہ کو بطور کنایہ رسول اللہ ﷺ نے اس ارشاد میں ظاہر فرمایا ہے کہ میرے لئے اللہ کی معیت میں (یعنی اللہ کے قرب کے مرتبہ میں) ایک

وقت ایسا بھی آتا ہے جس میں میرے ساتھ کسی مقرب فرشتے اور نبی مرسل کی بھی گنجائش نہیں ہوتی (یعنی اس سیر کا مدار صرف محبت پر ہے ترقی محبت سے یہ مرتبہ سیر حاصل ہوتا ہے) اور محبت اتباع سنت کا ثمرہ ہے اللہ نے فرمایا ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ پس سنت کی پوری پیروی اور ظاہر و باطنی اتباع سے ہی حضور کی وساطت سے یہ مرتبہ محبت حسب مشیت الٰہیہ حاصل ہو جاتا ہے۔

وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ اور (اللہ کے دشمنوں سے خواہ وہ نفس ہو یا شیطان یا کفار) اللہ (کی خوشنودی) کی راہ میں جہاد کرو۔

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۵﴾ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ یعنی اللہ کی خالص عبدیت کمال تقوی اور طلب وسیلہ تم کو مل جائے اور تم اپنا مقصد حاصل کر لو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ جن لوگوں نے کفر کیا اگر (بالفرض قیامت کے دن) ان کو وہ تمام چیزیں جو زمین پر ان کی محبوب ہیں اور ان ہی کے برابر اور چیزیں بھی عذاب قیامت سے چھٹکارا پانے کے لئے مل جائیں (اور وہ یہ تمام چیزیں دے دیں) تب بھی (عذاب کے عوض) ان سے یہ (پیش کش) قبول نہیں کی جائے گی۔

بہٖ کی ضمیر مفرد لائی گئی حالانکہ مرجع ضمیر تثنیہ ہے اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ اس جگہ ضمیر اسم اشارہ کے قائم مقام ہے اور اسم اشارہ مفرد سے تثنیہ کی طرف اشارہ کرنا جائزہ ہے جیسے عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ میں یا یوں کہا جائے کہ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ میں واؤ معیت کا ہے اور اس کا عطف مافی الارض پر ہے اور اسی معیت کی تاکید لفظ مِثْلَهٗ سے کر دی گئی ہے (اس صورت میں ضمیر کا مرجع گویا ایک ہی ہو جائے گا)۔

......ایک شبہ......

جو واؤ مع کے معنی میں ہوتا ہے اس سے معیت وجودیہ سمجھی جاتی ہے (یعنی دونوں چیزوں کا وجود گویا ایک ہی ہوتا ہے) لیکن اس جگہ معیت (وجودیہ نہیں بلکہ معیت) کا مفہوم ہے۔ معاوضہ بننے میں اشتراک اس لئے واؤ بمعنی مع نہیں ہو سکتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ضمیر کا رجوع کسی چیز کی طرف کیا جائے اور اس چیز کے ساتھ ساتھ دوسری شئی بھی ہو تو جس حکم کا تعلق براہ راست اول چیز سے ہو گا بالتبع اور ذیلی طور پر دوسری چیز سے بھی ہو گا (پس معیت وجودیہ ہی ہے اور فدیہ کا تعلق براہ راست مافی الارض سے ہے اور مافی الارض کے ساتھ چونکہ مثلہ بھی ہے اس لئے ذیلی طور پر مثلہ سے بھی تعلق ہو جائے گا)

یعنی چونکہ وہ کامل طور پر راندہ درگاہ ملعون اور رحمت خداوندی سے دور ہوں گے اس لئے قیامت کے دن ان پر عذاب ہو گا اور اس عذاب سے چھوٹنے کے لئے تمام مرغوبات کو معاوضہ میں پیش کرنا بھی ناقابل قبول ہو گا۔

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ اپنی ذات اولاد مال اور جو چیزیں دنیا میں کافروں کو پیاری تھیں اور راہ خدا میں ان کو خرچ نہیں کرتے تھے قیامت کے دن یہ سب چیزیں بالفرض اگر ان کے پاس ہو جائیں اور اتنی اور بھی ہوں اور وہ بطور فدیہ عذاب ان سب کو دینا چاہیں تب بھی عذاب سے نہ چھوٹ سکیں گے۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۳۶﴾ اور ان کے لئے دردناک عذاب مخصوص ہے یعنی عذاب کا دفع ہونا تو ناممکن ہی ہے عذاب میں تخفیف بھی محال ہے۔ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ فرماتا ہے قیامت کے دن جس دوزخی کا عذاب سب سے ہلکا ہو گا۔ اس سے کہا جائے گا کہ اگر تیرے پاس زمین بھر کی تمام چیزیں ہو جائیں تو کیا اس عذاب سے چھوٹنے کے لئے تو وہ تمام چیزیں دے دے گا۔ دوزخی کہے گا، بے شک اللہ فرمائے گا جب تو آدم کی پشت میں تھا اس وقت میں نے تجھ سے اس سے بہت ہی زیادہ حقیر بات کی طلب کی تھی وہ یہ تھی کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ قرار دینا مگر (دنیا میں پہنچنے

کے بعد) تو نے سوائے شرک کے ہر چیز کو ماننے سے انکار کر دیا۔ متفق علیہ۔

يُرِيدُونَ أَنْ يَخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنْهَا ۖ وہ آگ سے ہر چند نکلنا چاہئیں گے مگر نکلنے والے ہی نہ ہوں گے (یعنی نہ نکل سکیں گے) یعنی نکلنے کا ارادہ کریں گے جیسے دوسری آیت میں آیا ہے كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا یا یہ مطلب کہ اللہ سے نکلنے کی تمنا اور درخواست کریں گے جیسے دوسری آیت میں دوزخیوں کی دعا کو نقل کیا گیا ہے رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْهَا۔

وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ بصورت جملہ اسمیہ، کلام میں صرف زور پیدا کرنے کے لئے فرمایا (کیونکہ جملہ فعلیہ حدوث پر دلالت کرتا ہے، اور فعلیہ کی جگہ جملہ اسمیہ کا استعمال دوام کو ظاہر کرتا ہے)۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ مُقِيمٌ ۝ اور ان کے لئے لازوال عذاب مخصوص ہے۔

جملہ سابقہ میں جس مفہوم کو ضمناً بیان کیا گیا تھا۔ اس کی صراحت اس جملہ میں کر دی ایک مزید بات اس سے یہ معلوم ہوئی کہ جس طرح دفع عذاب اور تخفیف عذاب ان کے اوپر سے ناممکن ہو گی اسی طرح دوام عذاب بھی ناقابل زوال ہو گا۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا اور چور مرد اور چور عورت کے ہاتھ کاٹ دو۔ باجماع اہل قرأت اَلسَّارِقُ اور اَلسَّارِقَةُ پر رفع منقول ہے۔ حالانکہ ضابطہ نحو کا تقاضا ہے کہ ایسے مقام میں نصب (زبر) لایا جائے تاکہ کسی توجیہ کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ اس لئے سیبویہ اور دوسرے نحویوں نے اس جگہ خصوصی تاویل کی ہے سیبویہ نے کہا یہ دو جملے ہیں اَلسَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ مبتداء ہے اور خبر محذوف ہے یعنی حُكْمُهُمَا فِيمَا يُتْلٰى چور مرد اور چور عورت کا حکم ان آیات میں موجود ہے جو تم کو سنائی جا رہی ہے۔ اور فَاقْطَعُوا جزا ہے جس کی شرط محذوف ہے یعنی اگر ان کی چوری ثابت ہو جائے تو ہاتھ کاٹ دو۔

مبرد نے کہا جملہ ایک ہی ہے اور فعل انشاء ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ اَلسَّارِقُ پر نصب پڑھا جائے لیکن فَاقْطَعُوا کی فاء گزشتہ اسم پر فَاقْطَعُوا کو عمل کرنے سے روک رہی ہے اس لئے یوں کہا جائے گا کہ اَلسَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ مبتداء ہے اور چونکہ معنی شرط کو حامل ہے اس لئے اس کی جزاء میں فاء لائی گئی ہے۔

علامہ تفتازانی کا قول ہے کہ ایسے مقام پر انشاء بلا تکلف مبتدا کی خبر واقع ہو جاتی ہے کیونکہ حقیقت میں ایسا فعل انشائی شرط کی جزا ہوتا ہے یعنی اگر کسی نے چوری کی ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔

اسلوب قرآنی ہے کہ اکثر مواقع میں عورتوں کا تذکرہ مستقل طور پر نہیں کیا جاتا۔ مردوں کے ذکر میں عورتوں کا حکم بھی ذیلی طور پر آجاتا ہے لیکن اس جگہ اور حد زنا کے موقع پر مرد کے ساتھ مستقل طور پر عورت کا ذکر حدود کے موقع پر نہ ہو تو شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید عورتوں کے لئے حدود نہیں ہیں) اس لئے صراحت کے ساتھ عورت کا بھی ذکر کر دیا۔

اس آیت میں مرد کا ذکر پہلے اور حد زنا کی آیت میں عورت کا ذکر پہلے اس لئے کیا کہ چوری کے لئے جرأت کی ضرورت ہے جو مردوں میں زیادہ ہوتی ہے اور زنا کا مدار شہوت پر ہے جو عورتوں میں زیادہ ہوتی ہے، ہاتھ کاٹنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ ہاتھ چوری کا آلہ ہے لیکن زنا کی سزا میں آلہ زنا کاٹنے کا حکم نہیں دیا تاکہ قطع نسل نہ ہو۔

ہاتھ کا اطلاق پورے ہاتھ پر مونڈھے تک ہوتا ہے اسی لئے خوارج کے نزدیک چور کا ہاتھ مونڈھے سے کاٹنے کا حکم ہے۔

لیکن امت اسلامیہ کا عمل ہمیشہ سے یونہی چلا آیا ہے اور اسی پر اجماع ہو چکا ہے کہ پہنچے سے ہاتھ کاٹا جائے۔ عمل متوارث اور ایسے اجماع کے لئے کسی سند اور خصوصی دلیل کی ضرورت نہیں۔ (پوری امت کا اتفاق آراء گمراہی پر نہیں ہو سکتا) خصوصی طور پر کچھ احادیث بھی آئی ہیں جن کے اندر پہونچے سے ہاتھ کاٹنے کا ذکر ہے۔

صفوان کی چادر کی چوری کے سلسلہ میں دار قطنی نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پہونچے سے چور کا

ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا تھا۔ یہ روایت ایک راوی کی وجہ سے جس کا نام عذری ہے ضعیف قرار دی گئی ہے۔
کامل میں ابن عدی نے یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے لکھی ہے لیکن اس سلسلہ میں عبدالرحمٰنؒ بن سلمہؒ آتا ہے جس کے متعلق ابن قطان نے کہا ہے کہ مجھے اس کا کوئی حال معلوم نہیں (گویا یہ شخص منکر اور مجہول ہے)۔
ابن ابی شیبہ نے رجاء بن حیوۃ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جوڑ سے (ایک شخص کی) ٹانگ کٹوائی تھی۔ یہ روایت مرسل ہے۔ ابن ابی شیبہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے جوڑ سے (ہاتھ) کٹوائے تھے۔
بعض علماء نے لکھا ہے کہ ہاتھ کا لفظ مشترک ہے اس کا اطلاق پنجہ سے مونڈھے تک پورے عضو پر بھی ہوتا ہے اور صرف پہونچے تک بھی موخرالذکر معنی پر اس کا اطلاق زیادہ مشہور ہے اور اول معنی پر کم اور جب یہ لفظ مشترک ہے تو وہ معنی مراد لینا ضروری ہے جو یقینی ہو (یعنی پہونچے تک) اس سے زائد میں احتمال ہے کہ شاید یہ مراد نہ ہو اس لئے باقی حصہ دست میں اشتباہ ہے۔
حضرت ابن مسعودؓ کی قرات میں بجائے اَیْدِیَھُمَا کے اَیْمَانَھُمَا آیا ہے اس لئے باجماع علماء نے کہا اَیْدِیْ سے مراد دائیں ہاتھ ہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ کی قرأت مشہور ہے اور آیت کا تعلق حکم سے ہے۔ اور واقعہ بھی ایک ہی ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ اگر حکم سے آیت کا تعلق ہو اور واقعہ میں وحدت ہو تو مطلق کو مشہور میں ذکر کی ہوئی قید سے مقید کرنا جائز ہے۔ یہ مجمل کا بیان نہیں ہے کیونکہ یہاں اجمال ہی نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اور صحابہؓ نے چوروں کے داہنے ہاتھ ہی کٹوائے اگر مطلق مراد ہوتا۔ تو حضور ﷺ اور صحابہ بایاں ہاتھ کٹواتے لوگوں کے لئے سہولت اسی میں تھی اور سہولت کی طلب ضروری تھی۔ دلیاں ہاتھ بائیں ہاتھ سے زیادہ کام آتا ہے (اس کے کٹوانے میں لوگوں کا نقصان زیادہ ہے)۔
اَیْدِیْ جمع کا صیغہ ہے اور ھما تثنیہ کی ضمیر ہے اور اَیْدِیْ سے مراد دائیں ہاتھ ہیں اس لئے اس کا اشتباہ نہیں ہو سکتا کہ ایدی سے مراد چاروں ہاتھ ہیں اور جب اشتباہ نہ ہو تو تثنیہ کی طرف جمع کی اضافت جائز (بلکہ بہتر) ہے تثنیہ کی طرف اضافت کرنے سے تکرار تثنیہ ہو جائے گی (جو کلام میں گرانی پیدا کر دے گی) لیکن اگر جمع کا صیغہ لانے سے اشتباہ پیدا ہو رہا ہو تو تثنیہ کی جانب جمع کی اضافت جائز نہیں جیسے اَفْرَاسُکُمَا اور غِلْمَانُکُمَا کہنا (جب کہ دو گھوڑے اور دو غلام مراد ہوں) جائز نہیں۔ لیکن اگر اَیْدِیْ سے مطلق مراد ہو (صرف دائیں ہاتھ مراد نہ ہوں) تو چونکہ اس وقت (چار ہاتھ ہونے کا) اشتباہ ہو جائے گا اس لئے تثنیہ کی طرف جمع کی اضافت جائز نہ ہوگی۔ واللہ اعلم۔
سرقہ (چوری) سے مراد ہے کسی کا مال چھپا کر محفوظ مقام سے لے لینا قاموس میں ہے۔ سَرَقَ مِنْہُ الشَّیْءَ وَاسْتَرَقَہٗ چھپ کر کسی محفوظ مقام پر گیا اور وہاں سے دوسرے کا مال لے لیا۔ پس پوشیدہ طور پر محفوظ مقام سے کسی غیر کا مال لے لینا۔ چوری کے مفہوم میں داخل ہے اسی لئے چوری کے لئے مندرجہ ذیل شرطیں ضروری ہیں۔
(۱) مال غیر کا مملوک ہو اور چور کے مالک ہونے کا اس میں شبہ بھی نہ ہو۔
(۲) مال محفوظ ہو جس کی حفاظت میں کوئی شبہ نہ ہو۔
امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر کسی ایک چیز کے لئے کوئی ذریعۂ حفاظت ہو تو وہ ہر طرح کے مال کے لئے ذریعہ حفاظت مانا جائے گا لیکن باقی تینوں اماموں کے نزدیک اموال کے اختلاف کے اعتبار سے ان کے ذرائع حفاظت میں بھی اختلاف ہوتا ہے اور اس کی تعین صرف عرف پر موقوف ہے مثلاً اگر گھوڑوں کے اصطبل یا بکریوں کے باڑہ کے اندر سے موتی چرائے تو امام اعظم رحمۃ اللہ کے نزدیک ہاتھ کاٹا جائے گا۔ مگر دوسرے اماموں کے نزدیک نہیں کاٹا جائے گا (اصطبل اور باڑہ اگرچہ مقام حفاظت ہے مگر موتیوں کے لئے نہیں گھوڑوں اور بکریوں کے لئے ہے)۔
حفاظت کبھی تو مقام کی وجہ سے ہوتی ہے جو حفاظت کے لئے بنایا گیا ہو (مثلاً خزانہ کی جگہ بینک کی عمارت وغیرہ) اور کبھی نگراں کی وجہ سے مال کے محفوظ ہونے کا حکم دیا جاتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص راستہ میں یا مسجد میں اپنا سامان اپنے ساتھ رکھ کر بیٹھ جائے (تو باوجودیکہ راستہ عام جگہ اور مسجد عام مقام ہے مگر سامان کو زیر حفاظت قرار دیا جائے گا)۔

حضرت صفوان رضی اللہ عنہ مسجد میں سو رہے تھے کسی شخص نے ان کے سر کے نیچے سے چادر چرالی۔ رسول اللہ ﷺ نے چور کا ہاتھ کٹوادیا۔ رواہ مالک فی الموطا واحمد والحاکم وابوداؤد والنسائی وابن ماجہ۔ صاحب تنقیح نے لکھا ہے یہ حدیث صحیح مختلف طریقوں سے آئی ہے اور الفاظ بھی مختلف روایات میں کچھ مختلف ہیں۔ اگرچہ بعض سلسلے منقطع اور بعض کچھ ضعیف ہیں (مگر بحیثیت مجموعی حدیث صحیح ہے)۔

اگر دن میں چوری ہو تو شروع اور آخر دونوں حالتوں میں پوشیدہ ہونا ضروری ہے اور اگر رات میں ہو تو صرف ابتدا میں پوشیدہ ہونا کافی ہے۔ کیونکہ رات میں دیوار میں نقب زنی اگر چھپ کر کی پھر مالک سے مال زبردستی سامنے آکر لیا تو یہ سرقہ ہو جائے گا۔

باجماع علماء چوری کے لئے شرائط مذکورہ کا موجود ہونا لازم ہے کیونکہ چوری کے مفہوم میں یہ شرطیں داخل ہیں۔

رہا چور کی ملکیت کا شبہ نہ ہونا اور مال کا یقینی طور پر محفوظ ہونا تو یہ دونوں شرطیں مرفوع احادیث سے مستفاد ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے شافعی اور ترمذی اور حاکم اور بیہقی نے بیان کیا ہے اور بیہقی نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہاں تک ہو سکے مسلمانوں سے حدود (شرعی سزاؤں) کو ساقط کرو۔ مسلمان کے لئے خلاصی کا اگر کوئی بھی راستہ نکل سکتا ہو تو اس کو رہا کردو کیونکہ غلطی سے معاف کردینا سزا میں خطا کرنے سے حاکم کے لئے بہتر ہے۔

ابن ماجہ نے حسن سند سے حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع روایت بیان کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جب تک تم کو دفع کرنے کا راستہ ملے اللہ کے بندوں سے حدود کو دفع کرو۔ حضرت علیؓ کی مرفوع روایت ہے کہ حدود کو دفع کرو مگر امام کے لئے حدود کو معطل کردینا جائز نہیں (کہ کامل ثبوت کے بعد بھی سزا نہ دے) رواہ الدارقطنی والبیہقی بسند حسن۔

ابن عدی نے اہل مصر کی حدیث سے ضعیف سند کے ساتھ نیز جزبزہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت ان الفاظ کے ساتھ بیان کی ہے کہ شبہات کی وجہ سے حدود کو ساقط کردو اور اللہ کی مقرر کی ہوئی حد کے علاوہ دوسری صورتوں میں بھلے آدمیوں کی غلطیوں سے درگزر کرو۔ اس حدیث کا اول حصہ ابو مسلم کجی اور ابن السمعانی نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی روایت سے مرسلاً اور مسدد نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے موقوفاً بیان کیا ہے۔

اجماع علماء ہے کہ حدود کو شبہات کی وجہ سے ساقط کردیا جائے۔

چوری کی شرائط مذکورہ بیان کرنے کے بعد اب ہم وہ مسائل بیان کرتے ہیں جو ان شرائط پر متفرع ہوتے ہیں۔

مسئلہ :- لٹیرے اور اچکے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا یہ سامنے سے لیتے ہیں چوری نہیں کرتے۔ خائن اور منکر امانت کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ حفاظت کاملہ کے اندر سے اس صورت میں مال نہیں لیا جاتا، مالک اپنی مرضی سے اپنا مال امانت رکھتا اور دوسرے کی حفاظت میں دیتا ہے اس لئے مال مالک کی حفاظت میں نہیں رہتا، خائن اور منکر امانت کی حفاظت میں چلا جاتا ہے چور کی حفاظت میں مالک خود اپنا مال نہیں دیتا چور کو اس کی حفاظت میں دخل ہوتا ہے اصل مسئلہ کا ثبوت مندرجہ ذیل احادیث سے ہوتا ہے۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوٹنے والے پر قطع (دست کا جرم) نہیں اور جو علی الاعلان لوٹے وہ ہم میں سے نہیں۔ رواہ ابوداؤد۔

حضرت جابرؓ کی دوسری روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوٹنے والے پر قطع (دست کا جرم) نہیں نہ خائن پر نہ لوٹنے والے پر نہ اچکے پر۔ رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجہ والدارمی۔ ترمذی نے اس کو حسن صحیح کہا ہے۔

حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی روایت سے صحیح سند سے ابن ماجہ نے اس کی تائید میں دوسری حدیث بھی نقل کی ہے اور طبرانی نے الاوسط میں زہری کے طریق سے حضرت انس رضی اللہ عنہ یک تائیدی روایت بھی لکھی ہے اور ابن جوزی نے العلل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے بھی اس کی تائیدی حدیث بیان کی ہے مگر اس کو ضعیف کہا ہے۔ امام احمدؒ کے نزدیک منکر عاریت کا ہاتھ کاٹنا واجب ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں آیا ہے کہ ایک مخزومی عورت

لوگوں کا سامان بطور عاریت لے کر منکر ہو جاتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا۔ اس عورت کے آدمی نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ عرض معروض کی جس کی وجہ سے حضرت اسامہؓ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گزارش کی حضور ﷺ نے فرمایا۔ اسامہؓ! میرا تو خیال تھا کہ تم اللہ کی قائم کی ہوئی کسی حد میں مجھ سے (کبھی) کچھ نہیں کہو گے پھر (باہر تشریف لا کر) خطبہ دینے حضور ﷺ کھڑے ہو گئے اور فرمایا تم سے پہلے والے لوگ اسی لئے تباہ ہوئے کہ اگر ان میں کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور کمزور چوری کرتا تھا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیتے تھے۔ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی چوری کرے گی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دوں گا۔ پھر حضور ﷺ نے مخزومی عورت کا ہاتھ کٹوا دیا۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں آیا ہے کہ مخزومیہ سامان بطور عاریت لے کر منکر ہو جاتی تھی حضور ﷺ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا۔

جمہور کی طرف سے اس حدیث کا جواب یہ ہے کہ وہ عورت عاریت لے کر انکار کر جانے میں مشہور تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کی یہی مشہور صفت بیان کر کے تعین شخصی کر دی (اگرچہ نام نہیں لیا مگر اس کی امتیازی شہرت کو ذکر کر کے گویا نامزد کر دیا) آپ کا مطلب یہ تھا کہ قبیلہ بنی مخزوم کی وہ عورت جو عاریت لے کر مکر جانے میں مشہور تھی۔ ایک مرتبہ اس نے چوری کی تو اس کے ہاتھ کاٹ دینے کا حکم دیا گیا۔ (اس مطلب کی تائید اس تقریر سے بھی ہوتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے اقوام گزشتہ کی ہلاکت اس امر کو قرار دیا تھا کہ اگر کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا تو وہ چھوڑ دیتے تھے اور کمزور آدمی چوری کرتا تھا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیتے تھے اس تشبیہی قصہ کو بیان کرنے سے ثابت ہو رہا ہے کہ مخزومیہ عورت نے بھی چوری کی تھی۔ ورنہ صرف عریت لے کر منکر ہو جانے کو چوری نہیں کہا جا سکتا۔ پھر تمثیل اور ممثل لہٗ میں وجہ شبہ مشترک نہیں نکلے گی۔ پھر آخر میں حضور ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے متعلق فرمایا کہ اگر وہ بھی چوری کرے گی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دوں گا۔ یہ الفاظ بھی بتا رہے ہیں کہ مخزومیہ نے چوری کی تھی ورنہ لوگ کہہ سکتے تھے کہ حضور ﷺ یہ عورت تو منکر عاریت ہے چور نہیں ہے۔ اور آپ چوری کی سزا کا ذکر فرما رہے ہیں۔ اگر یہ عورت بھی کبھی چوری کرے تو حضور ﷺ اس کا ہاتھ کٹوا دیں۔ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مخزومی عورت کے منکر عاریت ہونے کی ایک عمومی حالت بیان کی، کوئی خاص واقعہ بیان نہیں کیا۔ عمومی حالت پر قطع دست کی سزا کیسے مل سکتی ہے اگر کوئی چور مشہور ہو مگر چوری کے کسی واقعہ کا ثبوت نہ ہو تو کیا اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا ان تمام قرائن و شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت نے کوئی چوری کی تھی) اگر اس حدیث کو ظاہر کے مطابق تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کے خلاف حضرت جابرؓ کی حدیث موجود ہے کہ خائن پر قطع (دست کا جرم) نہیں اس حدیث کو امت نے قبول کیا ہے اور اس پر عمل بھی کیا ہے لہٰذا حضرت عائشہؓ والی حدیث کو منسوخ قرار دے دیا جائے گا۔

مسئلہ :۔ کفن چور کا ہاتھ امام اعظمؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک نہیں کاٹا جائے گا (وارثوں کی) ملکیت مشتبہ ہے اور حفاظت کاملہ بھی نہیں ہے۔ کفن دفن کے بعد باقی ترکہ سے وارثوں کا حق متعلق ہوتا ہے کفن وارثوں کے حق میں سے نہیں دیا جاتا، بلکہ ادائے قرض اور اجراء وصیت سے بھی جو مال بچتا ہے وہ میراث میں تقسیم کیا جاتا ہے اس لئے کفن کے مالک وارث نہیں، نہ میت کفن کی مالک ہے مالک ہونے کی مردہ میں صلاحیت ہی نہیں۔ دنیوی احکام کے اعتبار سے مردہ کا شمار جمادات میں ہے۔ رہی قبر تو وہ بھی کوئی محفوظ مقام نہیں۔ جنگل میں ایک غیر محفوظ گڑھا ہے جہاں رات دن لوگ گزرتے ہیں نہ اس پر تالا ہے نہ بندش نہ چوکیدار نہ محافظ۔

امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک کفن چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے جو کفن چرائے گا ہم اس کے ہاتھ کاٹیں گے۔ رواہ البیہقی مگر یہ حدیث منکر ہے۔ حضرت براء بن عازب اس کے راوی ہیں۔ بیہقی نے لکھا ہے کہ اس کی سند میں بعض راوی مجہول ہیں۔ بخاری نے تاریخ میں لکھا ہے کہ ہشیم نے سہل کا بیان نقل کیا سہل

نے کہا میرے سامنے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے ایک کفن چور کا ہاتھ کٹوایا تھا۔ مگر سہل ضعیف راوی ہے عطاء نے کہا ہم اس کو کاذب قرار دیتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل نے حسن بصری اور ابن سیرین کا قول نقل کیا ہے کہ کفن چور کا ہاتھ کاٹا جائے۔ معاویہ بن قرہ کا قول بھی روایت میں آیا ہے کہ کفن چور کا ہاتھ کاٹا جائے۔ اس مبحث کی کوئی حدیث مرفوع نہیں آئی۔

مسئلہ :- امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمد نخعی اور شعبی کے نزدیک بیت المال کے چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ امام مالک کے نزدیک کاٹا جائے گا۔

ہم کہتے ہیں بیت المال کا مال عام لوگوں کا مال ہے اور چور بھی عوام میں داخل ہے (فی الجملہ بیت المال کی ملکیت میں چور بھی شریک ہے) ابن ابی شیبہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ اس پر (یعنی بیت المال سے چوری کرنے والے پر) ہاتھ کاٹنے کا جرم نہیں ہے ہر ایک کا بیت المال میں کچھ نہ کچھ حق ہے۔ بیہقی نے حضرت علی کا قول نقل کیا ہے کہ بیت المال سے جس نے چوری کی ہو اس پر قطع دست (کا جرم) نہیں ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان نقل کیا ہے کہ زکوۃ میں وصول شدہ ایک غلام نے مال غنیمت میں سے کوئی چوری کی معاملہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے اس کا ہاتھ نہیں کٹوایا اور فرمایا اللہ کے ایک مال نے اللہ کا دوسرا مال چرالیا۔

ایک شخص نے بیت المال سے کچھ چرالیا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس کو چھوڑ دو کوئی بھی ایسا نہیں کہ اس مال میں اس کا حق نہ ہو۔

مسئلہ :- ایک شریک اگر شرکت کا مال دوسرے شریک کے تحفظ میں سے چرالے تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

مسئلہ :- اگر ایک آدمی کے دوسرے آدمی پر کچھ روپیہ قرض ہوں اور دائن مدیون سے اپنے قرض کے برابر روپیہ چرالے تو چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ اس نے صرف اپنا حق وصول کیا بلکہ اگر رقم قرض سے زائد بھی چرائے تو چونکہ چور کی ملکیت بھی اس چرائی ہوئی رقم کے ساتھ مخلوط تھی اس لئے اس صورت میں بھی ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

مسئلہ :- ماں باپ اور ساری اوپر کی اصل اپنی اولاد کا مال چرالیں تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے تیری ذات اور تیرا مال (سب) باپ کا ہے اسی طرح اگر اولاد اور نسل اپنے ماں باپ اور بالائی اصول کا مال چرالے تو تین اماموں کے نزدیک ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ صرف امام مالکؒ کے نزدیک ہاتھ کاٹا جائے گا۔

اگر کسی محرم رشتہ دار نے اپنے محرم رشتہ دار کا مال چرالیا جیسے بھائی نے بھائی یا بہن کا یا چچا کا تو امام صاحب کے علاوہ دوسرے تینوں اماموں کے نزدیک ہاتھ کاٹا جائے گا۔ یہ حضرات قرابت قریبہ کو بھی قرابت بعیدہ کی طرح قرار دیتے ہیں امام ابو حنیفہ کے نزدیک ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ مال کی حفاظت اس صورت میں ناقص ہوتی ہے (ہر محرم کو دوسرے محرم کے گھر کے اندر جانے کی اجازت ہے) اللہ نے فرمایا ہے وَلَا عَلَىٰٓ اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ ......اَوْ صَدِيْقِكُمْ تک

یعنی کوئی گناہ نہیں اگر تم اپنے گھروں میں سے کچھ کھالو یا باپ کے گھروں میں سے یا ماؤں کے گھروں میں سے یا بھائیوں کے گھروں میں سے یا بہنوں کے گھروں میں سے یا چچوں کے گھروں میں سے یا پھوپھیوں کے گھروں میں سے یا ماموؤں کے گھروں میں سے یا خالاؤں کے گھروں میں سے یا اس مال میں سے جس کی کنجیاں تمہارے قبضہ میں ہوں یا اپنے دوست کے گھر میں سے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ محرم کے گھر میں داخل ہونا اور گھروں کے اندر سے کچھ کھالینا جائز ہے اور اگر ممانعت کی دلیل قائم بھی کر دی جائے تب بھی جواز کا شبہ تو باقی رہے گا جیسے حدیث اَنْتَ وَمَالُكَ لِاَبِيْكَ کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

شبہ :- اس آیت کی رو سے تو دوست کے گھر میں سے (بغیر اجازت) کھالینا جائز قرار پاتا ہے۔ لہٰذا دوست چرانے پر بھی ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ (دوست کا مال کھالینے سے تو دشمن نہیں ہو جاتا بلکہ دوستی میں مزید بے تکلفی اور استحکام ہو جاتا ہے البتہ) دوست کا مال چرانے کے وقت دوست نہیں رہتا دشمن بن جاتا ہے (لہٰذا قطع دست واجب ہو گیا)

مسئلہ :۔ اگر کسی محرم قرابتدار کے گھر سے کسی غیر آدمی کا مال چرا لیا تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا اور اگر محرم رشتہ دار کا مال کسی غیر کے گھر سے چرا لیا تو امام اعظمؒ کے نزدیک ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اول صورت میں حفاظت ناقصہ کے اندر سے چوری کی اور دوسری صورت میں حفاظت کاملہ کے اندر سے چرایا۔

مسئلہ :۔ اگر بیوی نے میاں کے گھر سے یا میاں نے بیوی کے گھر سے یا اس مکان سے جس میں دونوں رہتے ہیں کسی غیر شخص کا مال چرا لیا تو امام صاحب کے نزدیک چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ امام احمد کا بھی یہی مسلک منقول ہے اور امام شافعیؒ کا بھی ایک قول یہی ہے امام مالکؒ نے فرمایا اگر مشترک مکان سے جس میں میاں بیوی دونوں رہتے تھے کسی اجنبی کا مال چرا لیا تو چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

لیکن اگر میاں نے بیوی کے گھر سے یا بیوی نے میاں کے گھر سے اجنبی کا مال چرا لیا تو ہاتھ کاٹا جائے گا امام شافعی کا بھی اصل مسلک یہی ہے اور ایک روایت میں امام احمدؒ کا بھی یہی قول آیا ہے۔

امام شافعیؒ کا ایک قول اس طرح آیا ہے کہ شوہر نے اگر بیوی کے گھر سے کسی غیر کا مال چرا لیا تو ہاتھ کاٹا جائے گا اور بیوی نے میاں کے گھر سے چرا لیا تو نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان کی بیوی ہندہ سے فرمایا تو ابوسفیان کے مال میں سے اتنا لے سکتی ہے جو تیرے اور تیرے بچوں کے لئے کافی ہو۔

امام صاحبؒ کی دلیل یہ ہے کہ عرفاً میاں بیوی کے مکان میں اور بیوی میاں کے مکان میں بغیر اجازت کے آتے جاتے رہتے ہی ہیں لہٰذا حفاظت ناقص ہو گئی۔

امام مالکؒ کے مؤطا میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک غلام کو پیش کیا گیا جس نے اپنے آقا کی بیوی کا آئینہ چرا لیا تھا فرمایا اس پر کچھ (سزا) نہیں ہے تمہارے خادم نے تمہارا سامان چرا لیا ہے جب اس فرمان کی رو سے شوہر کے غلام کا ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا تو خود شوہر کا ہاتھ کیسے کاٹا جا سکتا ہے۔

مسئلہ :۔ اگر غلام نے اپنے آقا کا یا آقا کی بیوی کا یا مالکہ کے شوہر کا مال چرا لیا تو چونکہ غلام کو داخلہ کی اجازت ہوتی ہی ہے اس لئے ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

اگر مہمان نے (مہمانی کے دوران) میزبان کی کوئی چیز چرا لی تو چونکہ اس کو میزبان کی طرف سے اندر آنے کی اجازت مل چکی تھی اس لئے ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

وہ مکان جس میں عام طور پر دن میں داخل ہونے کی اجازت ہوتی ہے جیسے بازار کی دکانیں تو دن کے وقت ان میں چوری کرنے سے بھی ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ کیونکہ داخلہ کی اجازت عمومی ہوتی ہے۔

مسئلہ :۔ اگر بقدر نصاب سرقہ مال چرا لیا پھر چوری کے بعد اس کو خرید لیا یا مالک نے ہبہ کر دیا یا بطور میراث چور کی ملک میں آگیا اور یہ سب کچھ قاضی کے پاس مقدمہ جانے سے پہلے ہو گیا یا مقدمہ کی پیشی کے بعد اور فیصلہ سے پہلے ہو گیا یا فیصلہ کے بھی بعد ہوا بہرحال امام اعظمؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد اور امام ابویوسف کے نزدیک ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ چوری بہر طور پوری چوری ہو گئی اور اس کا ظہور و ثبوت بھی ہو گیا اب کوئی شبہ نہیں رہا۔

اس کے علاوہ صفوانؓ بن امیہ کی حدیث بھی ہے، حضرت صفوان (رضی اللہ عنہ) کا بیان ہے کہ میں مسجد میں سو رہا تھا چور آیا اور میرے سر کے نیچے سے چادر نکال لی۔ میں اس کو پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لایا اور عرض کیا اس نے میرا کپڑا چرا لیا ہے۔ حضور ﷺ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ تو میرا مقصد نہ تھا میں نے یہ چادر اس کو خیرات کی فرمایا میرے پاس لانے سے پہلے ایسا کیوں نہیں کیا۔ رواہ مالکؒ و احمدؒ ابوداؤد و ابن ماجہ والنسائی۔ نسائی کی روایت میں اتنا زائد ہے پھر رسول اللہ ﷺ نے اس کا ہاتھ کٹوا دیا۔

ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہ) کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا (میرے پاس لانے سے پہلے) آپس میں حدود معاف کر دیا کرو۔ جب میرے پاس تک کوئی (جرم قابل حد) پہنچ جائے گا تو حد جاری کرنا واجب ہو جائے گا)۔

حنفیہؒ کی طرف سے ابن ہمام نے جواب دیا ہے کہ صوفانؓ کی حدیث ایک روایت میں ایسی ہی ہے جیسے بیان کی گئی لیکن حاکم نے مستدرک میں روایت کے یہ الفاظ لکھے ہیں۔ میں یہ (چادر اس کے ہاتھ) بیچتا ہوں اور قیمت اس پر قرض چھوڑتا ہوں۔ بہت روایات میں یہ بھی نہیں آیا صرف اتنا آیا ہے کہ صفوانؓ نے کہا میرا یہ مقصد نہ تھا یا یوں کہا کہ کیا ایک عرب کا ہاتھ تیس درہم کی وجہ سے کاٹا جائے گا۔ بہر حال حدیث کے آخر میں جو زیادتی ہے اس میں اضطراب (اور عدم تعین) ہے اور اضطراب روایت میں ضعف پیدا کر دیتا ہے پھر فیصلہ کی تکمیل اس وقت جب (فیصلہ نافذ ہو جائے اور) حد جاری ہو جائے اور فیصلہ (کاملہ) سے پہلے چور کا مالک بن جانا شبہ پیدا کر دیتا ہے (اور شبہ کی صورت میں حد واجب نہیں ہوتی)۔

فصل

ہاتھ کاٹنے کے لئے چوری کا بقدر نصاب سرقہ ہونا تمام اہل سنت کے نزدیک بالاجماع ضروری ہے لیکن خوارج اور داؤد ظاہری اور ابن بنت الشافعی کے نزدیک نصاب ضروری نہیں۔ حسنؒ بصری کا بھی یہی قول روایت میں آیا ہے کیونکہ آیت مطلق ہے اس کے علاوہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چور پر اللہ کی لعنت۔ رسی چراتا ہے تو اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اور انڈا چراتا ہے تو اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ رواہ البخاری و مسلم۔

ہم کہتے ہیں باجماع علماء (اگرچہ آیت میں کوئی قید اور شرط نہیں ہے لیکن) آیت اطلاق پر نہیں ہے (یعنی کوئی قید یا کچھ نہ کچھ شرط مثلاً ملکیت کاملہ۔ تحفظ کامل وغیرہ سب کے نزدیک معتبر ہے)۔

خارجیوں کے قول کا اعتبار نہیں اور داؤد و حسنؒ بصری کی تنہا رائے اجماع کو نہیں توڑ سکتی۔

مسئلہ :- اگر چوروں کی ایک جماعت نے چرایا ہو اور تقسیم کے بعد ایک ایک کے حصہ میں بقدر نصاب مال نہ آئے تو امام اعظمؒ امام شافعیؒ کے نزدیک کسی کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ ہر شخص کے حصہ میں بقدر نصاب سرقہ مال آنا ضروری ہے۔ امام احمد کے نزدیک سب کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ مذکورہ بالا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا یہی تقاضا ہے امام مالکؒ نے فرمایا اگر چوری کا مال ایک نصاب سرقہ کے برابر ہو اور سب نے مل کر نکالا ہو اور مال بھی ایسا ہو جس کو منتقل کرنے کے لئے باہم مدد کرنے کی ضرورت ہوتی ہو تو سب کے ہاتھ کاٹے جائیں ورنہ کسی کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ جب تک ہر ایک کے حصہ میں نصاب سرقہ کے بقدر مال نہ آیا ہو۔

مسئلہ :- چوری کا نصاب امام اعظمؒ کے نزدیک دس درہم یا ایک دینار ہے یا کوئی مال جس کی قیمت دس درہم یا ایک دینار ہو وہ بھی نصاب سرقہ ہے۔

امام مالکؒ اور امام احمد کا قول قوی ترین روایت میں یہ ہے کہ چوری کا نصاب چوتھائی دینار یا تین درہم یا ان دونوں میں سے کسی کے برابر قیمت کا مال ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک بقدر چوتھائی دینار کے دراہم وغیرہ نصاب سرقہ ہے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مرفوع حدیث ہے۔ چوتھائی دینار اور زیادہ میں ہاتھ کاٹا جائے۔ حدیث کے دوسرے الفاظ اس طرح ہیں ہاتھ نہ کاٹا جائے مگر چوتھائی دینار میں۔ متفق علیہ۔

ایک روایت کے یہ الفاظ ہیں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ڈھال کی قیمت سے کم قیمت کی چوری میں چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جاتا تھا۔ مسلم کی روایت بایں الفاظ ہے۔ ہاتھ نہ کاٹا جائے مگر چوتھائی دینار اور اس سے اوپر (قیمت) کی چوری میں۔

مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے یہ الفاظ ہیں چوتھائی دینار میں ہاتھ کاٹو۔ اس سے کم (قیمت) والی چیز میں نہ کاٹو۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک چور کا ہاتھ ڈھال کی قیمت کے بقدر یعنی

تین درہم (کی چوری) میں کٹوایا۔ رواہ البخاری و مسلم۔
امام مالکؒ نے موطا میں عمرہ بنت عبدالرحمٰن کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں کسی چور نے ایک ترنج چرالیا۔ حضرت عثمانؓ نے حکم دیا کہ ترنج کی قیمت کی جانچ کی جائے جانچ کے بعد بارہ درہم فی دینار کے حساب سے اس ترنج کی قیمت تین درہم قائم کی گئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چور کا ہاتھ کٹوا دیا۔
امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا چونکہ اسقاط حد کے لئے حیلہ کی ضرورت ہے (خفیف شبہ سے بھی سقوط حد ہو جاتا ہے) اس لئے زیادہ سے زیادہ مقدار کو نصاب سرقہ بنانا ہی زیادہ مناسب ہے اور ڈھال کی (کم سے کم) قیمت مذکورہ بالا مقدار (تین درہم) سے زیادہ بھی روایت میں آئی ہے۔ حاکم نے مستدرک میں مجاہد کی وساطت سے ایمن کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں (چور کا) ہاتھ نہیں کاٹا گیا مگر (کم سے کم) ڈھال کی قیمت (کے بقدر چوری) میں اور اس زمانہ میں ڈھال کی قیمت ایک دینار (دس یا بارہ درہم) تھی۔
امام احمد اور امام شافعیؒ نے ابن اسحاق کی وساطت سے عمرو بن شعیب کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ڈھال کی قیمت دس درہم تھی۔ ابن ابی شیبہ نے مصنف کی کتاب اللقطہ میں سعید بن میسب کے حوالہ سے ایک مزنی شخص کی روایت لکھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب (چوری) ڈھال کی قیمت کے برابر ہو تو چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹ دیا جائے اور ڈھال کی قیمت دس درہم تھی۔ دار قطنی اور امام احمدؒ نے سالم بن قتیبہ از زفر بن ہذیل از حجاج بن ارطاۃ از عمرو بن شعیب از شعیب از جد شعیب کی اسناد سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے مگر دس درہم (کی چوری) میں۔
عبدالرزاق اور طبرانی نے قاسم بن محمدؒ کی موقوف روایت سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ہاتھ کاٹنے کا حکم نہیں ہے مگر ایک دینار یا دس درہم (کی چوری) میں۔ یہ روایت موقوف منقطع ہے کیونکہ قاسم بن محمد کی سماعت حضرت ابن مسعودؓ سے ثابت نہیں۔
حق یہ ہے کہ جمہور نے جن احادیث سے استدلال کیا ہے وہ بالکل صحیح ہیں اور یہ احادیث ضعیف ہیں اور زیادہ محتاط مسلک اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب دونوں مقابل احادیث قوت و ضعف میں ایک جیسی طاقت رکھتی ہوں۔ ابن اسحاق سالم زفر اور حجاج بن ارطاۃ جو عمرو بن شعیب والی حدیث کے راوی ہیں سب ضعیف ہیں۔ اور راوی کا یہ قول کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ڈھال کی قیمت دس درہم ہوتی تھی اس کی بنا صرف گمان اور تخمین پر ہے ورنہ یہ بات یقینی ہے کہ ڈھال کی قیمت کبھی تین اور کبھی دس درہم ہوتی ہے اور کبھی اس سے زیادہ بھی ہوتی ہے۔ جیسی ڈھال ویسی ہی اس کی قیمت۔ اس صورت میں حدیث لَنْ یُقْطَعَ یَدُ السَّارِقِ عَلٰی عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ اَدْنٰى مِنْ ثَمَنِ الْمِجَنِّ مجمل قرار پائے گی۔
اور احادیث یُقْطَعُ فِیْ رُبْعِ دِیْنَارٍ۔ اور لَا یُقْطَعُ اِلَّا فِیْ رُبْعِ دِیْنَارٍ اور اِقْطَعُوْا فِیْ رُبْعِ دِیْنَارٍ وَلَا تَقْطَعُوْا فِیْمَا هُوَ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِکَ۔ محکم ہیں۔ ان کے مقابلہ پر اگر کوئی حدیث آسکتی ہے تو وَلَا یُقْطَعُ السَّارِقُ اِلَّا فِیْ عَشَرَةِ دَرَاهِمَ آسکتی ہے مگر یہ حدیث مرفوع نہیں۔ اس کو مرفوع کہنا صحیح نہیں اور اختلاف کے موقع پر حدیث موقوف کو استدلال میں نہیں پیش کیا جاسکتا یہ مسئلہ اجماعی ہے۔
روایت میں آیا ہے کہ امام شافعیؒ نے امام محمدؒ سے کہا یہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے کہ چوتھائی دینار اور اس سے زائد کی چوری میں ہاتھ کاٹا جائے پھر آپ کیسے کہتے ہیں کہ دس درہم اور اس سے زائد کی چوری میں ہاتھ کاٹا جائے اس سے کم میں نہ کاٹا جائے۔
امام محمدؒ نے ایمنؓ بن ام ایمنؓ کی حدیث استدلال میں پیش کی جو مجاہد کی روایت سے آئی ہے۔ یہ ایمن ہی ہیں جو حضرت اسامہ بن زیدؓ کے اخیافی بھائی تھے۔ امام شافعیؒ نے جواب دیا کہ ایمان کی شہادت تو غزوۂ حنین میں مجاہد کی پیدائش سے پہلے ہو گئی تھی۔ ابو حاتمؒ نے بیان کیا ہے کہ ایمنؓ جو اس حدیث کے راوی ہیں وہ نہیں ہیں جو ام ایمنؓ کے بیٹے اور صحابیؓ تھے اور حنین کی جنگ میں شہید ہوئے تھے۔ بلکہ یہ تابعی ہیں، جنہوں نے نہ رسول اللہ ﷺ کا زمانہ پایا نہ چاروں خلفاء میں سے کسی خلیفہ کا۔

میں کہتا ہوں کہ ام ایمن نے رسول اللہ ﷺ کو گودوں میں کھلایا تھا، ان کی عمر رسول اللہ ﷺ سے زیادہ تھی۔ ان کا بیٹا وہ شخص کیسے ہو سکتا ہے جو کسی خلیفہ کے زمانہ میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ ایمن دو تابعیوں کا نام تھا۔ ایک ابن الزبیر تھے۔ دوسرے ابن ابی عمرو کے آزاد کردہ غلام، ابن ابی حاتم اور ابن حبان نے دونوں کو ایک ہی قرار دیا جائے۔ خلاصہ یہ کہ حدیث حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما والی حدیث کے مقابلہ پر نہیں لائی جاسکتی۔

مسئلہ :۔ جس ملک میں جو چیز بے قیمت، بے قدر اور عام طور پر مباح ہو اس کی چوری میں امام اعظمؒ کے نزدیک ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا جیسے لکڑی، خشک گھاس، بانس، مچھلی، پرندے، جنگلی شکار کے جانور چونہ، عمارتی گچ وغیرہ جو کھانے کی چیز جلد سڑ جاتی ہے اس کی چوری میں بھی ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا جیسے سالن، دودھ، دہی، گوشت، تازہ تر پھل، تر کھجوریں، تینوں اماموں کے نزدیک اگر ان چیزوں کو محفوظ کر کے رکھ لیا جائے تو ان کی چوری میں ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ آیت میں عموم ہے (اس عموم میں ہر چیز داخل ہے)۔

امام صاحبؒ نے فرمایا آیت کا عموم تو باتفاق علماء مراد نہیں ہے۔ نصاب سرقہ سے کم مقدار بہر حال مخصوص ہے۔ للہذا ان مذکورہ چیزوں کا استثناء حضرت عائشہؓ کی حدیث کی روشنی میں کیا جائے گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں حقیر بے مقدار چیز کی چوری میں چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جاتا تھا۔ یہ حدیث عبدالرحمٰن بن سلیمانؒ کی وساطت سے بروایت ہشامؒ بن عروہ از عائشہؓ آئی ہے اور ابن ابی شیبہؒ نے اسی سند سے مصنف میں اس کو ذکر کیا ہے۔ بصورت ارسال بسند وکیع از ہشام بن عروہؒ از عروہؓ بھی یہ حدیث منقول ہے۔ عبدالرزاق نے مصنف میں ابن جریج از ہشام اور اسحاق بن راہویہ نے عیسیٰ بن یونس از ہشام اور ابن عدی نے الکامل میں عبداللہ بن قبیصہ فزاری از ہشام بن عروہ از عائشہ رضی اللہ عنہا نقل کیا ہے۔ ابن عدی نے عبداللہ بن قبیصہ پر کوئی جرح بھی نہیں کی۔ صرف اتنا کہا ہے کہ عبداللہ کی متابعت کسی نے نہیں کی لیکن متقدمین نے اس کے متعلق کوئی کلام نہیں کیا۔

ابن ہمام نے لکھا ہے یہ امر بالکل ظاہر ہے کہ یہ تمام مرسل احادیث قابل استدلال ہیں۔ ابن ابی شیبہ نے اس کو موصولاً بھی بیان کیا ہے۔ عبدالرزاق نے اپنی سند سے بیان کیا کہ عبداللہ بن یسار نے کہا عمرؒ بن عبدالعزیزؒ کی خدمت میں ایک شخص کو پیش کیا گیا جس نے مرغی چرائی تھی آپ نے اس کا ہاتھ کٹوانے کا ارادہ کیا تو مسلمہ بن عبدالرحمٰن نے فرمایا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ پرندوں کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے۔ اس روایت کی سند میں ایک راوی جابر جعفی ہے۔

ابن ابی شیبہ نے بروایت عبدالرحمٰن بن مہدی از زہیر بن محمد از یزید بن حصفہ بیان کیا کہ عمرؒ بن عبدالعزیز کی خدمت میں ایک شخص کو پیش کیا گیا جس نے کوئی پرندہ چرایا تھا آپ نے سائب بن یزید سے فتویٰ پوچھا۔ سائب نے کہا میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ پرندہ کی چوری میں اس نے ہاتھ کاٹا ہو۔ پرندہ کی چوری میں اس کو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی۔ عمر بن عبدالعزیز نے چور کو چھوڑ دیا۔

ابوداؤد نے مراسیل میں جریر بن حازم کی روایت سے حسنؒ بصری کا قول لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں کھانے (کی چوری) میں ہاتھ نہیں کٹواؤں گا۔ شیخ عبدالحق نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے اور سوائے مرسل ہونے کے اور کوئی خرابی نہیں بیان کی۔ مگر ہمارے نزدیک مرسل قابل استدلال ہے۔

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پھلوں کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے۔ رواہ الترمذی عن لیث بن سعد والنسائی وابن ماجہ عن سفیان بن عیینہ ولیث وسفیان کلاہما عن یحییٰ بن سعید عن محمد بن یحییٰ بن حبان عن عمہ واسع ورواہ بن حبان فی صحیحہ۔

اگر کسی روایت کے منقطع اور موصول ہونے میں تعارض پڑ جائے تو موصول قرار دینا اولیٰ ہوتا ہے کیونکہ موصول میں زیادتی ہے اور ثقہ راوی کی طرف سے زیادتی قابل قبول ہے۔

طحاویؒ نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو ساری امت نے قبول کیا ہے علماء نے لکھا ہے کہ اس حدیث میں لفظ ثمر سے مرادوہ پھل ہیں جو درخت میں لگے ہوئے خصوصی تحفظ نہ ہونے کی وجہ سے ایسے پھلوں کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ عمرو بن شعیب نے اپنے داد احضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ان پھلوں کے متعلق دریافت کیا گیا جو درخت میں لگے ہوئے ہوں۔ فرمایا جو ضرورت منداس کو اپنے منہ سے لے لے (یعنی کھالے) جھولی نہ بنائے تو اس پر کوئی سزا نہیں اور جو شخص ان پھلوں میں سے نکال کر باہر لے آئے تو اس پر دوگنا تاوان ہوگا اور اگر پھلوں کو خشک کرنے کے مقام میں پہنچادیا گیا ہو اور پھر اس میں سے کوئی چوری کرے اور ڈھال کی قیمت کے برابر چوری کے پھلوں کی قیمت ہو جائے تو اس پر ہاتھ کاٹنے کی سزا ہے۔ ابوداؤد نے یہ حدیث ابن عجلان اور ولید بن کثیر اور عبیداللہ بن اخنس اور محمد بن اسحاق کی روایت سے لکھا ہے اور ان چاروں نے عمرو بن شعیب کی روایت کو بیان کیا ہے۔

نسائی نے یہ حدیث نقل کی ہے اور سند اس طرح قائم کی ہے از وہب از عمرو بن حارث وہشام بن سعد از عمرو بن شعیب، نسائی کی حدیث اس طرح ہے کہ قبیلہ مزینہ کے ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے ان بکریوں (کی چوری) کا حکم دریافت کیا جو رات کو گھر واپس نہ آسکی ہوں۔ چراگاہ میں ہی رہ گئی ہوں۔

فرمایا ان کو چرانے پر دوگنی قیمت دی جائے اور مارا جائے اور ایسی سزا دی جائے جو دوسروں کے لئے باعث عبرت ہو اور جو بکری وغیرہ تھان پر سے چرائی ہو تو اس کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔ بشر طیکہ اس کی قیمت ڈھال کی قیمت کے برابر ہو جائے۔

صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ان پھلوں کا کیا حکم ہے جو اپنے غلاف کے اندر ہوں؟

فرمایا جو شخص ان میں سے اپنے منہ سے لے لے اور جھولی نہ بنائے (یعنی صرف وہیں کھالے تو اس پر کچھ (تاوان وسزا) نہیں ہے اور جو اٹھا کر لے آئے تو اس کی دوہری قیمت اور مار پیٹ اور عبرت ناک سزا ہونی چاہئے اور اگر خشک کرنے کے مقام سے پھل لئے ہوں تو ہاتھ کاٹنے کی سزا ہو گی۔ رواہ احمد والنسائی۔

بعض روایات کے الفاظ اس طرح ہیں (دریافت کیا گیا) درختوں پر لگے ہوئے پھلوں (کو لے لینے) کے متعلق حضور کا کیا حکم ہے؟

فرمایا درختوں پر لگے ہوئے پھلوں کو لینے پر ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے۔ ہاں اگر پھل خشک کرنے کے مقام پر آگئے ہوں اور ان میں سے اتنے لے لئے جائیں کہ ان کی قیمت ڈھال کی قیمت کے برابر ہو جائے تو اس میں قطع دست کی سزا ہے اور اگر ڈھال کی قیمت سے کم قیمت کے ہوں تو دوگنا تاوان اور عبرتناک سزا تازیانہ ہے۔ حاکم نے بھی اصل حدیث اسی طرح نقل کی ہے اور صراحت کی ہے کہ ہمارے امام اسحاقؒ بن راہویہ کا قول ہے کہ عمرو بن شعیب کی حدیث بیان کرنے والا راوی اگر ثقہ ہو تو وہ ایسا ہی (واجب القبول) ہے جیسے ایوب از نافع از ابن عمر ابن ابی شیبہ نے اس حدیث کو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما پر لے جا کر ٹھیرادیا ہے۔ (یعنی حدیث موقوفاً بیان کی ہے) حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ پھلوں کی چوری میں قطع دست نہیں جب تک پھل اپنے خشک کرنے کے مقام میں نہ پہنچ جائیں۔

امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک محفوظ رکھے ہوئے پھلوں کی چوری موجب قطع ہے۔ حدیث مذکور سے ان کے مسلک کی تائید ہوتی ہے مزید تائید حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ سے ہوتی ہے جو امام مالکؒ نے موطا میں بیان کیا ہے کہ کسی چور نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ترنج چرالیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ترنج کی قیمت جانچنے کا حکم دیا، اس کی قیمت تین درہم جانچی گئی بشرطیکہ ایک دینار کے بارہ درہم قرار دیئے جائیں۔ حضرت نے چور کا ہاتھ کٹوادیا۔ امام مالکؒ نے ترنج سے مراد یہی معمولی ترنج لی ہے جس کو لوگ کھاتے ہیں لیکن ابن کنانہ نے کہا وہ چنے کے برابر سونے کا

ترنج تھا جس میں خوشبو رکھی جاتی تھی۔ امام مالکؒ نے اس قول کی تردید کی ہے اور فرمایا ہے کہ اگر وہ ترنج سونے کا ہوتا تو اس کی قیمت نہیں جانچی جاتی (بلکہ وزن کیا جاتا سونے کا اندازہ وزن سے کیا جاتا ہے۔ قیمت سے نہیں کیا جاتا)۔

حنفیہ نے ان احادیث کا جواب متعدد طریقوں سے دیا ہے۔

(۱) چونکہ یہ حدیث صراحتاً آیت قرآنی کے خلاف ہے اس لئے اس کے ظاہر پر عمل نہیں کیا جائے گا اللہ نے فرمایا ہے فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ جتنی زیادتی اس نے تم پر کی اتنا ہی بدلہ تم اس کو دو اور حدیث مذکور میں پھلوں اور جنگل میں رہی ہوئی بکری کی چوری میں دوگنا تاوان دینے کا حکم ہے یہ معنوی انقطاع ہے اس لئے حدیث پر عمل نہ کرنا واجب ہے۔

(۲) دونوں حدیثوں میں تعارض ہے ایک حدیث میں آیا ہے کہ پھلوں کی چوری میں قطع دست نہیں یہ مطلق حکم ہے پھل خشک کرنے کی جگہ پر لے آئے گئے ہوں یا باغ میں پڑے ہوں سب کو یہ ممانعت قطع شامل ہے لیکن اوپر کی پیش کردہ حدیث میں اگر پھل محفوظ کر لئے گئے ہوں اور خشک کرنے کے مقام میں آگئے ہوں اور اس وقت ان کی چوری کی جائے تو ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے۔ اس تعارض کو دور کرنے کی صورت یا تو تقسیم ہے کہ تر پھل چرانے پر قطع دست کی سزا نہ ہو اور خشک پھلوں کی چوری موجب قطع ہو یا عدم قطع کو قطع پر ترجیح دی جائے (اور خشک پھل ہوں یا تر کسی کی چوری کو موجب قطع نہ قرار دیا جائے) کیونکہ حدود کو ساقط کرنے کا حکم ہے اور عدم قطع کی ترجیح کی صورت میں سقوط حد ہو جائے گا۔

جس کھانے کی چوری پر قطع دست نہ کرنے کا حکم ہے اس سے مراد وہ کھانا ہے جس کا بگاڑ جلدی ہو جاتا ہے کیونکہ اس امر پر اجماع علماء ہے کہ گیہوں اور دوسرے خشک غلہ کی چوری موجب قطع ہے اسی طرح شکر کی چوری پر بھی ہاتھ کاٹا جائے گا۔ البتہ اگر قحط سالی ہو تو غلہ کی چوری میں قطع دست نہ ہوگا کیونکہ بظاہر ایسی چوری پیٹ بھرنے کے لئے کی جاتی ہے اور پیٹ بھرنے کے لئے لے لینا جائز ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اضطراری بھوک کی وجہ سے چوری کرنے میں قطع دست نہیں ہے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا قحط کے سال میں قطع دست نہیں ہے (کیونکہ ایسے وقت میں بظاہر کھانے کیلئے ہی لوگ چوری کرتے ہیں)۔

مسئلہ:۔ پہلی چوری پر ہاتھ کاٹے جانے کے بعد اگر دوبارہ چوری کرلے یا دایاں ہاتھ (کسی وجہ سے) پہلے ہی سے کٹا ہوا ہو اور اسی حالت میں چوری کرے تو اجماع کا حکم ہے کہ چور کا بایاں پاؤں کاٹا جائے۔ بایاں پاؤں کاٹنے کا حکم اس آیت میں نہیں ہے۔ آیت میں صرف ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے اور حضرت ابن مسعودؓ کی قرات کی وجہ سے ہاتھ سے مراد دایاں ہاتھ ہے لہٰذ آیت میں تو دایاں ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے اب دوبارہ چوری کرنے پر دایاں ہاتھ تو کاٹا ہی نہیں جاسکتا محل قطع موجود ہی نہیں ہے تو دوبارہ قطع کس کا ہوگا۔ ہاں سنت اور اجماع کی وجہ سے بایاں پاؤں کاٹا جائے گا۔

اور اگر چور کا پہلے سے ہی دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کٹا ہوا ہو یا چوری میں ہاتھ پاؤں کاٹ دیا گیا ہو اور تیسری بار چوری کرے تو امام اعظم اور امام احمد کے نزدیک قطع کی سزا اس کو نہیں دی جائے گی، بلکہ قید میں ڈال دیا جائے گا اور تعزیر کی جائے گی۔

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک دوسری مرتبہ کی چوری میں بایاں پاؤں اور تیسری مرتبہ کی چوری میں بایاں ہاتھ اور چوتھی مرتبہ کی چوری میں دایاں پاؤں کاٹ دیا جائے گا۔

امام احمدؒ کا بھی ایک قول اسی طرح روایت میں آیا ہے پھر پانچویں مرتبہ چوری کرنے پر تعزیر وقید کی سزا دی جائے گی۔

عطاءؒ اور عمرو بن عاصؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قول آیا ہے کہ پانچویں مرتبہ چرانے پر اس کو قتل کر دیا جائے گا۔

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت کو اپنے مسلک کے ثبوت میں پیش کیا ہے حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک چور کو پیش کیا گیا، آپ ؐ نے اس کا ہاتھ کٹوادیا۔ کچھ مدت کے

بعد اس نے پھر چوری کی اور اس کو پیش کیا گیا، حضور ﷺ نے اس کا پاؤں کٹوا دیا۔
کچھ مدت کے بعد اس نے پھر چوری کی اور پیشی ہوئی تو حضور نے اس کا (دوسرا) ہاتھ کٹوا دیا اس نے پھر چوری کی اور پیشی ہوئی تو آپ ﷺ نے اس کا (دوسرا) پاؤں کٹوا دیا (پانچویں بار) اس نے پھر چوری کی اور پیشی میں آیا تو آپ نے اس کو قتل کرا دیا۔ رواہ الدار قطنی۔
اس کی سند میں ایک راوی محمد بن یزید بن سنان ہے جو ضعیف ہے۔
ابو داؤد اور نسائی نے حدیث ان الفاظ میں لکھی ہے کہ ایک چور کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ فرمایا اس کو قتل کر دو صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس نے تو چوری کی ہے فرمایا (اس کا ہاتھ) کاٹ دو (ہاتھ) کاٹ دیا گیا۔ پھر دوبارہ (چوری کے جرم میں) اس کو پیش کیا گیا تو حضور ﷺ نے فرمایا اس کو قتل کر دو۔ عرض کیا گیا اس نے تو چوری کی ہے فرمایا تو (بایاں پاؤں) قطع کر دو۔ سہ بارہ پھر (چوری کے جرم میں) اس کو پیش کیا گیا اور حضور ﷺ نے فرمادیا اس کو قتل کر دو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس نے تو چوری کی ہے فرمایا تو (اس کا دوسرا ہاتھ) کاٹ دو حکم کی تعمیل میں دوسرا ہاتھ کاٹ دیا گیا پھر چوتھی بار پیشی ہوئی اور حضور ﷺ نے فرمایا اس کو قتل کر دو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا اس نے تو چوری کی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تو (اس کا دوسرا پاؤں) کاٹ دو (پاؤں) قطع کر دیا گیا۔ پھر پانویں مرتبہ کی پیشی پر حضور ﷺ نے فرمایا اس کو قتل کر دو۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے ہم اس کو اونٹوں کے تھان پر لے گئے اور چت لٹا کر قتل کر دیا۔ پھر کھینچ کر کنویں میں ڈال دیا اور اوپر سے سنگ باری کی۔
اس روایت میں ایک راوی مصعب بن ثابت ہے جو بقول نسائی قوی نہیں ہے اور حدیث منکر ہے۔ اس مبحث کی کوئی صحیح حدیث میرے علم میں نہیں آئی۔
چور کو قتل کرنے کی ایک حدیث حارث بن حاطب حجی کی روایت سے نسائی اور حاکم نے اور عبداللہ بن زیدؓ کی روایت سے ابو نعیم نے الحلیہ میں بھی لکھی ہے۔
ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ چور کو قتل کرنے کی حدیث منکر ہے جس کی کوئی اصل نہیں۔ امام شافعی نے کہا کہ یہ حدیث منسوخ ہے کسی عالم کا اس میں اختلاف نہیں۔ ابن عبدالبر نے لکھا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابو مصعب نے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور عمر بن عبدالعزیز کے متعلق بیان کیا ہے کہ یہ دونوں بزرگ چور کو قتل کرنے کا فیصلہ کرتے تھے، یہ بیان ہی غلط ہے اس کی کوئی اصل نہیں کیونکہ یہ حضرات اجماع کے خلاف نہیں کر سکتے۔
حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر چور چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ پھر چوری کرے تو اس کی ٹانگ کاٹ دو پھر چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ دو، پھر چوری کرے تو اس کا پاؤں کاٹ دو، رواہ الدار قطنی۔ اس روایت میں ایک راوی واقدی ہے جس کو امام احمد نے کذاب کہا ہے۔
امام شافعیؒ نے اس حدیث کو ایک اور سلسلہ سے بروایت ابوہریرہ مرفوعاً بیان کیا ہے اور عصمہ بن مالک کی روایت سے طبرانی اور بیہقی نے اس کو لکھا ہے مگر اس کی اسناد بھی ضعیف ہے۔ دار قطنی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میرے سامنے حضرت عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) نے ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کے بعد ہاتھ کٹوا لیا تھا۔
امام مالکؒ نے مؤطا میں عبدالرحمٰن بن قاسم کی وساطت سے قاسم کا بیان نقل کیا ہے کہ یمن کا ایک آدمی جس کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کٹا ہوا تھا آیا اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس اترا اور شکایت کی کہ یمن کے حاکم نے مجھ پر ظلم کیا ہے یہ شخص رات کو نمازیں پڑھتا تھا اور حضرت ابو بکرؓ اس سے فرماتے تھے تیرے باپ کی قسم، تیری رات تو چور کی رات نہیں ہے۔ عبادت گزار کی رات ہے۔
کچھ مدت کے بعد حضرت اسماء بنت عمیس (زوجہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کا ہار گم ہو گیا (لوگوں نے تلاش شروع

کی) وہ شخص بھی لوگوں کے ساتھ گھومتا پھرتا اور کہتا تھا اے اللہ جس نے اس نیک گھر کے رہنے والوں پر رات کو حملہ کیا ہے اس کی پکڑ تیرے ذمے ہے۔ آخر وہ زیور ایک سنار کے پاس مل گیا اور سنار نے کہا کہ وہ ہاتھ کٹا لے کر آیا تھا۔ ہاتھ کٹے نے بھی اقرار کیا اور سنار نے شہادت بھی دی تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بایاں ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا اور اس کا بایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس کی بددعا اپنے لئے خود اس کے اوپر اس کی چوری سے بھی زیادہ اثر انداز ہوئی۔ اس روایت کی سند میں انقطاع ہے عبدالرزاق نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔

امام محمدؒ بن حسن نے مؤطا میں لکھا ہے کہ زہری نے حضرت عائشہؓ کا بیان نقل کیا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا جس شخص نے حضرت اسماء کا زیور چرا لیا تھا اس کا دایاں ہاتھ (پہلے سے) کٹا ہوا تھا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس کا بایاں پاؤں کٹوا دیا۔ امام محمدؒ نے فرمایا زہری اس حدیث کو دوسروں سے زیادہ جانتے تھے۔

ہماری دلیل وہ حدیث ہے جو امام محمدؒ نے کتاب الآثار میں نقل کی ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے عمرو بن کی روایت سے عبداللہ بن سلمہ کا بیان نقل کیا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا اگر چور چوری کرے تو میں اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دوں گا۔ پھر دوبارہ چوری کریگا تو بایاں پاؤں کاٹ دوں گا۔ پھر چوری کریگا تو قید میں بند کر دوں گا یہاں تک کہ وہ نیکی کرنے لگے مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کہ میں اس کی ایسی حالت کر کے چھوڑ دوں کہ اس کے پاس نہ کھانے اور استنجا کرنے کیلئے ہاتھ باقی رہے نہ چلنے کیلئے پاؤں۔

عبدالرزاق نے مصنف میں معمر کا بیان بحوالہ جابرؒ نقل کیا کہ شعبی نے فرمایا حضرت علی کرم اللہ وجہہ صرف ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کٹواتے تھے پھر بھی اگر چور چوری کرتا تھا تو اس کو قید کر دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے مجھے اللہ سے شرم آتی ہے۔ الی آخر الحدیث۔

ابن ابی شیبہ نے مصنف میں شعبی کی روایت کی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عمل اور فرمان بروایت حاتم بن اسماعیل از امام جعفرؒ بن محمدؒ از امام محمد زین العابدین نقل کیا ہے۔ بیہقی نے عبداللہ بن سلمہ کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں ایک چور کو پیش کیا گیا آپ نے اس کا ہاتھ کٹوا دیا پھر (دوبارہ چوری کے جرم میں) اس کو پیش کیا گیا تو آپ نے اس کا پاؤں کٹوا دیا پھر (تیسری بار جرم سرقہ میں) اس کو پیش کیا گیا تو فرمایا کیا میں اس کا دوسرا ہاتھ بھی کاٹ دوں پھر کس چیز سے یہ استنجا کرے گا اور کس چیز سے کھائے گا کیا میں اس کا (دوسرا) پاؤں بھی کاٹ دوں تو یہ کس بل پر چلے گا۔ مجھے اللہ سے شرم آتی ہے اس کے بعد آپ نے اس کو پٹوایا اور ہمیشہ کے لئے جیل میں ڈال دیا۔

تنقیح عبدالہادی میں ابو سعید مقبری کا بیان مذکور ہے کہ میں موجود تھا، میرے سامنے ہی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں ایک شخص کو پیش کیا گیا جس کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کٹا ہوا تھا اور (پھر بھی) اس نے چوری کی تھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صحابہؓ سے فرمایا آپ لوگوں کی اس بارے میں کیا رائے ہے لوگوں نے کہا (اس کا ہاتھ) کٹوا دیجئے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا ایسی صورت میں تو (گویا) میں اس کو قتل ہی کر دوں گا۔ حالانکہ اس پر قتل کا جرم نہیں ہے یہ کس چیز سے کھانا کھائے گا۔ کس چیز سے نماز کے لئے وضو کرے گا۔ کس چیز سے غسل جنابت کرے گا کس طرح اپنے کام پورے کرے گا۔ پھر آپ نے چند روز تک اس کو جیل میں رکھا اور چند روز کے بعد نکلوا کر پھر صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ صحابہؓ نے وہی مشورہ دیا جو پہلے دیا تھا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی وہی فرمایا۔ جو پہلے فرمایا تھا پھر اس کو سخت کوڑے لگوا کر چھوڑ دیا۔

سعید نے بروایت ابوالاحوص از سماک بن حرب از عبدالرحمٰن بن عامر بیان کیا حضرت عبدالرحمٰن نے کہا کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک شخص کو پیش کیا گیا جس کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کٹا ہوا تھا اور اس نے چوری کی تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا پاؤں کاٹنے کا حکم دے دیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا اللہ تو فرماتا ہے اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ آپ نے اس کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں تو کٹوا ہی دیا ہے اب مناسب نہیں کہ اس کا دوسرا پاؤں بھی کٹوا کر ایسی حالت میں کر کے چھوڑ دیا جائے کہ چلنے کے لئے اس کے پاس پاؤں ہی نہ رہے یا تو اس کو تعزیر کیجئے یا اس کو قید خانہ

میں ڈال دیجئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو قید خانہ میں ڈال دیا۔ یہ روایت بیہقی نے بیان کی ہے۔

ابن ابی شیبہ نے مصنف میں سماک کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چور کے متعلق صحابہؓ سے مشورہ لیا۔ سب نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول پر اتفاق رائے کیا۔

مکحول کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کوئی چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ دو پھر کرے تو اس کا پاؤں کاٹ دو اور (پھر کرے تو) اس کا دوسرا ہاتھ نہ کاٹو اور اس کو رہنے دو کہ (ایک ہاتھ سے) کھائے اور استنجا کرے مگر مسلمانوں سے اس کو روک دو (یعنی قید کر دو کہ مسلم معاشرے میں وہ فساد نہ کرے)۔

ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کے موافق نقل کیا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ حضرت علیؓ کی رائے پر سب کا اجماع ہو گیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اسی قول کی طرف رجوع کر لیا۔

اور جس حدیث کو امام شافعی نے ثبوت میں پیش کیا ہے وہ یا تو بالکل بے اصل ہے یا منسوخ ہے۔ اگر صحابہؓ کو رسول اللہ کے فعل کا علم ہوتا تو وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خلاف پیش کرتے اور حضرت علیؓ بھی یہ نہیں کہتے کہ مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کیونکہ اللہ نے تو خود فرما دیا ہے کہ اللہ کے دین کے معاملہ میں تمہارے اندر ان دونوں کے متعلق کوئی نرمی نہ پیدا ہو۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فرمان کی روشنی میں ایک مسئلہ یہ بھی سامنے آجاتا ہے کہ جس کا بایاں ہاتھ یا بائیں ہاتھ کا انگوٹھا یا دایاں پاؤں کٹا ہوا ہو یا سوکھا ہوا ہو اور پہلی بار چوری کرے تو اس کا دایاں ہاتھ کاٹا جائے کیونکہ (حقیقت میں) یہ اس کا قتل ہو جائے گا۔ حالانکہ اس پر جرم قتل عائد نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ :- کاٹنے کے بعد داغ دینا بھی چاہئے، تاکہ (خون نکل کر) ہلاک نہ ہو جائے۔

امام احمدؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک داغنا مستحب ہے۔ حاکم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی رلویت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک چور کو پیش کیا گیا، جس نے چادر چرائی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا میرے خیال میں اس نے چوری نہیں کی۔ چور بولا یا رسول اللہ کیوں نہیں کی (یعنی میں نے یقیناً چوری کی ہے) فرمایا اس کو لے جاؤ اور (ہاتھ) کاٹ دو، پھر داغ بھی دو۔ پھر میرے پاس لے آؤ۔ چنانچہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا اور داغ بھی دیا گیا۔ پھر اس کو پیش کیا گیا حضور ﷺ نے فرمایا اللہ سے توبہ کر چور نے کہا میں اللہ سے توبہ کرتا ہوں فرمایا اللہ بھی تجھ پر مہربان ہو گیا (اس نے تیری توبہ قبول کر لی اور رحمت نازل فرما دی)۔

حاکم نے کہا یہ حدیث بر شرط مسلم صحیح ہے ابوداؤد نے اس حدیث کو مراسیل میں لکھا ہے اور قاسم بن سلام نے غریب الحدیث میں دار قطنی نے موقوفاً لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے ان کے ہاتھ جوڑ سے کٹوا دیئے پھر ان کو داغ دیا۔

مسئلہ :- چور کے ایک بار اقرار کرنے سے امام اعظم اور امام محمدؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اور اکثر علماء کے نزدیک ہاتھ کاٹنا واجب ہو جاتا ہے لیکن امام احمدؒ، امام ابو یوسفؒ، ابن ابی لیلیٰ، زفر اور ابن شبرمہ دو بار اقرار کے بغیر قطع کی اجازت نہیں دیتے۔ امام ابو یوسف کے نزدیک دو اقرار دو مجلسوں میں ہونے چاہئیں یہ حضرات حضرت ابو امیہ مخزومی کی روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک چور کو پیش کیا گیا جس نے اقرار کر لیا حضور ﷺ نے فرمایا میرے خیال میں تو نے چوری نہیں کی چور نے کہا یا رسول اللہ ﷺ بلاشبہ کی۔ حضور ﷺ نے پھر وہی پہلی بات دو یا تین بار لوٹائی (اور اس نے بھی اقرار کیا) حضورؐ نے قطع کا حکم دے دیا اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا اور تکرار اقرار کے بعد کاٹا گیا۔ تکرار سے پہلے نہیں کاٹا گیا۔

طحاوی نے بالاسناد بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ کے سامنے ایک شخص نے چوری کا اقرار دو بار کیا۔ آپؓ نے فرمایا تو نے خود اپنے خلاف دو مرتبہ شہادت دی پھر آپ نے حکم دے کر اس کا ہاتھ کٹوا دیا اور اسی کے گلے میں لٹکا دیا۔

...... قیاسی دلیل یہ ہے کہ ......

زنا میں تعدد اقرار ضروری ہے کیونکہ تعدد اقرار کو گواہوں کے تعدد کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے لہٰذا زنا پر قیاس کرتے ہوئے چوری میں بھی تکرار اقرار ضروری ہونا چاہئے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ابو امیہ مخزومی والی روایت کے متعلق تو خطابی نے لکھا ہے کہ اس کی سند میں کچھ کلام ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اگر حدیث کا کوئی راوی مجہول ہو تو نہ وہ قابل استدلال رہے گی نہ اس پر حکم واجب ہوگا۔ رہا زنا پر قیاس تو یہ قیاس مع الفارق ہے، کیونکہ زنا کے گواہوں کا تعدد تو اس لئے ضروری ہے کہ وہاں دروغ گوئی کا شبہ پیدا ہو سکتا ہے ممکن ہے ایک گواہ جھوٹ کہتا ہو اور یہاں خود اقرار کرنے میں دروغ گوئی کا شبہ نہیں ہو سکتا (یہ خیال بھی نہیں کیا جاسکتا کہ چور نے ایک بار جھوٹا اقرار کر لیا ہوگا کہ دوبارہ اقرار کر لیا جائے)۔

باقی زنا میں جو اقرار کا تعدد ضروری ہے تو وہ صرف اس وجہ سے ضروری ہے کہ نص شریعت میں اس کو ضروری قرار دیا گیا ہے ورنہ ہے وہ خلاف قیاس (اور جو حکم صرف نص میں آیا ہو اور خلاف قیاس ہو اس پر کسی دوسرے حکم کو قیاس نہیں کیا جاتا) پھر آپ زنا پر قیاس کرتے ہیں حد قذف اور قصاص پر قیاس کیوں نہیں کرتے (حد قذف اور قصاص کے لئے تعدد اقرار ضروری نہیں اسی طرح چوری کے اقرار کا تعدد بھی غیر ضروری ہونا چاہئے) امام اعظمؒ کے قول کا ثبوت حضرت ابو ہریرہؓ کی مذکورہ بالا حدیث سے ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف ایک مرتبہ اقرار کرنے پر چور کا ہاتھ کٹوا دیا پھر داغ بھی دیا۔

جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ دونوں کو انکے کئے کی اللہ کی طرف سے عبرت انگیز سزا دینے کے لئے، جزاءً اور نکالاً دونوں علت قطع ہیں یعنی مفعول لہٗ، یا مفعول مطلق ہیں، بغوی نے دونوں مصدروں کو اسم فاعل کے معنی میں قرار دے کر فَاقْطَعُوْا کی ضمیر سے حال کیا ہے، صاحب مدارک نے جزاءً کو مفعول لہٗ اور نکالاً کو اس کا بدل قرار دیا ہے۔

قاموس میں ہے نَكَّلَ تَنْكِيْلًا (باب تفعیل) کوئی ایسا کام کیا، جس سے دوسروں کو عبرت ہو، نکال ہر وہ چیز جس کے ذریعہ سے دوسروں کو عبرت دی جائے، کوئی چیز ہو، علامہ تفتازانی نے لکھا ہے کہ نکالاً کو بغیر عطف کے ذکر کرنا بتا رہا ہے کہ ہاتھ کاٹنا تو سزا کے طور پر ہے اور قطع بطور سزا اس لئے ہے کہ آئندہ ایسی حرکت کرنے سے وہ خود بھی رک جائے اور دوسرے بھی ایسے فعل سے باز رہیں، میں کہتا ہوں اس تحقیق کی بناء پر مناسب یہ ہے کہ جزاءً کو فَاقْطَعُوا کا مفعول کہا جائے اور نکالاً کو جزاءً کی علت قرار دیا جائے۔

بعض محققین نے ترک عطف کی یہ وجہ لکھی ہے کہ جزاء اور نکال کا مجموعہ قطع کی علت ہے جزاء کے لفظ سے اشارہ تو حق عبد کی طرف ہے اور نکال سے اشارہ حق اللہ کی طرف (اور دونوں کا مجموعہ علت قطع ہے)۔

مسئلہ:- امام اعظمؒ کے نزدیک قطع سے چرائے ہوئے مال کی عصمت ساقط ہو جاتی ہے یعنی چرایا ہوا مال اس قابل نہیں رہتا کہ (اگر وہ تلف ہو گیا ہو یا تلف کر دیا گیا ہو تو) اس کا تاوان دینا لازم ہو۔ باقی تینوں اماموں کے نزدیک قطع سے مال مسروق کی عصمت ساقط نہیں ہوتی قطع اور ضمان (تاوان) دونوں ساتھ ساتھ ہو سکتے ہیں اگر چرایا ہوا مال موجود ہوگا تو مالک کو واپس دیا جائے گا۔ قطع کے بعد بھی اور قطع سے پہلے بھی یہ مسئلہ اتفاقی ہے اور اگر چور کے پاس مال تلف ہو گیا ہو یا اس نے خرچ کر ڈالا ہو تو تینوں اماموں کے نزدیک ضمان دلایا جائے گا۔

اگر چور نے کچھ مال چرایا اور سزا میں ہاتھ کاٹ دیا گیا اور مال مالک کو دلا دیا گیا دوبارہ پھر وہی مال چور نے چرایا اور مال اپنی پہلی حالت پر تھا تو امام صاحب کے نزدیک اس صورت میں قطع کی سزا نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ مال کی عصمت پہلی مرتبہ قطع دست کے بعد ساقط ہو گئی (اور وہ مال اس قابل ہی نہیں رہا کہ اس کو چرانے کے عوض ہاتھ یا پاؤں کاٹا جائے، لیکن باقی اماموں کے نزدیک چونکہ قطع دست سے مال کی عصمت ساقط نہیں ہوتی اس لئے دوبارہ چرانے پر بھی قطع کی سزا دی جائے گی) امام ابو حنیفہ کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

(۱) آیت میں لفظ جزاءً آیا ہے اور سزا کے موقع پر لفظ جزاء کا استعمال اسی وقت ہوتا ہے جب وہ بدلہ خاص اللہ کے حق

میں مداخلت کا نتیجہ ہو بندہ کے حق کو اس میں کوئی دخل نہ ہو نکال کا لفظ بھی اسی وقت آتا ہے جب خاص اللہ کے حق میں مداخلت کی گئی ہو حق اللہ میں مداخلت کے نتیجہ کا نام ہی نکال (عبرت انگیز عذاب) ہے اس لئے قطع خالص اللہ کا حق ہے اور جرم بھی خاص حق اللہ سے تعلق رکھنے والا ہے اور حق اللہ کا جرم اسی وقت ہو سکتا ہے جب محل جرم حرام لذاتہ ہو (یعنی فی نفسہ اس کی حرمت ہو) جیسے شراب کی حرمت حرام لغیرہ نہ ہو ورنہ اس چیز کے اندر اباحت اصلی اور حرمت عارضی ہو گی اور شبہ کی وجہ سے سزا واجب نہ ہو گی پھر لفظ جزاء یا تو جزی بمعنی قضی سے ماخوذ ہے (یعنی اصل کے برابر ادا کر دیا) یا خود سے ماخوذ ہو جس کے معنی ہیں کافی ہو گیا (یعنی پورا پورا بدلہ ہو گیا) دونوں معنی کے لحاظ سے سزا کا کمال ہونا چاہئے اور تکمیل اس وقت ہو گی جب اس چیز کی حرمت ذاتی ہو (اور مجرم نے حرمت ذاتی کو توڑا ہو) اور جب مال مسروق کی حرمت لذاتہ ہو گی تو چوری کے بعد اس کی عصمت ٹوٹ جائے گی اور شراب و خنزیر کی طرح تلف ہونے یا تلف کرنے کے بعد کوئی معاوضہ نہیں ہو گا۔

(۲) اگر قطع دست کے بعد مالی تاوان واجب ہو گا تو تاوان ادا کرنے کے بعد چور کو اس مال کا مالک چوری کرنے کے وقت سے ہی قرار دینا پڑے گا اور جب چور کو مال لینے کے وقت سے ہی مالک مان لیا گیا تو اس کا ہاتھ کاٹنے کی کوئی وجہ ہے۔ (اس نے اپنا مال چرا لیا ہے۔

(۳) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دائیں ہاتھ کٹنے کے بعد چور پر (مالی) تاوان نہیں۔ رواہ الدار قطنی نسائی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں چور پر جب حد جاری کر دی جائے تو (پھر) اس پر ڈانڈ نہیں پڑے گا۔ بزار کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے حد قائم ہونے کے بعد چور چوری کے مال کا ضمان دہندہ نہیں ہوتا۔ اس روایت کا مدار سعید بن ابراہیم پر ہے سعید سے اس کے بھائی مسور بن ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف نے اپنے دادا حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا قول نقل کیا ہے۔ دار قطنی نے کہا سعید بن ابراہیم مجہول ہے اور مسور نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا ذکر نہیں کیا۔ یہ روایت جن طریقوں سے آئی ہے ان میں سے کوئی ثابت نہیں۔ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ سعید بن ابراہیم زہری تھے جو مدینہ کے قاضی تھے اور تسلیم شدہ ثقات میں سے تھے۔

شافعیہ نے آیت سے استدلال کا جواب اس طرح دیا ہے کہ لفظ جزاء کا سزا کے موقع پر استعمال اس وقت ہوتا ہے جب خاص اللہ کے حق میں مداخلت ہو یہ آپ کا مفروضہ ہی ناقابل تسلیم ہے دیکھو اللہ نے فرمایا ہے وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَىٰ وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ یہ آیت بتا رہی ہے کہ جزاء سیئۃ بندہ کا حق ہے جب ہی تو اس کو معاف کر دینے کا حق ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ جزاء بندہ کا حق ہے اور نکال اللہ کا حق جیسا کہ بعض اہل تحقیق نے ذکر کیا ہے۔

لفظ جزاء بیشک تکمیل سزا کو چاہتا ہے لیکن کمال جرم یہ ہے کہ حق اللہ اور حق العباد دونوں کو تلف کیا گیا ہو اچھا ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ قطع خالص اللہ کا حق ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ محل جرم حرام لذاتہ ہو اور ضمان ضروری نہ ہو بلکہ قطع شرع کا حق ہے ممنوع شرعی سے چور نے اجتناب نہیں کیا اس لئے اللہ کی طرف سے اس کو ہاتھ کاٹنے کی سزا ملی اور ضمان مالی بندہ کا حق ہے کہ چور نے ایسا مال لیا جس سے کسی شخص کا حق تعلق رکھتا تھا جیسے اگر شکار کا جانور (ہرن وغیرہ) کسی کا مملوک ہو اور احرام کی حالت میں کوئی اس کو ہلاک کر دے (تو مالی تاوان بھی دینا پڑتا ہے اور قربانی بھی) ہم محل جرم کی حرمت کو تسلیم بھی کر لیں تو یہ حرمت لذاتہ نہ ہو گی بلکہ شرعی ممانعت کی وجہ سے ہو گی اور حرمت لذاتہ قرار دی جائے گی تو مالک مال قطع کے بعد اس کو واپس ہی نہ لے سکے گا۔ جبکہ مال بھی موجود ہو اس کے لئے یہ مال حلال ہی نہ ہو گا (ہاتھ کٹوا دیا تو اب مال کس حق کی بنا پر لے گا) جیسے زانی کو سنگسار کئے جانے کے بعد مزنیہ بیوی سے شوہر کو قربت کرنا جائز نہیں رہتی کیونکہ اللہ نے رجم کو نکال فرمایا ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر مال مسروق کی حرمت شراب اور مردار کی طرح ذاتی قرار دی جائے گی تو جس طرح شراب اور مردار میں قطع ید نہیں اسی طرح کسی مال کی چوری میں قطع دست واجب نہ ہونا چاہئے معلوم ہوا کہ مال مسروق کی حرمت ذاتی نہیں۔

بالفرض اگر حرمت ذاتی مان بھی لی جائے تب بھی کیا خرابی ہو جائے گی اگر دو یا تین طرح کی حرمت قرار دید یجائے جیسے رمضان کے مہینے میں روزہ کی حالت میں کسی ذمی کی مملوکہ شراب پی لینا یا روزہ کی حالت میں دوسرے کی مملوک باندی سے زنا کرنا۔ شافعیہ نے دوسری دلیل کا جواب یہ دیا ہے کہ ضمان ادا کرنے کی صورت میں چور چوری کے مال کا چوری کرنے کے وقت سے ہی مالک قرار پا جائے گا حنفیہ کا یہ قول قابل تسلیم نہیں بلکہ تاوان کا وجوب تو مال کے تلف ہونے یا تلف کرنے کے وقت ہوتا ہے (چرانے کے وقت نہیں ہوتا۔)

حنفیہ کی تیسری دلیل کا جواب شافعیہ کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ آپ کی پیش کردہ حدیث ضعیف ہے اور اگر صحیح بھی ہو تب بھی آیت فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ کے عموم سے اس کا کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ شافعیہ نے وجوب ضمان کے ثبوت میں حضرت سمرہؓ بن جندب کی یہ حدیث پیش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (چوری کرنے والے) ہاتھ پر اس چیز کی ادائیگی لازم ہے جو اس نے لی ہے یہاں تک کہ جب وہ چیز دے دے گا (تو بار اترے گا) راہ احمد واصحاب السنن الار بعۃ بسند صحیح والحاکم۔

وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾ اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے یعنی اس کے حکم کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا اور اس کا ہر حکم حکمت پر مبنی ہے۔

احمد ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عمرو کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) کے زمانہ میں ایک عورت نے چوری کی اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ عورت نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا میری توبہ بھی ہو گئی فرمایا ہاں آج تو اپنے گناہ سے ایسی (پاک) ہو گئی جیسی پیدا ہونے کے دن تھی اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ پھر جس نے اپنی بیجا حرکت کے بعد توبہ کر لی اور عمل درست کر لیا تو کوئی شک نہیں کہ اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔

توبہ سے مراد ہے کئے ہوئے گناہ پر پشیمانی اور اس کے لئے استغفار اور استغفار کے ساتھ آئندہ نہ کرنے کا عہد۔ اور اصلاح سے مراد ہے اپنے اعمال کو درست کر لینا (توبہ کا معنی ہے لوٹنا جب اس کے بعد لفظ علی آتا ہے اور اللہ کی طرف توبہ کی نسبت کی جاتی ہے تو رحمت کے ساتھ بندہ کی طرف متوجہ ہونے اور توبہ قبول کرنے کے معنی ہوتے ہیں پس) يَتُوْبُ عَلَيْهِ کا معنی یہ ہے کہ اللہ بندہ پر رحم کرے گا اور اس کی توبہ قبول کرے گا اور آخرت میں اس کو عذاب نہیں دے گا۔

......کیا توبہ کرنے سے دنیوی سزا بھی ساقط ہو جاتی ہے......

امام احمد نے فرمایا توبہ کرنے سے ہر دنیوی سزا (حد شرعی) ساقط ہو جاتی ہے اس قول کے ثبوت میں ایک تو اسی آیت سے استدلال کیا جاتا ہے (جس میں توبہ قبول ہونے کی کوئی قید نہیں بیان کی نہ دنیا کی نہ آخرت کی اس کے علاوہ ایک اور آیت ہے اللہ نے فرمایا ہے وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا (اور تم میں سے جو دو شخص یعنی مرد و عورت زنا کا ارتکاب کریں ان کو دکھ پہنچاؤ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور اعمال ٹھیک کر لیں تو ان سے درگزر کرو) تیسرے رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کی طرح ہے۔ امام شافعی کے ایک قول میں حد شرعی کا سقوط اس وقت ہو جاتا ہے جب توبہ کئے ایک سال گزر جائے۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک کا قول ہے اور ایک روایت میں امام احمد اور امام شافعی کا بھی قول آیا ہے کہ توبہ سے کوئی دنیوی حد شرعی ساقط نہیں ہوتی۔ ہاں آیت مذکورہ میں چونکہ رہزنی کی حد شرعی کا استثناء آگیا ہے اس لئے توبہ سے صرف وہ معاف ہو جاتی ہے امام احمد کی اول الذکر دونوں دلیلوں کا احناف و موالکہ کی طرف سے یہ جواب دیا گیا ہے کہ اس آیت سے تو سقوط معلوم نہیں ہوتا، رہی دوسری آیت تو اس کا حکم شروع میں تھا پھر (جب حد شرعی کی تجویز

ہو گئی تو) اس کو منسوخ کر دیا گیا۔ دیکھو حضرت ماعز اور غمدیہ عورت (نے جب زنا کا اقرار کیا تو ان کو توبہ کرنے کے بعد بھی سنگسار کیا گیا تھا۔

مسئلہ :۔ حاکم کے پاس مقدمہ دائر ہونے اور جانے سے پہلے اگر چور نے چوری کا مال مالک کو واپس کر دیا تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا امام ابو یوسف کے نزدیک اس صورت میں بھی ہاتھ کاٹا جائے گا، اول قول کی وجہ یہ ہے کہ چوری ہونے کے لئے دعوی ضروری ہے لہذا ہاتھ کاٹنے کے لئے بھی حاکم تک مقدمہ کا پہنچنا شرط ہے اور جب مال واپس دے دیا تو دعوی کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہاں اگر دعوی دائر ہونے گواہان ثبوت پیش ہونے اور فیصلہ ہو چکنے کے بعد مال واپس کیا تو ہاتھ کاٹنا ضروری ہے اور فیصلہ سے پہلے شہادت سنی جانے کے بعد بھی یہی حکم ہے (یعنی قطع ید ہوگا) کیونکہ شہادت سے حاکم کے سامنے چوری ثابت ہو گئی اور دعوی بھی دائر ہو چکا۔

مسئلہ :۔ کیا چور کا ہاتھ کٹنے کے بعد آخرت کا گناہ معاف ہو جاتا ہے مجاہد نے کہا معاف ہو جاتا ہے) حضرت عبادہ بن صامت راوی ہیں کہ رسول اللہ (ﷺ) کے ارد گرد صحابہ کی جماعت موجود تھی۔ آپ نے فرمایا مجھ سے بیعت کر و اس شرط پر کہ کسی کو (ربوبیت) معبودیت اور خصوصی صفات میں اللہ کا شریک نہ بناؤ گے چوری نہ کرو گے، زنا نہ کرو گے، اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے، دیدہ و دانستہ کسی پر بہتان تراشی نہ کرو گے اور کسی بھلائی میں نافرمانی نہ کرو گے۔ تم میں سے جو شخص اس معاہدہ کو پورا کرے گا تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہو گا اور جو شخص مذکورہ افعال میں سے کسی فعل میں مبتلا ہو جائے گا اور اس کو دنیا میں اس کی سزا دے دی جائے گی تو اس کے گناہ کا اتار ہو جائے گا اور اگر مذکورہ افعال میں سے کوئی فعل کرنے کے بعد اللہ اس کے فعل پر پردہ ڈال دے گا تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد رہے گا، چاہے معاف کرے، چاہے سزا دے، متفق علیہ بغوی نے لکھا ہے صحیح یہ ہے کہ حد شرعی (قطع دست) جرم کی سزا ہے، توبہ کرنے کی اس کے بعد ضرورت ہے، اس کا ثبوت حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے ملتا ہے کہ ہاتھ کاٹنے اور داغنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اس کو حکم دیا تھا اللہ سے توبہ کر اور اس نے عرض کیا میں اللہ سے توبہ کرتا ہوں آپ نے فرمایا تو اللہ نے بھی تیری توبہ قبول فرمالی۔

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ بیشک اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ (اے نبی) کیا آپ کو معلوم نہیں خطاب رسول اللہ (ﷺ) کو اور روئے خطاب امت کی طرف ہے یا مخاطب عام ہے یعنی اے انسان کیا تو نہیں جانتا۔

اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ کہ اللہ ہی کی ہے حکومت آسمانوں کی اور زمین کی۔

يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ (گناہ گاروں میں سے) وہ جس کو (عذاب دینا) چاہے گا عذاب دے گا (صغیرہ گناہ ہوں یا کبیرہ کیونکہ عدل کا تقاضا یہ ہی ہے کہ گناہ کی سزا دی جائے) اور (اپنے فضل سے جس کے گناہ بخشنا چاہے گا بخش دے گا (یہ اس کے فضل کا تقاضا ہے خواہ توبہ کی ہو یا نہ کی ہو)۔

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے، عذاب دینے پر بھی اور معاف کر دینے پر بھی۔ لازم اس پر کچھ نہیں۔ عذاب کا ذکر مغفرت سے پہلے اس لئے کیا کہ عذاب کا استحقاق مغفرت پر مقدم ہے۔ تقدیم عذاب کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس جگہ صفت قدرت کو ظاہر کرنا مقصود ہے، اور مغفرت سے زیادہ عذاب دینے میں قدرت کا ظہور ہوتا ہے۔ مغفرت میں تو مغفور کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی مگر عذاب میں عذاب پانے والے کی طرف سے رکاوٹ ہوتی ہے (یعنی عذاب کو قبول کرنے سے اس کی طبیعت انکار کرتی ہے مگر عذاب دینے والے کی قدرت اس پر جبراً عذاب ڈالتی ہے) واللہ اعلم۔

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ اے پیغمبر آپ کو ان لوگوں کی حرمت رنجیدہ نہ بنائے جو کفر میں تیزی کے ساتھ جا رہے ہیں۔ جس چیز کا شرعاً اعتقاد اور بشرط امکان اقرار بھی ضروری ہے۔ اس کا

انکار کفر ہے۔

امام احمد اور مسلم نے حضرت براء بن عازب کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک یہودی جس کو سزائے تازیانہ دے کر منہ کالا کر دیا گیا تھا رسول اللہ ﷺ کی طرف سے گزرا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا تمہاری کتاب میں زانی کی شرعی سزا یہی ہے یہودیوں نے جواب دیا جی ہاں۔ آپ نے ایک یہودی عالم کو طلب فرمایا اور اس سے فرمایا میں تجھے اس اللہ کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ پر توریت نازل کی تھی کیا زانی کی شرعی سزا تم کو اپنی کتاب میں یہی ملتی ہے یہودی عالم نے کہا نہیں خدا کی قسم (توریت میں یہ حد زنا نہیں ہے) اگر آپ مجھے قسم نہ دیتے تو میں آپ سے نہ بیان کرتا۔ ہماری کتاب میں زانی کی سزا سنگسار کرنا ہے لیکن ہمارے بڑے آدمیوں میں جب زنا کی کثرت ہو گئی تو ہمارا یہ طریقہ ہو گیا کہ بڑا آدمی پکڑا جاتا تو ہم اس کو بغیر سزا دیئے چھوڑ دیتے اور کمزور کو پکڑا جاتا تو اس پر حد شرعی جاری کرتے، آخر ہم نے آپس میں کہا کہ کوئی ایسی سزا تجویز کر لینی چاہئے جو اونچے اور نیچے دونوں طبقوں والوں کو ہم دے سکیں چنانچہ اتفاق آراء کے بعد ہم نے تجویز کی کہ منہ کالا کرنا اور کوڑے مارنا زنا کی سزا ہے۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے کہا اے اللہ ان لوگوں نے تو تیرے حکم کو مردہ کر دیا میں ہی سب سے پہلے تیسرے حکم کو زندہ کر رہا ہوں۔ اس کے بعد آپ نے اس کو سنگسار کرنے کا حکم دے دیا اور اس کو پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس پر اللہ نے آیت یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ لَا یَحْزُنْکَ .... ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ تک نازل فرمائی۔ اس آیت میں یہودیوں کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے اِنْ اُوْتِیْتُمْ ھٰذَا فَخُذُوْہُ یعنی یہودیوں نے کہا تھا چلو محمد کے پاس چلیں اگر وہ کالا منہ کرنے اور کوڑے مارنے کا فتویٰ دے دیں تو اس پر عمل کرنا اور سنگسار کرنے کا فیصلہ کریں تو مت ماننا۔

بغوی نے یہ قصہ اس طرح لکھا ہے کہ خیبر کے بڑے آدمیوں میں سے ایک عورت و مرد نے زنا کا ارتکاب کیا۔ دونوں شادی شدہ تھے۔ توریت میں کتخدا زانیوں کی سزا رجم تھی لیکن یہودیوں نے ان کے بڑے آدمی ہونے کی وجہ سے سنگسار کرنے کی سزا دینی مناسب نہ سمجھی اور (مدینہ کے) بنی قریظہ کے پاس پیام بھیجا کہ محمد سے جا کر پوچھو اگر شادی شدہ مرد و عورت زنا کریں تو ان کی سزا کیا ہے۔ اگر وہ کوڑے مارنا تجویز کریں تو مان لینا اور سنگسار کر دینا تجویز کریں تو نہ ماننا یہ پیام سن کر بنی قریظہ اور بنی نضیر نے کہا خدا کی قسم وہ تو ایسا فیصلہ کریں گے جو تم کو پسند نہ ہو گا۔ اس کے بعد کعب بن اشرف، سعید بن عمرو، مالک بن الصیف اور لبابہ بن ابی الحقیق وغیرہ خدمت گرامی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ محمد ﷺ بتایئے شادی شدہ زانی اور زانیہ کی آپ کی کتاب میں کیا سزا ہے۔ حضور نے فرمایا کیا تم میرے فیصلہ کو پسند کرو گے یہودیوں نے کہا جی ہاں اتنے میں جبرئیل رجم کا حکم لے کر نازل ہوئے۔ آپ نے ان کو سنگسار کرنے کے حکم کی اطلاع دے دی مگر انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت جبرئیل نے (ایک یہودی عالم) ابن صوریا کا حلیہ اور حالات رسول اللہ ﷺ سے بیان کر کے کہا آپ کے اور ان یہودیوں کے درمیان ابن صوریا (کی شہادت) کو فیصلہ کن قرار دے دیا گیا (آپ ابن صوریا کو طلب کرائیں) رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں سے فرمایا کیا تم اس جوان سے واقف ہو جو ابھی بے ریش و بردت ہے، گورے رنگ کا ہے۔ ایک آنکھ سے کانا ہے اور فدک کا باشندہ ہے جس کو ابن صوریا کہا جاتا ہے یہودیوں نے کہا جی ہاں حضور نے فرمایا تو وہ کیسا آدمی ہے اور تم میں اس کا کیا درجہ ہے۔ یہودوں نے کہا جتنے علماء توراۃ اس زمین پر اس وقت رہ گئے ہیں ان میں وہ سب سے بڑا عالم توریت ہے۔ یہودیوں نے ابن صوریا کو بلوایا۔ جب وہ آگیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم ابن صوریا ہو۔ اس نے کہا جی ہاں فرمایا کیا تم (احکام توراۃ کے اس وقت کے) علماء میں سب سے بڑے عالم ہو۔ ابن صوریا نے کہا یہ لوگ ایسا ہی خیال کرتے ہیں۔ حضور نے یہودیوں سے فرمایا کیا تم ابن صوریا کو اپنے اور میرے درمیان پنچ بنانے پر راضی ہو۔ یہودیوں نے کہا جی ہاں رسول اللہ ﷺ نے ابن صوریا سے فرمایا۔ میں تم کو اس خدا کی قسم دیتا ہوں جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ جس نے موسیٰ پر توراۃ نازل کی تم کو مصر سے نکالا۔ تم کو بچانے کے لئے سمندر کو پھاڑ دیا۔ تم کو بچا لیا اور فرعونیوں کو غرق کر دیا۔ جس نے تم پر (تیہ میں) بادل کا سایہ (روز دھوپ کے وقت) کیا اور تم پر من و سلویٰ نازل کیا اور اپنی کتاب تم پر نازل کی جس کے اندر ان چیزوں کا ذکر ہے جو اللہ نے حرام یا حلال کر دی

تھیں۔ کیا تمہاری کتاب میں شادی شدہ زانی کی سزا سنگسار کر دینا ہے۔ ابن صوریا نے کہا جی ہاں قسم ہے اس کی جس کی آپ نے مجھے یاد دہانی کی ہے اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ میرے جھوٹ بولنے اور بدل کر بتانے سے مجھے توریت جلا ڈالے گی تو میں آپ سے اقرار نہ کرتا۔ لیکن محمد آپ کی کتاب میں کیا سزا ہے۔ حضور نے فرمایا اگر چار عادل آدمی گواہی دیں گے کہ اس نے اس میں اس طرح دخول کیا ہے جیسے سرمہ دانی میں سلائی تو سنگسار کرنا واجب ہے۔ ابن صوریا نے کہا قسم ہے اس کی جس نے موسیٰ پر توریت نازل کی۔ موسیٰ پر توریت میں بھی اللہ نے اسی طرح نازل فرمایا ہے۔ حضور نے فرمایا تو امر خداوندی کو ترک کرنے کا تمہارے لئے اول ترین باعث کیا ہوا۔ ابن صوریا نے کہا ہم بڑے آدمی کو پکڑتے تھے تو اس کو (بغیر سزا دیئے) چھوڑ دیتے تھے اور چھوٹے کو پکڑتے تھے تو اس پر حد شرعی جاری کرتے تھے مگر جب بڑے لوگوں میں زنا کی کثرت ہوگئی یہاں تک کہ ہمارے بادشاہ کے چچا کے بیٹے نے زنا کیا تو ہم نے اس کو سنگسار نہیں کیا۔ لیکن جب کسی دوسرے خاندان کے ایک شخص نے ارتکاب کیا تو بادشاہ نے اس کو سنگسار کرا دینا چاہا۔ اس پر مجرم کے خاندان والے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا جب تک بادشاہ کے چچا کے بیٹے کو سنگسار نہیں کیا جائے گا ہم اپنے آدمی کو سنگسار نہیں کرنے دیں گے۔ اس وقت علماء کا اجتماع ہوا اور مشورہ کیا گیا کہ رجم سے کم کوئی سزا ایسی تجویز کرنی چاہئے جو بڑے چھوٹے سب کو دی جائے۔ چنانچہ ہم نے ضرب تازیانہ اور کالا منہ کرنے کی سزا تجویز کر دی غرض اس قصہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے رجم کا حکم دے دیا۔ اور دونوں کو مسجد کے دروازہ کے پاس سنگسار کر دیا گیا اور حضور نے کہا الٰہی جب ان لوگوں نے تیرے حکم کو مردہ کر دیا تو سب سے پہلے میں ہی اس کو زندہ کر رہا ہوں۔ اس پر آیت مذکورہ کا نزول ہوا۔

بغوی نے اپنی سند سے حضرت ابن عمر کا بیان نقل کیا ہے کہ کچھ یہودی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ ہمارے ایک مرد اور ایک عورت نے زنا کیا ہے (کیا سزا دی جائے) حضور نے فرمایا سنگسار کرنے کے متعلق تمہاری کتاب میں کیا لکھا ہے۔ یہودیوں نے کہا (ہماری کتاب میں لکھا ہے کہ) ہم ان کو رسوا کریں اور کوڑے لگائیں۔ عبداللہ بن سلام نے کہا تم نے جھوٹ کہا توریت میں آیت رجم موجود ہے لوگ توریت لے آئے کھول کر ایک آدمی نے تلاوت شروع کی آیت رجم پر تو ہاتھ رکھ دیا اور اس سے اول و آخر کو ملا کر پڑھ دیا۔ حضرت عبداللہ نے کہا ہاتھ ہٹاؤ اس نے ہاتھ ہٹایا تو آیت رجم سامنے آگئی۔ آخر یہودی بول اٹھے محمد نے سچ کہا۔ توریت میں آیت رجم موجود ہے حضور نے حکم دے کر دونوں کو سنگسار کرا دیا۔ حضرت عبداللہ کا بیان ہے میں نے دیکھا کہ سنگ باری کے وقت مرد عورت پر جھکا ہوا تھا تاکہ عورت پر پڑنے والے پتھر اپنے اوپر روک لے۔ امام احمد نے مسند میں حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے لکھا ہے کہ فدک کے رہنے والوں میں سے ایک شخص نے زنا کیا۔ باشندگان فدک نے مدینہ کے یہودیوں کو لکھا کہ محمد سے مسئلہ پوچھو۔ اگر وہ کوڑے مارنے کا حکم دیں تو مان لینا اور سنگسار کرنے کا حکم دیں تو نہ ماننا۔ یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا اس سے آگے امام احمد کی روایت میں بھی قصہ کا بیان اسی طرح ہے جس طرح مسلم کی روایت میں ہے غرض حضور نے سنگسار کرنے کا حکم دے دیا اور اس کو پتھر مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس پر آیت فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ الخ نازل ہوئی۔

بیہقی نے دلائل میں حضرت ابوہریرہ کی روایت سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے بعض علماء روایت نے لکھا ہے کہ آیت مذکورہ کا نزول قصاص کے متعلق ہوا تھا قصہ یہ ہوا کہ بنی نضیر کو بنی قریظہ پر برتری حاصل تھی۔ بنی قریظہ نے کہا ہم اور ہمارے نضیری بھائی ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ ہمارا سب کا مذہب ایک ہے اور پیغمبر بھی ایک ہے لیکن بنی نضیر جب ہمارے کسی آدمی کو قتل کر دیتے ہیں تو ہم کو قصاص نہیں دیتے۔ خون بہا کے ستر وسق (کھجوریں) دے دیتے ہیں اور ہم اگر ان کے کسی آدمی کو قتل کر دیتے ہیں تو قاتل کو قتل کرتے ہیں اور ہم سے دگنی دیت یعنی ۱۴۰ وسق چھوارے لیتے ہیں اگر مقتول عورت ہوتی ہے تو اس کے عوض ہمارے مرد کو قتل کرتے ہیں اور مقتول مرد ہوتا ہے تو ایک آدمی کے عوض دو کو قتل کرتے ہیں اور مقتول غلام کے عوض ہمارے آزاد کو قتل کرتے ہیں اور (قتل سے کم

درجہ کی) دوسری چوٹوں کے عوض ہم سے دوگنا بدلہ لیتے ہیں۔ اب ہمارا اور ان کا فیصلہ آپ فرمادیں۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اسی طرح امام احمد اور ابوداؤد نے حضرت ابن عباس کی روایت سے لکھا ہے کہ اللہ نے یہ آیت یہودیوں کے دوگروہوں کے حق میں نازل فرمائی۔ جاہلیت کے زمانہ میں ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر چیرہ دستی حاصل تھی۔ دونوں فریقوں کا باہم معاہدہ مصالحت طے ہو گیا تھا کہ غالب فریق مغلوب فریق کا کوئی آدمی مار ڈالے گا تو پچاس وسق دیت ہوگی اور مغلوب گروہ غالب قبیلہ کے کسی آدمی کو قتل کردے گا تو سو وسق دیت ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ کی مدینہ میں تشریف آوری تک اسی پر عمل ہوتا تھا۔ جب حضور تشریف لے آئے تو اتفاقاً مغلوب فریق نے غالب فریق کے ایک آدمی کو مار ڈالا۔ غالب گروہ نے سو وسق دیت طلب کی۔ مغلوب فریق نے کہا کیا ایسا بھی (دنیا میں) ہوا ہے کہ جن دو قبیلوں کا نسب ایک ہو وطن ایک ہو دین ایک ہو اور پھر ایک قبیلہ والوں کی دیت دوسرے قبیلوں والوں سے آدھی ہو۔ پہلے ہم نے یہ معاہدہ تمہارے ظلم دباؤ اور خوف کی وجہ سے کیا تھا۔ اب محمد آگئے ہیں ہم دیت کے سو وسق نہیں دیں گے۔ اس نزاع کی وجہ سے جنگ چھڑنے ہی والی تھی کہ دونوں فریق رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں معاملہ پیش کرنے پر راضی ہو گئے اور کچھ لوگوں کو (جو واقع میں مخلص مسلمان نہ تھے منافق تھے) حضور کی خدمت میں بھیجا تاکہ آپ کی رائے معلوم کریں۔ اس پر آیت یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ لَا یَحْزُنْکَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ نازل ہوئی۔

مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۚ (کفر میں تیزی سے بڑھنے والے کچھ تو) ان لوگوں میں سے ہیں جو منہ سے کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے حالانکہ ان کے دل مومن نہیں ہیں۔ مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْا، اَلَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ کا بیان ہے۔ اٰمَنَّا مقولہ ہے۔ بِاَفْوَاهِهِمْ کا تعلق قالوا سے ہے اٰمَنَّا سے نہیں ہے۔

وَمِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا ۚ اور (کچھ) یہودیوں میں سے ہیں۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ وہ جھوٹی باتیں خوب سنتے ہیں۔

سَمّٰعُوْنَ خبر ہے۔ مبتدا محذوف ہے یعنی هُمْ سَمّٰعُوْنَ۔ ھم ضمیر منافقوں اور یہودیوں دونوں کی طرف راجع ہے یا صرف منافقوں کی طرف یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا خبر ہو اور سمّٰعون مبتدا یعنی یہودیوں میں سے کچھ لوگ جھوٹی باتیں خوب سنتے ہیں۔

لِلْكَذِبِ میں لام زائد ہے صرف مفید تاکید ہے یا یوں کہا جائے کہ سمعون کا مفہوم ہے سن کو قبول کرنے والے مراد یہ ہے کہ علماء یہود جو جھوٹی باتیں گڑھتے ہیں۔ یہ لوگ ان کو قبول کرتے ہیں۔ یا لام لت کے لئے ہے یعنی یہ لوگ آپ کا کلام اس لئے سنتے ہیں کہ اس میں کمی بیشی اور تغیر تبدل کر کے آپ پر بہتان تراشی کریں۔ بعض علماء کے نزدیک لام بمعنی الی ہے۔ یعنی اپنے علماء کے جھوٹ کی طرف کان لگاتے ہیں۔

سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِیْنَ لَمْ یَاْتُوْكَ ؕ ان یہودیوں تک پہنچانے کے لئے سنتے ہیں جو آپ کے پاس نہیں آئے۔ خواہ انتہائی بغض کی وجہ سے یا غرور کی وجہ سے۔ مطلب یہ ہے کہ بنی قریظہ کے جاسوس اہل خیبر کے لئے جاسوسی کرتے ہیں۔

یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ بگاڑتے رہتے ہیں کلام کو یعنی توریت میں آیت رجم و قصاص وغیرہ جو نازل کی گئی ہیں ان میں تحریف (تبدیل) کرتے ہیں۔ الکلم کا لفظ اسم جنس ہے یا اسم جمع بہر حال جمع نہیں ہے۔ اسی لفظی رعایت کی وجہ سے آئندہ فقرہ میں مفرد کی ضمیر اس کی طرف راجع کی گئی ہے۔

مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ بعد اس کے کہ وہ اپنے مواقع پر ہوتا ہے یعنی اللہ نے جو الفاظ توریت میں جن مقامات پر رکھ دیئے ہیں ان میں تبدیلی کرتے ہیں۔ تحریف سے مراد یا لفظی ہے یعنی ایک لفظ کو ہٹا کر دوسرا لفظ اس کی جگہ رکھ دیتے تھے

یا معنوی یعنی الفاظ کا وہ مطلب نہیں لیتے تھے جو اصلا مراد ہوتا تھا۔

يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا کہتے ہیں اگر تم کو یہ دیا جائے یعنی اگر محمد ﷺ تم کو اس تحریف شدہ حکم کی طرح حکم دیں

فَخُذُوْهُ تو اس کو لے لینا یعنی اس پر عمل کرنا۔

وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ اور اگر تم کو وہ (محرف شدہ حکم) نہ دیا جائے یعنی اگر محمد ﷺ اس تحریف شدہ حکم کے خلاف فیصلہ دیں

فَاحْذَرُوْا ؕ تو اس سے اجتناب کرنا یعنی محمد ﷺ کے فیصلہ کو قبول نہ کرنا۔

وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ اور اللہ جس کو گمراہی میں ڈالنا یا تباہ کرنا یا عذاب دینا چاہے گا۔

فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ آپ اللہ کی طرف سے اس کی امداد پر کچھ قابو نہیں رکھ سکتے۔ یعنی اللہ کی طرف سے آپ کو یہ طاقت نہیں مل سکتی کہ مراد خداوندی کو دفع کر سکو۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کی مراد کو دفع کرنے کا تم کو بالکل قابو نہیں ہو سکتا۔

آیت بتا رہی ہے کہ معتزلہ فرقہ (جو اللہ کی مراد اور ارادہ میں تلازم کا قائل نہیں) کا قول غلط ہے۔ اللہ کی مراد اور ارادہ میں انفکاک نہیں ہو سکتا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ؕ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو پاک کرنا اللہ نے نہیں چاہا۔ یعنی کفر سے پاک کرنا نہیں چاہا۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ تمام بندوں سے ایمان کا خواستگار ہے۔ کفر نہیں چاہتا۔ یہ آیت ان کے قول کے خلاف محکم دلیل ہے (معتزلہ نے امر اور ارادہ میں فرق نہیں کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح اللہ ایمان کا حکم دیتا ہے کفر کا حکم نہیں دیتا لیکن اس کے حکم کے خلاف لوگ کفر و معصیت کرتے ہیں۔ گویا اس دنیا میں حکم خدا کے خلاف بندوں کی طرف سے ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح اللہ بندوں سے ایمان ہی چاہتا ہے لیکن بندے کفر کرتے ہیں۔ گویا اللہ کے ارادہ کے خلاف عمل کرتے ہیں پس ارادہ خداوندی کے خلاف بندوں کی طرف سے عمل کا اظہار ہوتا ہے اور مراد ارادہ میں انفکاک ہو جاتا ہے۔ اشاعرہ کہتے ہیں امر خداوندی کے خلاف تو ہونا ممکن ہے اور ہو رہا ہے لیکن ارادہ الٰہی خیر و شر دونوں کو حاوی ہے ارادہ خداوندی کے خلاف ہونا نا ممکن ہے۔ اللہ اگر ارادہ خیر کرے تو کوئی شر کی طرف نہیں جا سکتا اور ارادہ شر کرے تو کوئی خیر کی طرف نہیں لا سکتا۔ جس طرح اس آیت میں صراحت ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں کو کفر سے پاک کرنا نہیں چاہا اس لئے پیغمبر بھی کچھ نہیں کر سکتے لیکن اس کے باوجود ایمان لانے کا حکم ان کو دیا گیا (اگرچہ وہ ایمان نہیں لائے۔

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۚۖ انہی کے لئے دنیا میں ذلت ہے۔ خواہ مارے جانے کی جیسے بنی قریظہ مارے گئے یا جزیہ ادا کرنے اور مسلمانوں سے خائف رہنے کی۔

وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۴۱﴾ اور آخرت میں انہی کے لئے بڑا عذاب ہوگا عذاب عظیم سے مراد ہے دوزخ میں ہمیشہ رہنا لَهُمْ کی ضمیر یا صرف یہودیوں کی طرف لوٹ رہی ہے یا منافقوں اور یہودیوں دونوں کی طرف راجع ہے

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ جھوٹ کو خوب سننے والے اور بڑے حرام خور ہیں۔ سَمّٰعُوْنَ کی تکرار محض تاکید کے لئے ہے۔ سُحْت سے مراد حرام روزی ہے۔ اصل لغت میں سحت کا وضعی معنی ہے ہلاکت۔ اللہ نے فرمایا ہے فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ یعنی لیہلککم۔ اخفش نے کہا ہر غیر حلال کمائی کو سحت کہا جاتا ہے۔

اس آیت کا نزول یہودی حکام جیسے کعب بن اشرف وغیرہ کے حق میں ہوا۔ یہ لوگ رشوتیں لے کر مقدمات کی ڈگریاں دے دیا کرتے تھے اور رشوت دینے والے کی جھوٹی باتیں سن کر قبول کر لیا کرتے تھے اور فریق ثانی کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے تھے۔

حسن، قتادہ، مقاتل اور ضحاک نے کہا سحت وہ رشوت ہے جو مقدمہ کے فیصلہ کے سلسلہ میں لی جائے۔ حسن نے کہا باطل کو حق بنانے اور حق کو باطل قرار دینے کے لئے حاکم کو جو رشوت دی جائے وہ سحت ہے لیکن اگر ظلم کو دفع کرنے کے لئے

حاکم کو رشوت دی جائے تو کوئی ہرج نہیں یعنی جان ومال کے بچاؤ کے لئے اگر حاکم کو بطور رشوت کچھ دیا جائے تو دینے والے پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔ لینے والے کے لئے تو بہر حال حرام ہے۔

میں کہتا ہوں یہی حکم اس وقت ہے کہ مدعی حق پر ہو لیکن اس کو اندیشہ ہو کہ حاکم بغیر رشوت لئے میرا حق نہیں دلوائے گا اور فریق ثانی کے ظلم کو دفع نہیں کرے گا تو اس صورت میں رشوت دینا جائز ہے لیکن حاکم کے لئے حق کا فیصلہ دینے کے لئے رشوت لینا بھی ناجائز ہے۔

حضرت ابن سعد نے فرمایا ہے اگر کسی نے کسی کا حق دلانے یا ظلم کو دفع کرنے کے لئے حاکم سے سفارش کی اور حاکم کو کچھ دیا اور حاکم نے اس کو قبول کر لیا تو حرام ہے۔ لوگوں نے کہا ابو عبدالرحمٰن ہمارا تو یہ خیال ہے کہ ناجائز فیصلہ کرنے کے لئے کچھ لینا سحت ہے (جائز حکم کے لئے کچھ لینا تو رشوت نہیں ہے) فرمایا ناجائز فیصلہ کے لئے لینا تو کفر ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الْکٰفِرُوْنَ مسروق کا بیان ہے میں نے حضرت عمر بن خطاب سے عرض کیا۔ فرمائیے کیا ناجائز فیصلہ کے لئے رشوت لینا سحت ہے۔ فرمایا نہیں وہ تو کفر ہے۔ سحت تو یہ ہے کہ بادشاہ کے پاس کسی کو قرب وعزت حاصل ہو اور کسی شخص کی بادشاہ سے کوئی ضرورت وابستہ ہو مگر یہ مصاحب سلطانی بغیر کچھ ہدیہ تحفہ لئے صاحب غرض کا کام نہ کرے۔

حضرت عمر کا ارشاد منقول ہے سحت کے دو طریقے ہیں جن سے لوگ (حرام) کھاتے ہیں (ناجائز) فیصلہ کی رشوت اور زانیہ کی بھاڑ۔

لیث کی روایت ہے کہ (کسی مقدمہ کے دونوں فریق) مدعی اور مدعیٰ علیہ حضرت عمر کی طرف آگے بڑھے۔ حضرت عمر نے ان کو ٹھہرا دیا وہ پھر بڑھے۔ حضرت نے پھر ٹھہرا دیا (تیسری بار) وہ پھر آگے بڑھے تو آپ نے ان کا فیصلہ کر دیا۔ اس کی وجہ دریافت کی گئی تو فرمایا (پہلی بار) دونوں آگے آئے تھے تو مجھے ایک کی طرف اپنے اندر ایسا جھکاؤ محسوس ہوا جو دوسرے کی طرف نہ تھا۔ میں نے اس حالت میں فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ دوسری مرتبہ بڑھے تب بھی کچھ کیفیت مجھے اندر محسوس ہوئی اس حالت میں بھی فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ آخر میں جب تیسری بار بڑھے تو اول کیفیت بالکل زائل ہو چکی تھی اس وقت میں نے فیصلہ کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے اللہ کی لعنت فیصلہ کے سلسلہ میں رشوت دینے اور لینے والے پر رواہ احمد والترمذی وصححہ والحاکم عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ بغوی نے حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت سے بھی یہ حدیث مرفوعاً بیان کی ہے۔

امام احمد نے ضعیف اسناد سے حضرت ثوبان کی مرفوع روایت نقل کی ہے اللہ لعنت کرے رشوت دینے والے اور رشوت دلوانے والے پر اور جو رشوت کے لین دین میں دوڑا پھرتا ہے۔

فائدہ :- ابن ہمام نے لکھا ہے رشوت چند طرح کی ہوتی ہے۔ نمبر 1 رشوت دے کر مقام قضاء حاصل کرنا۔ اس صورت میں قاضی قاضی نہیں ہو سکتا (یعنی رشوت دے کر قاضی بننا ناجائز ہے۔ ایسا قاضی اختیارات قضا کا مالک نہیں ہو سکتا (۲) رشوت لے کر قاضی کا فیصلہ اس مقدمہ میں نافذ نہ ہوگا۔ خواہ فیصلہ اپنی جگہ حق ہی ہو کیونکہ بغیر کچھ لئے اجراء حق قاضی پر لازم ہوتا ہے۔ مال کا لین دین دونوں ناجائز ہیں، (۳) اگر تحصیل منفعت (جائزہ) یا دفع مضرت کے لئے کسی کو رشوت دی کہ حاکم وقت سے سفارش کر کے وہ معاملات ٹھیک کرا دے تو یہ مال لینے والے کے لئے حرام ہے۔ دینے والے کے لئے یہ فعل جائز ہے۔ لینے والے کے لئے جواز کی تدبیر یہ ہے کہ اپنے ایک دو دن محنت کرنے اور اپنا وقت صرف کرنے کا معاوضہ طے کر لے اور وقت کو صرف کرنے اور محنت کرنے کی اجرت لے لے۔ اس صورت میں وہ مال سفارش کی رشوت نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر جان ومال کا کسی سے ڈر ہو اور اس ڈر سے اس شخص کو کچھ دے دے تو لینے والے کے لئے حرام ہے۔ دینے والے کے لئے جائز ہے۔

فائدہ :- محیط میں ہے کہ رشوت چند قسم کی ہوتی ہے نمبر ا باہم الفت ومحبت بڑھانے کے لئے کسی کو کچھ دینا یہ رشوت

نہیں ہدیہ ہے اور جائز ہے۔ میں کہتا ہوں رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق فرمایا ہے باہم ہدیہ دو اس سے آپس کی محبت پیدا ہو گی (یا یوں ترجمہ ہو گا کہ باہم ہدیہ دو آپس میں محبت بڑھاؤ) نمبر ۲ ایک شخص نے دوسرے کو ڈرایا اس نے ڈر کے مارے ڈرانے والے کو کچھ مال دے دیا تاکہ ازالہ خوف ہو جائے یا حاکم کے ظلم سے جان و مال کو بچانے کے لئے حاکم کو کچھ مال دے دیا یہ مال لینے والے کے لئے حلال نہیں لیکن دینے والے کے دینا جائز ہے یا نہیں عموماً مشائخ فقہاء اس کو جائز کہتے ہیں کیونکہ جان و مال کی حفاظت اور بچاؤ کے لئے یہ مال دیا جاتا ہے۔ نمبر ۳ اگر کوئی شخص کسی کو اس غرض سے کچھ دے کہ حاکم سے سفارش کر کے اس کا کام ٹھیک کرا دے اس صورت میں اگر وہ کام ناجائز ہے تو اس کی سفارش کے لئے مال دینا بھی حرام ہے اور لینا بھی حرام ہے اور اگر کام جائز ہے اور مال اس لئے دیا گیا ہے کہ حاکم سے سفارش کر کے کام کرا دیا جائے اور حاکم کے سامنے مال لینے والا اس کی مدد کرے تو دینے والے کے لئے اس طرح دینا تو جائز ہے لیکن لینے والے کے لئے لینا بھی جائز ہے یا ناجائز یہ مسئلہ اختلافی ہے کوئی جائز کہتا ہے کوئی ناجائز۔ اس کو حلال بنانے کی تدبیر یہ ہے کہ درمیانی شخص اپنے وقت کی حد بندی کر کے صرف وقت اور محنت کا معاوضہ طے کر لے اور حاکم سے معاملہ طے کرانے کی مدد کا کوئی معاوضہ مقرر نہیں کیا مگر صاحب معاملہ نے خود ہی اس کے عوض کچھ دے دیا تو عام مشائخ کے نزدیک اس کا لینا مکروہ نہیں ہے۔ مگر بعض کے نزدیک مکروہ ہے حضرت ابن مسعود کا قول بھی ایک روایت میں اسی طرح ہے۔

فَإِنْ جَاءُوكَ پس اگر وہ (یہودی فیصلہ کرانے کے لئے) آپ کے پاس آئیں۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ تو آپ (چاہیں تو) ان کے مقدمہ کا فیصلہ کر دیں یا (نہ چاہیں) نہ کریں۔

وَإِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَضُرُّوكَ شَيْئًا اگر آپ ان کا فیصلہ نہ کریں گے تب بھی وہ آپ کو کوئی دکھ نہ پہنچا سکیں گے اللہ نے اپنے رسول کو اختیار دے دیا کہ اگر غیر مسلم اپنا آپس کا مقدمہ لے کر آپ کے پاس آئیں تو فیصلہ کرنا نہ کرنا آپ کی مرضی پر موقوف ہے جو چاہیں کریں۔

بغوی نے لکھا ہے اگر ذمی کفار اپنے اندرونی مقدمہ کا فیصلہ کرانے کے لئے مسلم حاکم کے پاس آئیں تو کیا حکام کو اب بھی ان کا فیصلہ چکانے اور نہ چکانے کا اختیار ہے۔ یہ مسئلہ اختلافی ہے اکثر علماء کا خیال ہے کہ حاکم کو منفی مثبت دونوں اختیار ہیں۔ سورہ مائدہ میں کوئی حکم منسوخ نہیں ہے۔ مسلم حکام کو اب بھی اختیار ہے کہ چاہیں تو اہل کتاب کے باہمی مقدمہ کا فیصلہ کر دیں۔ نہ چاہیں نہ کریں لیکن اگر کریں تو اسلامی فیصلہ کریں نخعی، شعبی، عطاء اور قتادہ کا یہی قول ہے بعض علماء کے نزدیک کفار کے باہمی مقدمہ کا فیصلہ کرنا مسلم حاکم پر واجب ہے اور سورۂ مائدہ کی یہ آیت منسوخ ہے اور ناسخ آیت وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ ہے یہ قول مجاہد اور عکرمہ کا ہے۔ ایک روایت میں حضرت ابن عباس کا بھی یہی قول آیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا سورت مائدہ کی دو آیتوں کے علاوہ تیسری کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔ پہلی آیت لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ ہے جس کی ناسخ آیت اقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً ہے۔ دوسری منسوخ آیت فَإِنْ جَاءُوكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ ہے اس کی ناسخ آیت وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے اگر دو کتابی (کافر) اپنا مقدمہ لے کر (مسلم) حاکم کے پاس آئیں تو حاکم پر ان کے مقدمہ کا فیصلہ کر دینا واجب نہیں ہے۔ امام شافعی کا یہی قول ہے لیکن اگر دونوں فریق یا دونوں میں سے کوئی ایک ذمی ہو تو فیصلہ کرنا واجب ہے کیونکہ مسلمانوں نے ہر ظلم کو دور کرنے کا ذمیوں سے عہد کیا ہے اور سورۂ مائدہ کی یہ آیت ذمیوں کے متعلق نہیں ہے امام ابو حنیفہ کے نزدیک بہر حال مقدمہ کا فیصلہ واجب ہے۔

فریقین مقدمہ کتابی ہوں یا ذمی یا ایک ذمی

میں کہتا ہوں فریقین ذمی کافر ہوں یا حربی اگر مسلم حاکم کے سامنے اپنا مقدمہ لائیں تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا حاکم

پر واجب ہے ۔ بادشاہ کی طرف سے وہ اس کا ذمہ دار بنا ہے ۔ اسی طرح اگر صرف مدعیٰ علیہ ذمی ہو یا مسلمان ہو تب بھی حاکم پر مقدمہ کا فیصلہ واجب ہے ۔ مسلمان تو بہر حال مسلمان ہے اور ذمی اہل اسلام کی ذمہ داری میں آچکا ہے ہاں اگر مدعیٰ علیہ حربی ہو تو چونکہ ان سے شریعت اسلامیہ کے احکام کا التزام نہیں کیا ہے اس لئے حاکم پر بھی اس کا فیصلہ کرنا واجب نہیں ہے لیکن اگر دونوں مسلمان ہوں یا دونوں ذمی ہوں یا دونوں حربی ہوں یا ایک حربی اور ایک ذمی ہو اور دونوں جا کر کسی مسلمان سے فیصلہ کرانا چاہیں مگر یہ مسلمان حاکم عدالت نہ ہو بلکہ اس کی حیثیت پنچ کی ہو تو پنچ بننا اور فیصلہ کرنا واجب نہیں ۔ فیصلہ کر دے یا نہ کرے دونوں باتوں کا اختیار ہے۔

وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۚ اور اگر آپ انکے باہمی مقدمہ کا فیصلہ کریں تو انصاف کے ساتھ کریں۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾ حقیقت یہی ہے کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے ۔ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا انصاف کرنے والے اللہ کے پاس نور کے ممبروں پر ہوں گے ۔ رواہ مسلم

حضرت عمر بن خطاب کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے اعلیٰ مرتبہ والا منصف خوش اخلاق حاکم ہوگا ۔ اور بدترین مرتبہ والا ظالم جاہل حاکم ہوگا۔ (شعب الایمان)۔

وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ تعجب ہے کہ یہ آپ کو پنچ بنا رہے ہیں حالانکہ ان کے پاس تورات موجود ہے جس کے اندر اللہ کا حکم درج ہے ۔ استفہام تعجبی ہے یعنی تعجب ہے کہ یہ لوگ ایسے نبی کو پنچ بنا رہے ہیں جس پر ان کا ایمان نہیں اور اس حکم کا فیصلہ کرا رہے ہیں جو ان کو خود معلوم ہے ۔ تورات میں موجود ہے یعنی زانی کو سنگسار کر دینا مگر یہ اس پر عمل نہیں کرتے ۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ تحکیم سے ان کا مطلب طلب حق اور اقامت شرع نہیں بلکہ سہل حکم کی خواہش ہے ۔ خواہ وہ اللہ کا حکم نہ ہو۔

ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۳﴾ پھر (جب آپ ان کی تورات کے موافق حکم دیتے ہیں تو) اس کے بعد وہ منہ پھیر جاتے ہیں (بات یہ ہے کہ) یہ ایماندار ہی نہیں ہیں۔ اللہ کی کسی کتاب پر ایمان نہیں ہے ۔ نہ آپ کی کتاب پر ، نہ توریت پر ، ورنہ توریت پر عمل کرتے اور توریت کی جو کتاب تصدیق و تائید کر رہی ہے اس پر ان کا ایمان ہوتا۔

ع ۱۰

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ ہم نے توریت نازل کی ہے جس کے اندر ہدایت اور نور ہے ۔ اس سے اللہ کے احکام معلوم ہو جاتے ہیں ۔ اور اگر دل سخت نہ پڑ گئے ہیں تو ان میں روشنی پیدا ہو جاتی ہے

يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ اس کے ذریعہ سے انبیاء فیصلے کرتے تھے ۔ یعنی موسیٰ اور موسیٰ کے بعد والے انبیاء جن میں سب سے آخری نبی محمد ہیں ۔ رجم کا فیصلہ کرتے تھے ۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی یہی فیصلہ کیا ۔ حسن اور سدی نے کہا اَلنَّبِيُّوْنَ سے مراد رسول اللہ ﷺ کی ذات ہے ۔ آپ نے سنگسار کرنے کا فیصلہ کیا تھا (کسی جماعت کے سردار کے لئے جمع کا صیغہ استعمال کر لیا جاتا ہے) اس جگہ بھی صیغہ جمع اسی طرح آیا ہے جس طرح آیت اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا میں ابراہیم کو امت فرمایا ہے۔ اور بجائے ماضی کے يَحْكُمُ مضارع کا صیغہ یہ بتانے کے لئے استعمال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ بھی مقصود آیت میں داخل ہے۔

بعض اہل تفسیر کا خیال ہے کہ نَبِيُّوْنَ سے مراد وہ انبیاء ہیں جو حضرت موسیٰ کے بعد اور حضرت عیسیٰ سے پہلے ہوئے کیونکہ دوسری آیت میں وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسٰى آیا ہے (ہم ان سب کے پیچھے عیسیٰ کو لائے) لیکن اگر رسول اللہ کو بھی نَبِيُّوْنَ کے اندر داخل قرار دیا جائے گا تو پھر اس آیت میں تاویل کی جائے گی اور اٰثَارِهِمْ کی ضمیر بعض انبیاء کی طرف راجع کی جائے گی (کیونکہ رسول اللہ کے بعد تو حضرت عیسیٰ کو نہیں بھیجا گیا تھا تو گویا مطلب یہ ہوگا کہ محمد ﷺ کے علاوہ دوسرے انبیاء کے بعد ہم نے عیسیٰ کو بھیجا) جیسے آیت وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ میں بعض عورتوں کی طرف ضمیر راجع ہے اسی لئے

امام ابو حنیفہ نے فرمایا ہماری شریعت میں گزشتہ شریعتوں کے جو احکام منسوخ نہیں کر دیئے گئے ان پر عمل کرنا واجب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں دنیا اور آخرت میں عیسیٰ بن مریم سے بہت زیادہ قرابت رکھتا ہوں ۔ انبیاء علاتی بھائی ہیں ۔ ان کی مائیں مختلف ہیں مگر دین سب کا ایک ہے ۔ الحدیث متفق علیہ یعنی دین سب کا ایک ہی ہے ۔ جو اللہ نے جاری کیا ہے مگر انبیاء کے تعدد کے لحاظ سے دنیا میں اس دین کے آنے کے طریقے مختلف ہیں۔

الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا جو اللہ کے حکم کے مطیع تھے۔ لفظ اَسْلَمُوْا میں انبیاء کی مدح اور مسلمانوں کی عظمت کا اظہار اور یہودیوں پر طنز ہے کہ توریت کے حکم پر یہ نہیں چلتے اور اللہ کے حکم کی اطاعت نہیں کرتے۔

لِلَّذِيْنَ هَادُوْا ان لوگوں کے لئے جو کفر سے تائب ہو گئے اس کا تعلق یا تو اَنْزَلْنَا سے ہے یعنی ہم نے توریت ان لوگوں کے لئے نازل کی جو کفر سے تائب ہو گئے تھے ۔ یا فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ سے ہے یعنی توریت کے اندر ہدایت اور نور ان لوگوں کے لئے ہے جو کفر سے تائب ہو گئے ۔ یا يَحْكُمُ سے اس کا تعلق ہے یعنی یہودیوں کے مقدمات کا فیصلہ توریت سے انبیاء کرتے تھے ۔ بعض علماء نے کہا اس آخری شق پر لِلَّذِيْنَ میں لام بمعنی علی ہو گا جیسے وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا میں فَلَهَا کا معنی ہے فَعَلَيْهَا (اگر بدی کرو گے تو اپنے نفس کا ہی نقصان کرو گے) یا جیسے اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ میں لَهُمْ بمعنی عَلَيْهِمْ ہے (ان ہی لوگوں پر لعنت ہے) میں کہتا ہوں اس تشریح پر آیت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انبیاء توریت کے ذریعہ سے یہودیوں کے کفر کی وجہ سے ان کے خلاف حکم دیتے تھے کیونکہ تورات کا فیصلہ یہودیوں کے خلاف یہ تھا کہ جب کوئی رسول تمہاری کتاب کی تصدیق کرنے والا آئے تو اس کو ضرور ماننا اور اس کی مدد کرنا ۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ لِلَّذِيْنَ هَادُوْا کی قید دلالت کر رہی ہے کہ اس آیت میں انبیاء سے مراد وہ انبیاء بنی اسرائیل ہیں جو موسیٰ کے بعد آئے تھے اور ان کو حکم دیا گیا تھا کہ توریت کے احکام پر عمل کریں ۔ وہ انبیاء مراد نہیں ہیں جو احکام توریت پر عمل کرنے پر مامور نہ تھے ۔ جیسے عیسیٰ اور محمد ﷺ اسی طرح آیت لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا بھی دلالت کر رہی ہے کہ عیسیٰ اور محمد ﷺ توریت کے احکام پر مامور نہ تھے۔ بیضاویؒ کے اس قول کی بنا امام شافعی کے اس مسلمہ پر ہے کہ گزشتہ شریعتیں ہمارے لئے دلیل نہیں ہیں۔

ہم کہتے ہیں آیت لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا اس امر پر دلالت نہیں کرتی کہ توریت کے تمام احکام منسوخ کر دیئے گئے ۔ ہاں یہ ضرور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ توریت کے بعض یا اکثر احکام کو منسوخ کر دیا گیا ۔ اور جب تک قرآن اور حدیث سے ثابت نہ ہو جائے کہ فلاں حکم جو اللہ نے دیا تھا منسوخ کر دیا گیا ۔ ہمارے لئے واجب العمل رہے گا کیونکہ اللہ نے خود فرمادیا فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ۔

وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ اور اہل اللہ یعنی زاہد ، صوفی اپنے مریدوں کے اخلاق کو درست کرنے اور دلوں کو صاف و شستہ بنانے کے لئے توریت کے مطابق حکم دیتے تھے۔

وَالْاَحْبَارُ اور ماہر علماء بھی احبار کا واحد حَبْرٌ اور حِبْرٌ ہے حِبْرٌ زیادہ فصیح ہے ماہر عالم کو حِبْرٌ کہتے ہیں ۔ بعض علماء نے حبر کا معنی جمال لکھا ہے حدیث میں آیا ہے دوزخ سے ایک آدمی ایسی حالت میں نکلے گا کہ اس کا حسن و جمال جا چکا ہو گا ۔ تحبیر بمعنی تحسین لفظ حبر (بمعنی جمال) سے ہی بنا ہے ۔ علماء جمال امت ہیں جمال علم سے آراستہ ہوتے ہیں اس لئے علماء کو احبار کہا جاتا ہے۔

بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ بوجہ اس کے کہ ان کو کتاب اللہ کی نگہداشت کا حکم دیا گیا تھا اِسْتِحْفَاظ سے مراد یہ ہے کہ علماء کو توریت کی نگہداشت اور اس کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیا گیا تھا ۔ بھولنے اور عمل نہ کرنے کی ممانعت اور الفاظ میں کاٹ چھانٹ اور معنی میں ردو بدل سے باز داشت کر دی گئی تھی ۔ خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ انبیاء اور ان کے متبعین کو چونکہ توریت کی نگہداشت و حفاظت پر مامور کر دیا گیا تھا اس لئے وہ لوگوں کو توریت کے مطابق حکم دیتے تھے۔

وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ اور وہ (اللہ کی کتاب یا نگہداشت کتاب کی طلب پر) اقراری ہو گئے تھے لوگوں کو کتاب

کی تعلیم دیتے تھے اور صاف صاف بیان کرتے تھے

فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ پس (اے حکام اگر تمہارے فیصلے لوگوں کے مقصد کے خلاف ہوں تو پرواہ نہ کرو) تم لوگوں سے نہ ڈرو۔

وَاخْشَوْنِ اور (میری کتاب واحکام کو ترک کرنے میں) مجھ سے ڈرو۔ ابن عساکر اور حکیم ترمذی نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اگر آدمی آدمی سے ڈرے تو اس شخص پر اسی آدمی کو مسلط کیا جاتا ہے جس سے وہ ڈرتا ہے۔ اور اگر آدمی اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتا ہو تو اللہ اپنے سوا کسی کو اس پر قابو نہیں دیتا اور جو آدمی آدمی سے امید رکھتا ہے اس کو اسی سے وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ اور اگر اللہ کے سوا کسی سے امید نہ رکھے تو اللہ اپنے سوا کسی اور کے سپرد اس کو نہیں کرتا۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ اور میرے (نازل کئے ہوئے) احکام کے عوض نہ لو۔

ثَمَنًا قَلِيْلًا حقیر معاوضہ یعنی دنیوی اسباب وسامان یعنی اللہ کے احکام کے مقابلہ میں رشوت وغیرہ نہ لو۔ اس آیت سے صراحتاً ثابت ہے کہ توریت کے جن احکام کا منسوخ ہونا ثابت نہیں ان کی مکلف یہ امت بھی ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اور جس نے اللہ کے نازل کئے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہیں دیا یعنی اللہ کے احکام کی توہین کی اور ان کا انکار کرتے ہوئے ان کے مطابق حکم نہیں دیا کذا قال عکرمۃ۔

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ وہ ہی کافر ہیں (یعنی اس بات کو نہیں مانتے کہ احکام خداوندی کو حقیر سمجھنے کا ان کو حکم نہیں دیا گیا) بعض علماء کے نزدیک کافروں سے مراد فاسق ہیں۔ بعض نے کہا کفر سے مراد ہے حق پوشی حضرت ابن عباس اور طاؤس نے فرمایا یہ وہ کفر نہیں جو دین سے خارج کر دے۔ جیسے اللہ اور روز آخرت کا انکار دین سے خارج کر دیتا ہے بلکہ اس نے احکام خداوندی کے خلاف حکم دیا، اس نے حق کو چھپایا۔

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اور ہم نے توریت میں بنی اسرائیل پر فرض کر دیا تھا۔

اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ کہ جان کے بدلے جان یعنی قاتل آزاد ہو یا غلام۔ مرد ہو یا عورت۔ مسلمان ہو یا ذمی۔ مقتول کے بدلہ میں اس کو قتل کیا جائے ہماری شریعت میں اس مسئلہ کی تحقیق سورۂ بقرہ کی آیت اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ اور آنکھ آنکھ کے عوض پھوڑی جائے۔

وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ اور ناک ناک کے بدلہ میں کاٹی جائے۔

وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ اور کان کان کے عوض کاٹا جائے۔

وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ اور دانت دانت کے عوض اکھاڑا جائے۔

وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ اور (خاص) زخموں کا بھی بدلہ ہے۔ یہ خاص کے بعد عام کا ذکر ہے۔ لفظ قصاص چونکہ اپنے اندر مثلیت کا مفہوم رکھتا ہے اس لئے جہاں تک مثلیت ممکن ہوگی۔ بدلہ لیا جائے گا اور مثلیت کسی طرح ممکن نہ ہوگی تو قصاص (یعنی جسمانی بدلہ) نہیں لیا جائے گا مثلاً اگر جوڑ سے قصداً کاٹ دیا ہو تو کاٹنے والے کا ہاتھ بھی اسی جوڑ سے کاٹا جائے گا خواہ ہاتھوں کی لمبائی (اور موٹائی) میں اختلاف ہو، یہی حکم ٹانگ، سر، ناک، کان کی لو کاٹنے اور دانت توڑنے کا ہے۔ اگر ضرب کی وجہ سے آنکھ باہر نکل پڑے تو بدلہ ناممکن ہے کیونکہ مثلیت نہیں ہو سکتی لیکن اگر آنکھ اپنی جگہ باقی ہو اور بینائی جاتی رہے تو بدلہ واجب ہے کیونکہ مثلیت ممکن ہے، بدلہ کا طریقہ یہ ہوگا کہ آئینہ کو خوب گرم کیا جائے گا اور مارنے والے کے چہرہ پر تر روئی رکھی جائے گی اور پھر گرم آئینہ کو آنکھ کے قریب لایا جائے گا (آئینہ کی تپش تر روئی پر لگے گی تو اس سے ایک خاص قسم کی بھاپ اٹھ کر پتلی پر لگے گی) اس طرح آنکھ کی روشنی جاتی رہے گی۔ صحابہ کی ایک جماعت کا قول اسی طرح آیا ہے کفایہ میں ہے کہ ایسا ایک واقعہ حضرت عثمان کے زمانہ میں ہوا تھا۔ حضرت عثمان نے صحابہ سے مسئلہ پوچھا لیکن کسی نے کوئی (شافی) جواب

نہیں دیا ۔ اتنے میں حضرت علی تشریف لے آئے اور آپ نے یہ ترکیب بتائی ۔ کسی صحابی نے اس کی تردید نہیں کی گویا اتفاق آراء ہو گیا ۔ حضرت عثمان نے اسی طرح حکم جاری کر دیا ۔ سوائے دانت کے اور کسی ہڈی (کو توڑنے) کا بدلہ نہیں ہے۔

مسئلہ :۔ امام ابو حنیفہ اور امام احمد کے نزدیک زخم کا بدلہ اس وقت لیا جائے گا جب زخم کا اندمال ہو جائے ۔ امام شافعی کے نزدیک (بھرنے کا انتظار نہیں کیا جائے گا) فوراً بدلہ لیا جائے گا ۔ احناف کی دلیل حضرت جابر کی روایت ہے کہ ایک شخص کو زخمی کیا گیا تھا ۔ اس نے فوراً بدلہ لینے کی درخواست کی مگر رسول اللہ نے زخمی کے اچھا ہونے تک زخمی کرنے والے سے بدلہ لینے کی ممانعت فرما دی ۔ رواہ الدار قطنی۔

مسئلہ :۔ اگر آدھی باھ سے ہاتھ کاٹ دیا یا جوف تک گہرا زخم پہنچا دیا مگر مجروح اچھا ہو گیا تو بدلہ نہیں لیا جائے گا کیونکہ مثلیت کا امکان نہیں ۔ اول صورت میں ہڈی کی شکست ہے جس کا کوئی ضابطہ نہیں اور دوسری صورت میں موت سے بچ جانا نادر الوقوع ہے ۔ بظاہر تو ایسی ضرب ہلاکت تک پہنچا دیتی ہے ۔ امام شافعی کے نزدیک اگر بازو توڑ دیا اور الگ کر دیا تو کہنی سے ہاتھ کاٹا جائے گا اور اگر درمیانی کلائی سے توڑا تو پہنچے سے کاٹا جائے گا ۔ دوسری ہڈیاں توڑنے (اور اعضاء کو الگ کر دینے) کا بھی یہی حکم ہے کہ قریب ترین جوڑ سے ضارب کے اسی عضو کو کاٹا جائے گا ۔ بقیہ حصہ کا فیصلہ کسی پنچ کے ذریعہ سے ہو گا۔

مسئلہ :۔ زبان اور عضو مخصوص کو کاٹنے کا بھی امام صاحب کے نزدیک قصاص نہیں کیونکہ یہ دونوں عضو پھیلتے اور سکڑتے ہیں اس لئے ممکن نہیں ہاں اگر حشفہ کو کاٹ دیا ہے تو بدلہ لیا جائے گا (کیونکہ کاٹنے کی حد معین ہے) امام ابو یوسف امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک اگر زبان اور عضو مخصوص کو جڑ سے کاٹ دیا تو چونکہ مماثلت ممکن ہے اس لئے بدلہ لیا جائے گا ۔ اگر پورا ہونٹ جڑ تک کاٹ لیا تو بدلہ لیا جائے گا ۔ مماثلت ممکن ہے اور کچھ حصہ کاٹ لیا تو بدلہ نہ ہو گا ۔ مماثلت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

مسئلہ :۔ لنجے ہاتھ کے عوض تندرست ہاتھ اور دائیں کے عوض بایاں یا بائیں کے عوض دلیاں نہیں کاٹا جائے گا ، یہ فیصلہ اجماعی ہے۔

مسئلہ :۔ اگر مضروب کی آنکھ اپنی جگہ تھی مگر نابینا تھی یا ہاتھ لنجا تھا یا زبان گونگی تھی ۔ یا ذکر سن (بیکار) تھا ۔ یا انگلی زائد تھی اور ان اعضاء کو ضارب نے کاٹ دیا تو جمہور کے نزدیک کسی عادل پنچ سے فیصلہ کرایا جائے گا اور امام احمد کے نزدیک صحیح عضو کی دیت کا ایک تہائی ادا کرنا ہو گا کیونکہ عمرو بن شعیب کے دادا (حضرت عبد اللہ) کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک تہائی دیت دینے کا فیصلہ صادر فرمایا اس آنکھ کا جو اپنی جگہ قائم ہو مگر بے نور ہو اور شل ہاتھ کا جب اس کو کاٹ دیا گیا ہو اور ناکارہ دانت کا جب اس کو اکھاڑ دیا گیا ہو ۔ رواہ البیہقی من طریق النسائی حضرت ابن عباس کی موقوف حدیث میں ہے کہ شل ہاتھ کی ایک تہائی دیت ہے اور آنکھ اگر اپنی جگہ قائم ہو اور بے نور ہو تو ایک تہائی دیت ہے۔

مسئلہ :۔ اگر مقطوع کا ہاتھ صحیح اور قاطع کا ہاتھ شل ہو یا انگلیاں کم ہوں تو امام صاحب کے نزدیک مقطوع کو اختیار ہے چاہے قاطع کے شل ہاتھ کو کاٹے یا پورا پورا مالی تاوان لے لے ۔ پورا جسمانی بدل لینے کا تو امکان ہی نہیں ہے لہذا لیا تو اپنے حق سے کم (جسمانی) بدل لینا پڑے گا یا مالی بدل لے گا ۔ امام شافعی کے نزدیک مالی بدل لینے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں۔

مسئلہ :۔ اگر کھوپڑی کے دائیں بائیں دونوں ابھاروں کے درمیان اتنی ضرب لگی کہ دونوں ابھاروں کے درمیان کا پورا حصہ زخمی ہو گیا لیکن ضارب (کا سر بڑا ہونے کی وجہ سے) اتنا زخم اس کے سر کے دونوں ابھاروں کے درمیانی حصہ پر پورا نہ آسکتا ہو اس صورت میں زخمی کو اختیار ہے کہ اپنے زخم کے ناپ کے برابر ضارب کے سر پر زخم لگائے ۔ خواہ دائیں میں ابھار سے شروع کرے یا بائیں ابھار سے یا مالی تاوان لے لے اس کے برعکس صورت ہو تب بھی یہی اختیار ہو گا۔

مسئلہ :۔ امام صاحب کے نزدیک دانت توڑنے کا بھی ویسا ہی جسمانی بدلہ ہے جیسا دانت اکھاڑنے کا امام شافعی کے نزدیک توڑنے کا جسمانی بدلہ نہیں کیونکہ مثلیت ناممکن ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اگر ریتی سے ریتا جائے تو اصل شکست سے مماثلت ہو سکتی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ اونٹ کا بدلہ لینے کا رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تھا۔ رواہ النسائی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ہی ایک روایت یہ بھی ہے کہ انس بن مالک کی پھوپھی ربیع نے انصار کی ایک لڑکی کا دانت توڑ دیا۔ انصار رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے بدلہ لینے کا حکم دے دیا۔ یہ حکم سن کر انس بن مالک کے چچا حضرت انس بن نضر بولے یا رسول اللہ اس کا دانت نہیں توڑا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انس بدلہ اللہ کا فرض حکم ہے۔ اس کے بعد مدعی راضی ہو گئے اور مالی عوض انہوں نے قبول کر لیا۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں کہ اگر اللہ کے اعتماد پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ ان کی قسم پوری کر دیتا ہے، متفق علیہ۔

مسئلہ:۔ قتل نفس سے کم ضرب میں شبہ عمد نہیں ہوتا۔ ضرب یا قصداً ہو گی یا ضرب خطا قتل نفس سے کم میں شبہ عمد کا حکم عمد کا ہے۔

مسئلہ:۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک قتل نفس سے کم ضرب کا قصاص مرد و عورت، آزاد و غلام اور باہم دو غلاموں کے درمیان جاری نہیں ہو سکتا۔ باقی تینوں اماموں کے نزدیک تمام مذکورہ صورتوں میں بدلہ لیا جائے گا۔ ہاں اگر آزاد غلام کا ہاتھ کاٹ ڈالے تو قصاص نہ ہو گا کیونکہ ان کا مسلمہ ضابطہ ہے کہ آزاد سے غلام کا قصاص نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے فرمایا ہے اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ الخ یہ آیت اپنے عمومی حکم کے لحاظ سے امام ابو حنیفہ کے خلاف محکم ثبوت ہے۔ امام ابو حنیفہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ اطراف بدن کی پوزیشن مال کی طرح ہے اور تفاوت قیمت سے مال کی مماثلت ختم ہو جاتی ہے لیکن شریعت نے اطراف کی قیمت معین کر دی ہے۔ قتل نفس کی حالت اس سے جدا ہے۔ روح اور جسم کا تعلق منقطع کرنے سے زندگی ختم ہو جاتی ہے اور روح میں کوئی تفاوت نہیں۔

مسئلہ:۔ اطراف بدن کا قصاص مسلم و ذمی کے درمیان امام ابو حنیفہ کے نزدیک جاری ہو گا کیونکہ امام صاحب کے نزدیک مسلم و ذمی کے اطراف کا مالی معاوضہ برابر ہے لیکن امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک اگر مسلم غیر مسلم کے اطراف قطع کر دے تو قصاص نہ ہو گا کیونکہ ان کے نزدیک قتل کافر پر بھی مسلم سے قصاص نہیں لیا جا سکتا، سورۂ بقرہ میں یہ مسئلہ گزر چکا ہے۔

فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ پس (حقداروں میں سے) جو کوئی (قصور وار کے) قصاص سے در گزر کرے گا تو معاف کرنے والے کے لئے یہ فعل کفارہ ہو جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص، حسن بصری، شعبی اور قتادہ نے یہی مطلب بیان کیا ہے۔ ایک انصاری راوی ہیں کہ آیت فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس سے مراد وہ شخص ہے جس کا دانت توڑ دیا گیا ہو یا ہاتھ یا کوئی اور حصہ کاٹ دیا گیا یا اس کو زخمی کر دیا گیا ہو اور وہ معاف کر دے تو اللہ اسی کے بقدر اس کے گناہ ساقط کر دیتا ہے۔ اگر اس نے چہارم دیت معاف کر دی ہو گی تو اس کے گناہوں کا چہارم حصہ ساقط کر دیا جائے گا اور اگر ایک تہائی دیت معاف کی ہو گی تو گناہوں کا ایک تہائی حصہ ساقط کر دیا جائے گا۔ اور اگر پوری دیت معاف کی ہو گی تو پورے گناہ ساقط کر دیئے جائیں گے۔ اخرجہ ابن مردویہ۔

طبرانی نے الکبیر میں حسن سند سے حضرت عبادہ بن صامت کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اپنے جسم کے کسی حصہ (کے دکھ) کو معاف کر دیا اللہ اسی کے بقدر اس کے گناہ ساقط فرما دے گا۔ طبرانی اور بیہقی نے سنجرہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کو دکھ دیا گیا تو اس نے صبر کیا اور اس کو دیت دی گئی تو شکر کیا اور جس پر ظلم کیا گیا تو اس نے معاف کر دیا اور اگر خود ظلم کیا تو مغفرت کا طلب گار ہوا۔ ان سب لوگوں کے لئے (عذاب آخرت سے) امن ہے اور یہ ہدایت یافتہ ہیں۔

ترمذی اور ابن ماجہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابو درداء نے فرمایا میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے جس شخص کو

کوئی جسمانی اذیت دی جائے اور وہ معاف کر دے تو اللہ اس عمل کی وجہ سے اسکا ایک درجہ بلند کرتا ہے اور گناہ کو ساقط فرماتا ہے
ہمارے شیخ و امام (حضرت مرزا جان جاناں) رحمۃ اللہ کو جب زخمی کیا گیا اور ایسا زخمی کیا گیا کہ اسی سے آپ کی وفات ہو گئی اور امیر الامراء (نواب نجف خاں) نے آپ کے پاس پیام بھیجا کہ میں آپ کے مجرم سے قصاص لوں گا تو شیخ نے فرمایا تم میرے مجرم سے کچھ تعرض نہ کرو شیخ نے اس کو معاف کر دیا۔
بعض اہل تفسیر کے نزدیک لَہٗ کی ضمیر مجرم کی طرف راجع ہے مجرم کا ذکر اگرچہ صراحتاً نہیں آیا مگر کلام سابق سے سمجھا ضرور جاتا ہے۔ اس وقت آیت کا مطلب اس طرح ہو گا کہ اگر حقدار معاف کر دیں گے تو یہ معافی مجرم کے حق میں گناہ کا کفارہ ہو جائے گی اور جس طرح بدلہ چکانے کے بعد آخرت کا کوئی مؤاخذہ اس کے ذمہ باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح معافی کے بعد بھی آخرت میں اس کا مؤاخذہ نہ ہو گا۔ رہا معاف کرنے والے کا ثواب تو وہ اللہ کے ذمہ ہے۔ اللہ نے خود فرمایا ہے فَمَنْ عَفٰی وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ بغوی نے لکھا ہے یہ تفسیر حضرت ابن عباس کے قول میں آئی ہے۔ مجاہد، ابراہیم اور زید بن اسلم کا بھی یہ قول ہے۔
آیت کا تیسرا مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص اپنی طرف سے خود قصاص دے دے گا یعنی قصاص شرعی مستحق قصاص کو بخوشی دے دے گا تو یہ فعل اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا اللہ نے فرمایا ہے فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰاُولِی الْاَلْبَابِ۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ اور اللہ نے (قصاص وغیرہ کا) جو حکم نازل کیا ہے جو لوگ اس کے مطابق حکم نہیں دیں گے۔

فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ تو وہ ہی ظالم (ستم ڈھانے والے) ہوں گے کہ حکم الٰہی کی تعمیل سے باز رہے۔

وَقَفَّیْنَا عَلٰٓی اٰثَارِھِمْ بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ اور ہم نے ان انبیاء کے بعد عیسیٰ بن مریم کو بھیجا۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ مِنَ التَّوْرٰىۃِ کہ وہ اپنے سے پہلے والی کتاب یعنی توریت کی تصدیق کرتے تھے

وَاٰتَیْنٰہُ الْاِنْجِیْلَ فِیْہِ ھُدًی وَّنُوْرٌ اور ہم نے ان کو انجیل دی جس کے اندر مذہب اور روشنی تھی۔

وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ مِنَ التَّوْرٰىۃِ اور جو اپنے سے پہلے والی کتاب یعنی تورات کی تصدیق کرنے والی تھی۔

وَھُدًی وَّمَوْعِظَۃً لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴿۴۶﴾ اور پرہیزگاروں کے لئے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی۔ فِیْہِ ھُدًی جملہ حالیہ ہے اور مُصَدِّقًا کا عطف فِیْہِ ھُدًی پر ہے۔ چونکہ انجیل سے فائدہ اٹھانے والے صرف وہی لوگ ہیں جو اہل تقویٰ ہوں اس لئے خصوصیت کے ساتھ پرہیزگاروں کے لئے انجیل کو ہدایت و نصیحت قرار دیا۔

وَلْیَحْکُمْ اَھْلُ الْاِنْجِیْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فِیْہِ اور (حکم دے دیا گیا کہ) انجیل والے اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق حکم دیں
ایک شبہ:- نزول قرآن کے بعد انجیل کو منسوخ کر دیا گیا۔ پھر وَلْیَحْکُمْ بصیغہ امر کس طرح صحیح ہو گا۔ امر تو حال یا استقبال کے لئے آتا ہے (امر کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ فوراً یا آئندہ اس حکم کی تعمیل کی جائے۔ گزشتہ کے متعلق اب حکم دینا ناقابل تصور ہے)۔
جواب:- انجیل کے تمام احکامات منسوخ نہیں کئے گئے اور جو احکام منسوخ کئے گئے ہیں اور قرآن کی وجہ سے ان کو ترک کر دیا گیا ہے تو اس کا حکم بھی انجیل میں ہی موجود تھا (تو گویا یہ بھی حکم انجیل کی تعمیل ہوئی) اب اگر منسوخ ہونے کے بعد اس منسوخ پر عمل کیا جائے گا تو حکم انجیل کی خلاف ورزی ہو گی۔ اہل انجیل سے مراد ہے حضرت عیسیٰ کی وہ امت جو رسول اللہ کی بعثت سے پہلے گزر چکی اور امت اسلامیہ جو رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد امت محمدیہ قرار پائی۔ (یعنی حضور کی بعثت کے بعد یہ ہی امت اسلامیہ انجیل والی ہے کیونکہ انجیل کے احکام پر یہ ہی چلتی ہے اور قرآن سے جو احکام انجیل منسوخ کر دیئے گئے ان پر نہیں چلتی کیونکہ قرآن سے ان کے منسوخ ہو جانے کی صراحت خود انجیل میں پہلے سے موجود تھی اس طرح منسوخ شدہ

احکام پر نہ چلنا بھی حکم انجیل کے مطابق ہے۔) [1]

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾ اور جو لوگ اللہ کی نازل کردہ کتاب کے مطابق حکم نہیں دیتے وہ اللہ کی اطاعت سے باہر ہونے والے ہیں۔ یا (فاسقونَ سے مراد کافر ہیں یعنی) ایمان سے خارج ہیں۔ کیونکہ اللہ کے احکام کو حقیر جانتے ہیں۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ اور (اے محمدؐ) ہم نے آپ کے پاس یہ کتاب (قرآن) اتار کر بھیجا ہے جو برحق ہے اور اپنے سے پہلی والی (آسمانی) کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے۔

اول اَلْکِتَابَ سے مراد قرآن ہے۔ الف لام عہدی ہے اور دوسری اَلْکِتَابِ سے عام کتب الٰہیہ سابقہ ہیں اس میں الف لام جنسی ہے۔

مُهَيْمِن کا ترجمہ بروایت والبی حضرت ابن عباس نے شاہد کیا ہے یہی قول مجاہد، قتادہ اور سدی اور کسائی کا ہے عکرمہ نے اس کا ترجمہ کیا۔ بتانے والا۔ سعید بن جبیر اور ابو عبیدہ نے کہا صاحب امانت اور حسن بصری نے کہا امین۔ سعید بن مسیّب اور ضحاک نے کہا حاکم اور خلیل نے کہا نگران و محافظ۔ تمام معانی قریب قریب ہیں۔ مقصد سب کا یہ ہے کہ جس کتاب کے متعلق قرآن مجید شہادت دے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے وہ ضرور اللہ کی کتاب ہے۔ ابن جریج نے کہا قرآن مجید گزشتہ کتب الٰہیہ کا امین ہے۔ اگر اہل کتاب اپنی کتابوں سے کچھ بیان کریں اور وہ بیان قرآن میں بھی ہو تو اس کی تصدیق کرو ورنہ جھوٹ سمجھو یعنی اگر قرآن میں اس کی تصدیق ہو تو اس کو صحیح سمجھو اور قرآن میں تکذیب ہو تو اس کو غلط قرار دو اور اگر قرآن اس کے معاملہ میں خاموش ہو تو تم بھی خاموش رہو نہ تصدیق کرو نہ تکذیب کیونکہ اہل کتاب کے بیان میں صدق و کذب دونوں کا احتمال ہے۔

مُهَيْمِن بروزن مفیعل اصل میں مُؤَيْمِن تھا۔ یہ لفظ امانت سے ماخوذ ہے۔ ہمزہ کو ہاء سے بدل دیا گیا ہے۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ پس لوگوں کے معاملات میں اس حکم کے مطابق فیصلہ کیجئے جو اللہ نے (قرآن میں) نازل کیا ہے۔ کیونکہ حکم قرآنی یا حکم سابق کے موافق ہو گا یا ناسخ۔

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ اور (اگر لوگ آپ سے اللہ کے حکم کے خلاف فیصلہ کرانا چاہیں تو) آپ ان کی خواہشات پر نہ چلیں۔

عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ اس حق کو چھوڑ کر جو آپ کے پاس (اللہ کی طرف سے) آ گیا ہے۔ چونکہ اتباع (اس جگہ) مفہوم انحراف کو متضمن ہے اس لئے اس کے بعد عن لایا گیا۔ یا حال محذوف ہے یعنی مُعْرِضاً عَمَّا جَآءَكَ۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا (اے لوگو) تمہاری ہر امت کے لئے ہم نے شریعت اور (دین کی) کھلی ہوئی راہ مقرر کر دی۔ شِرْعَة گھاٹ، مراد شریعت، کیونکہ شریعت بھی۔ دوامی زندگی تک پہنچانے والی راہ ہے۔ مِنْهَاج کھلا ہوا راستہ مراد دینی راستہ۔ یہ لفظ نَہْج سے ماخوذ ہے نَہَجَ کا معنی ہے وَضَحَ (کھل گیا واضح ہو گیا) بیضاوی نے اس آیت سے اس امر پر استدلال کیا ہے کہ ہم گزشتہ شریعتوں کے احکام پر مکلّف نہیں ہیں۔

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ اگر قرآن یا حدیث سے ثابت ہو جائے کہ اللہ نے سابق کتابوں میں یہ حکم دیا تھا اور قرآن و حدیث سے اس حکم کا منسوخ ہونا ثابت نہ ہو تو لامحالہ ہم بھی اس کے مکلف ہوں گے کیونکہ وہ بھی ہماری شریعت کے احکام میں ہی داخل ہے (کیونکہ گزشتہ اقوام و ملل کے لئے اس حکم کا خاص ہونا ثابت نہیں اس لئے اس کو عام ہی قرار دیا جائے گا اور قیامت تک سب اس پر مامور ہوں گے) اب یہ کہنا کہ کتب سابقہ کے تمام احکام قابل ترک ہیں عقل سے بھی بغاوت ہے اور نقل کے بھی خلاف ہے۔ رہا شریعتوں کا باہم اختلاف تو وہ اصول میں نہیں ہے۔ اکثر فروعی مسائل میں ہے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک جماعت بنا دیتا کہ ہر زمانہ میں سب فروع

---

[1] شبہ کا زیادہ واضح جواب وہ ہے جو مترجم نے ترجمہ میں اشارتاً بین القوسین عبارت کو زیادہ کر کے ظاہر کر دیا ہے اس پر غور کیا جائے۔

میں بھی متفق ہوتے نہ کسی حکم کی منسوخی ہوتی نہ تبدیلی۔
وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ لیکن (اس نے نہ چاہا۔ اور تم کو مختلف امتیں اور مختلف شریعتوں کا حامل بنادیا) تا کہ ان احکام کے سلسلہ میں تمہاری جانچ کرے۔ جو اللہ نے تم کو دیئے ہیں (اور جو ہر زمانہ اور ہر امت کے لئے جدا جدا مناسب ہیں) مطلب یہ ہے کہ اللہ کو یہ جانچنا مقصود ہے کہ تم میں سے کون اللہ کے حکم پر چلتا ہے اور کون اپنے باپ دادا کے دین کی اندھی تقلید پر جما رہتا ہے۔ بعض علماء نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ اگر اللہ چاہتا کہ تم سب اسلام پر ہو جاؤ تو جبراً تم کو اسلام پر متفق بنادیتا مگر اس نے تمہارے جانچنے کی غرض سے جبر نہیں کیا۔
فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ پس نیک اعمال کی طرف بڑھو۔ یعنی فرصت کو غنیمت سمجھو اور اعمال صالحہ کی طرف سب سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو تا کہ سبقت کی فضیلت تم کو حاصل ہو (رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے) جو شخص کوئی اچھا طریقہ جاری کرے گا اس کو اس طریقہ پر چلنے کا ثواب بھی ملے گا اور ان لوگوں کا ثواب بھی ملے گا جو (قیامت تک) اس طریقہ پر چلتے رہیں گے مگر ان چلنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔
اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا تم سب کی واپسی اللہ ہی کی طرف ہو گی۔ یہ دعوت سبقت کی علت اور سبقت کرنے والوں کے لئے جزاء کا وعدہ اور سبقت میں کوتاہی کرنے ولوں کے لئے عذاب کی وعید ہے۔
فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝۴۸ پھر وہ تم کو جتلادے گا جن باتوں میں تم اختلاف کرتے تھے یعنی حق پرست اور باطل پرست کی جزاء سزا کا فیصلہ کردے گا جس سے معلوم ہو جائے گا کہ کون حق پر تھا اور کون باطل پر۔ ابن اسحاق نے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ کعب بن اشرف، عبداللہ بن صوریا اور شاس بن قیس نے باہم مشورہ کیا اور کہا چلو محمدؐ کے پاس چلیں۔ شاید ہم ان کو ان کے دین سے بہکا سکیں۔ یہ مشورہ کر کے خدمت گرامی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا محمد آپ جانتے ہیں کہ ہم یہود کے علماء اور سردار ہیں ہم اگر اتباع کرلیں گے تو سب یہودی آپ کے پیچھے آجائیں گے اور ہمارے خلاف نہیں کریں گے ہمارا اپنی قوم سے کچھ جھگڑا ہے ہم آپ کے پاس مقدمہ لے کر آئیں گے۔ آپ ہم کو قوم والوں کے خلاف ڈگری دے دیں۔ اگر آپ ایسا کردیں گے تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ حضور نے اس بات سے انکار کردیا اور مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔
وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ
اور (ہم نے آپ پر یہ حکم بھی نازل کیا کہ اللہ نے جو احکام نازل کئے ہیں ان کے مطابق ان کا باہمی فیصلہ کریں۔ اور اگر فیصلہ ان کی خواہشات کے خلاف ہو تو) ان کی خواہشات پر نہ چلیں اور احتیاط رکھیں کہ یہ کہیں اللہ کے نازل کردہ بعض احکام سے آپ کو بہکا نہ دیں۔ اس کلام کا عطف یا الکتاب پر ہے (اسی تقدیر پر ترجمہ مذکورہ ہوگا) یا الحق پر ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امر نا محذوف کا اَنِ احْكُمْ مفعول ہو۔ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ ھُمْ سے بدل ہے یعنی ان کی فتنہ انگیزی اور گمرہ کنی سے ڈریں یا مفعول لہ ہے یعنی ان سے محتاط رہیں۔ ان کی فتنہ انگیزی کے اندیشہ سے یا ان سے احتیاط رکھیں کہ کہیں یہ آپ کو گمراہی میں نہ ڈال دیں (اسی ترکیب کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے)۔
فَاِنْ تَوَلَّوْا پھر اگر یہ لوگ منہ موڑلیں یعنی نازل شدہ حکم سے اعراض کریں اور دوسرے کسی حکم کے خواستگار ہوں۔
فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ تو یقین کر لیجئے کہ بس خدا ہی کو منظور ہے کہ ان کے بعض جرموں پر ان کو سزا دے یعنی خدا ہی کو منظور ہے کہ بعض گناہوں کی سزا ان کو دنیا ہی میں فوراً دے دی جائے۔ بعض ذنوب سے مراد ہے روگردانی کرنا۔ لیکن ضمیر (بہ) لانے کی جگہ صراحت کے ساتھ بعض ذنوب کا لفظ ذکر کرنے سے اس امر پر تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ گناہ تو ان کے بہت ہیں منجملہ دوسرے گناہوں کے ایک گناہ یہ بھی ہے کہ نازل شدہ حکم سے منہ موڑتے ہیں اور یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ اور ان لوگوں میں سے بہت آدمی فاسق ہیں یعنی یہودیوں میں سے بہت لوگ سرکش اور کفر میں حد سے آگے بڑھنے والے ہیں۔

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ط کیا پھر یہ لوگ دور جاہلت کا فیصلہ چاہتے ہیں۔ جاہلیت سے مرادہے جاہلیت کے دور کا مذہب یعنی اپنی خواہشات پر چلنا۔ بعض اہل روایت نے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول بنی قریظہ اور بنی نضیر کے حق میں ہوا۔ ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی تھی کہ ان کا فیصلہ وہی کیا جائے جو اہل جاہلیت دور اسلامی سے پہلے کے لوگ) کرتے تھے کہ جداجدا قبائل کے مقتولوں میں نیچ اونچ کا لحاظ رکھتے اور ایک قبیلہ کے مقتول کو دوسرے قبیلے کے مقتول سے (قصاص اور دیت کے لحاظ سے) بڑا چھوٹا قرار دیتے تھے۔ آیت میں استفہام انکاری ہے یعنی (حکم جاہلیت کی طلب نہ کرنی چاہئے) آپ ایسا نہ کریں۔

وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ اور فیصلہ کرنے میں اللہ سے کون اچھا ہے ایمان رکھنے والوں کے نزدیک۔ لِقَوْمٍ میں لام بیان کا ہے یعنی اہل ایمان ہی غور وفکر کرتے ہیں اور سوچ سمجھ کر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اللہ سے بہتر اور برتر حکم والا اور کوئی نہیں ہو سکتا (مخلوق کا علم ناقص اور اللہ کا علم کامل ہے۔ مخلوق کے ساتھ جذبات اور میلانات لگے ہوئے ہیں اس لئے اس کے قائم کردہ قوانین اور جاری کردہ احکام میں بھی ماحول۔ رسم ورواج، قومیت، وطنیت، نسلیت اور لسانیت وغیرہ کے جذبہ کا لگاؤ ضروری ہے لیکن اللہ ہر جذبہ سے پاک ہے اس لئے اس کا بنایا ہوا قانون اور دیا ہوا حکم علم وعدل پر مبنی ہوتا ہے)۔

ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس کے حوالے سے لکھا ہے کہ عبداللہ بن ابی بن سلول مسلمان ہو گیا تھا لیکن پھر اس نے سوچا کہ میرے اور قبائل بنی قریظہ و بنی نضیر کے درمیان معاہدہ ہے اور ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف چکر چل جائے (اور یہودی غالب آجائیں) یہ سوچ کروہ اسلام سے پھر گیا اور کافر ہو گیا۔ حضرت عبادہ بن صامت نے فرمایا میں بنی قریظہ اور بنی نضیر کے معاہدہ سے اللہ کے سامنے اظہار بیزاری کرتا ہوں۔ اب میرا تعاون اللہ اللہ کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ ہے۔ اس پر آیت يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ اور اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ اور وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ نازل ہوئی۔

ابن اسحاق، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور بیہقی نے حضرت عبادہ بن صامت کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب بنی قینقاع کے یہودیوں میں باہم جنگ ہوئی تو (معاہدہ کے بموجب) عبداللہ بن ابی بن سلول انہی کے معاملہ میں الجھا رہا اور انہی کی طرف سے کھڑا ہو گیا لیکن عبادہ بن صامت رسول اللہ کی طرف آگئے اور عرض کیا کہ میں ان کے معاہدہ سے دست بردار ہوتا ہوں اور اللہ اور اس کے رسول کے سامنے اظہار بیزاری کرتا ہوں۔ آپ قبیلہ بنی عوف بن خزرج کے ایک فرد تھے (یعنی خزرجی تھے) اور آپ کا یہودیوں سے ایسا ہی معاہدہ تھا جیسا عبداللہ بن ابی کا تھا لیکن آپ نے کافروں کے تعاون ومدد سے اظہار بیزاری کر دیا۔ آپ کے اور عبداللہ بن ابی کے متعلق آیت ذیل کا نزول ہوا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ م اے ایمان والو یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ یعنی ان پر اعتماد نہ رکھو اور دوستوں کی ایسی معاشرت ان سے نہ رکھو۔[1]

بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ط وہ تو باہم ایک دوسرے کے دوست ہیں یعنی چونکہ سب کا مذہب ایک ہے اس لئے

---

[1] قاضی عیاض کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو حکم دیا کہ آپ نے جو کچھ لیا دیا ہو ایک چمڑے پر (لکھ کر) پیش کیجئے حضرت ابو موسیٰ کا کاتب عیسائی تھا، کاتب نے حساب پیش کیا حضرت عمرؓ نے تعجب کیا اور فرمایا یہ بڑی یادداشت رکھتا ہے۔ اچھا ہمارا ایک خط شام سے آیا ہے تم اس کو مسجد میں چل کر پڑھ دو، حضرت ابو موسیٰ نے فرمایا یہ مسجد میں نہیں جا سکتا، حضرت عمرؓ نے فرمایا کیا یہ جنب ہے، حضرت ابو موسیٰ نے کہا نہیں، عیسائی ہے، حضرت ابو موسیٰ کا بیان ہے کہ یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ نے میرے کچو کا مارا اور میری ران پر ضرب رسید کی اور فرمایا اس کو نکال دو پھر آیت لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اَوْلِيَآءَ تلاوت فرمائی۔ اخرجہ ابن ابی حاتم، والبیہقی فی شعب الایمان۔

آپس کی موالات اور تمہاری مخالفت وضرر رسانی پر سب متفق ہیں اس آیت میں دوستی کی ممانعت کی وجہ بیان فرمائی ہے۔

وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اور تم میں سے جو ان کا دوست ہے وہ حقیقت میں انہی میں سے ہے۔

یعنی عبداللہ بن ابی جو ان کا دوست ہے حقیقت میں کافر و منافق ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابو الحباب تم کو یہود کی دوستی سے عبادہ بن صامت پر جو کچھ ترجیح ملے گی وہ تمہارے لئے ہوگی عبادہ کے لئے نہیں ہوگی۔ ابن ابی نے کہا تو میں اس کو قبول بھی کرلوں گا۔

یہ بھی جائز ہے کہ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ سے مجازی معنی (یعنی فاسق ہونا) مراد ہو مطلب یہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں سے جو مسلمان دوستی کرے گا وہ فاسق ہوگا اور فاسق کافر کے مشابہ ہوتا ہے، فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ کہہ کر کلام میں زور پیدا کیا تاکہ ان کافروں سے اجتناب رکھنے کے حکم کی قوت کا اظہار ہو جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو مسلمان مشرکوں کے ساتھ رہتا ہو میں اس کا ذمہ دار نہیں (کہ لڑائی کے وقت مسلمانوں کا لشکر اس کو کافر سمجھ کر قتل کردے) طبرانی نے قابل وثوق سند سے حضرت خالد بن ولید کی روایت سے اور ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے حضرت جریر بن عبداللہ کی روایت سے اس کو نقل کیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ بلاشبہ اللہ ظالموں کو ہدایت یاب نہیں کرتا یعنی ان لوگوں کو ہدایت یاب نہیں کرتا جو کافروں سے دوستی کرکے خود اپنے اوپر بھی ظلم کرتے ہیں اور مسلمانوں کے دشمنوں سے تعاون کرکے مسلمانوں پر بھی ستم کرتے ہیں۔

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ اسی لئے تم ایسے لوگ کو کہ جن کے دلوں میں بیماری ہے دیکھتے ہو کہ دوڑ دوڑ کر ان میں گھستے ہیں، اس سے مراد عبداللہ بن ابی بن سلول اور اس کے منافق ساتھی ہیں جو یہودیوں سے موالات اور تعاون میں تیزی سے گھس رہے تھے يُسَارِعُوْنَ یا تریٰ کا دوسرا مفعول ہے اگر تریٰ کو بمعنی تعلمُ مانا جائے اور اگر تریٰ سے مراد آنکھوں سے دیکھنا ہو تو جملہ حالیہ ہے۔

يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ کہتے ہیں کہ ہم کو اندیشہ ہے کہ ہم پر کوئی حادثہ پڑ جائے یعنی زمانہ کی کوئی گردش آپڑے معاملہ الٹ جائے کافروں کے ہاتھ میں اقتدار پہنچ جائے اور محمد کا کام تکمیل کو نہ پہنچے اور مصیبت ہم پر پڑے، کذا قال ابن عباس، بعض اہل تفسیر نے آیت کے مطلب کی اس طرح تشریح کی ہے ہم کو اندیشہ ہے کہ زمانہ کی کوئی گردش پڑ جائے اور ہم کافروں سے مدد لینے کے ضرورت مند ہو جائیں یا خشک سالی آجائے اور کال پڑ جائے اس وقت یہ لوگ ہمیں غلہ نہیں دیں گے۔

ابن جریر اور ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ حضرت عبادہ بن صامت نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یہودیوں میں میرے ہم معاہدہ لوگوں کی تعداد بہت ہے مگر میں اللہ اور اس کے رسول کے سامنے ان کی دوستی سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں اور اللہ اور اس کے رسول سے موالات کرتا ہوں۔ اس پر ابن ابی نے کہا مجھے تو زمانہ کی گردشوں کا اندیشہ ہے میں اپنے ہم معاہدہ لوگوں کی دوستی سے دست بردار نہیں ہوسکتا۔ حضور ﷺ نے فرمایا ابو الحباب یہود کی دوستی سے جو تم کو عبادہ پر ترجیح حاصل ہوگی وہ تمہاری ہوگی، عبادہ کی نہ ہوگی ابن ابی نے کہا تو میں اس کو قبول کرلوں گا۔

فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ پس قریب امید ہے کہ اللہ فتح (سامنے) لے آئے، اَلْفَتْحُ سے مراد قتادہ اور مقاتل کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی نصرت کا فیصلہ کن حکم اور کلبی وسدی کے نزدیک فتح مکہ اور ضحاک کے نزدیک خیبر فدک اور دوسری یہودیوں بستیوں کی فتح ہے۔

اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ یا کوئی اور بات خاص اپنی طرف سے اس سے مراد ہے، منافقوں کے پوشیدہ راز ظاہر کر دینا اور ان کو قتل و رسوا کرنا یا بنی قریظہ کو قتل اور بنی نضیر کو جلاوطن کر دینا اور جزیرۂ عرب سے یہودیوں کی جڑ اکھاڑ دینا۔

فَیُصْبِحُوْا عَلٰی مَآ اَسَرُّوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِیْنَ ۝۵۲ پھر یہ منافق اپنے پوشیدہ دلی خیالات پر پشیمان ہوں گے۔ پوشیدہ دلی خیالات سے مراد ہے نفاق اور کافروں کی دوستی کا خیال، یعنی ان کو اپنے پوشیدہ خیالات پر پشیمانی ہوگی ان ظاہر اعمال کا توذکر ہی کیا ہے جن سے واضح طور پر ان کے نفاق کی نشان دہی ہوتی ہے۔

وَ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ اور مسلمان کہیں گے کہ کیا یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کی پختہ قسمیں کھاکر کہا تھا۔ بقول جملہ استینافیہ ہے مطلب یہ ہے کہ جب اللہ فتح سامنے لے آئے گا تو منافق اس وقت نادم ہوں گے اور مسلمان بطور تعجب کہیں گے...... جَهْدَ اَیْمَان سے مراد ہیں پختہ قسمیں۔ یہ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے یعنی یَجْتَهِدُوْنَ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ اور چونکہ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ جملہ حالیہ محذوف کا قائم مقام ہے اسی لئے (باوجود مفعول مطلق ہونے کے) اس کا معرفہ لانا درست ہے یا جَهْدَ اَیْمَان اور اَقْسَمُوْا کا معنوی اشتراک ہے، دونوں کا ایک ہی معنی ہے اس لئے جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ اَقْسَمُوْا کا مفعول مطلق ہے۔

اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ کہ ہم یقیناً تمہارے ساتھ ہیں یعنی مسلمان آپس میں بطور تعجب کہیں گے کہ کیا یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے قسمیں کھا کھا کر کہا تھا کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ ہیں یا اظہار مسرت کے طور پر مذکورہ بالا قول کہیں گے یا یہودیوں سے کہیں گے کہ انہی لوگوں نے پختہ قسمیں کھاکر کہا تھا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اگر تم کو نکالا گیا تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکل جائیں گے اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِیْنَ ۝۵۳ ان کی ساری کارروائیاں برباد گئیں اور دنیا و دین میں یہ ناکام ہوگئے۔ یہ آیت یا مومنون کا مقولہ ہے یا اللہ کا مقولہ ہے اللہ نے منافقوں کے اعمال کی بربادی اور ان کی نامرادی کی شہادت دی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ ۱ اے اہل ایمان تم میں سے جو اپنے دین

---

۱ قتادہ نے بیان کیا اللہ کو معلوم تھا کہ آئندہ کچھ لوگ مرتد ہو جائیں گے اس لئے اس آیت میں اس نے اطلاع دیدی، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوتے ہی عام عرب اسلام سے پھر گئے صرف تین مسجدوں والے مرتد نہیں ہوئے، مدینہ والے مکہ والے اور جواثا والے قبیلۂ عبدالقیس کے لوگ، مرتدوں نے کہا ہم نماز پڑھیں گے زکوٰۃ نہیں دیں گے ہمارا مال چھینا نہیں جا سکتا۔ حضرت ابو بکر سے اس سلسلہ میں گفتگو کی گئی کہ اس وقت آپ چشم پوشی کریں اور عرض کیا گیا کہ آئندہ جب ان میں دینی سمجھ آجائے گی تو زکوٰۃ دیدیں گے۔ حضرت ابو بکر نے فرمایا جن چیزوں کو اللہ نے جمع کیا میں ان میں تفریق نہیں کروں گا اگر اللہ اور اس کے رسول کی مقرر کردہ ایک رسی کے دینے سے بھی یہ انکار کریں گے تو میں ان سے جہاد کروں گا چنانچہ اللہ نے آپ کے ساتھ بھی کچھ جماعتیں کردیں یہاں تک کہ مرتدوں سے جنگ ہوئی ان کو قتل کیا گیا آخر ماعون یعنی زکوٰۃ ادا کرنے کا انہوں نے اقرار کیا، قتادہ نے کہا ہم آپس میں کہتے تھے کہ اس آیت کا نزول حضرت ابو بکر اور آپ کے ساتھیوں کے حق میں ہوا تھا، یعنی آیت فَسَوْفَ یَاتِیهم اللہ (یَاْتِیهم کی جگہ یَاْتِی قرآن مجید میں ہے، ہم۔ کا لفظ شاید زیادت کتابت کا نتیجہ ہو اور ممکن ہے حضرت قتادہ نے یوں ہی فرمایا ہو) بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗۤ۔ اخرجہ عبد بن حمید و ابن جریر و ابن المنذر و ابو الشیخ والبیہقی و ابن عساکر۔

صرف حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ میں مرتدوں سے جہاد کیا گیا صحابہ کی رائے شروع میں اس کے خلاف تھی اور حضرت ابو بکر کے خلاف انہوں نے ناگواری کا اظہار بھی کیا تھا لیکن آپ نے کسی کی ناگواری کی پرواہ نہیں کی، آخر صحابہ نے بھی آپ کی رائے کی تعریف کی، حضرت ابو موسیٰ اشعری کا بیان ہے میں نے رسول اللہ کے پاس آیت فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗۤ پڑھی تو حضور ﷺ نے فرمایا یہ لوگ اہل یمن میں سے ہیں اور اہل یمن میں سے بھی بنی کندہ میں سے اور بنی کندہ میں سے بھی قبیلہ سکون میں سے اور سکون میں سے قبیلہ تجیب میں سے۔

قاسم بن عمرہ کا بیان ہے میں حضرت عمر کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے مجھے مرحبا کہا پھر آیت مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ (بقیہ اگلے صفحہ)

اسلام سے (کفر کی جانب) پھر جائے گا، حسن بصری نے فرمایا اللہ کو معلوم تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد کچھ لوگ اسلام سے پھر جائیں گے اس لئے اس نے پہلے سے خبر دیدی کہ ایسا ہوگا۔

فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ تو اللہ آئندہ ایسے لوگ پیدا کردے گا جن میں اللہ کی محبت ہوگی اور ان کو اللہ سے محبت ہوگی یعنی مسلمانوں کی طرف سے مدافعت کے لئے تم میں سے ہی اللہ ایسے لوگوں کو پیدا کردے گا جو اللہ کے محبّ بھی ہوں گے اور محبوب بھی۔

اس قوم سے مراد کون سی قوم ہے اس کے متعلق اقوال میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد ہیں حسن، ضحاک اور قتادہ کے نزدیک حضرت ابوبکر اور آپ کے ساتھی مراد ہیں جنہوں نے مرتدوں اور زکوۃ دینے سے انکار کرنے والوں سے جہاد کیا تھا۔

اس کا واقعہ یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوتے ہی سوائے اہل مکہ اور اہل مدینہ اور بحرین کے قبیلہ عبدالقیس کے عام عرب مرتد ہوگئے اور بعض نے زکوۃ دینے سے انکار کردیا حضرت ابوبکر نے ان سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا مگر صحابہ کرام نے اس ارادہ کو پسند نہیں کیا حضرت عمرؓ نے فرمایا (یہ لوگ کلمہ گو ہیں) آپ ان سے کس طرح جہاد کرسکتے ہیں، رسول اللہؐ نے تو فرمایا ہے کہ مجھے لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم اس وقت تک ہے جب تک وہ لا الٰہ الا اللہ کے قائل نہ ہوجائیں جو لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہوگیا اس نے اپنی جان و مال کو مجھ سے محفوظ کرلیا اور اس کا (اندرونی) محاسبہ اللہ کا کام ہے ہاں کسی حق کی وجہ سے (اس کلمہ گو کے جان و مال سے) تعرض کیا جاسکتا ہے، حضرت ابوبکر نے فرمایا جو لوگ نماز اور زکوۃ (کی فرضیت) میں فرق پیدا کرتے ہیں خدا کی قسم میں ان سے جہاد کروں گا کیونکہ (جس طرح نماز جسمانی عبادت ہے اسی طرح) زکوۃ مالی فرض ہے خدا کی قسم اگر یہ لوگ بکری کا بچہ بھی رسول اللہ ﷺ کو دیتے تھے اور مجھے دینے سے انکار کریں گے تو میں اس پر ان سے جنگ کروں گا۔

حضرت انس کا بیان ہے کہ اداء زکوۃ سے انکار کرنے والوں سے جنگ کرنا صحابہ کو (شروع میں) پسند نہ تھا، ان کا قول تھا کہ یہ لوگ تو اہل قبلہ ہیں (اور اہل قبلہ سے جہاد نہیں کیا جاسکتا) لیکن جب ابوبکر گردن میں تلوار لٹکائے تنہا ہی نکل کھڑے ہوئے تو صحابہ کو بھی نکلے بغیر کوئی چارہ نہیں رہا۔

حضرت ابن مسعود کا بیان ہے، ہم کو شروع میں حضرت ابوبکر کا یہ فیصلہ پسند نہ تھا لیکن آخر میں ہم نے آپ کے خیال کی تعریف کی ابوبکر بن عیاش کا بیان ہے میں نے ابوحفص کو یہ کہتے سنا کہ انبیاء کے بعد حضرت ابوبکر سے افضل کوئی شخص پیدا نہیں ہوا، رسول اللہ ﷺ کے بعد آپ ہی مرتدوں سے جنگ کرنے کے لئے کھڑے ہوگئے، رسول اللہؐ کی زندگی ہی میں تین گروہ مرتد ہوگئے تھے (۱) بنی مذحج جن کا سردار ذوالحمار عبہلہ بن کعب عنسی تھا اس کا لقب اسود تھا یہ ایک شعبدہ باز کاہن تھا یمن میں اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور بلاد یمن پر قابض ہوگیا تھا رسول اللہؐ نے حضرت معاذ بن جبل (گورنر یمن) اور آپ کے ساتھی مسلمانوں کو لکھا کہ لوگوں کو مضبوطی کے ساتھ دین پر قائم رہنے کی ترغیب دیتے رہیں اور اسود سے لڑنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں، چنانچہ فیروز دیلمی نے (گھر میں گھس کر) اسود کو اس کے بستر پر ہی قتل کردیا۔ حضرت ابن عمر کا بیان ہے کہ قتل کی رات ہی آسمان سے رسول اللہ ﷺ کو اسود کے قتل ہونے کی خبر مل گئی اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ آج رات اسود کو قتل کردیا گیا اور مبارک شخص نے اس کو قتل کیا ہے عرض کیا گیا وہ کون ہے فرمایا فیروز، فیروز کامیاب ہوگیا۔ اس بشارت کو سنانے کے دوسرے روز حضور کی وفات ہوگئی اور مدینہ میں اسود کے قتل کی خبر (باضابطہ) ماہ ربیع الاول کے آخر میں پہنچی جبکہ حضرت اسامہ جہاد کے لئے جاچکے تھے سب سے اول حضرت ابوبکر کے پاس اسی فتح کی اطلاع آئی۔ (۲) بنی حنیفہ جن کا سردار مسیلمہ کذاب تھا، رسول

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) فَسَوْفَ يَأْتِي الخ تلاوت کی پھر میرے مونڈھے پر ہاتھ مار کر تین بار فرمایا میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اے اہل یمن وہ (محبّ محبوب قوم) تم میں سے ہوگی، اخرجہ البخاری فی تاریخہ۔

میں کہتا ہوں حضرت ابوبکر کے لشکر نے اہل یمن کی مدد سے مرتدوں سے جہاد کیا تھا (لہٰذا دونوں روایتیں صحیح ہیں)

اللہ ﷺ کی زندگی میں ہی دس ہجری کے آخر میں اس نے نبوت کا دعوی کر دیا تھا، اس کا خیال تھا کہ محمد کے ساتھ مجھے بھی نبوت میں شریک کر دیا گیا ہے چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اس نے مندرجہ ذیل خط بھی بھیجا تھا۔ مسیلمہ رسول خدا کی طرف سے محمد رسول اللہ کے نام۔ امابعد، یہ زمین آدھی میری اور آدھی آپ کی ہے، یہ خط دو آدمیوں کے ہاتھ حضور کی خدمت میں بھیجا، حضور ﷺ نے قاصدوں سے فرمایا اگر قاصدوں کو قتل نہ کرنے کا حکم نہ ہوتا تو میں تم دونوں کی گردنیں مار دیتا، پھر آپ نے جواب لکھوایا، محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مسیلمہ کذاب کے نام امابعد ساری زمین اللہ کی ہے اپنے بندوں میں سے وہ جس کو چاہتا ہے اس کا مالک بناتا ہے اور اچھا انجام پرہیزگاروں کا ہوتا ہے۔ پھر رسول اللہ بیمار ہو گئے اور آپ کی وفات ہو گئی تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کثیر لشکر کے ساتھ خالد بن ولید کو مسیلمہ سے لڑنے بھیجا آخر مطعم بن عدی کے غلام وحشی کے ہاتھوں سے مسیلمہ مارا گیا وحشی وہی شخص تھا جس نے حضرت حمزہ بن عبد المطلب کو شہید کیا تھا اور مسیلمہ کو قتل کرنے کے بعد کہا کرتا تھا میں نے مسلمان ہونے سے پہلے سب سے بہتر آدمی کو شہید کیا تھا اور مسلمان ہونے کے بعد بدترین آدمی کو قتل کر دیا۔

(۳) بنی اسدان کا سردار طلیحہ بن خویلد تھا، یہ مدعیان نبوت میں سب سے آخری شخص تھا جس نے مرتد ہو کر نبوت کا دعوٰی رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی میں کر دیا تھا لیکن اس سے جہاد حضور کی وفات کے بعد کیا گیا۔ حضرت ابو بکر نے خالد بن ولید کو اس کے مقابلہ کے لئے بھیجا حضرت خالد نے شدید جنگ کے بعد اس کو شکست دی یہ بھاگ کر شام کو چلا گیا پھر کچھ مدت کے بعد دوبارہ مسلمان ہو گیا اور اس کا اسلام خلوص کے ساتھ رہا۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں بہت لوگ مرتد ہو گئے تھے جن کو ہم سات فرقے کہہ سکتے ہیں۔

(۱) بنی فزارہ۔ یہ عیینہ بن حصین کا قبیلہ تھا

(۲) بنی غطفان۔ یہ قرہ بن سلمہ قشیری کا قبیلہ تھا

(۳) بنی سلیم۔ یہ فجاۃ بن عبدیالیل کا قبیلہ تھا

(۴) بنی یربوع۔ یہ مالک بن نویرہ کا کنبہ تھا

(۵) خاندان بنی تمیم کا کچھ حصہ، یہ قبیلہ شجاج بنت منذر زوجہ مسیلمہ کذاب کا تھا، شجاج نے بھی نبوت کا دعوی کیا تھا لیکن آخر میں مسلمان ہو گئی تھی۔

(٦) بنی کندہ یہ اشعث بن قیس کا خاندان تھا

(۷) بنی بکر بن وائل یہ بحرین کے باشندے اور حطیم کے قبیلہ والے تھے آخر کار حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں اللہ نے ان سب کا کام تمام کرادیا اور اپنے دین کو فتح یاب کر دیا۔

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ حضور ﷺ کی وفات ہوتے ہی عرب مرتد ہو گئے۔ اور نفاق ان کے دلوں میں جم گیا اور میرے باپ پر وہ مشکلات پڑیں کہ اگر مضبوط پہاڑوں پر پڑتیں تو ان کا بھی چورہ کر دیتیں۔

حضرت عمرؓ کی خلافت میں جبلہ بن ایہم کا قبیلہ غسان مرتد ہو گیا تھا یہ ارتداد اس وقت ہوا جب (شاہ غسان) جبلہ بن ایہم سے (ایک غریب آدمی کا) بدلہ لینے کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا تھا اور وہ عیسائی ہو کر ملک شام کو چلا گیا تھا، بعض علماء کے نزدیک قوم محبت و محبوب سے مراد اشعری قبیلہ کے لوگ ہیں عیاض بن غنم کا بیان ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابو موسی اشعری کی طرف اشارہ کر کے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کی قوم والے، رواہ ابن جریر فی السنن والطبرانی والحاکم، اشعری قبیلہ کے لوگ یمن کے باشندہ تھے۔

حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے پاس یمن والے آئے ہیں جن کے دل بڑے کمزور اور نرم ہیں۔ ایمان (تو) یمن کا ہے اور حکمت (بھی) یمن کی ہے متفق علیہ، کلبی نے کہا یہ یمن کے مختلف قبائل والے تھے

قبیلہ نخع کے دو ہزار افراد بنی کندہ اور عیلہ کے پانچ ہزار اور مختلف قبائل کے تین ہزار، ان سب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں قادسیہ کی جنگ میں اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ مسلمانوں پر مہربان، اَذِلَّۃٌ ذَلِیْلٌ کی جمع ہے ماضی ذَلَّ مضارع یَذِلُّ اور مصدر ذُلٌّ ذِلَّۃٌ ذُلَالَۃٌ ذَلَالَۃٌ اور مَذَلَّۃٌ ہے ذَلَّ بے عزت ہو گیا آسان ہو گیا، کذا فی القاموس ذلت اگر خود اپنی طرف سے بطور تواضع ہو تو قابل تعریف ہے اللہ نے فرمایا ہے وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ یعنی ماں باپ کے لئے عاجزی کے بازو بچھا دو، اگر کسی دوسرے کی طرف سے کسی کی ذلت ہو تو یہ عذاب ہے، اللہ نے فرمایا ہے تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ، ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ۔ ذلت کے مقابل عزت کا لفظ ہے یعنی غلبہ، عزیز وہ شخص جو غالب ہو مغلوب نہ ہو، عزت اگر خود ساختہ ہو تو قابل مذمت ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ کبھی مجازاً عزت بمعنی حمیت بھی مستعمل ہے اللہ نے فرمایا ہے، اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ، اگر عزت اللہ کی طرف سے ہو تو یہ نعمت اور کمال ہے اللہ نے فرمایا ہے وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ، دوسری آیت میں آیا ہے، مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے جو عزت اللہ کی طرف سے نہ ہو وہ ذلت ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے اَذِلَّۃٌ ذلیل کی جمع ہے ذَلُوْل کی جمع نہیں ہے ذَلُوْل کی جمع ذُلُلٌ ہے لیکن قاموس میں ہے ذلیل کی جمع ذِلال اور اَذِلَّاء اور اَذِلَّۃٌ ہے اور ذلول کی جمع ذُلُل اور اَذِلَّۃٌ ہے پس اَذِلَّۃٌ ذلیل اور ذلول دونوں کی جمع ہے۔

میں کہتا ہوں اگر اَذِلَّۃٌ کو ذلول کی جمع قرار دی جائے تو اس کا معنی ہو گا آسان سہل جو صَعْبٌ (دشوار) کی ضد ہے دونوں لفظوں (ذلیل وذلول) کا معنی قریب قریب ہے۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ وہ تواضع کرنے والے نرم خو مہربان اور آپس میں جھکاؤ رکھنے والے ہیں۔

قیاس لغوی کا تقاضا تھا کہ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ کی جگہ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ہوتا لیکن بجائے لام کے عَلٰی ذکر کیا گیا کیونکہ اَلْكَافِرِيْنَ کے ساتھ بھی عَلٰی آیا ہے مشاکلت کا تقاضا تھا کہ اَلْمُؤْمِنِيْنَ کے ساتھ بھی عَلٰی ذکر کیا جائے پھر اس امر پر تنبیہ کرنا بھی مقصود ہے کہ باوجودیکہ دوسرے مومنوں پر ان کو برتری حاصل ہے اور ان کا مرتبہ اونچا ہے لیکن مومنوں کے سامنے وہ جھکے رہتے ہیں یا یوں کہا جائے کہ لفظ ذلت اپنے اندر شفقت اور مہربانی کا مفہوم رکھتا ہے اور عطف (بمعنی مہربانی) کے بعد عَلٰی آتا ہے اس لئے اَذِلَّۃٍ کے بعد بھی عَلٰی کو ذکر کیا یا یوں کہا جائے کہ اَذِلَّۃٍ کا لفظ اَعِزَّۃٍ کے مقابل ذکر کیا ہے گویا اَذِلَّۃٍ کا معنی ہے غَیْرَ اَعِزَّۃٍ۔

اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ کافروں کے مقابلہ میں طاقتور یعنی کافروں کے مقابلہ میں طاقتور ہیں عاجزی وکمزوری ظاہر نہیں کرتے۔ اسی مضمون کی دوسری آیت بھی آئی ہے فرمایا ہے اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔

يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے۔

وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ اور (اللہ کے احکام کی تعمیل کرنے میں) کسی برا کہنے والے کے برا کہنے سے خوف زدہ نہیں ہوں گے (کسی ملامت گر کی ملامت کا اندیشہ نہیں کریں گے) یہ یُجَاهِدُوْنَ کی ضمیر سے حال ہے۔ اس صورت میں مطلب اس طرح ہو گا کہ وہ کافروں کی ملامت کا اندیشہ کئے بغیر جہاد کی ضمیر سے حال ہے۔ اس صورت میں مطلب اس طرح ہو گا کہ وہ کافروں کی ملامت کا اندیشہ کئے بغیر جہاد کریں گے منافقوں کی حالت اس کے خلاف تھی وہ مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ یا تو مال غنیمت کی طمع میں نکلتے تھے یا اس خیال سے نکلتے تھے کہ نہ نکلنے کی صورت میں ان کے نفاق کا اظہار ہو جائے گا لیکن اس کے ساتھ یہودی دوستوں کے برا کہنے کا اندیشہ لگا رہتا تھا اس لئے کوئی ایسا کام نہ کرتے تھے جس پر یہودی ان کو آئندہ ملامت کر سکیں۔ یا لَا يَخَافُوْنَ کا عطف یُجَاهِدُوْنَ پر ہے یعنی ان کے اندر دو وصف پائے جاتے ہیں ایک تو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں دوسرے دین میں بڑے ٹھوس ہیں دینی کام میں ان کو کسی کے برا کہنے کا اندیشہ نہیں، حضرت عبادہ بن صامت کا بیان

ہے ہم نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت ان شرطوں پر کی کہ حکم سنیں گے اور مانیں گے اور جہاں بھی ہوں گے حق بات کہیں گے اللہ کے معاملہ میں کسی برا کہنے والے کے برا کہنے کا اندیشہ نہیں کریں گے۔ متفق علیہ۔

لَوْمَةَ ایک بار ملامت کرنا۔ دونوں کو نکرہ لانے سے اس طرف اشارہ ہے کہ کسی ملامت گر کی کسی ایک ملامت کی بھی ان کو پرواہ نہ ہوگی۔

ذٰلِكَ یہ یعنی اللہ کا محب و محبوب ہونا مسلمانوں کے سامنے بچھ جانا، کافروں کے مقابلہ میں اظہار قوت کرنا، اللہ کی راہ میں جہاد کرنا کسی کی ملامت کی پروانہ کرنا اور قوم کے مرتد ہونے اور مسلمانوں کی ساکھ کم ہو جانے کے باوجود کسی کے برا کہنے سے نہ ڈرنا۔

فَضْلُ اللّٰهِ (ان پر) اللہ کی مہربانی ہے اور اس کی دین ہے

يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو دینا چاہتا ہے دیتا ہے پس جس کے اندر اوصاف مذکورہ میں سے کوئی صفت ہو اس کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے بر خود غلط نہ ہو جانا چاہئے کیونکہ یہ محض اللہ کی عنایت ہے خود آوردہ کچھ نہیں۔

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ اور اللہ بڑی وسعت والا ہے صوفیہ نے کہا اس کی وسعت بے کیف ہے تمام مظاہر میں اسی کے اوصاف کمالیہ پر تو انداز ہیں یا اللہ کے وسیع ہونے کا معنی ہے اس کے فضل و قدرت کا وسیع ہونا۔

عَلِيْمٌ ۝ وہ خوب جانتا ہے کہ اپنی قدرت کا استعمال کہاں کہاں کرے تقاضاء حکمت کے خلاف نہیں کرتا (یعنی اس کی قدرت اگرچہ نامحدود ہے مگر استعمال قدرت حکمت کے تحت ہے بغیر حکمت کے قدرت کا استعمال نہیں کرتا)۔

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا تمہارے دوست تو بس اللہ اور اس کا رسول اور اہل ایمان ہیں۔

اس کلام کا تعلق آیت لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ سے ہے درمیانی آیات نہی کی تاکید کے لئے ذکر کی گئی ہیں یا پچھلی آیات کو مستحقین دوستی کی تعین کے لئے بطور تمہید ذکر کیا ہے جیسے آیت فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ سے مستحق ولایت کی تعین ہو رہی ہے۔

اِنَّمَا کلمہ حصر ہے سابق کلام سے جو ممانعت مستفادہ ہو رہی ہے اس کی تاکید اس کلام سے ہوتی ہے کیونکہ بصرہ کے اہل نحو کے نزدیک اِنَّمَا سے نفی کا استفادہ ہوتا ہے۔

مسلمانوں کے دوست تین تھے اللہ رسول اور اہل ایمان اس کے باوجود اولیاء کی جگہ ولی۔ (بصیغہ مفرد) کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ حقیقت میں مستقل دوست تو ایک ہی ہے یعنی اللہ، باقی رسول اور اہل ایمان کا دوست ہونا تو وہ ذیلی ہے اور اللہ کی دوستی کی وجہ سے ہے۔

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ جو ٹھیک ٹھیک نماز پڑھتے اور زکوۃ ادا کرتے ہیں، یہ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوا کی صفت ہے یا بدل ہے یا محذوف مبتدا کی خبر ہے یا فعل محذوف کا مفعول ہے۔

وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝ (نمازیں پڑھتے ہیں) اور رکوع بھی کرتے ہیں، اس کا عطف اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ پر ہے یعنی ان کی نماز رکوع کے ساتھ ہوتی ہے، یہودیوں اور عیسائیوں کی نمازوں کی طرح بغیر رکوع کے نہیں ہوتی۔ یا رٰكِعُوْنَ کا معنی ہے خاشعون خاضعون یعنی وہ نماز و زکوۃ کی ادائیگی خشوع خضوع کے ساتھ کرتے ہیں۔ جوہری نے لکھا ہے رکوع کا استعمال کبھی عاجزی اور خضوع کے معنی میں بھی ہوتا ہے۔

یہ بھی جائز ہے کہ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ، جملہ حالیہ ہو اور يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ کی ضمیر سے حال ہو یعنی نماز کے رکوع کی حالت میں وہ زکوۃ ادا کرتے ہیں، طبرانی نے الاوسط میں مجہول راویوں کی سند سے حضرت عمار بن یاسر کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب ایک بار نفل نماز کے رکوع کی حالت میں تھے کہ ایک سائل آکھڑا ہوا آپ نے اسی حالت میں اپنی انگشتری اتار کر اس کو دیدی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ طبرانی کی (یہ روایت اگرچہ مجہول راویوں کی سند سے ہے لیکن) اس روایت کے

دوسرے شواہد بھی آئے ہیں۔ عبدالرزاق بن عبدالوہاب بن مجاہد نے اپنے باپ کی روایت سے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ آیت اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ حضرت علی بن ابی طالب کے حق میں نازل ہوئی، ابن مردویہ نے دوسری سند سے بھی حضرت ابن عباس کا یہ قول نقل کیا ہے اور حضرت علی کا بھی یہی قول بیان کیا ہے۔ ابن جریر نے مجاہد کی روایت سے اور ابن ابی حاتم نے سلمہ بن کہیل کی روایت سے بھی ایسا ہی بیان کیا ہے، ثعلبی نے حضرت ابوذر کی روایت سے اور حاکم نے علوم الحدیث میں خود حضرت علی کا قول اسی طرح لکھا ہے یہ تمام حضرت ابوذر کی روایت سے اور حاکم نے علوم الحدیث میں خود حضرت علی کا قول اسی طرح لکھا ہے، یہ تمام شواہد ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کی تائید کر رہا ہے۔

اس قصہ سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز کے اندر عمل قلیل کرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی اسی پر اجماع ہے اس قصہ سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ صدقہ نافلہ (خیرات) کو زکوۃ کہنا درست ہے اور آیت کا نزول اگرچہ حضرت علی کے حق میں ہوا مگر مورد کی خصوصیت حکم کے عموم سے مانع نہیں اعتبار خصوصیت مورد کا نہیں الفاظ کے عموم کا ہے اور صیغہ جمع کا استعمال اس کا قرینہ بھی ہے (کہ جو لوگ بھی ایسا کرتے ہوں ان کا یہی حکم ہے)۔

چونکہ دینے کا واقعہ رکوع کی حالت میں ہوا تھا اس لئے رکوع کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کر دیا ورنہ آیت کی مراد یہ ہے کہ سائل کے مانگنے کے بعد فوراً بلا تاخیر دیتے ہیں (رکوع میں یا قیام صلوۃ میں یا قعود میں یا کسی اور دنیوی دینی کام میں) رکوع کا ذکر بطور تمثیل ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ اگر روایت سے ثابت ہو جائے کہ یہ آیت حضرت علی کے متعلق نازل ہوئی تو صیغہ جمع کا استعمال دوسروں کو ترغیب دینے کے لئے ہے کہ وہ بھی حضرت علی کی طرح کریں اور اسی حکم میں شامل ہو جائیں۔

میں کہتا ہوں کہ آیت میں اگر حضرت علی مراد ہوں تو اس صورت میں لفظ اِنَّمَا سے جو حصر معلوم ہو رہا ہے وہ (حصر حقیقی نہ ہوگا کہ حضرت علی کے سوا تمام لوگ اس حکم سے خارج ہو جائیں بلکہ) اضافی ہوگا یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کے مقابل ہوگا ان کی نفی ہو جائے گی دوسرے مومنوں کی نفی نہ ہوگی، جیسے آیت وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ (میں حصر اضافی ہے)۔

بغوی نے لکھا ہے بعض روایات میں حضرت ابن عباس کی طرف اس قول کی نسبت کی گئی ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت عبادہ بن صامت اور عبداللہ بن ابی بن سلول کے متعلق ہوا جب حضرت عبادہ یہود کی دوستی سے دست بردار ہو گئے اور فرمایا میں اللہ، اللہ کے رسول اور مسلمانوں کا دوست ہوں تو انہی کے متعلق یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا سے اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الخ نازل ہوئی ان مومنوں سے مراد ہیں حضرت عبادہ اور دوسرے صحابہ کرام۔

بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ہماری قوم یعنی بنی قریظہ اور بنی نضیر نے تو ہم کو چھوڑ دیا اور ہم سے الگ ہو گئے اور قسم کھالی کہ ہمارے ساتھ نشست و برخواست نہیں رکھیں گے تو یہ آیت نازل ہوئی اس پر حضرت عبداللہ نے فرمایا ہم اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کی دوستی پر خوش ہیں، حبیر کی روایت ہے کہ آیت اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، کے سلسلہ میں ضحاک نے کہا یہ وہی مومن ہیں جن میں ہر ایک دوسرے کا دوست ہے۔

حضرت ابو جعفر محمد بن علی باقر نے فرمایا یہ آیت مومنوں کے متعلق نازل ہوئی، دریافت کیا گیا حضرت لوگ تو کہتے ہیں کہ اس کا نزول حضرت علی بن ابی طالب کے متعلق ہوا فرمایا وہ بھی مومنوں میں سے تھے، رواہ عبد بن حمید وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم وابو نعیم فی الحلیۃ۔

عکرمہ کا قول روایت میں آیا ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت ابو بکر کے متعلق ہوا، بغوی نے لکھا ہے (حضرت علی کے متعلق جو روایات آئی ہیں ان کو چھوڑ کر باقی) روایات کی روشنی میں راکعون سے مراد ہوں گے رات دن نفل نماز پڑھنے والے۔

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور جن کے دوست اللہ، اللہ کا رسول اور مومن ہوں (تو یہ اللہ کا گروہ ہوگا) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ان سے مراد مہاجر وانصار ہیں یعنی جو لوگ مہاجرین وانصار کی دوستی اختیار کریں گے۔

فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾ اور اللہ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے اصل میں فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ کی جگہ فَاِنَّهُمْ ہونا چاہئے (کیونکہ مرجع پہلے مذکور ہے) مگر غلبہ کو مدلل کرنے کے لئے لفظ حزب اللہ فرمایا (کہ یہ اللہ کا گروہ ہے) گویا یوں فرمایا کہ جو لوگ ان کے دوست ہوں گے وہ اللہ کا گروہ ہوں گے اور اللہ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے نتیجہ یہ نکلا کہ یہ ہی لوگ غالب آنے والے ہیں، پھر لفظ حزب اللہ میں ان اولیاء کی عظمت کا اظہار بلندی شان کا ذکر اور عزت بخشی کی صراحت بھی ہے اور جو لوگ اللہ رسول اور مومنوں کو چھوڑ کر دوسروں سے دوستی کرتے ہیں ان پر تعریض بھی ہے کہ وہ شیطان کا گروہ ہے۔

قاموس میں ہے حزب کا معنی ہے وظیفہ، گروہ، ہتھیار، جتھہ اور کسی شخص کے وہ ساتھی جو اس کے خیال پر ہوں میں کہتا ہوں یہی (آخری) معنی یہاں مراد ہے بیضاوی نے لکھا ہے کہ جو لوگ کسی نازل شدہ مصیبت (کو دور کرنے) کے لئے جمع ہو جائیں ان کو حزب کہا جاتا ہے، قاموس میں ہے حَزَبَهُ الْاَمْرُ اس پر مصیبت آپڑی۔

رافضی قائل ہیں کہ خلافت کا حصر صرف حضرت علی میں ہے اس قول پر استدلال روافض نے اس آیت سے کیا ہے اس جگہ ولی سے مراد ہے مسلمانوں کا ناظم اور امور انتظامیہ کا متولی پس اللہ نے اپنے لئے اور اپنے رسول کے لئے جس طرح ولایت کو ثابت کیا ہے اسی طرح علیؓ کو بھی مسلمانوں کا والی قرار دیا ہے اور لفظ اِنَّمَا کو حصر کے لئے ذکر کیا ہے (تاکہ مسلمانوں کا والی اللہ، اللہ کا رسول اور علی قرار پائیں کسی دوسرے کو یہ امتیازی وصف حاصل نہ ہو) اور چونکہ اللہ اور اللہ کے رسول کا والی ہونا عمومی ہے (تمام مسلمانوں کو حاوی ہے) اس لئے علیؓ کی ولایت بھی عمومی ہے بس علیؓ ہی امام ہیں آپ کے سوا کسی دوسرے کو خلیفہ ہونے کا حق نہیں، اس کی تائید براء بن عازب اور زید بن ارقم کی روایت سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ (مقام) خم کے تالاب پر فروکش ہوئے تو علیؓ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ میں مومنوں کا والی خود ان کی ذات سے بھی زیادہ ہوں صحابہ نے عرض کیا بیشک ایسا ہی ہے حضور ﷺ نے فرمایا اے اللہ جس کا میں مولی ہوں اس کا علیؓ بھی مولی ہے، اے اللہ جو علی کا دوست ہو تو بھی اس سے دوستی رکھ اور جو علی کا دشمن ہو تو بھی اس کا دشمن ہو جا۔

اس واقعہ کے بعد عمرؓ کی ملاقات علیؓ سے ہوئی تو عمرؓ نے کہا اے ابن ابی طالب تم کو مبارک ہو تم شبانہ روز (ہر وقت) ہر مومن مرد وعورت کے مولی ہو گئے۔ رواہ احمد وغیرہ

یہ حدیث حد تواتر تک پہنچ چکی ہے تقریباً تیس صحابیوں کی روایت سے محدثین کی ایک جماعت نے صحاح سنن اور مسندوں میں اس کا ذکر کیا ہے علی بن ابی طالب، بریدہ بن حصیب، ابو ایوب عمرو بن مرہ، ابوہریرہ، ابن عباس، عمار بن بریدہ، سعد بن وقاص، عبداللہ بن عمر، انس بن مالک، جریر بن مالک بن حویرث، ابو سعید خدری، طلحہ، ابو الطفیل، حذیفہ بن اسید اور بکثرت دوسرے صحابہ نے اس کو بیان کیا ہے بعض روایات کے الفاظ اس طرح ہیں میں جس کا والی اس کی جان سے زیادہ ہوں علیؓ بھی اس کا ولی (والی) ہے۔

غدیر خم کی یہ حدیث واضح طور پر علیؓ کی خلافت کو ثابت کر رہی ہے، عمران بن حصین راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا علیؓ مجھ سے ہے اور میں علیؓ سے علیؓ ہر مومن کا ولی (والی) ہے رواہ الترمذی وابن ابی شیبۃ۔ یہ دونوں حدیثیں آیت مذکورہ سے بھی زیادہ علیؓ کی خلافت پر واضح طور سے دلالت کر رہی ہیں کیونکہ آیت کا نزول اگر علیؓ کے لئے قرار دیا جائے تب بھی تمام مومنوں کو حکم ولایت شامل ہے اور دونوں حدیثوں میں تو علیؓ کی خصوصی ولایت کی صراحت ہے (کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہو سکتا)۔

ہم کہتے ہیں کہ آیت اور حدیثوں سے سوائے حضرت علیؓ کے دوسروں کی خلافت کی نفی پر دلیل لانی غلط ہے، کیونکہ صاحب قاموس نے لکھا وَلِیَ وَلْیًا سے اسم (صفت) ہے وَلِی کا معنی ہے، محب دوست، مددگار، جوہری نے صحاح میں لکھا ہے

ولاء اور توالی دو یا زیادہ چیزوں کا اس طرح ہو جانا کہ ان کے درمیان بیگانگی نہ رہے، مجازاً اس کا اطلاق قرب مکانی، قرابت نسبی، قرابت دینی، قرب دوستی، قرب مدد، قرب عقیدہ اور آقائیت پر ہوتا ہے اور ناظم امور (متولی انتظام) ہونے پر بھی ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے مولی کا معنی ہے مالک، غلام، آزاد کرنے والا، آزاد کیا ہوا، ساتھی قرابتدار، جیسے چچا کا بیٹا، بہن کا بیٹا، ہمسایہ، معاہد، مہمان، شریک، رب، ولی، مددگار، نعمت دینے والا، انعام یافتہ، محب، تابع، دوست، قرآن میں یہ لفظ آیا ہے بندہ کی خدا سے جو نسبت محبت و قربت ہوتی ہے اس کو ولایت کہتے ہیں اور ولی کا اطلاق بندہ پر بھی ہوتا ہے جیسے کسی کو ولی اللہ کہا جاتا ہے اور اللہ پر بھی ہوتا ہے آیت میں آیا ہے اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قرآن میں مولی کا اطلاق اللہ پر آیا ہے، فرمایا ہے نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ نیز جبرئیل اور نیک مومنوں پر بھی آیا ہے، فرمایا ہے اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ مَوْلٰہُ وَجِبْرِیْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔

خلاصہ یہ کہ یہ آیت اور یہ احادیث تعین کے ساتھ حضرت علیؓ کی خلافت پر ہی دلالت نہیں کرتیں دوسروں کی خلافت کی نفی تو بجائے خود رہی ہاں آیت سے حضرت علیؓ کا مستحق محبت ہونا اور احادیث سے حضرت علیؓ کی محبت کا واجب ہونا اور آپ کی دشمنی کا حرام ہونا ضرور ثابت ہو رہا ہے جس طرح آیت سے یہودیوں اور عیسائیوں سے دوستی اور موالات رکھنے کی حرمت معلوم ہو رہی ہے۔

ابو نعیم مدائنی کا بیان ہے کہ جب حسن مثنی بن امام حسن مجتبی سے کہا گیا کہ حدیث من کنت مولاہ میں حضرت علیؓ کی خلافت کی صراحت ہے تو فرمایا سنو خدا کی قسم اگر رسول اللہ ﷺ کی یہ مراد ہوتی تو آپ ﷺ بالکل واضح طور پر بیان فرما دیتے حضور ﷺ مسلمانوں سے تو سب سے واضح کلام فرمایا کرتے تھے، غدیر خم میں رسول اللہ کی اس تقریر کا باعث یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو امیر لشکر بنا کر یمن کو بھیجا حضرت علیؓ نے خمس کے مال میں سے ایک باندی لے لی اس کی شکایت بعض لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے کی، حضور ﷺ اس شکایت کو سن کر غضب ناک ہو گئے اور فرمایا تم ایسے شخص سے کیا چاہتے ہو جو اللہ اور اللہ کے رسول سے محبت رکھتا ہے اور اللہ اور اللہ کا رسول بھی اس سے محبت رکھتے ہیں، پھر آپ ﷺ نے یہ خطبہ دیا تاکہ حضرت علیؓ کی محبت مسلمانوں کے دلوں میں جم جائے اور ان کی شکایت دور ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس خطبہ میں جو یہ فرمایا ہے اَلَسْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اَنِّیْ اَوْلٰی بِکُلِّ مُؤْمِنٍ اس سے مسلمانوں کو متنبہ کرنا مقصود ہے کہ علیؓ کی محبت کا جو میں تم کو حکم دے رہا ہوں اس کی تعمیل تم پر واجب ہے اسی طرح آخر کلام میں جو حضور ﷺ نے دعا کی ہے اس کی غرض بھی علیؓ کی محبت کی تاکید ہے۔

یہ آیت دو طرح سے رافضیوں کے مذہب کی تردید کر رہی ہے۔

(۱) رافضیوں کے مذہب کی بناء تقیہ پر ہے مگر آیت اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکَافِرِیْنَ یُجَاہِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَائِمٍ تقیہ کی تردید کر رہی ہے (اس میں تعریف ان لوگوں کی گئی ہے جو علی الاعلان ڈنکے کی چوٹ جہاد کرتے ہوں اور کسی کے برا کہنے سے نہیں ڈرتے ہوں) حضرت علیؓ نے تینوں خلفاء کی بیعت کی اور تینوں کے ساتھ مل کر ۲۴ برس تک نمازیں پڑھیں اور جہاد کئے اور حضرت عمرؓ سے اپنی صاحبزادی کا نکاح کر لیا کیا سب کچھ تقیہ کے ساتھ لوگوں کے دباؤ کے زیر اثر تھا اگر ایسا تھا تو پھر آپ کا شمول اس آیت کے حکم میں نہ ہوگا، اس قول کے کہنے کی جرات سوائے رافضیوں کے کوئی سنی تو کر نہیں سکتا۔

(۲) آیت فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ہُمُ الْغَالِبُوْنَ، بتا رہی کہ صرف اہل سنت کا فرقہ ہی فرقۂ ناجیہ ہے رافضی یا کوئی دوسرا بدعتی فرقہ نجات یافتہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ہمیشہ اہل سنت غالب رہے ہیں بلکہ رافضی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ حضرت علی نے محض تقیہ کے ساتھ دباؤ کے زیر اثر خلفاء ثلاثہ کا ساتھ دیا اور آپ کے بعد دوسرے اماموں نے خوف کی وجہ سے اپنے دین کا اظہار نہیں کیا اور اپنے ساتھیوں کی پوشیدہ طور پر دین کی تعلیم دیتے رہے اور پوشیدہ رکھنے کا ہی حکم دیتے رہے اور برابر کہتے رہے

دیکھو دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں بہت ہی اخفاء سے کام لینا چاہئے، امام باقر اور امام جعفر صادق کی طرف یہ لوگ ایسے ہی اقوال کی نسبت کرتے ہیں جو ان کی کتابوں میں موجود ہیں یہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت صاحب الامر (امام مہدی) سامرہ کے تہ خانہ میں ہزار برس سے چھپے ہوئے ہیں۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ رفاعہ بن زید بن تابوت اور سوید بن حارث بظاہر مسلمان ہو گئے تھے مگر باطن میں کافر تھے مسلمان دونوں کو دوست سمجھنے لگے تھے اس پر مندرجہ ذیل آیت کا نزول ہوا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ الْكُفَّارَ اَوْلِیَآءَ ۚ اے ایمان والو ان لوگوں کو دوست نہ بناؤ جنہوں نے تمہارے دین کو مذاق اور کھیل بنا رکھا ہے (خواہ وہ) ان لوگوں میں سے ہوں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی (یعنی یہود) یا دوسرے کافر ہوں، کیوں کہ وہ دل میں کافر ہیں ایمان کو ظاہر کرتے ہیں۔ ممانعت موالات کو استہزاء پر مبنی کرنا بتا رہا ہے کہ ممانعت کی علت استہزاء ہے اور اس امر پر تنبیہ ہے کہ ان کے استہزاء کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان سے دشمنی کی جائے دوستی کا کیا ذکر۔

هُزُوًا اور لَعِبًا اسم مفعول کے معنی میں ہے یعنی مسخرہ اور کھلونا۔ اَلْكُفَّارَ سے مراد مشرک ہیں، حضرت ابن مسعود کی قرأت میں آیا ہے وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا۔ اس قرأت سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ کفار سے مراد مشرک ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ اَلْكُفَّارَ سے مراد دونوں گروہ ہوں مشرک بھی اور اہل کتاب بھی اس صورت میں یہ تخصیص کے بعد تعمیم ہوگی، اور اس امر کی طرف اشارہ ہوگا کہ استہزاء ہو یا کفر دونوں کا تقاضا ہے کہ موالات نہ کی جائے دشمنی رکھی جائے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۵۷﴾ اور اللہ سے ڈرتے رہو اگر تم مومن ہو یعنی ممنوعات کو ترک کر دو۔ اِنْ كُنْتُمْ شرط ہے اس کو جزاء کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ کلام سابق سے خود جزا کا مفہوم معلوم ہو رہا ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ پر اور اس کے وعد و وعید پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ممنوعات سے پرہیز رکھو۔

کلبی نے کہا کہ جب رسول اللہ ﷺ کا موذن نماز کی اذان دیتا اور لوگ نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے تو یہودی مذاق سے کہتے کھڑے ہو گئے نہیں کھڑے ہوئے نماز پڑھی نہیں پڑھی یہ کہہ کر ہنستے اس پر اللہ نے آیت ذیل نازل کی۔

وَاِذَا نَادَیْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا ؕ اور جب تم نماز کے لئے اذان دیتے ہو تو وہ نماز کا مذاق اور کھیل بناتے ہیں۔

اتَّخَذُوْهَا کی ضمیر نماز کی طرف راجع ہے یا نداء کی طرف۔ اِذَا نَادَیْتُمْ کا عطف اتَّخَذُوْا پر ہے یعنی ایسے لوگوں کو دوست نہ بناؤ جو تمہاری نماز کا مذاق اڑاتے اور کھیل بناتے ہیں۔

ابن ابی حاتم نے سدی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ مدینہ میں ایک عیسائی تھا جب مؤذن کو اشہد ان محمدا رسول اللہ کہتے سنتا تو کہتا اللہ جھوٹے کو جلادے ایک رات اس کا خادم آگ لے کر آیا نصرانی اور اس کی بیوی سو رہے تھے اتفاق سے آگ کی ایک چنگاری اڑ کر عیسائی پر جا پڑی جس سے وہ خود بھی جل گیا اور اس کی بیوی بھی۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ کفار جب اذان سنتے تو جل جاتے ایک بار رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر انہوں نے عرض کیا محمد تم نے ایک ایسی بدعت نکالی ہے کہ تم سے پہلے کسی امت میں اس کی نظیر کہیں سننے میں نہیں آئی اگر تم نبوت کے مدعی ہو تو اس بدعت کو ایجاد کر کے تم نے گزشتہ انبیاء کی کیوں مخالفت کی اگر اس میں کوئی بھلائی ہوتی تو انبیاء اس بھلائی کے زیادہ مستحق تھے انہوں نے ایسا کیوں نہیں کیا، یہ مینڈھے کی طرح چیخنا تم نے کہاں سے سیکھا کیسی بری آواز ہوتی ہے اور یہ کام کتنا قبیح ہے اس پر آیت وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا نازل ہوئی اور یہ آیت بھی اتری۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾ یہ (حق سے استہزاء) اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ سمجھتے نہیں ہیں۔ کیونکہ عقل کا تقاضا تو یہ تھا کہ استہزاء نہ کرتے اور کسی چیز کی اچھائی برائی پر غور کرتے۔

یہ آیت بتارہی ہے کہ کافروں میں دینی سمجھ نہیں ہوتی خواہ دنیا کے معاملات میں کتنے ہی ہوشیار ہوں اس سے معلوم ہوا کہ عقل وحواس سے سوچنا اور انجان چیزوں پر غور کرنا۔ حصول علم کی علت موجبہ نہیں (اگرچہ فلاسفہ صحیح غور وفکر کو حصول علم کا لازمی سبب قرار دیتے ہیں) بلکہ اللہ کا قانون اور دستور ہے کہ اگر آدمی صحیح غور وفکر کرتا ہے تو خدا تعالیٰ انجان چیز کا علم عطا کر دیتا ہے (تو گویا غور وفکر اور نتیجہ کے درمیان اصل چیز اللہ کی مشیت ہے)۔

ابن جریر نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس نے بیان کیا کہ کچھ یہودی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے حاضر ہونے والوں میں ابویاسر بن اخطب، رافع بن ابی رافع اور عاری بن عمرو بھی تھے) ان لوگوں نے حضور ﷺ سے دریافت کیا۔ آپ کا ایمان کن کن پیغمبروں پر ہے (یعنی آپ کس کس کو پیغمبر مانتے ہیں) حضور ﷺ نے فرمایا میں ایمان رکھتا ہوں اللہ پر اور جو کچھ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل ہوا اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور جو کچھ (دوسرے) انبیاءؑ کو اللہ کی طرف سے عطا کیا گیا سب پر میرا ایمان ہے۔ ہم ان میں سے کسی ایک کی بھی تفریق نہیں کرتے (کہ بعض کو سچا جانیں اور بعض کو جھوٹا) ہم تو اللہ کے فرماں بردار ہیں۔ عیسیٰ کا نام سن کر یہودیوں نے عیسیٰ کو پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا اور بولے ہم نہ عیسیٰ کو مانتے ہیں نہ اس کو جو عیسیٰ کو (پیغمبر) مانتا ہے۔

دوسری روایت میں آیا ہے کہ یہودیوں نے کہا خدا کی قسم تم لوگوں سے زیادہ دنیا و دین میں کوئی دوسرا کم نصیب اور تمہارے دین سے زیادہ برا دین ہمارے علم میں بھی نہیں آیا۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ

آپ کہہ دیں اے اہل کتاب کیا تم کو ہماری یہ بات بری لگتی ہے کہ ہم اللہ کو اور اس کتاب کو جو ہمارے پاس بھیجی گئی اور ان کتابوں کو جو اس سے پہلے نازل کی گئیں مانتے ہیں، استفہام انکاری ہے یعنی ہمارا یہ ایمان تم کو برا نہ لگنا چاہئے اس کی خوبی تو کھلی ہوئی ہے۔

نقمۃ، براعیب، انتقام برائی کا بدلہ، تَنْقِمُوْنَ تم برا جانتے ہو، عیب دار سمجھتے ہو مکروہ قرار دیتے ہو، مِنَّا ہم سے یعنی ہمارے کردار اور اطوار میں سے۔

وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۵۹﴾ اور یقیناً تم میں سے اکثر کافر ہیں۔

واو حالیہ ہے اور پورا جملہ تَنْقِمُوْنَ کی ضمیر سے حال ہے، مطلب یہ کہ تم میں سے اکثر کافر ہیں۔ آسمانی کتابوں کے منکر ہیں اور ہمارے اوصاف تمہارے اوصاف سے اچھے ہیں ہم آسمانی کتابوں کا اقرار کرتے ہیں، تم اچھی بات کو برا سمجھتے ہو اور بری بات کو برا نہیں جانتے یا واؤ عاطفہ ہے اٰمَنَّا پر عطف ہے یعنی تم کو ہماری یہ بات بری لگتی ہے کہ ہم تمہارے مخالف ہیں ہم مومن ہیں اور تم ایمان سے خارج (اس جملہ کی ترکیب و ترتیب حضرت مؤلف نے بعض دوسری وجوہ سے بیان کی ہے لیکن معنی میں زیادہ فرق پیدا نہیں ہوتا اس لئے ہم نے چند سطروں کا اس جگہ ترجمہ چھوڑ دینا مناسب سمجھا) یا واؤ بمعنی مع ہے یعنی تم ہمارے ایمان لانے کو برا سمجھتے ہو باوجودیکہ خود تم میں سے اکثر کافر ہیں۔

......ایک شبہ

عام اہل نحو کے نزدیک مفعول معہ کے لئے مصاحبت ضروری ہے اس لئے آیت مذکورہ میں واؤ بمعنی مع نہیں ہو سکتا ہاں اخفش کے نزدیک چونکہ مقارنت وجود کافی ہے اس لئے مذکورہ جملہ کو مفعول معہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

جواب:۔ جمہور کے نزدیک مفعول معہ ہونے کے لئے بے شک مصاحبت شرط ہے لیکن ہر واؤ جو بمعنی مع ہو اس کے مدخول کا مفعول معہ ہونا تو ضروری نہیں پھر مفعول معہ ہونے کی شرط ہر اس واؤ میں جو بمعنی مع ہو کیسے لاگو ہو سکتی ہے۔

جملہ مذکورہ محل جر میں بھی ہو سکتا ہے اس وقت مطلب اس طرح ہوگا چونکہ ہمارا ایمان اللہ پر اور اللہ کی کتابوں پر اور

تمہاری اکثریت کے کافر ہونے پر ہے، ہماری یہ ہی بات تم کو بری لگتی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ تنقمون کی علت ہو مطلب یوں ہوگا ہماری کسی بات کو تم اور کسی وجہ سے برا نہیں جانتے صرف اس وجہ سے برا جانتے ہو کہ ہم مومن ہیں اور تم میں سے اکثر کافر ہیں۔

قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوبَةً عِنْدَ اللّٰهِ (اے محمد ان یہودیوں سے) آپ کہہ دیں کہ میں تم کو ایسا طریقہ بتاؤں جو پاداش ملنے میں اس طریقہ سے (جس کو تم معیوب اور برا سمجھتے ہو) زیادہ برا ہے۔

مثوبۃ اور عقوبت، پاداش عمل اول اچھی پاداش کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسرا بری پاداش کے ساتھ لیکن اس جگہ بجائے عقوبت کے لفظ مثوبت کا استعمال بطور استہزاء ہے جیسے دوسری آیت میں آیا ہے بَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو (عذاب کی خبر تکلیف دہ ہوتی ہے بشارت نہیں ہوتی لیکن بشارت کا استعمال بطور استہزاء کیا گیا ہے)۔

بغوی نے لکھا ہے کہ ایمان باللہ و بالرسل اگرچہ بری بات قطعاً نہیں ہے لیکن یہودیوں نے چونکہ کہا تھا کہ ہم نے دنیا و دین میں کم نصیب تم سے بڑھ کر نہیں دیکھا اور نہ کسی مذہب کو تمہارے مذہب سے زیادہ برا پایا ان کی تردید میں یہ آیت نازل ہوئی اور فرمایا جس کو تم برا قرار دیتے ہو، اس سے بھی برا، ان لوگوں کا طریقہ ہے الخ یہی اسلوب ادا دوسری آیت میں اختیار کیا ہے فرمایا ہے أَ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمُ النَّارُ۔

مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ
یہ ان لوگوں کا طریقہ ہے جن پر اللہ نے لعنت کی اور غضب نازل کیا، اور ان میں سے (بعض کو) بندر اور (بعض کو) سور بنا دیا اور انہوں نے شیطان کی پوجا کی ۔عَبَدَ ماضی کا صیغہ ہے اَلطَّاغُوتَ مفعول ہے اس کا عطف لَعَنَہٗ پر ہے اَلطَّاغُوتَ سے مراد یا بچھڑا ہے شیطان کی تعبیر بچھڑے سے بطور مجاز کی گئی ہے معبودیت باطلہ کی صفت میں دونوں شریک ہیں یا شیطان ہی مراد ہے کیونکہ شیطانی اغوا سے ہی انہوں نے بچھڑے کی پوجا کی تھی، بعض علماء کا قول ہے کہ اس سے مراد کاہن اور وہ سب مقتداء ہیں جن کے احکام پر وہ گناہوں کے معاملہ میں بھی چلتے تھے۔

أُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا ایسے لوگ بدترین مقام والے ہیں یعنی ہر برے سے برے ہیں بدترین مقام والے کہنے میں ان کے برے ہونے کا پر قوت اظہار ہے۔

وَّأَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيلِ ﴿۶۰﴾ اور راہ راست سے بھی بالکل بھٹکے ہوئے ہیں۔

وَإِذَا جَآءُوكُمْ قَالُوٓا اٰمَنَّا اور (منافق) جب آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم آپ پر ایمان لے آئے (حالانکہ دلوں میں کفر کو چھپائے ہوتے ہیں)۔

وَقَدْ دَّخَلُوا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوا بِهٖ بادجودیکہ کفر لے کر آئے تھے اور کفر لے کر ہی نکلے یعنی اٰمَنَّا بک جھوٹ کہتے ہیں جس طرح کافر آئے تھے ویسے ہی آپ کے پاس سے گئے آپ کی نصیحت کا کوئی اثر نہیں لیا۔

وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا يَكْتُمُونَ ﴿۶۱﴾ اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ چھپائے رکھتے ہیں، اس آیت میں دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب کی منافقوں کو دھمکی ہے۔

وَتَرٰى كَثِيرًا مِّنْهُمْ اور ان (یہودیوں یا منافقوں) میں سے آپ بہتوں کو دیکھیں گے۔

يُسَارِعُونَ فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ تیزی کے ساتھ گھستے ہوئے گناہ اور ظلم اور حرام خوری میں ۔ بعض علماء کے نزدیک اثم سے مراد گناہ اور عدوان سے مراد ظلم ہے (جیسا ہم نے ترجمہ کیا ہے) اور بعض علماء کے نزدیک اثم سے مراد ہے توریت کی بعض آیات کو چھپانا اور عدوان سے مراد ہے توریت میں کچھ اپنی طرف سے بڑھانا۔ حرامی خوری کا خصوصیت کے ساتھ ذکر اس لئے کیا کہ وہ رشوتیں کھا کر رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے سے روکتے،

تحریف توریت پر آمادہ کرتے اور اللہ پر دروغ تراشی کرتے تھے ۔ یہ وصف خصوصیت کے ساتھ قابل مذمت تھا۔
لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٦٢﴾ بلاشبہ ان کے یہ اعمال برے ہیں پہلے ان کی بداعتقادی کو ظاہر کیا اور اس آیت میں بداعمال کا ذکر کیا تاکہ ان کے منافق ہونے کا ثبوت واضح ہو جائے۔
لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ط مشائخ اور علماء ان کو گناہ کی باتیں کہنے (یعنی جھوٹ کہنے) اور حرام کھانے سے کیوں منع نہیں کرتے، اس آیت میں مشائخ و علماء کو سخت زجر ہے کیونکہ ان کا فرض تو یہ تھا کہ دوسروں کو برائی سے روکیں بجائے روکنے کے وہ برائی کا حکم دیتے بلکہ خود بھی کرتے تھے، بعض اہل تفسیر کے نزدیک الربانیون سے علماء نصاریٰ اور احبار سے علماء یہود مراد ہیں۔
لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُوْنَ ﴿٦٣﴾ یقیناً ان کی یہ بری عادت ہے يَعْمَلُوْنَ سے يَصْنَعُوْنَ میں زیادہ زور اور بلاغت ہے کیونکہ صنع کا معنی ہے مشاق ہو جانے اور عادی بن جانے کے بعد کسی کام کا کرنا (گویا گناہ کرنے کی ان کی عادت اور مشق ہو گئی ہے) اسی لئے يَصْنَعُوْنَ کے لفظ سے خواص کی مذمت فرمائی۔
صاحب مدارک نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا قرآن میں یہ شدید ترین آیت ہے کہ برائی سے باز داشت نہ کرنے والے کو مرتکب گناہ کی طرح وعید کی گئی ہے بلکہ برائی سے نہ روکنے والوں کو دھمکی زیادہ قوت کی حامل ہے۔
بیضاوی نے لکھا ہے کہ بھلائی کو ترک کرنا گناہ کرنے سے زیادہ برا ہے کیونکہ معصیت میں تو نفس کے لئے لذت ہوتی ہے طبیعت کا جھکاؤ ہوتا ہے لیکن بھلائی کے ترک میں نہ لذت ہوتی ہے نہ میلان طبع اس لئے بھلائی کا ترک زیادہ مذمت کے قابل ہے۔
وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ط اور یہودیوں نے کہا اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے حضرت ابن عباس، عکرمہ، ضحاک اور قتادہ نے کہا کہ یہودی بڑے مال دار، فراخ دست اور دولت مند تھے لیکن جب انہوں نے اللہ کی نافرمانی اور رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کی تو اللہ نے جو فراخی اور کشائش ان کو عطا فرمائی تھی تنگی سے بدل دی اس وقت انہوں نے اللہ کو بخیل کہنا شروع کر دیا اور بنی قینقاع کے سردار فنحاص بن عازورا نے کہا اللہ کا ہاتھ تو رزق دینے سے بندھ گیا۔ ابوالشیخ ابن حبان نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس کا یہ قول نقل کیا ہے لیکن طبرانی نے حضرت ابن عباس کا بیان اس طرح نقل کیا ہے کہ ایک یہودی نے جس کو نباش بن قیس کہا جاتا تھا کہا کہ تیرا رب بخیل ہے کچھ دیتا نہیں۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی بعض علماء نے لکھا ہے کہ قول مذکورہ کا قائل فنحاص یا نباش تھا لیکن دوسرے لوگوں نے چونکہ اس کو منع نہیں کیا اور وہ بھی اس قول پر راضی رہے تو اللہ نے اس قول میں ان کو شریک قرار دیا اور اس بات کی نسبت سب کی طرف کر دی۔
ہاتھ باندھنے اور کھلنے سے مراد ہوتا ہے بخل اور سخاوت کرنا۔ دوسری آیت میں آیا ہے وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ۔
غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا م انہی کے ہاتھ بندھ گئے اور اس کہنے کی وجہ سے ان پر پھٹکار پڑی غلت یا تو بددعا کے طور پر فرمایا اس وقت ترجمہ اس طرح ہوگا انہی کے ہاتھ بندھ جائیں یعنی یہ مفلس محتاج ہو جائیں یا ہاتھ بندھنے سے حقیقتاً ہاتھ بندھ جانا مراد ہے یعنی دنیا میں ہتھکڑیاں پہننا قید ہو جانا یا دوزخ کے اندر طوق و زنجیروں سے جکڑا جانا۔

وقف لازم

بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ق (اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا نہیں) بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں اللہ کا ہاتھ ہونا بھی دیکھنے اور سننے کی طرح اللہ کی ایک مخصوص صفت ہے جس کی حقیقت کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا ہم پر اس کو ماننا اور ایمان لانا فرض ہے لیکن انسانی ہاتھ پر اس کو قیاس نہ کرنا چاہئے۔ انسانی ہاتھ کی ہر حالت اور کیفیت سے وہ پاک ہے۔ اہل سنت کے تمام ائمہ سلف کا قول ہے کہ ان صفات کا جس طرح ذکر آیا ہے اسی کو مانا جائے اور کسی کیفیت کا بیان نہ کیا جائے۔
حضرت عمرو بن عنبسہ کا بیان ہے میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا حضور ﷺ فرما رہے تھے رحمن کے دائیں ہاتھ کی

طرف، اور اس کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں ۔ کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو نہ پیغمبر ہوں گے نہ شہید مگر انبیاء اور شہداء ان کے مرتبہ اور قرب پر رشک کریں گے ان کے چہروں کا نور دیکھنے والوں کی نگاہوں کو چندھیا دے گا عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ وہ کون لوگ ہوں گے، فرمایا وہ ان لوگوں کی جماعتیں ہوں گی جو اپنے اپنے قبائل سے نکل کر ذکر خدا کے لئے جمع ہوتے ہیں اور جس طرح پاکیزہ چیزوں کا کھانا مرغوب ہوتا ہے اسی طرح پاکیزہ کلام ان کو مرغوب ہوتا ہے، رواہ الطبرانی بسند جید۔ [1]

متاخرین علماء نے دست خدا کی تاویل کی ہے اور قدرت قبضہ وغیرہ بطور مجاز مراد لیا ہے ۔ علماء نے لکھا ہے کہ دونوں ہاتھوں کے کشادہ ہونے سے انتہائی سخاوت مراد ہے ۔ دو ہاتھ کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ وہ قطعاً بخیل نہیں ہے کامل طور پر سخی ہے کیونکہ سخی کی انتہائی سخاوت یہی ہوتی ہے کہ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا مال دے۔

دنیا اور آخرت کی عطا کی طرف بھی اس سے اشارہ ہے (ایک ہاتھ سے دنیا اور دوسرے ہاتھ سے آخرت کے انعام) یا یوں کہو کہ اللہ کی طرف سے عطا دو طرح کی ہوتی ہے ایک ڈھیل دینے کے لئے دوسری عزت افزائی کے لئے (دونوں ہاتھوں سے دینے سے اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے)۔

يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے یعنی اپنی حکمت کے مطابق کبھی کبھی روزی میں فراخی دیتا ہے کبھی تنگی کر دیتا ہے ۔ ایک وہم یہ پیدا ہو سکتا تھا کہ کسی انسان کی روزی کی تنگی کا باعث شاید بخل عطا ہو اس وہم کو دور کرنے اور مفہوم سخاوت کو پختہ کرنے کے لئے فرمایا کہ وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔

وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ؕ اور جو قرآن آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے بھیجا جاتا ہے وہ ان میں سے بہتوں کی مزید سرکشی اور ترقی کفر کا سبب ہو جاتا ہے جس طرح عمدہ مقوی غذا سے تندرست کی صحت اور بیمار کی بیماری میں ترقی ہوتی ہے اسی طرح قرآن مجید سے ان کے خبث باطن کی وجہ سے سرکشی اور کفر کا ان کے اندر اضافہ ہو جاتا ہے اس کی تشریح بعض علماء نے یہ کی ہے کہ جب کوئی آیت اترتی تھی تو وہ اس کا انکار کرتے تھے اس طرح کفر میں آگے بڑھتے چلے جاتے تھے، نزول قرآن کی جانب اضافۂ کفر کی نسبت ایسی ہے جیسے کسی چیز کی نسبت سبب بعید کی طرف مجازاً کر دی جاتی ہے۔

وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ اور ہم نے ان (یہودیوں اور عیسائیوں) کے درمیان قیامت کے دن تک کے لئے دشمنی اور بغض ڈال دیا ۔ حسن و مجاہد نے بینہم کی ضمیر کا مرجع یہود و نصاریٰ کو قرار دیا ہے ۔ بعض علماء کے نزدیک صرف یہودیوں کے مختلف فرقے مراد ہیں یعنی اللہ نے یہودیوں کے فرقوں میں دین کے سلسلہ میں اختلاف ڈال دیا کہ قیامت تک ان کے درمیان نہ اتفاق قومی ہو گا نہ اتحاد قلبی۔

كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ اور جب بھی انہوں نے لڑائی کی آگ بھڑکائی اللہ نے اس کو بجھا دیا حسن نے اس کا یہ مطلب بیان کیا کہ جب بھی یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنے اور آپ ﷺ کے خلاف شرارت برپا کرنے کا ارادہ کیا، اللہ نے ان کے درمیان اختلاف پیدا کر دیا جس کی وجہ سے ان کی شرارت رک گئی اللہ نے ان کو ناکام و مقہور کر دیا اور اپنے دین و پیغمبر کو نصرت عنایت فرما دی۔

قتادہ نے کہا آیت میں یہودیوں کی ہر جنگ مراد ہے جب انہوں نے فساد مچایا اور توریت کے حکم کی خلاف ورزی کی تو اللہ نے ضطنوس رومی کو ان پر مسلط کر دیا پھر دین کو تباہ کر دیا تو مجوسیوں (کیرش) کو ان پر مسلط کیا پھر فساد پھیلایا تو مسلمانوں کو ان پر مسلط کیا ہر بستی میں تم کو یہودی سب سے زیادہ ذلیل دکھائی دیں گے۔

وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ اور یہ زمین میں تباہی پھیلاتے پھرتے ہیں یعنی لڑائیاں اور فتنے برپا کرنے کی کوششیں کرتے ہیں، یَسْعَوْنَ کا ترجمہ یَطْلُبُوْنَ بھی ہو سکتا ہے یعنی فساد و کفر کی طلب اور دین اسلام کو مٹانے کی کوشش اور

[1] ان جماعتوں سے مراد پاک باطن خانقاہ نشین صوفیہ اور مدارس اسلامیہ کے طلبہ ہیں، از مولف رحمۃ اللہ

اپنی کتابوں سے رسول اللہ ﷺ کے ذکر کو محو کر دینے کی سعی کرتے ہیں۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۴﴾ اور اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا اس لئے ان کو سزا دے گا۔ [1]

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا اور اگر اہل کتاب (محمد ﷺ اور قرآن پر) ایمان لے آتے۔

وَاتَّقَوْا اور (کفر و معاصی سے) پرہیز رکھتے۔

لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ تو ہم ان سے ان کے گناہ ساقط کرتے یعنی گزشتہ گناہ خواہ کتنے ہی بڑے ہوتے معاف کر دیتے، حضرت عمرو بن عاص کا بیان ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہاتھ پھیلائیے میں آپ سے بیعت کروں گا۔ حضور ﷺ نے ہاتھ پھیلا دیا مگر میں نے اپنا ہاتھ سمیٹ لیا فرمایا عمرو کیوں کیا بات ہے میں نے عرض کیا میں ایک شرط کرنی چاہتا ہوں، فرمایا وہ کیا ہے بیان کرو میں نے عرض کیا میں یہ شرط لگانا چاہتا ہوں کہ میرے (گزشتہ) قصور معاف کر دیئے جائیں فرمایا عمرو کیا تم کو معلوم نہیں کہ اسلام سابق گناہوں کو ڈھا دیتا ہے۔ اور ہجرت بھی پہلے کئے ہوئے گناہوں کو گرا دیتی ہے اور حج بھی گزشتہ گناہوں کو منہدم کر دیتا ہے۔ رواہ مسلم۔

وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۶۵﴾ اور بیشک ہم ان کو راحت کی جنتوں میں داخل کرتے کیونکہ جنت میں داخلہ کی شرط ایمان ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس کی جس کے دست قدرت میں محمد کی جان ہے جو یہودی اور عیسائی میری رسالت کی خبر سن لے پھر اس پر ایمان نہ لائے جو مجھے دے کر بھیجا گیا ہے اور اسی حالت میں مر جائے تو ضرور دوزخی ہوگا۔ رواہ مسلم من حدیث ابی ہریرہؓ۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ اور اگر وہ توریت و انجیل کو قائم رکھتے یعنی ان کے ضوابط و احکام کی پابندی رکھتے اور ان پر عمل کرتے ان میں بگاڑ نہ پیدا کرتے اور نہ ان کی کوئی آیت (و حکم) پوشیدہ رکھتے انہی احکام میں سے ایک حکم یہ بھی تھا کہ محمد ﷺ پر ایمان لائیں گے اور آپ ﷺ کے جو اوصاف اللہ نے توریت میں بیان کر دیئے ہیں ان کو کھول کر بیان کریں گے۔

وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ اور ان کتابوں کو بھی قائم رکھتے جو اللہ نے ان کے پاس بھیجی ہیں یعنی قرآن، زبور اور تمام آسمانی کتابیں چونکہ اہل کتاب سب ہی کتابوں پر ایمان لانے پر مامور تھے اس لئے گویا سب کتابیں انہی کے پاس بھیجی گئیں۔

---

[1] رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا امت موسیٰ کے اکہتر فرقے بن گئے جن میں سے ستر دوزخی اور ایک جنتی ہوا اور امت عیسیٰ بہتر فرقوں میں بٹ گئی جن میں ایک جنتی اور اکہتر دوزخی ہوئے اور میری امت آئندہ تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی جن میں ایک جنتی اور بہتر دوزخی ہوں گے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وہ (جنتی) کون ہوں گے، فرمایا جماعتیں جماعتیں جماعتیں (یعنی اہل جماعت) رواہ ابن مردویہ من طریق یعقوب بن زید بن طلحہ عن زید بن اسلم عن انس رضی اللہ عنہ یعقوب بن زید (جو مذکورہ حدیث کا ایک راوی ہے) نے کہا جب حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اس حدیث کو مرفوعاً بیان کرتے تھے تو یہ آیت پڑھتے تھے۔ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتَابِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا...... سَاۤءَ مَا يَعْمَلُوْنَ تک، میں کہتا ہوں کہ نجات یافتہ فرقہ وہ ہے جو اللہ کی کتاب کو پکڑے ہوئے ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے جب فرمایا کہ (ایسا) اس وقت ہوگا جب علم جاتا رہے گا تو زیاد بن لبید نے کہا (یا رسول اللہ ﷺ) علم کیسے جاتا رہے گا ہم قرآن پڑھتے ہیں اپنے بچوں کو بھی پڑھائیں گے اور ہمارے بچے اپنے بچوں کو پڑھائیں گے اور وہ اپنے بچوں کو پڑھائیں گے قیامت تک یوں ہی سلسلہ جاری رہے گا۔ فرمایا ابن لبید تیری ماں تجھے روئے میں تو تجھے مدینہ کے لوگوں میں بڑا سمجھ دار جانتا تھا کیا یہ یہودی اور عیسائی توریت اور انجیل نہیں پڑھتے ہیں لیکن توریت و انجیل کے اندر جو (ہدایت) ہے اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔

ابن جریر نے جبیر بن سیر کی روایت سے بھی یہ حدیث کی ہے اس روایت میں یہ الفاظ ہیں پھر آپ ﷺ نے پڑھا۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰاةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ۔ الخ

لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ تو اپنے اوپر سے اور اپنے قدموں کے نیچے سے کھاتے فراء نے کہا اس سے مراد ہے رزق کی انتہائی فراخی عرب کہتے ہیں فلاں شخص از سر تا پا خیر میں ہے ۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اوپر سے بارش ہوتی اور نیچے زمین سر سبز ہو جاتی اور کھیتیاں پیدا ہوتیں ۔ اسی کی طرح دوسری آیت میں آیا ہے وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اگر بستیوں والے ایمان لے آتے اور ممنوعات سے بچتے تو ہم آسمان و زمین سے ان کے لئے برکتوں کے دروازے کھول دیتے، حاصل مطلب یہ ہے کہ ان پر رزق کی تنگی اللہ کے بخیل بن جانے کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ ان کے کفر و معاصی کی نحوست کی وجہ سے ہوئی۔

مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ ان میں کچھ لوگ تو عادل ہیں نہ افراط میں مبتلا ہیں نہ تفریط میں، حضرت عبداللہ بن سلام اور آپ جیسے دوسرے مومنین اہل کتاب کا یہ گروہ تھا۔

وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا یَعْمَلُوْنَ ۟ اور ان میں سے بہتوں کے اعمال خراب ہیں یعنی حق سے عناد اللہ کی کتاب میں تحریف اور اس سے روگردانی اور رسول اللہ سے عداوت یہ سب ان کی بری حرکتیں ہیں ۔

ابو الشیخ نے حسن (بصری) کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے اپنا پیام دے کر مجھے مبعوث فرمایا میں نے اپنے دل میں بڑی تنگی محسوس کی اور خیال کیا کہ لوگ ضرور میری تکذیب کریں گے لیکن اللہ نے وعید آمیز حکم دیا کہ یا تو پیام پہنچاؤ ورنہ میں تم کو عذاب دوں گا ۔ اس وقت آیت ذیل نازل ہوئی۔

یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ [1] اے پیغمبر آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے جو (پیام) بھیجا گیا ہے وہ (لوگوں تک) پہنچا دو یعنی جو کچھ بھی نازل ہوا ہے سب پہنچا دو کوئی حصہ باقی نہ رہنا چاہئے کسی سے خوف نہ کرو نہ اپنے ضرر کا اندیشہ کرو۔

مسروق کا بیان ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا جو شخص تم سے کہے کہ محمد ﷺ نے اللہ کے نازل کردہ کلام میں سے کوئی حصہ چھپا لیا وہ جھوٹا ہے کیونکہ اللہ خود فرما رہا ہے یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۔ بعض علماء کا

ع ۹ ۱۴

---

[1] ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور ابن عساکر نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ آیت یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ، غدیر خم کے دن حضرت علی بن ابی طالب کے حق میں نازل ہوئی ۔ ابن مردویہ نے حضرت ابن مسعود کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہم (یہ آیت اس طرح) پڑھتے تھے ۔ یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ اِنَّ عَلِیًّا مَوْلَى الْمُؤْمِنِیْنَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔
اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ غدیر خم کے دن نازل ہوئی لیکن غدیر خم کے دن اس کا نزول تسلیم کرنا بد ایت اور روایت دونوں کے خلاف ہے اس آیت بلکہ پوری سورت کی رفتار بتا رہی ہے کہ غدیر خم کے دن اس آیت کا نزول نہیں ہوا ۔ بخاری نے صحیح میں حضرت عائشہ کی روایت سے اور اسی کی تائید میں ترمذی اور حاکم نے بھی حضرت عائشہ کی روایت سے اور طبرانی نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے جو احادیث بیان کی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت کا نزول غزوۂ خندق میں ہوا۔
ایک یہ امر قابل غور ہے کہ غدیر خم میں سرکار والا کا نزول اجلال اس زمانہ میں ہوا جب تبلیغ کا کام ختم ہو گیا تھا ، قرآن کا کوئی حصہ بلا تبلیغ کے نہیں رہا تھا اور حج وداع میں عرفہ کے دن آیت اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا نازل ہو چکی تھی پھر کس طرح حکم تبلیغ دیا جا سکتا تھا اور بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ کہنا کس طرح صحیح ہوگا۔ اور جزیرہ عرب میں کوئی مشرک باقی نہیں رہا تھا پھر وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ کا کیا معنی ہوگا ۔ اس کے علاوہ اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد جو کلام ہے اسکے بعد جو کلام ہے اس میں یہودیوں اور عیسائیوں کا کچھ تذکرہ ہے چنانچہ فرمایا ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ یَّبْسُطُوْۤا اِلَیْكُمْ اَیْدِیَهُمْ فَكَفَّ اَیْدِیَهُمْ۔
اور آگے فرمایا ہے یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ حَتّٰى تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تبلیغ سے مراد آیت رجم و قصاص ہے جو بروایت ابن حبان ، حسن کے قول پر یہودیوں کے قصہ میں نازل ہوئی ۔ واللہ اعلم۔

قول ہے کہ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ میں آیت رجم وقصاص کی تبلیغ کا حکم ہے جو یہودیوں کے قصہ میں نازل ہوئی بعض اہل روایت کے نزدیک آیت یَا اَیُّہَا الرَّسُوْلُ کا نزول حضرت زینب بنت جحش اور ان کے نکاح کے متعلق ہوا بعض کے نزدیک جہاد کے متعلق اس کا نزول ہوا، صورت واقعہ یہ ہوئی کہ منافقوں کو حکم جہاد ناگوار ہوا تھا اسی کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْکَمَةٌ وَّ ذُکِرَ فِیْہَا الْقِتَالُ رَاَیْتَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ یَّنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ نَظَرَ الْمَغْشِیِّ عَلَیْہِ مِنَ الْمَوْتِ۔ بعض مسلمانوں کو بھی یہ حکم پسند نہ تھا اسی کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ قِیْلَ لَہُمْ کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ الخ رسول اللہ ﷺ نے جب بعض لوگوں کی اس ناپسندیدگی اور کراہت طبع کو دیکھا تو جہاد کی ترغیب دینے سے کچھ رکنے لگے اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ ابن ابی حاتم نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ جب آیت یَا اَیُّہَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے عرض کیا، اے میرے رب میں کیا تدبیر کروں میں تنہا ہوں یہ سب میرے خلاف جمع ہو جائیں گے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ ط اور اگر آپ نے (ایسا) نہیں کیا تو (بالکل) اس کا پیام نہیں پہنچایا یعنی اگر آپ نے ہر حکم نہیں پہنچایا اور کوئی حکم پہنچانے سے چھوڑ دیا تو گویا آپ نے کوئی پیام نہیں پہنچایا کیونکہ بعض حصوں کو چھپانے سے وہ حصہ بھی بیکار ہو جاتا ہے جو پہنچا دیا گیا ہو جیسے نماز کے بعض ارکان ادا نہ کرنے سے پوری نماز بیکار ہو جاتی ہے، اگر بعض احکام کی تبلیغ ترک ہو جائے تو ظاہر ہے کہ لوگوں کا ایمان اس متروک حصہ پر نہ ہو گا اور اس کو ایمان نہیں کہا جا سکتا جیسے یہودی کہتے تھے کہ ہم بعض کو تو مانتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں (اور قرآن کی نظر میں یہودیوں کا یہ ایمان عدم ایمان کی طرح قرار پایا) اس کے علاوہ ایک امر یہ بھی ہے کہ بعض حصوں کو چھپانا اسی طرح عذاب کی دعوت دیتا ہے جس طرح سب کو پوشیدہ رکھنا یہ ایسا ہی ہے جیسے اللہ نے (ایک آدمی کے قتل کے متعلق) فرمایا ہے فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا۔

وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ ط اور اللہ لوگوں سے آپ کی حفاظت کرے گا۔ یعنی آپ تبلیغ احکام میں لوگوں سے نہ ڈریں آپ اگرچہ تنہا ہیں لیکن وہ آپ کو قتل نہ کر سکیں گے، اس تفسیری مطلب پر یہ شبہ وارد نہیں کیا جا سکتا کہ (اللہ نے جب حفاظت کا وعدہ کر لیا تھا تو) پھر رسول اللہ ﷺ کا سر کیسے زخمی کیا گیا اور آپ کا دانت کس طرح توڑ دیا گیا اور طرح طرح کی ایذائیں کیوں دی گئیں)۔

اس شبہ کا جواب صاف ہے کہ آیت میں قتل سے حفاظت کا وعدہ کیا گیا ہے ہر ایذاء سے محفوظ رکھنے کا وعدہ نہیں ہے بعض لوگوں نے اس شبہ کا یہ جواب دیا ہے کہ (کافروں کی طرف سے ہر طرح کی ایذا رسانی اور) سر مبارک کا زخمی ہونا اس آیت کے نزول سے پہلے کا واقعہ ہے کیونکہ سورۂ مائدہ قرآن کی تمام سورتوں سے آخر میں نازل ہوئی تھی۔ ترمذی اور حاکم نے حضرت عائشہ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا چوکیدارا (رات کو) کیا جاتا تھا یہاں تک کہ اللہ نے وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ، آیت نازل فرمائی (۔ اس کے بعد آپ نے لوگوں سے اپنی حفاظت ترک کرا دی اور) خیمہ کے اندر سے سر نکال کر فرمایا، لوگو واپس چلے جاؤ اللہ نے میری حفاظت کر دی ہے، اسی حدیث میں ہے کہ یہ آیت لیلی فراشی ہے یعنی رات کو جب رسول اللہ ﷺ اپنے بستر پر تھے اس وقت اس کا نزول ہوا۔

بخاری نے حضرت عائشہ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ (اپنی حفاظت کی خاطر شب کو) بیدار رہتے تھے، جب مدینہ میں تشریف لائے تو فرمایا اگر میرے رفقاء میں سے کوئی شخص آج رات میرا پہرا دیتا تو مناسب تھا اتنے میں ہم نے ہتھیاروں کی کچھ آواز سنی حضور ﷺ نے فرمایا کون ہے ادھر سے آواز آئی میں سعد بن ابی وقاص ہوں، حضور ﷺ کا پہرہ دینے آیا ہوں (اس کے بعد) رسول اللہ ﷺ سو گئے۔

طبرانی نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے لکھا ہے کہ منجملہ حفاظتی گارڈ کے رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت عباس بھی تھے پھر جب آیت وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ، نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے پہرہ چوکی چھوڑ دیا۔ طبرانی نے حضرت

عصمہ بن مالک خطمی کا بیان نقل کیا ہے کہ رات میں ہم رسول اللہ ﷺ کا پہرہ دیا کرتے تھے آخر جب آیت وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ ۔نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے چوکی پہرہ چھوڑ دیا

ابن حبان نے صحیح میں حضرت ابوہریرہ کا بیان نقل کیا ہے کہ جب سفر میں ہم رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب ہوتے (اور کہیں پڑاؤ ہوتا تو) حضور ﷺ کے لئے ہم سب سے بڑا درخت اور اس کا سایہ چھوڑ دیتے تھے آپ ﷺ اس کے نیچے فروکش ہوتے تھے ایک روز آپ ایک درخت کے نیچے اترے اور تلوار درخت میں لٹکادی (۔اور سو گئے) اچانک ایک آدمی نے آکر تلوار لے لی اور بولا محمد اب مجھ سے تم کو کون بچائے گا حضور ﷺ نے فرمایا اللہ بچائے گا تلوار رکھ دے اس نے فوراً تلوار رکھ دی اور آیت وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ نازل ہوئی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ محمد بن کعب قرظی نے بھی حضرت ابوہریرہ کی روایت سے اسی طرح نقل کیا ہے اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ اس دیہاتی کا ہاتھ کپکپانے لگا تلوار ہاتھ سے گر گئی اور سر درخت سے مارنے لگا یہاں تک کہ اس کا دماغ پارہ پارہ ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ غزوہ بنی انمار میں بمقام ذات الرقیع ایک اونچے درخت کے نیچے فروکش ہوئے آپ ﷺ ایک کنوئیں کے من پر پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھے ہوئے تھے کہ قبیلہ بنی نجار کے (ایک شخص)وارث نے کہا میں محمد کو قتل کئے دیتا ہوں لوگوں نے پوچھا تو ان کو کیسے قتل کردے گا بولا میں ان سے جاکر کہوں گا ذرا مجھے اپنی تلوار دیجئے جب وہ دیدیں گے تو میں ان کو قتل کردوں گا چنانچہ وہ خدمت گرامی میں آیا اور عرض کیا محمد ذرا مجھے اپنی تلوار تو دکھایئے، حضور ﷺ نے اس کو دیدی مگر اس کا ہاتھ لرزنے لگا حضور ﷺ نے فرمایا تیرے مقصد میں رکاوٹ پیدا ہو گئی ۔اس پر اللہ نے آیت یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ الخ نازل فرمائی ۔بخاری نے بھی یہ قصہ اسی طرح لکھا ہے مگر اس میں نزول آیت کا ذکر نہیں ہے

اس آیت کے نزول کے اسباب میں سے ایک عجیب سبب نزول یہ بھی آیا ہے کہ (مکہ میں) رسول اللہ ﷺ کسی محافظ کے زیر حفاظت رہتے تھے روز ابو طالب آپ کی حفاظت کے لئے آپ کی ہمراہی میں کسی ایک ہاشمی کو بھیج دیا کرتے تھے جب یہ آیت نازل ہوئی اور اس کے بعد بھی جب ابو طالب نے حضور ﷺ کے ساتھ محافظ کو بھیجنا چاہا تو آپ ﷺ نے فرمایا چچا اللہ نے جن وانس سے میری حفاظت کردی ہے

ابن مردویہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ کی روایت سے بھی ایسا ہی واقعہ نقل کیا ہے یہ قصہ چاہتا ہے کہ یہ آیت مکی ہو مگر ظاہر اس کے خلاف ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ۝۶۷ یقیناً اللہ ان کافر لوگوں کو راہ نہیں دے گا ۔یعنی اللہ کافروں کو قدرت نہیں دے گا کہ وہ اپنا مقصد حاصل کر سکیں اور آپ کو قتل اور دین اسلام کو مٹا سکیں ۔بغوی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے بطور استہزاء جواب دیا ہم تو تم سے پہلے ہی اسلام لے آئے ہیں مذاق کے لہجہ میں یہ بھی کہنے لگے جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ کو حنان بنالیا ہے اسی طرح ہم تم کو حنان بنانا چاہتے ہیں (غالباً اس جگہ حنان کا ترجمہ رفیق شفیق مہربان ہے)جب حضور ﷺ نے یہ حالت دیکھی تو خاموش ہو رہے اس پر آیت یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ الخ نازل ہوئی اور اللہ نے آپ کو حکم دیا کہ (یہودیوں سے) فرمادیں یَا اَھْلَ الْکِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ الخ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رافع اور سلام بن مشکم اور مالک بن الصیف نے آکر عرض کیا محمد کیا تمہارا یہ دعویٰ نہیں کہ تم ابراہیم کی شریعت اور دین پر ہو اور ان کے پاس جو کچھ (اللہ کی طرف سے آیا) تھا تمہارا اس پر ایمان ہے حضور ﷺ نے فرمایا بیشک میرا یہی قول ہے لیکن تم لوگوں نے نئی باتیں ایجاد کرلی ہیں اور شریعت ابراہیم میں جو کچھ ہے تم اس کے منکر ہو اور جن چیزوں کو لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کرنے کا تم کو حکم دیا گیا تھا تم نے ان کو چھپالیا ہے کہنے لگے جو کچھ ہمارے ہاتھوں میں ہے ہم تو وہی لیں گے ہم یقیناً حق و ہدایت پر ہیں اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

قُلْ یٰۤاَھْلَ الْکِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ آپ کہہ دیں اے اہل کتاب تم کسی (صحیح) بات پر نہیں ہو یعنی کسی

ایسے دین پر نہیں ہو جو اللہ کے نزدیک قابل اعتبار ہو، یا آیت کی توجیہ اس طرح کی جائے کہ اہل کتاب کا مذہب اللہ کے نزدیک معتبر نہیں تھا اور نماز کی طرح دین کا بھی قابل اعتبار وجود وہی ہے جو شرعی ہو جس کا شریعت نے اعتبار کیا ہو (اس کے علاوہ دین کا کوئی وجود نہیں) اور اہل کتاب کا دین شرعاً غیر معتبر ہے اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ تم کسی دین پر نہیں ہو

حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ یہاں تک کہ تم توریت وانجیل کو اور ان (کتابوں اور صحیفوں) کو قائم کرو جو تمہارے پاس بھیجے گئے ہیں (یعنی زبور و قرآن وغیرہ)

توریت وانجیل وغیرہ کو قائم رکھنے کا ایک تقاضا تو یہ ہے کہ ان کے اندر جو اصول دین بیان کئے گئے ہیں ان کو مانا جائے دوسرا تقاضا یہ ہے کہ محمد ﷺ اور قرآن کو مانا جائے اور توریت میں رسول اللہ ﷺ کے جو اوصاف بیان کئے گئے ہیں ان کو بیان کیا جائے، تیسرا تقاضا یہ ہے کہ توریت کے مسائل فروعیہ پر عمل کیا جائے جب تک ان کا منسوخ ہونا ثابت نہ ہو جائے اور جب ان کا منسوخ ہونا ثابت ہو جائے تو اس حکم ناسخ پر عمل کیا جائے جو اللہ نے نازل فرمایا ہو۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ شریعتوں پر عمل کرنا واجب ہے (بشرطیکہ قرآن سے ان کا منسوخ ہونا ثابت نہ ہو اگر نسخ ہو جائے تو ناسخ پر عمل کرنا ہی شریعت سابقہ پر عمل کرنا ہے۔)

وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ اس آیت کا ترجمہ اور تفسیری بیان اوپر گزر چکا ہے۔

فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ پس آپ ان کافروں کا غم نہ کریں، یعنی نہ ان پر رحم کھا کر نہ ان کی ایذا رسانی سے ڈر کر، ان کی سرکشی حد سے بڑھ چکی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ اس آیت کا ترجمہ اور تفسیری بیان سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے مزید اعادہ کی ضرورت نہیں، اس جگہ صرف اتنا بیان کرتا ہے الصابئین کو اس مقام پر الصابئون واؤ کے ساتھ کیوں ذکر کیا گیا، ان کا اسم تو منصوب ہوتا ہے اور ان کے اسم پر اس کا عطف ہے۔ لہٰذا اس کو بھی منصوب ہونا چاہئے علماء کوفہ اور کسائی و مبرد کے مسلک پر تو کسی تاویل کی ضرورت نہیں اہل کوفہ کے نزدیک ان کا عمل صرف اسم پر ہوتا ہے معطوف پر نہیں ہوتا اس لئے الصابئون کا عطف اِنَّ کے اسم کے محل پر ہو جائے گا معطوف سے پہلے خبر اِنَّ کے گزرنے کی شرط نہیں کیونکہ اِنَّ کا عمل خبر میں ہوتا ہی نہیں ہے، کسائی اور مبرد کے نزدیک تو یہی ترکیب درست ہے کیونکہ اِنَّ کا اسم اس جگہ مبنی ہے (یعنی اَلَّذِيْنَ) ان کا عمل اپنے اسم پر ہی ظاہر ہوا تو معطوف پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔ لیکن علماء بصرہ اور سیبویہ کے نزدیک اسم اِنَّ پر معطوف کا مرفوع ہونا اس وقت درست ہوگا جب اِنَّ کی خبر بھی پہلے گزر چکی ہو ورنہ دو عاملوں کا ایک خبر پر اجتماع لازم آئے گا ایک اِنَّ دوسرا معنی ابتداء اور اس جگہ اِنَّ کی خبر الصابئون سے پہلے مذکور نہیں اس لئے تاویل کرنی پڑے گی۔ سیبویہ نے کہا الصابئون مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے یعنی الصابئون کذلک اس جملہ کو يَحْزَنُوْنَ کے بعد آنا چاہئے تھا لیکن خبر سے پہلے لانے میں یہ بتانا مقصود ہے کہ باوجودیکہ صابی لامذہب ہوتے ہیں لیکن اگر ان کے افکار ایمانیہ اور اعمال صحیح ہوں تو ان کی بھی مغفرت ہو جائے گی ان لوگوں کا تو ذکر ہی کیا ہے جو کسی مذہب کے حامل ہیں اگر ان کا ایمان صحیح اور عمل درست ہوگا تو ان کی مغفرت تو بدرجہ اولیٰ ہوگی۔

یہ بھی جائز ہے کہ اَلصَّائِبُوْنَ وَالنَّصَارٰى دونوں مل کر مبتدا ہو اور بعد کو آنے والا جملہ اس کی خبر ہو اور اِنَّ الَّذِيْنَ کی خبر محذوف ہو جس طرح شاعر کا شعر ہے۔

نَحْنُ بِمَا عِنْدَنَا وَاَنْتَ بِمَا عِنْدَكَ رَاضٍ وَالرَّاْىُ مُخْتَلِفٌ

نَحْنُ کی خبر رَاضُوْنَ محذوف ہے یعنی جو کچھ ہمارے پاس ہے ہم اس پر خوش ہیں اور جو کچھ تیرے پاس ہے تو اس پر راضی ہے اور خیالات جدا جدا ہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اَلصَّائِبُوْنَ سے پہلے اَلَّذِيْنَ ہُمْ محذوف ہو یعنی اَلَّذِيْنَ ہُمُ الصَّائِبُوْنَ اور اب اس کا عطف

اَلَّذِیْنَ سابق پر ہو جائے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس جگہ اِنَّ (عامل نہیں ہے بلکہ) نعم کے معنی میں ہے اور اس کے بعد آنے والا لفظ مبتدا ہے اور الصابئون کا عطف مبتدا پر ہے۔ بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ الصابئون نصب کی حالت میں ہی ہے اور مبنی بر فتحہ ہے اس کی حالت نصبی یا کیسا تھ بھی جائز ہے اور واؤ کے ساتھ بھی (جیسے الذین اور الذون)۔

لَقَدْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اور بے شک ہم نے بنی اسرائیل سے وعدہ لے لیا تھا، یعنی توراۃ میں حکم دیا تھا کہ توراۃ پر ایمان لاؤ اس پر عمل کرو تمام انبیاء پر اور خصوصاً محمد پر ایمان لاؤ)۔

وَاَرْسَلْنَآ اِلَیْهِمْ رُسُلًا ؕ اور ہم نے ان کے پاس بہت پیغمبر بھیجے۔ تاکہ ان کو نصیحت کریں اور دینی امور کھول کر بتائیں۔

كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ (لیکن) جب بھی کوئی پیغمبر کوایسی تعلیم لے کر پہنچا جو ان کی خواہشات نفس کے خلاف تھی (اور تعلیم توریت کے موافق تھی) اس کلام میں اس بات پر دلالت ہے کہ بنی اسرائیل نے توراۃ کی مخالفت کی اور جو عہد و پیمان کئے تھے ان کو توڑ ڈالا۔

فَرِیْقًا كَذَّبُوْا انبیاء کے) ایک گروہ کی تو انہوں نے تکذیب کی اور قتل نہیں کیا۔

وَفَرِیْقًا یَّقْتُلُوْنَ ﴿۷۰﴾ اور ایک فریق کو (تکذیب کے بعد) قتل کر ڈالتے تھے۔

بجائے ماضی کے مضارع کا صیغہ استعمال کرنے سے غرض یہ ہے کہ حال گزشتہ کا استحضار اور قتل انبیاء کی عظمت کا اظہار اور اس امر پر تنبیہ ہو جائے کہ ان کی پہلے بھی یہی عادت تھی اور آئندہ بھی یہی رہے گی اس کے علاوہ آیات کا مقطع بھی ہم آواز ہو جاتا ہے۔

یا فریقًا یقتلون سے مراد یہ ہے کہ محمد ﷺ سے یہ لوگ جنگ کرتے اور آپ ﷺ کے کھانے میں زہر ملاتے اور آپ پر جادو کرتے ہیں اور ان ترکیبوں سے آپ کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔

وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ اور ان کا گمان یہ تھا کہ (انبیاء کی تکذیب اور قتل سے) کوئی وبال (ان پر) نہیں آئے گا یعنی ان پر کوئی مصیبت اور عذاب نہیں آئے گا۔

فَعَمُوْا وَصَمُّوْا پس (موسیٰ کے بعد) یہ اندھے اور بہرے ہو گئے تھے یعنی دین اور دلائل کو دیکھنے سے اندھے اور حق بات سننے سے بہرے ہو گئے کیونکہ ان کا گمان ہی باطل تھا۔

ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ پھر اللہ نے ان پر رحم فرمایا یعنی جب عیسیٰ علیہ السلام پر یہ ایمان لائے اور توبہ کی تو اللہ نے انکی توبہ قبول فرمائی۔

ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا پھر (عیسیٰ علیہ اسلام کے بعد دوبارہ) یہ اندھے بہرے ہو گئے محمد ﷺ کا انکار کر دیا

كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ ؕ ان میں سے بہتیرے اس صورت میں لفظ کثیر عَمُوْا وَصَمُّوْا کی ضمیر سے بدل ہو گا جیسے کلام عربی میں آتا ہے اکلونی البراغیث (جمہور اہل نحو کا قول ہے کہ اگر فاعل ظاہر ہو تو فعل کو مفرد لایا جائے گا لیکن آیت اور مثال مذکور میں کثیر اور البراغیث باوجودیکہ فاعل اور ظاہر ہیں پھر بھی فعل کو بصیغۂ جمع لایا گیا۔ اس شبہ کا جواب جمہور نے یہ دیا ہے کہ کثیر اور البراغیث فاعل نہیں ہیں بلکہ ضمیر فاعلی سے بدل ہیں) یا اس طرح ترجمہ ہو گا کہ ایسے ان میں بہت ہیں اس وقت کثیر خبر ہو گی اور مبتدا محذوف ہو گا یعنی اُولٰٓئِکَ کَثِیْرٌ۔

وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ اور اللہ ان کے عمل کو خوب دیکھ رہا ہے یعنی ان کے اعمال کی ان کو سزا دے گا۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ ؕ بے شک کافر ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ ہی مسیح بن مریم ہے۔ یعنی فرقہ ملکانیہ اور یعقوبیہ جو حلول و اتحاد کا قائل ہے (مسیح کے اندر اللہ کا حلول مانتا اور دونوں کو متحد قرار دیتا ہے۔)

وَقَالَ الْمَسِیْحُ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ ؕ اور مسیح علیہ السلام نے کہا کہ اے بنی اسرائیل اللہ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ یعنی جس طرح تم کو پالتا ہے اسی طرح مجھے بھی پالتا ہے

اور رب و مربوب کے درمیان نہ اتحاد ممکن ہے نہ حلول۔

اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ جو کسی کو اللہ کا شریک بنائے گا یقیناً اللہ نے اس کے لئے جنت حرام کردی ہے۔

یعنی اللہ کے خالص تنزیہ کے مقام میں ..... جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرے گا خواہ کسی دوسرے کو مستحق معبودیت قرار دے یا کسی اور کو واجب الوجود مانے یا اللہ کی کسی اور خاص صفت اور مخصوص فعل میں ساجھی تسلیم کرے (یوں تو مخلوق خالق کے ساتھ بہت سے امور میں شریک ہے مثلاً مخلوق بھی موجود ہے اور خالق بھی مخلوق بھی حاکم اور عالم اور صاحب ارادہ اور سمیع و بصیر ہے اور خالق بھی مگر خالق کی صفات کامل اور مخلوق کی صفات ناقص مخلوق کی صفات ممکن و حادث اور خالق کی بعض صفات و افعال مخصوص ہیں۔ مخلوق کی ان میں شرکت برائے نام بھی نہیں۔ پس مقام تنزیہ میں اللہ کا کوئی شریک نہیں صرف اسی کی ذات و صفات ہر عیب و نقصان اور زوال و حدوث سے پاک ہے۔ غالباً حضرت مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی مضمون کی طرف ترجمہ میں اشارہ کیا ہے۔

جنت صرف موحد متقیوں کے لئے تیار کی گئی ہے اس لئے گویا اس نے اپنے اس حکم کی وجہ سے جنت کو مشرکوں کے لئے حرام کر دیا ہے۔ (یعنی مشرکوں کا جنت میں داخلہ ناممکن اور محال ہے اگرچہ اللہ کے لئے کوئی ممکن چیز محال نہیں ہے اور جنت میں مشرکوں کا داخلہ بجائے خود ممکن ہے لیکن اللہ نے چونکہ صراحت کر دی ہے کہ جنت صرف اہل ایمان کے لئے تیار کی گئی ہے اس لئے مشرکوں کا جنت میں داخلہ ناممکن ہو گیا۔ یعنی باوجود ممکن الذات ہونے کے مشرکوں کا جنت میں جانا ممتنع بالغیر ہو گیا (مترجم)

وَمَاْوٰىهُ النَّارُ اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ جو مشرکوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ۝ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ ضمیر کی جگہ لفظ ظالمین صراحت کے ساتھ ذکر کرنے سے اس امر پر تنبیہ ہے کہ انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ مِنْ اَنْصَارٍ میں مِنْ زائد ہے یعنی ان کا کوئی مددگار نہیں۔ لفظ ناصر (مفرد) کی جگہ انصار (بصیغہ جمع) لانے سے ان کے گمان کا بطلان بطور استہزاء ظاہر کرنا ہے کیونکہ ان کا دعویٰ اور گمان تھا کہ ہمارے مددگار بہت ہیں۔ بعض علماء نے کہا اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ (اگر بفرض محال ان کا کوئی مددگار بھی ہو تب بھی ایک کی مدد کافی نہ ہو گی بلکہ) مدد کے لئے بہت مددگاروں کی ضرورت ہو گی اور مددگاروں کی جماعت ان کو نصیب نہ ہو گی

اللہ کا کلام بھی ہو سکتا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کلام کا تکملہ بھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ کلام کلام اللہ نے اس امر سے آگاہ کرنے کے لئے نقل فرمایا کہ بنی اسرائیل نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو کچھ کہا وہ عیسیٰؑ کی عظمت کو ظاہر کرنے اور ان کا مقرب بننے کے لئے کہا مگر مسیح نے خود ان کی تردید کی اور اظہار مخالفت کیا پھر دوسرے (حق پرست) لوگوں کا تو ذکر ہی کیا ہے جس چیز کا انکار عیسیٰؑ نے خود کیا دوسرے حق پرست لوگ اس چیز کی نسبت ان کی طرف کیسے کر سکتے ہیں۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ یقیناً وہ لوگ کافر ہو گئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے۔ یعنی فرقہ مرقوسیہ اور نسطوریہ کافر ہیں جو تین اقانیم (اصول) کے قائل ہیں۔ تین سے مراد بعض کے نزدیک اللہ عیسیٰ علیہ السلام اور جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ اللہ مرتبہ ذات کا نام ہے اور عیسیٰ علیہ السلام صفت علم کا اور جبرائیل علیہ السلام صفت حیات کا بعض کے نزدیک تین سے مراد ہیں اللہ (باپ) عیسیٰ علیہ السلام (بیٹا) اور مریم (بیوی) اور تینوں اللہ ہیں۔ اس قول کی تائید اللہ کے اس قول سے ہوتی ہے جو قیامت کے دن اللہ عیسیٰ علیہ السلام سے فرمائے گا۔ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔

وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ حالانکہ ایک معبود کے سوا اور کوئی معبود نہیں مِنْ اِلٰهٍ میں مِنْ زائد ہے جو مفید عموم ہے اور خبر محذوف ہے یعنی عالم ہستی اور ممکنات میں کوئی دوسرا واجب الوجود موجود ہی نہیں ہے کہ واجب الوجود اور موجد عالم ہونے کی وجہ سے مستحق معبودیت ہو سکے۔ صرف ایک معبود موجود ہے۔ جس کا کوئی شریک نہیں نہ ذات و ماہیت میں نہ کسی وصف خصوصی ہیں۔

وقف لازم

وَاِنْ لَّمْ یَنْتَهُوْا عَمَّا یَقُوْلُوْنَ لَیَمَسَّنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۝ اور اگر یہ لوگ اپنے ان اقوال سے باز نہ آئے تو جو لوگ ان میں سے کافر رہیں گے ان پر دردناک عذاب واقع ہوگا۔ یعنی اگر الفاظ شرک سے باز نہ آئیں گے اور توحید کامل کا اقرار نہ کریں گے۔ مِنْهُمْ میں مِنْ بیانیہ ہے یا تبعیضیہ ہے یعنی ان کافروں میں سے وہ لوگ جو مرتے دم تک کفر پر قائم رہے۔

اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ھم ضمیر نہیں ذکر کی (حالانکہ مقام کا تقاضا تھا کہ ضمیر لائی جاتی۔ مرجع پہلے مذکور ہے اور کافر ہونے کا ذکر بھی آچکا ہے) تاکہ دوبارہ ان کے کافر ہونے کی شہادت ہو جائے اور صراحت کے ساتھ معلوم ہو جائے کہ مرتے دم تک کفر پر قائم رہنے والوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اسی لئے آگے فرمایا۔

اَفَلَا یَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَیَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۝ تو کیا وہ (شرک کو چھوڑ کر) اللہ کی طرف رجوع اور (گزشتہ شرک کی) معافی کی طلب نہیں کریں گے اور اللہ تو بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اگر وہ توبہ کرلیں گے تو اللہ ان پر رحم فرمائے گا اور بخش دے گا۔ یعنی تعجب ہے کہ اللہ کے غفور رحیم ہونے کے باوجود وہ توبہ استغفار نہ کریں۔

مَا الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ مسیح بن مریم تو اور کچھ نہ تھے صرف رسول تھے یعنی مسیح کے اندر صرف رسالت تھی صفت ربوبیت نہ تھی (آیت میں حصر حقیقی نہیں کیونکہ مسیح کے اندر سوائے وصف رسالت کے اور اوصاف بھی تھے۔ ایک وصف خصوصی یہ ہی تھا کہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے بلکہ حصر اضافی ہے) یعنی نصاریٰ جو الوہیت مسیح کے قائل ہیں عیسیٰ میں یہ وصف نہ تھا صرف رسالت تھی (رسالت سے اونچا کوئی مرتبہ نہ تھا)۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ مسیح سے پہلے بھی پیغمبر گذر چکے ہیں یہ بھی گزر جائیں گے یعنی مسیح بھی پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر ہیں اور (ہر) رسول ممکن حادث تھا۔ جس کا عدم جائز تھا اس لئے یہ بھی ممکن جائز العدم ہیں اللہ نے ان کو کچھ خصوصی معجزات عطا فرمادیئے تھے۔ جیسے مبروص اور مادرزاد نابینا کو بھلا چنگا کر دینا اور مُردوں کو زندہ کر دینا۔ لیکن موسیٰ کو بھی خاص معجزات دیئے تھے ان کی لاٹھی کو زندہ چلتا پھرتا سانپ بنا دینے کی ان کو طاقت عطا فرمادی مُردوں کو زندہ کرنے سے لاٹھی کا زندہ سانپ بنا دینا زیادہ عجیب ہے۔ (مردہ تو پہلے زندہ تھا اور لاٹھی کبھی زندہ ہی نہ تھی) عیسیٰ کو اللہ نے بغیر باپ کے پیدا کیا تو آدم کو بغیر ماں باپ کے پیدا کیا (ظاہر ہے تخلیق عیسیٰ سے تخلیق آدم زیادہ عجیب ہے)

وَاُمُّهٗ صِدِّیْقَةٌ ؕ اور مسیح کی ماں صدیقہ تھی یعنی دوسری عورتوں کی طرح ایک عورت تھی لیکن دوسری عورتوں پر اپنی سچائی کی وجہ سے فضیلت رکھتی تھی اللہ کے احکام اور انبیاء کی تصدیق کرتی تھی۔

كَانَا یَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ دونوں کھانا کھاتے تھے یعنی کھانے کے ضرورت مند تھے (کھانے سے پاک اور بے نیاز نہ تھے) آیات میں اول مسیح و مریم کے کمالات و فضائل کا ذکر کیا اور بتا دیا کہ یہ فضائل استحقاق الوہیت نہیں پیدا کرتے، دوسروں کو بھی اللہ نے اسی طرح کے فضائل عطاء فرمائے ہیں۔ پھر مسیح و مریم کی وہ کمزوریاں اور نقائص ذکر فرمائیں جو حدوث کی علامات اور ربوبیت کے منافی ہیں اور یہ ظاہر فرمادیا کہ مسیح و مریم بھی تغیر پذیر کائنات میں سے تھے اسکے بعد آگے بطور تعجب فرمایا۔

اُنْظُرْ كَیْفَ نُبَیِّنُ لَهُمُ الْاٰیٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى یُؤْفَكُوْنَ۝ دیکھئے تو ہم کس طرح ان سے دلائل بیان کر رہے ہیں پھر دیکھئے وہ کدھر الٹے جا رہے ہیں۔ یعنی حق کو سننے اور غور کرنے سے کس طرح پھرے جا رہے ہیں۔ ثُمَّ انْظُرْ میں لفظ ثُمَّ دونوں تعجبوں کے تفاوت کو ظاہر کر رہا ہے۔ اللہ کا طرز بیان عجیب ہے لیکن اس سے بھی زیادہ تعجب آفریں ان کا اعراض ہے واضح طور پر جانتے ہیں کہ عیسیٰ حوادث لیل و نہار سے پاک نہ تھے نہ ان کی اپنی ہستی تھی نہ وہ اپنی ہستی کو خود باقی رکھنے کے مالک تھے۔ وجود اور بقاء وجود دونوں میں محتاج تھے۔ اس کے باوجود امکان و حدوث کی دائرہ سے وہ عیسیٰ علیہ السلام کو باہر خیال کرتے ہیں۔ جب انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے اندر کچھ خداداد خاص صفات کا مشاہدہ کیا تو الوہیت عیسیٰ کے قائل ہو گئے اور رب و مربوب کا فرق ان کو دکھائی نہ دیا۔

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی پوجا کرتے ہو جو نہ تمہارے کسی نقصان پر قابو رکھتی ہیں نہ نفع پر یعنی کیا عیسیٰ کی پوجا کرتے ہو۔ عیسیٰ کے

تمام افعال دوسرے انسانوں کی طرح اللہ ہی کے پیدا کئے ہوئے تھے اس لئے حقیقت میں کچھ بھی اپنا نہ تھا۔ سب کچھ خداداد تھا جس طرح دنیا میں اللہ دکھ اور مصیبت میں مبتلا کرنے اور آخرت میں عذاب دینے کی قدرت رکھتا ہے۔ ویسا عیسیٰ کو قابو نہیں اور جس طرح اللہ دنیا میں جسمانی صحت اور روزی کی وسعت اور آخرت میں جنت دینے کا اختیار رکھتا ہے ویسا اختیار عیسیٰ کو نہیں۔

مَا کی وضع لغوی ان چیزوں کے لئے ہے جو فطرتاً قوت ادراک سے خالی ہوں لیکن اس جگہ عیسیٰ مراد ہیں (تو مَنْ ہونا چاہئے جس کی وضع عاقل کے لئے ہے) گویا دوسری عاجز مخلوق کی طرح عیسیٰ کو بھی قرار دیا اور امر پر تنبیہ کی کہ مسیح بھی (گویا) اس مخلوق کے ہم جنس تھے جو ذی عقل نہیں پھر حامل الوہیت کیسے ہو سکتے ہیں۔ حصول نفع سے دفع ضرر کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے اس لئے ضرر کا ذکر نفع سے پہلے کیا۔

وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۶﴾ اور اللہ ہی سننے اور جاننے والا ہے۔ یعنی اقوال و عقائد سے واقف ہے۔ قول و عقیدہ کے مطابق سزا جزا دے گا۔ هُوَ ضمیر فصل مفید حصر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مسیح حقیقتاً سننے کے مالک تھے نہ دیکھنے کے نہ جاننے کے نہ دوسرے اوصاف کے ان کے یہ تمام اوصاف خداداد تھے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ آپ کہہ دیجئے اے حاملان کتاب اپنے دین (کے معاملہ) میں مبالغہ سے کام نہ لو یعنی حد اعتدال سے ہٹ کر افراط و تفریط میں مبتلا نہ ہو عیسیٰ کے عبداللہ اور رسول اللہ ہونے کا یقین رکھنا صحیح دین الٰہی ہے (اس عقیدہ سے تجاوز نہ کرو) یہودیوں نے اپنے دین میں تفریط کی اور حضرت عیسیٰ کی رسالت کے منکر ہو گئے اور عیسائیوں نے عیسیٰ کے معاملہ میں افراط سے کام لیا اور ان کے الٰہ ہونے کے مدعی ہو گئے۔ بعض علماء کے نزدیک یا اہل الکتاب سے صرف نصاریٰ کو خطاب ہے۔

غَيْرَ الْحَقِّ ناحق۔ یعنی افراط و تفریط نہ کرو ناحق۔ اس لفظ سے مفہوم غلو کی تاکید ہو گئی کیونکہ غلو تو ناحق ہوتا ہی ہے یا غیر الحق (مفعول مطلق نہیں بلکہ) دِيْنِكُمْ سے حال ہے یعنی اپنے باطل دین میں غلو نہ کرو۔ دین باطل میں غلو کرنے سے مراد ہے دین باطل پر جما رہنا۔

وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو اس سے پہلے گمراہ ہو چکے تھے یعنی اپنے ان اسلاف کی تقلید نہ کرو جو بعثت محمدی سے پہلے اپنی شریعت میں خود ہی گمراہ ہو گئے تھے۔

وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا اور بہتوں کو گمراہ بھی کر دیا تھا۔ یعنی بدعت اور گمراہی میں لوگ ان کے پیرو ہو گئے تھے۔

وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۷۷﴾ اور (بعثت محمدی کے بعد تکذیب اور مخالفت کی وجہ سے) سیدھے راستہ سے بھٹک گئے۔ یعنی دین اسلام سے بھٹک گئے۔ بعض علماء نے کہا آیت میں اول ضلالت سے مراد ہے، کفر اور دوسری ضلالت سے مراد ہے گمراہ کرنا۔ بعض نے کہا اول ضلالت سے مراد ہے عقلی گمراہی اور دوسری ضلالت سے مراد ہے شریعت کے بتائے ہوئے راستہ سے بھٹک جانا ہے۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لعنت کی گئی ان لوگوں پر جنہوں نے کفر کیا تھا بنی اسرائیل میں سے یعنی یہودیوں پر

عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبانی یعنی داؤد کی زبانی زبور میں اور عیسیٰ کی زبانی انجیل میں اول الذکر کافروں سے اہل ایلہ مراد ہیں کہ سنیچر کے دن کی حرمت کی انہوں نے خلاف ورزی کی تھی اور حضرت داؤد علیہ السلام نے ان کے لئے بددعا کی تھی اور کہا تھا الٰہی ان پر لعنت کر اور ان کو عبرت بنا دے چنانچہ ان کی شکلیں بندروں کی طرح کر دی گئیں اور اصحاب مائدہ جب ایمان نہ لائے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کو بددعا دی اور کہا الٰہی ان پر لعنت کر اور ان کو عبرت کی نشانی بنا دے چنانچہ وہ مسخ کر کے سور بنا دیئے گئے یہ لوگ پانچ ہزار تھے۔

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۷۸﴾ یہ (لعنت) ان کی نافرمانی اور حد سے تجاوز کرنے کی وجہ سے ہوئی۔

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ (نافرمانی اور حد سے تجاوز کرنے کی تشریح یہ ہے کہ) وہ آپس میں برے

کام (دوبارہ) کرنے سے نہ روکتے تھے یا یہ مطلب ہے کہ جب بعض لوگ برے کام کرنے کا ارادہ کرتے تھے تو دوسرے لوگ ان کو منع نہیں کرتے تھے برائی سے منع نہ کرنے کا تقاضا ہے کہ سب پر عذاب آجائے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ سے میں نے خود سنا آپ فرما رہے تھے کہ لوگ جب ظالم کو ظلم کرتے دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو اغلب ہے کہ اللہ کا عذاب ان سب پر آجائے۔ رواہ الاربعۃ۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے نسائی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جب لوگ برے کام (ہوتے) دیکھیں اور ان کو نہ بدلیں۔ ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ جن لوگوں کے اندر گناہ کئے جا رہے ہوں اور وہ گناہوں کو بدل دینے کی طاقت رکھنے کے باوجود نہ بدلیں تو اغلب ہے کہ اللہ کا عذاب ان سب پر آجائے

آیت کا دوسرا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ برے کاموں سے باز نہ رہتے تھے بلکہ ان پر جمے رہتے تھے تَنَاهِيْ عَنِ الْاَمْرِ فلاں شخص فلاں کام سے رک گیا باز رہا۔

لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۹﴾ ان کی یہ حرکتیں بری تھیں اس جملہ میں ان کی بد کرداری پر تعجب اور پر شوکت مذمت ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن مسعود کی روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا تم سے پہلے بنی اسرائیل میں سے اگر کوئی شخص گناہ کرتا تھا تو دوسرا شخص اس کو منع کرتا تھا لیکن دوسرے روز صبح کو ہی منع کرنے والا اسی مرتکب گناہ کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا اور کھاتا پیتا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کل گناہ میں اس کو آلودہ اس نے دیکھا ہی نہ تھا جب اللہ نے ان کی یہ حالت ملاحظہ فرمائی تو سب کے دل ایک جیسے کر دیئے اور کچھ لوگوں کو ان میں بندر اور سور بنا ڈالا اور داؤد علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی ان پر لعنت کی اس کا سبب ان کی نافرمانی اور حدود ممانعت سے تجاوز تھا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم کو ضرور نیکی کی ہدایت اور برائی سے باز داشت اور بیوقوف کے ہاتھوں پر گرفت اور حق پر اجتماعی موافقت کرنی لازم ہے ورنہ تمہارے دلوں کو بھی اللہ ایک جیسا کر دے گا (یعنی سب کے دلوں پر مہر لگا دے گا) اور جس طرح ان پر لعنت کی اسی طرح تم پر بھی لعنت کرے گا) رواہ الترمذی وابوداؤد۔ من حدیث عبداللہ بن مسعود مرفوعاً۔[1]

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ آپ ان (یہودیوں میں سے) بہتوں کو دیکھ رہے ہیں جیسے کعب بن اشرف اور اس کے

يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ط کہ کافروں سے دوستی کرتے ہیں کافروں سے مراد ہیں مکہ کے مشرک یہ یہودی مکہ کے مشرکوں کے پاس اس غرض سے گئے تھے کہ ان کے لشکر کو رسول ﷺ پر چڑھا لائیں۔ حضرت ابن عباس، مجاہد اور حسن کا قول ہے کہ مِنْهُمْ کی ضمیر منافقوں کی طرف راجع ہے کیونکہ منافق یہودیوں کے دوست تھے۔

لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۸۰﴾ جو کام انہوں نے آگے کے لئے کیا ہے وہ بیشک برا ہے کہ اللہ ان پر ناخوش ہو اور عذاب ہی میں یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے۔

اگر اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ کو مخصوص بالذم قرار دیا جائے تو سَخِطَ سے مراد ہو گا موجب غضب و عذاب اور اگر مخصوص بالذم کو محذوف مانا جائے تو اَنْ سَخِطَ الخ علت ذم ہو گی

وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ اور اگر یہ لوگ اللہ پر ایمان رکھتے اور پیغمبر پر اور اس کتاب پر جو پیغمبر کے پاس بھیجی گئی تھی تو ان کو (بھی) دوست نہ بناتے یعنی اگر یہودی یا منافق ایماندار ہوتے تو مکہ کے کافروں سے (مسلمانوں کے مقابلہ میں) دوستی نہ کرتے یا یہ مطلب کہ اگر منافق ایماندار ہوتے تو یہودیوں سے دوستی نہ کرتے کیونکہ اللہ اور آسمانی کتابوں پر ایمان اس سے روکتا ہے (تقاضائے ایمان کے خلاف ہے کہ اللہ کے دشمنوں سے اللہ کے دوستوں کے مقابلہ میں دوستی کی جائے)۔

وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۱﴾ لیکن ان میں سے بہت سے لوگ فاسق ہیں یعنی اللہ کے احکام کی پابندی سے باہر ہیں۔

---

[1] شاید عبدالرحمٰن بن مسعود سہو کاتب ہے صحیح عبداللہ بن مسعود ہے۔ (مترجم)

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ آپ اہل ایمان کا سب سے سخت دشمن یہودیوں اور مشرکوں کو پائیں گے ابو الشیخ اور ابن مردویہ نے حضرت ابی کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا یہودی جب بھی مسلمان کو تنہائی میں پاتا ہے اس کے دل میں خیال آتا ہے کہ مسلمان کو قتل کر دوں۔

مشرکوں سے مراد ہیں عرب کے مشرک کیونکہ وہ خواہشات نفسانی میں غرق تھے اسلاف کے اندھے پیرو تھے تحقیق سے ان کا دور کا بھی تعلق نہ تھا انبیاء کی تکذیب اور عداوت کے ہمیشہ سے عادی تھے۔

وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ اور جو لوگ اپنے نصاری ہونے کے قائل ہیں ان کو آپ اہل ایمان کی دوستی کے سب سے زیادہ قریب پائیں گے۔ بغوی نے لکھا ہے اس جگہ تمام نصاری مراد نہیں ہیں کیونکہ مسلمانوں کی دشمنی میں تو عام نصاری بھی ویسے ہی شدید ہیں جیسے مسلمانوں کو قتل کرنے، تباہ کرنے، قید کرنے، مسلمانوں کی بستیوں کو برباد کرنے، مسجدوں کو ڈھانے اور قرآن مجید کو جلانے میں یہودی سخت ہیں، دونوں فرقوں میں کوئی فرق نہیں ہے آیت میں صرف وہ عیسائی مراد ہیں جو مسلمان ہو گئے جیسے نجاشی اور ان کے ساتھی۔

نسائی بن ابی حاتم اور طبرانی نے حضرت عبد اللہ بن زبیر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت نجاشی اور ان کے ساتھیوں کے متعلق ہوا۔

ابن ابی حاتم وغیرہ کا مجاہد نے قول نقل کیا ہے کہ آیت کا عیسائیوں کا وہ وفد مراد ہے جو حبشہ سے حضرت جعفر کے ساتھ آیا تھا عطاء کا بھی یہی قول ہے۔

بعض اہل تفسیر کے نزدیک تمام یہودی اور تمام عیسائی مراد ہیں کیونکہ عموماً یہودی سنگ دل اور عیسائی ان کے مقابلہ میں نرم دل ہوتے ہیں اور عیسائی مشرکوں کی امداد کم کرتے تھے۔ یہودی مشرکوں کے بڑے حامی تھے میں کہتا ہوں کہ واقعہ نزول کچھ بھی ہو خواہ نجاشی کا قصہ ہو یا کوئی دوسرا۔ الفاظ کے عموم کا تقاضا ہے کہ کوئی معین جماعت مراد نہ ہو کیونکہ جو یہودی مسلمان ہو گئے تھے جیسے عبد اللہ بن سلام اور کعب احبار وغیرہ وہ بھی مسلمان ہونے والے عیسائیوں سے کم درجہ پر نہ تھے (پھر مسلمانوں عیسائیوں کو اقرب المودت کہنا اور مسلم یہودیوں کو اقرب المودت کے گروہ سے خارج قرار دینا کوئی معنی نہیں رکھتا) حق بات یہ ہے کہ نصاری سے مراد وہی نصاری ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے صحیح اور سچی عیسائیت پر تھے جن میں سے حضرت نجاشی اور آپ کے رفقاء بھی تھے مسیح کو اللہ یا اللہ کو تین میں کا تیسرا کہنے والے (کفار) مراد نہیں ہیں عیسائیوں کے یہ باطل فرقے تو یہودیوں کی طرح خواہش پرست اور سنگ دل تھے جیسے نجران کے باشندے تھے البتہ جو صحیح عیسائیت پر تھے اور انجیل کے صحیح عالم تھے وہ منتظر تھے کہ حضرت عیسی علیہ السلام کے بعد ایک پیغمبر کا آنا ضروری ہے جن کا نام احمد ہوگا یہ لوگ سچے علم اور صحیح عمل کے شیدائی، دنیا سے روگرداں، صاف دل پاک باطن تھے پہلے حضرت عیسی پر ایمان لا چکے تھے جس کی وجہ سے ان کے دل روشن ہو گئے تھے اس کی تائید آئندہ متصل آیت سے ہو رہی ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا یہ اس سبب سے ہے کہ ان میں بہت سے علم دوست عالم ہیں اور بہت سے تارک دنیا درویش ہیں یعنی اہل ایمان سے نصاری کے اقرب المودت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان میں علماء اور مشائخ ہیں بغوی نے لکھا ہے کہ رومی زبان میں قس اور قسیس کا معنی ہے عالم۔ قاموس میں ہے قسیس صدر علماء نصاری قسیس کسی چیز کی تلاش اور جستجو کرنا۔ صحاح میں ہے قسیس عالم، عابد، سردار نصاری اور قس کا معنی ہے کسی چیز کو رات میں تلاش کرنا علماء اور عبادت گزار مشائخ بھی رات کو ہی علم اور توجہ کی یکسوئی کے طلب گار ہوتے ہیں رہبان راہب کی جمع ہے جیسے راکب کی جمع رکبان آتی ہے رہبان سے مراد ہیں عبادت گزار خانقاہ نشین لوگ۔ قاموس میں ہے رَہِبَ (باب سمع) وہ ڈر گیا اور تَرَہُّبْ کا معنی ہے عبادت گزاری۔

وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ اور یہ وجہ بھی ہے کہ وہ غرور نہیں کرتے یعنی جب ان کو قبول حق کی دعوت دی جاتی

ہے تو وہ یہودیوں کی طرح دعوت کو پائے حقارت سے نہیں ٹھکراتے۔

قتادہ نے کہا کچھ اہل کتاب صحیح شریعت عیسوی پر قائم تھے پھر جب رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تو آپ کی بھی تصدیق کی اور ایمان لے آئے اللہ نے اس آیت میں انہی کی تعریف فرمائی اور انہی کے متعلق آیت ذٰلِکَ بِاَنَّ مِنۡهُمۡ قِسِّیۡسِیۡنَ وَرُهۡبَانًا الخ نازل فرمائی، میں کہتا ہوں قتادہ نے جن عیسائیوں کا بیان کیا ہے کہ وہ بعثت سے پہلے بھی دین حق پر تھے اور بعثت کے بعد بھی رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئے وہ ہی رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد میں مراد ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا تین شخص ایسے ہیں جن کو دوہرا ثواب ملے گا (ان میں سے) ایک وہ اہل کتاب ہے جو اپنے نبی پر بھی ایمان لایا اور (بعثت کے بعد) محمد ﷺ پر بھی ایمان لایا۔ متفق علیہ عن ابی موسیٰ الاشعری۔

اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ قریش نے باہم مشورہ کر کے طے کر لیا کہ مسلمانوں کو طرح طرح کی اذیتیں دے کر دین اسلام سے برگشتہ کریں گے۔ چنانچہ طرح طرح سے دکھ اور جسمانی تکلیفیں دینے لگے جس کو دکھ اٹھانا تھا اس نے اٹھایا اور جس کو اللہ نے بچانا چاہا بچا لیا رسول اللہ ﷺ کو آپ کے چچا ابو طالب کی وجہ سے امان میں رکھا لیکن ساتھیوں کا دکھ جب انتہا کو پہنچ گیا اور ان کو محفوظ رکھنے کی کوئی تدبیر نظر نہ آئی تو آپ نے ملک حبش کو نکل جانے کا حکم دے دیا کیونکہ اس وقت تک جہاد کی اجازت نہیں ہوئی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا وہاں کا بادشاہ نیک ہے نہ وہ ظلم کرتا ہے نہ اس کے پاس پہنچ کر کسی پر ظلم کیا جا سکتا ہے تم لوگ وہاں چلے جاؤ جب اللہ مسلمانوں کے لئے (یہاں) کوئی کشائش پیدا کر دے گا تو دیکھا جائے گا۔ شاہ حبشہ سے مراد نجاشی تھا۔ نجاشی شاہ حبش کا لقب تھا جیسے (شاہ روم کا لقب) قیصر اور (شاہ ایران کا لقب) کسریٰ تھا اس نجاشی کا نام اصحمہ تھا حبشی زبان میں نجاشی کا معنی ہے عطیہ۔ حسب الحکم گیارہ مرد اور چار عورتیں (سب سے پہلے ترک وطن کر کے) حبش کو چل دیئے۔

حضرت عثمان بن عفان، آپ کی اہلیہ حضرت رقیہ جو رسول ﷺ کی صاحبزادی تھیں، حضرت زبیر بن العوام، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ، حضرت ابو حذیفہ کی بی بی حضرت سہلہ بنت سہیل بن عمرو، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت ابو سلمہ بن عبدالاسد اور آپ کی بی بی، حضرت ام سلمہ بنت امیہ، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت عامر بن ربیعہ اور آپ کی بی بی حضرت لیلیٰ بنت ابی حیثمہ، حضرت حاطب بن عمرو حضرت سہیل بن بیضا

رجب ۵ نبوت کو روانہ ہوئے اور سمندر پر پہنچ کر نصف دینار میں ایک کشتی کرایہ پر لے کر ملک حبش کو چلے گئے۔ یہ ہی پہلی ہجرت ہوئی کچھ مدت کے بعد حضرت جعفر بن ابی طالب بھی چلے گئے اور آپ کے بعد پیہم مسلمان حبش کو ہجرت کرنے لگے عورتوں اور بچوں کے علاوہ صرف مردوں کی تعداد ۸۲ ہو گئی جو حبش میں پہنچ گئے۔ قریش کے علم میں جب یہ بات آئی کہ مسلمان حبش میں پناہ گیر ہو گئے ہیں تو انہوں نے عمرو بن عاص کو حبش بھیجا۔ نجاشی اور اس کے سرداروں کے لئے عمرو بن عاص کے ساتھ کچھ تحفے ہدیئے بھی کر دیئے تاکہ شاہ حبش مسلمانوں کو واپس لوٹا دے لیکن ان کی یہ تدبیر ناکام ہوئی اور اللہ نے مسلمانوں کو محفوظ رکھا یہ قصہ ہم سورۂ آل عمران کی آیت اِنَّ اَوۡلَی النَّاسِ بِاِبۡرٰهِیۡمَ لَلَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ کی تفسیر میں لکھ چکے ہیں۔

عمرو بن عاص اور ان کے ساتھی جب ناکام واپس لوٹ آئے تو نجاشی نے بڑی خاطر مدارات کے ساتھ مسلمانوں کو رکھا مدت کے بعد جب رسول اللہ ﷺ نے (مدینہ کو) ہجرت کی اور سن ۶ ہجری میں حضرت عمرو بن امیہ ضمری کے ہاتھ نامہ مبارک نجاشی کے نام روانہ کیا جس میں لکھا تھا کہ اگر ام حبیبہ راضی ہوں تو ان کا نکاح مجھ سے کر دو اور مسلمانوں کو میرے پاس واپس بھیج دو۔ حضرت ام حبیبہ بنت ابو سفیان اپنے شوہر کے ساتھ ہجرت کر کے چلی گئی تھیں لیکن حبش میں ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا (تو رسول اللہ ﷺ نے نجاشی کو نامہ مبارک لکھا۔

حسب الحکم نجاشی نے اپنی باندی ابرہہ کو چار سو دینار دے کر حضرت ام حبیبہ کے پاس بھیجا اور ابرہہ کے ذریعہ سے رسول اللہ ﷺ کا پیام نکاح حضرت ام حبیبہ کو پہنچایا، حضرت ام حبیبہ نے یہ پیام سن کر خوشی کے مارے اپنے کنگن دے دیئے اور

خالد بن سعید بن العاص کو وکیل نکاح بنادیا خالد نے چار سو دینار مہر پر رسول اللہ ﷺ کا نکاح حضرت ام حبیبہ سے کر دیا نجاشی نے رقم مہر حضرت ام حبیبہ کو دے دی۔ ابرہہ جب مہر کی اشرفیاں لے کر حضرت ام حبیبہ کی خدمت میں پہنچی تو آپ نے پچاس اشرفیاں اس کو عطا فرمائیں ابرہہ نے لینے سے انکار کر دیا اور عرض کیا مجھے بادشاہ نے نہ لینے کی ہدایت کر دی ہے۔ میں تو بادشاہ کے توشہ خانہ کی مہتمم ہوں میں محمد رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرتی اور ان پر ایمان لاتی ہوں میری آپ سے یہ درخواست ہے کہ جب آپ پہنچیں تو حضور ﷺ کو میرا اسلام عرض کر دیں حضرت ام حبیبہ نے فرمایا بہت اچھا۔ بادشاہ نے اپنی عورتوں کو حکم دیا کہ حضرت ام حبیبہ کو (جو خوشبوئیں موجود ہیں جیسے) عود عنبر بھیج دیں۔ حضرت ام حبیبہ کا بیان ہے کہ ہم حبش سے مدینہ کو روانہ ہو گئے۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ خیبر میں تھے جو حضور ﷺ کے پاس جانا چاہتے تھے وہ خیبر کو چلے گئے مگر میں مدینہ میں رہی جب رسول اللہ ﷺ خیبر سے مدینہ کو واپس آگئے تو میں خدمت گرامی میں حاضر ہوئی آپ مجھ سے نجاشی کا حال پوچھنے لگے میں نے ابرہہ کا سلام پہنچایا۔ حضور نے سلام کا جواب دیا اس پر آیت عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً نازل ہوئی یعنی ام حبیبہ کے ساتھ نکاح ہونے کی وجہ سے امید ہے کہ تمہارے دشمنوں کی (ابوسفیان وغیرہ) دشمنی کو اللہ دوستی سے بدل دے گا۔ چنانچہ ابوسفیان کو جب ام حبیبہ کے نکاح کی اطلاع پہنچی تو بولا وہ نر ہے ان کی ناک کو نہیں ٹھونکا جاسکتا (یعنی محمد ﷺ شریف بہادر ہیں ان میں کوئی عیب نہیں) حضرت جعفر کے ساتھ نجاشی نے اپنے بیٹے اربا بن اصحمہ بن الجر کو ساٹھ حبشیوں کے جماعت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا تھا اور ایک عرض داشت بھی بھیجی تھی جس میں لکھا تھا یارسول اللہ میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں آپ کی (گزشتہ کتابوں میں بھی) تصدیق کی گئی ہے میں نے آپ کی اور آپ کے چچا کے بیٹے کی بیعت کر لی ہے اور اللہ رب العالمین کا فرماں بردار ہو گیا ہوں۔ میں آپ کی خدمت میں اپنے بیٹے اربا کو بھیج رہا ہوں اگر آپ کا حکم ہو گا تو خود بھی حاضر ہو جاؤں گا۔ والسلام علیک یارسول اللہ۔ یہ قافلہ حضرت جعفر اور آپ کے ساتھیوں کے بعد ایک کشتی میں سوار ہوا لیکن وسط سمندر میں پہنچ کر اربا ڈوب گیا۔ حضرت جعفر اور آپ کے ستر ساتھی اونی کپڑے پہنے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے ان میں 62 حبشی تھے اور 8 شامی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو پوری سورۂ یٰسین پڑھ کر سنائی یہ لوگ سن کر رونے لگے اور سب ایمان لے آئے اور عرض کیا یہ کلام تو اس کلام سے بہت ہی مشابہ ہے جو عیسیٰ علیہ السلام پر اترتا تھا اس پر آیت وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى نازل ہوئی۔ اس آیت میں وہی عیسائی مراد ہیں جن کو نجاشی نے بھیجا تھا اور جو حضرت جعفر کے ساتھ آئے تھے یہ ستر آدمی تھے اور خانقاہوں والے تھے۔

مقاتل و کلبی نے ان کی تعداد چالیس بیان کی ہے جن میں ۳۲ حبشی اور آٹھ شامی تھے اور عطاء کے قول میں کل تعداد اسی بیان کی گئی ہے۔ چالیس نجرانی (یمنی) جو بنی حارث کے قبیلہ میں سے تھے اور ۳۲ حبشی اور آٹھ شامی رومی۔

ابن ابی شیبہ، ابن ابی حاتم اور واحدی نے ابن شہاب کے سلسلہ سے سعید بن المسیب اور ابو بکر بن عبد الرحمٰن اور عروہ بن زبیر کی روایت مرسلاً بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرو بن امیہ ضمری کو نامہ مبارک دے کر نجاشی کے پاس بھیجا۔ حضرت عمرو نے جاکر نامہ مبارک نجاشی کو پہنچا دیا۔ نجاشی نے خط پڑھ کر مشائخ و علماء کو بلایا حضرت جعفر کو مع رفقاء کے بھی طلب کیا حضرت جعفر نے سب کو سورۂ مریم پڑھ کر سنائی سن کر سب ایمان لے آئے اور سب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آیت وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً --- فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ انہی کے متعلق اللہ نے نازل فرمائی۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر کی روایت سے لکھا ہے کہ نجاشی نے اپنے خاص مصاحبین میں سے ایک بزرگ شخص کو جس کا نام فلاس تھا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھی بھیجا۔ حضور ﷺ نے اس کو سورۂ یٰسین پڑھ کر سنائی۔ سن کر (افلاس اور اس کے ساتھی) سب رونے لگے اور انہیں کے متعلق آیت مذکورہ کا نزول ہوا۔

نسائی نے حضرت عبداللہ بن زبیر کا قول لکھا ہے کہ آیت مذکورہ کا نزول نجاشی اور ان کے ساتھیوں کے متعلق ہوا۔